سہ ماہی
ادبیات

سرورق کا مصور

اے کے سجاد (پ۔ ۶ جنوری ۱۹۲۳ء) لگ بھگ بارہ مختلف اسالیب آزمانے کے بعد ان دنوں دو نمایاں اسالیب میں مصوری میں مشغول ہے۔ ایک تو وہی عامی طور پر مقبول و معروف انداز ہے جہاں وہ اپنی متصوفانہ خاکہ نگاری کو مردی خط و خال میں اجاگر کرتا ہے۔ ایسی مسطح تصویر کشی سے اس نے تصوف پر اپنی کتابوں کی تزئین کی ہے۔ اس نوع کی پیکر تراشی یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد کے اطالوی مصوروں کی یاد دلاتی ہے۔

دوسری طرف وہ مشرقی طرز کا بھی دلدادہ ہے اس کی کہیں دھیمے کہیں شوخ رنگوں میں ابھرتی ہوئی اشکال اور ہیئتیں ایرانی اور مغل منی ایچر مصوری کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں

اس کی متصوفانہ تصویروں میں مرد و زن کی بند آنکھیں ازحد معنی خیز ہیں۔

اے کے سجاد ایک اظہاریت پسند مصور اور قلم کار ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد سچ کی تلاش اور حقیقت مطلق تک رسائی ہے اس کے خیال میں دنیاوی آلام و مصائب سے نجات کا راز صوفیانہ طرز عمل میں پوشیدہ ہے۔

(خ۔ا۔ی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شمارہ ۱۹

جلد ۵

بہار ۱۹۹۴ء

مدیر مسئول : غلام ربانی آگرو

مدیر منتظم : افتخار عارف

مدیر اعلیٰ : خالد اقبال یاسر

بدلِ اشتراک

— اندرونِ ملک —

فی شمارہ -/۳۰ روپے ، سالانہ چندہ -/۱۲۰ روپے
(بشمول محصول ڈاک)

— بیرونِ ممالک —

امریکہ، کینیڈا، یورپ، مشرقِ بعید، جنوبی افریقہ

فی شمارہ : ۱۰- امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ : ۴۰- امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

مشرقِ وسطیٰ، بھارت، شمالی افریقہ

فی شمارہ : ۸- امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ ۳۲- امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

- اشاعت کے لیے اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف صاف صاف لکھی ہوئی "مدیرِ اعلیٰ ادبیات، سیکٹر ایچ -۸/۱، اسلام آباد" کے پتے پر ارسال فرمائیے اور مضمون کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھیے۔

- مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

- نگارشات کے نفسِ مضمون کی ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ اُن کی آرا کو اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

ترسیل و اشتہارات : ——— حمید قیصر

اہتمامِ طباعت : ——— طارق شاہد

— ناشر —

اکادمی ادبیات پاکستان ○ سیکٹر ایچ ۸/۱ ○ اسلام آباد

فون نمبر : ۲۵۴۵۶۷

طابع ● کرسٹل پرنٹرز، اسلام آباد ● فون ۸۱۴۴۶۶

فہرست

حمد	اسلم انصاری	۷
نعت	انجم رومانی	۸
نعت	انور محمود خالد	۹
نعت	ماجد صدیقی	۱۰

بلوچستانی ادب۔ خصوصی مطالعہ

بلوچی شاعری کے اردو تراجم ۱۹۴۷ء تاحال	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۱۱
براہوئی شاعری کے اردو تراجم ۱۹۴۷ء تاحال	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۴۰
بلوچستانی پشتو شاعری کے تراجم ۱۹۴۷ء تاحال	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۵۶
بلوچی ادب	عطا شاد	۹۴
بلوچی شاعری کا ارتقاء	یاسمین نظامی	۹۷
بلوچستانی پشتو ادب۔ ۱۹۴۷ء تاحال	علی دیپک قزلباش	۱۰۴
ہزارہ گی کا ابتدائی لسانی مطالعہ	شرافت عباس	۱۰۷

افسانہ

ایک ستارہ ٹوٹا	نعمت اللہ گچکی	۱۲۹
آواز	غنی طارق	۱۳۳
نسخہ	غنی پرواز	۱۳۷

غریب باسی	رزاق نادر	۱۳۹
تشنہ کام	منیر عیسیٰ	۱۴۲
شابو	م۔ م۔ طاہر	۱۴۴
قحط سالی	عبدالغفار پکچی	۱۴۸
انعام	محمد بیگ بلوچ	۱۵۲
دوسرا سچ	افضل مراد	۱۵۵

شاعری

نظم	جوانسال بگٹی	۱۵۹
نظم	جوانسال بگٹی	۱۶۲
غیرت	میر گل خاں نصیر	۱۶۵
مرا قلم مرا سخن	میر گل خاں نصیر	۱۶۶
دیا	میر گل خاں نصیر	۱۶۷
تو	میر گل خاں نصیر	۱۶۸
کشار	آزاد جمالدینی	۱۶۹
نہادی	آزاد جمالدینی	۱۷۲
ایک بند (مزدور سے خطاب)	آزاد جمالدینی	۱۷۴
لوری	آزاد جمالدینی	۱۷۵
اے شبِ ماہ!	آزاد جمالدینی	۱۷۶
خانہ بدوش	میر محمد حسین عنقا	۱۷۸
وطن کی خاک	میر محمد حسین عنقا	۱۷۹
باتیں کروں	سید ظہور شاہ ہاشمی	۱۸۰
امید	قاضی عبدالرحیم صابر	۱۸۱
قدر مشترک	سید خیر محمد عارف	۱۸۲
مجبوری	سید خیر محمد عارف	۱۸۳
پاکستان کے لیے دعا	میر عیسیٰ قومی	۱۸۴

اے قائداعظم!	میر عیسیٰ قومی	۱۸۵
جان کنی	عطا شاد	۱۸۷
غزل	مراد ساحر	۱۸۸
غزل	مراد ساحر	۱۸۹
کھو جانے والے کی تلاش	اکبر بارکزئی	۱۹۰
روچا کئے کشت کنت	اکبر بارکزئی	۱۹۱
اکیلا پن	مبارک قاضی	۱۹۳
وطن	مبارک قاضی	۱۹۵
اے مری جاں، میری دوست!	بشیر بیدار	۱۹۶
وطن کا نغمہ	مومن بزدار	۱۹۷
دل سمندر نگر	واحد بزدار	۱۹۹
درد کا شجر	اللہ بخش بزدار	۲۰۱
پرائی زمین	منظور بلوچ	۲۰۳
آرزو	ممتاز یوسف	۲۰۵
رات مہرباں آ جا!	ممتاز یوسف	۲۰۶
اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں	حیات شوکت	۲۰۹
وطن	میر عبدالرحمٰن کرد	۲۱۰
گل زمین	نادر قمبرانی	۲۱۱
قومی نغمہ	پیر محمد زبیرانی	۲۱۲
اب جاگ اٹھے ہیں ہم	پیر محمد زبیرانی	۲۱۳

ممتاز مفتی ۔ فن و شخصیت

ممتاز مفتی : تعارف	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۲۱۵
ممتاز مفتی سے ایک گفتگو	رشید امجد۔ جلیل عالی	۲۱۹
ایک ذاتی خاکہ	ممتاز مفتی	۲۳۹
مفتی بڑا ایڈیشک ہے	عزیز ملک	۲۴۳
مفتی جی	مسعود قریشی	۲۴۶

ان کہی سے علی پور کا ایلی تک	شمیم احمد	۲۴۹

فنون لطیفہ

مغربی مصوری کے جدید تر رجحانات	نسیم نیشوفوز	۲۵۹
اے۔ کے۔ سجاد کا فن	انور زاہدی	۲۶۳

فکر و نظر

مثال کے طور پر جوئیس۔۴	پیٹر مخمل	۲۶۷

تنقید و تحقیق

بلھے شاہ کی ارضیت	ڈاکٹر انور سدید	۲۷۷
شاہنامہ فردوسی ایک عالمی شاہکار	ڈاکٹر محمد ریاض	۲۸۲
باقی صدیقی۔ ایک ناقابل فراموش شاعر	جمیل یوسف	۲۹۳
کمانڈانٹ جنرل آف ہیومر۔ شفیق الرحمن	فوزیہ چودھری	۲۹۹

جائزہ

گھوڑیاں/ ارشد میر	شریف کنجاہی	۳۱۵
اقبال" پیامبر امید/ علامہ حکیم محمد حسین عرشی امرتسری	ڈاکٹر محمد ریاض	۳۱۷
بیدل/ خواجہ عباداللہ اختر	ڈاکٹر محمد ریاض	۳۲۱
ملفوظات رومی" / عبدالرشید تبسم (مترجم)	ڈاکٹر محمد ریاض	۳۲۵
شہربدر/ اکبر حمیدی	نظیر صدیقی	۳۲۸
عذاب شہرپناہ/ انور زاہدی	نظیر صدیقی	۳۳۲
نصف النہار/ انور جمال	شمیم ترمذی	۳۳۶

جان پہچان

تصاویر

قلمی معاونین کے پتے	اشتر علی مرزا	۳۴۱

اسلم انصاری

حمد

بادباں تیرے' ہوا تیری' سفینے تیرے
موجِ دریا میں بنائے ہوئے رستے تیرے

ذرّے ذرّے کو کیا تو نے چمن زارِ وجود
نقشِ عالم پہ بکھرتے ہیں اجالے تیرے

ب زمینوں پہ اترتے ہیں تری یاد کے چاند
ہر بلندی پہ چمکتے ہیں ستارے تیرے

ر دبستانِ تمنا میں ہے تیرا مذکور'
شاخیں تیری ہیں' شجر تیرے' پرندے تیرے

رزو تیری ہے دریاؤں کے سینوں کا خروش
کفِ ہر موج لٹاتی ہے خزینے تیرے

س سے ممکن تری قدرت کے صحیفوں کا شمار
کوہ و صحرا میں درخشاں ہیں جریدے تیرے

اتوانا کو تواں تو ہی عطا کرتا ہے'
حوصلہ دیتے ہیں ہر دل کو اشارے تیرے

کون اس ورطۂ حیرت سے نکل سکتا ہے
سب مناظر میں سبھی دیکھنے والے تیرے

قش ہر رنگ میں تیرا ہی بیاں کرتا ہے
رنگ ہر حال میں لکھتا ہے قصیدے تیرے

کر کرنے کو ترا پھول زباں بنتے ہیں
تھامے رکھتا ہے ہر اک برگ نوشتے تیرے

ہ فنا ہو کہ عطا' تیری ہی قدرت کا ظہور
وہ خلا ہو کہ ملا' رنگ ہیں سارے تیرے

لِ ہر سنگ میں ہے تیرے ہی نغموں کا وفور
سنگ تیرے ہیں' گہر تیرے ہیں' جھرنے تیرے

ہر عبارت کا ہے مقصود ترا ذکرِ جمال
ہر ستائش کو ہیں منظور ترانے تیرے

انجم رومانی

نعت

جو ان سے سلسلہ استفادہ رکھتے ہیں
وہ تنگیوں میں بھی راہیں کشادہ رکھتے ہیں

بلند رکھتے ہیں معیارِ زندگی کتنا
نظر میں ان کا جو معیار سادہ رکھتے ہیں

بھروسہ کرتے ہیں اعمال پر مگر کم کم
امیدِ چشمِ عنایت زیادہ رکھتے ہیں

ہے بدنصیب نہ آئے جو اس کے سائے میں
وہ اپنا دامنِ رحمت کشادہ رکھتے ہیں

عجیب در ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے
وہ یاد اوروں سے مجھ کو زیادہ رکھتے ہیں

گلے لگاتے ہیں سب کو وہ، اس سے قطع نظر
کہاں سے آئے ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں

عزیز رکھتے ہیں انجم جو اپنے ایماں کو
عزیز جاں سے وہ ان کو زیادہ رکھتے ہیں

انور محمود خالد

نعت

اے کہ ترا وجود ہے رونقِ بزمِ کائنات
مظہرِ نورِ حق ہے تو، تجھ سے فروغِ شش جہات

اسوہ ترا مرے لیے جادۂ منزلِ حیات
مشعلِ رہ میرے لیے، تیرے لبوں کی بات بات

صبحِ ازل کی ضو بھی تو، شامِ ابد کی لو بھی تو
ذاتِ خدا کے بعد ہے تیری ہی ذات کو ثبات

نطق ترا اگر نہ ہو فکر و عمل کا رہنما
کیا ہیں مرے تصورات، کیا ہیں میرے تخیلات

نام ترا اگر نہ ہو میرے نفس نفس کی لے
کارِ فضول سب کلام، کارِ فضول سب حیات

حاملِ اسوۂ عظیم! تو ہے رؤف اور رحیم
مجتمع تیری ذات میں سارے رسل کی ہیں صفات

دونوں جہان کی عظمتیں سرنگوں تیرے سامنے
کاشفِ سرِّ کائنات! گرہ کشا ہے تیری ذات

تیرا جلال بھی عظیم، تیرا جمال بھی عظیم
خیرِ کثیر کے طفیل، تیری ادائیں معجزات

خواب میں بھی اگر مجھے دیدِ حضورؐ ہو نصیب
روز ہو میرا روزِ عید، شب ہو مری شبِ برات

ماجد صدیقی

نعت

وسعتِ ارض میں جس جگہ آپ نے پاؤں رکھا وہاں پھول کھلنے لگے
دشت جتنے تھے وہ گلستاں ہو گئے گلستاں گلستاں پھول کھلنے لگے

اس مبارک لہو سے بہایا گیا ارضِ طائف میں جو آپ کے جسم سے
آنگنوں میں گزرتے ہوئے وقت کے سر بہ سر جاوداں پھول کھلنے لگے

اس سخن سے کہ غارِ حرا میں رہا مدتوں خود کلامی پہ جو منحصر
خطۂ خاک کے ہر خیابان میں سو بہ سو ہم زباں پھول کھلنے لگے

اس طراوت سے جو صدقِ جذبات سے آپ نے تخمِ حرف و معانی کو دی
پہلوئے آسماں میں زماں در زماں، لب بہ لب جاں بہ جاں پھول کھلنے لگے

لطفِ اقوال سے اپنے رومال سے آپ نے اشک آنکھوں سے پونچھے تھے جو
ضم ہوئی دہر میں جب ان اشکوں کی نم کہکشاں کہکشاں پھول کھلنے لگے

آپ کے نطق سے لوگ ناطق ہوئے کیا سے کیا صورتِ ماجدِ بے زباں
بخش دیں آپ نے جن کو تابانیاں اور وہاں در وہاں پھول کھلنے لگے

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

بلوچی شاعری کے اردو تراجم ۱۹۴۷ء تا حال

قیام پاکستان کے بعد پہلی دفعہ بلوچی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی ۔ نتیجتاً رسائل نکلنے لگے اور ریڈیو سے بھی پروگرام نشر ہونے لگے ۔ ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان کراچی (بعد میں کوئٹہ پھر تربت اور خضدار) نے بلوچی نشریات کے خصوصی پروگرام کا آغاز کر دیا ۔ یوں بلوچی ادب تحریری طور پر پیش کیا جانے لگا ۔ بلوچی شاعروں نے اردو غزلیات سے کافی استفادہ کیا ۔ ۱۹۵۱ء میں بلوچی زبان کا پہلا رسالہ اومان ' جناب خیر محمد ندوی اور ۱۹۵۶ء میں ایک ماہانہ رسالہ " بلوچی " کراچی سے جناب آزاد جمالدینی کی ادارت میں منظر عام پر آئے ۔ ماہنامہ " بلوچی " کی وساطت سے اردو سے تراجم شائع ہوئے ۔ یہ ترجمے شعری اور نثری دونوں صورتوں میں کئے جاتے ۔ ان تراجم کے ذریعے بلوچی ادب میں اردو کی اصناف منتقل ہونا شروع ہوئیں۔

تعلیم کے فروغ نے بلوچی شعراء میں ذہنی پختگی کے پہلو بہ پہلو انہیں ایک نیا شعور اور جذبہ عطا کیا ۔ بلوچی حلقہ ادب کراچی " بلوچی زبان سر سنگ " کراچی اور بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ کے علاوہ کئی ادبی انجمنیں معرض وجود میں آئیں ۔ جو بلوچی شعر و ادب کے فروغ کا باعث بنیں ۔ ۱۹۶۱ء میں " اولس بلوچی " وفاقی حکومت کی جانب سے منظر عام پر آنا شروع ہوا اور اب تک جاری ہے ۔ اس ماہنامے نے ادبی تراجم کی حوصلہ افزائی کی ۔ اس میں عالمی ادب سے جو ترجمے بلوچی میں کئے گئے تھے وہ بھی شائع ہوئے ۔ غلام محمد شاہوانی کے ہفت روزہ " نوائے وطن " (پہلا دور ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء ۔ دوسرا دور زیر ادارت ملک محمد پناہ ۱۹۷۱ء سے ...) اور عبد الکریم شورش کے "نوکین دور" (ابتداء ۸ جون ۱۹۶۲ء) نے اردو سے تراجم شائع کئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد بلوچی شعراء نے ایک جانب کلاسیکی شاعری کو زیادہ سے زیادہ متعارف کرایا اور دوسری طرف روایتی اصناف سخن میں نئے انداز کے شعر کہے ۔ غزل اور زہیرگ (المیہ گیت) جدید شعرا کی قدیم شعرا ہی کی طرح مرغوب اور دلپسند اصناف ہیں ۔ ظہور پاکستان نے بلوچی شاعری کو اب تک کم از کم سو سخنور دیئے ہیں ان کے افکار زیادہ تر ادب برائے زندگی کے نظریئے کے مظہر ہیں ۔ وہ مقصدیت پر زور دیتے ہیں ۔ اگر امید پسندی کے ساتھ ساتھ قنوطیت اور یاسیت بھی بلوچی شعراء کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہے تو وہ زیادہ دیر تک اپنے آپ پر اس قنوطیت کو حاوی نہیں ہونے دیتے۔ موجودہ دور کے شاعروں میں گل خان نصیر کا نام سرفہرست ہے۔ آپ بلوچی کے علاوہ اردو میں بھی لکھتے تھے ۔ آپ نے بلوچی شاعری میں ہیئت کے نئے نئے تجربے کئے۔ آپ کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے۔ آپ کی دو اچھی نظمیں "شیطان" اور "کوہ چلتن سے خطاب" پیش کی جاتی ہیں جن میں واقعات کی عکاسی اور تاثر بھرپور ہے۔

شیطان

مترجمہ ۔ فدا یزدانی (؟)

موسم برف گیا ، فصل بہاراں آئی
ننھے پودوں نے مصیبت سے رہائی پائی
ہوگیا سب کو یقین برف پڑے گی نہ کبھی
لیکن افسوس کہ کل ہی یہ قیامت چھائی

اپنے باغوں کی طرف دوڑ پڑے پیر و جواں
تاکہ پودوں کی جوانی پر نہ چھا جائے خزاں
میں نے بھی ڈھانپ دیا پودوں کو سرکنڈوں سے
برف کے گالوں سے اٹھتا رہا یخ بستہ دھواں

برف گرتی رہی آکاش سے تاروں کی طرح
نور چھنتا رہا موسم سے پھواروں کی طرح
ماہ کامل کے اجالوں نے افق کو چوما
میرے دریائے محبت کے کناروں کی طرح

رقص کرتی ہوئی، گاتی ہوئی، اتراتی ہوئی
میں تری یاد کے ایوان سجاتی ہی رہی
کاش کم ہو یہ "پشین" اور "چمن" کی دوری
فاصلہ دلوں کے مابین نہ رہ جائے کوئی

تیرے الفاظ مرے ذھن میں لہرانے لگے
"بختے! میں تیرا منگیتر ہوں، تجھے یاد رہے
واپسی ارض "چمن" سے نہ ہو میری جب تک
باغ بادام میں سایہ بھی نہ تیرا جائے"

میرے کانوں میں یہ آواز تری گونج گئی
"دیکھو بادام کے باغوں میں نہ تم جانا کبھی"
رک گئے میرے قدم، ٹھہر گئی موج صبا
برف گرتی رہی، گرتی رہی ، گرتی ہی رہی

"کیونکہ ان باغوں میں رہتے ہیں شکاری کتے
خان کے گرسنہ تازی و تتاری کتے
خان' ہے جس کا مکاں خوف خدا سے خالی
خود ہے اک بھیڑیا اور اس کے حواری' کتے"

میرے احساس پہ جلتا ہوا اک تیر لگا
برف کا سیل' دہکتے ہوئے شعلوں میں ڈھلا
وہ جگہ جو کہ رہے خوف خدا سے خالی
کون ہوگا وہاں شیطان کے بندوں کے سوا

میں لرزتی ہوئی اس راہ سے کترا ہی گئی
ایک شیطان سے بچتی ہوئی گھر آ ہی گئی

"کوہ چملتن سے خطاب" کی ابتداء ابر گوہر آفریں کی قدرتی منظر کشی سے ہوتی ہے۔ اور ہوتے ہوتے ابر رواں زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ شاعر زندگی کے مسائل اور دنیا بھر کے پکڑ دھکڑ کے تذکرے چھیڑ دیتا ہے۔ نظم شاعر کے توانا ارادوں پر تمام ہوتی ہے اور کوہ چملتن زندگی' صلابت' طاقت اور نور کا نشان بن جاتا ہے۔ انور احسن صدیقی نے ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔ آیئے نظم ملاحظہ کیجئے:

کوہ چملتن سے خطاب

مترجمہ ۔ انور احسن صدیقی(۲)

ایک بادل نیلگوں پانی کو سینے میں لئے
اور سمندر کی ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا
پورے جاہ و فخر و ناز و شوکت ، سطوت کے ساتھ
دو دیسوں سے کہیں
آرہا تھا مست و آہستہ خرام
یک بیک اس کا سر پر افتخار
جاکے ٹکرایا کسی دیوار سے
ابر کی آنکھوں نے دیکھا سامنے
ایک کوہ سربلند و پر شکوہ
اپنے شانوں پر اٹھائے رفعت افلاک کو
آسماں کے دامن صد چاک کو

چند لمحے اپنی بے پایاں گہرباری کے بعد
اپنے سینے کی سبک ساری کے بعد
اپنے دامان تہی سے مطمئن
نرم چنچل ہوا کا دست شفقت تھام کر
اک دھندلکے کی طرح
ہو گیا جاکر فراز کوہ پر
آسمان کے دامن صد چاک کو
چپ کھڑا تھا راستہ روکے ہوئے
ابر نے سینے کو اپنے کھول کر
دو تک پھیلا دیا بوندوں کا نور
اور سخاوت کا ظہار
بھر دیئے نالے ندی سب دور دور!

○

گاہے گاہے جی میں آتا ہے خیال
کاش مانند عقاب
مجھ میں آجاتی اگر اڑنے کی تاب
آج میں پرواز کرتا بادل پر اضطراب
جلوہ گر ہوتا تیری چوٹی پہ مثل مہتاب
دیکھتا شاداب و سیراب و حسیں
وہ بلوچوں کی مقدس سرزمیں
حاکموں کے ظلم اور جبر و ستم
خون بہتا یم بہ یم
گولیوں کی بارشوں کے پیچ و خم
سر فروشوں کی شجاعت بزدلوں کے اشک غم
میں کہ سنتا اپنے گوش ہوش سے
داد و تحسین و ستائش سرفروشوں کے لئے
طعن و تشنیع و ملامت بزدلوں کے واسطے
دیکھتا میں دیدہ خوں بار سے
لوٹ استبداد و ظلم و شورش و جنگ و جدل

اور گلی کوچوں میں توپیں آگ برساتی ہوئی
خون پھیلاتی ہوئی
مغربی سوداگروں کے اسلحہ مرگ آفریں
توپ و تفنگ آتشیں
جل رہا ہے جن میں مشرق کا شباب
اے چہلتن! اے گرامی قدر کوہ سربلند و بے پناہ
تو کہ تھا چالیس باہمت سواروں کی بھی اماجگاہ
اے شہ مقصود کے پر خار کہسار سیاہ
تو کہ تھا رستم کا میدان جدال
اے حصار کوہ زار!
اے بلوچستان کی سنگین تراشیدہ چٹان
روزن زنداں سے اکثر دیکھتا ہوں میں
تیرا حسن بے مثال
ہے عجب اپنی تمناؤں کا حال
دیکھ لے جور و جفا کے طرز و طور
بربریت کا ہو دور
اور ظالم اپنی آزادی کے بدلے توپ و بم
لے کے کرتے ہیں ستم
سرزمین پاک پر
اجنبی ناپاک ڈاکو اپنے رکھتے ہیں قدم
غم زدہ جسموں کی روحیں سلب کرتے ہیں تمام
بھوک اور افلاس کر دیتے ہیں عام
حق پرستوں کی زبانیں کاٹ کر
ناتواں انسان کا خون چاٹ کر
عدل کے احساس کو وہم و گماں سے کھینچ کر
کشت زر کو ابن آدم کے لہو سے سینچ کر
مغربی سوداگروں نے بھر دیا دامن تمام
مفلسوں کا دولت افلاس سے
اہل زر کا گوہر و الماس سے
بخش دیتے ہیں یہ دلالوں کو تاج و سلطنت
اور پھیلاتے ہیں عیاری کے جال
بیچتے ہیں لا کے یاں کی منڈیوں میں اپنا مال

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی آواز ہے

ان دلوں پہ [illegible] جائیں گے

[illegible] نقوش

چاروں اور لازوال!

میر گل خان نصیر کی ایک اور بلوچی نظم کے چند اشعار کا اردو ترجمہ پیش [illegible] ہے - ان میں وہ
[illegible]وں کے چراغ جلا کر ہمارے ارادوں کو [illegible] ہیں۔

پتھر اگر کنوئیں میں گر جائے

قرنہا قرن وہیں پڑا رہے

پانی کا بہاؤ اسے بہا نہیں سکتا

ویسے ہی موتی کی مانند بلوچ

زمانے کے نشیب و فراز سے

بھرا اور غبار آلود نہیں ہوتا

وہ سونے اور الماس کی مانند ہے

جو نمی سے زنگ آلود نہیں ہو سکتا

ایک دن گھروں سے باہر نکلیں گے

اپنے رندی (رندوں) کے انداز میں

پلوؤں کو باندھ لیں گے (اتحاد کا اظہار)

سر دھڑ کی بازی لگائیں گے

مشک اور عنبر کی طرح خوشبو کامیابی

اپنے خوش نام وطن کے لئے حاصل کریں گے

میر گل خان نصیر کے بلوچی کے پانچ مجموعے (گلبانگ ۱۹۵۳ء شب گروک ۱۹۵۹ء دوستین شیرین
[illegible] داستان) ۱۹۶۳ء گل بہار (رزمیہ داستان) ۱۹۶۸ء گرانڈ (۱۹۷۲ء) شائع ہو چکے ہیں۔

"دوستین شیرین" کا منظوم اردو ترجمہ غوث بخش صابر نے کیا ہے - اس کے پبلشر ادارہ ثقافت
بلوچستان کوئٹہ ہیں۔ سن اشاعت اکتوبر ۱۹۸۸ء کل صفحات ۲۰۳ ' کل اشعار ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں
داستان کچھ یوں ہے۔ جب شاہ بیگ ارغون کے ترک لشکر نے رندوں پہ حملہ کیا' تو دوستین لڑتا ہوا قید ہو گیا۔
اور ہرند یا ائند کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ اس کی منگنی لال خان رند کی لڑکی شیریں سے طے ہوئی تھی۔
[illegible]ں نے اس کو محبت تھی۔ قید خانے میں اسے کئی برس بیت گئے۔ جب شیریں کے والدین کو دوستین کے
[illegible] بچے کی امید نہ رہی تو انہوں نے شیرین کی نسبت ایک اور جگہ ٹھہرا دی۔ اتفاق سے اس کا نام بھی

دوستین ہی تھا۔ عین شادی والے دن دوستین بھاگ کر اپنے گاؤں واپس آگیا۔ تو دیکھا شیریں کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ موقع پر پہنچا اور خود کو ڈوم ظاہر کرکے گانا شروع کیا۔ شیریں نے دوستین کی آواز پہچان لی اور یہ بات جب رندوں کو معلوم ہوئی تو سب اس سے گلے ملے اور خود دولہا نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا "اب جبکہ تم واپس آگئے ہو میں تمہاری امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں"

یہاں پر منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمایئے

دولہا کہ تھا دوستین نام — محفل سے بولا خوشکلام!
دوستین ہے جب زندہ سلام — شیریں ہے اب مجھ پر حرام
دونوں ہوں مل کر شاد کام — میں نے کیا جو خرچ مال
شیریں پر ہے وہ حلال! — دوستین پہ بخشا میں نے مال
دوستین اور وہ مہ لقا! — عقد ان کا دیواں میں ہوا
محفل بنی اس کی گواہ!! — مطرب کہ ہے اک خوش بیان
ہے عندلیب نغمہ خواں! — گیتوں میں کرتا ہے بیاں!

آخر میں گل خان نصیر عصری تقاضوں کا کھلے دل سے جائزہ لیتے ہوئے ماحول کو بدلنے کی امید کے ساتھ محنت کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم اپنے کوچہ و دشت و دمن کو — کریں گے گل بداماں اس چمن کو
کریں آباد محنت سے وطن کو — کہ ہے عظمت کی شاں محنت میں پنہاں

خوشی سے آج دل ہے باغ و بستان
رخ جاناں سے محفل ہے فروزاں

دلیرو ساتھیو خاتون خانہ! — غلامی کا نہیں ہے اب زمانہ!
عوامی دور آیا محرمانہ! — بنو محنت کشوں کے ساتھ سلطان

خوشی سے آج دل ہے باغ و بستان
رخ جاناں سے محفل ہے فروزاں

جناب خوش بخش صابر نے پہلی کوشش یہ کی ہے کہ اردو میں منظوم ترجمہ کرتے وقت بلوچی ہی کی بحر کو برقرار رکھا ہے۔ اس سے ان کا منظوم ترجمے کا کام خاصا پیچیدہ ہوگیا۔ مگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بھرپور

انداز میں بروئے کار لانے میں کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے بڑی کدو کاوش، جانفشانی اور ولولے سے اپنے فرض کو نبھایا ہے۔ یوں میر گل خان نصیر کا یہ شاہکار بلوچستان کی حدود سے نکل کر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر روشناس ہوسکا۔

میر عبد الواحد آزاد جمالدینی کی شاعری سادگی اور سچائی سے بھرپور ہے۔ وہ ہلکی پھلکی بحروں اور عام فہم زبان میں اپنے ماحول کی نہایت چابکدستی سے عکاسی کرتا چلا جاتا ہے۔ اور سچائی اور توانائی سے ایک ایسی منزل کا پتہ دیتا ہے جہاں دائمی اور عالمگیر محبت ہے۔

آزاد جمالدینی کے مجموعہ کلام مست ء توار (للکار) (مطبوعہ کوئٹہ ۱۹۵۳ء کل صفحات ۳۶) کا منثور اردو ترجمہ جناب انجم قزلباش نے کیا۔ چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:۔

"ملا من لوٹاں" (ہم امن چاہتے ہیں) کا ایک بند دیکھیے۔

معبود نے بھی مقدس قرآن میں
امن کی بے انتہا تعریف کی ہے
اور اسی لئے ہم بلوچ بھی
جنگ سے نفرت کا اعلان کرتے ہیں
کیونکہ ہم انسان ہیں اور
دائمی امن کے خواہاں ہیں

غزلیہ اشعار:

میری نازک اندام، پیاری محبوبہ! تو غم کی اندھیری راتوں میں
چاند کی طرح میرے جیون میں اجالا کرتی ہے
اے دلبرا تو غم کو دور کرنے والی ہے
تو میرے گھر کی روشنی اور زیبائش ہے
اے میری پری پیکر، دلکش و زیبا
تو ہر نفس میرے ساتھ رہتی ہے
اب اس عشق و محبت کی باتیں چھوڑ
کہ غریب وفادار غلاموں کو عشق و محبت زیب نہیں دیتا،
عشق کا زیور تو ایسے ہی لوگوں کو زیب دیتا ہے
جو بے فکر ہیں، شاد و خرم ہیں، شیر ہیں اور مست ہیں

آزاد' ہماری یہ خستہ حالی خود بخود کوئی راہ نکال لے گی
آزادی کی قدر و منزلت کا اس کے اپنوں کو علم نہیں ہے
یقیناً" کبھی نہ کبھی غلاموں کو بھی راستے کا نشان مل جائے گا
جیسے ریشمی کپڑوں میں ملبوس شخص کو ریشم کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا

آزاد جمالدینی کی ایک غزل کا منظوم ترجمہ از یزدانی (۴) جالندھری پیش قارئین ہے۔

افسردہ شمع پھر سے درخشاں کریں گے ہم
ہر قلب' ہر نظر کو فروزاں کریں گے ہم
بخشیں گے ہم عروس وطن کو جمال نو
مشاطگی' زلف پریشان کریں گے ہم
تقدیر کی ہر آہنی زنجیر توڑ کر
ہر ایک وہم' داخل زنداں کریں گے ہم
ہر کہنہ رسم جس سے ہے بیمار ذہن قوم
اس کو رہین آتش سوزاں کریں گے ہم
یہ امتیاز زر' یہ تفاوت یہ فاصلے
ان سب کو نذر گردش دوراں کریں گے ہم
ہر نقش جہل و ظلم و شقاوت مٹائیں گے
اپنے وطن کو رشک گلستاں کریں گے ہم
ذوق سفر ہے راہنما راہ شوق میں
دشوار منزلیں ابھی آساں کریں گے ہم

ملک محمد سعید ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو قریہ تیری (مستونگ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق دہوار قوم سے ہے۔ جن کی مادری زبان فارسی ہے۔ آپ کی دو مشہور کتابیں "مکمل تاریخ بلوچستان" اور "تاریخ بلوچستان" ہیں۔ آپ کے بلوچی اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

گردش دوراں کب میرے سامنے ٹھہری
مستی دوراں نے ہمیشہ میرے سامنے سرخم کیا ہے
موج بیاباں آنسوؤں کی طرح میرے سامنے رواں دواں ہے
میرے سامنے کوہ سلیمان گھاس کی طرح اڑ جاتا ہے
میرے سامنے رستم داستان فخر نہیں کرتا
خسرو ایران نے میرے سامنے آنکھیں نیچی کی ہیں

میں عشق جگر سوز ہوں مجھے کسی اور کام کے لئے نہ کہہ
کیونکہ میرے سامنے دامن بچا ہے اور نہ گریبان
جدھر دیکھتا ہوں، دنیا مجھے سیہ پوش نظر آتی ہے
میرے سامنے صرف شعلہ ایمان فروزاں ہے

محمد حسین عنقا کا آبائی وطن سبھگور تھا۔ ان کے والد محمد عبد اللہ مچھ (بولان) میں ٹھیکیداری کے سلسلے میں آئے تھے اور پھر یہیں اقامت گزین ہوگئے۔ محمد حسین عنقا یہیں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔

عنقا، ملک محمد سعید اور میر مٹھا خان مری کا محبوب شاعر غالب تھا۔ اور ان تینوں نے جوانی کے زمانے میں غالب کو بلوچی زبان میں اپنے اپنے انداز میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ مگر "غالب بولان" کا لقب عنقا کے حصے میں آیا اور وہ اس پر فخر کرتے تھے۔

آپ کا مجموعہ کلام ۱۹۳۴ء میں کراچی سے "رحیل کوہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ایک اور مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں فارسی، براہوئی اور بلوچی منتخب کلام ہے۔ نمونے کے طور پر بلوچی اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

پتلے پتلے ہونٹوں پر پن و مسواک
دل جسے دیکھ کر، خون خون اور چاک چاک ہے
قمیض پھاڑ کر پھر سینے بیٹھ جاتا ہے
صورت میں حور تجھ سے بہتر نہیں ہے
البتہ اس کا دامن خون سے پاک ہے
نور و خوشبو دل و دماغ میں بس گئے ہیں
تیری محبت گلاب کی پتی ہے
تیری جدائی کی یاد نے اس قدر بے تاب کر رکھا ہے
کہ سانس بھی گرم گرم نکل رہی ہے
عنقا وہ کیوں طاقت ور اور تم کمزور ہو؟
حالانکہ ہم دونوں ایک ہی مٹی کے ہیں

اصل نام محمد اسحاق، قلمی نام عطا شاد، شاد تخلص مقام پیدائش سنگانی سر، تربت (مکران) سن پیدائش ۱۹۳۹ء گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے بی۔ اے کیا۔ آپ کئی کتابوں جیسے بلوچی نامہ، بلوچی لوک گیت، گچیں (جدید بلوچی شعرا، بلوچی اردو لغت اور اردو مجموعہ کلام "سنگاب" کے مصنف اور صدارتی ایوارڈ یافتہ ہیں۔

نوجوان شعرا میں عطا شاد نے بلوچی شاعر کو جدید رنگ اور آہنگ سے آشنا کیا۔ عطا شاد اپنا ایک نیا لہجہ لے کر بلوچی شاعری میں داخل ہوا ہے۔ جس کی انفرادیت بلوچی اور اردو دونوں میں نمایاں ہے۔ عطا کی فکر میں جو بے خوفی اور کہستانوں کی گونجتی آواز ہے۔ اس میں اقبال کا فیض بھی شامل ہے۔(۴)۔

کوہساروں کی عطاؔ رسم نہیں خاموشی
رات سو جائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے

عطا شاد کے ذیل کے اردو اشعار بلوچی بحر میں ہیں۔

منجمد لمحوں میں رہا جائے
آگ کی دیوار بنا جائے
دل کی منزل ہے ملے کہاں ہو گی
روح کی جانب راستہ جائے
ہوش میں تیرے قرب جو آئیں
لمس کی لذت کا نشہ چھائے
ماہ میں تاثیر آ گئی مئے کی
یوں تجھے کوئی سوچتا جائے

عطا شاد کی ایک بلوچی غزل (۵) کا اسی کی زبان سے منظوم ترجمہ ملاحظہ کیجئے

جنم جنم کی پیاس بجھائے' ایک فقط احساس' دل سیلاب طلب' بولان ہو جیسے
برق گرے' یا شعلے برسیں پھر بھی رہے شاداب یہ تشنہ کشت طرب' بولان ہو جیسے
خنجر خون چکیدہ' یا لالہ لب کی باس' شہید رنگ کوہیں' یہ ایک ہی بات
عشق کی پھیلی ہوئی سرحد تک' حسن ہے ایک جہان اور غم بس ایک ہے سب بولان ہو جیسے
زلزلہ بروامان ہے لیکن خاک بسر ہے' چاک گریباں زخم غم احساس سے چور
صدیوں کا محروم' ہزاروں عمروں کا ناکام وہ اک انسان کہ اب بولان ہو جیسے
تشنگی دل کیسے بیاں ہو' ارمانوں کا ذکر تو جیسے صحرا اور شبنم کی بات!
زیست کے حسرت زار میں تنہا میری وفا بھی ایک عجب بولان ہو جیسے
بچھڑے ہوئے ساتھی نہ ملے' پھر آتے جاتے موسم بھی ناکام رہے' پھر جائے کیوں؟
دل کا راہ گزر ہے سونا' آس تھکی ہے' وہ عالم ہے جان بلب' بولان ہو جیسے
ایک وفا ہے ایک محبت' ایک تمنا' ایک طلب ہے پھر بھی میں اس سوچ میں ہوں
تیرے وصل کا باعث تھا منظور ترا' اور میرے لئے الفت کا سبب بولان ہو جیسے

عطا شاد کی ایک بلوچی نظم کا اردو ترجمہ عین سلام نے بعنوان ''مقبرے کا میر'' کیا ہے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔(۶)

میرا اے مقبرے کے میر
آج اس دشت میں
جہاں کوئی نظر آتا نہیں بجز افلاک
نکہتیں خشک داغ خاکستر
نقش کتبے کے تیری شہرت کی طرح اندھے ہیں اور بوڑھے ہیں
مقبرہ جیسے سنگ مرمر کا کہنہ قلعہ
جو منہدم تو نہیں
لیکن اس کا وہ حسن استحکام

اور اس کی وہ آب و تاب تمام
اب ہے اک خواب' ایک خیال خام
میں فلاک' تیرا ضعیف غلام
تیرے خاکیں سرہانے استادہ
ایسے خاموش اتنا ساکت ہوں
جیسے تو دھاڑنے سے تھا معذور
عمر کے باقیات میں اپنی

میرا اے مقبرے کے میر
آج اک عکس اک شبیہ نما
جو اک اخبار میں تھا مطبوعہ
مجھے تیرے قریب لے آیا
میں نے دیکھا ہراس و خوف سے دور
دور ہر لمس اختیار سے دور
رکھ رہا ہے قدم اک آدم زاد
رفعت ماہ کی زمین پہ
مجھے یاد آیا وہ دور
جب میں تھا پاپیادہ
تو اسپ پہ تھا سوار
روز و شب ایک مسافت نایافت
میں تیرے اسپ تیز سے آگے
بھاگتا۔ ہانپتا۔ لپکتا ہوا
گرتا۔ پڑتا' تڑپتا' مرتا ہوا
اپنے ہی خون میں نہایا ہوا
میں "فلاک" تیرا' میں آدم زاد
اس طرح ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا
مر تو سکتا تھا تھک نہ سکتا تھا

میرا اے مقبرے کے میر

آج تو مرچکا میں زندہ ہوں
کھیت وہ سرشک کا
جس کو تو نے چھینا تھا
اس بنا پہ
"دوشک" میرا فرزند
پیشہ آبا، علم کی نذر کر رہا ہے کیوں
کھیت وہ سرشک کا
اب بھی ہے گرد
نیا آقا، تیرا فرزند ارجمند
جسے سیم و زر ہیں پسند
ایک دوشیزہ حسیں کی طرح
ملک ہے ملکیت زمیں کی طرح

○

میرا اے مقبرے کے میر
آج میرا وہ خوار و زار "دوشک"
میرا بیٹا جو اب دوشنبے ہے
جس نے اخبار میں دکھایا تھا
مجھ کو وہ عکس وہ شبیہ نما
آج مجھ کو تیری غلامی کا
اور پرانی نمک حلالی کا
طعنہ دیتا ہے اور کہتا ہے
"حرمت چاند کو چمکاتی ہے
عظمت آدمی کے قدموں میں
اور مجبور آدمی کا مقدر
زمین کا پاتال
گنگ چوپایہ عہد کا ہے غلام
فرن غیرت کے امتحاں کا نام

○

میڑا اے مقبرے کے میر
آج اس دشت میں
جہاں کوئی نظر آتا نہیں بجز افلاک
نکھیں خشک داغ خاکستر
نقش کتبے کے، تیری شہرت کی طرح اندھے ہیں اور بوڑھے ہیں
مقبرہ جیسے سنگ مرمر کا کہنہ قلعہ
جو منہدم تو نہیں
تاہم اس کا وہ حسن استحکام
اور اس کی وہ آب و تاب تمام
اب ہے اک خواب اک خیال خام
میں "فلانک" تیرا ضعیف غلام
تیرے خاکیں سرہانے استادہ
ایسے خاموش اتنا ساکت ہوں
جیسے تودھاڑنے سے تھا معذور
ایسے خاموش اتنا ساکت ہوں
جیسے تو دھاڑنے سے تھا معذور
عمر کے باقیات میں اپنی
سوچتا ہوں

کہ اب میں سوگ مناؤں
سینہ کوبی کروں کہ روؤں افسوں
کتبے کو توڑ دوں
کہ تیرا نام بھسم کر دوں
میں کاٹ لوں یہ زبان
جو ہے جوپایوں سی
کہ طعنوں سے بوجھل اس سرکو
اس غلامی کو جس نے میرے ضمیر کو کچلا
تیری آقائیت کی لاش کے ساتھ
تیری اس قبر ہی میں دفنا دوں
شاعر مکران (۷) میر عیسیٰ خان قومی (نام عیسیٰ، میر اور خان لقب، قومی تخلص) تربت میں ۱۹۰۹ء میں

پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام میر دوشین ہے۔ جن کا شمار مکران کے معززین میں ہوتا تھا۔ آپ کو عنفوان شباب ہی سے شعر و سخن سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

پہلی پاکستان بھارت جنگ ۱۹۶۵ء کے دوران خبرنامہ 'مکران' کا اجراء کیا اور ایک سائیکلو اسٹائل ہفت روزہ جاری کیا کیونکہ مکران میں طباعت کی سہولت مہیا نہ تھی اور نہ ہی کوئی پریس تھا۔ دوران جنگ اس خبرنامے نے نہایت اہم خدمات انجام دیں اور بعد میں بھی نکلتا رہا۔

آپ نہایت وسیع القلب اور انسان دوست شاعر ہیں۔ آپ نے بلوچی میں ایک نہایت عمدہ قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی خوبیاں بڑے پرشوق انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

میر عیسیٰ قومی تمام بلوچی اصناف سخن پر حاوی ہیں اور بارہ ہزار سے زائد اشعار کہہ چکے ہیں۔ چھ بندوں پر مبنی ایک قومی نظم کا ایک بند دیکھئے۔

اے بلوچستان!! اے بلوچوں کے وطن
تو خواب خرگوش میں کب تک پڑا رہے گا؟
تیرے کوچے میں ہر طرف پھولدار پودے تھے
(اور) تیرے پتھروں سے بھی زرگل پھوٹتا تھا
موسمی بارش میدانوں پر چھڑکاؤ کرتی تھی
(اور) جواں مرد گھوڑوں پر سوار ہوکر سیر کو نکلتے تھے
اے بلوچستان! بلوچوں کے وطن
تو خواب خرگوش میں کیوں پڑا ہے؟

غزلیہ اشعار کا اردو ترجمہ۔

محبوبہ کیلئے میں بہت آہ و زاری کررہا ہوں
(اس لئے کہ) وہ میری پہلی محبوبہ ہے جو زیادہ (عطر) لگائے رہتی ہے
اس کے لئے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں
وہ کم سن ماہ رنگین سے بھی زیادہ حسین ہے۔
اے میرے بے وفا دوست! میری وفا کے باوجود تو نے بے وفائی کیوں کی؟
تو نے پہلے میری دل آزاری کی اور پھر زلفیں سنوارنے لگی
اے میری محبوبہ! تو نے ہونٹوں پر سرخی کیوں لگائی ہے؟
(یہ تو نے سرخی کیا لگائی ہے) مجھ پر جفا کررہی ہے۔

سید ظہور ہاشمی (معروف سید ہاشمی) کا تعلق تربت مکران سے ہے آپ کی ایک مشہور نظم "وڑولیانی یات" کا نسیم دشتی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔(۸)

خوشیوں کی گزری ہوئی یادیں اب میرے لئے دکھ اور درد کے فسانے ہیں!
میرا محبوب مجھ پر جو جور و ستم روا رکھے میں لب پر حرف شکایت نہیں آنے دوں گا

کیونکہ اس کی طرف کسی قسم کا جورو ستم منسوب کرنا اس کی شان میں گستاخی اور میرے عشق کی توہین ہے!
جان من! تیرے انتظار میں دو سال تک اشک خونیں بہاتا رہا اب میری تاب مجھ کو ہنگامہ آہ و فغاں کرنے سے جواب دے چکی ہے مگر تجھے تا ہنوز میرے عالم جنون کی کوئی خبر نہیں!
رقیب کی مجلس میں بصد ناز و تمکنت جلوہ افروز ہوکر تو نے میری خانہ ویرانی کا سامان پیدا کر دیا اور میرے جنون کی حالت کو درخور اعتناہی نہ سمجھا!
میری محبت ہوس سے خالی ہے۔ چنانچہ میں اپنے محبوب کو اپنا دل خونیں بھی بطور نذرانہ پیش کر سکتا ہوں جو رقیب کے "جس کی محبت میں ہوا وہوس ہے" بس کی بات نہیں!
خوشیوں کی گزری ہوئی یادیں اب میرے لئے دکھ اور درد کے فسانے ہیں!

یہ ہاشمی کا غزلیہ کلام پیش خدمت ہے۔ اس کا اردو ترجمہ عبد الرحیم ظفر نے کیا ہے۔(۹)

مشک و عنبر سے مشکی ہوئی زلفوں کی یاد
دل ویران کو آباد کیا کرتی ہے!
میری محبوب غزالہ تری جلوہ ریزی
دہر کے حسن کو بھی ماند کیا کرتی ہے
یاد میں جب تری دل زار ہوا کرتا ہے
خود بخود مائل اشعار ہوا کرتا ہے
آرزو ہے کہ تجھے آج بناؤں دلہن
دست نازک میں ترے پیار سے باندھوں کنگن
میری ہانل! تیرے ہاتھوں میں لگاؤں مہندی
خون دل خون جگر بھر کے رچاؤں مہندی

یہ اسحاق شمیم ۱۹۲۳ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ اردو اور بلوچی میں شعر کہتے ہیں۔ بلوچی میں آپ نے سب سے پہلا ڈرامہ "حانی شہ مرید" لکھا جو ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوا(۱۰)
چند بلوچی کے اشعار کا ترجمہ(۱۱)

(۱)

بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں اور کشتی بھی بھنور میں پھنس کر ڈوبنے کو ہے'
لیکن اپنی ہمت اور جوانمردی کو نہ چھوڑو۔ اگر تم اپنے اندر کچھ ہمت رکھتے ہو تو یقیناً" خدا تمہارا محافظ ہے اور منزل تمہارے قدم چومے گی۔

(۲)

کمر کس لو اور لمبے لمبے ڈگ بھرو کیونکہ سپاہی کا کام یہی ہے اور میر چاکر خان رند نے بھی یہی کیا ہے اگر تمہیں اپنی منزل کی خواہش ہے تو سر کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان عمل میں کود پڑو۔

(۳)

تمہاری سب سے بڑی بربادی نا اتفاقی ہے۔ جب تم نے اپنے پیر پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ پھر دوسروں سے گلہ کیوں کرتے ہیں۔

(۴)

اب اٹھو یہ تمہاری بیداری کا وقت ہے تمہاری رگوں میں بھی میر چاکر کا خون دوڑ رہا ہے اور تم میں سے ہی چاکر پیدا ہو سکتے ہیں اگر تم نے بے اتفاقی سے پرہیز کیا

(۵)

شیم نے تم کو سب کچھ بتلا دیا ہے اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ مگر سب سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ کہیں اپنے دشمن تم خود تو نہیں ہو؟ (بلوچی سے ترجمہ از مصنف)

قاضی عبد الرحیم صابر(۱۹۱۹ء ۔۔۔ ۱۹۹۱ء) خلف الرشید قاضی دین محمد' پسنی بندر (مکران) کے رہنے والے تھے۔(۱۲) مڈل تک تعلیم پسنی میں ہی پائی بعد میں کراچی پہنچے۔ مزید تعلیم کے بعد وہیں مدرسی اختیار کی۔ ان کی اردو شاعری کی ابتداء ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ء سے بلوچی اور فارسی میں بھی شعر کہنے لگے۔ ۱۹۳۹ء سے اردو میں لکھنا شروع کیا اور تصنیف و تالیف کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ ۱۹۴۳ء سے کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کی کئی کتابیں شائع ہوئیں ان میں "بلوچستان کی وادیوں میں" "سیر مکران حصہ اول' حصہ دوم" "بلوچستان کے جانباز" اور "مکران تاریخ کے آئینے میں" اردو میں ہیں "سردارِ دوجہان" صابر ء گفتار" اور "دو دوست یک منزل" بلوچی میں ہیں۔ "سردار ء دوجہاں" بلوچی میں سیرت پاکؐ پر پہلی کتاب ہے۔ آپ "بلوچی ادبی بورڈ" کراچی کے جنرل سیکرٹری اور پندرہ روزہ "صدائے بلوچ" کے نگران رہے آپ بلوچی کے ایک ممتاز ادیب' شاعر اور مصنف تھے "ومت توار" کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

وہ عشق کے دیوانہ ہیں یوں ہوش میں نہیں آئیں گے۔
وہ جو بے ہوش ہیں فقط اک پکار سے ہوش میں نہیں آسکتے۔
مرد کہتا انہیں زیبا ہے جو کسی کے محتاج نہ ہوں۔

اور جو جوانمرد ہیں وہ مصیبتوں سے نہیں گھبرایا کرتے۔
دل سے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے۔

○

افسوس! ہمارے پیشرو اور لیڈر جاہل اور بے علم ہیں۔
اور اپنی مرضی سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔
بار بار قوم کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں۔
یہ خودغرض شکم کے بندے ہیں اور کبھی قوم کے غمخوار نہیں بن سکتے۔
دل سے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے!

○

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس قوم کا صحیح رہبر نہیں ہے۔
جو دل سے قوم کا ہمدرد ہو۔
وہ فوج کس طرح لڑ سکتی ہے جس کا سالار نہ ہو۔
قوم کی صدیوں کی غلامی کی خو بو ایک گھڑی میں نہیں مٹ سکتی۔
دل سے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے۔

○

راستہ بہت لمبا اور طویل ہے اور
قدم قدم پر سینکڑوں نوکدار پتھر اور کانٹے ہیں۔
سب سے بڑی مصیبت قوم کے لئے وہ غدار ہیں۔
جو چند پیسوں کے لئے قوم کو بیچ کھاتے ہیں اور برباد نہیں ہوتے۔
دل کے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے۔

○

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری قوم بھی بیدار اور ہوشیار ہو جائے۔
اور نور علم سے آراستہ ہو جائے تو مل کر یکجان ہو جاؤ۔
پھر دیکھو کہ ہمارے کام کس طرح سنورتے ہیں۔
دل کے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے۔

○

وقت کی قدر کرو اور بالکل بیکار مت بیٹھو۔
کینہ اور ضد کو چھوڑ دو اور حسد سے بیزار ہو جاؤ۔
اے بھائیو وقت کی پکار یہی ہے' ہوشیار ہو جاؤ۔
زمانہ جلد جلد گذرتا جاتا ہے لیکن زمانہ کی باتیں رہ جاتی ہیں۔
دل سے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے!

○

اے بھائیو! صابر کے دل میں بڑا درد ہے۔
اور اس کا اشعار میں اظہار بے حد مشکل ہے۔
اس لئے ایک آہ سرد دل سے کھینچ کر فریاد کرتا ہوں۔
اور کہتا ہوں کہ قوم کس طرح آگے بڑھ سکتی ہے جب تک نوجوان خودار نہ ہوں
دل سے گہرے زخموں کے نشان نہیں مٹ سکتے۔

قاضی عبد الرحیم صابر کا مجموعہ کلام " صابر ء گفتار" (بلوچی اشعار بمعہ اردو ترجمہ) سال اشاعت ۱۹۷۹ء صفحات ۱۹۲' قیمت اڑھائی روپے ناشر مصنف خود ہی ہے۔ ساڑھے چھ سو کے لگ بھگ اشعار پر مشتمل ہے چند بلوچی اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

یہ دنیا و جہاں تیرے جمال سے ہے اور تیری
کاریگری حد کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔
تیری ذاتؐ پر اسلام جس قدر ناز کرے کم ہے کیونکہ
تو نے دنیا میں خدا کے نام کو چمکایا ہے۔
تو نے قوم کو یکمشت کیا پھر اس سے کہا کہ تجھے کوئی نہیں ٹھکرا سکتا
ہمارا قائد اعظم زندہ باد
خانہ جنگی' ظلم اور خلق آزادی۔ یہ باتیں اشرف المخلوقات
کو سزا وار نہیں بلکہ حیوانوں کیلئے ہیں
پھر پہلے کے جوش و خروش اور خواب گراں
سے بیداری کا دور آیا پھر ایک نئی خواہش
دل میں ابھر رہی ہے۔

قاضی عبد الرحیم صابر بلوچی ثقافت کو پیش کرتے ہیں ایک نظم کا ترجمہ یہ ہے۔
بلوچوں میں یہ عام رسم ہے کہ دلہن کو سات دن تک سائیبان میں بٹھاتے ہیں۔ جسے بلوچی میں جل بندی کہتے ہیں۔ لڑکی والے کی طرف کی عورتوں کو جل بندی کی دعوت دیتے ہیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے تقریباً سو ڈیڑھ سو عورتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایک جلوس کی شکل میں خواتین ساتھ حلوا' تیل اور پھولوں کے ہار وغیرہ لے کر گیت گاتی لڑکی کے گھر جاتی ہیں۔

گیت

الٰہی سب کو یوں شادان کر دے ۔۔۔ بڑھا دے مرتبہ ذیشان کر دے
خوشی میں غم کبھی آنے نہ پائے ۔۔۔ سبھوں کی مشکلیں آسان کر دے

خوشی بچوں کی ماؤں کو دکھا دے　　یونہی پورا ہر اک ارمان کر دے
عطا کر دولت ایمان سب کو　　کرم کر، لطف کر احسان کر دے

لڑکی کے گھر پہنچنے کے بعد جل' یعنی قالین کو سات سہاگنوں کے ہاتھ میں پکڑاتے ہیں۔ ان میں سے باری باری ہر ایک انگلیوں کو تیل میں تر کرکے دلہن کے سر پہ ملتی ہے۔ اور حلوے کا ایک ٹکڑا دلہن کے منہ میں ڈالتی ہے۔ اس کے بعد جل کو پردہ کی طرح لٹکا کر باندھ دیتی ہیں اور دلہن کے منہ پر موٹے کپڑے کا نقاب باندھا جاتا ہے۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد دولہا کی طرف سے آئی ہوئی عورتیں واپس چلی جاتی ہیں۔ اور دلہن سات دن تک نہایت خاموشی کے ساتھ اسی جگہ بیٹھ کر گذارتی ہے۔ اس عرصہ میں ہر رات کو عورتیں آکر جمع ہوتی ہیں اور مبارکبادی کے گیت گاتی ہیں۔

گیت

مبارک ہو تجھے یہ شادمانی　　رہے قائم سدا تیری جوانی
دیا بلبل نے گل کو مژدۂ نو　　مبارک ہو تجھے موسم سہانی
خوشی سے جھوم اٹھے ڈالی ڈالی　　قبا پہنی گلوں نے ارغوانی
مبارک ہو ترے ماں باپ کو بھی　　کہ جن پر رب نے کی ہے مہربانی

جب تک دلہن جل میں ہوتی ہے۔ خصوصاً" دولہا کے گھر میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ عورتیں دس دس بارہ بارہ کی ٹولیوں میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھر شادی میں شرکت کرنے کی دعوت دینے جاتی ہیں۔ ساتویں رات کو رسم مہندی ہوتی ہے۔ اکثر قوالی کی محفل ہوتی ہے۔ پھر دونوں طرف سے مہندی کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سات سہاگنوں کے ہاتھوں میں مہندی دے کر دلہن کو لگائی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ عورتیں گیت گاتی ہیں۔

گیت

صورت پہ تیری ہے نثار　　یہ چاند تاروں کی قطار
خوشبو پہ تیری ہے فدا　　یہ سرو' لالہ' یہ بہار
کچھ بھی تجھے معلوم ہے　　ہے کس کو تیرا انتظار
دیکھے گا دولہا جب تجھے　　آئے گا تب اس کو قرار

عورتیں مہندی لگا کر واپس آتی ہیں۔ اس رات کو صبح تک دولہا کے گھر خوشی اور شادمانی ہوتی ہے۔ پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مشاطہ' جسے بلوچی میں "سرگوپ" کہتے ہیں دلہن کو نہلا کر نئے کپڑے اور زیورات پہنا کر بٹھا دیتی ہے۔ اور دولہا کی طرف سے عورتوں کے آنے کے بعد دلہن کے بالوں کو سنوارنے کی رسم جسے بلوچی میں "سرگوپی" کہتے ہیں شروع کی جاتی ہے۔ مشاطہ کو سب عورتیں حسب حیثیت کچھ نہ کچھ دے دیتی ہے۔

جس وقت لڑکی کی رخصتی کا وقت آتا ہے۔ اس وقت ماں کی عجیب حالت ہوتی ہے۔ وہ خوشی اور غم دونوں حالتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ خوشی اس بات کی کہ وہ اپنی لڑکی کی مرادیں جیتے جی دیکھ رہی ہے اور غم اس بات کا کہ وہ اپنے دل کے ٹکڑے کو' جسے خون جگر دے دے کر اس نے پرورش کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں رخصت کررہی ہے۔ بہر حال وہ خوشی اور غم کی ملی جلی حالت میں اپنی لڑکی سے یوں مخاطب ہوتی ہے کہ۔

> "اے جان مادر! اب تم نئے گھر اور ایک نئے ماحول میں جارہی ہو۔ ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہی ہو۔ خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد اپنے خاوند کی فرمانبرداری اپنا فرض جاننا ساس اور سسر کو اپنے والدین کی جگہ سمجھنا۔ بڑوں کا ادب' اور چھوٹوں سے پیار کرنا سلیقہ شعار اور امور خانہ داری کے سلسلہ میں کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہ دینا۔ تم ایک شریف باپ کی بیٹی ہو۔ اس کے نام پہ حرف نہ آنے دینا۔"

اس کے بعد دلہن کی سہیلیاں اور دوسری عورتیں رخصتی کے گیت گاتی ہیں۔

گیت

چلے یوں ہی سدا باد بہاری
پھلیں پھولیں چڑھیں پروان بچے
برات آئی ہے اور نوشہ کھڑا ہے
سدھارو اپنے گھر کو دل کی ٹھنڈک!

مرادیں اپنی پائیں مائیں ساری
خوشی کی اس طرح آجائے باری
کرو اے جان من اب تو تیاری
دعائیں دل کی لے جاؤ ہماری

صابر کے چند عشقیہ / غزلیہ اشعار پیش خدمت ہیں۔

تیری پر خمار آنکھیں میرے لئے عرق انگور ہیں
اگر اجازت ہو تو ایک گھونٹ پی لوں
آج صابر کی آنکھیں بری طرح پھڑک رہی ہیں

اس لئے مجھے امید ہے کہ وہ خوشبوؤں کے ساتھ
آج ضرور آئے گی
آنکھوں سے تیر اندازی کرکے بے وفا مجھے زخمی
کر رہی ہو' تیرے نازک اور نرم بالوں کو مرمر
(ریشم) سے کیا نسبت

بلوچی کے ایک نامور سخنور (مومن بزدار) کے اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

میں آج ایک نیا قصہ سناتا ہوں جو کہ ازیں راز کی صورت میں میرے سینے میں موجود تھا۔ ہر عزیز اور ساجن اس کو غور سے سنے
تمام تعریفیں اس حقیقی مالک اور خالق کیلئے ہیں جس نے والدین کا بہانہ بنا کر ہم سب کو پیدا کیا
اے مسلمان! اس ذات واحد کو یاد کر جس کا کوئی ثانی اور شریک نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی درود پڑھتا رہ!
خالق و رازق وہی ایک ہی ہے جس نے ہر ایک کو بے حساب رزق عطا کیا ہے۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں کا اگر پھر بھی تو شکر گزار نہیں تو یہ تیری غلطی ہے!
جس نے ہمیں برے کاموں سے روکا اور سیدھا راستہ دکھایا اے انسان اس چار روزہ زندگی میں جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ اعمال صالح بنا۔
وہ وقت عنقریب سر پر ہے جبکہ خدائے قدوس کے بغیر ہر چیز پر فنا آئے گی اور صرف خدا ہی باقی رہے گا۔ اے مسلمان! محمد مصطفیٰ پر درود پڑھتا رہ
وہ مالک حقیقی جو کہ روز اول سے ہے اور آخر تک رہے گا جو ہر جگہ پر حاضر و ناظر ہے اور ہماری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے
یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اے انسان سوچ سمجھ کر بیج بو کیونکہ قرآن حکیم میں صاف لفظوں میں ارشاد ہے کہ انسان کیلئے وہی کچھ ہے جو کہ اس نے اس دنیا میں کمایا!
اے انسان! تو جو عمل بھی کرے گا وہ قیامت تک تیرے ساتھ رہے گا۔ حضرت محمد مصطفیٰ پر درود پڑھتا رہ
اس چار روزہ زندگی میں کسی جاندار کو بھی بقا نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم کا فرمان ہے کہ موت کا پیالہ ہر ایک جاندار کو چکھنا ہے!

یہ دولت جو کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے عنایت فرمائی ہے اسے اللہ ہی کی راہ میں خرچ کر
اے مومنو! سود مت کھاؤ! کیونکہ مٹاتا ہے اللہ سود کو!
دولت اکٹھی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو اسے جمع نہ کر اور اپنا دوست نہ بنا!
اے مسلمان حضرت محمد مصطفیٰ پر درود پڑھتا رہ!
اللہ تعالیٰ کی تعریفیں تو ان گنت اور لا تعداد ہیں جس نے زمین و آسمان بنائے اور پھر آسمان سے بارش برسا کر مردہ زمین سے سبزہ پیدا کیا۔
انسان، چرند، پرند، کیڑوں اور مکوڑوں غرضیکہ ہر ایک جاندار کو پانی دے رہا ہے اور اور ہمارے لئے فصلات اور میوے بھی پکاتا ہے تاکہ ہم انہیں کھا کر اس کی ذات باری کے شکر گزار ہوں!
اے انسان غافل نہ بن اور اس غفلت کو چھوڑ دے اس مالک کو یاد کر، اور حضرت محمد مصطفیٰ پر درود پڑھ!
اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے حساب ہیں اور اس کا فرمان ہے کہ اے انسان! ان کو کھا کر شکر ادا کر۔ اور ان میں سے زیادہ سے زیادہ راہ خدا میں دینے کی کوشش کر، اور فضول خرچ نہ بن!
اے مسلمان! تو اپنی نمازیں باجماعت ادا کر کیونکہ تجھ پر نماز فرض ہے۔ اور تو دن رات اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جا!
اللہ تعالیٰ سے لو لگا۔ اور شیطان کی دوستی کو چھوڑ دے اور اس کو قریب بھی نہ آنے دے کیونکہ یہ تیرا واضح دشمن ہے۔
اے مسلمان حضرت محمدؐ مصطفیٰ پر درود پڑھتا رہ!

مراد ساحر(۱۳) ۱۹۳۰ء میں تحصیل دشت ضلع مکران میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار مکران کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ چند غزلیہ اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

میری حالت اس وقت بگڑی جبکہ ایک ماہرو بن ٹھن کر میرے سامنے آگئی
اس پھول کی چاہت سے زندگی میرے لئے وبال جان بن گئی
کیونکہ اس کے غضب ناک چڑھتے تیور کے شعلوں کو دیکھنے سے
میرا دل جل بھن کر کباب ہوگیا
جدائی کی تاریک راتوں میں غم و آلام لاتعداد تھے۔
حسین محبوبہ کے جواب تلخ سے مافی الضمیر گلے میں اٹک کر رہ گیا
ہاں اگر میری قسمت میں شراب نہیں تھی تو کوئی زہر آلود شربت پلا دیا ہوتا
...... ساحر عشق کے گرداب میں غرق ہو جائے گا
شاید اس کی قسمت میں ساحل مراد نہیں!

اے حسینہ! تیرے رعب سے میرے ہاتھ جوڑنے پر بھی کسی کو تیرا پتہ بتانے کی جرات نہ ہوئی
لیکن میں اس دنیا سے تنگ آکر تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ کم از کم مجھے اپنے گھر سے دور، کسی ایسے گوشہ میں جہاں باد نسیم سے تیری عطر بیز زلفوں کی بو آئے بیٹھنے دے۔"

مراد ساحر اپنی نظم میں ایک نئی زندگی بنانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی ایک نظم کے دو بندوں کا اردو ترجمہ یوں ہے۔

"اے میرے ہمدم! آجاکہ اس فرسودہ زندگی میں ایک نیا پرمسرت ماحول پیدا کرنے کیلئے ایک ایسا راہنما تلاش کریں تاکہ اس کے مقابلہ میں موت خود بخود تلواروں کیلئے اپنے چوڑے چکلے سینوں کو ڈھال بنائیں!"
"میرے دوست! آجاکہ اپنے تپتے ہوئے دلوں سے ایک ایسا جھلسا دینے والا انگارہ روشن کریں کہ اس سے ہماری زندگی میں رنج و غم کے نوک دار کانٹے جل کر خاکستر ہو جائیں..............
آجاؤ کہ اس وسیع خطہ کے ویران میدانوں کو ہمیشہ سرسبز و شاداب کرنے کیلئے ایک ایسا دریا جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کی مانند ہو، پیدا کریں"

مکران کا باسی (۱۴) صدیق آزاد اپنی فنی لحاظ سے ایک خوبصورت نظم میں یوں عروج و زوال کا نقشہ کھینچتا ہے

ابر رم جھم رم جھم برسا
ہوا چلی
میں نے بھی دیکھا
(اور ان کے) نغمہ (اطف) مجلس آرائی کو
اور ان کے رقص و راسشدی کو
شراب نے جنہیں مدہوش کر دیا
ابر رم جھم رم جھم برسا
ہوا چلی
یکا یک ابر
نیلے آسمان پر چھا گیا
ابر کے بے رحم ہجوم نے
انتقام لینا شروع کر دیا
جام بکھر گئے

(اور) شراب چھلک گئی
قوس قزح (کا رنگ) اور بار سنگھار
چاند صورت دو شیزائیں
غم زدہ ہو گئیں (ان کا رنگ ماند پڑ گیا)
اور آنکھوں سے اشک بہہ نکلے

عبد الحکیم حق گو(۱۵) (۱۹۱۳ء ـــــ ۱۹۷۲ء) کا شمار بلوچی شعرا کی صف اول میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کی نمایاں خوبی تغزل و تصوف ہے۔ چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے

ساقی ایک جام شراب(۱۶) سبز رنگ کا دے
تاکہ سر سے پا تک مستی چھا جائے
جدائی کا غم' دریا و موج' بارش اور طوفان
ان سب نے ایک ہی دفعہ مجھ پر حملہ کر دیا ہے
اے خضر آجا اور رہنمائی کر کہ ہم گم کردہ راہ ہیں
آ اور ایک ہی دفعہ ہمارے منتشر خیالات کو یکجا کر
میں حق گو زیر بار غم ہوں'
اگر خدا چاہے تو بد نصیبی مبدل بہ خوش نصیبی ہو جائے۔

بلوچی کے متعدد شعرا نے پاک سرزمین کے گن گائے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے بلوچی اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:(۱۷)

وطن مری محبوبہ بھی ہے' میرا ناموس بھی ہے
ہم اپنے وطن کے لئے سخت محنت کریں گے
ہماری پاک سرزمین کی عظمت سارے جہاں میں مسلم ہے
ہم اس سرزمین کی عظمت کیلئے شب و روز محنت کریں گے

غوث بخش صابر کہتے ہیں:

شوق شہادت نے مجھ پر نشہ سا طاری کر دیا ہے
میں قدم قدم پر پاک دھرتی کی قسم کھاتا جاؤں گا
میری قسم' چاکر رند کا قول ہے
میری قسم' نوری نصیر خان کی عظمت کی قسم ہے
مجھے دودھ کے پاک نام کی قسم
دیکھو پاک وطن کی عزت مجھے پکار رہی ہے
اور ہم آواز ہو کر کہہ رہے ہیں

علی ہاشم شاکر

اے پاک وطن تو شاد و آباد رہے
کسی کی مجال نہیں کہ تیری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے
کیونکہ ہماری قوم داناؤں اور باعمل لوگوں کی قوم ہے

آدم حقانی کی حقانیت دیکھئے

اے پاکستان
تو ہماری روح ہے
تیرے ہی دم سے ہماری سانسوں کا رشتہ قائم ہے
تو ہمارا دین ہے
تو ہمارا ایمان ہے

کریم بخش وشتی کی جداں خیالی بعنوان "پاکستان آباد رہے" ملاحظہ ہو:

یہ ایک عطیہ ایزدی ہے۔ یہ ایک باغ رضوان ہے
حوران بہشتی بھی سدا ۔ تیرے مناظر کی شیدائی ہیں
خدا کرے تو سدا شاداں رہے پاکستان
خدا کرے پاکستان شاداب رہے
ہم رنگ و نسل نہیں دیکھتے ۔ نہ ہی علاقہ اور مقام دیکھتے ہیں
ہم مسلمان ہیں سب بھائی بھائی ۔ ہم پاکستان کے فرزند ہیں
خدا کرے تو سدا شاداں رہے پاکستان
خدا کرے پاکستان شاداب رہے

الفت نسیم کے خیال میں

اپنا یہ دیار باعث فخر ہے یہ کوچے یہ باغ اور ان کی بہاریں
ارض وطن کے یہ سبزہ زار۔ یہ دشت و جبل اور یہ کوہ و دمن
اے باغ وطن اے میرے گلزار وطن
میری روح اور بدن تجھ پر فدا ہوں

ملک محمد رمضان(۱۹۱۶ء تا ۱۹۹۰ء) رطلب اللسان ہیں

تو ہماری زندگی ہے پاکستان ۔ تجھ سے ہماری شان قائم ہے پاکستان
تیری ٹھنڈی چھاؤں تلے ہم خرم ہیں۔ تو ہماری جان ہے پاکستان
پاکستان ۔ پاکستان
رمضان تیری تعریف کے گیت گاتا ہے۔ وہ گیتوں کی دھن پر محو رقص ہے
ہمارے اہل وطن خوشحال اور شاد کام ہیں۔ اللہ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے
پاکستان ۔ پاکستان

اس مختصر مگر بھرپور جائزے سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ کیسے، کس طرح اور کہاں کہاں بلوچی اشعار کو اردو کے منظوم اور منثور لبادے اوڑھائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں نمائندہ سوچوں کے دھاروں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس تجزیئے سے ایک خوشگوار، دلپذیر اور ولولہ انگیز کیفیت قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔

اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

حواشی

۱۔ خیابان پاک، کراچی، ۱۹۵۶ء / ۱۹۶۴ء ص ۲۳۹، ۲۴۰

۲۔ ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان، جنوری ۱۹۶۵ء ص ۳۶۔۔۔ ۳۸

۳۔ خیابان پاک، کراچی، ۱۹۵۶/ ۱۹۶۴ء ص ۲۴۵

۴۔ علامہ اقبال اور بلوچستان، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء میں جدید بلوچی شاعری پر علامہ اقبال کی چھاپ کے سلسلے میں کئی شعراء جیسے میر گل خان نصیر، پیر محمد زبیرانی، عطا شاد، آزاد جمالدینی، ظہور شاہ ہاشمی، احمد زہیر، مراد ساحر اور غوث بخش صابر وغیرہ کے کلام کے اردو ترجمے دیئے گئے ہیں۔ انشاء اللہ اس پر علیحدہ مقالہ سپرد قلم کیا جائے گا۔ اسی طرح "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک"، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور، ۱۹۸۳ء میں جدید بلوچی شعراء مثلاً مولانا حضور بخش جتوئی، میر عیسیٰ قوی، گل خان نصیر، ملا ظہور شاہ ہاشمی، عبدالباقی درخانی، عبدالغفور درخانی، مومن بزدار، محمد حسین عاجز، عبدالحکیم حق گو، عبدالمجید سورابی، عطا شاد، انور صاحب خان چلم زئی بلوچ، حاجی فقیر محمد عنبر بلوچ، غوث بخش صابر، خدائے رحیم حکیم، آزاد جمالدینی، ملک محمد رمضان بلوچ، قاضی عبدالرحیم صابر، پیر محمد زبیرانی، عبدالرحمٰن غور، احسن خارانی، عبدالقادر اثیر، عیسا خان، شیدا، خدائے رحیم بیتاب وغیرہ کے بلوچی نعتیہ کلام کے اردو ترجمے مندرج ہیں۔

۵۔ عطا شاد "ماہنامہ بلوچی دنیا" ملتان، اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۳۱

۶۔ مقبرے کا میر "عطا شاد مترجم عین سلام: پندرہ روزہ "نوائے وطن" کوئٹہ خاتمہ سرداریت نمبر ۹ جون ۱۹۷۶ء سرورق

۷۔ "مہمات بلوچستان حصہ دوم" کامل القادری، لاہور، ۱۹۸۰ء ص ۷۶ ۴ تا ۴۸۲

۸۔ سید ہاشمی / ترجمہ: نسیم دشتی، "ماہنامہ بلوچی دنیا" ملتان، فروری ۱۹۶۶ء ص ۵۲

۹۔ ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان جون و جولائی ۱۹۶۷ء ص ۷۵

۱۰۔ مہمات بلوچستان حصہ دوم، کامل القادری، لاہور ۱۹۸۰ء ص ۴۹۳

۱۱۔ "بلوچی دنیا" ملتان، اگست ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۴۸

۱۲۔ بلوچستان میں اردو، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، راولپنڈی، ۱۹۸۶ء ص ۱۵۳ تا ۱۵۷

۱۳۔ مراد ساحر، بلوچی زبان کا ایک رومانی شاعر، نسیم دشتی، بلوچی دنیا، ملتان، جنوری ۱۹۶۴ء ص ۳۰۔۔۔ ۳۴، ۵۴

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند' چودھویں جلد (جلد دوم) لاہور' ۱۹۷۱ء' ص ۳۰۳

۱۴۔ مسائل بلوچستان' جلد دوم' کامل القادری' لاہور' ۱۹۸۰ء ص ۵۲۷ تا ۵۳۱

۱۵۔ ایضاً" ص ۳۷۳ تا ۳۷۴

۱۶۔ "سبز" بلوچی زبان میں نہ صرف معروف رنگ بلکہ استعارہ' حسین' دلکش' خوشنما اور محبوب کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے' یہاں بھی مراد' محبوب و مرغوب' ہے۔

۱۷۔ گلزمین' سید عابد رضوی' کوئٹہ' ۱۹۷۸ء ص ۲۸ تا ۳۲

بلوچی شعرو ادب میں قومی تشخص' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' ماہ نو' لاہور' اگست ۱۹۸۳ء ص ۹۳ تا ۱۰۱

وحدت افکار' راولپنڈی' سن ندارد' ص ۶۳ تا ۶۴

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

براہوئی شاعری کے اردو تراجم ۱۹۴۷ء تا حال

قیام پاکستان سے پیشتر(۱) درخوانی مدرسہ فکر کے علماء و ادبا نے براہوئی زبان کو ادبی ادارہ بنایا۔ رسم الخط معین کیا۔ اور اس کے تحریری ادب میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ تاسیس پاکستان کے بعد ماہنامہ "معلم" سریاب کوئٹہ' ہفت روزہ " نوائے وطن" کوئٹہ اور "نوائے بولان" مستونگ میں براہوئی شعرا و ادبا کے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا' ۴ نومبر ۱۹۵۹ء کو کوئٹہ میں "براہوئی ادبی بورڈ" کی تشکیل کی گئی۔ جس کے فوری صدر نواب غوث بخش رئیسانی قرار پائے۔ اس ادبی بورڈ کے چند ابتدائی اجلاس ہوئے تھے۔ جن میں نور محمد پروانہ' سید کامل القادری' پروفیسر انور رومان' پروفیسر خلیل صدیقی' پیر محمد بیرل زبیرانی' نادر قمبرانی' محمد خان رئیسانی' راقم الحروف (انعام الحق کوثر) اور دیگر صاحبان نے شرکت کی تھی۔

اس "براہوئی ادبی بورڈ" کے اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ۲۴ فروری ۱۹۶۰ء کو مستونگ سے براہوئی کے پہلے پندرہ روزہ اخبار "ایلم" کا اجراء ہوا۔ جس کی ادارت پروانہ صاحب نے کی۔ "ایلم" ایک جانب براہوئی کے غیر تحریری اور تحریری ادب کا محافظ بنا اور دوسری طرف نئے لکھنے والوں کیلئے اظہار کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ براہوئی کا جدید رسم الخط جو اردو رسم الخط سے بہت ملتا جلتا ہے' اسی اخبار کا حامل ہے۔ بعد ازاں ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے براہوئی نشریات کے لئے علیحدہ وقت دے دیا اور ۱۹۶۵ء میں محکمہ قبائلی نشرو اشاعت کوئٹہ نے بلوچی ماہنامہ "اولس" میں بھی براہوئی حصہ شامل کر لیا پھر خضدار سے براہوئی میں بھی "احوال" نکلنے لگا یوں براہوئی زبان و ادب کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقعہ ملا۔ اب "براہوئی اکیڈیمی" کے علاوہ اور کئی انجمنیں اس کے فروغ کیلئے مصروف عمل ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس وقت(۲) غیر تحریری ادب کی روایت کے علاوہ تین مختلف سکول یعنی درخانی روایت جو براہوئی زبان کو اشاعت اسلام' تطہیر و تخلیق کردار' تزکیہ نفس' تذکرہ اکابرین اور اعلائے اقدار اسلامیہ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ تحقیقی اور تخلیقی کام کررہے ہیں۔ اب ہم مختلف انداز کی براہوئی شاعری کے اردو تراجم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

مولانا عبد الباقی درخانی بہت اچھے حمد گو' نعت گو اور نغمہ پرداز تھے کہتے ہیں۔(۳)

زمین و آسمان اور ستاروں میں محمدؐ ہی محمدؐ ہے۔ اور ہمارے فکر و اشارہ میں بھی محمدؐ ہی محمد ہے۔

آپؐ کے ذریعے رب تعالیٰ کی خدائی ظہور پذیر ہوئی۔ یا حبیبؐ آپؐ حبیب کبریا ہیں۔

خدا تعالیٰ نے آپ کو عرش سے زیادہ مرتبہ عطا فرمایا۔ یا حبیبؐ آپ جہان کے بادشاہ ہیں۔

آپؐ نے معراج کی رات باری تعالیٰ کی زیارت فرمائی۔ یا حبیبؐ آپؐ امام الانبیاء ہیں۔

قیامت کے دن جب نفا نفسی ہوگی تو آپؐ امتی امتی پکاریں گے۔

آپؐ اپنی امت اور دوسروں کے لئے شافع ہیں۔

اے باری تعالیٰ کے دلبر درخانی کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

آپؐ ہمارے مالک' وارث اور مہربان ہیں۔

حاجی گل محمد نوشکوی گویا ہوتے ہیں۔(۴)

آپؐ نے معراج کی رات باری تعالیٰ کی زیارت فرمائی۔ یا حبیبؐ آپؐ امام الانبیاء ہیں۔

قیامت کے دن جب نفا نفسی ہوگی تو آپؐ امتی امتی پکاریں گے۔

آپؐ اپنی امت اور دوسروں کیلئے شافع ہیں۔

اے باری تعالیٰ کے دلبر درخانی کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

آپؐ ہمارے مالک' وارث اور مہربان ہیں۔

حاجی گل محمد نوشکوی گویا ہوتے ہیں۔(۳)

جب باری تعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا تو آپؐ کی شان میں فرمایا کہ میں نے اپنی خدائی فقط محمدؐ کی وجہ سے ظاہر کی ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے نور کو ازل میں پیدا فرمایا پھر آپؐ کے نور سے اس دنیا کو پیدا فرمایا۔

ملائکہ آپؐ کے سر کے پسینہ سے پیدا ہوئے۔ عرش و کرسی' لوح و قلم سب کچھ محمدؐ کا نور ہے۔

آپؐ کے چہرہ مبارک کے پسینہ سے سب آسمان پیدا ہوئے۔ دوسرے سب کچھ آپ کے سینہ کے پسینہ سے تخلیق میں آئے۔

میرے گناہ تو بہت ہیں۔ مگر آپؐ ہمارے شافع ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں۔

مولوی نور محمد (۱۹۲۱ء ۔ ۱۹۷۷ء) یوں "کلام نور" میں اظہار عقیدت کرتے ہیں:۔

آپؐ کو صد بار مرحبا کہتا ہوں۔ آپ کی عزت و شان بڑی ہے آپؐ ختم المرسلین ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں آپؐ جیسا اور آپؐ کا ثانی کوئی نہیں۔ نہ فرشتے نہ کوئی اور بشر' آپؐ جملہ مرسلین کے سردار ہیں۔

زندگی کے ہر شعبہ میں تم سنت رسولؐ کی پیروی کرو۔ اگر تم مفلس ہو پھر بھی اپنے آپ کو کامیاب یقین کر لو۔

مولانا محمد افضل مینگل نوشکی (۵) کی جامع مسجد میں خطیب اور افضل المدارس کے مہتمم تھے۔ ۱۹۷۳ء میں فوت ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ آپ کی ایک براہوئی نعت کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

اللہ کی مہمانی ہوئی۔ آقائے نامدار کے لئے براق لایا گیا۔
محمدؐ مصطفیٰ جلوہ افروز ہوئے۔ ساتوں آسمانوں سے آگے گئے۔
اپنے رب سے ملاقی ہوئے۔ اپنے کمال کے باعث بلند مرتبہ پر پہنچے۔
دنیا جہالت کی وجہ سے تباہ ہو رہی تھی۔ بتوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔
بے دین' بدراہ اور فاسق لوگ کفر کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔
آنکھوں کے سامنے شمع روشن ہوئی۔ اپنے جمال پاک سے تاریکی کو روشن کیا۔
بے شک محمد مصطفیٰ آپؐ سب کے پیشوا ہیں۔
آپؐ شافع روز جزا ہیں۔ آپ کی اولاد باصفا ہے۔
صدق دل سے ہم میں سے ہر ایک
آپؐ پر اور آپؐ کی آل پر درود بھیجیں۔
بعض براہوئی شعرا کی تخلیقات کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔(۶)
اے دلبر! غازہ پرور نگاہوں سے میری طرف دیکھ! تاکہ میں تیرے
لالہ جیسے ہونٹوں اور خنجر جیسی ناک کو دیکھ سکوں (محمد اسماعیل قلاتی)
اے دوست! مجھ سے تجھے کس نے چھین لیا۔ میں تیری جدائی میں دیوانہ ہو رہا ہوں
مجھے تیرے بغیر چین نہیں۔ زمانہ کے کسی کام میں دل نہیں لگتا
آنکھوں سے نیند غائب ہے۔ اور آنسو جاری ہیں۔
تیرے آنے کا منتظر ہوں۔ کمر میں ہاتھ دیئے ہوئے تیرا راستہ دیکھ رہا ہوں۔
اگر پھر بھی تو نہ آئے' تو کون میری طرف آئے گا (نور محمد پروانہ)
جانم میری طرف آ۔ تجھے خدا کا واسطہ
جانم میرے ساتھ میٹھی گفتگو کر' تجھے خدا کا واسطہ (مولانا محمد صاحب لڑی)
اے محبوب میں تجھے کیا تحفہ پیش کروں۔ میں اپنے سینے سے
ایک آگ پیش کروں یا اپنے تفکرات کا انبار
یا چند قصے پیش کروں جو کہ ساز کی آواز میں پوشیدہ ہیں
یا ٹوٹے ہوئے دلوں کی آواز پیش کروں۔ (محمد موسیٰ طور)
جمال کے دل میں محبت کا اثر پیدا ہو گیا (لیکن) تو اپنی بات پر
قائم نہیں۔ تیری جدائی پر درد ہے۔ (واحد بخش جمال بادینی)
اے باد صبا' میری طرف سے (دوست کو) یہ پیغام سنا دے
کہ یہاں سے روشنی اٹھ گئی ہے۔ اور تمام ملک میں شام ہے۔
اے دلبر میں تیرے لئے اداس ہو گیا ہوں اور تیری جدائی میں کنگال ہو چکا ہوں (فتح
محمد سالاڑی)
بہار کا موسم ہے اور نئے نئے پھول سرخ انار کی طرح کھلے ہیں۔
شاعر کے دل کو پھولوں نے مسل دیا ہے (جس کی وجہ سے)

شربت کا مزہ بھی اس کے لئے تلخ ہے (حاجی گل محمد نوشکوی)
بے طوری میں مجھے خیال آیا کہ یار کی طرف جاؤں۔ کیونکہ
مدت گزری ہے کہ یار کے سلام کو نہیں گیا۔
خمار آلود آنکھوں کے ساتھ دل کو محبوب لوٹنے والا ہے۔
بیچارا جگر یار کے زلفوں کا اسیر ہوگیا ہے (محمد عارف جگر مینگل)
زندگی کے غم بہت زیادہ ہیں
اور مفلسی و ناداری سے دل پریشان ہیں۔
کاشتکار روٹی کیلئے ترس رہے ہیں
اور زمینداروں کے دن بھنگ اور شراب نوشی میں گذرتے ہیں
یہ پھول یہ سبزہ اور یہ گل لالہ
یہ بہار کا پرکیف موسم ہے
چکور اور دوسرے پرندوں کی آوازیں
اور ہرن اور پہاڑی دنبوں کا شکار
یہ ہماری وادیاں' نالے اور پہاڑ کی چٹانیں
ان کے اندر قافلے قطار در قطار
چھوٹی لڑکیوں کی خوش آوازی نے
ہمارے دل کو چیر کر رکھ دیا (نادر قمبرانی)
ں نے دشت و جبل اور وادیوں میں فریاد کی۔ تجھے کوہ و بیاباں میں ہر جگہ تلاش کیا
بھی تیرے پیچھے دوڑتا رہا کبھی آہستہ کبھی تیز جب بھی کہیں گر پڑا۔
ں نے تمام سختیاں جھیل لیں
یں اپنے ضدی دل کے ساتھ کیا کروں۔ جس قدر بھی میں نے
اسے تسلی دی لیکن وہ ہٹ دھرمی پر قائم رہا (میر اکرم مینگل)
بہار کا موسم اور پھولوں کا وقت ہے۔ ہر درخت سبز لباس میں ملبوس ہے
خوبصورت موسم اور پھولوں کی خوشبو کے ایام ہیں۔ بہار کی آمد اور خزاں کے چلے جانے کے دن ہیں۔
موسم بہار کے دن سب سے بہتر ہیں۔ لیکن اے بھائی یہ میرے لئے تلخ دن ہیں۔
یہ خوشی کے دن ہیں اور تمام جہان خوش ہے۔ لیکن عسکر کی زندگی خوشی سے خالی ہے(عسکر بلوچ)
جس چیز کی محبت تجھے خدا سے دور رکھے۔ وہ تیرا دونوں جہانوں کا دشمن ہے۔ (گل محمد (جھالاوان)
عشق سے در بدر ہیں اور دنیا و دین سے بے خبر ہیں۔ (حکیم خدائے رحیم)(۷)
بہار نے پھول کی کلی کو ہنسا دیا اسے ہار باندھ کر بنایا سنوارا
لالے نے اس پر منہ کھولا اور مسکرا دیا کہ ہنسنے میں پھول کا زوال ہے!
پیرل زہرانی)(۸)
مجھے اپنے دل سے غم اور تفکرات کو مٹانا ہے۔ اے محبوبہ!

جس قدر بھی شراب میسر ہو۔ آج مجھے پلا
تیری مست آنکھیں عجیب خوبصورتی کے ساتھ لرز رہی ہیں۔ کون ہے؟
جو تجھے ایک دن دیکھے۔ مجھے تو دیکھنے کی تاب نہیں۔
وادیوں اور کوہساروں پر ہر جگہ سیاہ بادل گھرے ہوئے ہیں
تمام کوچہ گرد و غبار سے اٹا پڑا ہے اور روشنی بھی کم ہے۔
بجلی کی پیہم کڑک سے دل دہلے جارہے ہیں۔ آس پاس کی بجلی کی یہ چمک کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔
اس اندھیری رات کو دیکھ
آؤ ایک دیا جلائیں۔
(عبد الرحمان کرد) (۹)
اے قاصد تو یہاں سے جا۔ اور میرے دوست کو کہہ دے
کہ وہ آئے۔ اگر وہ نہ آسکے تو چھینے ہوئے میرے دل کو واپس لا۔
اے باد صبا! تو جا
اور اس پھول کو کھلا کر واپس آ
اگر وہ پھول نہ کھلے'
تو اس کی خوشبو لے کر آجا۔ (عبد القادر شاہوانی)
میری جان آجا۔ اور حجاب نہ کر دیدار دکھا دے۔ منہ کو نہ چھپا
مجھے محفلوں میں بے تاب نہ کر۔ مجھ سے منہ چھپانا اچھا نہیں۔ (عبد الکریم عاصی)
تیری جدائی کے غم سے تمام دنیا کا سفر کیا۔ لیکن کہیں بھی مجھے آرام نہیں ملا۔ تیری جدائی پر درد ہے۔
بیچارہ نیمرغی رات دن فریاد میں مشغول ہے۔ تیرا دیدار
تمام فکر و غم کا مداوا ہے۔ تیری جدائی پر درد ہے۔
(پیر محمد نیمرغی)
جب کبھی یہاں تم آجاؤ۔ ممکن ہے میرے دل کو قرار آجائے
اور میرے درد کا کچھ درمان ہوجائے۔
جب کبھی فیض تم سے ملے۔ تمہیں شاید آنکھوں سے پھر جدا نہ رکھے۔
اور دل کے ساتھ تمہیں چاہے۔ ہم ہر وقت تمہارے لئے منتظر ہیں۔
(حکیم فیض محمد' محمد پوری)

میر گل خان نصیر بلوچی کے ایک عظیم سخنور کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مگر میر صاحب نے شاعری کی ابتداء براہوئی زبان سے کی تھی(۱۰) جیسا کہ انہوں نے خود کہا کہ میں نے پانچویں جماعت سے براہوئی زبان میں شاعری شروع کی تھی۔ اس زمانے میں ریکی' شاہی' زنگی' بشام اور قیصر خان کے براہوئی اشعار نوشکی میں عام طور پر گائے جاتے تھے۔ ان کلاسیکل شعراء کے علاوہ ملک داد قلاتی' حاجی نواب جان قلندر رانی اور مولانا عبد الجید چوتوئی کی منظوم شاعری کی کتابیں گھر گھر موجود تھیں۔ اور قرآن پاک کی حد تک پڑھنے والے ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتے تھے۔ اور وہ ان شعراء سے کافی حد تک متاثر

ہوئے تھے۔
اسی دور میں نوشکی کے موسم بہار سے متاثر ہو کر براہوئی میں چند شعر کہے تھے۔ جن کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

دیکھو بہار کا کاروان آن پہنچا ہے
اور جنت کے پھولوں سے لد کر بہار آگئی ہے
گل لالہ' گلاب اور سنبل ہر سو پھیلے ہوئے ہیں
اور سارا جہاں فردوس بریں بنا ہوا ہے۔

میر گل خان نصیر کی براہوئی کی ایک رومانوی نظم "انگور ناباغ" کا اردو ترجمہ یہ ہے۔
ایک دن انگور کے باغ سے میں گزر رہا تھا کہ اچانک بام کی بلندی پر نظر پڑی جہاں سرخ گلاب کی مانند حسینہ نظر آئی۔ یوں سمجھیں کہ کوہ قاف کی کوئی پری بیٹھی تھی۔
اگرچہ وہ کافی دور تھی مگر اس کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ہیں محو حیرت تھا کہ یہ حسینہ کہاں سے آئی ہے۔ گلدار دوپٹہ خوبصورت قیمتی لباس
روی جرابیں اور جامہ زیب تن۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دل لوٹ لیا
ماتھے پر سبز خال جمائے۔ مجھے دام میں گرفتار کر لیا۔

براہوئی زبان کی اولین ادیبہ' شاعرہ اور مرثیہ نگار مائی تاج بانو دختر علامہ محمد عمر دین پوری(۱۱) کی درج ذیل لوری قابل داد ہے۔

میں تیری آنکھوں کے صدقے
اے وردانہ! تو میری آنکھ کا نور ہے
خدا کے فضل سے تو (عالم وجود میں) آئی
زیبل! تجھے خدا عمر دراز دے!

علامہ اقبال کے کلام کا اثر براہوئی پر براہ راست پڑا ہے۔(۱۲) براہوئی کی جدید شاعری میں وہی ندرت خیال' شکوہ الفاظ اور اسلوب واضح نظر آتا ہے۔ مثلاً
علامہ محمد عمر دین پوری (المتوفی ۱۹۴۸ء) علامہ اقبال کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے براہوئی زبان میں پچاس کے لگ بھگ دینی کتابیں لکھی ہیں۔ اور قرآن پاک کا پہلی مرتبہ براہوئی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور ان کے چند براہوئی اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔ ان اشعار میں اقبال کے فکر کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

میں شاعر اور قلمکار ہوں۔ اس لئے قلم اور زبان سے ہی آتش افشانی کر سکتا ہوں۔
مجھ میں قوت مشاہدہ ہے۔ میں قوم کا نباض ہوں۔ اس کے امراض کو جانتا ہوں اور ان کا علاج کرتا ہوں۔
مسلم قوم کے ماضی پر نظر دوڑاؤ' کیا اب یہ وہی قوم ہے؟ جو دنیا کو طرز تکلم سکھاتی تھی' گفتگو کے آداب بتاتی تھی۔

نور محمد پروانہ (ایڈیٹر ہفت روزہ "ایلم" مستونگ) براہوئی کے کہنہ مشق کھانی شاعر اور قلمکار ہیں۔ ان کے چند اشعار کا رترجمہ یہ ہے۔

پیارے بھائیو! آگے بڑھو' مل بیٹھو' یہی وہ مبارک گھڑی ہے۔

کوہ و دشت، صحراؤں اور بیابانوں میں پھیل گئی
انہوں نے زندگی کے اسرار بتا دیئے اور کہا
موت کی آنکھوں میں جس نے آنکھیں ڈالیں
درحقیقت وہی زندہ کہلانے کا مستحق ہے
زندگی دراصل شیر کی ہے چاہے وہ ایک لمحے کی ہی کیوں نہ ہو۔
وہ ایک لمحہ لومڑی کی ہزار سالہ زندگی پر بھاری ہے۔
بھیڑ اور کبوتر کی زندگی قبول مت کرو۔
اگر بھیڑ کی طرح بے بس بنو گے تو بھیڑیوں کا شکار ہو جاؤ گے
اگر کبوتر بن کر زندگی بسر کرو گے تو شاہین کے لئے لقمہ تر بن جاؤ گے
تنکا مت بنو کہ تمہیں ہوائیں ہر طرف لے اڑیں
پہاڑ کی طرح مضبوط رہو۔
شیر بنو، شہباز بنو۔
اور یہی دراصل زندگی ہے۔

براہوئی ادب کا جدید ترین دور قیام پاکستان کے فوراً بعد سے لے کر آج تک جاری ہے۔(۱۳) اس دور کے جوان فکر شعرا کے ہاں قومی تعمیر و ترقی اور ملکی استحکام کا تذکرہ موجود ہے۔ ان شعراء کے کلام میں ایک جانب روایتی شاعری کے مطابق حسن و عشق کی داستانیں رقم ہوئی ہیں اور دوسری طرف حب الوطنی کے انمٹ جذبات صفحہ قرطاس پر محفوظ ہوئے ہیں۔ ان شعرا نے پاکستان کی تاریخ کے ہر اہم واقعہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان موضوعات میں قوم و وطن پر غیر ملکی جارحیت کے وقت قوم کو بیدار کرنے اور راہ ترقی پر گامزن کرنے کیلئے قومی نظمیں بھی دستیاب ہیں۔ چند شعراء کے کلام کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

بلبل یوں کہتی ہے
ہر درخت اور پھول پر
بارش میں اور اولوں میں
آج یوں کہتی ہے
ہم آج آزاد ہیں، ہم آج آزاد ہیں (فیض اللہ مینگل)(۱۴)
قدم قدم رواں ہو جاؤ، بہادر ہو جاؤ، کشمیر کو جلد آزاد کراؤ (۱۵)
اور جنت نشین ہو جاؤ (یاد رہے کہ کشمیر جنت نظیر مشہور ہے)
(نبی داد خان لانگو رئیس)
اے اللہ! ہمیں فتح و نصرت عطا فرما اور ہمیں اسلاف کی شان و شوکت بخش(۱۶)
(عبد الحلیم خاکی)
ہم اسلام کیلئے قربان ہوں کہ پاکستان ہمارا ملک ہے ہم آج آزاد ہیں اور پاکستان ہمارا ملک ہے۔
(حاجی فیض) (۱۷)

براہوئی زبان کے ایک ممتاز شاعر غلام حیدر حسرت اپنی ایک نظم "حسین وطن" (۱۸) میں گویا ہوتے ہیں

وطن حسین ہے
وطن پر بہار ہے
اے وطن
تجھ ہی سے اعتبار وفا قائم ہے
اور تجھ ہی سے قوم کی عظمت اور شان برقرار ہے
اے حسین وطن
ہم تجھ پر فدا ہوتے ہیں
ہم ہر لحہ تجھ پر اپنا سر قربان کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں
اے حسین وطن
ہمارے پیغمبر کے دین کا امین تو ہی ہے
اسلام کا نور تیرے ہی دم سے پھیل رہا ہے
اس دور کے ایک اور ممتاز شاعر پیر محمد زبیرانی کہتے ہیں:۔
وطن آزاد ہو گیا ہے
اس لئے آج ہماری صبح و شام بھی آزاد ہیں
آج قیدی اور غلام بھی آزاد ہیں
اے وطن تو ہمیشہ زندہ و سلامت رہے
یہاں کا ہر فرد خوشحال ہے
اے وطن تو ہمیشہ سلامت رہے
پیر محمد زبیرانی کی مشہور نظم "قائد اعظم" کے چند شعر یہ ہیں۔
دشت و صحرا اور کوہ و بیاباں خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے
پھر مسلمانوں کا بخت جاگا
نسیم صبح بے کیف اور بے خبر تھی
ساون کی گھٹاؤں نے اس میں زندگی کی لہر دوڑا دی
قائد اعظم نے قوم کو بیدار کیا
تمام مسلمان اس کی قیادت میں متحد ہو گئے۔
دنیا کے نقشے پر ایک نیا گل زمین ملک ابھرا
مسلمانوں کا قائد قول کا پکا تھا۔ اس نے اپنا عہد پورا کیا
براہوئی ادب کے ایک بزرگ شاعر نور محمد پروانہ اپنی نظم "جی جان وطن پاکستان" میں رقمطراز ہیں۔
تو ملت کا گہوارہ ہے
تو ہماری عزت اور غیرت ہے
تیری خاطر ہم آگ میں کود جائیں گے
ہمارے جی جان وطن پاکستان

ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں:۔
اے وطن پورا بولان تیرے دل میں ہے
جس میں وسیع و عریض وادیاں ہیں
سندھ کا انگڑائی لیتا ہوا دریا
اور اس کے کنارے سرسبز و حسین درخت
ان سب کو ہم اپنے دل میں بساتے ہیں
اے وطن خیبر کا مالک تو ہے
ہر شہر کا آقا تو ہے
ہم تیری تعریف کرتے ہیں
اے وطن پنجاب تیرا پھول ہے
تجھے ہم ترقی دیں گے
اے وطن
تیری تعریف ہر دلیل سے بلند ہے
ہم تجھے اپنے دل میں بساتے ہیں۔

براہوئی زبان کے ایک ممتاز غفور عبد الرحمن کرد "پاک وطن" کے تحت یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:۔
میرے وطن کی ہواؤں کے دامن میں پھولوں کی خوشبو بسی ہے
میری سرزمین پر مستی سے جھومتے بادل سایہ فشاں ہیں
خیبر کی شکن در شکن وادیاں اور اونچے پہاڑ آسمان کو چوم رہے ہیں
بولان کے فلک شگاف پہاڑ کی چوٹیوں پر برف نے دستار بندی کی ہے
پاک گل زمین سرسبز اور پر بہار ہے
بہار میں گل و لالہ اس کے دامن کو سجاتے ہیں
وطن کے نشیب و فراز اس کا حسن ہیں
ہر طرف پھیلے ہوئے پھولوں کو یکجا کرکے ایک گلدستہ تیار کرو۔

براہوئی زبان کے کہنہ مشق شاعر مولانا عبد الباقی درخانی کے وطن کی محبت سے متعلق جذبات بعنوان "پیارا وطن" اس طرح نوک قلم پر آئے:۔
ہمارا پیارا وطن پاکستان
تو اسلام کی شان و شوکت کا گہوارہ ہے
تجھ سے زندگی میں ایک خوبصورت نیا رنگ ابھرا
تو آزاد ہے تو ہم بھی آزاد ہیں

حکیم خدائے رحیم حکیم "جمہور کا وطن" کے تحت کہتے ہیں:۔
وطن کے جیالے سپاہی ہمیشہ ہر محاذ پر کامیاب ہوں
اپنی بے مثال جرات سے نشان حیدر کا اعزاز پائیں

عظیم شب و روز دعا گو ہے
جمہور کا یہ وطن عزیز سدا سلامت رہے
براہوئی کے ایک بزرگ شاعر بابا عبدالحق "میرا وطن" میں یوں اظہار عقیدت کرتے ہیں:۔
میں وطن کی تعریف میں نغمہ سرا ہوں
میرا وطن باوقار ہے
یہ میرا گھر ہے میں اس کا محافظ ہوں
اس کی خاطر جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں
گل بنگلزئی 'پاک وطن' کے تحت گویا ہیں:۔
وطن ہی ہمارا سرمایہ حیات ہے
غدار وطن راندہ درگاہ رہے
پاک وطن پائندہ و تابندہ رہے
گل خدا تمہاری زبان مبارک کرے
جوہر براہوی بعنوان "زیبا وطن" کہتے ہیں:۔
جوہر براہوئی غزل سرا ہے
اس وطن کا کوئی ثانی نہیں
غریب اور بے بس بھی یہاں فخر دارا و جم ہیں
امیر عبدالقادر شاہوانی اپنی نظم "جان و مال قربان" میں کہتے ہیں:۔
جو قوم کے جوان اور سپوت تمہارے محافظ ہیں
میرا یقین و ایمان ہے کہ میرا وطن ترقی کرے گا
وطن کی حفاظت کیلئے ایک ہو جاؤ
وطن خوشحال ہو یہی میرا ارمان ہے
مولانا عبدالغفور درخانی "ارض پاکستان" کے تحت یوں نغمہ سرا ہیں:۔
دینی غیرت کی کلاہ تیرے سر پر ہے تو قوم کی عزت ہے
تو ملت اسلام کا آہنی قلعہ ہے
سرحد سندھ پنجاب اور بلوچستان تیرے دم سے ہیں
میری عزت و ناموس تجھ سے وابستہ ہے
عبدالصمد شاہین (براہوئی کے نامور شاعر و ادیب، محشر رسول نگری کی شہرہ آفاق مثنوی "فخر کونین" کے مترجم۔ اردو سے براہوئی میں) "ہم آزاد ہیں" میں گویا ہیں۔
خدا کا فضل و کرم کہ آج ہم آزاد ہیں
پاک سرزمین پر ہم آباد اور خوشحال ہیں
شاہین ہماری خوش نصیبی ہے کہ خواب اقبال کو
قائد اعظم نے ایک حسین حقیقت میں تعبیر کیا

براہوئی کے نو خیز شاعر میر نصیر عاقل اس طرح اپنے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

پاک گلشن تیرے لئے جان تک قربان ہے
ہم تیرے دشمنوں کے لئے قہر خدا ہیں
ہم اپنے خون پسینہ سے تجھے خوشحال کریں گے
اور تیری شان کو جہاں میں نمایاں کریں گے

براہوئی کے ایک اور نوجوان شاعر رحمن جیت زئی کہتے ہیں۔

اے وطن' ہم تیرے فرزند ہیں
اور تو مادر ملت
ہم بلبل ہیں اور تو پھول اور چمن
ماں کے حقوق اس کے باوفا اور غیرت مند جگر بندوں پر ہیں اور
ہم ان حقوق کو پورا کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔
ہماری زبانوں پر ہمیشہ دعا ہے کہ
اے وطن ہم تجھ پر قربان ہو جائیں

بقول عبد الحلیم خادی زیر عنوان "پھولوں کی سرزمین":

ہماری مال و دولت وطن کے لئے ہے۔ ہم اس سرزمین کے لئے جان قربان کر دیں گے
یہ گل زمین خوشبوؤں سے مہکتی ہے۔ یہ خدا کا عطیہ ہے
خادی! اپنے وطن کی بات کرتا ہے
وطن تو سبھی کو پیارا ہوتا ہے

براہوئی کا معروف نعت گو شاعر صالح محمد شاد بعنوان "یوم قرار داد پاکستان" نغمہ سرائی کرتا ہے۔

تئیس مارچ ہر سال خوشی کا پیغام لے کر آتا ہے
اس روز پیر و جوان خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں
اللہ اکبر کے نعرے نے تمام مسلمانوں کو متحد کر دیا
انہوں نے آزادی کے لئے ہر قربانی پیش کی
انجام کار دشمن ناکام ہوئے اور فتح حق کی ہوئی

براہوئی کے ایک نامور شاعر تراب لاڑ کانوی اپنی قابل ذکر نظم "میرے دلبر وطن" میں گویا ہوتے ہیں۔

میری پاک مٹی ایشیاء کا دل ہے
اس دیس میں باغ ہیں اور کانیں ہیں
سمندر اور وادیاں ہیں
یہ دریاؤں کا دیس ہے
یہاں کی زمین کا فرش زمردیں ہے
کشمیر جنت نشاں اس کا فرش ہے
خدا نے اس وطن کو ہر دولت سے نوازا ہے

ہاں ... اور یہاں اجناس کی فراوانی ہے
' بولان' لاہور' اور گوادر
دل لوگوں کا علاقہ خیبر یہاں ہے
اعتبار سے یہ ملک بہت عظیم ہے
ہن جوداڑو اس کے گواہ ہیں
ن کا پرچم سبز ہلالی پرچم ہے
و قوت و جلال کا مظہر ہے
تراب کے لئے باعث کمال ہے
سحاق سوز اپنی نظم "آزاد وطن" میں کہتے ہیں۔
ے وطن آزاد ہے
وطن آباد ہے
ار کو خزاں کا خوف نہیں
اعظم کی یادگار ہے
' صداقت' عدالت' شجاعت ہمارا طرہ امتیاز ہے
رزمین تاابد سلامت رہے
رے دلوں کی دعا اور زبان کی آواز ہے
وز ہماری یہی آرزو ہے
امور قلمکار ڈاکٹر عبد الرحمن براہوئی اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں۔
ب ہم آزاد ہوئے تو براہوئی شعرا میدان میں نکل آئے۔ آزادی کے دس سال بعد براہوئی شاعری میں
انقلاب آتا ہے' شاعر اپنے محبوب کے فراق و وصال سے بے نیاز ہو کر اپنی نئی مملکت سے محبت کرنے
ہے اور محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔
محبوب۔ اب تیری تعریف کرنا خرافات میں شامل ہے میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں تیری تعریف
' بلکہ اب میں اپنے رہنما قائد اعظم محمد علی جناح کی شان میں اشعار کہتا رہوں گا۔"
اکٹر عبد الرحمن براہوئی کے اس دعوی کے ثبوت میں براہوئی شاعری کے متذکرہ بالا نمونے پیش کئے جا
ں۔ جس میں ہر لحظہ ہمیں پاک سرزمین سے الفت اور اس کی خاطر اپنی جان نثار کرنے کا پختہ ارادہ ملتا
زاب اپنی ایک اور نظم (ایک کا حوالہ دیا جا چکا ہے) میں گویا ہوتے ہیں۔
طن
مادر ملت کہتے ہیں
غیرت و عزت تجھے سمجھتے ہیں
جوں نے تیرے لئے
ہر قیمت پر قربان کیا
سے جدا نہیں ہیں

اس لئے ہم بھی تجھ پر قربان ہونے کو ہر لحہ تیار ہیں
علاوہ ازیں جدید براہوئی شاعری میں ہماری ملی اور قومی ثقافت بھی بھرپور انداز میں اجاگر ہوئی ہے بقول واحد بخش۔
اے مسلمانو! آؤ مل کر محمدؐ پر درود پڑھیں۔ آپؐ کے صدقے اللہ تعالیٰ ہم پر اپنی رحمت (نازل) کریں۔ محمدؐ نے فرمایا تم تمام مسلمان کہیں بھی ہو آپس میں بھائی ہو۔ یہاں آپس میں جس قدر ہو سکے بھلائی کرو۔
صالح محمد شاد کے الفاظ میں۔ کتنی اعلیٰ شان ہے حضرت رسول اللہؐ کی
شاد کہو صبح و شام صلی علیٰ صل علیٰ

حوالہ جات

(۱) براہوئی ادب' عبدالرحمٰن کرد' ثقافت اور ادب وادی بولان میں' کوئٹہ' ۱۹۶۶ء ص ۲۳۹' ۲۵۰۔
براہوئی زبان' پروفیسر انور رومان' تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند' چودھویں جلد (جلد دوم) لاہور' ۱۹۷۱ء ص ۲۷۰۔
(۲) براہوئی زبان و ادب' سید کامل القادری' اورینٹل کالج میگزین' لاہور' نومبر ۱۹۶۲ء۔
براہوئی زبان اور ادب' عبدالرحمان براہوئی' سالنامہ "ماہ نو" کراچی' مارچ' ۱۹۶۶ء۔
(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' لاہور' ۱۹۸۳ء ص۹۸ تا ۱۰۲۔
(۴) ایضاً ایضاً ص ۱۰۸۔
(۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' لاہور ۱۹۸۳ء ص ۱۱۸' ۱۱۹۔
اس کتاب میں جن مزید جدید براہوئی شعراء کے براہوئی کلام کے اردو ترجمے دیئے گئے ہیں۔ ان میں شامل ہیں: مراد علی ریئسانی' محمد عمر ولد شیر محمد بنگل زئی' حاجی محمد عمر ابن جاتی' علی محمد' محمد اسحاق سوز' پیر محمد زبیرانی' حافظ سعید احمد' کریم بخش سائل' پیر محمد نیرفی' واحد بخش رند' مولانا عبدالغفور درخانی' تراب لاڑکانوی' عبدالصمد شاہین' صالح محمد شاد' بابا عبدالحق شاہوانی' گل بنگلزئی' اور میر گل خاں نصیر۔
(۶) ثقافت اور ادب وادی بولان میں' کوئٹہ' ۱۹۶۶ء ص ۲۳۰۔ ۲۳۷۔
(۷) "ایلم" مستونگ' ۱۷ اپریل ۱۹۶۶ء۔
(۸) ایضاً ۳ اپریل ۱۹۶۶ء۔
(۹) ثقافت اور ادب وادی بولان میں' کوئٹہ' ۱۹۶۶ء ص ۲۳۶ تا ۲۳۹۔
(۱۰) میر گل خاں نصیر براہوی شاعر' نادر قمبرانی' ماہنامہ زینہ' کوئٹہ' جولائی ۱۹۸۹ء' ص ۲۰' ۲۳۔
(۱۱) براہوئی زبان' پروفیسر انور رومان' تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند' چودھویں جلد (جلد دوم) لاہور' ۱۹۷۱ء ص ۴۵۰' ۴۵۲۔
(۱۲) علامہ اقبال اور بلوچستان' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' اسلام آباد' ۱۹۸۶ء ص ۱۶۸ تا ۱۷۳۔
(۱۳) گلزمین' عابد رضوی' کوئٹہ' ۱۹۷۸ء ص ۵۰۔

ماہ نامہ "اولس" کوئٹہ' فروری ۱۹۹۱ء۔

ہفت روزہ "الیم" مستونگ' ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء۔

ہفت روزہ "الیم" مستونگ' ۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء۔

ایضاً" ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

گلزمین' عابد رضوی' کوئٹہ' ۱۹۷۸ء صفحات ۵۱ تا ۶۰۔

وحدت افکار: شائع کردہ محکمہ فلم و مطبوعات' وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان' اسلام آباد مطبوعہ راولپنڈی صفحات ۳۵ تا ۴۱۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

بلوچستانی پشتو شاعری کے تراجم سے [illegible]

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں پشتو شاعری (۱) نے ہمہ جہت ترقی کی ہے۔ نعت گوئی کے حوالے سے اس دور میں ایسا کوئی شاعر تو سامنے نہیں آتا جو کلی طور پر نعت گو شاعر ہو مگر اپنے طور پر نعت گوئی کا حق کم و بیش ہر ایک نے ادا کیا ہے۔ ویسے پشتو میں نعت گوئی کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ عربی، فارسی یا اردو میں ہے۔

سید محمد رسول فریادی (۲) تحصیل پشین کے علاقہ کا نکزئی کے سادات میں سے ہیں۔ وہ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید شربت شاہ ہیں۔ زیادہ تر تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ اچھے شعر کہتے ہیں اور ترنم سے پڑھتے ہیں۔ ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ فریادی اکثر و بیشتر مشاعروں اور ریڈیو پر اپنا کلام سناتے ہیں۔ کئی مقامی رسالوں میں بھی ان کی بہت سی چیزیں چھپی ہیں۔ والہانہ انداز میں نعت کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ "درود و سلام کا تحفہ" کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

نبیؐ خیرالابرار آپ پر ہزار درود و سلام بھیجتا ہوں۔
اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے طفیل اس دنیا کو وجود بخشا' بلکہ ساری کائنات کے وجود کا باعث آپؐ ہیں' اے خدا کے حبیب! (دراصل) اللہ نے اپنی خدائی آپؐ کے وجود کے ذریعے ظاہر کر دی ہے۔
جب آپؐ کا ظہور ہوا تو جہالت کے اندھیرے ختم ہوئے۔ امن اور سلامتی کا دور شروع ہوا اور ہلاکت آفرینی کا دور تمام ہوا۔ آپؐ نے مساوات کا چراغ جلایا۔ اے ہمارے سردار آپؐ بہترین خلائق میں ہیں۔
آپؐ کو قرآن نے طٰحٰی اور یاسین کے پاک ناموں سے یاد کیا۔ آپؐ اللہ کے حبیب اور تمام جہانوں کے لیے باعث رحمت ہیں۔ پروردگار نے آپؐ کو خلق عظیم پر پیدا کیا۔ اے ہمارے بااختیار پیغمبر آپؐ اللہ کی بہترین تخلیق ہیں
آپؐ کو رب الودود نے اپنے فضل سے منتخب کیا۔ آپؐ کو اللہ نے مقام محمود عطا فرمایا اور شافع امت کا رتبہ بخشا۔ آپؐ تمام عالم موجودات کے لیے باعث فخر ہیں۔
اللہ خود آپؐ کا نازبردار ہے اور آپؐ اچھی ہستیوں میں بہترین (تخلیق خدا) ہیں۔
خداوند کریم نے خود آپؐ پر درود و سلام بھیجا ہے۔ آپؐ کو مسجد اقصیٰ میں انبیائے کرام کی امامت کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپؐ اللہ کے رازداں ہیں اور آپؐ اللہ کی بہترین خلائق میں سے ہیں۔

اس شب (یعنی معراج) آپؐ اللہ کے راز و نیاز سے مشرف ہوئے ملائک ہر سو مرحبا (ومعہ) کے ترانے گا رہے تھے۔ جبریل امین کو بھی تک آپؐ کے ساتھ ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔ یا نبی آپؐ اللہ کی بہترین مخلوق ہیں۔

اے عالی نسبؐ فخر عربؐ مدنی لقب پیغمبرؐ آپؐ دونوں جہانوں کے بادشاہ ہیں۔ اور اللہ کے محبوب بھی۔ آپؐ پر رسالت کا سلسلہ ختم ہوا۔ آپؐ نورالانوار ہیں۔

میں فریادی درود و سلام کا تحفہ بھیج رہا ہوں۔ آپؐ کے در کا یہ غلام شفاعت کا امیدوار ہے آپؐ اللہ کی بہترین مخلوق میں سے بہترین ہیں۔(علیہ الصلوۃ والسلام)

ری جگہ سید محمد رسول فریادی یوں گلہائے عقیدت(۳) پیش کرتے ہیں:

اے محبوبؐ میں تجھ پر محبت کا سلام بھیجتا ہوں۔ اور اپنے خیال کے قاصد کو یہ پیغام بڑی محبت سے دے رہا ہوں۔

میں تو اس دنیا میں تمہاری دید کی امید پر زندہ ہوں۔ لیکن بہت سے لوگوں کو محبت کا مقام معلوم نہیں ہے۔

میں بڑی محبت سے درود اور سلام کی سوغات بھیج رہا ہوں۔ لیکن اے ساقیؐ میں فریادی محبت کے ایک جام کا طلب گار ہوں۔

اے خدا کے در پر سب سے معتبر (رسول مبارکؐ)، خدا کے بعد سب سے زیادہ بااختیار (رسول مبارکؐ) اے سب سے زیادہ نازبردار (رسول مبارکؐ) اور اے ہمارے دلوں کے قرار (رسول مبارکؐ) اے تمام نازبرداروں کے نازبردار۔ کچھ بھی نہ تھا ایک آپؐ ایک نور تھے اور روشن تھے۔

جب آپؐ نہیں تھے تو دنیا پر ظلم کا راج تھا۔ جس میں ہر شخص کا ننگ و ناموس تاراج تھا۔ انسانوں کو قتل کرنا ان کا عام رواج تھا۔ اور جہل کا یہ مرض ان میں اتنا عام تھا کہ لاعلاج تھا۔ انسانیت بچ بچ خطرے میں تھی۔ نہ ہی کسی میں ایک ذرہ صلاحیت تھی۔

ہر طرف کالی رات چھائی ہوئی تھی۔ ایک انسان دوسرے کا خون بہا رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اور چور بھی دن دہاڑے راہزنی کرتے۔ ہر طرف جنگ و جدل اور شرو فساد تھا جو شخص جو چاہتا وہی کرتا۔ مادر پدر آزاد تھا۔

جب آپؐ تشریف لائے تو کفار کے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

کعبہ میں بت سر کے بل گر گئے۔ جب آپؐ کا مبارک نور دنیا میں پھیلا تو فریادی دنیا سے ظلم اور زیادتی ختم ہو گئی۔ یہ دنیا امن کا ایک گہوارہ بن گئی۔ جہالت ختم ہو گئی اور ہر شخص روشنی سے منور ہو گیا۔

سلطان محمد صابر(۴) ۱۹۲۵ء میں کوئٹہ کے قریبی گاؤں نچاری میں پیدا ہوئے اور کوئٹہ شہر میں تعلیم ں کی۔ آپ کے آباؤ اجداد غزنی کے مشہور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ گھرانہ امیر رحمٰن خان کے عہد میں افغانستان چھوڑ کر پاکستان میں آباد ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ بہت

اگر میں در محترم کی مٹی بن جاؤں تو اسے سعادت (و فلاح) دو جہاں سمجھوں۔ تیرے بغیر میں جنت میں رہنے کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔
محفل (معرفت) اگر دنیا میں کوئی ہے بھی تو ہم اسے کہاں مانتے ہیں۔ لوگوں کا یہ دعوے فضول ہے کہ اور بھی محفلیں موجود ہو سکتی ہیں۔
اپنے عمل کے لحاظ سے میں کسی سرخروئی کا مستحق نہیں۔ ہاں حضورؐ کی محبت کے سہارے زندہ ہوں۔ اور اگر یہی گرمی آپؐ کے طفیل برقرار رہی تو (محبت کی یہ حرارت) کئی دوزخوں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔
حضورؐ ایک طویل مدت سے دربار رسالت میں شرف باریابی کی اجازت کا متمنی ہوں کاش آپؐ کی ذات گرامی اسے شرف قبولیت بخش دے۔
(آپؐ کی محبت کی شراب پینے والا دونوں جہانوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بے خودی کے بعد کوئی اور شراب پینے کی کیا ضرورت ہے۔
"دانائی" آپؐ کی پیروی اختیار کرنے کا نام ہے۔ اس کے علاوہ اور "حکمتیں" تلاش کرنا دانائی کے خلاف ہے۔
آپؐ کی محبت میں جان کا نذرانہ پیش کرنا واحد ثواب کا کام ہے۔ اس سے بڑھ کر ثواب تلاش کرنے والا انجام کار نامراد رہے گا۔
آپؐ کی کتاب مبارک جس کے ہاتھ آئے وہی "عالم" کہلاتا ہے۔ اس کتاب کو چھوڑ کر ڈھیروں کتابیں چاٹنے والا بھی جاہل ہی رہتا ہے۔
ہر ایک عالم اس شخص کا اپنا ہے جو اس حقیقت سے واقف ہو جائے کہ قدم مبارک کے نیچے لاتعداد جہاں آباد ہیں۔
جو فکر (دین) آپؐ نے پیش کیا ہے صرف وہی لازوال ہے (خزاں اس پر کبھی نہیں آ سکتی) فلسفیوں نے بھی بزعم خود خوشنما باغ تعمیر کیے ہیں (لیکن وہ سراب کے سوا کچھ نہیں۔
سمجھنے کی بات یہ ہے کہ رسول کی محبت دراصل خدا کی محبت ہے۔ دین (اسلام) میں راز کی بات یہی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی راز دین میں نہیں۔
حضورؐ کیا ہی اچھا ہو کہ (عالم خواب میں ہی سہی) مشرف بہ زیارت ہو جاؤں۔ (آپؐ جانتے ہیں) اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور ارمان نہیں رکھتا۔
جس ہستیؐ مبارک کی وجہ سے یہ معزول شدہ (جس کی سرزنش کی گئی تھی) انسان دوبارہ عرش معلیٰ تک رسائی حاصل کر سکا ہے میں (ذاکر) اس پر ہمیشہ درود و سلام بھیجتا رہوں گا۔

عبدالباری(۸) نام اور اسیر تخلص ہے۔ علاقہ پشین کے بچان نامی گاؤں میں لاجور خان کے ہاں ۱۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد نے ضلع ژوب کے قلعہ سیف اللہ کے مشرق میں واقع ایک گاؤں "سگہ" کو خیرباد کہہ کر علاقہ پشین میں سکونت اختیار کی۔ ان کا تعلق کاکڑ سنزرخیل کی شاخ علی زئی شموزئی اللہ دادزئی

آپ کا پیشہ تجارت اور مشغلہ شعر و شاعری ہے۔ آپ "شیدایان پشتو ادب" پشین کے صدر ہیں۔ مقدس خان معصوم کے خیال میں "عبدالباری اسیر نے بلوچستان میں پشتو ادب کے جمود کو توڑا ہے۔"
آپ اردو میں بھی اچھے شعر کہتے رہے ہیں۔ "شمع" کراچی، ڈائریکٹر لاہور، قندیل لاہور، چاند لاہور، کوئٹہ، زمانہ کوئٹہ، جنگ کوئٹہ، مشرق کوئٹہ اور روش، چمن کی فائلیں اس کی گواہ ہیں۔
نعتیہ کلام کا ترجمہ (۹) ملاحظہ فرمائیے:

(۱)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تیرے در پر قربان ہو جاؤں۔ میں اپنا سلام اور درود پیش کرتا ہوں۔)
آپؐ کے نور مبین کے طفیل جہالت اور ظلمت کا دور ختم ہو گیا۔ آپؐ کا احسان ہر خاص و عام پر ہے میں آپؐ پر قربان ہو جاؤں۔ آپؐ کے رخ انور کے سامنے چاند سورج کی کوئی حیثیت نہیں، پھولوں جیسی لطافت رکھنے والے حسین اور منور رخ مبارک۔ میں آپؐ کے قربان ہو جاؤں۔
امت مسلمہ کی ہر نماز آپؐ کے ذکر مبارک کے بغیر مکمل نہیں۔ میں آپ کے قربان ہو جاؤں۔

(۲)

آپؐ کی پیدائش دنیا کے لیے باعث نور ہے۔ آپؐ ہمیشہ امت کے غم خوار رہے ہیں اور انسانیت کے باغ کے گل سرسبد ہیں۔
مشرق اور مغرب میں آپؐ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپؐ ہی حشر کے پرہیبت مقام پر ہماری سفارش کریں گے کیونکہ آپؐ کو اس کا اختیار دیا گیا ہے۔
آپؐ اللہ کے حبیب ہیں۔ عالی نسب اور اللہ کے ہاں محترم ہیں۔ سورج کی طرح آپؐ ہر مقام پر نورافشاں ہیں۔
آپؐ کی ذات کے طفیل زمین و آسمان کو وجود بخشا گیا۔ خداوند کریم کے ہاں آپؐ سے بڑھ کر کوئی حیثیت کا مالک نہیں۔
زمین پر آپ محمدؐ ہیں اور آسمانوں میں احمد انبیاء کے قافلے کے آپؐ سالار ہیں۔
اللہ نے آپؐ کو ننانوے ناموں کا شرف بخشا ہے۔ آپؐ عرب اور عجم دونوں کے لئے سردار بنائے گئے ہیں۔
باری اسیر کہتا ہے کہ آپؐ بے شمار اوصاف کے مالک ہیں۔ تمام حسن و خوبی کے مدعی آپؐ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اللہ (۱۰) (نام) درویش (تخلص) پہلے پہل دلریش تخلص کرتے تھے۔ جو بعد میں درویش سے بدل دیا گیا۔

والد کا نام شریف احمد شاہ ہے اور درانی قبیلے کے پوپل زئی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ گلستان ضلع پشین کے باشندے ہیں۔ آپ ماہنامہ پشتو "اولس" کوئٹہ سے بھی متعلق رہے ہیں۔ آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں انگریزی کے لیکچرار ہیں۔

ابتداء میں آپ کی عوامی شاعری (اولسی غزل) ۔۔ پشتو میں عوامی صنف شعر) بہت مقبول ہوئی۔ کوئٹہ میں منتقل ہونے کے بعد جدید ادبی ماحول سے متاثر ہو کر جدید شاعری شروع کی۔ اور بہت کم عرصے میں وہ نام پیدا کیا جو جلدی سے کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ آپ آج کل پشتو اکیڈیمی کوئٹہ کے صدر ہیں۔ نمونے کے طور پر آپ کے نعتیہ کلام کا اردو ترجمہ(۱۱) یہ ہے:

(۱)

تیری طرف سے آنے والی سرد اور خوشبودار ہوا کے جھونکے۔ نے اگر کسی کانٹے کو بھی چھو ۔ہے تو وہ کانٹا نہیں رہا بلکہ پھول بن گیا ہے۔

وہ شخص چاند کی طرح تاریکیوں میں اپنا راستہ بنا سکتا ہے۔ جس شخص کے چہرے پر ترے در پاک کا غبار پڑ جائے۔

اے خالق کائنات! تیرے اور میرے درمیان کتنا خوبصورت رشتہ قائم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ترا بھی محبوب ہے اور میرا بھی محبوب ہے۔

جن لوگوں کے دلوں کے آسمان پر تیری محبت کے سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں ان پر رات کبھی نہیں آتی اور ان پر ہمیشہ دن رہتا ہے۔

درویش کا یہی دستور اور یہی روزگار ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کا چہرہ تیرے نام کے پانی سے دھوتا ہے۔

(۲)

تھکی ماندی محبت مدد کی طلب گار ہے۔ غریب محبت امداد چاہتی ہے۔ زمانہ آج تیرے شہر سے محبت کو زبردستی نکال رہا ہے۔

جو پاؤں (تلوے) تیری محبت کی منزلوں میں زخم خوردہ ہیں۔اے حبیب! تجھ سے تو راستے بھی محبت کرتے ہیں۔

رقیب دونوں ہاتھوں سے الحاد کی خاک بکھیر رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ میرا شیشہ محبت اس سے گرد آلود ہو۔

نفرت کے سوداگروں کے کاروبار کو اس وقت نقصان پہنچا۔ اے محبوبؐ جب دنیا کے بازار میں تو مہر و محبت لے آیا۔

اس نے اپنی آنکھیں ترے چہرے کی کرنوں سے دھوئی ہیں۔

میں جبرئیل سے اے محبوبؐ اسی لیے محبت کرتا ہوں۔

ابوالخیرہ حلاند (زلاند) (۱۲) ۷ جون ۱۹۳۹ء کو کوئٹہ شہر سے سات میل کے فاصلے پر ایک گاؤں سرہ غوڑگئی' میں

ن کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق بازئی قبیلہ سے ہے۔ آپ بی۔ اے اور پشتو آنرز ہیں۔ ان دنوں
ستان کوئٹہ میں بحیثیت پروڈیوسر پشتو پروگرام کام کر رہے ہیں۔
آپ نے ۱۹۵۶ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ جب آپ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ آپ کی کتابوں
ف ہیں۔ اردو میں "پشتو کہاوتوں کی کہانیاں" بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ کے شعری اور نثری
بہت سراہا گیا ہے۔ آپ پشتو ادب میں ایک مخصوص مقام کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ نعتیہ اشعار کا
(۱۳) ملاحظہ فرمایئے:

(۱)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ ہی قرآن ہیں۔ اور خدا کے بعد کائنات میں آپؐ کا
ہمسر کوئی نہیں۔
انس و جن میں اے حبیبؐ آپ کا کوئی ثانی نہیں اور فرشتے بھی آپؐ کی شان دیکھ کر
حیران ہیں۔
تیرے در کی غلامی میں ہی مرنا فضیلت ہے کیونکہ مسلمان کے لیے تیرا در جنت سے
بھی افضل ہے۔
گمراہوں کے لیے آپؐ اندھیروں میں روشنی ہیں۔ اپنے مکمل دین کی آپؐ ہی تفسیر
اور ترجمان ہیں۔
آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہدایت کا روشن راستہ اور کہکشاں ہے۔ جو بھی اس راستہ پر چلا وہ
رضوان تک پہنچ گیا۔
انسان ہر زمانے میں تری راہ ہدایت کا محتاج ہے۔ خواہ وہ آسمان کی رفعتوں تک ہی
کیوں نہ پہنچ جائے۔
ہر شخص کی پریشانی کا حل تیرا دین ہے اور دنیا کا ہر مسیحا اور ہر لقمان (حکیم) آپؐ ہی
کے درمان کا محتاج ہے۔
خالق خدائے قدوس) بھی تیری جدائی برداشت نہ کر سکا اور اسی لیے آپؐ کو اس نے
معراج کی رات اپنے پاس بلوایا۔
یہ آپؐ ہی کی برکت ہے ورنہ آج بھی کعبہ میں لوگ انہیں بتوں کے سامنے سجدہ ریز
ہوتے۔
اگر آپؐ نہ ہوتے تو لوگ مدینہ منورہ جا کر کیا کرتے اور اس طرح آپؐ کی محبت میں
سرشار کون عرب جاتا۔
اے خدا تو زلاند کی آدھی رات کی یہ دعا قبول فرما اور اسے اپنے محبوبؐ کے دربار
لے جا۔

اگر خدا ایک ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نام نہیں ہے۔ تو پیارے محمدؐ کا بھی کوئی ثانی نہیں ہے۔

اے لوگوں مجھے کافر مت سمجھو میں مسلمان ہوں کیونکہ احد اور احمد میں "میم" کے بغیر کوئی فرق نہیں۔

خالق کائنات نے تیری ہی بدولت اپنی خدائی کا اظہار کیا اور لولاک (عرش) سے بعز کوئی سند نہیں۔

تجھ سے زیادہ بخت والا اور سعد کوئی نہیں کیونکہ تو معراج کے وقت "قاب" اور "قوسین" سے بھی آگے گذر گیا تھا۔

جب آپؐ کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ تو اب رقیب کے لیے میرے دل میں حسد کی کوئی جگہ نہیں۔

جس دن نفسا نفسی (آخرت) ہو تو اس دن آپؐ مجھے بھول مت جانا کیونکہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی آپؐ کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔

جب میں سر جھکائے شرمندگی میں خالی ہاتھ آپؐ کے پاس آؤں۔ تو آپؐ مجھ پر کرم کریں۔ کیونکہ آپؐ کے کرم کی کوئی حد ہی نہیں۔

میں نے امید کا کشکول (کاسہ گدائی) اپنے کندھے پر لٹکا لیا ہے۔ کیونکہ آپؐ کے در کے سوالی کا سوال رد نہیں ہوتا۔

یہ عزیز و اقارب انجان بن کر گزر رہے ہیں۔ اور زمانہ کا وہاں آپؐ کے سوا کوئی بھی شناسا نہیں ہے۔

مقدس خان (۱۴) (پورا نام) معصوم (تخلص) ۱۹۳۳ء میں میرباش خان کے ہاں پیدا ہوئے اور ان دنوں کوئٹہ شہر کے نواں کلی میں رہائش پذیر ہیں۔ تعلق درانی پوپلزئی قبیلہ سے ہے۔ پیشہ تجارت ہے۔ ۱۹۵۱ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ہر صنف میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی وقتاً فوقتاً مذاکروں، مشاعروں اور دیگر پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں ان کا کلام اور مضامین (اردو اور پشتو) چھپتے رہتے ہیں۔

نعتیہ اشعار کا اردو ترجمہ (۱۵) ملاحظہ ہو:

اے دو جہاں کے سردار میں تیرے قربان جاؤں۔ اے تمام امت کے غم خوار میں تیرے قربان جاؤں۔

تری (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ولادت ایک رحمت تھی۔ اے کردگار کی رحمت کے مظہر میں ترے قربان جاؤں۔

تریؐ ولادت مبارک تھی کیونکہ اس سے روشنی پھیل گئی۔ ہر سمت اور ہر مقام پر، میں ترے قربان جاؤں۔

ناگہاں یہ روشنی کیسے پیدا ہوئی۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا، میں ترے قربان جاؤں۔

تمام دنیا کے راہب حیران و پریشان تھے۔ کیونکہ انہیں یہ اسرار معلوم نہ تھے، میں

ترے قربان جاؤں۔
حضرت حلیمہ بی بی کے مال و دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ اور یوں آپؐ کا مرتبہ ظاہر ہوا میں ترے قربان جاؤں۔
بغیر پانی کے سینچے ریگستان میں پھول کھل جاتے۔ آپؐ کے راستے میں' میں ترے قربان جاؤں۔
یہ یتیمؐ بھی اللہ کا پیغمبرؐ ہو گا' اے حسین و جمیل کس کو یہ معلوم تھا' میں ترے قربان جاؤں۔
وہ تمام بے آب و گیاہ دشت اور صحرا۔ تیری وجہ سے گلشن میں بدل گئے میں تیرے قربان جاؤں۔
مجھ معصوم پر رحم کی نظر کر۔ اے میرے دل کے قرار' میں ترے قربان جاؤں۔
غلام جعفر (۲۹) اور قلمی نام سہیل جعفر ہے۔ والد کا نام سید غلام ہے۔ خٹک قبیلے سے تعلق رکھتے
۱ مئی ۱۹۵۹ء کو لورالائی شہر کے ہزارہ محلّے میں پیدا ہوئے۔ آج کل ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے منسلک

۱۹۷۶ء سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ افسانے اور مضامین بھی لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو شاعری
نہ ہیں۔ ان کے پشتو مضامین زیادہ تر "اولس کوئٹہ" اور "ہیواد کوئٹہ" میں چھپے ہیں۔ اردو کلام' جام
' اخبار خواتین' کراچی' مشرق' کوئٹہ اور نوائے وطن' کوئٹہ میں چھپتا رہا ہے۔ پشتو نعتیہ کلام کا اردو
۱) یہ ہے:

تیری رحمتیں زندگی کے لیے بے حد و حساب ہیں اور اسی طرح میرے رنجیدہ دل کی خوشی کے لیے بھی کافی ہیں۔
میں الفاظ کے ذریعے ترے اعلیٰ مقام کا تعین نہیں کر سکتا۔ تو مجھ پاگل کے لیے صفات کی ایک دنیا ہے۔
اپنی محبت کی آگ میں ایک مرتبہ مجھے بھی جلا دے۔ تاکہ میں تیری پیروی کے لیے اپنی زندگی راکھ کر دوں۔
نہ تو کوئی میرا غم کا ساتھی ہے اور نہ ہی مجھے سکون نصیب ہوتا ہے میں اپنی جوانی کے لیے تجھ سے تھوڑا سکون مانگتا ہوں۔
میں اپنے احساس کے آئینے میں اپنا وجود تلاش کرتا ہوں۔ میری تنہائی میں تیرا تصور بھی میرے لیے بہت کافی ہے۔
میں گناہگار اپنی زندگی کے اس سلسلے پہ حیران ہوں کہ میں دن کو رات پر اور رات کو دن پر حیران ہوں۔'
میری زندگی تیرے وصال کے راستے کی رکاوٹ ہے اور میں پاگل تیری دید کے اس مرحلے پر بہت حیران ہوں۔'
تیری رحمتیں بہت زیادہ ہیں لیکن میرے حصہ میں صرف سسکیاں آئی ہیں۔ میں اپنے

احساس [illegible]شوں کے اس سلسلے پر بڑا حیران ہوں۔
تیری [illegible] کے صدقے۔ میں اپنے دل کے مکان میں خطاؤں کی گرد سے زنگ آلود
اور گرد آلود آئینہ دیکھ کر حیران ہوں۔
تیرے تصور سے میری پژمردہ زندگی کو ہمیشہ سکون ملتا ہے اور اسی کیفیت کے سبب
آج یہاں کی ہوا میرے دل کا غنچہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔
میں اپنی خطاؤں پر بہت شرمندہ ہوں لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا میں خطاکار حیران
ہوں کہ روز آخرت بہانہ کیا کروں گا۔
مجھ سہیل پر بھی تیری بے حد و حساب محبت کی ایک نظر رہے۔ میں کب تک یونہی
اپنے بخت کی تاریکی پر حیران رہوں گا۔

ولی محمد خان(۱۸) اور سیال کاکڑ قلمی نام ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ضلع پشین کے سرانان نامی گاؤں میں عبدالرحمٰن خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق اورک زئی' میرداد زئی' ہنادوزئی' علی زئی' سنزرخیل کاکڑ قبیلہ سے ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ایم۔ اے (اردو' فارسی' پشتو) ایم او ایل' بی ایڈ ہیں۔ ان دنوں وہ بلوچستان یونیورسٹی میں صدر شعبہ پشتو ہیں۔ وہ نثر اور نظم دونوں میں یکساں مہارت کے حامل ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اچھی خاصی لائبریری کے مالک ہیں۔ پشتو ادبی دنیا کی ایک قد آور شخصیت ہیں۔ نعتیہ کلام کا ترجمہ(۱۹) ملاحظہ فرمائیے:

مالک نے ہمیشہ اس دنیا میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں اور ہر پیغمبر اپنے دور میں لاثانی ہوتا ہے۔
آنحضرتؐ کی تعلیمات ہمیشہ جاری و ساری رہیں گی۔ اس دنیا کے وہ لوگ نادان ہیں جو
انہیں تسلیم نہیں کرتے۔
اس عظیم شخصیت کا مقام تو دلوں میں ہے جب تک دنیا قائم ہے اس کا سکہ چلتا
رہے گا۔
اے بھائی! آنحضرتؐ کی تعلیمات بڑی دلکش ہیں۔ انہیں اپنے لیے غربت پسند تھی اور
ان کا نام ہر سمت جاری تھا۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارک۔ سنہری زیورات کی طرح ہیں۔ جو کتابوں
میں اس طرح نظر آتی ہیں جیسے آسمان پر ستارے۔
جب سیال کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات یاد آتی ہیں۔ تو وہ سوچتا ہے کہ کاش
ان تعلیمات پر عمل ہو اور ہر شخص کا دل شاد ہو۔

عبد الغفور(۲۰) پورا نام اور پردیس تخلص ہے۔ والد کا اسم شریف محمد آخوندزادہ اور دادا کا نام حاجی مزمل آخوندزادہ ہے۔ تعلق یاسین زئی سید ہاشمی قبیلہ سے ہے۔ ۱۲ اگست ۱۹۳۲ء کو سبی کے ارد گرد غلجی خاندان کے مشہور ناصر قبیلہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک بڑے عالم دین تھے اور مذکورہ قبیلہ میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اب آپ ضلع پشین کے گاؤں ابراہیم زئی میں مستقل سکونت پذیر ہیں۔ آپ کے نعتیہ اشعار کا ترجمہ(۲۱) درج ذیل ہے:

پورا کلمہ (طیبہ) آپؐ کے نام سے منسوب ہوا۔ کائنات میں آپؐ کے سوا کوئی دوسرا منتخب (خدا کا محبوبؐ) نہیں ہے۔

بت خانہ ' بیت اللہ شریف میں بدل گیا اور ہر بلند و ارفع کی فوقیت ترے بعد شمار ہونے لگی۔

تری ہیبت سے قیصر و کسریٰ کے محلات لرزنے لگے۔ دنیا کے تمام سلطان (بادشاہ) تیرے مطیع ہو گئے۔

توحید کی تیغ سے تو نے وہ نشان مٹا دیئے۔ جن کو لوگ خدا سمجھ کر ان کی تسبیح و ثنا کرتے تھے۔

ترے ہی ہونے (ہستی) سے یہ سب کچھ موجود ہے اور ہر موجود پر ترا ہی احسان ہے (اس کی ہستی یعنی وجود کے لیے۔

جن لوگوں نے ترے چراغ سے روشنی حاصل نہیں کی۔ وہ لوگ ابھی تک اندھیروں کے اسیر ہیں۔

معراج کی مہمانی کا شرف صرف تجھے ہی حاصل ہوا۔ یہ مقام ہر شخص کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔

تو نے انصاف کا معیار کچھ اس طرح قائم کیا کہ فلسفیوں نے تیری دانائی تسلیم کر لی۔

تو نے انسان کو انسانیت سے مشرف کیا۔ پردیس کو بھی خدا کرے تری امداد ' (کرم) میسر آئے۔

۲۲) نام اور عسکر تخلص ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو ژوب (فورٹ سینڈیمن) شہر میں غنچہ گل کے ہاں پیدا پیشے کے اعتبار سے بنک مینجر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ نثر و نظم خوب اور مسلسل ں۔ عبدالباری اسیر کے الفاظ میں "پشتو ادب کو بہت کچھ دے چکے ہیں اور اب بھی بہت کچھ دے ں۔" ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اردو میں بھی اچھے شعر کہتے ہیں۔ نعتیہ کلام کا اردو ترجمہ(۲۳) ئین ہے:

میرے دل و دماغ اور وجدان میں محمدؐ رہتے ہیں اور میرے فکر ' خیال اور بیان میں بھی وہی جلوہ آفریں ہیں۔

ستاروں کی جھلملاہٹ میں اور چاند کی کرنوں میں۔ اس صورت میں بھی محمدؐ ہیں اور اس صورت میں بھی محمدؐ ہیں۔

خواہ انجیل ہو۔ یا زبور ' خواہ تورات ہو یا دوسرے صحیفے۔ ہر مذہب میں اور قرآن میں محمدؐ ہی ہیں۔

آنکھ کے جھپکنے کے عمل اور دل کے دھڑکنے کے عمل میں۔ ہر لمحہ محمدؐ کی تعریف و توصیف کا بیان ہوتا ہے۔

آغاز بھی وہی ہیں اور انجام بھی وہی ' اولین بھی وہی اور آخرین بھی وہی۔ نبیوں کے کاروان کے سالار محمدؐ ہی ہیں۔

مختار اور بادشاہ ہیں اور ہر شے پر حاکم ہیں۔ اے عسکرؔ مکان اور لامکان دونوں میں محمدؐ ہیں۔'

سید محمد گل شاہ خوستی (۴۴) ۸ مئی ۱۹۵۱ء کو کلی زرد تحصیل' سنجاوی ضلع لورالائی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سیدوں کے خوستی قبیلہ سے ہے۔ آپ کے والد بزرگوار سید سید شین گل شاہ اپنے قبیلہ سید کے سربراہ اور سردار ہیں۔ سید گل شاہ کے جدامجد سید پالے شاہ خوستی تحریک آزادی کے بے لوث مجاہد تھے۔ وہ اس پاک سرزمین پر آزادی کی خاطر انگریزوں کے ساتھ ژوب اور صوبہ سرحد میں آخر تک برسرپیکار رہے۔ اس مجاہد کے متعلق "غازی" (عوامی صنف پشتو شعر) میں کافی مواد ملتا ہے۔

عبدالباری اسیر کے الفاظ میں "گل صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ حافظہ بلا کا پایا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کا حافظہ اپنی جگہ ایک انسائیکلو پیڈیا اور ان کا دماغ ایک کمپیوٹر کی طرح تیز ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پھر لکھتے ہی جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ طویل و بسیط مقالے لکھ ڈالتے ہیں۔"

ان کے مضامین مقالے' نظمیں اور غزلیں پاکستان کے معیاری رسائل اور اخبارات میں چھپتے رہے ہیں۔ جن میں سالانہ میگزین رگ سنگ' لورالائی' ماہنامہ اولس' پشتو کوئٹہ' ہفت روزہ ہیواد' ہفت روزہ ظفرالاسلام' کوئٹہ' ہفت روزہ بریشنا' کوئٹہ' ماہنامہ' عدل' کراچی' ماہنامہ' اباسین' کراچی' ماہنامہ جمہور اسلام' پشاور' روزنامہ بانگ حرم' پشاور' روزنامہ امن' کراچی وغیرہ شامل ہیں۔

گل صاحب کو پشتو اور اردو دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ دونوں زبانیں روانی سے بولتے اور لکھتے۔ گل صاحب نہایت ہی سادہ مزاج' مخلص' حد درجہ ذہین اور خوش طبع انسان تھے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۸ء کو لورالائی میں ایسا مشہور اور ممتاز شاعر و ادیب اور مخلص رفیق اللہ کو پیارا ہو گیا۔ گل صاحب نے اپنی پشتو شاعری کی ابتدا نعت شریف سے کی تھی جبکہ وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کے نعتیہ کلام کا نمونہ ترجمے کی صورت میں درج ذیل(۲۵) ہے:

آپؐ (مبارک) اللہ کے نازبردار ہیں اور آپؐ روئے زمین کی روشنی ہیں۔
خدا خود آپؐ پر درود بھیجتا ہے۔ آپؐ (مبارک) خدا کے وہ دوست ہیں۔
خدا کے بعد عام خدائی کے مختار ہیں۔ آپؐ وہ عظیم باشاہ ہیں۔
دنیا کی ہر چیز خدا نے آپؐ کی وجہ سے پیدا کی۔ اور آپؐ ہی تمام اشیاء کے باعث ہیں۔
عرش' کرسی' آسمان اور زمین۔ آپؐ ہی کے طفیل پیدا ہوئے اے خدا کے محبوب (مبارک)
سورج' چاند' ستارے آپؐ ہی کے حسن سے روشن ہیں۔ اور آپؐ اپنے حسن میں لاثانی ہیں۔
آپؐ وجود (ظہور) کے لحاظ سے آخری (پیغمبر) ہیں۔ لیکن معنوی لحاظ سے اولین ہیں۔
لولاک کا تاج اور معراج کی سعادت صرف آپؐ کو نصیب ہوئی ہے کیونکہ آپؐ مولا (خدا) کے نازبردار ہیں۔

آپؐ کا ہر عمل قرآن کے مطابق تھا۔ کیونکہ آپؐ (مبارک) ہادی برحق ہیں۔
خواہ نبی ہو خواہ ولی ہو یا عالم ہو۔ آپؐ ان سب کے آقا ہیں۔
کوئی خطاکار ہو یا عاصی راندۂ درگاہ۔ آپؐ (مبارک) سب کے غم خوار ہیں۔
آپؐ دنیا میں ہمارے تمام دکھوں کی دوا ہیں۔ اور عقبیٰ میں آپؐ ہمارے مددگار ہیں۔
اے رسولؐ آپ ناداروں کے چارہ گر ہیں اور دردمند دلوں کی دوا ہیں۔
آپؐ کی زندگی ہمارے لیے نمونہ ہے اور آپؐ ایک گوہر بے بہا ہیں۔
آپؐ کی محبت کی وجہ سے خدا آپؐ کی امت کو بخش دے گا۔ کیونکہ آپ خدا کے پیارے ہیں۔
میں آپؐ کی محبت میں دو جہان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آپؐ (مبارک) ہی میرے پیشوا ہیں۔
محمد گل پر آپؐ رحمت کی عنایت کریں۔ کیونکہ آپؐ تو عطا کا بحر بے کنار ہیں۔

[...] نام اور گوہر(۲۶) تخلص ہے۔ آپ لورالائی میں بہادر نواز کے ہاں پیدا ہوئے جو پشتون قبیلے اورک[...] [...]لی شاخ علی شیرزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ گوہر صاحب کے والد اسی سال پیشتر صوبہ سرحد کے علاقہ [...] نقل مکانی کر کے لورالائی میں آباد ہوئے تھے۔ اور جب سے ان کا خاندان یہیں آباد ہے۔ اردو اور [...]معروف منفرد شاعر و ادیب پروفیسر رب نواز مائل کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اردو اور پشتو پر پورا عبور [...]۔ دونوں میں خوب لکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ اردو کا مجموعہ کلام "پس دیوار" ۱۹۸۵ء میں طبع ہوا۔ [...] ناشر ہیں: پشتو ادبی ملگری بلوچستان' لورالائی۔ اسے ملک بھر کے ادبی حلقوں نے سراہا ہے۔
گوہر صاحب علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ آج کل نیشنل سنٹر کراچی میں [...]سسٹنٹ ڈائریکٹر کام کر رہے ہیں۔ پشتو کے نعتیہ کلام کا اردو ترجمہ(۲۷) ملاحظہ فرمایئے:

میں آپؐ کے وجود (موجودگی) کے ساتھ اس عقیدت سے زندگی گزار رہا ہوں کہ اگر آپؐ کا نہ ہوں (نہ بنا) تو پھر عبث اور بے کار زندگی گذار رہا ہوں۔
میں خطاؤں کی پر پیچ راہوں کا راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ میں وہ مومن ہوں جو آپؐ کی رحمت کی امید پر زندگی گذار رہا ہو۔
میں گناہوں کے شہر میں سرگردان و پریشان پھرنے والا مسافر کب تک اپنے گھر سے بے گھر صرف ہدایت کے رستوں میں زندہ رہوں گا۔
آپؐ تابناک سورج کی کرنوں سے معمور ایک صبح کی طرح ہیں۔ اور میں ایک چراغ کی طرح اندھیری رات کی طوالت میں زندہ ہوں۔
میں آپؐ کے چہرے کی رعنائی اور تازگی کے بارے میں سوچتے ہوئے آئینے کی طرح روز ازل سے حیرتوں میں زندہ ہوں۔
میں سرما کے یخ بستہ دن' اور دن بھی کسی برفیلی رات کی طرح آپؐ کے جمال کی گرم دھوپ کی حرارت پر زندہ ہوں۔
آپؐ دکھی دلوں کے لیے سکون ہیں اور غم زدوں کے لیے راحت اور میں گوہر۔ کس

کرب اور کس اذیت میں زندگی گزار رہا ہوں۔

میں روسیاہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپؐ کے لیے امتحان ہوں۔ لیکن آپؐ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپؐ کی وجہ سے میں خدا کا پیارا ہوں۔
میں زیارت کے اونچے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں سے گزر کر اے پیارے دوست' خوبصورت دوست' آپؐ ہی کے لیے آ رہا ہوں۔
دل پر آبلے' آنکھوں پر آبلے' احساس میں آبلے او رپیروں کے تلووں پر آبلے۔ میں اپنے آپ کے طویل راستے پر سفر کے لیے مسافر (سفر میں) ہوں۔
مجھے معلوم نہیں کہ اسلام کیا ہے' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں خودغرضی کے اس دور میں بھی صرف آپؐ کے لیے مسلمان ہوں۔
آپؐ کے لیے میں کشادہ صحن (مہمان نوازی کے لیے) اور پشتونوں کا باوقار حجرہ (مہمان خانہ) ہوں۔ آیئے۔ میں آپؐ کے لیے اپنے گھر کا کھلا دروازہ (منتظر) ہوں
میں جو کچھ بھی ہوں لیکن پھر بھی آپؐ پر فخر کرتا ہوں۔ مجھے جنت کی کوئی لالچ نہیں۔
میرے منہ میں خاک بھر جائے اگر میں آپؐ کے لیے کبھی نقصان کا باعث بنوں۔
میں آپؐ کی (رحمت) امید پر گناہ کرتا ہوں۔ زور و زیادتی اور خطا کرتا ہوں۔ میں گوہر ایمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اتنا سرکش صرف آپؐ کے طفیل ہوں۔

عبدالکریم بریالئے پشتو اور اردو پر عبور رکھتے ہیں۔ ایسے نامور شاعر و ادیب کے پشتو نعتیہ کلام کا اردو ترجمہ(۲۸) ملاحظہ ہو:

میں دنیا کو ترک کر کے آپؐ کے دربار میں آ جاؤں گا۔ وصال کا وہ لمحہ آپؐ کے طفیل میرا مقدر بن چکا ہے۔
اے دو جہانوں کی عظمت' تری ذات (ہستی) کی برکت سے بریالے آج تیرے طفیل بہت سے لوگوں سے بہت بہتر ہے۔

(۲)

اس اندھیری رات کے بعد تیرے ہی طفیل صبح کی روشنی ہے۔ کیونکہ تری رحمت کا سورج ترے ہی باعث دنیا میں طلوع ہوا ہے
شام کا خوف اور ہجر کا وار (موقع) میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان اونچے اونچے پہاڑوں پر عصر کا وقت آپؐ ہی کے طفیل ہے۔
خواہ ہجر کی کالی رات ہو یا بخت کی تاریکی ہو۔ لیکن جو شخص آپؐ کے در تک پہنچ گیا وہ آپؐ کے طفیل منور (روشن ضمیر) ہو گیا۔
اے محمدؐ میں ایک نہ ایک دن اپنی منزل (آپؐ تک) پہنچ جاؤں گا کیونکہ آپ کے طفیل کہکشاں میری فکر کی رہگذر ہے۔

میں خود پہاڑی چٹانوں سے رسنے والا پانی ہوں لیکن زندگی کی دھوپ (گرمیوں کا موسم) میرے تعاقب میں ہے اور میرا وجود پیاسے لوگوں کے لیے آپ کے طفیل آب کوثر ہے۔

ظر ۱۹۴۲ء میں ضلع پشین کے مشہور و معروف قصبہ خانوزئی میں حاجی امیر محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان پشتون قبیلے کاکڑ کی ذیلی شاخ پانیزئی سے ہے۔ بلوچستان یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔
نظر صاحب کا شمار ہمارے ملک کے اچھے ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ پشتو میں پیش کردہ ا اردو ترجمہ(۲۹) یہ ہے۔

آپؐ دنیا کے اندھیروں کے لیے روشنی ہیں اور امن کی روشن صبح ہیں آپؐ سچے خیرالبشر ہیں۔ آپؐ پر میرا سلام
آپؐ رحمتہ اللعالمین ہیں' اولین بھی اور آخرین بھی۔ آپؐ صادق بھی ہیں اور امین بھی' آپؐ پر میرا سلام۔
آپؐ کا پیغام محبت ہے' اور آپؐ کی ہر بات سچی ہے اور قند سے زیادہ شیریں بھی' آپؐ پر میرا سلام۔
آپؐ دکھی لوگوں کا مداوا اور غریبوں کے دوست ہیں اور محبت کی روشن شمع۔ آپؐ پر میرا سلام۔
جب دنیا میں آپؐ کا ظہور ہوا' تو کسریٰ کے گھر صف ماتم بچھ گئی۔ کعبے کے بت چور چور ہو گئے۔ آپؐ پر میرا سلام۔
آپؐ نبیوں کے سردار اور خاتم المرسلین ہیں۔ آپؐ اپنی امت کے غمزار ہیں' آپؐ پر میرا سلام۔
آپؐ ایک طرف تو کردگار کے محبوب اور دوسری طرف کونین کے سردار ہیں۔ میری روح کے لیے قرار ہیں۔ آپؐ پر میرا سلام۔

ہزادہ حمید اللہ (۳۰) ضلع پشین کے گاؤں فیض آباد میں ۱۹۳۷ء میں عبدالرحمان صاحبزادہ(۳۱) ۱۸۸۷ء ---- ۴ ستمبر ۱۴۰۰ھ / ۱۹۷۹ء آپ تفسیر' حدیث' فقہ' صرف و نحو عربی فارسی' منطق' ست' تجوید و قرات وغیرہ میں اچھی خاصی نظر اور مہارت رکھتے تھے۔ آپ علم کی پیاس بجھانے گئے تھے۔ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ ساری زندگی ان کا شعار پرہیزگاری اور تقویٰ رہا۔ ان میں بھی حصہ لیا تھا۔ ایک بہت اچھا کتب خانہ جس میں قلمی نسخے بھی ہیں یادگار کے طور پر بن ملا محمد عظیم صاحبزادہ بن ملا رحمت اللہ اخوند بن ملا خوشحال اخوند (۳۲) (صاحب حال بزرگ) ا ہوئے۔ آپ کاکڑ قبیلے کی ذیلی شاخ ترغرئی کی ذیلی شاخ احمد خیل اور پھر احمد خیل کی ذیلی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم و تقویٰ کی بنا پر حسن زئی کے کچھ گھرانوں کو صاحبزادہ کا نام دیا گیا۔ جن آپ کا خاندان بھی شامل ہے۔ صاحبزادہ حمیداللہ نے اردو' عربی' فارسی' اسلامیات' تاریخ اور ں ایم۔ اے کیا ہے۔ پہلے چار مضامین میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔
پ کئی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ ساٹھ سے زائد مضامین پشتو میں اور بیس سے زائد

وہ مختار اور بادشاہ ہیں اور ہر شے پر حاکم ہیں۔ اے عسکرؔ مکان اور لامکان دونوں میں محمدؐ ہیں۔'

سید محمد گل شاہ خوستی (۲۴) ۸ مئی ۱۹۵۱ء کو کلی زوڑ تحصیل' سنجاوی ضلع لورالائی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سیدوں کے خوستی قبیلہ سے ہے۔ آپ کے والد بزرگوار سید سید شین گل شاہ اپنے قبیلہ سید کے سربراہ اور سردار ہیں۔ سید گل شاہ کے جدامجد سید پالے شاہ خوستی تحریک آزادی کے بے لوث مجاہد تھے۔ وہ اس پاک سرزمین پر آزادی کی خاطر انگریزوں کے ساتھ ژوب اور صوبہ سرحد میں آخر تک برسرپیکار رہے۔ اس مجاہد کے متعلق "غازی" (عوامی صنف پشتو شعر) میں کافی مواد ملتا ہے۔

عبدالباری امیر کے الفاظ میں "گل صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ حافظہ بلا کا پایا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کا حافظہ اپنی جگہ ایک انسائیکلو پیڈیا اور ان کا دماغ ایک کمپیوٹر کی طرح تیز ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پھر لکھتے ہی جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ طویل و بسیط مقالے لکھ ڈالتے ہیں۔"

ان کے مضامین مقالے' نظمیں اور غزلیں پاکستان کے معیاری رسائل اور اخبارات میں چھپتے رہے ہیں۔ جن میں سالانہ میگزین رگ سنگ' لورالائی' ماہنامہ اولس' پشتو کوئٹہ' ہفت روزہ ہیواد' ہفت روزہ ظفرالاسلام' کوئٹہ' ہفت روزہ برشنا' کوئٹہ' ماہنامہ' عدل' کراچی' ماہنامہ' اباسین' کراچی' ماہنامہ جمہور اسلام' پشاور' روزنامہ بانگ حرم' پشاور' روزنامہ امن' کراچی وغیرہ شامل ہیں۔

گل صاحب کو پشتو اور اردو دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ دونوں زبانیں روانی سے بولتے اور لکھتے۔ گل صاحب نہایت ہی سادہ مزاج' مخلص' حد درجہ ذہین اور خوش طبع انسان تھے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۸ء کو لورالائی میں ایسا مشہور اور ممتاز شاعر و ادیب اور مخلص رفیق اللہ کو پیارا ہو گیا۔ گل صاحب نے اپنی پشتو شاعری کی ابتدا نعت شریف سے کی تھی جبکہ وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کے نعتیہ کلام کا نمونہ ترجمے کی صورت میں درج ذیل(۲۵) ہے:

آپؐ (مبارک) اللہ کے نازبردار ہیں اور آپؐ روئے زمین کی روشنی ہیں۔
خدا خود آپؐ پر درود بھیجتا ہے۔ آپؐ (مبارک) خدا کے وہ دوست ہیں۔
خدا کے بعد عام خدائی کے مختار ہیں۔ آپؐ وہ عظیم باشاہ ہیں۔
دنیا کی ہر چیز خدا نے آپؐ کی وجہ سے پیدا کی۔ اور آپؐ ہی تمام اشیاء کے باعث ہیں۔
عرش' کرسی' آسمان اور زمین۔ آپؐ ہی کے طفیل پیدا ہوئے اے خدا کے محبوب (مبارک)
سورج' چاند' ستارے آپؐ ہی کے حسن سے روشن ہیں۔ اور آپؐ اپنے حسن میں لاثانی ہیں۔
آپؐ وجود (ظہور) کے لحاظ سے آخری (پیغمبر) ہیں۔ لیکن معنوی لحاظ سے اولین ہیں۔
لولاک کا تاج اور معراج کی سعادت صرف آپؐ کو نصیب ہوئی ہے کیونکہ آپؐ مولا (خدا) کے نازبردار ہیں۔

آپؐ کا ہر عمل قرآن کے مطابق تھا۔ کیونکہ آپؐ (مبارک) ہادی برحق ہیں۔
خواہ نبی ہو خواہ ولی ہو یا عالم ہو۔ آپؐ ان سب کے آقا ہیں۔
کوئی خطاکار ہو یا عاصی راندۂ درگاہ۔ آپؐ (مبارک) سب کے غم خوار ہیں۔
آپؐ دنیا میں ہمارے تمام دکھوں کی دوا ہیں۔ اور عقبیٰ میں آپؐ ہمارے مددگار ہیں۔
اے رسولؐ آپ ناداروں کے چارہ گر ہیں اور دردمند دلوں کی دوا ہیں۔
آپؐ کی زندگی ہمارے لیے نمونہ ہے اور آپؐ ایک گوہر بے بہا ہیں۔
آپؐ کی محبت کی وجہ سے خدا آپؐ کی امت کو بخش دے گا۔ کیونکہ آپ خدا کے پیارے ہیں۔
میں آپؐ کی محبت میں دو جہان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آپؐ (مبارک) ہی میرے پیشوا ہیں۔
محمد گل پر آپؐ رحمت کی عنایت کریں۔ کیونکہ آپؐ تو عطا کا بحر بے کنار ہیں۔

سعید احمد نام اور گوہر(۲۶) تخلص ہے۔ آپ لورالائی میں بہادر نواز کے ہاں پیدا ہوئے جو پشتون قبیلے اورک زئی کی ذیلی شاخ علی شیرزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ گوہر صاحب کے والد اسی سال پیشتر صوبہ سرحد کے علاقہ تیراہ سے نقل مکانی کر کے لورالائی میں آباد ہوئے تھے۔ اور جب سے ان کا خاندان یہیں آباد ہے۔ اردو اور پشتو کے معروف منفرد شاعر و ادیب پروفیسر رب نواز مائل کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اردو اور پشتو پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ دونوں میں خوب لکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ اردو کا مجموعہ کلام "پس دیوار" ۱۹۸۵ء میں طبع ہوا۔ اس کے ناشر ہیں: پشتو ادبی ملگری بلوچستان، لورالائی۔ اسے ملک بھر کے ادبی حلقوں نے سراہا ہے۔

گوہر صاحب علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ آج کل نیشنل سنٹر کراچی میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر کام کر رہے ہیں۔ پشتو کے نعتیہ کلام کا اردو ترجمہ(۲۷) ملاحظہ فرمایئے:

میں آپؐ کے وجود (موجودگی) کے ساتھ اس عقیدت سے زندگی گزار رہا ہوں کہ اگر آپؐ کا نہ ہوں (نہ بنا) تو پھر عبث اور بے کار زندگی گذار رہا ہوں۔
میں خطاؤں کی پر پیچ راہوں کا راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ میں وہ مومن ہوں جو آپؐ کی رحمت کی امید پر زندگی گذار رہا ہو۔
میں گناہوں کے شہر میں سرگردان و پریشان پھرنے والا مسافر کب تک اپنے گھر سے بے گھر صرف ہدایت کے رستوں میں زندہ رہوں گا۔
آپؐ تابناک سورج کی کرنوں سے معمور ایک صبح کی طرح ہیں۔ اور میں ایک چراغ کی طرح اندھیری رات کی طوالت میں زندہ ہوں۔
میں آپؐ کے چہرے کی رعنائی اور تازگی کے بارے میں سوچتے ہوئے آئینے کی طرح روز ازل سے حیرتوں میں زندہ ہوں۔
میں سرما کے یخ بستہ دن، اور دن بھی کسی برفیلی رات کی طرح آپؐ کے جمال کی گرم دھوپ کی حرارت پر زندہ ہوں۔
آپؐ دکھی دلوں کے لیے سکون ہیں اور غم زدوں کے لیے راحت اور میں گوہر۔ کس

کرب و اندوہ کی اذیت میں زندگی گزار رہا ہوں۔

میں بدنصیب اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپؐ کے لیے امتحان ہوں۔ لیکن آپؐ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپؐ کی وجہ سے میں خدا کا پیارا ہوں۔
میں زیارت کے اونچے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں سے گزر کر اے پیارے دوست، خوبصورت دوست، آپؐ ہی کے لیے آ رہا ہوں۔
دل پر آبلے، آنکھوں پر آبلے، احساس میں آبلے اور پیروں کے تلووں پر آبلے۔ میں اپنے آپ کے طویل راستے پر سفر کے لیے مسافر (سفر میں) ہوں۔
مجھے معلوم نہیں کہ اسلام کیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں خودغرضی کے اس دور میں بھی صرف آپؐ کے لیے مسلمان ہوں۔
آپؐ کے لیے میں کشادہ صحن (مہمان نوازی کے لیے) اور پشتونوں کا باوقار حجرہ (مہمان خانہ) ہوں۔ آیئے۔ میں آپؐ کے لیے اپنے گھر کا کھلا دروازہ (منتظر) ہوں
میں جو کچھ بھی ہوں لیکن پھر بھی آپؐ پر فخر کرتا ہوں۔ مجھے جنت کی کوئی لالچ نہیں۔
میرے منہ میں خاک بھر جائے اگر میں آپؐ کے لیے کبھی نقصان کا باعث بنوں۔
میں آپؐ کی (رحمت) امید پر گناہ کرتا ہوں۔ زور و زیادتی اور خطا کرتا ہوں۔ میں گوہر ایمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اتنا سرکش صرف آپؐ کے طفیل ہوں۔

عبدالکریم بریالئے پشتو اور اردو پر عبور رکھتے ہیں۔ ایسے نامور شاعر و ادیب کے پشتو نعتیہ کلام کا اردو ترجمہ(۲۸) ملاحظہ ہو:

میں دنیا کو ترک کر کے آپؐ کے دربار میں آ جاؤں گا۔ وصال کا وہ لمحہ آپؐ کے طفیل میرا مقدر بن چکا ہے۔
اے دو جہانوں کی عظمت، تری ذات (ہستی) کی برکت سے بریالے آج تیرے طفیل بہت سے لوگوں سے بہت بہتر ہے۔

(۲)

اس اندھیری رات کے بعد تیرے ہی طفیل صبح کی روشنی ہے۔ کیونکہ تری رحمت کا سورج ترے ہی باعث دنیا میں طلوع ہوا ہے
شام کا خوف اور ہجر کا وار (موقع) میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان اونچے اونچے پہاڑوں پر عصر کا وقت آپؐ ہی کے طفیل ہے۔
خواہ ہجر کی کالی رات ہو یا بخت کی تاریکی ہو۔ لیکن جو شخص آپؐ کے در تک پہنچ گیا وہ آپؐ کے طفیل منور (روشن ضمیر) ہو گیا۔
اے محمدؐ میں ایک نہ ایک دن اپنی منزل (آپؐ تک) پہنچ جاؤں گا کیونکہ آپ کے طفیل کہکشاں میری فکر کی رہگزر ہے۔

میں خود پہاڑی چٹانوں سے رسنے والا پانی ہوں لیکن زندگی کی دھوپ (گرمیوں کا موسم) میرے تعاقب میں ہے اور میرا وجود پیاسے لوگوں کے لیے آپ کے طفیل آبِ کوثر ہے۔

نذر محمد نظر ۱۹۴۲ء میں ضلع پشین کے مشہور و معروف قصبہ خانوزئی میں حاجی امیر محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق پشتون قبیلے کاکڑ کی ذیلی شاخ پانیزئی سے ہے۔ بلوچستان یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔

نظر صاحب کا شمار ہمارے ملک کے اچھے ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ پشتو میں پیش کردہ "سلام" کا اردو ترجمہ(۲۹) یہ ہے۔

آپؐ دنیا کے اندھیروں کے لیے روشنی ہیں اور امن کی روشن صبح ہیں آپؐ بے خیرالبشر ہیں۔ آپؐ پر میرا سلام

آپؐ رحمتہ اللعالمین ہیں' اولین بھی اور آخرین بھی۔ آپؐ صادق بھی ہیں اور امین بھی' آپؐ پر میرا سلام۔

آپؐ کا پیغام محبت ہے' اور آپؐ کی ہر بات سچی ہے اور قند سے زیادہ شیریں بھی' آپؐ پر میرا سلام۔

آپؐ دکھی لوگوں کا مداوا اور غریبوں کے دوست ہیں اور محبت کی روشن شمع۔ آپؐ پر میرا سلام۔

جب دنیا میں آپؐ کا ظہور ہوا' تو کسریٰ کے گھر صف ماتم بچھ گئی۔ کعبے کے بت چور چور ہو گئے۔ آپؐ پر میرا سلام۔

آپؐ نبیوں کے سردار اور خاتم المرسلین ہیں۔ آپؐ اپنی امت کے غمزار ہیں' آپؐ پر میرا سلام۔

آپؐ ایک طرف تو کردگار کے محبوب اور دوسری طرف کونین کے سردار ہیں۔ میری روح کے لیے قرار ہیں۔ آپؐ پر میرا سلام۔

پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ (۳۰) ضلع پشین کے گاؤں فیض آباد میں ۱۹۳۷ء میں عبدالرحمان صاحبزادہ(۳۱) (۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء ---- ۴ ستمبر ۱۴۰۰ھ / ۱۹۷۹ء آپ تفسیر' حدیث' فقہ' صرف و نحو عربی فارسی' منطق' ریاضی' حکمت' تجوید و قرات وغیرہ میں اچھی خاصی نظر اور مہارت رکھتے تھے۔ آپ علم کی پیاس بجھانے قندھار بھی گئے تھے۔ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ ساری زندگی ان کا شعار پرہیزگاری اور تقویٰ رہا۔ تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا تھا۔ ایک بہت اچھا کتب خانہ جس میں قلمی نسخے بھی ہیں یادگار کے طور پر موجود ہے) بن ملا محمد عظیم صاحبزادہ بن ملا رحمت اللہ اخوند بن ملا خوشحال اخوند (۳۲) (صاحب حال بزرگ) کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کاکڑ قبیلے کی ذیلی شاخ ترغرئی کی ذیلی شاخ احمد خیل اور پھر احمد خیل کی ذیلی شاخ حسن زئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم و تقویٰ کی بنا پر حسن زئی کے کچھ گھرانوں کو صاحبزادہ کا نام دیا گیا۔ جن میں ایک آپ کا خاندان بھی شامل ہے۔ صاحبزادہ حمیداللہ نے اردو' عربی' فارسی' اسلامیات' تاریخ اور سیاسیات میں ایم۔ اے کیا ہے۔ پہلے چار مضامین میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔

آپ کئی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ ساٹھ سے زائد مضامین پشتو میں اور بیس سے زائد

مضامین اخبار میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں مطبوعہ کتب کے علاوہ عربی، فارسی اور پشتو کے مخطوطات موجود ہیں۔ جن کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔(۳۳) آپ پشتو، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں شعر کہتے ہیں۔ آپ پشین کی ہی نہیں بلوچستان کی عظیم شخصیت ہیں۔ پشتو میں نعتیہ کلام موجود ہے۔ صاحبزادہ حمید اللہ کی ایک جدید نعت(۳۴) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو مسدس ترکیب کی صورت میں ہے:

یہی دن تھے اور یہی راتیں تھیں، یہی زمین اور یہی آسمان ۔
چاند کی یہی دمک تھی اور سورج اسی طرح درخشاں تھا
ثریا کی یہی خوبصورتی تھی اور یہی خوبصورت کہکشاں تھا
یہ بھاری بھر کم کوہستان نہایت متانت اور خاموشی سے کھڑا تھا
یہ چھوٹا جہاں تو درست تھا مگر بڑے جہان میں فساد برپا تھا
یہ چھوٹا جہاں تو یہ کائنات تھی اور بڑا جہان یہ چھوٹا انسان تھا

جفا کے زاغ نے وفا کے گلستان میں آشیانہ باندھ رکھا تھا
صفا کے گلستان میں تکدر تھا یا دغا تھی
کذب و جفا نے اخلاص کے بلبل کو گلستان سے نکال باہر کیا تھا
صداقت کے گلستان میں ریا کی کلیاں کھل گئی تھیں
صداقت، حق پرستی اور توحید تین ایسے نگینے تھے
جو معدن دنیا میں نہیں پائے جاتے تھے

انسان کے اندر ایک لوتھڑا تھا جس نے یہ فساد برپا کیا تھا
یہ بارش کا ایک قطرہ تھا جس نے حق کے سر کو توڑ کر بہا دیا تھا
ایک چھوٹی سی گرہ تھی جو نیکی کے پاؤں میں بیڑی بن گئی تھی
اندھیرے کے دیو کے پنجوں میں روشنی کی لاش تڑپ رہی تھی
ساحل کا یہی سکون تھا یہی بہار و خزاں تھی
ایک خطرہ انسانی دل تھا جس نے دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا

پھول پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور کلی ہنسنا بھول گئی تھی
راہ تاریک تھی اور منزل سخت تھی زبان بولنا بھول گئی تھی
بڑی عجیب کیفیت تھی ہنسی اور گریہ دونوں گم ہو گئے تھے
شرافت اور انسانیت ایک متاع بے بہا تھا، گم ہو گیا تھا
یہ زمان و مکان حیرت کی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے تھے
مریض کی حالت کچھ ایسی تھی کہ علاج سخت مشکل تھا

اچانک ایک روشنی پھوٹی جس نے بوقبیس کو روشن کر دیا
اس روشنی کی کرنیں جودی سے فاران تک پھیل گئیں
حق کا سورج طلوع ہوا جس نے دنیا کو روشن کر دیا

جب روشنی کا لشکر آیا تو باطل بھاگ نکلا
یہ ایک آسمانی بجلی تھی جس سے شیطان بھسم ہو گیا
یہ حق کی طرف سے ایک گرز تھا جس کی ہر ضرب بے امان تھی
قدرت کے خزانوں میں یہ وہی در یتیم تھا
جس کی چمک دمک وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی رہی
جس کا چرچا زمینوں اور آسمانوں میں ہوتا رہا تھا
جس کا دبدبہ قدرت کے بیانوں (کتب سماویہ) میں موجود تھا
آج اس ظلمت کدے میں وہ مسلسل ضیا پاشی کر رہا تھا
راکھ کے ڈھیر میں سے نکلا ہوا یہ لعل بدخشاں تھا
ربیع کی بارہویں تھی بہار کے ہر سو جھونکے آ رہے تھے
آج کائنات کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا ہر طرف چرچے سے تھے
عروس تاریخ نے کیا ہی خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے
کتاب حوادث میں کیا کیا شہ سرخیاں پڑی تھیں
آج انسانیت کا کاروان منزل پر پہنچنے والا تھا
اب انسان کی دلی آرزو بہت جلد ہی بر آنے والی تھی
یہ ایک بادل تھا جو آ کر برسا اور پیاسی زمین کو سیراب کر گیا
ایک خوشگوار چھاؤں تھی جس نے دھوپ کی تمازت کو ختم کر دیا
بیواؤں کے لیے ایک پناہ میسر ہوئی جس سے وہ سب خوش ہو گئیں
اس نے بدوں اور بدبینوں کا قلع قمع کر دیا
غریبوں اور غمزدوں اور یتیموں کے لیے ایک بڑا درمان تھا
یہ زندگی کے تاج کا ہیرا تھا اور تاریخ کے بنانے کا عنوان تھا
ہر شخص کو اپنی کھوئی ہوئی منزل مل گئی اور ہر ایک کو چین نصیب ہوا
اندھیرے اور گمراہی سے ہر شخص برکنار ہوا
ہر شخص کو اس نے اندھیرے کے خارزار سے نکالا
رحمت و نعمت کی بدلیاں گہر بار ہوئیں
اللہ کی قدرت کے قربان جاؤں اس کا کتنا فضل تھا
کہ انسان پر اس نے اتنا بڑا احسان کر دیا

ملا عبدالسلام اشیزئی (قاضی عبدالسلام بابا) ایک ممتاز عالم دین اور حق گو شاعر تھے(۳۵)۔ ۱۳۰۰ھ میں ضلع پشین کی تحصیل چمن کے مقام شیلا باغ سے پانچ میل شمال کی طرف شاخہ نامی گاؤں میں ملا حبش کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں وفات پائی اور گاؤں شاخہ کے اپنے آبائی قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

آخوندزادہ علامہ عبدالعلی اور ملا عبدالسلام اشیزئی کا شمار پشتو زبان کے ان صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے زور قلم سے اس علاقے میں تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی جدوجہد کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ملا عبدالسلام اشیزئی کے ایک پشتو شعر کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"میں تلوار اور خنجر اپنے آپ سے کبھی الگ نہیں کر سکتا کیونکہ میں انگریزوں کے شب خون کے لیے ہر وقت چوکنا بیٹھا ہوں۔"

آپ اپنے مجموعہ کلام "سوسن چمن" (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) میں کہتے ہیں:

"میں نے سوسن کے اوراق میں اپنے وطن کا دکھ رقم کر دیا ہے۔"

آپ کی پشتو نعت کا ترجمہ(۳۶)

مرحبا اے دلربا آ جا میں غلام ہوں اور آپؐ آقا ہیں۔
آپؐ کے روضے کی طرف سے آنے والی ہوا میری دوا ہے۔ جو آپ فرمائیں گے میں اسے مانوں گا۔

جب آپؐ کا ظہور ہوا تو وطن گلزار بن گیا۔ جب دشمن دور ہوا تو میرے دل کو قرار آیا۔ میں آپ کے انتظار میں مطمئن بیٹھا ہوا ہوں آئیں کہ آپ دلوں کی دوا ہیں آپ تخت رفعت ہیں بخت و دولت ہیں خیرالامت ہیں میں گدائے در ہوں۔ عرش آپ کی منزل اور عیش آپ کو حاصل ہے آپ کا کام مکمل ہے اور آپ محفل آرا ہیں آپ بدرالایمان ہیں۔ صدر احسان' کان عرفان اور رجم شیطان ہیں۔ آپ نور رحمان اور دوست یزدان ہیں۔ آپ میرے دل کی جراحت کا مرہم ہیں۔ آپ آیات حق اور فیض مطلق ہیں۔ ہر طبق پر محمدؐ احمدؐ ہیں۔ آپ دوست اکبر' سرو سرور دافع شر اور شاہ اسراہی ہیں (صاحب معراج) آپ سراج منیر بشیر و نذیر ذکر کثیر اور دلپذیر ہیں۔ میں بیچارہ حیران ہوں گریبان دریدہ ہوں' تشنہ لب ہوں اور آپ میرے رہنما ہیں۔ لولاک آپ کی کرامت کی نوید ہے۔ آپ کے سر پر تاج نبوت ہے۔ سلام سلام کہتا ہے اور سلام دوام کہتا ہے۔ آپ روز جزا میرے شافع ہیں۔

بلوچستان کے بعض جدید پشتون شعرا جنہوں نے آزاد فضاؤں میں آنکھیں کھولیں' کی تخلیقات کا اردو ترجمہ(۳۷) درج ذیل ہے:

سعید گوہر/ ریاض تسنیم

اپنے سکون کی خاطر رحمت کا اشارہ تو مانگتا ہے
میرا وجود اگر سمندر ہے' کنارہ تو مانگتا ہے

ایک بے رنگ موسم میرے حواس پر چھایا ہوا ہے
جمال سے یہ میری محروم آنکھیں نظارہ تو مانگتی ہیں

آنسو جلاؤ، چراغاں کرو، ماتم نہیں، رات تو چاہتی ہے کہ
ہم صبح ہونے سے بہت پہلے ہی مر جائیں

ایک دانشور نے نہایت طنز بھرے انداز میں مجھ سے کہا
یہ گرتا ہوا بوڑھا آسماں اب سہارا تو مانگتا ہے

ایک روپیہ جیب میں نہیں رکھتا۔ میرا معصوم بچہ
اور اگر کچھ نہیں مانگتا، چاکلیٹ یا غبارہ تو مانگتا ہے

دیکھو! میرا پیارا محبوب پھر میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے
گوہرا! وہ مجھے اپنے حجرے (بیٹھک) میں بلا تو رہا ہے

سید خیر محمد عارف / ریاض تسنیم

میں اور وہی میرا قتل، تنہا آیا ہوں تنہا جاؤں گا
میں کسی کے گلے کا ہار نہ بن سکا، تنہا آیا ہوں، تنہا جاؤں گا

یہ ویران جگہ، خالی جائے ملاقات، میرے دل میں کانٹے اگ آئے ہیں
میں پنگھٹ پر مزید نہیں روونگا، تنہا آیا ہوں، تنہا جاؤں گا

خداوندا! فراق ایک برس کا نہیں، صبر کا کشکول میرے ہاتھ سے گر چکا
کسی اور کو مجھ جیسا نہ کر، تنہا آیا ہوں تنہا جاؤں گا

بے بسی کی رات عروج پر ہے، نوید صبح کا امیدوار ہوں
کہیں چوڑیوں کی کھنک نہیں تنہا آیا ہوں تنہا جاؤں گا

الف کی طرح اکیلا میں مدتوں سے کسی کا راستہ تک رہا ہوں
تنہا دل، تہی پہلو، تنہا آیا ہوں تنہا جاؤں گا

محبت دکھاؤں یا اپنا دل، اس پر فریب دنیا کے بازار کو
نام و ننگ میرے پاس نہیں، تنہا آیا ہوں تنہا جاؤں گا

اگر مانو تو سب کچھ جھوٹ ہے عارف! نہ خلوص ہے نہ وفا
دل ہر چند دھڑکتا ہو، تنہا آیا ہوں تنہا جاؤں گا

درویش درانی/ ریاض تسنیم

میں ہوں۔ رات ہے۔ تنہائی ہے اور ادھورے ارمان
نہ تیرا خیال مجھے سونے دیتا ہے نہ یہ تھکے ہوئے ارمان

ہجر کڑوا ہے، صبر مشکل ہے۔ ناراضی کے لیے بڑا حوصلہ درکار ہے
اب تو بھی پشیماں ہو گا۔ میں بھی ارمان کر رہا ہوں

محل کی جبیں پر شکنیں کیوں ابھر آتی ہیں
جب کبھی خدائے برتر جھونپڑی کے ارمان پورے کرتا ہے

سرخ ہونٹوں کا وعدہ جھوٹا تھا۔ کالی آنکھوں کی دعوت فریب تھی
مگر سادہ دل ارمانوں کو یہ بات کون سمجھا سکے گا

زخمی زخمی آرزوئیں اور مرے مرے ارمان، دل کے اجڑے ہوئے
آنگن میں ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں

سید محمد گل محمد شاہ خوستی/ ریاض تسنیم

جسے میں نے جاگتے میں بھی دیکھا اور خواب میں بھی
اس سے میرا تعلق ثواب بھی تھا عذاب بھی تھا

نشے کا اثر اب بھی میرے دماغ پر ہے
اس کا عشق ساغر بھی تھا شراب بھی تھا

جو کبھی کبھی آ جاتا تھا وہ اب مجھے بھلا چکا ہے
کبھی کبھی جو دریا تھا وہ صحرا بھی تھا

اسے ہر چند میں اپنے قریب لایا
مگر اس شوخ کے اقرار میں انکار بھی تھا

وہ پتھر سے سخت تھا اور اس کا ضمیر تاریک تر تھا
جو حسن کے باب میں نکلا ہوا سورج بھی تھا

مجھ گل کو اس کی محبت نے جیتے جی ضائع کر دیا
ورنہ میرے ہاتھ میں قلم بھی تھا اور کتاب بھی تھی

عبدالغنی مبارز / ریاض تسنیم

گذر جائے گی مگر مرضی سے زندگی نہیں گذرتی
اس سے اچھی ہے بہت اچھی ہے پاگل کی زندگی

اے فراق! ایک میں ہی نہیں یہاں تیرے ہاتھوں
ہر آدمی کی زندگی تھکی ہاری' ریزہ ریزہ ہے

میرے محبوب: تیرے دروازے پہ میری معصوم آرزوئیں
بہت ہی ارمان کے ساتھ فریاد کناں ہیں کہ زندگی: زندگی:

میں زندگی کے ساتھ زندگی میں کچھ بھی نہ کر سکا
یوں ہی زندگی کو اسپند کی طرح دھواں دھواں کر دیا

لوگو! کسی کی نظر سے پھر بھی امید و بیم رکھتا ہوں
زخمی زخمی زندگی کو حوصلے کے ساتھ بتا رہا ہوں

پیارے! اب مجھے ڈر ہے اور نہ کسی سے ڈرتا ہوں
خدا کے فضل سے زندگی شباب پہ آئی ہوئی ہے

مبارز! میں اکیلا نہیں ہوں زندگی کے کئی غم
میرے ساتھ میرے مسکن میں زندگی بسر کر رہے ہیں

محمود ایاز / ریاض تسنیم

میں آیا اور میرے محبوب: واپس چلا گیا
میں تیرے اس دیار سے واپس چلا گیا

زندگی: میں جتنی تیزی کے ساتھ تیری طرف آیا تھا
اتنی ہی عجلت میں واپس چلا گیا

میں پھر ایک پژمردہ ارمان کی طرح مایوس ہوں
پیارے: تیرے دروازے سے میں واپس چلا گیا

اے رقیب: دو دلوں کو جدا کرنا تجھے زیب نہیں دیتا
ستم گر اے ستم گر! میں واپس چلا گیا

تو بھی ہوا کی طرح میرے اوپر تیزی سے گزر گیا
میں بھی بے خبری میں واپس چلا گیا

افضل شوق / ریاض تسنیم

کہیں کسی کی غریبی، کہیں شہر کی رسومات
کہیں تھکاوٹ، کہیں راستے کی رکاوٹیں

یہ اندھیرے مجھ اور تجھ کو ایک دوسرے سے گم کر دیں گے
کہاں چوری چھپے کی آشنائی، کہاں انتظار کی ساعتیں

محبت خلوص کے ترازو میں کیسے کم وزن نہ ہو گی
کہاں میری بے بسی، کہاں یار کے ظلم و ستم

شوق: دلکش بہار، جاگتے میں بھی خواب دیکھنے کی طرح
کہاں تبسم و مسرت، کہاں خوف کی سوچیں

شوق: دلکش بہار، جاگتے میں بھی خواب دیکھنے کی طرح
کہاں کاغذی خوبصورتی، کہاں ہار کے پھول

سہیل جعفر / ریاض تسنیم

بہت عرصے سے ہم دونوں ایک دوسرے سے بے خبر ہیں
ہم دونوں خلوص کے ساتھی نہیں صرف ہمسفر ہیں

نہ کہکشاں نہ قوس قزح نہ چاند کی طرح
میں اور چہرہ دونوں اجڑے ہوئے آنگن کا ایک منظر ہیں

سورج کی طرح تمہارا تعلق روشنیوں کے ساتھ ہے
ہم دونوں صرف دن ڈھلنے تک کے ساتھی ہیں

تو حالات سے خفا اور میں تجھ سے خفا
بخت زبوں! ہم دونوں عرصے سے در بدر ہیں

محبت کا نفع نہ میرے اور نہ دل کے نصیب میں ہے
اس ہنر میں ہم دونوں بے کمال و بے ہنر ہیں

ایک خوبصورت سی دلہن کی قیمت بہت ہی اونچی ہے
سہیل! میں اور میری زندگی دونوں سونے سے کم تر ہیں

بعض دوسرے پشتو شعراء کے کلام کے اردو تراجم (۳۸) ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ اے محبوب تیری آنکھیں شراب کی کٹوریاں ہیں اور تیرے لبوں میں پھولوں کی طرح خوشبو ہوتی ہے۔

۲۔ جب سے اپنے محبوب پر شیدا ہوں۔ اسی وجہ سے ہی آج دنیا میں رسوا ہوا ہوں

۳۔ کچھ علاج بھی اس دنیا میں نہ ہو سکے گا اس دل کا جو زلفوں کا اسیر ہو۔

۴۔ مال اور دولت کے نشے میں ڈوبے ہوئے تو موت کو بھول چکا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آخر تیرا کام یعنی انجام کیا ہو گا؟

(امین اللہ امین (۳۹)

۱۔ سرخ کپڑوں میں لپیٹ رہا ہوں اپنے نازنین یعنی معشوق کے لیے تعویذ اور شہد کی طرح بھیجوں گا اس حسین معشوق کو تعویذ۔

۲۔ رقیب کی نظر تیز ہوتی ہے اور میں وفا میں بدنام ہو گیا۔ ڈرتا ہوں اس لیے لکھتا ہوں حسین یعنی معشوق کے لیے تعویذ۔

تیرے بدن پر اور میرے دل پر گذر چکا ہے یہ درد اور پہلے سے کچھ نہ کچھ اور درد زیادہ ہوا ہے۔

خدا کے لیے آج تھکے ہوئے فقیر کو دکھ نہ دے' قسمت یہاں لائی ہے مجھے' دکھی ہوں اور دکھ نہ دے۔

محمد یونس آصف (۴۰)
عبدالرحیم حمزہ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو ضلع پشین کی کلی ذب خانزئی میں محمد الیاس ترین کے گھر پیدا ہوئے۔
آپ مزاحیہ شعر کہتے ہیں جیسے:

۱۔ کل تجھ پہ میں مغرور تھا اے جیب، آج تم کیسے خالی ہو میری جیب۔

۲۔ ہٹ جا سامنے سے یہ بس ہماری آ رہی ہے اور اپنی دھول سے تیز ہے۔ ہر شخص اس کو دیکھ کر حیران ہے۔

۳۔ جیسے کوئلہ اسی طرح چھاتی اندر سے کالی ہے کیونکہ پیتے جو ہیں نخروں سے یعنی سگریٹ کو۔

۴۔ چھوٹے بچے بھی نشوں کے عادی ہو گئے اس وجہ سے ان پر ہر وقت دھواں پھرتا رہتا ہے اور ضرور اسی وجہ سے اڈوں پر گھوم کر ٹوٹے جمع کرتے رہتے ہیں۔

مجیب الرحمٰن مجیب (۴۱) پشتو کے نامی گرامی شاعر اور ادیب حکیم مولوی عبدالخالق کے فرزند ہیں۔ آپ کا تعلق پانیزئی کاکڑ قبیلے سے ہے۔ مجیب یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو پشین کے گاؤں خانوزئی میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد ان کے والد کوئٹہ کی کلی مبارک ہدہ میں رہائش پذیر ہوئے۔
اپنے اس شعر میں جدائی کے متعلق کہتے ہوئے اپنے حال کے بارے میں کہتے ہیں۔
جدائی کے ہر عصر حالت نزع طاری ہوا اور پھر غم ہجراں کا رونا یوں روتے ہیں:

ہجراں کے زلزلے نے میرے دل کے گھر کو ویران کر دیا ہے، میرا ہر ارمان اور خواہش اس کے ملبے تلے دب گیا ہے۔ اس لیے میں چیخ چیخ کر روتا ہوں اور پھر اپنی شومئی قسمت اور ساقی کی بے رخی کے متعلق کہتے ہیں:

مجھ سے نفرت کی وجہ سے محبوب اپنے وصل اور دیدار سے جب رقیبوں کو نوازتے ہیں تو اس کی مثال یوں ہے کہ گندم کی وجہ سے کھیت میں اگی ہوئی زوز (ایک کانٹے دار جڑ بوٹی ہے) سیراب ہو جاتی ہے۔

غلام محمد غلام (۴۲) ۱۹۵۲ء میں نظر محمد خان کے گھر چمن پھاٹک کالونی میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں ان کے والد کی ملازمت (محکمہ مال) کوئٹہ میں تھی۔ آپ کا تعلق ترین قبیلہ کی بیکل زئی شاخ سے ہے۔ آپ پشتو کے متعدد مشاعروں میں حصہ لے چکے ہیں۔ آپ کا مستقبل روشن ہے۔ چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

غلام تو حسن کی قید میں بند ہو چکا ہے اور اب کسی پرندے کی طرح اس پنجرے میں گھومتا رہ۔

زندگی کے دن راتوں رات گذار رہا ہوں لیکن ہائے قسمت کب سویرا ہوگا

غلام کے دل کو یہ حوصلہ ہے اور امید ہے آ جائے وہ وقت جبکہ میں اپنے محبوب کا خیرمقدم کروں گا۔

اگر میں نے ساقی کی پیشانی اور اس کے کھٹے پن کو محسوس کیا تو اپنے لئے ایک الگ میخانہ بناؤں گا۔

میں تو خوشی کے خریدنے کے لیے آیا تھا۔ لیکن بے درد نے مجھے غم تول کر دے دیا۔

ڈاکٹر آخوندزادہ صلاح الدین صلاح (۴۳) (یکم فروری ۱۹۵۴ء --- ۱۳ اپریل ۱۹۸۸ء) آخوندزادہ نصیرالحق کے فرزند' اردو' فارسی اور پشتو کے مشہور شاعر عبدالحق زیور(۴۴) کے بھتیجے اور علامہ عبدالعلی(۴۵) آخوندزادہ (۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء --- ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء' مشہور عالم و فاضل' اچھے طبیب' فارسی اور پشتو کے نامور شاعر' سابقہ ریاست قلات کے وزیر تعلیم اور قاضی القضاۃ تحریک پاکستان کے نامی گرامی رہنما اور کئی کتابوں کے مصنف و مولف) کے پوتے(۴۶) ضلع پشین کے مشہور مقام خانوزئی کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق پانیزئی کاکڑ قبیلے سے ہے۔ ڈاکٹر (ایم بی بی ایس) صلاح مرحوم کے چند پشتو اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

عشق حقیقی دنیا ہی میں باہمت لوگوں کا شیوہ اور خصلت رہا ہے۔ جو حقیقی عشق میں مبتلا نہیں اس کی مثال یوں ہے کہ اس کا کوئی محبوب تھیں اور کوئی یار نہیں۔

خداوند قدوس مومن کے پاک اور صاف دل کو پسند فرماتے ہیں جن کے دل کوئلے کی مانند سیاہ ہوں وہ کیا کر سکیں گے۔

اے محبوب مجھے اپنے دیدار سے نواز کیونکہ میں دیدار کے لیے مجبور ہوں' جس کی وجہ یہ ہے کہ میں تیری جدائی کے غم میں بیمار ہوں اور رنجیدہ ہوں۔

اپنے گریبان کو خود سیاہ کر کے پھاڑ دوں گا اور اپنے رنج و الم سے سارے عالم کو آگاہ کروں گا۔

اگر میں نے تجھے اپنا نہ بنایا تو اپنے گریباں کو سیاہ کر دوں گا اور ساری دنیا کو اپنے دل کی آگ دکھا دوں گا۔

ڈاکٹر بی ڈی ایس)(۴۷) صاحبزادہ کلیم اللہ صدام فرزند صاحبزادہ عبدالرحمٰن آغا(۴۸) ضلع پشین کے پشین شہر سے ملحق کلی فیض آباد میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ پروفیسر صاحبزادہ حمیداللہ کے چھوٹے بھائی ہیں جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں کوئٹہ سے روزنامہ جنگ' کا اجراء ہوا تھا۔ آپ غالباً" وہ پہلے پشتون نثرنگار ہیں جنہوں نے اردو میں کم و بیش چالیس مضامین پاکستان کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے۔ مثلاً اولس پشتو کوئٹہ' ہفت روزہ ہیواد پشتو کوئٹہ' انجمن ترقی پشتو میگزین' پاکستان ادب سورج (ڈائجسٹ) نئی قدریں' پشتو میگزین پشاور' قند مردان' اباسین' ابن سینا' لیاقت میگزین اور بولان مجلہ کوئٹہ وغیرہ

آپ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ آپ کی کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ آپ اردو اور پشتو کے معروف شاعر ہیں۔ پشتو کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

مجھے کالی زلفوں کے ہر ایک تار نے اسیر کر دیا ہے اور دلبر مجھے کالی زلفوں کے سانپ نے کاٹا ہے۔

کلیم زندگی کی مثال ہوا کی طرح ہے کبھی پیچھے ہٹ کر نہیں دیکھتی آگے چلتی ہے۔

دل کے دشت میں غموں کے قافلے آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں صدموں کے کچھ قافلے روانہ ہو چکے ہیں اور کچھ رخت سفر باندھ رہے ہیں۔

آنسوؤں کے جنازے بھوؤں کے کندھوں پر دیکھ رہا ہوں آنکھوں کی موت نے میرے

ان چھپے ہوئے آنسوؤں کو باہر نکال کر چھوڑا ہے۔
ستاروں کے جھرمٹ کی طرح محبوب کی ناک منہ اور آنکھیں ایک چمک رہی ہیں۔
تیرے حسن کے پرستاروں کا جھرمٹ بھی انگشت بہ دندان ہے۔
فکر کی کنگھی میری زندگی کے آڑے بالوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ میری
فکر کی جوان صبح اس پھیلنے سحر کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔
فلسطینی اور لبنانی دوشیزاؤں کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:
ہمیشہ زندہ رہیں گی دنیا میں وہ لڑکیاں جو آگے چلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دنیا میں ان
لڑکیوں کو کوئی بھی نہیں مار سکتا۔

راز محمد راز یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو ملک حاجی محمد دین ترین کے ہاں پیدا ہوئے'(۴۹) آپ تاریخ کے لیکچرار ہیں۔ آپ کی ایک غزل کا اردو ترجمہ اور تشریح کچھ یوں ہے:

خداوند زندگی' زیست کی یہ ساری گلیاں کیوں ماتم کناں ہیں۔ ان روتی گلیوں میں ہم روتے وجود کے ساتھ کیوں کر خوش و خرم زندگی گزار سکتے ہیں۔ خداوند طرب' اگرچہ تو نے میرے غم سے پتھرائے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کر بھی دی تو کیا ہے کیونکہ ابھی تک میرے بہت سارے آنسو تجھ پر بصورت قرض باقی ہیں۔

زندگی کی تمام راہوں کے مالک خدا' وہ لڑکی جو میری روح حیات ہے اپنا چہرہ لے کر عشق کی افق پر مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ اور چہرے کی تابندگی نے میری تمام راہیں روشن کر دی ہیں۔

خدائے احساس' اس کی ریشمی عنبریں زلفیں' میرے پہلو کے نیچے دبی ہوئی ہیں۔ یہ میرے لیے معراج زندگی ہے۔ میرے اس خوبصورت احساس اور طرب کو دائمی صورت عطا کرنے کے لیے مجھے موت کی خوبصورت وادیوں میں سے لے کر گزر جا تاکہ یہ احساس پھر کبھی فنا نہ ہو میری تجھ سے یہ آخری دعا ہے۔

میری خشک آنکھوں کے اندر روتے آنسو میرے وجود میں قطرہ قطرہ بحر کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ میں جلد ہی اپنے انہی آنسوؤں میں ڈوب کر رہ جاؤں گا۔ اس کی تند و تیز اونچی لہریں جلد ہی میرے سر سے گزر کر میری زندگی کا خاتمہ کر دیں گی اور میں اپنے ہی آنسوؤں کے آبی تابوت میں ایک اور زندگی کے لیے محفوظ ہو جاؤں گا۔

عبدالباری اسیر(۵۰) کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ ان کے مزید اشعار کا ترجمہ دیکھئے:

میں فولادی عزم' مضبوط دل اور بلند حوصلے رکھتا ہوں۔ مجھے بھلا تو ہمت کی کیا دعوت دیتا ہے۔

دل کو دل سے کیسے راہ پیدا ہو سکے گی۔ جب تک ایک انسان دوسرے کی زبان نہ سمجھ پائے۔

جب میں اسیر تیرے حسن کے آئینے کو دیکھتا ہوں تو پھر مجھے باقی دنیا نظر نہیں آتی اس

لیے تو اپنے رخ زیبا کا چراغ جلائے رکھو۔ موت نے ان نازنینوں کو بھی ابدی نیند سلا دیا جن کے ہونٹ ہر وقت ناز و تفخر سے گلابی ہوتے تھے۔

سید عابد شاہ عابد ۱۴ اگست ۱۹۴۳ء کو سید یار محمد شاہ کے ہاں کوئٹہ شہر میں پیدا ہوئے۔(۵۱) آپ کا تعلق بخاری سید اسماعیل زئی کی ذیلی شاخ تور خیل سے ہے۔ آپ ایم اے (پشتو' اردو) اور پشتو آنرز ہیں۔ بلوچستان یونیورسٹی کے پاکستان سٹڈیز میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ آپ نے اردو شاعری کا آغاز ۱۹۵۶ء میں اور پشتو شاعری کا ۱۹۵۹ء میں کیا۔ تین کتابوں کے مولف اور مترجم ہیں۔ بلوچستان پشتو اکیڈمی کوئٹہ کے صدر رہے ہیں۔ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ پشتو اور اردو میں بہت خوبصورت شعر کہتے ہیں۔ نت نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ اردو اور پشتو کے ایسے تجربہ کار شاعر و ادیب ہیں جنہوں نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی ایک پشتو غزل کا اردو ترجمہ انہی سے ملاحظہ فرمایئے۔

شہر کی یہ ویراں گلیاں' میں تنہا ہوں دل تنہا
ہر دھڑکن آزار جاں' میں تنہا ہوں دل تنہا
پیاس کی شدت مت پوچھو مجھ کو پیاس محبت کی!
اک اک لہر میں سو طوفاں' میں تنہا ہوں دل تنہا
کتنے پھول مہکتے ہیں دل میں داغوں کی صورت
آگ بنا ابر باراں' میں تنہا ہوں دل تنہا
اک اک موڑ پہ ہستی کے جب جب میں نے ہاتھ بڑھائے
سایا نکلا ہر داماں' میں تنہا ہوں دل تنہا
شہر وفا کا ہر در بند اور ان پر صدیوں کی دھول
دھڑکن دھڑکن وہم گماں' میں تنہا ہوں دل تنہا
جو بھی شخص ادھر آیا سنگ بہ دست نظر آیا
شہر کے مجھ پر یہ احساں' میں تنہا ہوں دل تنہا

دوسری غزل کے چار شعر یہ ہیں:

رسم گریہ بھی اٹھا دی ہم نے — آگ پانی میں لگا دی ہم نے
ہم نے کیا کیا نہ ستم خود پہ کیے — تجھ کو کیا کیا نہ دعا دی ہم نے
تیری فرقت میں دل محزوں کو — نت نئے غم کی سزا دی ہم نے
جان کا جزو بنا کر اے دوست — درد کی قدر بڑھا دی ہم نے

نام رب نواز اور تخلص مائل'(۵۲) ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو لورالائی شہر میں بہادر نواز کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے اردو میں ایم۔ اے (فرسٹ ڈویژن) سے پاس کیا۔ آج کل گورنمنٹ کالج دکی (ضلع لورالائی) کے پرنسپل ہیں۔

پروفیسر رب نواز مائل پشتو اور اردو کے نامور شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ اپنے انفرادی لہجے اور رنگ کے باعث ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام کے مالک ہیں۔ انہوں نے نت نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ انہوں نے

پشتو ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور بہت کچھ دے رہے ہیں...... ان کے شعر و شاعری میں متعدد شاگرد بھی ہیں۔ ان میں افضل شوق اور شفیق احمد بدر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی دو پشتو غزلوں کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

وخت چی مینی غوندی شے هم لی اثر کہ
دغہ شپہ دشپو بہ څوک نوے سحر کہ

رب نواز مائل / ترجمہ: سعید گوہر

۱۔ وقت محبت جیسی شے کو بھی بے اثر کر دیتا ہے
رات‌وں کی اس رات کو کون نئی صبح میں بدلے گا

۲۔ جیسے میں نہیں، وہ خود میری ذات میں ہے
ایک شخص کچھ یوں بھی مجھ پر نظر کرتا ہے

۳۔ زندگی کے پہلے دن سے موت تک
یہ میں نہیں، زمانے خود سفر کرتے ہیں

۴۔ اے گل چہرہ یار! جب ستاروں کی روشنی بھی تو ہے
اب بے شک تو میرے وجود پر حکمرانی کر

۵۔ اتحاد اگر زندگی کا استناد بن جائے
کون کام اور غم دل، سب برابر کرے گا

۶۔ مائل، چاہے وہ اونچے پہاڑوں کے رہنے والے ہوں
زمانے کے بزدلوں کو کون مرد بنا سکے گا

چی ختمیږی نہ خرصی قیصہ دائم
زمہ پہ تکیو کنی کہ حال ددی زرهٔ دائم

رب نواز مائل / ترجمہ: سعید گوہر

۱۔ جو اختتام تک نہیں پہنچتا، میں ایک ایسا قصہ کہہ رہا ہوں
اگر میں حروف میں اس دل کا حال بیان کر رہا ہوں

۲۔ ان آنکھوں کے علاوہ بھی اس میں کچھ ہے
حق ہے اگر میں تمہارے چہرے کو گلاب کہہ رہا ہوں

۳۔ غبار سے، اشخاص سے، سورجوں سے
کچھ میرے پیچھے بھی آئیں گے، اگر کچھ کہہ رہا ہوں

۴۔ اے نکتہ چینو! انصاف کرو! ادب پرستو!
میں یہ کہتا ہوں کہ تم نے مجھے بے خطا قتل کیا ہے

۵۔ دامن وصال مجھے تنگ دکھائی دیا
اس کے بعد میں فراق کو سب کچھ کہوں گا

۶۔ جو ہمیشہ ظالموں کی گردنیں توڑتے ہیں
میں یہ کہتا ہوں کہ وہ ہر دور کے بہادر لوگ ہیں

پروفیسر صاحبزادہ حمیداللہ کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ ان کی دو پشتو غزلوں کا اردو ترجمہ پیش قارئین ہے:

(۱)

۱۔ جب عشق کا ماجرا ظاہر ہوا تو حسن کی دوشیزہ گریہ کناں ہوئی۔

۲۔ عشق کہاں یہ گوارا کر سکتا تھا کہ حسن آرام سے رہے۔ بس وہیں سے یہ سلسلہ محبت شروع ہوا۔

۳۔ جب شاعری کی زبان گنگ ہو گئی تو موسیقی کی زبان نے باتیں شروع کر دیں۔

۴۔ اس کی پلکیں آسمان کی طرف اٹھیں اور یوں آدھی دنیا کی ویرانی کا سامان کر گئیں۔

۵۔ آنکھوں کی زبان نے ایسی باتیں کیں کہ منہ کے اندر کی زبان حیران ہو کر رہ گئی۔

۶۔ سفید بالوں کا ظہور رات کا صبح ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب غفلت کی خانہ ویرانی ہو گئی۔

۷۔ جب اس نے مجھے دیکھ کر نظر چرائی تو اسی سے عاشقی کی شرح بیان ہو گئی یعنی یہ محبت کی ابتداء ہے۔

۸۔ عشق نے اپنا مقدمہ اس قدر زوردار استدلال سے پیش کیا کہ اہل حسن کا گروہ پریشان ہو کر رہ گیا۔

۹۔ محبت اس قدر مظلوم و مجبور تھی کہ حسن کی دنیا اس پر مہربان ہو گئی۔

۱۰۔ جب بادل بڑے بڑے آنسوؤں سے رویا تو تب شگوفے کے لبوں پر ہنسی پھیل گئی۔

۱۱۔ حمیداللہ نے تو یہ زندگی تمہارے لیے چھوڑ دی۔ اب دیکھوں کہ موت کا خانہ کیسے آباد ہوتا ہے!

(۲)

۱۔ جب کچھ نہ تھا تو بھی تو تھا اور جب کچھ نہ ہوگا تو بھی تو رہے گا۔ انسان تو یہاں پر مہمان ہے اور اے مہمان! تو اتنا مغرور کیوں ہے؟

۲۔ میں گناہ پر گناہ کیے جا رہا ہوں اور تیری طرف سے مغفرت پر مغفرت ہے۔ تو وہ کر جو تجھے زیب دیتا ہے اور میں وہ کرتا رہوں گا جو میں کیا کرتا ہوں یعنی اے خدا بندہ تو گناہ کرتا ہے اور تو اسے معاف کرتا ہے۔

۳۔ اگر میں موج سے کہیں بچ گیا تو ساحل مجھے غرقاب کر دے گا۔ اے بحر! یہ تو تیرے گھر کی بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟

۴۔ (محبت) اتنی مشکل بھی تو نہیں ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ محبت تو تھوڑی ہے مگر اے دل! یہ سارا کھڑاک تیرا ہی لگتا ہے۔

۵۔ جب سونا کان سے نکلتا ہے تب قیمتی ٹھہرتا ہے۔ مگر اے عشق! تو جس قدر دل کے اندر چھپا ہوا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی قیمتی ہوتا ہے۔

۶۔ اصل چیز تو مقصد و مرام ہے چاہے آگ ہو چاہے پانی ہو۔ اے نمرود! تو خلیلؑ کے بلند مقام سے کہاں واقف ہے؟ (تو نے انہیں آگ میں ڈال کر غلط سوچا تھا کہ وہ تیری بات مان لیں گے)

۷۔ میں نے تو ہجر و فراق کے گھپ اندھیرے میں اپنے آنسوؤں کا دیا بنا کر کام نکالا اور تیرا (اے مخاطب) یہ حال ہے کہ دن دہاڑے آنکھیں موند کر بیٹھا ہوا ہے لہٰذا مجھ میں اور تجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

۸۔ اے حمیداللہ! ٹوٹی کشتی نے سمندر کو بدنام کر دیا۔ اے تقدیر! بدنامی تیرے حصے میں آئی۔ چاہے تیرا قصور ہو چاہے نہ ہو۔ یعنی لوگ اپنے ہر نقصان اور غلطی کو تقدیر کی خرابی گردانتے ہیں۔

علامہ اقبال کے افکار اور ان کا مکمل کلام تراجم کے ذریعے پشتونوں تک پہنچ چکا ہے۔(۵۳) اور پھر خود علامہ صاحب کو پشتونوں سے جو علاقہ رہا ہے وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں محراب گل افغان کے افکار' جمال الدین افغانی' نادر شاہ ابدالی' خوشحال خاں کی وصیت اور علامہ صاحب کی یہ مشہور نظم' اپنی خودی پہچان اور غافل افغان' پیش کی جا سکتی ہیں۔

پشتو ادب پر علامہ اقبال کے جو نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا اندازہ ہم موجودہ صدی کی پشتو شاعری اور ادب سے کر سکتے ہیں۔ بلوچستان کے پشتو گو شعراء اور ادبا بھی متاثر ہوئے ہیں۔ جیسے سلطان محمد صابر (پشتو ادب کا جانا پہچانا نام) نے پیر رومی اور مرید ہندی کے اثر کے تحت ایک نظم "عالم بالا میں" تحریر کی ہے۔ جو جمال الدین افغانی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن محمودی کے مابین ایک مکالمہ ہے۔

سعید گوہر نے علامہ اقبال کی کئی نظموں کا پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ فکر اقبال سے بھی اثر پذیر ہوئے ہیں۔ اردو اور پشتو کے نامور شاعر اور ادیب سید عابد شاہ عابد بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ وہ اقبال کے حضور گویا ہوتے ہیں:

تجھ کو دیکھا تو خود کو بھول گیا — کس مصور کا شاہکار ہے تو
حسن تخلیق لازوال سہی — ہر بلندی سے ہمکنار ہے تو
فلسفہ ہے رموز انسانی — جس طرح روشنی چراغوں میں
فلسفہ آرزوئے جہد جمال — مئے چھلکتی ہوئی ایاغوں میں
یہ مغنی ہے کائنات جمال
ساری دنیا جسے کہے اقبال

اردو اور پشتو کے معروف لکھاری فضل احمد غازی نے ایک پمفلٹ بعنوان اقبال اور پشتون (۲۱

صفحات) چھپوایا تھا۔ وہ اپنے مضمون "عظیم اقبال کا ثقافتی نظریہ" (۵۴) میں لکھتے ہیں: علامہ اقبال کے مطالعہ سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہم سب اسلام کے وسیع دامن میں پروان چڑھے ہیں۔ جس کی حیثیت رنگا رنگ ثقافتوں کے سرچشمے کی ہے۔ اقبال نے شعری ثقافت کے ناطے عظیم الشان اسلامی تحریک کو اس قدر زبردست قوت عطا کی ہے کہ ہم اپنے سے کئی گنا دو بڑی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ اقبال کا کارنامہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں وہ شعور، قوت، عظمت اور جلال پیدا ہوا جس کے سامنے اکثریت مغلوب ہو کر رہ گئی"

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں پشتو کے شعرا کی قومی نظمیں(۵۵) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں وطن کے تحفظ کا جذبہ بھی بیدار کرتے ہیں۔ سید محمد رسول فریادی اپنی ایک نظم "پاک وطن کے جوانوں سے خطاب" میں گویا ہوتے ہیں:

اپنی چمکدار تلوار سے ملک میں وحدت کا نام پیدا کرو
اٹھو مسلمانو اور اس جہان میں اپنا نام پیدا کرو
قوم تمہارے ساتھ ہے۔ اس کی مدد سے اپنی
ماضی کی عظمت کو دھراؤ، جاگو اوردنیا پراپنانام ثبت کرلو
اپنی کھوئی ہوئی خودی کو حاصل کرو۔ اتفاق اوراتحاد کی رسی کو
مضبوطی سے تھامے رہواورہمت سے کام لے کرقوم وطن کی خدمت کرو

سید محمد رسول فریادی کی ایک اور نظم کا ترجمہ یہ ہے:

جانثار وطن پر سر قربان کرنے اور نوجوان قوم کو خواب گراں سے بیدار کرنے کا
فریضہ انجام دیتے ہیں۔
اور وطن کے سرفروش اپنی قربانیوں سے وطن کا نام بلند کرتے ہیں۔

سید خیر محمد عارف "لیلائے آزادی" سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

میں نے اپنے خیال کی زلف پر نازک نازک پھول سجائے ہیں۔ تمہارے نازک ہونٹ
مسکراہٹوں سے لبریز ہیں۔ تم سرتاپا محبت کی علامت ہو۔
تم اپنی حسین زلفوں سے اپنے چاہنے والوں کو لبھا رہی ہو
اگر کسی نے تمہاری عزت پر بری نظرڈالی تو تمہاری عصمت کی پاک چادر کی قسم
میں اس کا سر قلم کر کے ہی دم لوں گا
اور میں اسے ذلت اور رسوائیوں سے ہمکنار کر دوں گا تم آزادی کی لیلیٰ ہو
تمہارے لیے میں اپنی جان قربان کر دوں گا
تمہاری عظمت کے سائے تلے ہی میں اپنی زندگی گزارنا پسند کرتا ہوں۔

عبدالرحیم بریالیے اپنی نظم "وطن کی مٹی سے خطاب" میں کہتے ہیں:

میں وہ جوہر ہوں جو تجھ سے پیدا ہوا
اگر دنیا مجھے پہچانتی ہے
تو وہ بھی صرف تیری ہی بدولت
میں نے تیرے طفیل سورج کی طرح دنیا میں روشنی پھیلائی ہے۔

میں تیری عزت اور ناموس کے لیے
اپنا سر قربان کر دوں گا۔
میں وہ بہادر ہوں جو اپنی قوت کے بل بوتے پر تیری
حفاظت کروں گا۔ میں تیرے نام پر قربان ہو جاؤں گا۔
کیونکہ میں تجھ پر قربان ہو کر ہی خوش و خرم رہ سکتا ہوں۔

عمر گل عسکر "ہم ایک آزاد وطن کے مالک ہیں" کے تحت اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

میں ایک شاعر ہوں
میں حساس دل کا مالک ہوں لوگو
میں وطن کی لذت سے آشنا ہوں
اور اس کی قدر و قیمت سے باخبر ہوں اے لوگو
اس لیے میں ہر غم اور ہر کفر سے بے نیاز ہوں اے لوگو
میں ایک آزاد وطن کا رہنے والا ہوں
اس لیے میں ہر دکھ اور ہر غم سے بالاتر ہوں
میں ایک شاعر ہوں
میں حساس دل کا مالک ہوں اے لوگو

سرور سودائی اپنے سینے میں ایک عزم جواں رکھتے ہیں۔ وطن دوستی کے جذبات کی اس طرح عکاسی کرتے ہیں:

اے خدا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمیں اپنا
آزاد وطن عطا کیا ہے۔ اس وطن کی صورت میں تو نے ہمیں
رنگا رنگ پھولوں سے بھرا ایک گلشن بخشا ہے۔

پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ کی وطن دوستی کی جھلکیاں ان کے کلام میں جابجا ملتی ہیں جیسے:

اے وطن عزیز! مجھے تیرے دشت و جبل بھی عزیز ہیں اور تیرے خار و گل بھی مجھے
جان سے زیادہ پیارے ہیں۔

ایک اور نوجوان شاعر سعید گوہر کے سینے میں پاک وطن کی محبت کے جذبات یوں موجزن ہیں:

میرے سینے میں وطن کی محبت کے جذبات موجزن ہیں اور میرے دل میں اس کے لیے
پاکیزہ احساسات کا طوفان برپا ہے۔ میں اس سرزمین پر ثریا کے قدموں کی گرد کا
متلاشی ہوں۔ کیونکہ میری سوچ کی رفعت آسمان کی بلندیوں سے بھی زیادہ بلند ہے۔

تاسیس پاکستان کے بعد بلوچستان میں پشتو کے متعدد شعراء کی تخلیقات کے اردو تراجم پیش کئے گئے۔
ان کے مطالعہ کے بعد یہ بات ابھرتی ہے کہ یہاں کے ان شعرا نے ایک جانب بھرپور انداز میں ملی شاعری کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف قومی شاعری کے ساتھ ساتھ آپ بیتی (جو بعد میں جگ بیتی بنتی ہے) میں بھی گلہائے رنگ رنگ صفحہ قرطاس پر بکھیرے ہیں۔ یوں یہ قافلہ رنگ و بو اپنی توانائیوں اور تابانیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس میں روز بروز بیش از قیمت اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔۔

اہل جنوں کا کرتے ہیں کانٹے بھی احترام
ہر گام پر بچھاتے ہیں سر عاجزی کے ساتھ

حواشی

۱۔ "ر فتا لک ذکرک" پشتو نعت گوئی۔ ایک جائزہ' سید عابد شاہ عابد' قلم قبیلہ' کراچی' ۱۹۸۸ء ص ۳۰
۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' لاہور ۱۹۸۳ء ص ۲۲۶' ۲۱۸' ۲۱۹
۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۵۳ تا ۲۵۵
۴۔ ثقافت اور ادب وادی بولان میں' کوئٹہ' ۱۹۹۲ء ص ۳۶ تا ۳۸
۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۲۰' ۲۲۱
۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں ص ۲۲۳ تا ۲۲۴
۷۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۲۵ تا ۲۲۷
۸۔ روشن اگتے ہاتھ' عبد الباری اسیر' کوئٹہ ۱۹۹۱ء ص ۵۲۰ تا ۵۲۲
۹۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۲۹' ۲۳۰
۱۰۔ روشن اگتے ہاتھ' عبد الباری اسیر' کوئٹہ' ۱۹۹۱ء ص ۵۰۲' ۵۰۳
۱۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' لاہور' ۱۹۸۳ء ص ۲۳۱' ۲۳۲
۱۲۔ روشن اگتے ہاتھ' عبد الباری اسیر' کوئٹہ' ۱۹۹۱ء ص ۵۴۳ تا ۵۴۵
۱۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' کوئٹہ' ۱۹۸۳ء ص ۲۳۳' ۲۳۴
۱۴۔ روشن اگتے ہاتھ' ص ۵۳۳ تا ۵۳۶
۱۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۳۸' ۲۳۹
۱۶۔ روشن اگتے ہاتھ' ص ۳۴۶ تا ۳۴۸
۱۷۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۳۵ تا ۲۳۷
۱۸۔ روشن اگتے ہاتھ' ص ۵۶۴ تا ۵۶۸
۱۹۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۳۹' ۲۴۰
۲۰۔ روشن اگتے ہاتھ' ص ۵۱۵' ۵۱۶
۲۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں ص ۲۴۱
۲۲۔ روشن اگتے ہاتھ' ص ۴۹۷ تا ۵۰۱
۲۳۔ نبی کریم صلی اللہ عیلہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۴۳
۲۴۔ روشن اگتے ہاتھ' عبد الباری اسیر' کوئٹہ ۱۹۹۱ء ص ۴۸۹ تا ۴۹۳
۲۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' لاہور ۱۹۸۳ء ص ۲۴۵' ۲۴۶
۲۶۔ بلوچستان میں اردو' ڈاکٹر انعام الحق کوثر' راولپنڈی' ۱۹۸۶ء (دوسرا ایڈیشن) ص ۲۷۷
۲۷۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ص ۲۴۷' ۲۴۸' ۲۵۰' ۲۵۱
۲۸۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں' ۲۴۸' ۲۴۹
۲۹۔ ایضاً ص ۲۵۲
۳۰۔ روشن اگتے ہاتھ' عبد الباری اسیر' کوئٹہ ۱۹۹۱ء ص ۵۷۶ تا ۵۸۰

۳۱۔ تذکرہ صوفیائے بلوچستان، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور، ۱۹۸۶ء (دوسرا ایڈیشن) ص ۲۴۳

۳۲۔ ایضاً" ص ۹۷، ۹۸

۳۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۵

۳۴۔ پشتو میں سیرت نگاری، پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ، کوئٹہ، ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء ص ۱۲۹ تا ۱۹۶

۳۵۔ روشن اگتے ہاتھ، عبد الباری اسیر، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء ص ۵۸۸ تا ۵۹۳

گلزمین، سید عابد رضوی، کوئٹہ، ۱۹۷۸ء ص ۱۷ تا ۱۹

۳۶۔ پشتو میں سیرت نگاری، پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ، کوئٹہ، ۱۹۸۷ء ص ۵۲، ۵۳

۳۷۔ بشکریہ کراچی کے جواں سال پشتو اردو شاعر ریاض تسنیم / سعید گوہر

۳۸۔ روشن اگتے ہاتھ، عبد الباری اسیر، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء ص ۵۷، ۳۳۸، ۳۷۲

۳۹۔ امین اللہ امین عبد الخالق کے گھر میں ۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو گاؤں فیروزی کانز مسلم باغ ضلع ژوب میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ہتوزئی، غازی زئی، مسترزئی، ہارون خیل، سنیا کاکڑ قبیلے سے ہے۔

۴۰۔ ۱۹۵۵ء میں سرانان ضلع پشین میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی عبد الخالق اور کاکڑ سنزر خیل کی ذیلی شاخ پائیزئی، سے متعلق ہیں۔ آصف قلعہ سیف اللہ کے مشہور ہوٹل کے مالک، نہایت سنجیدہ اور خوش اخلاق نوجوان ہیں۔

۴۱۔ روشن اگتے ہاتھ، عبد الباری اسیر، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء ص ۳۸۷ تا ۳۸۹

۴۲۔ ایضاً" ص ۴۰۵ تا ۴۰۸

۴۳۔ روشن اگتے ہاتھ، عبد الباری اسیر، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء ص ۴۱۳ تا ۴۱۹

۴۴۔ بلوچستان میں اردو، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، راولپنڈی، ۱۹۸۶ء ص ۳۶۰ تا ۳۶۳

۴۵۔ بلوچستان میں فارسی شاعری، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء ص ۲۰۳ تا ۲۰۸

۴۶۔ قاضی عیسیٰ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "میرے ہاتھوں پہلا شخص جس نے بلوچستان میں مسلم لیگ کی ممبری قبول کی وہ مرحوم اخوندزادہ عبد العلی خان تھے۔ علاوہ ازیں جدوجہد میں نے جو دورہ میں مسلم لیگ کے قیام کے لئے کیا مرحوم اخوندزادہ نے میرا ساتھ دیا"۔۔۔۔ علامہ عبد العلی نے مسلم لیگ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا: "مسلم لیگ اتفاق و اتحاد کی علامت ہے اور اس لحاظ سے یہ جماعت ہمارا دین اور ہمارا ایمان ہے۔"

جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار، ڈاکٹر انعام الحق کوثر لاہور، ۱۹۹۱ء ص ۲۵ علاوہ عبد العلی کی ایک بہترین پشتو نعت کے چند شعر کا ترجمہ یہ ہے: "ان کا لقب سید المرسلین ہے ان کے نام پر مکرر صلوٰۃ ہو۔ ان کے چہار یار دین کے چار ستون ہیں ان میں سے ہر ایک شرع انور کا ستارا ہے۔ اے نبی البرایا! آپ پر درود و سلام ہو آپ پر درود و سلام ہو اور اے شفیع محشر آپ پر سلام ہو۔۔۔۔"

آپ کے ایک شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ "میرے وطن کا ہر کانٹا میرے لئے پھول کی طرح نرم و نازک ہے۔ لیکن اس کا ہر پھول وطن دشمنوں کے لئے خار زار کی مانند ہے۔"

دو اور شعروں کا ترجمہ: (۱) اے معشوق! اگر تیرا حسن و جمال جنت کی حوریں خواب میں بھی دیکھ لیں تو ان کے لئے جنت میں رہنا دو بھر ہو جائے اور وہ دنیا میں آنے کی خواہش کریں گی۔ (۲) اگر زندگی کے کسی موڑ پر وصال ہو جائے تو بعد مرنے کے میری ہڈیوں سے پھول قبر پر اگ آئیں گے

علامہ عبد العلی کی پشتو شاعری نے بعد کے پشتو شعرا کو بہت متاثر کیا۔

۴۷۔ روشن اگلے ہاتھ، عبدالباری اسیر، کوئٹہ [illegible]ء، ص ۴۸۴ تا ۴۸۸

۴۸۔ روشن اگلے ہاتھ، ۵۰۵، ۵۱۳ تا ۵۱۴

۴۹۔ ایضاً ۵۲۳ تا ۵۲۶

۵۰۔ روشن اگلے ہاتھ، ص ۵۲۸ تا ۵۳۲

۵۱۔ بلوچستان میں اردو، ص ۴۴۸

۵۲۔ روشن اگلے ہاتھ، ص ۵۷۱ تا ۵۷۵

۵۳۔ علامہ اقبال اور بلوچستان، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء ص ۱۳۶ تا ۱۴۹

۵۴۔ ایضاً ص ۱۵۳

اولس پشتو، کوئٹہ، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

۵۵۔ فکر مبین، سید عابد رضوی، کوئٹہ، ۱۹۷۸ء ص ۱۳ تا ۲۱

عطا شاد

بلوچی ادب

بلوچی دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شامل ہے۔ ایک وسیلہ اظہار کی حیثیت سے اس کے آثار ۵۵۰ قبل مسیح تک ملتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ زبان بولنے والے (بلوچ) قبائل بحیرہ خضر کے ساحلوں پر آباد تھے۔ اس کے بعد نامعلوم اسباب کی بناء پر ان کی نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختلف ادوار میں مختلف قبائل نے بحیرہ خضر کے ساحلی علاقوں کو خیرباد کہہ کر مشرق کی جانب کوچ کیا اور کوہ البرز کی دشوار گزار وادیوں سے ہوتے ہوئے ایران میں وارد ہوئے اور کرمان کے علاقے میں مقیم ہوگئے۔ اس علاقے میں ان کی طویل قیام کی شہادتیں عرب مورخین کی تحریروں اور شاہنامہ فردوسی کے اشعار سے ملتی ہیں۔ اس کے بعد بھی ان کی نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہا۔ خراسان اور سیستان کے علاقوں میں ان کے طویل پڑاؤ رہے۔ اب سے تقریباً" آٹھ، نو سو سال قبل یہ قبائل مشرقی اور جنوب مشرقی ایران سے مکران کے راستے برصغیر میں وارد ہوئے۔ ان کی بڑی تعداد ان علاقوں میں آباد ہوگئی جو آج بلوچستان کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ قبائل مزید سفر کرکے سندھ اور پنجاب میں آباد ہوگئے۔ چنانچہ اب بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں بلوچی زبان بولنے والے قبائل کی بڑی تعداد موجود ہے۔ تاہم ان کی اکثریت بلوچستان ہی میں آباد ہے۔

بلوچ قبائل ابتدا ہی سے قبائلی مزاج کے حامل، سخت کوش صحرا نشین رہے ہیں، انہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے مستقل یا نیم مستقل قیام کے لئے علاقے بھی ایسے منتخب کئے جو عام طور پر غیر آباد، ویران اور شدید موسمی حالات کے حامل تھے اس لئے ان قبائل کی جدید تمدنی اور شہری زندگی کا آغاز صدیوں کی کوہ و صحرا نشینی کے بعد ہوا۔ اس کے دو منطقی نتائج برآمد ہوئے۔ اور وہ یہ کہ ان کی تاریخ کے بارے میں مستند تحریری مواد ان کی اپنی زبان میں مرتب نہ ہو سکا، اور دوسرے یہ کہ ان کے ادبی رجحانات اور تخلیقات کا سلسلہ وار تحریری ریکارڈ تیار نہ ہو سکا۔ پھر بھی ایک خطیر اور بے حد وقیع ادبی ذخیرہ منظوم رزمیہ اور رومانی داستانوں کی شکل میں سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل سفر کرتا ہوا عہد حاضر تک پہنچا۔ یہ سرمایہ نہ صرف ان کے ادبی و شعری مزاج اور قدرت فن کا منہ بولتا مرقع ہے، بلکہ یہی داستانیں مختلف قبائل کے حالات اور بطور مجموعی پوری بلوچ نسل کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہیں۔

دنیا کی تمام زبانوں میں یہ بات ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ ان کے ادبی تخلیقی عمل کی ابتداء نثر کی بجائے نظم سے ہوئی یہ ایک فطری عمل تھا۔ شاعری جذبہ و احساس اور فکر و تاثر کے لطیف اظہار کی صورت تھی۔ یہ عمل ایک منہ زور خود رو چشمے کی صورت سے جاری رہا۔ حرف و تحریر سے ناآشنا لوگ بھی گیتوں اور نظموں کے ذریعے اپنے انداز میں، اپنے اپنے لب و لہجہ میں اور اپنے اپنے کمال تخلیق کے مطابق اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے، اور یہ سرمایہ ایک لوک ورثے کے طور پر ایک نسل سے

دوسری نسل کو منتقل ہوتا چلا گیا۔ اور آج یہ صورت ہے کہ عالمی ادبی سرمایہ کا سب سے بڑا حصہ اسی لوک شاعری پر مشتمل ہے۔

جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے' اس کے لئے تحریر کی صلاحیت شرط اول ہے۔ یہ صلاحیت انسانی معاشرے میں فکر اور اظہار کی قدرت کے صدیوں بعد پیدا ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ ہر زبان کا نثری سرمایہ' شعری سرمائے کے بہت بعد میں وجود میں آیا۔ بلوچی زبان بھی اس اصول فطرت سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جو اس زبان میں نظم و نثر کی یکساں قدامت پر دلالت کرتی ہیں۔

کوہ بے ستوں کی چٹانوں پر بہت سے ایسے کتبے دریافت ہوئے ہیں جو کسی قدیم اور اجنبی زبان میں چٹانوں پر کندہ کئے گئے تھے۔ ان پر تحقیق ہوئی تو واضح ہوا کہ ان کا زمانہ داریوش کبیر کے عہد حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض محققین داریوش کبیر اور قرآنی کردار سکندر ذوالقرنین کو ایک ہی شخصیت قرار دیتے ہیں اور اس کا عہد حکومت ولادت مسیح سے صدیوں پہلے کا وہ زمانہ ہے جس کا تعین بہت مشکل ہے۔ ان کتبوں کو پڑھنے کی کامیاب کوشش سے ثابت ہوا کہ ان کا رسم الخط تو ضرور نامانوس ہے' لیکن ان کی زبان آج کی بلوچی زبان سے مماثل ہے۔ بعض جملے ایسے بھی ملے ہیں جو الفاظ' معانی اور ساخت کے اعتبار سے آج کی بلوچی زبان سے مکمل مطابقت رکھتے ہیں۔ ہم ان کتبوں کی تحریروں کو بلوچی نثر کی قدیم ترین صورت قرار دے سکتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے' ان کا زمانہ ہزاروں سال پرانا ہے۔

بلوچی نثر کی دوسری قدیم شکل ہم تک ان ان گنت لوک کہانیوں کے روپ میں پہنچی ہے جو لوک گیتوں اور منظوم داستانوں' ہی کی طرح سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل سفر کرتی ہوئی عہد حاضر تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے بعض لوک کہانیوں کا مجموعہ ایک برطانوی پولٹیکل آفیسر مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے ۱۹۲۲ء میں رومن رسم الخط میں شائع کیا۔ بعد میں یہ کہانیاں بلوچی رسم الخط میں منتقل ہوئیں اور ان کے اردو تراجم بھی کتابی شکل میں شائع کئے گئے۔

یہ کہانیاں' کہانی کے تمام فنی لوازم یعنی مربوط پلاٹ کردار نگاری' مکالمات تدریجی ارتقاء' کلا مکس اور اینٹی کلا مکس وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہیں۔ یہ کہانیاں بلوچی زبان کے قدیم نثری ادب ہی کا اہم حصہ ہیں' اور اب جبکہ یہ ضبط تحریر میں بھی آچکی ہیں' اس تصور کا ایک واضح علمی جواز بھی فراہم ہوگیا ہے۔

جہاں تک جدید نثری ادب کا تعلق ہے' یہ سلسلہ دینی و مذہبی تحریروں سے شروع ہوا۔ رواں صدی کے دوسرے عشرے کے دوران لاہور کے ایک عیسائی تبلیغی ادارے نے ایک تبلیغی مقصد کی خاطر یوحنا کا بلوچی ترجمہ نستعلیق عربی رسم الخط میں شائع کرکے بلوچ علاقوں میں پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ مذہب پرست بلوچ عوام کو گمراہ کرنے کی کھلی سازش تھی جس کا شدید ردعمل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس سازش کے موثر سدباب کیلئے بلوچ علماء کا دبستان درخانی میدان عمل میں آگیا۔ اس ادارے نے سب سے پہلے بغدادی قاعدہ کی طرز پر عربی رسم الخط میں اولین بلوچی قاعدہ شائع کیا پھر دینی تبلیغی کتب اور رسائل کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جس سے نہ صرف عیسائی مبلغین کے قدم رک گئے بلکہ پہلی بار بلوچی زبان میں بامقصد نثری ادب میں تخلیق کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ اسی ادارے سے ۱۹۲۰ء میں مولانا حضور بخش جتوئی نام کے ایک ممتاز عالم دین نے قرآن حکیم کا بلوچی ترجمہ شائع کیا۔ اس کے بعد بھی قرآن کریم کے مختلف پاروں' آیات اور سورتوں کے بلوچی ترجمے شائع ہوتے رہے' تاہم مکمل قرآن پاک کا پہلا اور اب تک آخری بلوچی ترجمہ وہی

تھا جو ۴۳ سال قبل شائع ہوا' علماء کی یہ کاوشیں تسلسل کے ساتھ جاری رہیں اور ان کی بدولت بلوچی نثر نگاری کی ایک قابل قدر روایت قائم ہوگئی۔

دینی لٹریچر سے ہٹ کر بلوچی نثر نگاری کے سلسلے میں جو کام ہوا' اس میں بنیادی اور اہم نوعیت کا کردار بلوچی رسائل و جرائد نے ادا کیا۔ ان میں تین جرائد کے نام سر فہرست ہیں "بولان"۔ "بلوچستان جدید" "لوعہ" "نوائے وطن" ان جرائد کے مدیر نامور بلوچ اہل قلم میر محمد حسین عنقا' میر گل خان نصیر اور محمد پناہ تھے۔

بلوچی زبان و ادب کے تیز رفتار ارتقاء اور اس میں نئی اصناف و اسالیب اور فکری رجحانات کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہوا۔ اس وقت بھی رسائل و جرائد ہی نے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے کراچی سے مولانا خیر محمد ندوی نے "اومان" کے نام سے بلوچی ماہنامہ جاری کیا۔ اس میں بیشتر تحریریں مذہبی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔ تقریباً" دو سال بعد یہ جریدہ بند ہو گیا' اس کے دو سال بعد کراچی ہی سے نامور بلوچ شاعر و دانشور' مرحوم آزاد جمالدینی' نے ماہنامہ "بلوچی" کا آغاز کیا۔ یہ بلوچی زبان کا پہلا باضابطہ' جامع اور مکمل ادبی جریدہ تھا۔ اس میں شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید' تاریخ' افسانے اور ڈرامے کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ اس طرح بلوچی اہل قلم کیلئے نئے میدان ملے اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس طرح جدید بلوچی اہل قلم کا ایک حلقہ بنتا گیا۔ کراچی سے ماہنامہ "بلوچی" چھ سال سے زائد عرصے تک بلوچی زبان و ادب کی خدمت کے بعد بند ہوا تو بلوچی ادب میں ایک واضح تعمیری انقلاب رونما ہو چکا تھا۔

۱۹۶۰ء میں ماہنامہ "بلوچی" کراچی بند ہوا تو اس کے ایک سال بعد کوئٹہ سے حکومت پاکستان کے زیر اہتمام "اولس" کے نام سے ایک بلوچی ماہنامہ جاری ہوا۔ بنیادی طور پر اس جریدے کا مقصد حکومت کی پالیسیوں اور کارناموں کی تشہیر تھی لیکن حسن اتفاق سے اس کے اولین ایڈیٹر بلوچی زبان کے ممتاز ادیب امان اللہ گچکی مقرر ہوگئے۔ انہوں نے "اولس" کے ذریعہ سرکاری مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بلوچی ادب کو بھی اس کا لازمی حصہ بنا دیا۔ اس طرح "اولس" ایک معیاری اور نمائندہ ادبی پرچے کی حیثیت سے زبان و ادب کو پروان چڑھانے کا فریضہ انجام دیتا رہا اور ماہنامہ بلوچی کے بند ہونے سے جو خلا پیدا ہو تھا' اس نے بڑی حد تک اسے پر کر دیا۔ اس پرچے کے توسط سے جو جدید بلوچی ادبیات تخلیق ہوکر سامنے آئیں ان کا انتخاب بعد میں بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ' نے کتابی شکل میں شائع کیا جسے خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مجموعہ بلوچی نثری ادب کے سلسلے میں ایک مینار نور ثابت ہوا' جس سے بے شمار نئے لکھنے والوں کی رہنمائی ہوئی۔

ماہنامہ "بلوچی" ۱۹۷۷ء میں کوئٹہ سے شائع کیا گیا۔ اور آزاد جمالدینی کی وفات تک اپنی سابقہ روایت کے مطابق بلوچی زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ عبد الکریم شورش کے جریدے "نوکین دور" کو بھی اس سلسلے میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا' لیکن اس کے ساتھ ہی ایک وقیع ادبی جریدے کے طور پر بھی خدمات انجام دیتا رہا۔ "نوکین دور" کے ادبی حصے کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس جریدے نے ادبی تحقیق کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں اس کے بعض خصوصی نمبر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں' ان کی بدولت بلوچی ادبیات کے کئی خفیہ خزانے اور انجانے گوشے منظر عام پر آئے۔

ریڈیو پاکستان میں بلوچی شعبے کا قیام بلوچی نثر کے ارتقاء میں ایک تاریخ ساز دور کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

اس کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان کراچی سے ہوا اور مختلف اہل قلم کی مدد سے دو سال تک بلوچی نشریات کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس شعبہ کی نگرانی سید ظہور شاہ ہاشمی کے سپرد کی گئی جو بلوچی زبان کے انتھک ادیب شاعر اور محقق تھے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور بے مثال محنت سے اس ذمہ داری کو اس طرح نبھایا کہ نہ صرف ریڈیو کی بلوچی نشریات کو بامقصد اور مقبول بنا دیا' بلکہ ان کے ذریعہ اہل قلم میں بھی نئی روح پھونک دی۔ بعد میں انہوں نے ریڈیو سے الگ ہو کر آزادانہ تخلیق و تحقیق کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس طرح بلوچی زبان کا دامن نظم و نثر کے بیش بہا خزانے سے بھر دیا۔

ریڈیو سے بلوچی زبان میں تقریریں' تبصرے' خبریں اور اہم قومی امور کے جائزے نشر ہونے لگے تو موضوعات کی مناسبت سے بلوچی نثر کے دامن میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ پھر ریڈیو سے بلوچی ڈرامے کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ صنف ادب بھی بلوچی میں شامل ہوگئی۔ ۱۹۵۶ء میں کوئٹہ میں ریڈیو اسٹیشن کے قیام سے بلوچی نشریات کا دائرہ مزید وسیع ہوا۔ ۱۹۵۹ء تک کراچی اور کوئٹہ دونوں اسٹیشنوں سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد بلوچی نشریات کا شعبہ مکمل طور پر کوئٹہ منتقل کر دیا گیا یہیں سے بلوچی نثر کے ارتقاء کا اہم ترین دور شروع ہوا۔ جس کے نتیجے میں بلوچی نثر نے مختصر سی مدت میں صدیوں کا سفر طے کر لیا۔

ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے ایک اہم ترین خدمت یہ انجام دی کہ اس نے بلوچی زبانوں کے مشرقی اور مغربی لہجوں اور بہت سے دوسرے علاقائی لہجوں کے درمیان ایک معیاری' سب کی سمجھ میں آنے والی اور سب کیلئے قابل قبول نثری زبان کی تشکیل کا فریضہ انجام دیا۔ اس مشترکہ معیاری زبان کی تشکیل نے بلوچی کے نثری ادب کی رفتار ترقی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ جن اہل قلم نے ریڈیو کے ذریعہ بلوچی زبان میں مختلف اصناف نثر کے فروغ میں نمایاں ترین خدمات انجام دیں ان میں میر امان اللہ گچکی' میر بشیر احمد بلوچ' میر صورت خان مری اور میر غوث بخش صابر کے نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مجھے فخر ہے کہ اس تاریخ ساز کاوش میں شامل رہنے کی سعادت مجھے بھی عرصہ دراز سے حاصل رہی ہے۔ ہم لوگوں نے نہ صرف بلوچی کے نثری ادب کو نت نئی اصناف سے روشناس کرایا بلکہ زبان کے دامن کو وسیع تر کرنے کی بھی کامیاب کوششیں کیں۔ ہم نے بہت سے نئے الفاظ' نئی تراکیب اور نئی اصطلاحیں وضع کیں۔ انہیں میں ایک اہم اصطلاح "کسمانک" ہے جو بلوچی ڈرامے کیلئے وضع کی گئی اور اب عام ہو چکی ہے۔

بلوچی نثر میں تخلیقی و تحقیقی ادب کی روایت کو پروان چڑھانے والوں میں سید ظہور شاہ ہاشمی اور آزاد جمالدینی کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں عبد الکریم شورش کی خدمات بھی بیان کی جا چکی ہیں ان کے علاوہ میر شیر محمد مری' میر مٹھا خان مری' عبد اللہ جمالدینی' میر بشیر احمد بلوچ' پروفیسر عزیز بگٹی اور میر گلزار خان مری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میر شیر محمد مری کے تحقیقی کارنامے میں دو نہایت وقیع اور مفید کتابیں شامل ہیں "کہنین شاعری" (قدیم بلوچی شاعری) اور "بلوچی ادب ء تاریخ" (بلوچی ادب کی تاریخ) میر مٹھا خان مری نے تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے میں اہم کام کیا۔ "بلوچی اردو لغت" ان کی ایک اہم تالیف ہے۔ اس لغت کی تیاری میں میں بھی ان کا شریک کار رہا۔ یہ لغت مرکزی اردو بورڈ نے شائع کی تھی۔ میر مٹھا خان مری نے نامور بلوچ شاعروں مست توکلی اور رحم علی مری کی زندگی اور فن پر تحقیق کی اور ان کا غیر مطبوعہ کلام دریافت کرکے مکمل صحت کے ساتھ مرتب کیا' اس طرح انہوں نے دونوں قدیم شعراء کو گوشہ گمنامی سے نکال کر زندہ جاوید کر دیا۔ ان کا اہم کارنامہ "درگال" ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال کی زندگی اور ان

کی سیاسی و ادبی خدمات پر تحقیق ہے۔ اس کی بدولت بلوچ عوام کو علامہ اقبال' ان کے افکار و نظریات اور پیغام کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ میر صاحب کی اس تخلیق کو پاکستان رائٹرز گلڈ کا ادبی انعام اور اکیڈمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی علمی' ادبی اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں ان کو حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ بھی عطا ہوا ہے۔

عبد اللہ جان جمالدینی نے ایک قدیم قادر الکلام شاعر رکھی پر تحقیقی مضامین تحریر کرکے اس کی فنکارانہ انفرادیت اور اہمیت کو اہل نظر سے روشناس کرایا۔ میر بشیر احمد بلوچ کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بلوچی زبان کے عظیم شاعر جام درک پر تحقیق کرکے اس کی زندگی اور فن پر قیمتی مواد فراہم کیا اور اس کا کلام یکجا کرکے اسے کتابی صورت دی۔ اس کے علاوہ انہوں نے وادی مکران کے بلوچی شعراء پر نہایت پر مغز اور بسیط تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں۔ پروفیسر عزیز بگٹی اور میر گلزار خان مری نے بھی اہم تحقیقی کارناموں کے ذریعہ بلوچی زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بلوچی زبان کا نثری ادب تمام جدید اصناف سے مالا مال ہے۔ داستان' افسانہ' کہانی' ڈراما' تحقیق' تنقید' تبصرہ' تذکرہ' رپور تاژ' انشائیہ اور طنز و مزاح ہر صنف پوری آب و تاب سے بلوچی کے نثری ادب میں شامل ہے' اور اس طرح بلوچی ادب پورے اعتماد کے ساتھ دوسری پاکستانی زبانوں اور قومی زبان اردو کے جدید ادب کے شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں بلوچی اکیڈمی کی خدمات بھی بے حد وقیع اور قابل قدر ہیں۔ یہ بلوچی زبان کا نمائندہ علمی' ادبی اور اشاعتی ادارہ ہے۔

اس مرحلے پر اس حقیقت کا اعتراف بے حد ضروری ہے کہ بلوچی زبان و ادب کے فروغ اور تیز رفتار ارتقاء میں بلوچی اہل قلم نے ہمسایہ پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں قومی زبان اردو کا فیضان سب سے زیادہ ہے۔

یاسمین نظامی

بلوچی شاعری کا ارتقاء

بلوچی اسکالروں اور محققین کے مطابق بلوچی زبان کی تاریخ بہت پرانی ہے اور ایک بولی کی حیثیت سے ۵۵۰ قبل مسیح تک اس کے آثار ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت یہ بولی بولنے والے "بلوچ" قبائل بحر خضر کے ساحلوں پر آباد تھے۔ بعض اسباب کی بناء پر وہاں سے ان کی نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح ان کا ایک بڑا حصہ ان خطوں میں وارد ہوا' جو اب بلوچستان کے مغربی اور جنوب مغربی علاقوں پر مشتمل ہیں۔ یہ قبائل اپنے ہمراہ اپنی زبان بھی لائے۔ اس وقت تک اس زبان کی ساخت کیا تھی' کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس وقت بلوچی زبان کے جو لہجے اور شکلیں بلوچستان کے مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہیں' وہ لازماً" اسی قدیم زبان کی ارتقائی صورتیں ہیں اور قدامت کے اعتبار سے قدیم فارسی یعنی اوستہ سے بھی قدیم ہیں۔ ہا خامنشی عہد کے کتبوں کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد یہ مفروضہ یکسر ختم ہوگیا ہے کہ بلوچی فارسی کی ایک شاخ ہے۔ ان قدیم کتبوں میں جو زبان دریافت ہوئی ہے وہ موجودہ مشرقی بلوچی سے غیر معمولی مشابہت رکھتی ہے۔

یہ زبان اس قدر قدیم ہونے کے باوجود صدیوں تک محض بول چال کی زبان رہی۔ اس کی تحریری صورتیں صرف چودھویں صدی عیسوی کے بعد سے ملتی ہیں اور اس کا دستیاب قدیم ترین شعری ادب پندرھویں صدی اور سولہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم بلوچی ادب کی تمام تر شعری تخلیقات کا ذخیرہ لوگوں نے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھا اور یہ اشعار نسلاً" بعد نسلاً" سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے عہد جدید تک پہنچے۔ سب سے پہلے مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے قدیم بلوچی منظومات کا ایک مجموعہ ۱۹۰۷ء میں رومن رسم الخط میں شائع کیا۔ "پاپولر پوئٹری آف دی بلوچز (POPULAR POETRY OF THE BALOCHESE) کے نام سے یہ کتاب لندن میں شائع کی گئی تھی۔

بلوچی شاعری کا یہ اولین مجموعہ ہے۔ اس سرمائے سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ دوسری بہت سی زندہ زبانوں کی طرح بلوچی ادب کا آغاز بھی نثر کی بجائے نظم سے ہوا۔ یہ قدیم منظوم ذخیرہ زیادہ تر لوک گیتوں اور عشقیہ و رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کا انداز سادہ اور بیانیہ ہے اور اس میں مختلف جنگوں کے حالات بھی ملتے ہیں۔ اس طرح بلوچوں کی تاریخ کا اہم ترین ماخذ بھی یہی ذخیرہ ہے۔ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اس منظوم ادب کی ابتداء بلوچوں کے نامور رند اور لاشار قبائل کے تاریخی دور میں ہوئی تھی۔ بلوچی زبان کے نثری ادب کی تاریخ بھی کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ بلوچی زبان کی اولین نثری کتاب جو فارسی رسم الخط میں تھی ۱۸۸۱ء میں لاہور سے شائع کی گئی۔ یہ لالہ ہتو رام کی تالیف "بلوچی نامہ" تھی۔ بلوچی زبان کا قدیم ترین قلمی نسخہ برٹش میوزم لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۴۳ء سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نادر روزگار

قدیم ترین قلمی نسخہ برٹش میوزم لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ [illegible] سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نادر روزگار نسخہ کمالان گچکی نامی بلوچ دانشور کی تالیف ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بلوچ قبائل موجودہ بلوچستان میں وارد ہوئے تو ان کو یہاں پہلے سے آباد قبائل کی جانب سے مزاحمت کا سامنا ہوا۔ جنگیں ہوئی اور اپنے احساس تفاخر کو نظم کرنے کی روایت کا آغاز ہوا یہ سرمایہ سینہ بہ سینہ آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتا رہا اور اس طرح صدیوں کا سفر طے کرکے عہد حاضر تک پہنچا۔ ابتدائی دور کے اس شعری سرمائے کے خالق شعراء کے بارے میں روایات کے علاوہ کوئی مستند تاریخی شہادت دستیاب نہیں۔ قبائلی حمیت، شجاعت، بہادری اور عشق و محبت کی داستانوں پر مشتمل یہ نظمیں بلوچ سرداروں کے درباروں میں گا کر سنائی جاتی تھیں، کون سناتا تھا اور ایسی محفلوں کے آداب کیا تھے، اس بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ جن قدیم ترین شعراء کے نام تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں انہیں شہ عیسیٰ، بی برگ، شہ مرید، ریحان، تویل جت، گنی نوڑ بندغ زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کے بارے میں مستند تاریخی مواد دستیاب ہے۔ نامور بلوچ شاعر ورک شہ عیسیٰ کے بارے میں کہتا ہے۔

آسے بالتہ عیسیٰ ءُ

مارے پھر ہواڑے جشتوں

یعنی (شاعری کی) آگ شہ عیسیٰ نے روشن کی۔ ہم اس کی تپش لے کر آئے ہیں۔

عہد جدید کے نامور شاعر جواں سال بگٹی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بلوچی کے قدیم ترین شاعر بلکہ پہلے باقاعدہ شاعر شہ کلاں تھے۔ ان کا کہنا ہے۔

آسے کلاں ءُ بالتہ

شہ عیسیٰ دست تاپتہ

جام ورک ءِ پھر پھوکتہ

یعنی۔ آگ شہ کلاں نے روشن کی، شہ عیسیٰ نے ہاتھ تاپ کر اس سے حرارت حاصل کی اور جام ورک نے اس کی (گرم) راکھ پھونکی (اور اس سے استفادہ کیا)۔ یہ منظوم قول شہ کلاں کی قدامت و اولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس بارے میں مزید کوئی تاریخی حوالہ یا شہادت نہیں ملتی۔

ان قدیم شعراء کے بعد بلوچی شاعری نیا موڑ لیتی ہے اور اپنے دور ثانی میں داخل ہوتی ہے۔ یہ دور اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل سے شروع ہوتا ہے یہ تاریخی تبدیلیوں کا دور تھا۔ اس دور میں بلوچستان کی جغرافیائی حدود میں وسعت آئی اور بلوچ قبائل مغربی ساحلی علاقوں اور ان کے قریب کے خطوں سے آگے بڑھ کر وسیع تر علاقوں میں پھیل گئے۔ اس کے نتیجے میں بلوچی زبان کے مختلف لہجے وجود میں آئے۔ چنانچہ قلات سے خاران، چاغی اور مکران وغیرہ میں مغربی لہجہ اور قلات سے زیریں منطقوں کچھی، سی، مری، بگٹی، نصیر آباد اور ان کے اطراف کے علاقوں میں مشرقی لہجہ وجود میں آیا۔ اس دور ثانی میں دونوں لہجوں کے نامور شعرا پیدا ہوئے جن کا اپنا اپنا منفرد مقام ہے۔

مغربی لہجے کے حامل شعراء کے ہاں علمی اصطلاحات اور ثقالت زبان کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ لوگ مدرسوں سے فارغ التحصیل تھے۔ اس لئے ان کے ہاں عربی و فارسی کے اثرات زیادہ تھے۔ اس حلقہ شعراء میں ملا فاضل، ملا قاسم، ملا بوہیر، ملا بہادر، ملا ابراہیم اور رکی کو نمائندہ

حیثیت حاصل ہے۔ مشرقی لہجے کے حامل شعراء میں سادگی سلاست اور روانی ملتی ہے۔ ان شعراء کے باضابطہ تحصیل علم کی شہادتیں نہیں ملتیں۔ لیکن اس گروہ میں جام درک' مست توکلی' بجار' گدو' ڈوم' رحم علی مری اور جوان سال بگٹی جیسے قادر الکلام شعراء موجود ہیں۔

دور ثانی کی شاعری قدیم شاعروں کی طرح محض داستان گوئی اور ڈرامائی انداز بیان پر مشتمل نہیں' بلکہ اس میں شاعر متکلم کی صورت میں سامنے آتا ہے اور مناظر فطرت کو تمہید کا لازمی حصہ بنا کر حسن اظہار میں ایک جدت کا اضافہ کرتا ہے اس دور میں داخلیت کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے لیکن نئی طرز فکر و احساس اور سیاسی و معاشرتی شعور کا بامعنی اظہار بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ استعارات اور تشبیہات بھی بلوچی شاعری میں ایک نئی تازگی اور دلکشی پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بلوچی شاعری کا دور جدید غیر محسوس طور پر دور ثانی کے اختتام سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک عملی مثال جو انسال بگٹی کی شخصیت ہے۔ وہ دور ثانی کا شاعر ہے لیکن اس کا عہد' عہد جدید تک جاری رہتا ہے اور دور ثانی کا ایک اہم اختتامی مرحلہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ بلوچی شاعری کا جدید دور برطانوی عملداروں کے عروج کے دور سے شروع ہوتا ہے انگریزوں نے بلوچ علاقوں میں عیسائیت کی تبلیغ کیلئے راہ ہموار کرنی چاہی تو اس کا شدید ردعمل ظاہر ہوا۔ بلوچ علماء پوری استقامت کے ساتھ دین کی حفاظت کیلئے میدان عمل میں آگئے اس سلسلے میں "دبستان درخانی" کا نام بلوچی ادب کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اس ادارہ کے علماء نے بلوچی زبان کے منظوم مقصدی ذخیرے میں گرانقدر اضافہ کیا' بلکہ اسی مرحلے پر بلوچی نثر کی ابتداء بھی ہوئی۔ یہی وہ دور تھا جبکہ پہلی بار بلوچی زبان و ادب پر ہمسایہ زبانوں کے اثرات پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوئے۔

جہاں تک بلوچی شاعری میں جدید ترین اسالیب کی ابتداء' خصوصاً" غزل گوئی کے آغاز کا تعلق ہے' اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ بلوچی شاعری کے دوسرے دور ہی میں غزل سے ملتی جلتی ایک صنف سخن رواج پا گئی تھی۔ چنانچہ ملا فاضل کو اس سلسلے میں اولین شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے اظہار کے ساتھ ممتاز بلوچ محقق کریم دشتی نے ملا فاضل کی غزل کا شعر حوالے کیلئے پیش کیا ہے۔

جنک کبکے کہ لڈیت ماں بہارء
من ء گندیت چیرونت و تارا

میری محبوبہ کبک دری کی طرح بہاروں میں محو خرام ہے۔ لیکن جب مجھ پر نظر پڑتی ہے تو چھپ چھپ جاتی ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ غزل کا بانی اسی دور ثانی کا ممتاز شاعر جام درک تھا جسے نامور بلوچ حکمران خان نصیر خان نوری کے دربار میں ملک الشعراء کا مرتبہ حاصل تھا' بلوچی شاعری کو جدید اسالیب اور جدید مضامین سے اسی نے روشناس کرایا۔ بہر حال بلوچی غزل کا اولین صورت گر ملا فاضل ہو یا جام درک' یہ دونوں نقطہ ہائے نظر یہ واضح کرتے ہیں کہ بلوچی غزل کی ابتدائی ہیئت بلوچی شاعری کے دوسرے دور ہی میں واضح ہوگئی تھی۔ تاہم ایک باضابطہ صنف سخن اور مکمل ترین صورت میں فارسی اور اردو کی ہمشکل اور ہم مزاج غزل کا اصل دور بلوچی شاعری کا تیسرا دور ہی کہلائے گا۔

بلوچی شعر و ادب کا تیسرا دور' دوسرے دور سے اس حد تک وابستہ و مربوط ہے کہ ان دونوں کے

درمیان کسی حد فاصل کی نشاندہی ممکن نہیں۔ علمی نقطہ نظر سے ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی شعر و ادب کا تیسرا دور دوسرے دور ہی کی ارتقائی شکل ہے اور ارتقاء کا یہ سفر جام درک، ملا فاضل، مست توکلی، رحم علی مری اور جواں سال گمشی سے ہوتا ہوا غیر محسوس طور پر آزاد جمالدینی، سید ظہور شاہ ہاشمی اور میر گل خان نصیر کو اسی دور کے نمائندہ شعراء تک پہنچتا ہے اور یوں بلوچی شاعری اپنے جدید ترین دور میں داخل ہوتی ہے۔

بلوچی زبان اور شعر و ادب کا یہ دور جسے جداگانہ طور پر واضح کرنا مناسب بھی ہے اور ضروری بھی وہ پاکستانی دور ہے، آزاد جمالدینی، ظہور شاہ ہاشمی اور میر گل خان نصیر کو اسی دور کے نمائندہ شعراء میں شمار کیا جائے گا۔ بلوچی شعر و ادب کے پاکستانی دور کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہماری تحریک آزادی نے کئی مرحلوں میں اپنا سفر طے کیا۔ اور قیام پاکستان کا تاریخی واقعہ اسی تحریک کا آخری نتیجہ تھا۔ تحریک آزادی نے جہاں سیاسی اعتبار سے لوگوں کو بیدار کرکے ایک نیا شعور عطا کیا، وہیں اظہار و بیان کے نئے زاویئے بھی عطا کئے۔ چنانچہ بلوچی زبان اور شعر و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ نامور بلوچ رہنما نواب زادہ یوسف علی خان عزیز مگسی نہ صرف تحریک آزادی کے ایک سرفروش رہنما تھے بلکہ ایک باصلاحیت اور صاحب طرز شاعر بھی تھے۔ ان کی شخصیت اور فن کو دوسرے اکابر کے علاوہ مولانا ظفر علی خان نے منظوم خراج تحسین پیش کیا تھا۔ انہوں نے اصل تحریک پاکستان کے آغاز (۱۹۳۵ء) تک نہ صرف آزادی وطن کی تحریک میں مجاہدانہ حصہ لیا بلکہ اس سلسلے میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے صف اول کے شعراء سے گہرے روابط کی بناء پر شعرو سخن کے میدان میں بھی جدید رجحانات قبول کئے اور انہیں بلوچستان میں متعارف بھی کرایا۔ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے قیامت خیز زلزلے میں وہ خود تو شہید ہوگئے لیکن ان کے افکار ذہن در ذہن سفر کرتے رہے۔ ابتدائی طور پر ان سے اثر قبول کرنے والے شعراء میں محمد حسین عنقا اور میر گل خان نصیر دو انتہائی اہم اور معتبر نام ہیں۔ ان کے علاوہ سید ظہور شاہ ہاشمی، آزاد جمالدینی اور ملک سعید کو نمایاں اہمیت حاصل ہے اس دور میں ابھرنے والے شعراء کسی نہ کسی طور پر عملی سیاست سے بھی وابستہ رہے تاہم سید ظہور شاہ ہاشمی اور محمد حسین عنقا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی شاعری سیاست کی آمیزش کے ناگوار، اور ہنگامی اثرات سے پاک رہی۔ یہی دو نامور شعرا جدید بلوچی غزل کے بانی اور اولین معمار تصور کئے جاتے ہیں۔ میر گل خان نصیر اور آزاد جمالدینی نے بھی غزل کی آبیاری کی، تاہم ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بلوچی کے شعری ادب میں جدید نظم کے ارتقاء کا فریضہ انجام دے کر اسے ایک مستقل اور توانا صنف کی حیثیت سے بلوچی شاعری کا حصہ بنا دیا۔ تحریک پاکستان کے آخری دور اور آزادی وطن کے ابتدائی زمانے میں ممتاز مقام حاصل کرنے والے ان شعراء کے اثرات قیام پاکستان کے بعد ابھرنے اور نام پانے والے اکثر شعراء کے کلام میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں اس فہرست میں ملک طوقی، اکبر بارک زئی، مراد ساحر، کریم دشتی اور صدیق آزاد وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعراء نے نہ صرف آزادی وطن سے پیدا ہونے والی سازگار فضا اور نسبتاً کھلے ماحول سے فائدہ اٹھایا، بلکہ اردو سمیت دوسری معاصر زبانوں کے شعری سرمایہ اور جدید رجحانات سے پورا پورا استفادہ کرنے کے مواقع بھی ان کو زیادہ حاصل رہے۔ چنانچہ آزاد جمالدینی، ظہور شاہ ہاشمی اور میر گل خان نصیر کے بعد ابھرنے والے یہی شعراء تھے جن کی کاوشوں کی بدولت بلوچی زبان کے شعری ادب میں انقلابی تبدیلیاں آئیں

اور اس کے لئے مسلسل اور تیز رفتار ارتقائی راہیں ہموار ہوئیں۔

قیام پاکستان کے بعد پہلی صف کے ان شعراء نے فکر و فن کی جو فضاء قائم کی تھی' اس کے زیر اثر کئی شعراء منظر عام پر آئے۔ اس سلسلے میں الجواہر واجہ' بشیر بیدار اور ہاشم شاکر کے نام نمایاں ہیں تاہم ان میں نمایاں ترین اہمیت عطا شاد کو حاصل ہے۔ عطا شاد بلوچی زبان کا منفرد اور جدید ترین لب و لہجہ کا حامل شاعر ہے۔ اس نے بلوچی کی قدیم روایات اور جدید رجحانات کو ایک نئے زاویئے اور نئے رنگ و آہنگ سے آشناء کیا۔ عطا شاد کی تخلیقی صلاحیتوں اور جراتمندانہ تجربوں نے بلوچی شاعری کو بالکل ہی نیا اور اچھوتا آہنگ دے کر عہد جدید کے معاصر ادب کے دوش بدوش لاکھڑا کیا ہے۔ اس زبان میں جدید ترین شعری اصناف کو رواج دینے' بیسویں صدی کے طرز احساس اور آنے والے ادوار کے امکانات تک رسائی کے در کھولنے اور جدید ترین موضوعات کو بلوچی شاعری میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ عطا شاد نے بلوچی شاعری میں اسلوب و اظہار اور زبان کے نئے تجربات کے ذریعہ بھی اہم تاریخی خدمات انجام دی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عطا شاد کو بلوچی شاعری کے ارتقاء کی نمایاں ترین علامت قرار دیا جاتا ہے۔ بلوچی زبان میں قومی منظومات کے فروغ میں بھی بنیادی کردار عطا شاد نے انجام دیا ہے۔

آخر میں قدیم و جدید بلوچی شعری ادب کے باہمی فرق کے چند پہلو اجاگر کرنا ضروری ہے۔ عہد قدیم کی بلوچی شاعری میں تغزل کا رنگ تو موجود ہے تاہم قدیم منظومات میں عشقیہ خیالات' احساسات اور جذبات کا اظہار قدیم بلوچی بحروں میں ہوا ہے۔ عہد قدیم میں قافیہ و ردیف کا بھی کوئی التزام نہیں تھا۔ جبکہ عہد حاضر میں قدیم بحور کو ترک کر دیا گیا ہے اور تمام تر شاعری میں وہی بحریں اور اوزان اختیار کئے جارہے ہیں جو فارسی اور اردو شاعری میں مروج ہیں اس کے ساتھ ساتھ ردیف و قافیہ کا التزام بھی جدید بلوچی شاعری کا لازمہ بن چکا ہے۔

بلوچی زبان میں لوک گیتوں کا ایک قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ اس کا ایک نہایت جامع مجموعہ اب سے کئی سال قبل عطا شاد اور عین سلام کی مشترکہ کوششوں سے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ بعد میں غالباً" ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے زیر اثر بلوچی شاعری میں گیت کی صنف بھی شامل ہوئی اور گذشتہ پینتیس سال کے دوران بے شمار ایسے گیت بھی کہے گئے جو مستقل ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں بے شمار ملی نغمے بھی شامل ہیں جو جذبہ حب وطن اور ملی اقدار سے محبت کی علامت ہیں۔

علی دبیک قزلباش

بلوچستانی پشتو ادب ۱۹۴۷ء تا حال

پشتو ادب کی بنیادی اصناف جن سے پشتو شاعری کا آغاز ہوا ہے۔ "ٹپہ" اور "غاڑہ" ہیں۔ یہ عوامی اصناف ہیں اور شروع سے آج تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں' کچھ عرصہ سے تحریری شکل میں بھی نظر آنے لگی ہیں لیکن ابھی تک ان کی تالیف ہوتی ہے تخلیق کار کی وضاحت نہیں ہوتی۔ یہ "سیلابی" اوزان پر کہی جاتی ہیں۔ سیلاب کو انگریزی میں (SYLLABLE) اور آریائی میں "چھند" کہتے ہیں۔ یہ اوزان آریائی ہی ہیں۔ پشتو کی تمام شاعری سیلابی اوزان پر ہوتی ہے' اس کے علاوہ دوسرا کوئی عروضی اصول نہیں ہے۔

بلوچستان میں پشتو شاعری کے تحریری آثار بیٹ نیکہ کے مناجات سمجھے جاتے ہیں۔ بیٹ نیکہ قدوسے کے "کسے" نامی پہاڑ کے صحرائی دامن میں ۳۰۰ھ سے ۴۰۰ھ تک بتایا جاتا ہے۔ ان کے بعد کئی ایسے نام ہیں جو بلوچستان میں پشتو ادب کی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں' جیسے پیر محمد کاکڑ جو ایک قادر الکلام شاعر مانے جاتے ہیں' ان کا دیوان بھی محفوظ ہے اور پشتو ادب میں ایک مسلم حیثیت رکھتے ہیں ان کا زمانہ [illegible] سے [illegible] تک رہا ہے۔

پیر محمد کاکڑ کے دور سے ۱۹۴۷ء تک بلوچستان میں پشتو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ موضوع کو دیکھتے ہوئے ان کے ذکر سے گریز کیا جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد دوسری زبانوں کی طرح پشتو ادب بھی جدیدیت کی طرف سفر کرتا نظر آتا [illegible] کئی ایسے شعراء پیدا کئے جنہوں نے اس عرصہ میں بلوچستان میں پشتو ادب کو بے بہا سرمایہ مہیا کیا۔ [illegible] العلی اخوندزادہ اور ملا عبد السلام عشرے زئی دو ایسے شاعر ہیں جنہوں نے پشتو ادب میں نہ صرف نیا [illegible] کیا' بلکہ روایتی شاعری کرتے ہوئے بھی موضوع کے اعتبار سے نئے رستے تلاش کئے' ان کا اسلوب جدا رنگ رکھتا ہے۔ عبد العلی اخوندزادہ کی شاعری کا خصوصی وصف ان کی نازک خیالی ہے جو تمام [illegible] سے نبھائی گئی ہے' جبکہ عبد السلام نے قوم کی رہنمائی اصلاح اور آزادی کے موضوعات کو خصوصا [illegible] ساتھ اپنایا ہے' ان کو ثانی خوشحال خٹک بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح [illegible] کا شمار بھی اسی وقت [illegible] شعراء میں ہوتا ہے جنکو سید خیر محمد عارف نے کچھ عرصہ پہلے متعارف کرایا' انہوں نے [illegible] کو وحدت الوجود کا شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے دیوان پر پشتو اکیڈمی کوئٹہ میں کام [illegible] ہے۔

موجودہ دور کا پشتو ادب جس قدر تیزی سے ترقی کر رہا ہے' اس [illegible] میں اس زبان کی کمی بہت حد تک پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ اب [illegible] افسانہ' انشائیہ' طنز و مزاح' تنقید' خاکہ' ڈرامہ وغیرہ میں [illegible]

فاضل لیکچرار پروفیسر سیال کاکڑ اور پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ کی خدمات کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتی ہیں' سیال کاکڑ پشتو کے نامور فوک لورسٹ ہیں' انہوں نے پشتو کی فوکلوری اصناف پر بہت کام کیا ہے' اس کے علاوہ زندہ و مرحوم شعراء کا کلام اکٹھا کرنے میں بھی ان کا حصہ ناقابل فراموش ہے' شاعری اور نثر نگاری میں اپنا رنگ رکھتے ہیں۔ آپ کی تقریباً "۳۵ کے لگ بھگ کتابیں چھپ چکی ہیں' یہ سلسلہ ابھی تک اسی تیزی اور دلچسپی سے برقرار ہے' جبکہ صاحبزادہ حمید اللہ فوکلور کے علاوہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ تنقید میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں' پشتو کے علاوہ اردو' فارسی' عربی اور انگریزی میں بھی کام کر رہے ہیں' مجموعی طور پر ۳۴ کتابوں کے مولف و مصنف ہیں۔ ابو الخیر زلاند نظم و نثر دونوں طرف مائل ہیں۔ خصوصی طور پر ان کی نظمیں جدید تقاضوں کو پورا کر رہی ہیں' ریڈیو پروگراموں میں اپنی شخصیت منوا چکے ہیں' فوکلور سے آپ بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ رباعیات عمر خیام کے پشتو مترجم ہونے کے ساتھ دو کتابوں کے مولف ہیں۔ ان کے علاوہ یوسف گل وردک (مرحوم) منفرد نثر نگار رہے ہیں۔ کمال خان شیرانی' ضیاء لاجوری' مولوی عبد الخالق ناربز' حافظ خان محمد' مولوی محمد یعقوب' عبد الحمید کاکڑ' مولوی عبد الخالق' وزیر محمد سوالی (مرحوم)' حق داد موسیٰ خیل' نذیر خیال' ظفر اللہ' محمد نظیر درانی' یوسف منصور' علاؤ الدین مجروح' علی محمد بزگر' در محمد کاسی کے علاوہ ڈاکٹر خدائیداد مترجم اور نثر نگار ہیں' کمال خان شیرانی بھی چند کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور خان عبد الصمد خان اچکزئی' نثر نگار و وقائع نگار' مترجم اور ماہر لغت رہے ہیں' بلوچستان میں پہلا پریس بھی انہی کا مرہون منت ہے۔ اپنی نوعیت کے پہلے پشتو اخبار "صیواد" کا اجراء کرنے والے سلطان محمد صابر بھی اچھے تخلیق کار ہیں' پشتو اکیڈمی کوئٹہ جو ابھی تک پشتو ادب کیلئے سرگرم عمل ہے' بھی آپ کی محنت سے وجود میں آئی تھی اور سلطان محمد بانی زئی بھی ایک قابل ذکر محقق اور نثر نگار رہے ہیں۔ فاروق شاہ سانکزئی انشاء پرداز اور شاعر ہیں ان کی نثر خلیل جبران کے زیر اثر محسوس ہوتی ہے علمی و فلسفیانہ انداز رکھتے ہیں' ماہنامہ "اولس" کوئٹہ جس نے پشتو کے تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی میں اہم کردار ادا کیا ہے' کے طویل عرصہ تک مدیر رہے۔ پشتو میں معیاری ڈرامے بھی تخلیق ہو رہے ہیں' جن میں سید عابد شاہ عابد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں' ڈرامہ نگاری کے ساتھ پشتو اور اردو میں شاعری بھی کرتے ہیں' سید محمد رسول فریادی روائت کے نمائندہ شاعر ہیں' مقدس خان معصوم اپنا رنگ رکھتے ہیں' اور پشتو کے فروغ کیلئے قابل قدر جذبہ رکھتے ہیں۔ فضل احمد غازی صاحب طرز نثر نگار ہیں شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ "گلستان" ادبی پرچہ کی ادارت میں پشتو کیلئے اعلیٰ کارکردگی کے حامل رہے ہیں۔ ان کی تحریریں پشتو ادب میں ایک سرمایہ ہیں اور فروغ ادب میں خدمات ناقابل فراموش ہیں چند کتابوں کے مولف بھی ہیں۔ افسانہ نگاری میں بھی باقاعدگی پیدا ہوئی ہے۔ حاجی مرزا خان بھی بنیادی طور پر باقاعدہ افسانہ نگار ہیں اور تنقید و تحقیق میں بھی حصہ رکھتے ہیں۔ ولی محمد ولی کا افسانوی مجموعہ چھپ چکا ہے۔ شاعر بھی ہیں' نظر پانیزئی افسانہ نگاری کے ساتھ باقاعدہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ "دریہ" فاروق سرور کا افسانوی مجموعہ ہے جو پشتو ادب میں ایک منفرد اور قابل قدر اضافہ ہے۔ آپ نے خصوصی طور پر علاقائی افسانوں پر توجہ دی ہے۔ اسی طرح طنز و مزاح میں عبد القدوس درانی کا نام بالکل منفرد ہے ان کی تحریر "شاناں والا" کافی مشہور ہے۔ عبد الفتح پشتو میں بھی نثر لکھتے رہے ہیں۔ آج کل کراچی سے "پلوشہ" کے نام سے ادبی ماہنامہ نکالتے ہیں جو پشتو کا واحد باقاعدہ ماہنامہ ہے' اور "جرس" کے ذریعے طاہر آفریدی بھی معیاری تحریروں کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ دو کتابوں کے مصنف ڈاکٹر کلیم اللہ صدام ایک عرصہ سے پشتو ادب

بھی شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی طرح ڈاکٹر عبد السلام جوہر بھی اچھے شاعر ہیں۔ عوامی رنگ کے شاعروں میں عبد الباری امیر بھی شامل ہیں اور اپنا انداز رکھتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری بھی کرتے ہیں' چند کتابوں کے مولف ہیں۔ شفیق العالم معذور یار نابینا ہیں لیکن اچھا شاعری کرتے ہیں۔ اسی طرح خواتین بھی اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتی ہیں۔ اور پشتو ادب میں قابل ذکر ناموں میں خیر النساء شنواری عالیہ اسماء' ولی محمد بیگم' حقو رنوا' تاجہ' کرم نساء' سلمیٰ گل' سکینہ گل' سلیمہ جبین درانی' میرمن جہان' مہرمن جہاں صفیہ' مسرت آفندی' مسرت انجم' سیدہ ناز جاوید' پروین لونی اور یاسمین لونی شامل ہیں' ان کا حصہ بلوچستان میں قابل قدر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ادب اپنے وقت کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہی ترجمانی بلوچستان کے پشتو ادب میں بھی ملتی ہے آج بھی پشتو ادب میں بلوچستان پہلے کی طرح اہمیت کا حامل ہے' بلکہ اب تو مسلم ہے۔ جدید شاعری میں اپنا برابر حصہ رکھتا ہے۔ یہاں کی پشتو غزل نے اپنا اسلوب عورتوں سے باتیں کرنے کی حد سے کافی آگے بڑھا دیا' نئے تشبیہات' استعارات پیدا کئے' رمز' کنایہ' اشاریہ اور علامت نے اپنی اپنی جگہیں بنا لیں' پیرایہ کو نیا لباس ملا' نئے نئے تجربات ہوئے' معنویت اور تکنیکی اعتبار سے فکری گہرائی اور جمالیاتی اوصاف علامتی اظہار اور ڈکشن کی اساس پر زندگی اور قدروں کی حقیقی ترجمانی ہونے لگی' نئے ردیف' قافیوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ جیسے' آئینہ' ہتھیلی' رستہ' ہوا' چاند' سورج' مزار' ابابیل' درخانی' حسرت' صلیب' سفر' گرد' رات' دن' چراغ' موت' آنسو' امید' درد' پتھر' روشنی' تاریکی' گھر' جنت وغیرہ کا استعمال ہو رہا ہے۔ کربلا کا استعارہ عام ہوتا گیا' محرومیوں اور پس ماندگیوں کے احساسات کو حقیقی تصویر میں پیش کیا جانے لگا' وقت کی ترجمانی ہونے لگی' اس کے ساتھ ساتھ نئی غزل جمالیاتی احساس' تصور و تصوف' کے ساتھ ساتھ فکری وسعت میں بھی بہت زیادہ پھیلی ہوئی نظر آنے لگی' نظم بھی جدید تقاضوں کو نبھانے میں پیچھے نہیں رہی بلکہ مقفیٰ سے اب معریٰ اور آزاد کی طرف زیادہ دھیان دیا جانے لگا ہے اور بہت اچھی نظمیں کہی جا رہی ہیں۔

بلوچستان میں جدید غزل کو متعارف کرانے میں لورالائی اور لورالائی کی ادبی تنظیم پشتو ادبی ملگری' کا ایک اہم کردار ہے۔ جبکہ ابھی نئی تنظیم "ملگری لیکوال" بھی تیزی سے متعارف ہو رہی ہے۔ پشتو میں جدیدیت کا آغاز امیر حمزہ شنواری کی غزل سے ہوتا ہے' لیکن بلوچستان میں اس کا سہرا "پشتو ادبی ملگری" کے بانی پروفیسر رب نواز مائل کے سر ہے' جو اردو شاعری میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جدیدیت کی طرف انہوں نے ہی توجہ دی اور غزل و نظم کو جدید لباس پہنانے کے ساتھ ساتھ علامت سے بھی آشنا کیا آزاد نظم بھی آپ ہی مرہون منت ہے آپ نے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ رب نواز مائل کی شاعری کے بارے میں ایوب صابر کہتے ہیں۔

"مائل کی ادبی شخصیت کے کئی رنگ ہیں' وہ پشتو کے جدید ترین شاعر ہیں' پشتو غزل میں ان کا انداز بھی وہی ہے جو اردو میں شہزاد احمد ظفر اقبال اور ایسے دیگر جدید شعراء کا ہے' نظم میں وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے گروپ کے آدمی نظر آتے ہیں جبکہ معنویت کے لحاظ سے احمد ندیم قاسمی کے بہت قریب ہیں۔"

اس کے علاوہ نثر میں جیسے' افسانہ' انشائیہ' ڈرامہ' خاکہ' تجزیاتی مطالعہ اور تنقید ان تمام میں مائل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ تنقیدی مضامین میں اعلیٰ فکری و فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں' بلکہ نثر میں تمام پشتو ادب میں ان کا انداز منفرد و ممتاز ہے۔

سعید گوہر شاعری کے علاوہ اردو کے بھی اچھے شاعر ہیں' گوہر کے بارے میں پشتو کے نقاد عبد الکریم بریالی کا خیال ہے کہ "غزل کی تکنیکی اور فکری پہلو کی اساس پر سعید گوہر آج کی شاعری میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں' بلکہ میں کہوں گا کہ نئی شاعری میں گوہر کا مخصوص رنگ بہت سے مکاتیب پر برتری رکھتا ہے۔ ان کی غزل کا وصف قدرت اظہار' لفظی بلاغت اور فکری گہرائی ہیں' سوز مایوسی اور محبت کا میٹھا درد ان کی غزل میں توجہ اور تاثر کی اساس بنتا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ گوہر جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔"

نازک خیالی شاعری کا اہم خاصہ ہے اور سید خیر محمد عارف کی شاعری اس وصف کے ساتھ نئے ردیف قافیوں کے استعمال اور زبان کے علاقائی الفاظ کے استعمال و تشبیہات سے خوب بھرپور ہے۔ ان کی شاعری جدید پشتو غزل و نظم میں بہت بڑا اضافہ ہے' رسم و رواج کو انہوں نے تحریری طور پر اچھی طرح محفوظ کیا ہے' تنقید و تحقیق میں انفرادیت رکھتے ہیں اور اچھے مورخ بھی ہیں' درویش درانی اپنے رنگ کے منفرد جدید شاعر ہیں' ان کا مجموعہ "ازغنہ لار" (پر خار رہ) بلوچستان میں جدید پشتو شاعری کی پہلی کتاب ہے' پشتو غزل کے بابا' حمزہ شنواری کے خیال میں درویش درانی "------------- ترقی پسند ادب سے متاثر ہیں' انہوں نے ترقی پسند اسلوب اختیار کیا لیکن اسے اپنی پشتون تہذیب کے قالب میں ڈھال دیا" --------- خصوصی طور پر درویش کی اکثر طویل افسانہ نما نظمیں پشتو اقدار و روایات کے گرد گھومتی ہیں اور غزل میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے ابھی تک دو مجموعہ کلام شائع ہوئے ہیں۔

سرور سودائی بھی جدید شاعری میں اپنا مقام رکھتے ہیں' ان کی شاعری یاسیت و بیزاری کی وجہ سے ایک خوبصورت پر تاثر کیفیت رکھتی ہے' اردو میں بھی شاعری کی ہے' لیکن اب دونوں زبانوں کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ ان کی طرح عبد الکریم بریالے بھی اب ادب سے وہ شغف نہیں رکھتے' بریالے شاعر بھی ہیں لیکن ان کے تنقیدی تحقیقی مضامین کا پشتو ادب میں جو مقام ہے وہ کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اظہار کی لطافت کے سبب عمر گل عسکر بھی اس حلقے کے ایک اچھے پشتو اردو شاعر ہیں غزل اور نظم کے علاوہ ھائیکو بھی کہتے ہیں۔

پروفیسر راز محمد راز پشتو جدید ادب میں اہم نام ہے۔ آپ کی شاعری فلسفیانہ اور انسانی زندگی اور موت کے اسرار میں ڈوبی ہوئی ہے' راز کی انفرادیت ان کی تیرہ سیلابی غزلیں ہیں ' اور ان کا سب سے الگ سوچنے کا انداز ہے۔ آزاد نظم ایک طویل مخالفت کے بعد پشتو شاعری میں اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب ہوئی اس طرح مختصر نظمیں بھی آج کل بہت اچھی کہی جانے لگی ہیں۔ جن میں افضل شوق کو اہمیت حاصل ہے' ان کا مجموعہ کلام غزل و نظم پر مشتمل "شیلدے امیل" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ سہیل جعفر' محمود ایاز اور مجیب الرحمٰن پانیزئی بھی پشتو کے نوجوان جدید شاعر ہیں اپنے اپنے منفرد انداز میں بہت خوبصورت شاعری کرتے ہیں' سہیل میں کم گوئی کے ساتھ انفرادیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ بے ساختگی محمود ایاز کی شاعری کا اہم وصف ہے۔ ان کے علاوہ عبد الغنی مبارک' نسیم اچکزئی' ڈرامہ نگاری بھی کرتے ہیں اور شعری مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ ناظر صادق شاعری کے ساتھ نثر بھی لکھ رہے ہیں اور گل شاہ خوس (مرحوم) کی بے وقت موت سے پشتو ادب کا ایک باب بند ہوا' ان کی طرح کئی اور نوجوان قلمکار' غلام محمد صابر' خلیل باور' عصمت درانی' گل خان حیرت' فیض محمد شہزاد' رخسانہ مقدس' اختر جبین رومانہ' نذر محمد شاہب' اورنگ زیب' احساس ' رزاق فہیم' عارف تبسم' ناز درانی' تیمور شاہ کمال اور نعیم آزاد بھی پشتو ادب

نو کے تجربات و تخلیقات سے نواز رہے ہیں، بلوچستان کے پشتو ادب کو آج ہم دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل رکھ سکتے ہیں اور یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہاں تھوڑے وقت میں بہت کام ہوا ہے۔

استفادہ

۱۔ "اولس" کوئٹہ، "پشتو" پشتو اکیڈمی پشاور
۲۔ "لیکنھی" پشتو اکیڈمی کوئٹہ از عبد الکریم بریالی
۳۔ "قند" مردان۔
۴۔ تیراحوال۔ ایوب صابر۔
۵۔ "پلوشہ" کراچی۔
۶۔ "اغزنہ لار" درویش درانی۔
۷۔ "روشن اسکتے ہاتھ" عبد الباری سید۔

شرافت عباس

ہزارہ گی کا ابتدائی لسانی مطالعہ

زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زبان سے مراد تحریر نہیں بلکہ کلام ہے یعنی وہ زبان جو واقعتاً بولی جاتی ہے۔ تحریر یا تقریر کلام مستعمہ کی ایک ناقص سی علامتی شکل ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سیاسی اور سماجی حالات زبان یا کلام کی کسی خاص صورت کو بہت نمایاں حیثیت میں قائم رکھیں یا اسے مفلوج کر دیں اور اس کی تحریری شکل باقی رہ جائے جس کا سمجھنا سالہا سال کے مطالعے کے بعد ممکن ہو، لیکن زبان تو بولنے والوں کے منہ میں زندہ رہتی ہے۔

اس تناظر میں اگر ہزارہ گی کو دیکھا جائے تو گو اس کا تحریری سرمایہ نہایت قلیل ہے اور عام طور پر اسے "فارسی کا ایک مخصوص لہجہ" کہنے پر اکتفا کر لیا جاتا ہے، لیکن بات شاید صرف اتنی ہی نہیں ہے۔

زبان اور اس کے بولنے والوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کسی قوم کی زبان ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کی تاریخ، رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور اس کا مزاج صاف صاف اور واضح طور پر منعکس ہوتے ہیں اور اگر دقت نگاہ سے دیکھا جائے تو زبان ہی کے حوالے سے کسی قوم کی تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔

ہزارہ قبائل کی زبان ہزارہ گی بھی ایسی بے شمار خصوصیتوں کی حامل ہے جن میں ان قبائل کا تاریخی پس منظر، حسب نسب اور گنجینہ زاد و بوم پوشیدہ ہے۔ زیر نظر مقالے کا مقصد ماہرین لسانیات اور زبان شناسی سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ ہزارہ گی کی طرف مبذول کرانا ہے، مگر پہلے کچھ گفتگو ہزارہ قبائل کے بارے میں ہو جائے۔

پاکستان کے سرحدی قبیلوں بلوچ اور پشتونوں کی طرح ہزارہ قبائل بھی ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف آباد ہیں۔ ان علاقوں کی طرف جو آج وطن عزیز پاکستان کے نام سے موسوم ہیں، ہزارہ قبائل کی آمد اور توطن کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔ منگول یلغاروں سے لے کر تیمور کے حملوں تک اور پھر بابری مغلوں کے عہد میں۔۔۔۔۔ ان قبائل کے افراد برصغیر کے مختلف علاقوں میں سکونت پذیر نظر آتے ہیں۔

برصغیر کے نابغہ روزگار شاعر امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود شمسی جو ہزارہ لاچین قبیلے کے سردار تھے تیرھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں نواح غزنین سے برصغیر میں وارد ہوئے اور مومن آباد موضع پٹیالی (حال بھارت) میں سکونت پذیر ہوئے (۱) ہزارہ قارلق اور دوسرے کئی ہزارہ قبیلے اور امراء ہزارہ، امیر تیمور کے ساتھ برصغیر آئے جن میں سے بہت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شمالی مغرب (موجودہ ضلع ہزارہ اور ایبٹ آباد وغیرہ) کے علاقہ جات سے وابستہ ہو گئے (۲) بابر اور ہمایوں کے ادوار میں بھی ہزارہ قبائل غیر منقسم ہندوستان کا رخ کرتے رہے۔ ہمایوں کے دور میں خضر خان (۳) ہزارہ اور اکبر کے عہد میں میرزا شادمان

ہزارہ' مملکت کے اہم افراد میں شمار ہوتے تھے۔ (۴) اسی طرح بعد کے ادوار میں ارغونوں' ترخانوں اور مگل اقوام و قبائل کے ساتھ ساتھ ہزارہ قبائل کی برصغیر میں آمد کا سلسلہ جاری رہا۔(۵)

گزشتہ صدی ہزارہ قبائل کی برصغیر کی طرف ہجرت کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اسی کے آٹھویں اور نویں عشرے میں ان قبائل کی بڑی تعداد نے افغانستان میں اپنے آبائی اور روایتی وطن "ہزارہ جات" سے ان علاقوں کا رخ کیا جو آج پاکستان کہلاتے ہیں۔ ہزارہ قبائل کی اس ہجرت کے بارے میں ورنیں گریگورین لکھتا ہے:

"In 1880s as a result of political up heavals or
because of their own depressed position in Afghansitan
many Hazaras were forced to leave their tradtional
homeland in central Afghanistan some moved to
Quetta in Balochistan.............." (۶)

ہزارہ قبائل کی ایک ممتاز شخصیت اور افواج پاکستان کے سابق کمانڈر انچیف (حال گورنر بلوچستان)٭ جنرل محمد موسیٰ نے(جو ۱۹۰۸ میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے) اپنے قبیلے کی ہجرت کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"My father)migrated to India (now Pakistan)
from Afghanistan in 1890 due to oppressive policy
of Amir Abdul Rehman towards Hazara tribes
to which we belong."----(۷)

یوں ہزارہ قبائل ایک صدی سے زیادہ مدت سے وطن عزیز کی سماجی' سیاسی اور علمی و ادبی زندگی کا حصہ ہیں اور بلوچستان کے علاوہ جہاں یہ مقامی آبادی کا جز ہیں' ملک کے دوسرے حصوں شمالی اور سرحدی علاقہ جات اور سندھ میں بھی آباد ہیں۔

کئی دوسرے قبائل کی طرح ہزارہ قبائل کے تاریخی پس منظر کے بارے میں بھی علماء اور محققین کے مابین خاصے اختلافات پائے جاتے ہیں' کچھ علماء اس رائے حامل ہیں کہ ہزارہ قبائل ہزاروں سال سے ان علاقوں کے باشندے رہے ہیں جو آج مرکزی افغانستان میں "ہزارہ جات" کے نام سے موسوم ہیں۔ اس رائے کے حامل افراد میں فرانسیسی محقق فریئر سر فہرست ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہزارہ قبائل افغانستان کے قدیم باشندے ہیں اور یہ لوگ سکندر اعظم کے حملے کے وقت بھی انہیں علاقوں میں سکونت پذیر تھے جہاں وہ آج (ہزارہ جات میں) آباد ہیں ا فریئر اپنے اس دعوے کے سلسلے میں یونانی مورخ کورٹس کے حوالے بھی پیش کرتا ہے۔

علماء اور محققین کا دوسرا گروہ ہزراہ قبائل کو چنگیز اور اس کے جانشینوں کی افواج کی باقیات قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ علماء کے سرخیل آئین اکبری کے مصنف علامہ ابوالفضل ہیں۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ "ہزارہ قوم کے لوگ ان چغتائی لشکریوں کی اولاد ہیں جن کو منگو قان نے ہلاکو کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ ہلاکو خان نے اس فوج کو اپنے فرزند نکودر اوغلان کی ماتحتی میں اس نواح میں بھیجا۔ یہ لوگ غزنی سے قندھار اور

میدان سے سرحد بلخ تک پھیلے ہوئے ہیں۔"۷

ہزارہ قبائل کے تاریخی پس منظر اور ان کی جائے سکونت کے بارے میں تقدیم و تاخیر کے مسئلے پر پائے جانے والے اختلاف رائے سے قطع نظر' اس بات پر تمام محقق متفق ہیں کہ ہزارہ قبائل' نژاد زرد Yellow Race سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یوں ان کا سلسلہ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ منگولوں سے جا ملتا ہے۔

تاریخ رشیدی کے مقدمہ نگار N.ELIAS نے تو ہزارہ قبائل کو شکل و شباہت' کینڈے اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے "منگولیا سے باہر خالص منگول قرار دیا ہے (۸) اور شاید انہیں منگول خدو خال کی وجہ سے ہی پاکستان کے بہت سے علاقوں میں ہزارہ قبائل کے افراد کو تبت' گلگت بلتستان یا چین جاپان وغیرہ کا باشندہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان مخصوص خدو خال کی وجہ سے اگر کسی ہزارہ کو پاکستان کے روایتی لباس کے علاوہ یورپی' چینی یا جاپانی لباس میں دیکھا جاوے تو بلاشبہ ان کےMangolide ہونے کی مکمل تصدیق ہو جاتی ہے۔

بلوچستان خصوصا اسکے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں ہزارہ قبائل کے فراد جملہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں بین الاقوامی' قومی اور علاقائی سطح پر اعزازات کے علاوہ علم و ادب کے میدان میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ کوئٹہ سے ان کے تین مجلے شائع ہوتے ہیں اور تینوں سہ ماہی ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ بھی ہزارہ قبائل کی زبان میں جسے عرف عام میں "ہزارگی" کہا جاتا ہے' روزانہ "ہزارہ گی پروگرم" نشر کرتا ہے۔

خدوخال کی طرح ہزارہ قبائل کی زبان "ہزارگی" پر بھی منگولی چھاپ نظر آتی ہے۔ ہزارگی کے بارے میں اکثر علماء و محققین کا خیال ہے کہ یہ ترک منگول آمیز فارسی کا ایک جداگانہ لہجہ ہے۔ کچھ محققین اسے منگولی کا ایک لہجہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ N.ELIAS پروفیسر وںڈر گیلنیٹس کے حوالے سے ہزارہ قبائل کی زبان کے بارے میں رقم طراز ہے:

"In spite of a slight mixture of persian
wordstheir language is Strictly Mangolian
or more particularly west Mangolian i.e Kalmak."(۹)

ماؤنٹ اسٹارٹ انفنسٹن جس نے 1808,09ء میں افغانستان میں حکومت برطانیہ کی طرف سے خدمات انجام دیں اپنی کتاب An Account of the kingdom of caubul میں بابر کی یادداشتوں کے حوالے سے اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ بہت سے ہزارہ قبائل میں اس وقت بھی مغولی زبان رائج تھی (۱۰)۔ جبکہ آر مینس ویمبرے جس نے 1862-63 میں افغانستان میں سفر اور قیام کیا' ہزارہ قبائل کی زبان میں تبدیلی کی اطلاع دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

It is remarkable that they have changed their
mother tongue for the persian which is
not generally spoken in the neighbourhroord where

they dwell. The Mongol dialect or rather a jargon of it is only preserved by a small portion of them who have remained isolated in the mountains near Herat."(۱)

ترجمہ : یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے (ہزارہ قبائل نے) اپنی مادری زبان کو فارسی میں تبدیل کر لیا ہے جو عام طور پر ان کی جائے سکونت کے قرب و جوار میں نہیں بولی جاتی۔ (قدیم) منگولی زبان کے الفاظ (ناقابل فہم شکل میں) صرف ان کے ایک چھوٹے سے طبقے میں محفوظ ہیں جو باقی ہزارہ قبائل سے کٹ کر ہرات کے قریب پہاڑوں میں آباد ہے۔"

کرنل میٹ لینڈ جس نے انیسویں صدی کے آخر میں (1882/83) حکومت برطانیہ کی انٹیلی جینس ٹیم کے ساتھ افغانستان کے قبائل کی تفصیلات جمع کیں' اپنی رپورٹ میں ڈیمبرے کے مندرجہ بالا خیالات کی حرف بحرف تصدیق کرتا ہے۔ نیز وہ غور کے علاقے میں نیلی اور زرنوئی کے مقام پر ہزارہ قبائل کی چند ایسی شاخوں کا ذکر کرتا ہے جن کی زبان آج بھی "مغولی قدیم" ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں جو افغان باؤنڈری کمیشن کی Reports on tribes کی چوتھی جلد کے نام سے شائع ہوئی ان مغولی الفاظ کی ایک فہرست بھی دی ہے جو مذکورہ ہزارہ قبائل کی زبان کا جز ہیں۔(۲) معروف مستشرق لڈوگ اڈیمک بھی جس نے حال ہی میں (۱۹۷۵ میں) افغانستان کے بارے میں کئی ہزار صفحات پر مشتمل تاریخی' جغرافیائی' ثقافتی اور سماجی کوائف پر مبنی چھ نہایت وقیع کوائف گزٹیئر مرتب کئے ہیں' اپنے گزٹیئر "ہرات" میں میٹ لینڈ کی بیان کردہ تفصلات کی تصدیق کرتا ہے۔(۳)

پروفیسر کیبلیشں' کرنل میٹ لینڈ اور لڈوگ کے مشاہدات کو زبان شناسی کے مروجہ اصولوں کے تحت "زبان محلی" کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسے مجموعہ افراد کی زبان کو جو بقول ڈیمبرے "اپنی اکثریت سے کٹ کر رہ گیا ہو" پوری قوم یا قبائل کی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں ان کی زبان یا لفظیات ان کے تاریخی و معاشرتی روابط کے تعین کے سلسلے میں ضرور مدد گار ثابت ہو سکتے ہیں جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔

سرمایہ الفاظ اور اصوات کے اعتبار سے ہزارہ گی بیک وقت آریائی اور تورانی (ترکی) دونوں خصوصیات کی حامل ہے۔ گو اکثر علمائے لسانیات نے زبان کے سرمایہ الفاظ' دستور اور اصوات میں سے صرف دستور و اصوات کو اس قابل قرار دیا ہے کہ انہیں زبان خصوصاً زبان کے ماخذ کے سلسلے میں زیر بحث لایا جائے۔ لیکن چونکہ ہمارا موضوع فی الحال ہزارہ گی کا ماخذ دریافت کرنا نہیں بلکہ اس کی چند خصوصیات کا مطالعہ ہے لہٰذا اس کے ماخذ کی بحث کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

دستور یا قواعد کے لحاظ سے دیکھا جاوے تو ہزارہ گی فارسی کے تابع ہے۔ لیکن اصوات اور سرمایہ الفاظ کے اعتبار سے یہ اپنا علیحدہ تشخص رکھتی ہے جسے مغربی محققین Hazara s own dialects of persian. قرار دیا ہے۔

علمائے لسانیات' الفاظ مانعہ کو اس بنیاد پر زبان کا بنیادی سرمایہ تصور نہیں کرتے کہ "ان میں بڑے پیمانے پر سے لین دین ہو جاتا ہے اور تجارتی سامان کی طرح اس زبان کے الفاظ اس زبان میں اور اس

الفاظ اس زبان میں چلے آتے ہیں۔" (۱۴) لیکن سرمایہ الفاظ کو یکسر نظر انداز کرنا بھی درست نہیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ انہیں اصوات کی پشت پناہی بھی حاصل ہو۔

اصوات کے لحاظ سے ہزارہ گی فارسی کے مقابلے میں ہند آریائی زبانوں کے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ ہزارہ گی کے متداول لغات میں ہزارہ گی کے حروف تہجی کی جو تفصیل ملتی ہے اسے اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

الف ب پ ت ٹ ث ج چ خ د ڈ ر ز س ش ص
غ ف ق ک گ ل م ن و ہ "اور" ی

ہزارہ گی کے لغت نویسوں خصوصاً علی اکبر شہرستانی اور محمد عوض۔ نبی زادہ کار گرنے فارس بھی میں ان چھبیس حروف تہجی میں "ڑ کو شامل نہیں کیا ہے جبکہ ہزارہ گی میں اس کی آواز واضح طور پر موجود ہے۔ چنانچہ خود شہرستانی اور کارگرنے اپنے لغات میں ڑ کے مندرجہ ذیل ہزارہ گی الفاظ درج کئے ہیں۔

غڑغو= دیگ بزرگ مسین= تانبے کا بڑا دیگچہ

غڑغلا= غال مغال

گڑدم گڑدم= معروف است کہ عقرب باشد= بچھو

گڑدمک= پارۂ آہن کو چکی کہ در پیش بوت زنند= لوہے کا چھوٹا سا ٹکرا جو بوٹ کے سامنے لگایا جاتا ہے۔

یوں ہزارہ گی میں "ڑ" کے حرف تہجی یا صوت کے ساتھ حروف تہجی کی تعداد ستائیس ہو جاتی ہے۔ اور نیز فارسی میں مستعمل عربی کے مندرجہ ذیل حروف یا اصوات کم ہو جاتی ہیں:

ث
ح
ذ
ض
ط
ظ
اور
ع

جبکہ ان میں ٹ Hard T اور ڈ Hard D کی اصوات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔(۱۵)

آغاز حرف میں وہ الفاظ جن میں "ح" کا استعمال ہوتا ہے ہزارہ گی میں اس کی جگہ الف مقصورہ یا الف ممدودہ استعمال ہوتا ہے جیسے حلوہ کے بجاوے آلوہ۔ یا "حالدہ" بمعنی اب یا ابھی کو ہزارہ گی میں "آلی" تلفظ کیا جاتا ہے ع

آلی کہ و جنگ دوشمنوں خو مورید
بورید و فتح کدہ پسکی لی بیید

عبداللہ افغانی نویس نے لغت عامیانہ فارسی دری افغانستان میں ہزارہ گی میں حائے حطی کی تبدیلی کو یوں وا

گیا ہے:(۱۴)

فاتحہ = (فاتحہ) دعای کہ بر میت و بعد از ختم طعام کنند۔

فاتحہ رفتن = نزد بازماندگان میت برای دعا رفتن۔

فاتیا گرفتن = کنایہ گلیم انداختن۔ غراواری کردن

Hard T "ٹ"

"ٹ" یا تائے ہندی ' فارسی کے حروف تہجی یا فہرست اصوات میں شامل نہیں۔ اس کے بجائے یہ ہند آریائی زبانوں کی مخصوص آواز ہے۔ ہزارہ گی میں ٹ کی موجودگی ترک منگول اور ہند آریائی خاندان السنہ کی تال میل کی نشاندہی کرتی ہے۔ ذیل میں ہزارہ گی کے چند ایسے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جن میں "ٹ" کی آواز واضح ہے۔

ہزارہ گی	فارسی	اردو ترجمہ
اٹکی	بافت موی	چوٹی گوندھنا۔ چوٹی۔ جوڑا وغیرہ
اٹکل	حدس۔ پندار۔ گمان	گمان۔ دھوکہ۔ اندازہ
اصطلاح ہزارہ گی:مہ از دور اٹکل دیگہ کس کدوم (میں دور سے یہ سمجھا کہ اور کئی آرہا ہے)اثبات۔		
اٹف	علامت تصدیق	اثبات ۔ ہوں کرنا۔ ہاں کرنا
ٹکہ	نریز۔ نرخصی ناشدہ	بکرا۔ خصی ناشدہ بکرا
سٹہ	بزرگ	بڑا۔ بزرگ۔ مثال شعری:
		بلدہ ولجہ کدو جنجال نکونید
		نام سٹہ کلون خور سال نکونید
سٹہ پی	پود گلیم	کمبل یا اونی کپڑے کا ریشہ
سٹہ گیر	خدمتگار۔ نوکرزن	خادمہ۔ نوکرانی
ٹوپ کدو	جست زدن۔ حملہ کردن	چھلانگ لگانا۔ حملہ کرنا۔
		اصطلاح ہزارہ گی:از بلے دیوال ٹوپ کد
		(اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگا دی)
کٹوک	حلقوم۔ گلو	حلق ۔ گلا۔ نرخرہ
کوٹو	غم۔اندوہ۔ ارمان	رنج۔ دکھ
کٹوٹی	کاسہ چوبین۔ خمرہ	کاٹھ کا پیالہ
ٹکی	مدور۔ نان کوچک	گول‌ٹکیہ۔ روغنی روٹی یا ٹکیہ
ٹیکی	نان روغنی	اصطلاح ہزارہ گی : دنیا وہ سرمہ ٹیکی شدہ
		(دنیا میرے لیے گول (تنگ) ہوگئی ہے)
ٹاٹ	لانہ زیرزمینی	بھٹ۔ جانوروں کے زیر زمین غار وغیرہ
ٹاکور	اسپ کم بہا۔=یابو	ٹٹو
ٹوٹوک	چکش نوک تیز	ہتھوڑے کی ایک قسم

ٹٹول	آب گل آلودہ	گدلا پانی
ڈٹا	سگ۔ کلب۔	کتا
ڈٹھ		
ٹشا		
لوٹھ	دستانہ۔ عمامہ	صافہ۔ عمامہ۔ پگڑی
ونٹی	عمل قطع کردن۔ شکستن	توڑنا۔ ٹوٹنا
وٹنک	عمل شکستن گردن	گردن ٹوٹنا۔ گردن ٹوٹنے کا عمل
منٹی	خرد۔ کوچک	چھوٹا۔ چھوٹی
ٹچی	تحریک۔ اغراء۔	اکسانا۔ ترغیب دینا۔ اصطلاح ہزارہ گی: اورہ چٹی ددہ آخردہ جنگ چل کد۔ (اسے اکسا کر آخر لڑائی دیا)
ڈٹھ	گل کنہ۔ جای کہ از آن گل برند۔	گارہ بنانے یا گیلی مٹی بنانے کی جگہ۔
اوٹھ	آن۔ اشارہ	وہ۔ وہاں۔ اشارہ
اڈوکوٹ	تصادفاً" مقابل شدن	اتفاقاً" آمنا سامنا ہو جانا۔ دفعتاً" سامنے آ جانا۔
غمٹ نمول	برہم زدن۔ پراگندگی	درہم برہم۔ معاملہ بگڑ جانا۔
سنگ ٹول	مرغی است کوچک با منقار دراز و پرہای خاکستری	لمبی چونچ اور خاکستری رنگ کا ایک چھوٹا سا پرندہ۔
ٹکری	تندرست و نیرومند	توانا۔ باہمت۔ تندرست و جفاکش
پٹ	مخفی و پنہان	پوشیدہ۔ پنہان۔ چھپا ہوا۔
پٹ پٹ	نہاں نہاں	چپکے چپکے
پٹ خاکی	نوعیت از بازی دندہ کلک طفلان	بچوں کا ایک کھیل
پٹکی	پنہانی	چھپ چھپا کر۔ پوشیدہ طور پر۔
پٹ ران	ضخامت ران	ران۔
پٹو	شال ریشمی کہ زنہا و مردہا بدور خود گیرند	ریشمی شال جو خواتین و مرد عموماً" اپنے گرد لپیٹتے ہیں (یا اوڑھتے ہیں)
ٹاٹ	۱۔ پارچہ درشتی کہ از آن بوری وغیرہ سازند ۲۔ بوری کہ جوال کوچک است	۱۔ ٹاٹ جس سے بوریاں تیار کی جاتی ہیں ۲۔ چھوٹی بوری
سکل	پالان اسپ و مرکب	گھوڑے کا پالان۔ زین۔ کاٹھی وغیرہ
لیکٹ	درہم و خراب	درہم برہم
اٹالہ	قیمت تخمینی	اندازاً قیمت۔ تخمینی لاگت۔ تخمینہ
ہٹنک	کوتاہ قد۔	پست قد
لیٹی	نوع غذا از آرد جواری	جوار کے آٹے سے تیار کی جانے والی ایک غذا۔

ٹچی	فضول و بے معنی	فضول وبے ہودہ باتیں۔ یا وہ گوئی
سٹہ	۱۔ چوب دست چوپان۔	چھڑی یا لاٹھی جس سے چرواہے بکریاں ہانکتے ہیں۔
	۲۔ چوبی کہ بہ آن کالا را دروقت شستن زنند۔	کپڑے دھونے کا ڈنڈا
گٹ	آمیختہ۔ ممزوج	خلط ملط شدہ۔ رل مل جانا۔
گٹ شدن	خلط و ممزوج شدن	خلط ملط ہو جانا گھل مل جانا۔
گوٹکہ	اندوختہ	جمع پونجی
ٹوٹہ	پارچہ و تکہ	کپڑے کا ٹکڑا نیز کسی بھی چیز کا ٹکڑا
ٹوکور	تفتی کہ با عصای	ٹکور کرنا۔ سکائی کرنا۔ سیکنا۔
ٹکر	ضرب خوردہ رہانند	
خانہ ٹکانی	جارو کردن و تکان دادن فرش خانہ۔ گھر کی جھاڑو بہارو کرنا۔ گھر کو صاف ستھرا کرنا۔	
کٹہ پای	کسیکہ پای بزرگ دارد	بڑے پاؤں والا۔
کٹہ سر	سرا سر کٹہ	رئیس و سرغنہ سردار۔ سربراہ۔ بڑے سر والا۔
کٹہ کٹہ گفتن	سخن متکبرانہ گفتن	شیخی بگھارنا۔ بڑا بول بولنا۔
گوٹ	چوب مخروط میان سوراخی کہ بر آن تار وچہ مدہ سپچند۔ نیز دانہ سطرنج	مخروطی شکل کی ایک کھوکھلی لکڑی جس پر چمڑا اور تار لپیٹ کر کھیلتے ہیں۔ نیز شطرنج کے مہرے۔
ٹونڈی	چندی گرفتن	چغلی بھرنا۔
ٹنگ	آواز۔ صدا۔	آواز۔ کسی چیز کی دھات سے ٹکرانے کی آواز۔
ٹنگ	ختم۔ ناراحت۔	ناراض۔ خفا
ٹن ٹی	پستہ قد۔	کوتاہ قد۔ بونا۔ مثال شعری: ٹن ٹی خاتوپس سرگی رئی شدہ ٹوکری ش پر شیدہ ہسکی رئی شدہ

لغات اور کتب فرہنگ کے علاوہ ہزارہ گی کی عام بول چال سے "ٹ" کے حامل الفاظ کی مثالیں جمع کی جائیں تو یہ تعداد کئی ہزار سے تجاوز کر جا ئے گی۔ تاہم ذیل میں فارسی اور عربی کے ایک معروف ہزارہ شاعر استاد بیانیؔ کے چند ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں "ٹ" کے حامل الفاظ اور اصوات پوری طرح نمایاں ہیں۔

اقتباس از نظم بعنوان "وصیت نامہ یک شہید"

آلی گو گوش کیند تو رہ کٹہ خور
منہ خو ایل کیند پرو پٹکہ خور
منہ خو ایل کیند پرو پٹکہ خور

همه دست بله دست سگر هوش کید
چدو قوره سگه کلون گوش کیه

هوش خوربگید که بیو مو کته کاره
جدا موکته خواره از براره
موکه جنگای مووررای خدایه
دست مووداموں شیر خدایه
بلده و لجه کدو جنجال تکو نیید
نام سگه کلون خور اسال تکو نیید

اوله توغ سنید کار سگه ره
که کار مو از اول ازدست مونره

اقتباس از نظم بعنوان "نو بد سنگ"

آلی گونبد سگر در موبه
آبه بوگوئید کالتہ بوشوبه
نیکی پخته کنه دخرخ رای مو
اکو موری پنای موشد خدای مو

اقتباس از نظم بعنوان "مادری برسر قبر جوانش۔"
شهید رای خدا باچه آبه خو
نیای تو با خدا باچه آبه خو
باچه سگه موشد چراغ رای مو
غمای موتر کس نمید نه جز خدای مو

"ڈ" یا Hard D کی آواز اور حرف تہجی بھی فارسی کے بجائے ہند آریائی زبانوں کی مخصوص آواز ہے اور ہزارہ گی میں موجود "ڈ" کے الفاظ بھی اسے فارسی سے خاصہ علیحدہ کر دیتے ہیں۔ ذیل میں سابق الذکر کتب اللغات سے ہزارہ گی میں موجود "ڈ" کے الفاظ کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ہزراہ گی	فارسی	اردو
اڈوکوٹ	تصادفامقابل شدن	اتفاقایایکایک سامنے آنا۔ اچانک سامنا کرنا۔
پنڈک	بستۂ کوچک	چھوٹی یا مختصر گٹھڑی۔

پنڈکی	مرادف پنڈک	چھوٹی گٹھڑی یا پوٹلی
کاڑہ گک	نوعی ملفیت کہ میان گندم روید و در کابل آنرا گندک گویند۔	ایک مخصوص گھاس جو گندم کی فصل میں اگتی ہے اور جسے کابل میں گندم کہا جاتا ہے۔
کوڑال	سر سخت۔ طاقتور	طاقتور۔ مضبوط
کوڑہ ای	شلند	ڈھیر
پنغ	گیاہی است کوہی بابز گیاہی پہن و دراز و شیرہ آن بوی ناخوش آید دارد۔	بڑے اور لمبے پتوں والی ایک قسم کی گھاس جس کے رس سے ناگوار بو آتی ہے۔
ماکوڑ	در آتش بریان شدہ	بھنا ہوا۔ جلا ہوا۔
منڈیل	دستار۔ عمامہ	دستار، پگڑی، عمامہ
پڑ	کچل۔ لگن۔	لنگڑا
پاڑہ	درختی است کہ در کنار دریا در جای گرم روید	ایک قسم کا درخت جو گرم علاقوں میں دریا کے کنارے اگتا ہے۔
پیڈک	بازی است کہ میان یکدائرہ انجام دہند	ایک قسم کا کھیل جو (بچے) عموماً دائرے کی شکل میں بیٹھ کر کھیلتے ہیں۔
پوڑ	نیم زبان۔ کسیکہ حرف راوا نکنڈ	تو تلا
غنڈک	قنداق	بندوق کا بٹ
بوغونڈی	تپہ و بلندی	سطح مرتفع۔ ٹیلہ۔ بلندی
پنڈی	خود را جمع و یک مشت گرہ زدن	اپنے آپ کو سمیٹنا یا سکڑنا۔
پوڑہ	نازک۔ سست	نازک۔ سست۔ ناپائیدار
پولنڈولچی	پندیدن۔ آماس کردن	سوجنا۔ ورم آ جانا۔
گوڈی	انبان	ایک قسم کا چمڑے کا تھیلا
گنڈولہ	نانی از جو و باقلی	جو کے پراٹھے۔ مخصوص روٹی جس میں جو اور روغن استعمال کیا جاتا ہے۔

وعلیٰ ہذاالقیاس

گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہزارہ قبائل کے خدو خال کے ساتھ ساتھ ان کی زبان پر بھی منگولیائی چھاپ نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں بابو خدائے نذر تمبری (۱۸) نے اپنے ایک مکتوب (بنام راقم) میں بڑی فکر انگیز اور پتے کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہزارہ قبائل کی زبان ہزارہ گی کو ماہرین متروک خراسانی فارسی ARCHAIC KHURASAN PERSIAN کہتے ہیں۔ اس میں بعض زیادہ ترکی اور منگولی الفاظ شامل ہیں۔ خصوصاً:

(۱) بدن کے اعضاء کے نام۔
(۲) رشتوں اور رشتہ داروں کے نام۔
(۳) زراعت اور مدنیت سے متعلق الفاظ۔
(۴) حکومت اور جنگ سے متعلق الفاظ وغیرہ وغیرہ۔

مثلاً اعضائے بدن= ہزارہ گی میں سر کو توقہ، گدی کو گیدکہ، ماتھے یا پیشانی کو چوقو، رخسار یا گال کو کومہ، ابرو کو قاش، مژہ کو کرپک، آنکھ کو اوقہ، کنپی کو توقہ، شکم یا پیٹ کو کورہ، دانت کو ایرم، انگوٹھے کو ایرک، ہتھیلی یا کف دست کو ایلقہ کہتے ہیں جو سب کے سب ترک منگول الفاظ ہیں۔"

ہزارہ گی میں رشتوں اور رشتہ داروں کے لیے جو الفاظ مخصوص ہیں بابو خدائے نذر نے ان کی بھی فہرست دی ہے:

ماں --	آنیکہ
باپ --	آتہ یا اتہ
بہن ---	باجی
ماموں--	تغی
چچا/تایا--	تغائی۔ تاتا
دادا ۔ نانا---	باکل۔ .کلہ
دادی/نانی--	آجہ
پردادی/پرنانی--	آچل
خالہ زاد--	بولہ
دلہن--	بیری

ہزراہ گی میں منگولیائی اور ترک لغات کے بارے میں بابو خدائے نذر مزید لکھتے ہیں کہ "جس قدر ذات "Self" کے قریب تر ہوتے جائیں، غیر فارسی الفاظ زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔"

دانشگاہ کابل کے استاد شاہ علی اکبر شہرستانی اپنی کتاب "قاموس لہجہ دری ہزارہ گی" میں، جس میں انہیں نے ہزارہ گی جس میں مستعمل ۱۴۸۸ غیر فارسی الفاظ کا جائزہ لیا ہے، رقمطراز ہیں کہ:

"ہزارہ گی زبان اصلی خراسانی دری کی ایک شاخ ہے اور اس نے جس طرح دوسری زبانوں کے لغات کی حفاظت کی ہے اس کی مثال دری زبان میں بھی نہیں ملتی۔"

شہرستانی نے اپنی قاموس میں مندرج الفاظ میں سے تقریباً اسی فی صد کو ترک منگول خاندان السنہ کی زبانوں قلماق، قرغیزی، قازاقی اور ترکی چغتائی وغیرہ سے اور باقی ماندہ بیس فیصد کو دری، پشتو اور ہندی وغیرہ سے مشتق یا مستعار قرار دیا ہے۔

ایلزبتھ بیکن جس نے ۳۹-۱۹۳۸ میں ہزارہ منگول قبائل پر تحقیق کے سلسلے میں افغانستان کا سفر اختیار کیا تھا، اپنے مقالے بعنوان

An Inquiry into the History of Hazara Mongols in Afghanistan.
میں ہزارہ قبائل کے بارے میں یہ سوال اٹھاتی ہے:

"That they(the HazaraMongols) weredescended from military garrisons left in Afghanistan by Changgis Khan in the early part of the the thirteenth century A.D as is frequently stated by European writers seemed open to question. If the ancestors of the Hazaras came directly from Mongolia to Afghanistan why did their language an archaic persian contain so many turkic words than Mongol."

ترجمہ: "یہ سوال کہ یہ لوگ (ہزارہ قبائل) جیسا کہ یورپی مصنفین کی طرف سے کہا جاتا ہے، چنگیز خان کے ان فوجی دستوں کی باقیات ہیں جو اس نے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں افغانستان میں رہنے دیئے تھے، تاحال تشنہ جواب ہے۔ اگر ہزارہ قبائل کے آباؤاجداد براہ راست منگولیا سے افغانستان آئے تھے تو ان کی زبان میں جو قدیم فارسی ہے، منگولی کے بجائے ترکی الفاظ بہت زیادہ کیوں ہیں۔"

اس نکتے پر مختلف زاویوں سے بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ہزارہ قبائل کا تعلق منگول فوجی دستوں کے بجائے چغتائی دستوں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہے:-

"It would appear that the present Hazara Mongols are not from military garrasions planted by Changgis Khan but from Mongol troops many of them chagatain who entered Afghanistan at various times during the period from 1229 to about 1447 A.D"

ترجمہ: "یوں لگتا ہے کہ موجودہ ہزارہ منگول چنگیز خان کی سپاہ کی باقیات نہیں بلکہ ان کا تعلق ان منگول فوجی دستوں سے ہے جن میں سے بہت سے چغتائی تھے اور جو ۱۲۲۹ سے ۱۴۴۷ عیسوی کے عرصے میں مختلف اوقات میں افغانستان میں داخل ہوئے۔"

الزبتھ بیکن کی سنون و تقویم کی بحث سے قطع نظر جب ہم ہزارہ گی کے سابقوں اور لاحقوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں منگولی اور ترکی دونوں زبانوں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ خاص طور پر چند لاحقے تو ہزارہ گی کو ترکی چغتائی اور ترک منگول لہجوں اور زبان سے تقریباً متصل کر دیتے ہیں۔ ذیل میں ایسے چند لاحقوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ہزارہ گی کے چند ترک منگول لاحقے

لو۔

ترکی چغتائی کا یہ لاحقہ ہزارہ گی میں مکان و زمان اور اسم سے پیوست ہو کر فعل کی وضاحت کرتا ہے جیسے:

تیلو (تہ + لو)= از زیر ــ نیچے سے یا نیچے کی طرف سے

برلو (بر+ لو)= از بالا ــ اوپر سے یا اوپر کی طرف سے

بغلو (بغل + لو)= از کنار۔ ازدامن ــ کنارے سے یا ایک طرف سے

جغه لو (جغه + لو)= از کنار و گوشه — ایضاً — ایضاً
شولو (شب (شو)+ لو)= شب ہنگام — رات کے وقت
(کئی آریائی زبانوں کی طرح ہزارہ گی میں بھی ب ’ن اور "ان" وغیرہ کی اصوات "و" میں تبدیل ہو جاتی ہیں بلکہ یوں کہا جاوے تو نامناسب نہ ہو گا کہ ہزارہ گی میں ان اصوات کی "و" میں تبدیلی کا عمل دیگر تمام زبانوں سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے۔ اس تبدیلی اصوات پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے)

لاحقہ لو کی چند مثالیں

اکوبیہ اکوبیہ تیلون تمباکو بیا — تیلو (تہ + لو)
راه برلون خوره تیلو کده رفت — برلو (بر+ لو) و تیلو
اگر یار مدی شولو بیای — شولو (شو+ لو)
ترنگ ترنگ ته دالو بیای

لہ

یہ لاحقہ ترکی زبان کے مختلف لہجوں قازاقی’ ترکمنی’ او سغوری وغیرہ کی طرح ہزارگی میں بھی "امر" کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قازاقی اور ترکمنی میں:

آبای لہ۔ احتیاط کرو
سینبر کہ۔ آہستہ بولو
سوز لہ ۔ بولو۔ کہو
بغلہ۔ بند کرو
ہزارہ گی میں اس سے مصدر فاعلی کے ذریعہ امر بناتے ہیں جیسے:
قخلہ کو — دھوپ میں سکھاؤ یا آگ پر خشک کرو۔
اس کے علاوہ لاحقہ "لہ" ہزارہ گی میں صفت کے طور پر بھی مستعمل ہے مثلاً سولہ۔ نرم

جی’چی

یہ دونوں لاحقے خفیف اختلاف صوتی کے باوجود ایک ہی ہیں اور فعل کو وجہ مصدری کے ذریعہ اسم یا امر سے ملاتے ہیں اور انہیں فاعل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ نیز فعل کی معاونت کرتے ہیں ۔:

قوره جی کد= مرد= مرگیا ۔ وفات پا گیا۔
غولجی کده= بیزار شده است = تنگ آچکا ہے۔ بیزار ہو گیا۔
قره جی موکونہ= تماشه می نماید= تماشہ دکھارہا ہے۔ (مرادی= مکر کر رہا ہے وغیرہ)
اسی طرح یہ لاحقہ فعل کی معاونت بھی کرتا ہے۔ جیسے۔:
بوغوجی= گور کردن’ انداختن در چقری= گاڑنا۔ گڑھے وغیرہ میں دبا دینا۔
چیلو قیمچی= اداره کردن= انتظام کرنا۔ بندوبست کرنا۔ مرتب کرنا۔
بوئجی= بوی کردن = سونگھنا

لاحقہ چی ترکی زبان نیز چغتائی میں فاعلیت کے لیے مستعمل ہے۔ ہزارہ گی میں بھی اس کا استعمال اسی طرح

یہ جز جب اسم کے ساتھ آئے تو اسے بھی فاعل بنا دیتا ہے۔
خاشہ چی= ہیزم شکن۔ خارکش = لکڑہارا' جنگل سے لکڑیاں اور گھاس وغیرہ جمع کرنے والا۔
توی چی= کسیکہ مراسم عروسی بہم گرفتہ است= شادی میں شرکت کرنے والا۔ باراتی
ایل چی= قاصد' پیام دہندہ= قاصد' ایلچی
(اردو میں بھی اس لاحقے (چی) سے باورچی' ڈھنڈورچی مشعلچی' طبلچی توپچی وغیرہ بنائے جاتے ہیں)
اس لاحقے سے ہزارہ گی میں تشابیہ کا کام بھی لیا جاتا ہے اور تشبیہ دی جاتی ہے جیسے سولہ= نرم'
سے سولہ چی' چنانچہ اصطلاح ہے
از گشنگی سولچی کدہ بود= از گرسنگی بے حال افتادہ بود= وہ بھوک سے نڈھال ہو گیا تھا۔

قو

اس لاحقے کے سلسلے میں شہرستانی رقمطراز ہے کہ "یہ لاحقہ خالص ترکی زبان سے تعلق رکھتا ہے لیکن لہجہ ہزارہ گی کے زیر اثر اصل ترکی لاحقے "قون" کا 'و' گر گیا ہے۔" ترکی اور اس کے دیگر مختلف لہجوں میں یہ لاحقہ بدستور قون یا قن کی شکل میں مستعمل ہے۔ یہ لاحقہ عام طور پر ہزارہ گی میں مروج و مستعمل اسماء ترکی سے پیوست ہوتا ہے اور کیفیت یا صفت کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً:

چپقو= طوفان بادوباراں
قوشقو= پردم۔
تپقو= تلہ روباہ گیر۔دام=لومڑی پکڑنے کا جال۔ پھندا

الچی

ترک منگولی کا یہ لاحقہ ہزارہ گی میں فعل لازم کو متعدی میں تبدیل کرتا ہے اور ---- اسمائے معنی' صفات اور صیغہ امر کے آخر میں آتا ہے۔ جیسے

ار غلچی= بیدار کردن' خیزاندن= اٹھا دینا۔ سوتے سے بیدار کر دینا۔
باچہ را از خاوار غلچی کد۔۔ پسر را از خواب خیزاند= بچے کو نیند سے جگا دیا۔ گوسلگون خورہ سیرلچی کد= گئو سالہ ہای خودرا سیرگدانید= اپنے بچھڑوں کو چرا کر لے آئے۔
گوسپونہ ازبلی بن دیلچی کد= گوسفند را از سرتپہ غائب کرد۔ بھیڑ کو ٹیلے پر سے بھگا دیا۔
ناجورہ آو او پلچی کد= ناجور را آب نوشانید= بیمار کو پانی پلایا۔
الفولچی= کسی را وا دار کردن' بہ گام انداختن= اکسانا' ترغیب دینا۔
بولغولچی= آب کش کردن کالد= کپڑے کھنگالنا۔ (کپڑے دھونا نیز)
دو تلچی= گر یختاندن= بھگانا۔ بھگا دینا۔

لو

ایک اور لاحقہ جو ہزارہ گی میں کثرت سے مستعمل ہے ترکی اور مغولی دونوں زبانوں میں بھی عین انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہزارہ گی میں۔ وہ لاحقہ' لو' ہے۔ اردو میں اس کے مترادف "والا" اور فارسی میں دار' ور یا مند کا لاحقہ استعمال ہوتا ہے جیسے گوالا' بندر والا' دولتمند' مالدار' دھاریدار' رنگدار' دانشمند' طاقتور' دانشور وغیرہ وغیرہ۔ ہزارہ گی میں درج ذیل مثالیں اس کو واضح کرتی ہیں:

مرکہ تو = ناز وادہ = لاڈلا' لاڈلی۔
جرگہ تو = نیرومند = بہادر' شجاع
چینہ تو = خانہ دار = گھر والا' گھر بار والا۔ صاحب خانہ۔ صاحب مکان وغیرہ
بچہ تو = صاحب فرزند = بال بچے دار نیز صاحب فرزند۔
شیر تو = شیر دار = دودھ دینے والی۔ (بکری' گائے وغیرہ کے لیے)
سایہ تو۔ دارای سایہ و نیز کسیکہ اجنہ در روحش حلول کردہ باشد =
سایہ دار یا ایسا شخص جس پر جن وغیرہ کا سایہ ہو۔

حسین علی یزدانی اس لاحقے کے بارے میں رقمطراز ہے:

"این پسوند مغلی است۔ زیرا در زبان مغلی کا ربرد زیاد دارد۔ نام عدہ ای از شخصیتہای مغولی دارای این پسوند بودہ است مانند:

جابا نماتو = برگزیدہ از جانب خداوند' نامی یکی از سرداران مغل۔
گیغا تو = نام یکی از ایلخانان 'اوگک تو' نام یازدہ ہمین نفراز خانان۔
مغلستان۔" (۱۹)

ترجمہ: "یہ لاحقہ (تو) مغلی ہے اور مغلی زبان میں کثرت سے اس کا استعمال ہے۔ مغول شخصیات میں سے متعدد کے ناموں میں یہ لاحقہ موجود ہے۔ جیسے' جابا نما تو:(خدا کی طرف سے چنا ہوا) جو سرداران مغل میں سے ایک کا نام تھا۔ نیز گیغا تو' ایک ایلخانی کا نام اور۔۔۔ اوگک توکہ مغلستان کے گیارھویں فرمانروار کا نام تھا۔"

یزدانی اس سلسلے میں مزید لکھتا ہے کہ "لاحقہ تو لہجہ ہائی ترکی میں بھی پایاجات ہے۔ مثلاً جرگتو' جرگہ بمعنی دل یا (جرات + تو)= دل والا' دلاور' جرات مند۔۔۔ ہزارہ گی میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں مستعمل ہے اور اس کا سابقہ بے جرگہ بمعنی بزدل یا کم ہمت کے معنوں میں۔ضرب المثل ہزارہ گی'

باچہ جرگہ تو بخش قومہ۔ بہادر بیٹا اپنی قوم کے لیے (خدا کا عطیہ) ہے۔

شہرستانی بھی ہزارہ گی کے لاحقے 'تو' کو ترکی اور مغلی دونوں زبانوں سے متعلق قرار دیتا ہے نیز اسے انہی دونوں زبانوں کے حوالے سے "دری" میں بھی مستعمل سمجھتا ہے:۔

این پسوند درمتون کہنہ دری از زبان ترکی و مغلی دخیل شدہ است و درزبان گفتاری ترکی نیز ہست مانند:

جامع التواریخ۔ الجاتیو: الجای= تخت ' عزت +تو)
صاحب تخت کہ لقب یکی از شاہان مغلی دورۂ ایلخانیان بودہ است۔
قطعات عشرہ۔۔ نیرہ تو= نامدار
پنج رسالہ حافظ آبرو۔ طلا تو= جای کہ گوسفند وحشی داشتہ باشد۔"

لاحقہ "تو" کا استعمال ہزارہ گی میں دخیل تمام زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے جیسے اوپر کی مثالوں میں شیر' فارسی(شیرتو) عیال' عربی (عیالتو) یا الجہ' ترکی مغلولی (الجاتیو) نیز یہی کلمہ الجہ یا اولجہ انہی معنوں یعنی تخت' عزت ' مال غنیمت کے معنوں میں ہزارہ گی میں بھی موجود ہے جیسے:

بسے   و   لچہ   موکنم   دیگہ   تفنگ   شیر
اول   خدا   موکنوم   یک   دہ   تلر   شیر

تبدیلی اصوات

زبان شناسوں نے مختلف اصوات کی کثرت اور صوتی تبدیلیوں کی وجہ سے مختلف زبانوں کو مختلف حروف تہجی یا اصوات سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً عربی زبان کو "ظ" کی کثرت کی وجہ سے "ظ" کی زبان اور ترکی کو "ت" کی کثرت کی وجہ سے "ت" کی زبان کہا گیا ہے۔ اسی قیاس پر ہزارہ گی کو اگر "الف" "ب" "ن" اور "الف ن" نیز "گ ان" (جمع فارسی) کی اصوات کی "و" میں تبدیلی کی وجہ سے "و" کی زبان" کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ الف اور ب کی "و" میں تبدیلی یا اس کے برعکس صوتی تبادل کئی اور زبانوں میں بھی موجود ہے اور فارسی میں بھی اس کی مثالیں جا بجا دیکھنے میں آتی ہیں مثلاً نان کے الف کی و میں تبدیلی یا نوشتن کے و کی ب میں تبدیلی وغیرہ۔ لیکن ہزارہ گی میں یہ صوتی تبدیلی نہ صرف کثرت سے بلکہ لازمے اور خاصے کے طور پر نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"ن" اور "الف ن" کی "و" میں تبدیلی

وہ تمام اسمای اور افعال جو فارسی یا دری وغیرہ میں ن یا الف ن پر مختتم ہوتے ہیں' ہزارہ گی میں ان کی انتہای صدا "و" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی کے تمام مصادر بھی کہ ان کے آخر میں "ن" آتا ہے' ہزارہ گی میں آنے کے بعد "و" میں بدل جاتے ہیں۔ مثلاً

فارسی/دری   ہزارہ گی
انداختن   انداختو
کردن   کدو   مثال شعری: ہزارہ   او   ہزارہ   او   ہزارہ
دشمن   دہ   جنگ   کدو   تاب   تورندارہ

گرفتن   گرفتو
گفتن   گفتو
خواندن   خواندو۔ خاندو۔ مثال شعری: از   دشمو   کدتو   خوبی   ہای   تو   موگہ
از   نماز   خاندو   دو   عای   تو   موگہ

کشتن   کشتو
آمدن   آمدو
مسلمان   مسلمو
ایمان   ایمو   مثال شعری: ارہ   دشمو   شموایمو   ندرہ
دہ   سنگرزور   جنگ   کدوندرہ

دشمن   دشمو
پیراہن   پیرو
سلطان   سلطو

مہمان　　مہمو　　مثال شعری: آمہ خانہ یہ مہومو آمدہ
غیری ندی کہ مند خسو آمدہ

باران　　بارو
دوران　　دورو
تنبان　　تنبو
جوان　　جوو　　مثال شعری: ای گلای تو مرہ شیرہ دادی
بال کدہ مردگ پیرہ دادی
مردگ پیر جای بالی ماموشہ
جو دیچہ نور دیدہ موموشہ

خان　　خو
جان　　جو
نادان　　نادو
جولان　　جولو
افغان　　افغو، اوغو: مثال شعری: جنگ اوغو از راہ رہ چاغ مو کونہ
کم کم بے چارہ بی ایراغ موکونہ

پشیمان　　پشیمو
ریسمان　　ریسمو
نے زن　　نے زو
والدن　　والو　　مثال شعری: ای دیدہ تو صد قیرونہ خوردی
قسمای تہ والو نہ خوردی

و علی ھذا القیاس

فارسی کا قاعدہ ہے کہ اسماء کے آخر میں ہاے ہوز آنے کی صورت میں اکثر "گان" کے اضافے سے جمع بناتے ہیں جیسے بچہ= بچگان، نبیرہ= نبیرہگان، شہزادہ= شہزادگان، ہزارہ=ہزاراگان وغیرہ۔ اسی طرح فارسی میں جمع بنانے کے دو عمومی قاعدے یعنی مفرد کے آخر میں "ہا" یا "ان" کا اضافہ کر کے جمع بنائی جاتی ہے جیسے درخت سے درختان، دختر سے دختران، دہقان سے دہقانان، پدر سے پدران، پسر سے پسران وغیرہ، یا گل سے گلہا، لیکن ہزارہ گی میں جمع کی صورت میں آخر میں "گان" آئے تو عام طور پر "الف ن" کی جگہ "و" لے لیتا ہے جبکہ "گ" کی آواز بدستور قائم رہتی ہے۔ تاہم یہ آواز استثنائی حالتوں میں (جیسا کہ فارسی میں بھی موجود ہے) ک سے بدل جاتی ہے۔ جیسے ہزارہ گی میں بچگان سے بچگو یا بچہ کو وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایسے تمام جانداروں کے ناموں کے ساتھ بھی جن کے آخر میں "و" آتا ہے جمع کی صورت میں "گ و" بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے آہو سے آہوگو خرو (کہ خروس کا مصغر ہے) کی جمع خروگو وغیرہ۔ ہزارہ گی میں جمع کی چند مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

مفرد	جمع فارسی	جمع ہزارہ گی
سوداگر	سوداگران	سوداگرو

چوپان چوپانان چوپنو

هزاره هزاره گان هزره گو

ترکمن ترکمان ترکمنو

افغان افغانان افغونو۔ اوغونو

مسلمان مسلمانان مسلمنومثال شعری: صبانو بعد مال ده دختر دنه
مسلمنو قلی خوردگ بیرونه

درخت درختان درختو

گاو۔ گئو گئوان۔ گاوان گوو

گوسپند گوسپندان گوسپندو

خاتون خاتونا خاتونو

دختر دختران دخترومثال شعری: ای کار ره دخترو موکونه
نان ملده نه پیرو موکونه

ماهی ماهیکومثال شعری: ده لب آو موره یارشی نیسته
اوره خوراک ماهیکو موکونه

پهلوان پهلوانان پالونو

آهو آهوان آووگو

مرد مردان۔ مردکان مردکو

خرو، خروس خروسان خروگو

وعلی هذالقیاس

و میں صوتی تبدیلی کے بعد "ن" اور "الف ن" پر ختم ہونے والے کلمات ہزارہ گی میں اضافت کی حالت میں آنے پر دوبارہ "و" کی جگہ "ن" میں تبدیل ہو جاتے ہیں جیسے:

جوان= "جو": خبر آمد کہ مریم "جونہ" بردہ چراغ روشن بچکونہ بردہ

تنبان= تمبو (تنبو): پیرو تمبون سان کہ کر موکونہ

دختران= دخترو: صبانو بدمال دہ دخترونہ مسلمنو قلی خوردگ بیرونہ

"ب" کی تبدیلی "و" میں

ہزارہ گی کے بہت سے ایسے الفاظ میں جہاں اختتام "ب" یا "اب" پر ہوتا ہے عموماً صوت با، و میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شہرستانی نے اس صوتی تبدیلی کو ایجاز یا قصر سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"در کلماتیکہ مختوم بہ (اب ۔ ٩ باشند اب در داو بشکل امالہ کلمات عربی بہ "و" بدل میشوند کہ این خاصیت در لہجہ ہای مختلف زبان گفتاری دری ہست۔ مگر در لہجہ ہزارہ گی (و) گاہی مکسور و گاہ کاملا مفتوح است۔"

(ب کی و میں تبدیلی بابا طاہر عریاں ہمدانی (٢٠) کے ہاں بھی کثرت سے ملتی ہے۔ خصوصاً وہ "شب" کو عموماً "شو" کہتے ہیں)

وگر شو شد که موجانم بسوزد
گریبان تا بدانم بسوزد

شو تا راست وگرگان می زنند میش
دو زلفینت حمایل کن بوره پیش

"ب" اور "اب" پر ختم ہونے والے اور ہزارہ گی میں ان کی "و" میں تبدیلی کی چند مثالیں:

آب - آو مثال: اگر دنیا را او بگیره مرغاوی (مرغ آبی) دہ بند پای ش۔
تاب - تاو
کتاب - کتو
پرچاب - پرچو
آفتاب - افتو مثال از اصطلاح ہزارہ گی: افتو سون راس کیل شدہ۔
پیتاب - پیتو
تناب - تنو مثال از اصطلاح ہزارہ گی: چونہ دتنو جلنہ کو۔
چوب - چو
سیب - سیو
خواب - خو دوش رفتم ۔۔۔ شو نبود نیم شو بود
شب - شو یک ضح ستادم ماہ چورک دہ خوبود

اسم، فعل اور مصادر کے ن اور الف ن نیز ب اور الف ب پر ختم ہونے والے الفاظ کی ہزارہ گی میں "و" میں تبدیلی کے علاوہ ضمیر اور ان کے معاون افعال میں بھی "و" کی صوتی تبدیلی واضح طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ جس طرح مصادر میں گفتن، گفتگو میں اور کردن کردو یا خوردن خوردو میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح ضمیر "ما" کا الف "و" میں تبدیل ہو جاتا ہے یعنی ما کی جگہ مو کہا جاتا ہے جبکہ مخاطب واحد یعنی "من" کا "ن" الف میں تبدیل ہو کر اسے "ما" میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اوپر بابا طاہر عریاں کی دو بیتی سے "ب" کی تبدیلی "و" میں (شب کی جگہ شو) بطور مثال پیش کی گئی تھی۔ ان کے کلام میں واحد مخاطب یعنی "من" کو "مو" کہا گیا ہے نہ کہ ہزارہ گی کی طرح "ما" کو مو میں یعنی الف کے بجائے "ن" و میں تبدیل ہوا ہے جیسے:

موکہ مست از می انگور باشم! چرا از ناز نینم دور باشم
موکہ از آتشت گری نہ دنیم! چرا از دود محنت کو رباشم

(بابا طاہر عریاں کی مثال بر سبیل تذکرہ ہے تاہم محل نظر رہے کہ قدیم فارسی لہجے میں بھی ب کی تبدیلی و میں ہوتی ہے جیسے کہ بینم کی جگہ وینم استعمال ہوا ہے۔)

ذیل میں زبانوں کے مطابق کچھ مصادر کی مثالیں افعال کے تحت پیش کی جاتی ہیں جن سے "ی" کی صوتی تبدیلی "و" میں "واضح ہوتی ہے۔

ی کی تبدیلی و میں۔ زمانہ حال۔ فعل گفتن= گفتو

فارسی	ہزارہ گی	
می گوی	موگی	
می گو یید	موگید ۔ موگین	
می گویم	موگوم	
می گوییم	موگیم ۔ موگی	
می گوید	موگہ :	اخوند موگہ بی اید بورید دیگہ: کہ واجب گشتہ از گفتہ پیمبر
موگونید	موگن۔:	یکی را خان و لیودال موگویہ: دیگہ شرملت خور و بد حال موگویہ
	موگویہ	ولچہ سنگر موگہ سودا نموشہ: فروختہ ش دکس روا نموشہ

زمانہ حال فعل کردن= کدو

می کنی ۔	موکنی (مونی):	بلدی ہر تورہ او دیو برمونی۔
می کنید۔	موکنن (مونن)	
می کنم۔	موکنوم (مونوم)	
می کنیم۔	موکنی (مونیم۔ نیم)	
می کند۔	موکنہ (مونہ۔ منہ):	دسنگر جنگی زور مورہ ندرہ: از جنگ داخلی موکنہ بی چارہ
می کنند۔	موکنن (مونن):	دہ یلی دل خودوکری موکنہ وہ = دل خود مقتی موکنہ

زمانہ حال کے علاوہ ہزارہ گی میں زمانہ ماضی میں بھی "ی" کی تبدیلی واضح ہے۔ ذیل میں ماضی استمراری سے اس تبدیلی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

می گفت ۔	موگفت	
می رفت۔	مورفت	
می گفتم۔	موگفتم	
می رفتم ۔	مورفتم	وعلی ھذاالقیاس۔

غرض ہزارہ گی، فارسی کے عموی دستور لیکن ترک منگول لفظیات سے مالا مال اور تورانی خاندان السنہ کے لاحقوں، تراکیب اور لغات پر مشتمل ایک ایسی زبان ہے جس میں فارسی کے الفاظ قابل لحاظ تعداد میں صوتی تبدیلیوں کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ اس مقالے میں ہزارہ گی کی چند خصوصیات اور خدوخال کا ابتدائی اور سرسری اور تعارفی جائزہ لیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زبان شناسی کے ماہرین اور محقق اس پر توجہ دیں کہ اس سے تازہ موضوعات اور علم لسانیات نیز دیگر متعلقہ علوم کے حوالے سے کئی مفید پہلو سامنے آ سکتے ہیں۔

حواشی

۱۔ شعرا لعجم اور لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا

۲۔ ڈسٹرکٹ سینسس رپورٹ ضلع ہزارہ

۳۔ ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم تقریظ و ترجمہ از یوریج سنگ میل لاہور

۴۔ اکبر نامہ ذیل حوادث سال ۱۰۰۹ھ

۵۔ تاریخ سندھ از اعجازالحق قدوسی۔

(۱) جس وقت مضمون لکھا گیا' جنرل محمد موسیٰ بقید حیات تھے۔

۶۔ دی ایمرجینس آف ماڈرن افغانستان از ورتیمن گریگوریین۔

۷۔ جوان تو جنرل از جنرل محمد موسیٰ

۸۔ مردم شناسی ایران بحوالہ پژوہشی در تاریخ ہزارہا از حسین علی یزدانی چاپ ایران

۹۔ آئین اکبری جلد دوم از علامہ ابوالفضل ترجمہ: مولوی محمد فدا علی طالب' سنگ میل۔ لاہور۔

۱۰۔ تاریخ رشیدی از مرزا محمد حیدر دوغلت مع ترجمہ و مقدمہ از N.ELIAS' بک ٹریڈرس لاہور

۱۱۔ An Account of the Kingdom of Caubul by Mount Staurt Elphinstone
Vol. II 1972 Oxford University press Karachi.

۱۲۔ Record of In Telligence Party Afghan Boundry Commission reports
on tebes vol. ivGovt. Central Printing Office Simla 1891۔

۱۳۔ گزیٹر "ہرات" از ایڈم لڈوگ شائع کردہ اکیڈم مِیکی وڈک یو فرلاگ سنشالٹ۔ گراز۔ آسٹریا ۱۹۷۹

۱۴۔ اردو لسانیات از ڈاکٹر شوکت سبزواری

۱۵۔ ث اور ذ کے ہزارہ گی الفاظ کی مثالیں ان کتابوں سے لی گئی ہیں (الف) قاموس لہجہ دری ہزارہ گی از پوہنوال علی اکبر شہرستانی' (ب) لہجہ ہائی مرزن مردم ہزارہ از محمد عوض نبی زادہ کارگر (ج) اشعار ہزارہ گی از استاد بیانی کی "کتاب نغمہ ہائی انقلاب" دفتر اول۔

۱۶۔ لغات عامیانہ فارسی افغانستان از عبداللہ افغانی نویس طبع کابل۔

۱۷۔ استاد خادم حسین بیانی' جامعۃ الاسلامیہ کابل کے معروف عالم' استاد اور خطیب ہیں اور ان کا شمار دور حاضر کے ممتاز عربی و فارسی شعراء میں ہوتا ہے۔ درج ذیل ہزارہ گی اشعار ان کے ایک مجموعہ کلام نغمہ ہائی انقلاب کے حصہ ہزارہ گی سے لیے گئے ہیں۔

۱۸۔ بابو خدائے نذر تیموری المتخلص بورگہ ہزارہ معروف ہزارہ گی شناس ہیں اور اس موضوع پر ان کی عمیق نگاہی کا اعتراف ممتاز مستشرق محققہ پروفیسر ایلزبتھ بیکن نے اپنی کتاب "OBOX" اور ایرانی محقق ڈاکٹر محمد اوتادا لعجم نے اپنے مقالے "پاکستان کے ہزارہ قبائل میں سماجی تبدیلیاں" میں کیا ہے۔

۱۹۔ پژوہشی در تاریخ ہزارہ ہا از حاج حسین علی کاظم یزدانی۔ طبع ایران

۲۰۔ بابا طاہر عریاں ہمدانی گیارہویں صدی عیسوی کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کا "دوبیتی نامہ" فارسی شاعری کی وقیع اور معروف کتاب ہے۔ بابا طاہر کے اشعار اسی "دوبیتی نامہ" سے لیے گئے ہیں۔

نعمت اللہ گچکی

ایک ستارا ٹوٹا

موسم سرما کا سرد ترین دن تھا۔ یخ بستہ ہوا چل رہی تھی کالے بادل آسمان پر پھیلے ہوئے تھے سورج کی تپش میں کوئی جان نہ تھی' دن خوفناک اور بھیانک رات کا سماں دکھا رہے تھے بادل مست شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ بجلی ناچ رہی تھی۔ بارش مشکیزہ کی طرح منہ کھول چکی تھی۔

"عاجزوں پر رحم ..... آنکھوں کی ٹھنڈک' پردہ کرو" یہ کمزور آواز مرحوم بجار خان کی چچی شاہناز کی تھی کہ اس کی بات اس کے دانتوں کے درمیان ٹوٹ کر رہ گئی "گنجل! آسی جان کی نبض کو تو دیکھو کہ بخار ٹوٹ گیا ہے کہ نہیں...."

"اماں جی میری بدبختی ہے کہ میرے لعل کا جسم ابھی تک اسی طرح گرم ہے اور بھنے ہوئے دانوں کی مانند تپ رہا ہے۔ خالہ جان کوئی ایسی دوائی کہیں سے پیدا کرو تاکہ اس کا یہ بخار ٹوٹ جائے۔" مرحوم بجار خان کی بیوہ گنجل پکار اٹھی اور کہا کہ "آج میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ملا دوستین کے پاس جا کر اس سے اس پھول جیسے معصوم کے واسطے تعویذ لے آؤں..... کل مجھے زیبو نے کہا کہ دوستین بہت بڑا عامل ہے اور لوگوں کا اس پر عقیدہ ہے اور وہ اسے عامل و کامل مانتے ہیں خدا کرے کہ بارش جلد ختم جائے۔" شہناز نے کہا۔

"لیکن خالہ جان ندی نالوں میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ آج تمہیں ملا کے گاؤں جانے کے لیے راستہ نہیں دیں گے۔ آج تم ایسا کرو کہ شمع کے دیئے ہوئے اس تعویذ کو اسے دھو کر پلاؤ۔" گنجل نے کہا۔ "تو سچ کہتی ہے کہ اس کے جھاڑ پھونک کیے ہوئے حرمل بھی جلانے ہوں گے۔" نانی اماں نے آرام سے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں گھر کے باہر سامنے سے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ گنجل نے اپنے کان کھول کر گھر کے دروازے پر آنکھیں لگا دیں۔ اتنے میں ایک عورت کپڑوں سے پانی ٹپکاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

"او...... او...... آ اے بیچاری بزناز تمہیں ہوا کا کون سا جھونکا یہاں اڑا کر لایا ہے۔ اب کے تم نے ہمیں بالکل ہی فراموش کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں آنے کے لیے تم کو تو خیال تک نہیں آیا...... بے شک بیچاری بزناز' یہ تیرا قصور نہیں بلکہ یہ ہماری اپنی قسمت ہے جو ہم سے روٹھ چکی ہے۔ اب ہمیں سیاہ بختی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس حال میں کون ہمیں اپنائے گا۔" گنجل نے کہا۔ بزناز اپنے کپڑوں سے پانی نچوڑتی ہوئی جا کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ اور اپنے بالوں کو خشک کرتی ہوئی گویا ہوئی۔ "کیا کروں بی بی۔"

گنجل نے کہا "یہ مشکلات اور سیاہ بختی دنیا میں سب کے ساتھ ہیں۔ میں شرم کی وجہ سے تمہارے

پاس آنے سے قاصر رہی۔۔۔۔" بزناز اپنی بات ابھی تک مکمل نہ کر پائی تھی کہ گنجل نے اٹھ کر اپنی ایک بوسیدہ چادر اس کو نکال کر دی تاکہ وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو تبدیل کرے۔

بزناز اپنے کپڑوں کو تبدیل کر کے بیٹھ گئی۔ خوش آمدید کے بعد بزناز نے کہا کہ "اس دفعہ میں آپ لوگوں کے سامنے شرمسار ہوں آپ لوگوں کے پاس کبھی بھی اس طرح خالی ہاتھ نہیں آئی۔ لیکن اس سال قحط سالی کی وجہ سے ہم لوگ بہت سخت پریشانی میں مبتلا ہیں۔ تم لوگوں کی طرف آنے کو تو دل بہت چاہتا تھا۔ لیکن خالی ہاتھ آنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ بارش ہونے کی وجہ سے پہاڑی جڑی بوٹیاں ناپید ہو چکی ہیں۔ چند دنوں کی بات ہے کہ مجھے آسی جان کی علالت کی خبر ملی تو مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ سیار جان کے والد نے بھی مجھ پر کافی دباؤ ڈالا کہ تم جا کر آسی جان کی سلامتی کی خبر لے کر آؤ۔ یہی ہے کہ میں اور میار جان ادھر ادھر سر مارتے ہوئے آج یہاں آ کر پہنچے ہیں۔" اس پر گنجل نے کہا کہ "تم لوگوں نے اپنے آپ کو بڑی زحمت میں ڈالا اور اس بارش اور سردی میں یہاں آن پہنچے ہو۔" بزناز نے کہا کہ علی الصباح ہم وہاں سے جب چلے تو ان گھٹاؤں کو دیکھ کر مجھے ان سے بارش کی بو آنے لگی لیکن میں برداشت نہ کر سکی اور چل پڑی تو ہمیں بارش نے راستے ہی میں آن لیا۔ بس اتنا کر سکے کہ ندی سے اس پار ہوئے۔" بزناز کہتی رہی۔ "ندی سیلاب کے پانی سے لبالب ہو کر آئی ہے مگر تم یہ بتاؤ کہ اب آسی جان کی طبیعت کیسی ہے؟" ۔ "یہی ہے کہ ایک ہی طرح بستر میں پڑا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ میرے بچے کو کیا ہوا۔" چاند جیسے بچے کو۔ گنجل نے بڑی بے دلی سے کہا۔ "سر اٹھاتا ہی نہیں ہے بلکہ دن بدن اس کی طبیعت گرتی ہی جا رہی ہے اور مجھے اس میں تندرستی کے آثار نظر نہیں آتے۔" بزناز نے کہا کہ "تم لوگوں نے اس کا علاج بھی کیا ہے کہ نہیں؟" گنجل نے بزناز کو جواباً کہا کہ "ہم سے جو کچھ ہو سکا ہے اس کے علاج معالجہ میں ہم نے اپنی دانست کے مطابق کوئی کمی نہیں چھوڑی۔"

بزناز نے ان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ "اس کو بھیڑ کی کھال چڑھاتے۔ گنجل نے کہا "اس بارے میں ہمیں ایک اللہ والے نے کہا تھا اور ہم نے اس کے کہنے کے مطابق اس کو کل ہی ایک دنبے کی کھال چڑھائی۔" بزناز نے پھر بات کو طول دیتے ہوئے کہا کہ "ایک دو سالہ پہاڑی بکری یا بکرے کی کھال پہناتے۔ شاید اس پر خدا مہربان ہو کر اس کو تندرستی و صحت و سلامتی بخشتا۔"

"بزناز پھر تو یہ تمہارا ہی کام ہے کہ میار جان کے باپ کو کہو کہ وہ کہیں نہ کہیں سے پہاڑی بکرے کی کھال مہیا کرے تاکہ بچے کو وہ پہنائی جائے۔"

گنجل کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی "خالہ بزناز میں کیا کروں میرا تو سارا یہی بڑھیا ہے۔ اس سے اس بارے میں جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ کر رہی ہے۔ اسی تگ و دو میں اس کے پاؤں میں بھی چھالے پڑ گئے ہیں کبھی اس ملا کے پاس جا تو کبھی اس شیخ کے پاس۔ بوا بزناز میں آپ کو کیا بتاؤں میں نے تو اپنے آپ کو اس بچے پر قربان کر رکھا ہے۔ میں نے اپنا سارا مال و متاع اس کے واسطے رہن کر دیا ہے اور بیلوں کے جوڑے کو بھی اس کے علاج کے لیے بیچ دیا۔ اب رہا سہا میرے کانوں کے سونے کے یہ بندے اور چھوٹی موٹی چیزیں ہیں یہ بھی اس پر قربان ہیں۔ اور میں نے منت بھی مانی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے پھول کو صحت و سلامتی بخشے تو میں اسے اس موسم سرما کے ابتداء میں قلندر بادشاہ کے دربار پر زیارت کے واسطے لے جاؤں گی۔ ہاں سچ کہتی ہے۔" بزناز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ تو صحیح ہے مگر تم لوگ یہ بھی کر لو" اس پر

گنجل نے بڑی بے قراری سے پوچھا "وہ کیا؟" بزناز نے کہا کہ "اس کو کسی ماہر سے داغ بھی دلواؤ اور اس کے لیے ہمارے گاؤں میں داغ دینے والا ایک ماہر شخص ہے۔ اس نے اس طرح کے ایک بیمار آدمی کے دل کے نچلے حصے پر داغ دے دیا اور وہ شخص اب بالکل تندرست ہو گیا ہے اور وہ پہاڑی ہرنوں کی طرح کودتا پھرتا ہے۔" بزناز نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اوئے...... اوئے میں تیرے واری جاؤں کوئی ایسے کام کی بات کریں تیرے ہاتھ چوم لوں گی۔" گنجل نے بڑی ہی خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا ہے خدا کرے کہ وہ نیک ساعت والی صبح آئے۔" بزناز نے جواباً" کہا۔ اتنے میں دادی اماں شاہناز لرزتی کانپتی بولی اور پکار کر گنجل سے کہا کہ "بوا زیبو کی بات کو فراموش نہ کرنا اگربتی وغیرہ بھی اپنے ساتھ اٹھانا۔" اگربتی کو کیا کرنا ہے۔ حیرانی سے بزناز نے پوچھا ہمارے ہمسائے میں زیبانو نامی ایک ماہر عورت ہے اور وہ علاج و معالجہ اور ٹونے ٹوٹکوں کے لیے بہت ہی مشہور ہے میرے اپنے بچے کو بھی ایسی ہی تکلیف تھی تو ہم بچے کو اس کے پاس لے گئے اس نے بچے کو دیکھتے ہی کہا اس کو اور کچھ نہیں اس کے لیے زیادہ بھاگ دوڑ مت کرو اگربتی اور جلانے کی چیزیں تیار کرو۔ جمعہ کی رات کو میں اس کا علاج کروں گی۔" گنجل نے جواباً" کہا کہ "سچ کہتی ہے" بزناز نے باتوں باتوں میں پوچھا "بی بی تیرا لڑکا کتنا پڑھا ہوا ہے اس سال جب یہاں آئی تھی تو یہ بچہ ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔"...."خالہ یہ تو تم خود ہی جانتی ہو کہ اس کا باپ بچے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتا تھا۔ جب اس نے پانچ جماعتیں پاس کیں تو اس کے استاد نے کہا کہ اس کو بڑے اسکول میں بھیج دو۔ لیکن ہمیں بچے کو دور پردیس میں بھیجنا گوارا نہ تھا کہ وہ سرد و گرم موسموں کی مشقتیں برداشت کرے۔ لیکن بزناز نے کہا۔ "اس کا باپ خود ہمیں چھوڑ کر بہت دور چلا گیا ملک الموت کی طاقت سے خدا کی پناہ۔" گنجل نے سرد آہ بھر کر کہا

"اری گنجل تم لوگ کیسے ہو! اس نے ہم کو ویرانے میں چھوڑ دیا" یہ گراناز کی آواز تھی وہ دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی۔ "ہیا بخیر گراناز میں کب سے تمہاری راہ تک رہی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ شیخ نے کیا کہا۔ "اری بوا اس شیخ کی بات ہی مت پوچھ ایسے شیخ تو دنیا میں بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں اور یہ منفرد شخصیت کا مالک ہے اور یہ تو آسمان سے ستارے توڑ کر لاتا ہے۔ کل میں نے تمہارے بارے میں اس سے بات کی تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم کل صبح آؤ تو پھر میں تمہیں اس بارے میں بتا دوں گا۔ یہی ہے کہ آج صبح ہی بارش میں تربتر ہو کر ہم اس سے ہو کر آ رہے ہیں۔" یہ باتیں ایک ہی سانس میں گران ناز نے کہہ ڈالیں۔ "پھر تو یہ بتاؤ کہ اس نے کیا کچھ کہا۔" گنجل بے تابی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ "ہاں جی اس کے لیے اور کسی قسم کی بھی بھاگ دوڑ مت کرو نہ کوئی دوسرا علاج و معالجہ کرو اور نہ ملا و طبیب سے آؤ۔ اب مجھ پر ہی اس کام کو چھوڑ دو میں جانوں اور تمہارا لڑکا جانے اس کو اور کوئی کچھ نہیں ہے۔ اس پر صرف سحر جادو کا اثر ہے۔ اور اس پر کسی نے تعویذ گنڈے کے ذریعہ جادو کر رکھا ہے اور وہ تعویذ کسی پرانے قبرستان میں گاڑے ہوئے ہیں' تمہاری قسمت نے یاوری کی اور تم نے موقع پر مجھے اس بارے میں خبر کر دی۔ ورنہ اگر اس پر کچھ دن اور گزرتے تو تعویذ گل سڑ جاتے اور بات ہاتھ سے نکل چکی ہوتی۔ مگر اب اطمینان رکھو مرشد کی مہربانی سے اس کا سحر باطل ہو جائے گا۔ لیکن شیخ نے کہا کہ ایک کام کرنا ہو گا" گنجل ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے خاموشی سے یہ سارا ماجرا سن رہی تھی اور گران ناز کی آخری بات اس نے بڑے غور سے سنی اور کہا "پھر اس نے کیا کہا۔ "شیخ نے کہا کہ زمین تو زمین ہے اگر بات آسمان کی بھی ہو تب بھی میں

ان تعویذوں کو نکال لاؤں گا۔ شیخ نے ہدایت کی کہ تم لوگ اس طرح کہ کپڑے سینے والی سات سوئیاں اور سات پرانے سکے اور آسی کے قد کے برابر سات رنگ کے کپڑے کے ٹکڑے۔ ایک بوتل خوشبو کی۔ شاہت دانے کوڑیوں کے مہیا کر کے لاؤ میں ان چیزوں کو خوشبو لگا کر ان پر منتر وغیرہ پڑھ کر دم کروں گا اور سات پرانے قبرستانوں میں دبا دوں گا اور سوئیوں کو تم لوگوں کو دے دوں گا تاکہ تم لوگ ان سوئیوں کو مریض کی چارپائی میں میخ بنا کر لگا دو۔ کوڑی اور سکوں کو میرے جن لے جائیں گے۔"

گران ناز نے یہ سارا ماجرا ان کو سنا دیا۔ "اماں گنجل تم نے سنا میں نے تمہیں کہا تھا کہ نامراد ظالموں نے سحر و جادو کر رکھا ہے مگر تو نے نہ مانا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سارا معاملہ اسی کی مکار ممانی کا ہے اس نے ہی اس کو سحر و جادو کر رکھا ہے تاکہ بچہ ان کے دام میں اسیر ہو جائے اور ان کا گھر داماد بن کر رہے۔ مگر اب اللہ تعالٰی آسی جان کو تندرستی بخشے۔ میں ان کو اس حرکت کا مزہ چکھاؤں گی۔ دادی اماں جو کہ گھر میں اپنے بیمار پوتے کے قریب بیٹھی ہوئی اللہ اللہ کر رہی تھی سحر کا نام سنتے ہی گویا اس کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے اور وہ دانت پیسنے لگی۔

"اچھا تو پھر میں کل صبح آؤں گی اور تم لوگ ان چیزوں کو مہیا کر کے رکھنا۔۔۔" گران ناز نے بزناز سے کہا "تم لوگ تو اچھے ہو' معاف کرنا میں ذرا جلدی میں تھی اور تم سے تمہاری خیریت بھی نہ پوچھ سکی۔" "کوئی بات نہیں محترمہ اس میں تمہارا قصور ہی نہیں یہ تو وقت ہی ایسا ہے۔" بزناز نے کہا "کافی عرصہ سے نظر نہیں آئی ہو۔ یہ تم کو معلوم نہیں تمہاری مہمان نوازی دودھ و دہی پنیر اور لسی کو ہم کیسے فراموش کر سکتا ہیں۔" گران ناز نے کہا۔ "جی ہاں آپا اب ہم اس دودھ دہی پنیر وغیرہ کو کبھی کبھی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ مال مویشی اور بھیڑ بکریوں کے گلے قحط کی نذر ہو گئے۔"

بارش ختم ہو چکی تھی بادل چھٹ گئے تھے۔ ہوا بند ہو چکی تھی آسمان دھلے ہوئے کٹورے کی طرح صاف تھا۔ سورج ڈھل کر غروب ہو چکا تھا ستارے نرگسی پھول کی طرح آسمان پر چمک رہے تھے اور ایسے نظر آ رہے تھے گویا کہ بارش کے بلوری پانی نے ان کا گرد آلود چہرہ دھو ڈالا ہو' گنجل اور بزناز گھر کے صحن میں کھڑی ہوئی تھیں بزناز نے آنکھیں اوپر کو اٹھا کر کہا "وہ دیکھو پروین کا ستارہ آسمان کے عین سینے پر چمک رہا ہے کیچ کے کھجور پک چکے ہیں۔ ہمارے کھجور بھی پک چکے ہوں گے اور کھانے کے قابل ہوں گے نہ؟"

"جی ہاں آپا بزناز! اس وقت تو مجھے دنیا کی کسی نعمت کا ہوش نہیں جب آسی جان صحت یاب ہو جائے گا تو پھر میرے لیے یہ سمجھو کہ تر و تازہ کھجوروں کا عام موسم ہو گا۔ میری دنیا کی خوشی اور شادکامی اس کی جان کے ساتھ ہے۔" یہ ساری باتیں گنجل نے گلوگیر آواز میں کہہ ڈالیں اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے اور وہ اپنا سر بزناز کی جھولی میں رکھ کر کہنے لگی۔ "بزناز مجھے کیا ہوا میرا دل دھڑک رہا ہے اور یہ بے چینی میری جان کو کھائے جا رہی ہے خدا خیر کرے نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ خدا میرے اکلوتے بچے کی جان سلامت رکھے۔" اسی لمحے مغرب کی جانب سے ایک بڑی روشنی نمودار ہوئی اور گران ناز کی نظر اس پر پڑی اور کہنے لگی۔ "وہ دیکھو کتنا بڑا ستارہ ٹوٹ گیا۔ وہ ہے جو قبلہ کی طرف جا رہا ہے یا رحمان عاجزوں پر رحم فرما بچانے والے بچا۔۔۔ گنجل تو تو گم نہ ہوئی تیری آنکھوں کی روشنی۔۔۔ تیرے گھر کی روشنی۔۔۔ تیری خوشی کا ستارہ ٹوٹ گیا۔" دادی اماں شاہناز کی دل دہلانے والی آواز آہستہ آہستہ ماتمی آوازوں میں گم ہوتی چلی گئی۔ ستارہ ٹوٹ چکا تھا۔ گھر کی روشنی بجھ گئی تھی۔

(بلوچی سے ترجمہ۔ پیر محمد زبیرا)

ثمی طارق

آواز

تیز آہٹوں سے دل ہلا دینے والی آواز بلند ہورہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ آواز دھرتی کی کوکھ سے جنم لے رہی ہو۔ ان تیز آہٹوں کی دہشت سے ایک دھول اٹھ رہی تھی جس سے ہر جانب تاریکی پھیل رہی تھی۔ نا امیدی اور مایوسی کا عالم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان آہٹوں کے پیچھے کسی عورت کی مغموم آواز دھیرے دھیرے آرہی ہو۔ میں نے اس آواز کو غور سے سنا مجھے یوں لگا جیسے کہ وہ مجھ سے مخاطب ہو۔

"نوجوان!"

لوگ اس آلودہ ماحول سے نجات کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں اور ایک آپ ہیں جو کہ خود سے بیگانہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اگر اس طرح بیٹھنے سے کچھ حاصل ہوتا تو آج ہر طرف آزادی کے نغمے گونج اٹھتے ...... میں اس آواز کو غور سے سن کر سوچوں کے تلاطم میں ڈوبنے لگتا ہوں۔ کہ تیز ہواؤں کے جھونکے مجھے گرا دیتے ہیں اور یہ آواز مجھے اور بھی قریب سے سنائی دیتی ہے۔

"نوجوان!"

میں بھی صدیوں سے تمہاری طرح آزادی کی خواہش لئے ہاتھ پر ہاتھ دھری بیٹھی رہی۔ میں اس وقت ایک خوبصورت دوشیزہ تھی۔ میرے جلوے سے کائنات روشن تھی۔ لیکن اب میرا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ میری بالوں کی چمک ختم ہو چکی ہے۔ ان میں اب سفیدی آگئی ہے لیکن میرے آنگن میں ابھی تک آواز کا چراغ روشن نہیں ہوا ہے۔ مجھے اب یہ احساس ہوا ہے کہ آزادی خواہشات کی غلامی سے نہیں بلکہ جدوجہد اور قربانیوں سے عبارت ہے۔ اور پھر یہ آواز خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اور میرے گرد تاریکیوں کے بادل اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔ سنسان ماحول مجھے اور بھی خوفزدہ کر دیتا ہے۔ لیکن ایک موہوم حوصلہ مجھے آگے بڑھنے کیلئے مجبور کر دیتا ہے۔ میں آگے کی جانب بڑھتا ہوں کہ اچانک کسی پتھر سے ٹکرا کر گر پڑتا ہوں اور ایک اجنبی ہاتھ میری جانب بڑھتا ہے اور میں اس ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

ہاتھ!

ظلم اور استبداد کے لیے اور سخت ہاتھ جو مضبوط اور بے بس انسانوں کیلئے تیز تلوار کی مانند ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہاتھ جو مجھے سہارا دینے کیلئے میری جانب بڑھا تھا۔ یہ ایک سخت اور کھردرا ہاتھ تھا۔ اس ہاتھ پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔ اور ایسا لگتا تھا کہ آسودگی اور خوشحالی نے ان ہاتھوں کو چھوا تک نہ ہو اور اس میں اس ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہتا ہوں۔

"آپ کے ان ہاتھوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھی میری طرح ایک مجبور اور محروم انسان ہوں گے۔ یعنی آپ میری ہی کائنات کے لوگوں میں سے ہیں لیکن پھر بھی آپ مجھ سے اپنی

صورت چھپائے ہوئے ہیں۔"

"میری صورت دیکھ کر تم کیا کرو گے؟ میں تو اپنی غم بھری صورت سے خود ہی اکتا چکی ہوں۔" آوا
ایک مرتبہ پھر میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اور اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔

"آپ کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن مجھے آپ کی صورت دیکھنے کی تمنا بے چین کر رہی ہے
کیونکہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔"

"میں کون ہوں۔"؟ آواز پھر میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

"ہاں آپ کون ہیں؟" میں اس سے پوچھنے لگتا ہوں۔

"میں آزادی ہوں۔ لیکن اسیر ہوں۔ اور میرے یہ کھردرے اور سخت ہاتھ میری اسیری کے گ
ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جان کر آپ کیا کریں گے؟" ایسے لگا جیسے وہ مجھ سے دست و گریباں ہونا چاہتی ہ
اور میں ندامت سے خاموش ہو جاتا ہوں۔

تند و تیز ہوا چل رہی تھی۔ گرد سے تاریکی اور بھی پھیلنے لگتی ہے۔ ہر جانب رات کا سماں تھا اور ا
کی آواز کی گونج اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ تاریکی اور گونج کی دہشت سے مجھ پر ایک خوف طاری ہ
تیز ہواؤں کے جھونکے مجھے پھر سے گرا دیتے ہیں۔ لیکن میں اپنے پاؤں کو زمین پر مضبوطی سے دھنسا کر خو
گرنے سے بچالیتا ہوں اور خوف کے باوجود اس آواز کو پھر سے سننے کی کوشش کرتا ہوں۔

" ہا ہا ہا..... میں ہی آزادی ہوں لیکن مجھے آزادی کے دشمنوں نے قیدی بنا لیا ہے۔ میں ا
کے ان بندھنوں کو توڑنا چاہتی ہوں لیکن مجبوریاں میرے پاؤں کی زنجیریں بن چکی ہیں' میں جہاں بھی
ہوں لوگ میرا گلا دبانے کیلئے میری جانب لپکتے ہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح چلاتی ہے۔ اور اس کی صدا
بازگشت کافی دیر تک سنائی دیتی ہے۔ اور پھر ہر جانب ایک خاموشی طاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ خاموشی زیاد
تک قائم نہیں رہ سکی اور ایک ہلکی اور پر اسرار آواز پھر سے سنائی دیتی ہے۔

"میں جنت کا ایک آزاد پرندہ تھی لیکن مجھے تاریک گھونسلے میں بند کر دیا گیا ہے۔ مجھے آزاد فضا
ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھانے سے محروم کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں بے زبان جانور کی طرح یہ
کچھ خاموشی سے سہہ لوں گی لیکن یہ ان کی بھول ہے------" خاموشی پھر طاری ہو جاتی ہے اور
سوچوں کے گرداب میں ڈوبنے لگتا ہوں کہ اچانک وہ صدا پھر سے گونجتی ہے۔

"میں اسیر ہوں' خواہشوں کی اسیر' مجبوریوں اور محرومیوں کی اسیر..... لیکن اسیر ہونے کے باوج
لوگ مجھے آزاد سمجھتے ہیں اور میں اس آزادی کے مطلب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آزادی برائے
آزادی جو کہ غلامی کی بدترین تصویر ہے۔"

"تصویر!"

"جو کہ بظاہر خوبصورت لیکن ...."! بات اس کے منہ میں اٹک جاتی ہے۔

"لیکن اس گرد و غبار میں تم یہاں کیا چاہتی ہو"؟ میں نے پوچھا

"گرد و غبار......" وہ اس لفظ پر زور دیتے ہوئے کہتی ہے۔

"یہ تو آپ کے محسوسات ہیں ویسے یہ میرے پاؤں تلے کی اٹھتی ہوئی مٹی ہے۔ جو میرے تیز قد
کے سبب اڑ رہی ہے۔ اس گرد و غبار کو پیچھے چھوڑنا چاہتی ہوں کیونکہ لوگ مجھ سے بہت آگے نکل

ہیں۔ اور میں ان میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔" اور وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی

"کیا تم یونہی کھڑے نظارہ کرتے رہو گے"؟ ایسے لگا کہ وہ مجھ سے سوال کر رہی ہو اور میں سکتے میں آگیا' لیکن اس کی باتوں کی صدائے بازگشت اب بھی آرہی تھی۔

"میں وقت کے ہاتھوں لٹ چکی ہوں۔ میرے بال سفید اور جسم نحیف ہے محنت اور مشقت نے میری کمر ٹیڑھی کر دی ہے۔ میں اپنے وجود سے اب بھی بے خبر نہیں ہوئی ہوں لیکن آپ......؟

"نوجوان!

آپ بہت ہی سادہ لوح ہیں" اس نے کہا اور میں نے دل ہی دل میں بوبڑاتے ہوئے کہا واقعی یہ سچ کہتی ہے...... میں دل ہی دل میں اور نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ آواز پھر سے بلند ہوئی۔

"اگر آپ سادہ نہ ہوتے تو مجھے پہچان کیسے نہ لیتے۔ آپ اگر میرے سینے کے پوشیدہ زخموں اور ارمانوں کو دیکھ نہیں پاتے تو کوئی بات نہیں لیکن میرے ان کھردرے اور سخت ہاتھوں سے میری مجبور زندگی کا اندازہ لگانا آپ کیلئے مشکل بات نہ ہوگی"

"نوجوان!

"زندہ انسانوں کیلئے خاموشی موت ہے۔ میں بھی کافی مدت تک خاموشی کو ذریعہ نجات سمجھتی رہی۔ اور میری یہ حالت ہوئی جو تم دیکھ رہے ہو" پھر وہ ٹھنڈی آہ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"میں حسین دوشیزہ تھی۔ لیکن خاموشی نے میرے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ میرا حسن اور خوبصورتی گہنا گئی۔ میرا لہو خشک ہو گیا۔ کاش کہ میں خاموشی سے گریز کرتے ہوئے جدوجہد کی راہ اختیار کر لیتی تو میری زندگی رایگاں نہ جاتی۔"

"لیکن آپ اپنے اردگرد کے حالات سے کچھ نہ کچھ تو سیکھ لیتیں!" میں نے بے ساختہ کہا اور وہ منہ بسورتے ہوئے کہنے لگی۔

"وہ مجھے کیا سکھاتے انہیں تو میرے ہونٹوں کی سرخی اور جسم کا لہو چاہئے تھا لیکن میں اب جان چکی ہوں۔"

"آپ کیا جان چکی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

فضا میں پھیلی گرد اور غبار آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے اور میں اپنے اردگرد کو اچھی طرح دیکھنے لگتا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ماحول سنسان اور ویران ہے۔ لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ عورتیں رسم و رواج کی باندی ہیں۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ اور یہ سب، کچھ دیکھتے ہوئے میرے اندر کا انسان جاگ اٹھتا ہے۔ اور میں تیز قدموں کے ساتھ اس آواز کے پیچھے بھاگنے لگتا ہوں۔ میرے قدموں کے نیچے کی مٹی دھول بن کر فضا میں پھیل جاتی ہے۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھتا ہوں تو مجھے گیتوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور میں ان لوگوں کے ساتھ شامل ہونے کیلئے بے قرار ہوتا ہوں۔ جو کہ بڑے جذبے سے گیت گا رہے تھے۔ اور میں ان میں شامل ہو جاتا ہوں۔ جو مجمع لگا کر گیت گا رہے تھے۔ موسیقی کی تھاپ پر ناچ رہے تھے۔ ان کے ناچنے سے پیروں کی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔ دھول اس قدر زیادہ تھی کہ اس کو دیکھ کر دھند کا گمان گذرتا تھا۔ اور میں خود کو اس دھند میں چھپا محسوس کرتا ہوں۔ کہ اچانک وہی کھردار اور سخت ہاتھ میرے شانوں کی طرف بڑھتا ہے۔ اور میں خوف سے چلا اٹھتا ہوں۔ اور آواز پھر سے میرے کانوں میں

گونجتی ہے۔

"گیتوں بھری موسیقی سننے سے کسی کی دلی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ دیکھتے نہیں کہ کچھ لوگ خود کو ان گیتوں سے کس طرح آزاد کرا رہے ہیں۔ یہ شور جو دور سے آرہا ہے۔ انہیں لوگوں کا ہے جو گیتوں کے بجائے جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔" یہ سن کر میں موسیقی کی محفل سے اٹھ کر اسی طرف بھاگنے لگتا ہوں۔ اور تیز قدم بڑھاتے ان تک پہنچ جاتا ہوں۔ اب میں وہاں کئی ایسے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جوکہ ہوا میں جھنڈے لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ان کے پیروں کی آواز سے دہشت پیدا ہورہی تھی۔

"پیروں کی آواز!"

جوکہ ابھاگن عورت کی طرح اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے بے چین ہوں اور اب مجھے ان پیروں کی آواز کے علاوہ اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا ...... پیروں کی آواز جوکہ آزادی کے کاروان کو منزل تک پہنچانے کیلئے بے قرار ہیں۔

(بلوچی سے ترجمہ۔ مصنف

غنی پرواز

نسخہ

کوئٹہ کے سول ہسپتال میں دوائیوں کے اسٹور کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی نسخہ لے کر دوائیاں لینے آیا تھا۔ لیکن دوائیاں اسٹور میں تھیں' جس کی کھڑکی تک پہنچنا ضروری تھا' اور یوں لگتا تھا کہ آج وہاں تک پہنچنا آسان نہیں۔ کیونکہ لوگ ترتیب سے نہیں بلکہ بے ترتیبی سے جمع ہوکر اسٹور کی کھڑکی تک پہنچنے کیلئے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی پوری طاقت آزما رہا تھا۔ ہر کسی کی کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد اور تمام لوگوں سے پہلے کھڑکی تک پہنچے۔ اس مقصد کیلئے ہر کوئی اپنے ہاتھ' پاؤں' کان اور منہ بیک وقت استعمال کررہا تھا۔ اور اپنے آس پاس کھڑے ہونے والے لوگوں سے' بلکہ اپنے سے آگے کھڑے ہونے والے لوگوں سے بھی' آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہرکوئی اپنی طاقت' تجربات اور کوششوں کے مطابق ہی آگے بڑھ رہا تھا یا پیچھے ہٹ رہا تھا طاقتور خاموشی' ہمت اور اطمینان سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جبکہ کمزور ہر لحہ پیچھے ہٹ رہے تھے یا لوگوں کے چھوٹے سے حلقے میں پھنس کر رہ گئے تھے اور پے درپے دھکے کھا رہے تھے' جس کی بناء پر اگر ایک طرف اپنی کمزوری پر پیچ و تاب کھا رہے تھے' تو دوسری طرف اپنے سے زیادہ طاقتور لوگوں پر غصہ کھا رہے تھے' اور بڑبڑا' بڑبڑا کر اپنے اپنے غصے کا اظہار بھی کررہے تھے۔

"کیا مصیبت ہے۔ صبح سے آیا ہوں' اور مسلسل آگے بڑھنے کی کوشش کررہا ہوں' مگر ابھی تک یہ بدبخت کھڑکی آنے کا نام تک نہیں لیتی۔"

"کیا انسان اسی طرح ہوتے ہیں؟ یہ تو حیوان ہیں۔ بلکہ درندے ہیں' درندے!"

"کوئی انتظام ہی نہیں۔ لوگوں میں کوئی ترتیب ہی نہیں۔ آج یہ کم بخت سپاہیوں کو نجانے کیا ہوگیا ہے' جو بالکل ہی غائب ہیں۔"

اپریل کا آغاز تھا۔ کوئٹہ میں اپریل کے اختتام تک تھوڑی بہت سردی باقی رہتی ہے۔ دو تین دن پہلے بارش برسنے کی وجہ سے زمین ابھی تک پوری طرح خشک نہیں ہوئی تھی۔ اور اس صبح تو ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی' جس سے سردی میں کچھ اضافہ ہوا تھا۔ لیکن مسلسل دھکم پیل کے باعث سارے لوگ پسینے سے شرابور ہو چکے تھے۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے کوٹوں' واسکٹوں' قمیضوں اور دوسرے کپڑوں کو کبھی ڈھیلا کر لیتے تھے اور کبھی کس لیتے تھے۔ میری طبیعت بھی کچھ ناساز سی تھی۔ ڈاکٹر عظیم سے ایک نسخہ لے کر دوائیاں لینے آیا تھا۔ لیکن جب یہ منظر دیکھا تو پاؤں آگے بڑھنے کیلئے تیار نہ ہوئے۔ اس ارادے سے کھڑا رہا کہ ہجوم کچھ گھٹ جائے تو پھر دیکھا جائے گا۔ مجھے وہاں کھڑے رہنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ چاہئے تو یہ تھا کہ میں تھک ہار کر اپنی راہ لیتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر بات صرف دوائیوں تک محدود ہوتی تو میں یقیناً

بہت ہی پہلے بے زار ہو کر جا چکا ہوتا۔ مگر شاید مجھے یہ منظر ہی بہت اچھا لگ رہا تھا اس لئے میں ابھی تک کھڑے ہو کر' نہایت دلچسپی سے اس کا نظارہ کر رہا تھا۔

یوں تو ان لوگوں میں سے ہر کوئی اس دلچسپ منظر کا ایک جزو لاینفک تھا۔ میری توجہ باری باری ہر ایک کی جانب مبذول ہو رہی تھی۔ لیکن منظر کا سب سے دلچسپ کردار وہ گورا چٹا نوجوان تھا جو سات آٹھ دفعہ کھڑکی کے قریب سے دھکے دیکر پیچھے ہٹا دیا گیا تھا انہیں دھکوں کی وجہ سے دو تین دفعہ تو اتنا لڑکھڑا چکا تھا کہ گر کر کچل جانے سے بال بال بچا تھا۔ اور مسلسل ناکامیوں کے غموں سے نڈھال ہو کر اب اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔

"لعنت ہو ایسی دوائیوں پر۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ میں دوئیاں لئے بغیر ہی چلا جاؤں۔ اتنے دھکے کھانے' لڑکھڑانے اور گرنے سنبھلنے سے تو آدمی کی جان ہی نکل جاتی ہے۔"

اب وہ دھکے کھانے' لڑکھڑانے اور گرنے سے سنبھلنے کے چکروں سے اتنا دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ غالباً" بار بار باہر کی طرف جھانک جھانک کر دیکھتا تھا۔ میرے خیال میں اب وہ بھاگنے کے لئے راستہ تلاش کر رہا تھا۔

یہ منظر اسی مرحلے تک پہنچا تھا کہ یکا یک ایک لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک نسخہ لئے ہوئے ہجوم کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ ویسے تو اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ مگر برقعے کا اگلا حصہ اٹھا کر سر پر ڈالا تھا' جس سے اس کا چہرہ پوری طرح کھلا تھا۔ عام سی شکل و صورت تھی اس کی' البتہ جوان ضرور تھی۔ ہجوم کے پاس رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ لوگوں کی طرف بڑھا کر کہا۔

"کوئی مہربانی کرکے میری یہ دوائیاں تو لے کر دیدے۔"

اس کی بات یا ہاتھ بڑھانے سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی توجہ کس طرف تھی۔ لیکن میں نے اچھی طرح سے دیکھا کہ پکڑنے کے لئے نسخے کی طرف بڑھنے والا ہاتھ اسی نوجوان کا تھا جو اب تک کم و بیش سات آٹھ دفعہ پیچھے ہٹا دیا گیا تھا اور دو تین دفعہ نیچے گر کر کچل جانے سے بال بال بچا تھا۔

لڑکی کا نسخہ لینے کے بعد نوجوان نے پہلے پہل تو نظریں اٹھا کر چاروں طرف گھور گھور کر دیکھا۔ جیسے ابھی ابھی سو کر اٹھا ہو اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اور اس کے بعد یہ منظر اپنے نقطۂ عروج اور حسین ترین مرحلے تک جا پہنچا۔ وہ نوجوان شیر نر کی طرح اکڑ گیا اور اپنے' دائیں بائیں اور سامنے کھڑے ہونے والوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا اور اپنے لئے راستہ بناتا ہوا آن واحد میں کھڑکی کے سامنے جا پہنچا اور دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے دونوں کناروں کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر دوائیاں لے کر اسی مردانگی کے ساتھ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا اور اپنے لئے راستہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اپنی دوائیاں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں لڑکی کی دوائیاں۔!

اور تھوڑی دیر کے لئے سارے لوگ اپنے کام کو بھلا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے---------!!

(بلوچی سے ترجمہ۔ مصنف)

رزاق نادر

غریب باسی

"عرفان کا والد کہہ رہا تھا کہ آج بڑے وزیر نے اعلان کیا ہے کہ ہم سادگی اپنائیں اور تقریبات اور دوسرے اجتماعات کے لئے ایک ڈش استعمال کریں۔" آمنہ اپنی مخمور نگاہوں کو جنبش دے کر رہ گئی ..... اس کے قریب بیٹھی بوڑھی ستی جو دو وقت کی روٹی کیلئے اسی گھر میں کام کرتی تھی غمگین ہوئی۔ مشکلات کی وجہ سے وقت سے پہلے اس کی جھریوں بھری پیشانی کی سلوٹیں بڑھنے لگی تھیں۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ پھر خوبصورت اور حسین چہرے والی آمنہ خود ہی گویا ہوئی...."خدا نہ کرے ایسا ہو اگر ایسا ہوا' تو ہمیں بھی نقصان ہوگا کیونکہ عرفان کے والد کی بیشتر آمدنی سرکٹ ہاؤس سے وابستہ ہے ہر وقت آفیسرز' وزیر اور بڑے لوگ آتے ہیں۔ ان کی خوب خاطر تواضع کرکے اچھی اچھی ورائٹی کی ڈشیں تیار کرواتے ہیں' اب اگر خوراک سادہ ہوگی تو وہ کیسے سرکار سے اتنے بڑے بل منظور کرا سکیں گے۔" یہ سوچتے ہوئے اس کی مخمور نگاہوں میں فکر مندی کے آثار نمایاں ہوئے۔ ذرا دیر کے وقفے کے بعد وہ ایسے بات کررہی تھی جیسے خود کو تسلی دے رہی ہو۔ "خدا نے ہمیں اب تک خاصا نوازا ہے۔" یہ سن کر ستی بے دلی سے اپنے ہاتھ زمین سے لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "بی بی میں اب کھانا لے کر جاؤں کیونکہ اس کے بعد میرا بچہ سو جائے گا" ان باتوں کے بعد ستی کھانے کے برتن میں سالن لے کر گھر کی جانب چل دی' سارے راستے اسے سادگی والی بات پریشان کررہی تھی' وہ بے خیالی میں ایسے جارہی تھی جیسے من ہی من میں اپنے آپ سے لڑتی جارہی ہو۔ وہ خود سے الجھنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کی اوقات ہی کیا تھی جو دوسروں سے ٹکر لے۔ اگر اسے ذرا سی بھی طاقت ہوتی تو وہ اپنے ایک ہی بچے کے لئے اوروں کی خوشیاں چھین لیتی۔ اور اگر اس کا بس چلتا تو دو سال پہلے وہ بیمار شوہر کو موت کے آہنی پنجوں سے چھڑا لیتی۔ اس بات کا جواب نہ اس کے پاس تھا اور نہ ہی دوسروں کے پاس بعض لوگ کیونکر اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ دوائی کے بغیر مرجاتے ہیں اور بعض لوگ اس قدر دولت مند کہ دنیا کی تمام خوشیاں خرید لیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اور کبھی کبھار ابہام میں ایک دو باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔ یہ طاقتور اور کمزور' لیکن جب یہی کمزور کوئی کام کرنے پر تل جائیں تو ان کا بھی طریقہ یہی ہوتا ہے اور یہی کچھ ازل سے ہوتا آرہا ہے انہی پریشانیوں میں وہ اپنی جھگی تک پہنچ گئی۔ اندر آتے ہی اپنے سوئے ہوئے بیٹے کے چہرے پر بھوک کے آثار دیکھے۔ اس نے برتن چولہے پر رکھا اور اپنے بیٹے کی پیشانی کو یوں بوسہ دیا جیسے وہ اس کے حصے کی بھوک کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دے گی۔ وہ آنسو بہا رہی تھی اور اب اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ اس میں مزید اپنے بیٹے کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ وہ پلٹ کے یوں کھڑی ہوئی جیسے زمین اور آسمان ایک ہوگئے ہوں۔ بڑی کوششوں کے بعد وہ اپنی رلی تک پہنچی اور رلی کے اندر گئی جیسے کسی قبر میں چلی گئی ہو اور ادھر سے کبھی نکلنا نہ ہوگا اور نہ ہی وہ فاقہ زدہ

بیٹے کا چہرہ دیکھے گی' وہ بہت رونا چاہتی تھی مگر آنسو اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے اس کشمکش میں چا
رات کے کون سے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح ستی سویرے اٹھی' چائے بنائی' بیٹے کو نیند سے جگایا او
اسے ایک پیالی چائے کی دی۔ بیٹا چائے پینے کے بعد خوش خوش اٹھا گلی کے کونے میں پڑی ہوئی اپنی بوسیا
گٹھڑی اٹھائی۔ اور ذرا گلی کے موڑا اور پھر ماں سے کہنے لگا۔ "اچھا ماں! میں ہڈیاں جمع کرنے چلا" ستی اس
کی طرف دیکھنے لگی لیکن خاموش رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اگر اس نے کوئی بات کی تو اس
کے آنسو چھلک جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اس کے آنسو چھلکے۔ اس کا بیٹا پھکول گھر سے نکلا۔

اسی اثناء میں تین چار روز بیتے۔ ان دنوں کی ہر گھڑی اس کی پریشانی کو بڑھا رہی تھی۔ ہر وقت
اسے یہی بات کھائے جا رہی تھی کہ اگر آفیسرز' وزراء اور امیر کبیر لوگوں نے سادہ خوراک کھانا اور پہ
شروع کر دیا۔ تو سرکٹ ہاؤس میں بھی سادہ خوراک بننی شروع ہو جائے گی اس طرح انہیں یہ نقصان ہوگا
خوراک اگر سادہ ہوگی تو بھیڑ بکریاں بہت کم ذبح کی جائیں گی یا پھر ذبح ہی نہ کی جائیں گی۔ اس طرح ہڈیا
دستیاب نہ ہوں گی۔ کہ ان پر اس کی اور اس کے آٹھ سالہ بیٹے کی گزر بسر ہوتی ہے۔ پانچویں روز سور
جب دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا جنوب کی جانب پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ گیا تو آٹھ سا
پھکول بھی گھر پہنچ گیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ آتے ہی گندے ہاتھ گندی جیب میں ڈالے ایک پانچ روپے
نوٹ اپنی ماں کی جانب بڑھاتے ہوئے خوشی سے کہنے لگا۔ "اماں یہ لے لو میں آپ کو ایک اچھی خبر سنا دوں

"کیا میرے لال"

" کل بڑے وزیر اس طرف آ رہے ہیں بہت ساری بھیڑ بکریاں ذبح کی جائیں گی پھر ہڈیاں کافی ہو
گی۔ اور پھر میں کل آپ کو پورے بیس روپے لا کر دوں گا میرے سو روپے پورے ہوں گے میں اپنے
جوتے خریدوں گا" یہ سن کر جیسے ستی کے کلیجے میں خنجر پیوست ہو گیا ہو' اس نے بیٹے کو بغل میں لے
"میرے لال" اس بات سے اس کی غمگین آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے۔ ہر وقت اس کی باہوں کا حص
اس کے بیٹے کو گھیرے رہتا تھا۔ اپنے بیٹے کو دنیا جہاں کی سختیوں سے چھپائے جا رہی تھی۔ اس کی ہچکی بند
گئی اس حالت سے اس کا بیٹا پریشان ہوا اور جذباتی ہو کر رونے لگا "اماں کیوں رو رہی ہو۔ کسی نے آپ
کچھ کہا ہے؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں اسے مزہ چکھاؤں' اسے جہنم رسید کر دوں۔" ستی کچھ نہ بولی اور بیٹے کے
پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ جب بیٹا ذرا سنبھلا تو وہ تکیہ لے آئی اور اپنی بغل میں اسے لٹا لیا۔ اس کے سر پر یو
ہاتھ پھیرتی رہی جیسے دکھ کی ابدی چادر اس کے سر سے اٹھا رہی ہو! بیٹے نے پھر پوچھا "اماں آپ کیو
روئیں۔؟

"رہنے دے یہ بات"

"نہیں اماں کہہ دو" بیٹے کی ضد کے آگے ماں لاچار ہوئی اور کہنے لگی "میرے بیٹے! بڑے وزیر
اعلان کیا ہے کہ اب سادہ خوراک استعمال کی جائے گی۔ کل شاید بھیڑ بکریاں ذبح نہ ہوں۔ صرف تین
سیر گوشت پر اکتفا کیا جائے گا۔ اس طرح پھر ہڈیاں نہ ہوں گی اور تمہارے جوتوں کے پیسے پورے نہ ہو
گے' تو فکر نہ کر کل بی بی صاحبہ نے مجھے بیس روپے دیئے ہیں میں تیرے لئے جوتے لے لوں گی اب سوجا
باتیں بھی کر رہی تھی اور بیٹے کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتی جا رہی تھی اور جب وہ خاموش ہوا تو ستی اس تصد
کے بعد کہ واقعی وہ سو گیا ہے' اٹھی اور اپنی رلی میں گھس گئی' آخری روز شام کے وقت جب پھکول لوٹ

آیا تو آتے آتے اس نے تیس روپے اپنی ماں کو تھمائے اور کہنے لگا۔

"اماں اب کی بار گزشتہ وقتوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بکریاں ذبح کی گئیں اور مجھے ہڈیوں سے تیس روپے ملے۔ بڑے وزیر کل بھی یہاں ہیں اور کل بھی میں اتنے ہی پیسے لیتا آؤں گا" اور پھر ماں اور بیٹا دونوں مسکرا رہے تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ کہ وہ خوشی سے مسکرا رہے ہیں یا بڑے وزیر کے فیصلے پر۔

(بلوچی سے ترجمہ۔ فضل خالق)

تشنہ کام

ڈز۔ ڈز۔ مارو۔ ہلاک کرو۔ قتل کرو۔ کب تک مارو گے۔ کتنوں کا خون کرو گے آخر؟۔ ایک کا' دو کا' تین کا' دس کا' بیس کا' تیس' چالیس' پچاس' سو' ہزار کا' میرا شمار تو لاکھوں میں ہے۔ تمہارے یہ پرانے حربے یہ گولیاں جو کہ اب تک بیکار تھیں انہیں آزماؤ' انہیں یہیں استعمال کرو۔ ہم پر۔ میرے سینے میں اتنی طاقت ہے کہ وہ تمہارے سارے وار برداشت کر سکتا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا میں مر کر بھی فنا نہیں ہوں گا۔ میں زندہ رہوں گا اس وقت تک ' جب تک یہ دنیا قائم و دائم ہے لیکن تم--- تمہارا نام و نشان تک مٹ جائے گا کیونکہ تم سراپا جنگ ہو' آزمالو اپنے آپ کو -- اپنے زور بازو کو۔ یقیناً وہ دن دور نہیں جب تم اپنی تمامتر قوت کے باوجود ختم ہو جاؤ گے۔ پھر کیا کرو گے۔ لیکن میرا اور تمہارا مقابلہ جاری رہے گا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر مقابلہ کیلئے تیار رہو' میں آرہا ہوں۔ تم سے مقابلہ کرنے۔ سالی پورے جوش اور ولولے سے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا' وہ پوری پامردی سے زمین کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اب تک گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں اور اس کے قدم ان وحشت ناک آوازوں کی طرف بڑھ رہے تھے' ایسا نہ ہو کہ کوئی مظلوم گولیوں کی زد میں آجائے' یہ سوچتے ہی اس نے دوڑنا شروع کیا دوڑ.........

دوڑ.........دوڑ.........

سالی ایک چھوٹے سے دیہات کا باشندہ تھا' اس کا تعلق اس علاقے سے تھا جہاں لوگ پانی کی بوند بوند کو ترستے تھے' جہاں لوگ قطرے قطرے کیلئے لڑتے تھے۔ بارش کی دعائیں مانگتے تھے' اپنے مولا سے' تاکہ علاقہ پانی سے جل تھل ہو جائے' پیاسی دھرتی جاگ اٹھے اور لوگ پانی کیلئے آپس میں دست و گریباں ہونے کی بجائے شیر و شکر ہو جائیں' لیکن دعاؤں میں اتنا اثر کہاں کہ مانگتے ہی شرف قبولیت ملے' بارش برسنے لگے' ویسے بھی قدرت نے بارشوں کیلئے موسم بنایا ہے کیونکہ بن موسم بارش رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتی ہے' ایسی زحمت جسے انسان برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا' جبکہ ہر شخص خوشیوں کا متلاشی ہوتا ہے۔

سالی کا تعلق ایسے علاقے سے تھا جہاں اب تک نہ بجلی کی روشنی پہنچی تھی اور نہ ہی پانی۔ پانی جو کہ وفا کی جان ہے۔ پہچان ہے' کہاوت مشہور ہے "ایک کٹورہ پانی سو سال وفا" لیکن آج وفا کا نام بدل گیا' وفا کا بدلہ گولیوں سے دیا جارہا ہے۔ سالی کو بار بار یہ قول یاد آرہا تھا' اس نے سوچا میں کیوں ہار مانوں' حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں اکیلا نہیں' پوری برادری میرے ساتھ ہے' پیاسا صرف میں نہیں میرے تمام بھائی پیاسے ہیں' اسی پیاس کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں' وہ چیخ رہے ہیں' چلا رہے ہیں اور تڑپ رہے ہیں۔

سالی دوڑ رہا تھا' دلدوز چیخیں۔ رونے کی آوازیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ' شور وغوغا' بھاگتے ہوئے لوگوں

کے قدموں کی چاپ اس کے کانوں میں آرہی تھیں لیکن وہ دوڑ رہا تھا اس کے قدم آگے کی جانب بڑھ رہے تھے وہ آج خوش تھا' شاد تھا اور مسرور تھا۔ لیکن مغموم بھی وہ آج خوش اس لئے تھا کہ آج علاقے کے لوگ جوانمردی سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں پانی کے حصول کیلئے۔ اپنا حق حاصل کرنے کیلئے۔ لیکن ان کیلئے پانی اب بھی نایاب تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ روز روز کی جھک جھک سے' بہتر ہے کہ آج فیصلہ ہوجائے کیونکہ جنگ زندگی عذاب کر دیتی ہے اور ایسی بے سکون زندگی کس کام کی۔ یہی سوچتے سوچتے سالمی آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر ماضی کے واقعات گھوم رہے تھے۔ اس نے پانی کی خاطر اپنے ہی جیسے ایک انسان کی کس قدر منت ساجت کی تھی لیکن اس کی تمام التجائیں بے اثر ثابت ہوئیں اور اس یزید نما شخص کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ یہ واقعہ فراموش نہ کر سکا تھا۔ وہ شخص زور آور تھا اور اس کی اس زور آوری کے پس پشت بھی یقیناً" کوئی مضبوط ہاتھ تھا ،گرنہ ان تلوں میں تیل کہاں۔ خیر وہ کب تک زور آزمائے گا کبھی نہ کبھی اس کی قوت جواب دے گی۔ پھر کیا کرے گا۔ خاک میں مل جائے گا۔ منت کرے گا یا آہ و زاری یا خوشامد کرے گا۔ خوشامدیں کرنا گڑگڑانا جھکنا' منتیں کرنا اس کا شیوہ ہے------ یہی تو اس کی خوبیاں ہیں------ ازل سے وہ یہی کرتا آیا ہے اور آج بھی ایسا کرنے میں اسے کوئی عار نہیں----- لیکن آج سالمی کا دل جل رہا تھا---- وہ بے قابو تھا اور بے اختیار دوڑ رہا تھا---- وہ سمجھ گیا کہ گولیوں کا یوں برسنا بلا وجہ نہیں-------- گولیوں کی بوچھاڑ سے اس کے دل میں وسوسے جنم لے رہے تھے جبکہ سالمی چاہتا تھا کہ تمام لوگ اتفاق امن اور آشتی سے رہیں----- وہ خوش تھا کہ آج علاقے کے تمام لوگ نفاق مٹا کر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دشمن سے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے---- لیکن وہ مغموم تھا کیونکہ دشمن ے کارندوں نے آج گولیاں برسائیں---- کسے معلوم کون گولیوں کی زد میں آیا---- کس کے گھر سے نوحوں کی آوازیں آئیں گی---- کس ماں کا گوشہ جگر گولیوں کا نشانہ بنا----- کس بہن کے اکبر صفت بھائی کا سینہ چھلنی ہوا----- کس باپ کا بازو ٹوٹا اور نجانے کس کے سر سے اس کا آنچل نوچ لیا گیا---- کون جانے--- کون جانے------ سالمی دوڑ رہا تھا شاید یہ گولیوں کی وحشتناک آوازیں ختم ہو جائیں---- شاید گولیوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے----- لیکن ایسا نہ ہو سکا------ گولیاں موسلا دھار بارش کی مانند برس رہی تھیں---- ہاں لوگ آرزو مند بارش کے----- پانی نہ برسا---- گولیاں برس رہی ہیں---- پانی نہیں---- انسانوں کا لہو بہہ رہا ہے----- پانی کے بدلے لہو----- لہو ارزاں ہے----- لہو کی کوئی قیمت نہیں---- پانی کے بدلے خون-----

سالمی بھاگتا بھاگتا ایک جگہ رک گیا گولی سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی ----- اس کی معصوم بہن زخمی ہوکر اس کے قدموں میں گر گئی ----- سالمی نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا' اس کے بے جان جسم سے خون بہہ رہا تھا ----- سالمی کے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور پیاس کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی۔

(بلوچی سے ترجمہ ۔ آمنہ پناہ)

م ب طاہر

شابو

بچپن ہی سے میں بابا شابو کے الجھے ہوئے بال لمبی گرد آلود داڑھی اور پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھتا چلا آرہا تھا۔ لیکن کبھی بھی میں نے یہ کوشش نہ کی کہ اس دیمک خوردہ درخت کے دل کے اندر جھانک لوں۔ اور یا اس غم زدہ بوڑھے کے درروں کے منہ کھول دوں یا/ گذری ہوئی تاریخی کتاب کے بوسیدہ ورقوں کو پڑھ لوں۔ کیونکہ میں اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور جب اس بچپن کے نادان دور میں ہم کبھی کسی چیز کیلئے یا چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضد کرتے اور بالک ہٹ میں آتے تو گھر کے بڑے لوگ ہم کو اپنی ضد سے باز آنے کیلئے ڈرانے دھمکانے لگتے تو بابا شابو کو آواز دیتے۔ اور جب ہم بابا شابو کا نام سنتے تو ڈر کر خاموشی اختیار کرلیتے کیونکہ اس وقت وہ ہمارے واسطے بچپن کے افسانوی دیو کی طرح تھا جوکہ خوبصورت پریوں کو اٹھا کر لے جاتا اور عمر بھر اپنی باندی بنا کر رکھتا اور بات بھی سچ ہے کیونکہ بابا شابو کی ہیئت کذائی بھی تو ایسی تھی لمبا تڑنگا قد کالا چہرہ خوفناک آنکھیں۔ واقعی افسانوی دیو سے کم نہ تھے۔

لیکن جب میں تھوڑا سا بڑا ہوا اور کبھی کبھی بابا شابو کے پاس جاکر بیٹھنے لگا تو پتہ چلا کہ بابا شابو اتنا خوفناک تھا ہی نہیں جو ہم کو گھر کے لوگ بتایا کرتے تھے۔ بے شک یہ بات ہے کہ لوگوں کی باتیں اس کو ناپسند تھیں۔ اور نہ وہ کبھی کسی سے بات کرتا تھا۔ ہر وقت اس کے چہرے پر ایک خوفناک سی خاموشی طاری رہتی تھی۔

عمر کی گاڑی دوڑتی جارہی تھی۔ شابو کی زندگی کے دن گھٹتے جارہے تھے اور ہماری زندگی کا درخت بڑھتا جارہا تھا۔ بابا شابو ہر صبح و شام خدا واسطے کی روٹی لینے کیلئے ہمارے دروازے پر آکھڑا ہوتا۔ اور اس کے بعد پورے دن بابا شابو کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

بابا شابو ہمارے علاقے کا ایک بھیک منگا فقیر تھا۔ جوانی سے کوئٹہ آیا ہوا تھا۔ اور کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ شابو کس نسل سے ہے' کون ہے' کہاں سے ہے۔ اور اس نے بھی اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کبھی کبھار اس کی زبان پر پیر بلانوش اور دا بندین کا نام آتا تھا۔ اور جب کبھی ہم دا بندین کا نام لیتے تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔ ابتدائی دنوں میں بابا شابو دوسرے لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا لیکن جب ہم کوئٹہ آئے تو اس کو معلوم ہوا کہ یہاں پر دا بندین کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ تو اس کے بعد اس نے دوسرے لوگوں سے بھیک مانگنا ترک کردیا۔ وہ پہاڑ کے دامن میں اپنے لئے گھاس پھونس کی ایک جھگی بنا کر اس میں رہتا تھا۔ کسی اور کو وہ اپنی اس جھگی کے اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ اور نہ وہ بازار کو جاتا تھا۔ صرف وہ صبح اور شام اپنی خیرات لینے کیلئے ہمارے گھر آتا تھا۔ کیونکہ ہمارا گھر بھی پہاڑ سے اتنا دور نہ تھا۔

شابو کی زندگی لوگوں کیلئے ایک معمہ تھی۔ کچھ لوگ شابو کو ولی و بزرگ کہتے تھے۔ کچھ لوگ اسے

صوفی خیال کرتے تھے۔ اور بعض اس کو پیر مانتے تھے۔ لیکن اس گھر کے لوگ اس کو بابا کہتے اور بچوں کو اس سے ڈراتے تھے۔ گاہے بگاہے شہر کے بچے اس کو تنگ کرتے اور اس پر پتھر برساتے تھے۔ ہم نے سنا کہ ایک دن ایک بچے نے اس کے تن کے کپڑے پھاڑ دیئے اس پر بابا شابو رونے لگا۔ اور دوسرے دن وہ بچہ موٹر کے نیچے آکر مرگیا۔ اس کے بعد لوگ اس سے ڈرنے لگے اور بچے بھی اس سے دور رہتے تھے بابا شابو واقعی ایک معمہ تھا اور کوئی اسے بوجھ نہ سکا۔

ان دنوں جب میں بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ اور کچھ دنیا کے حالات اور مذہبوں کی تاریخ کا مطالعہ کر چکا تھا جس سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں اور میں نے سنا کہ عیسائی اور بدھ مت میں بھی بابا شابو کی طرح کے لوگ ہیں ان کو تارک الدنیا کہا جاتا ہے اور بہت سارے صوفی بھی دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ لہٰذا میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ بابا شابو سے کچھ قریب تر ہوکر اس سے اس کی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لوں۔ مگر میری ان کوششوں سے بابا شابو مجھ سے ناراض ہونے لگا۔ یہ بات ہمیشہ میرے دل میں تھی۔ مگر کوئی راہ نہ نکلتی تھی۔ دن گذرتے گئے بابا شابو کے دانت گرنے لگے اور کالے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگیں' کمر جھکنے لگی۔ اور ہاتھ بڑھاپے کی کمزوری سے کانپنے لگے اور بھرے بھرے جسم کا مالک بابا شابو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن چکا تھا۔ لیکن وہ باوجود اس بڑھاپے کے اپنی روٹی لینے کیلئے ہمارے گھر ضرور آیا کرتا تھا۔ اگر ہم کبھی کبھار' اس کو کہتے کہ بابا ہم خود ہی تمہاری روٹی کو تمہاری جھگی پہنچا آیا کریں گے تو اس پر وہ اپنا سر ہلا کر کہتا نہ۔نہ

ایک وقت جب میں رات کو گھر آیا تو معلوم ہوا کہ آج بابا شابو اپنی دو وقت کی روٹی لینے کیلئے نہیں آیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر وہ کل صبح بھی نہیں آیا تو میں خود ہی اس کی روٹی اس کی جھگی پر اس کو دینے جاؤں گا۔

صبح ہوئی۔ دوپہر ہو گذری اور رات ہوگئی۔ مگر بابا شابو اپنی روٹی لینے نہ آیا۔ اس پر میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے کہ یہ شخص تو آج تک بیمار ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ تو اس پیرانہ سالی کے باوجود اپنی زندگی کی یہ دو وقت کی روٹی آکر لے جانا بھولا ہی نہیں کیا بات ہے کہ وہ دو دن ہو گذرے ہیں کہ آتا ہی نہیں کیا وہ اس دنیا سے چل بسا ہے۔ یا ہم سے ناراض ہے۔ یا پھر وہ کہیں اور چلا گیا ہے۔؟ آخر کیا بات ہے۔؟ دل نے کہا کہ اب جاکر معلوم کر لوں۔ لیکن وہ جو کہتا تھا کہ میری جھگی میں مت آیا کرو۔ مجھے یاد تھا اس لئے میں جرات نہ کر سکا۔ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ آج ضرور ہی اس کی جھگی میں جاؤں گا۔ بتی ہاتھ میں لے کر اور روٹی بغل میں دبا کر میں اس کی جھگی کی طرف چل پڑا پہاڑ کے دامن میں پہنچا۔ نیچے کی طرف قبرستان تھا اور پہاڑی چٹانوں پر سے کبھی کبھی گیدڑوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہر کے کتے بھی بھونک رہے تھے' چاروں جانب ایک خوفناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور میں بابا شابو کی جھگی کی جانب رواں تھا۔ دل ڈاکوؤں کے خوف سے بھی دھڑک رہا تھا۔ جھگی کے دروازے پر پہنچا اور بابا شابو کو پکارا مگر کوئی آواز نہ آئی اس طرح تین چار بار آوازیں دیں پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ ڈرتے کانپتے جھگی کے اندر قدم رکھا۔ جھگی کافی لمبی تھی کچھ آگے چل کر جو دیکھا تو بابا شابو جھگی میں مٹی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اور اس جھگی کے ایک کونے میں پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ سر کی جانب سے جاکر میں نے آواز دی مگر کوئی جواب نہیں آیا چراغ نیچے رکھ کر ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا تو اس کا کاندھا سرخ آگ کی طرح گرم۔

اس کو کچھ ہلایا تو اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور میرا نام لیا اور پھر دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اس کو کہا کہ بابا تمہاری روٹی لایا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ "پانی۔"

میں نے گھڑے سے کٹورے میں پانی بھرا۔ بابا شابو کو روٹی اور پھر پانی کا کٹورا دیا اس نے پانی پی لیا تو ایک سرد آہ بھری اور میرا نام لے کر "کہا اچھا ہوا کہ آخر وقت میں تم آہی گئے۔ اور تم ہر وقت مجھ سے پوچھا کرتے تھے لیکن میں تم کو کچھ بتاتا نہیں تھا اب جو پوچھنا ہے پوچھ لو کیونکہ بدبخت شابو کی زندگی کے آخری لمحے ہیں۔"

میں تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ دل میں کہا کہ یہ لاوارث اور مسکین شخص بخار میں تڑپ رہا ہے اور بھوکا پیاسا ہے اس سے کیا پوچھوں لیکن وہ میری اس خاموشی کو دیکھ کر کہنے لگا "کیوں مجھ سے کچھ پوچھتے نہیں ہو؟" میں نے اس کو کہا "بابا شابو میرے دل میں ہر وقت یہی آرزو تھی کہ تمہاری زندگی کے حالات سے باخبر ہو جاؤں"

شابو نے اس پر اپنے آپ کو سنبھالا اور پہلو بدل کر کہنے لگا "میں دالبندین کا رہنے والا ہوں ایک غلام زادہ ہوں۔ میں اپنی نوجوانی میں لوگوں کی مجلسوں میں حصہ لینے اور بیٹھنے والا نوجوان تھا۔ دن کو اپنے آقاؤں کی خدمت سرانجام دیتا تھا اور راتوں کو اپنی پرسوز آواز میں بلوچی اشعار اور گیت گا کر ان کے دل کو خوش کرتا رہتا تھا۔ بڑے دور دراز علاقوں سے لوگ میرے گانے سننے کیلئے بڑی تعداد میں آتے تھے۔ اور میرے واسطے تحفے تحائف بھی لاتے تھے۔ میں دنیا کے تفکرات سے آزاد زندگی گذارتا تھا۔ اور غم و اندوہ سے بے فکر تھا۔ لیکن بخت نے مجھ سے کنارہ کشی کی اور خوشی کے دن زوال پذیر ہونے لگے اور بدقسمتی کا ہلال طلوع ہوا۔ بخت نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ انہی دنوں میری نظر ایک شریف زادی دوشیزہ پر پڑ گئی اور وہ میرے دل کے نہاں خانے میں بس گئی' دوشیزہ بھی میری خوش آوازی سے مسحور ہو کر مجھے چاہنے لگی۔ سماجی رسم و رواج' اعلیٰ اور ادنیٰ' آقا اور غلام کا فرق آڑے آگیا' مجھ سے چھپنے لگی تاکہ لوگوں میں بدنام نہ ہو' اس سے آتش عشق اور بھڑک اٹھی' میرے لئے ایک بلا بن گئی اس طرح میری شاعری اور سوز دروں اور درد نہاں میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے سب لوگ ہماری اس چاہت سے باخبر ہوگئے کہ میرا دل شاملو کی زلفوں کا اسیر ہوگیا' لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے' جس وقت یہ خبر شاملو کی ماں کے کانوں تک پہنچی تو اس نے شاملو کو گھر میں بند کرکے رکھا اور اس بارے میں میرے خلاف جاکر سردار سے شکایت کی اور اس دن سے میری بدقسمتی کے دن شروع ہوگئے' اس کے بعد میں نے اپنی زندگی میں ایسے ایسے برے دن دیکھے کہ میں ان کو قیامت تک فراموش نہ کر سکوں گا۔"

"میں غلام تھا لڑکی شریف زادی تھی۔ سردار ظالم تھا اور زمانہ بے رحم' میں مجبور و بے بس تھا وہ لوگ مجھ سے حیوانوں جیسا سلوک کرتے اور کام لیتے۔ اور ساری رات مجھے پاؤں پر کھڑا رکھتے تھے۔ تاکہ میں شاملو کو اپنے دل سے بھلا دوں۔ لیکن وہ تو میرے دل پر اس طرح مسلط تھی کہ اذیتوں سے مجھے جیسے چین مل رہا تھا۔ آخرکار میں مجبور ہوکر اپنی زندگی اور شاملو کے نام و ناموس کی خاطر چل نکلا۔ اور اس کی محبت کو دل سے لگائے آج تک جی رہا تھا" یہ ماجرا سنانے کے بعد بابا شابو کی آنکھیں ایسی روشن ہوگئیں گویا اس کے دل سے ایک بہت بھاری بوجھ اتر گیا۔ اور اس کا کالا کشادہ چہرہ پھول کی طرح سرخ ہوگیا۔ ایسا جیسا کہ

ایک چھوٹے سے بچے کا چہرہ کسی بہت بڑے کام کے کرنے سے ہو جاتا ہے۔ شابو کے خشک ہونٹ خوشی سے کھل گئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑے اور دوبارہ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور میں نے جو دیکھا تو اس کی جان نکل چکی تھی۔ اور نبض خاموش تھی۔

(بلوچی سے ترجمہ۔ پیر محمد زبیرانی)

عبدالغفار بگٹی

قحط سالی

موسم سرما ہے۔ ساون اور گذشتہ موسم بہار میں بارش کا ایک قطرہ تک نہیں گرا۔ قحط سالی سے جھاڑ جھنکاڑ اور درخت سب خشک ہیں۔ کوہ و دمن میں ایک سبز تنکا تک بھی نہیں ہے۔ مال مویشی والے لوگ حیران ہیں' ہر ایک کی داڑھی چہرے پر خشک ہو چکی ہے۔ بھیڑ بکری اور گائے موت کے منہ میں جارہے ہیں۔ زمین و زماں اور پہاڑ اور گھاٹیوں کو دیکھیں تو ہر ایک کی زبان پر بارش بارش کی پکار ہے۔ لیکن کچھ نہیں۔ ان فریادوں کو سننے والا کوئی نہیں' کون ان فریادوں کو کان لگا کر سنے۔ یوں کہو کہ یہ نیلا آسمان بہرا ہے۔ ان لاچاروں اور مظلوموں کی فریاد کو سنتا ہی نہیں۔

باران اپنے علاقے کا سب سے بڑا دولت مند سفید ریش ملک تھا۔ اس کا مہمان خانہ مہمانوں سے کبھی بھی خالی نہیں ہوتا تھا ہر روز ایک دو مہمان اس کے مہمان خانے میں ضرور ہوا کرتے تھے اور جب بھی کوئی شخص اس کے گھر یعنی مہمان خانے میں آتا تھا تو وہ دودھ' دہی' گھی اور پنیر سے اپنی جھولی بھر کر چلا جاتا تھا۔

باران بڑے ٹھاٹ باٹ اور کروفر کا مالک تھا اور جب بھی کبھی کبھار وہ شہر جاتا تھا' تو ہر ایک شخص کی یہ خواہش ہوتی کہ باران مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشے۔ لیکن اللہ کے کاموں کو کوئی نہیں جانتا۔ اب وہی باران ہے کہ لوگوں کے در پر قرض مانگنے کیلئے دوڑتا پھرتا ہے۔ کوئی شخص بھی اس کو ایک دمڑی تک دینا گوارا نہیں کرتا اور ہر شخص یہی کہتا ہے کہ خدا اس کو کہیں اور گم کرے۔ اور تو اور اس کو کوئی ایک روٹی کا لقمہ دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے علاقے اور بستی میں کوئی اس ڈر سے جاتا ہی نہیں تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی نہ کسی چیز کیلئے ضرورت مند ہو۔ اور منہ بسور کر مانگ نہ لے۔

اس جھوٹی دنیا پر کوئی اعتبار نہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی خوراک خالص گھی اور دودھ ہوا کرتا تھا آج ان کی خوراک ساگ پات ہے اور اگر اس ساگ پات کے روز روز کے کھانے سے ان کا جی اکتا جائے اور دل میں درد اٹھے' بڑی مشکل سے کہیں سے کوئی روٹی کا لقمہ دستیاب ہو تو وہ بھی غنیمت ہے کہ ان کے منہ کو لگ جائے' یوں تو وہ روٹی کی شکل کو دیکھنے کیلئے ترستے ہیں کہ روٹی کی شکل کیسی ہوتی ہے۔ اس سارے قصے کا پس منظر کیا ہے۔؟ تمہیں معلوم نہیں کہ قحط سالی ہے۔ اب کوہ و دمن کے باشندوں کے ہاں کچھ بھی نہیں دودھ' نہ گھی' نہ پنیر' نہ لسی اور نہ بھیڑ بکریوں کی پشم' سب کی امیدیں ٹوٹ چکی ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

ہر ایک کا ایک دور ایک زمانہ ہوتا ہے۔ غریبوں کو تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اور ان پر کیا گذر رہی ہے' بدبختی آتی ہے تو وہ اپنے ساتھ ساری بلائیں لے کر آتی ہے۔ اس قحط سالی کو تو

چھوڑ دیجئے وہ تو ہے ہی۔ مگر یہ جو موسم سرما اپنے ساتھ یخ بستہ ہواؤں کو لے کر آیا ہے صبح و شام ہاتھ پاؤں کو سن کرنے والی ہوائیں دھول اڑاتی چل رہی ہیں۔

باران اپنی بیوی سے مخاطب ہے۔ "بد قسمت گنجی! اب کیا کرنا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہماری قحط زدہ دبلی پتلی رہی سہی بھیڑ بکریاں اس موسم سرما کی بھینٹ چڑھ جائیں گی۔" گنجی نے باران کو جواباً کہا "تم کو تو ہر وقت ان بھیڑ بکریوں کا غم لگا ہوا ہے۔ بچہ بھوک سے مررہا ہے تھوڑا سا اندوختہ کھجوروں کا تھا وہ بھی اب ختم ہو چکا ہے کہ اسے دو چار دانے کھجور کے دیدوں' دو دن ہوئے ہیں کہ اس نے کچھ کھایا تک نہیں۔ ان خشک ٹکڑوں کو تو وہ کھا ہی نہیں سکتا۔" گنجی کی ان باتوں کو سن کر باران نے خاموشی اختیار کر لی۔ باران کا بڑا لڑکا گنگزار جو کہ روز بھیڑ بکریوں کو چرایا کرتا تھا' آج وہ گھر میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ پیش کے پتوں سے بنے ہوئے اپنے چپلوں کو گانٹھتے ہوئے اس نے کہا "تم کہدا بجار کے پاس جاؤ شاید کہ وہ تمہیں کچھ کھجوریں دیدے" باران نے جواباً کہا "بیٹا! میں نے تو کل اس کو اپنے طور پر کہا لیکن اس نے مجھے یونہی خالی ہاتھ لوٹا دیا۔" اس پر گنگزار نے کہا "مجھے اس سے یہی توقع تھی وہ دن اور تھے کہ وہ خود ہی درختوں سے کھجوریں اتار کر یہاں لاکر پہنچایا کرتا تھا۔ وہ اس لئے کہ ہمارے پاس اس وقت دودھ گھی دہی پنیر کی بہتات تھی۔ آج جب کہ ہمارے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو لوگ ہمیں پوچھیں کیوں۔"

باران کی بڑی لڑکی شاری نے کہا "ابا! میں تو بالکل ہی برہنہ تن ہو چکی' نہ تن پر قمیض ہے نہ سر ڈھانپنے کیلئے دوپٹہ اور چادر' جب ندی سے پانی لانے کیلئے جاتی ہوں تو مجھے شرم آتی ہے۔" اس پر باران نے اپنی لڑکی شاری کو کہا "بیٹی! مجھے جو کوئی بھی دیکھ لیتا ہے تو وہ اس ڈر سے اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے کہ میں اس سے کچھ مانگ نہ لوں مجھے کوئی قرض دینے والا ہی نہیں اور پھر ان قحط زدہ کمزور مریل بھیڑ بکریوں کو کوئی یونہی مفت میں بھی لینے کو تیار نہیں کہ ان میں سے ایک بیچ کر اس سے گذارہ چلاؤں۔" یہ باتیں باران کے منہ میں ہی تھیں کہ گنجی نے پکار کر کہا "شاری ادھر کو آکہ تیرے بہن بھائی بھوکے ہیں" شاری شکستہ دل سی اٹھ کر پہاڑ کی طرف چل پڑی اور اپنے ساتھ بستی کی چند اور سہیلیوں کو بھی ساتھ لے کر چلی نوری۔ نے اپنے خیمے سے باہر نکل کر آواز دی کہ "اری بہن شاری آج کس پہاڑی درے کی جھاڑیوں کی باری ہے۔؟ شاری نے کہا کہ "اس طرف کی سب جھاڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اس درے کے بالائی حصے کے اس طرف والے ڈھلوان کی کچھ جھاڑیاں سبز ہیں۔" "شاری وہ تو بہت دور ہے" نوری نے ایک آہ سرد بھر کر کہا "پھر میں کیا کروں لاچاری ہے بھوک سے مر رہے ہیں۔" اور پھر وہ چل پڑیں باران کا لڑکا گنگزار ان سب باتوں کو خاموشی سے بیٹھا سن رہا تھا۔ اس واقعہ سے اسکا دل تنگ تھا۔ اٹھا اور اٹھ کر سواس پہن کر' پھٹی پرانی چادر کاندھے پر لپیٹ کر۔ چرواہوں والی لاٹھی کو ہاتھ میں لے کر بھیڑ بکریوں کے گلے کو ہانک کر چل پڑا۔ سردیوں کے دن تھے صبح کا وقت تھا پہاڑوں کی اوٹ سے سورج اپنا چہرہ دکھا رہا تھا۔ تیز و تند سرد ہوا چل رہی تھی اور ٹھنڈک بہت ہی زیادہ تھی۔ گنگزار کے پیٹ میں دانہ تک نہیں گیا تھا اور وہ سردی سے سخت کانپ رہا تھا' بھیڑ بکریوں کو موت آنکھیں دکھا رہی تھی۔ روزانہ ان میں سے پانچ چھ موت کا لقمہ بنتی جارہی تھیں۔ گنگزار ان دبلی پتلی بھیڑ بکریوں کے گلے کے ساتھ دوڑتا جارہا تھا تا آنکہ وہ بستی کے لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن اس کی یہ قحط زدہ مریل بھیڑ بکریاں بڑی مشکل سے چل رہی تھیں اور اس نے اپنی ان بھیڑ بکریوں کے گلے کو اس نزدیکی پہاڑی درے کے درمیان میں چھوڑ دیا' تاکہ وہ پہاڑ

کے سوکھے گھاس پھوس سے اپنا گذارہ کر سکیں۔ اور وہ خود ایک پہاڑی ٹیلے پر جاکر بیٹھ گیا۔ اس کو بانسری بجانا خوب آتا تھا۔ لیکن اس کا دل سخت غمگین اور تنگ تھا۔ اس نے ایک نظر ان بے آب و گیاہ ٹلے پہاڑوں کو دیکھا پھر اپنی حالت کو دیکھا اور بے خودی کے عالم میں اس کے دل سے ایک سرد آہ نکلی اور آنسو اس کی آنکھوں سے ابل پڑے۔ اپنے تھیلے میں سے بانسری نکال کر دل میں کہا..... گنگزار آج بانسری نہ بجاؤ گے! تو پھر کب بجاؤ گے یہ کہہ کر بانسری منہ پر رکھ کر بجانے لگا۔ بانسری بجاتا رہا اور اس وقت تک بجاتا رہا تا آنکہ دوپہر ہوگئی اور سورج بجھ کر ٹھنڈا ہونے لگا۔ بھیڑ بکریوں کا گلہ پہاڑی درے میں ادھر ادھر پھیل گیا۔ اچانک اس کے دل نے اس کو گدگدایا۔ کیا تم بھیڑ بکریاں چرانے آئے ہو یا بانسری بجانے؟ وہ اٹھا کہ بھیڑ بکریوں کے گلے کی خبر لوں اس حال میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ چار بکریاں مری پڑی ہیں۔ وہ حیران تھا کہ کیا ہوا؟ اس عالم میں اس کی آنکھیں اچانک اوپر اٹھیں اور اسے بادل کا ایک ٹکڑا آسمان کے کنارے پر تیرتا ہوا نظر آیا اس نے دل میں خوشی محسوس کی کہ آج بارش ہوگی اور دشت و دمن سرسبز ہوں گے۔ ایسے میں اگر کچھ بکریاں مر بھی گئیں تو کوئی بات نہیں۔ دعا کیجئے کہ بارش ہو جائے' کچھ دیر گذرنے نہ پائی تھی کہ بادلوں نے سطح آسمان کو پوری طرح سے ڈھک لیا۔ جنوبی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بادل مست سے مست تر ہوتے جا رہے تھے۔ گھن گرج شروع ہوگئی' بجلیاں چمکنے لگیں' بادل جب گرجنے لگے تو گنگزار نے کہا "بادلو برسو برسو خدا کے واسطے دل کھول کر خوب برسو۔"

بجلی چمکی بادل گرجے تو بارش کی دھاریں پے درپے برسنے لگیں بارش اتنی تیز ہونے لگی گویا کہ کسی نے مشکیزے کے منہ کا تسمہ کھول دیا ہو' اس بارش نے بھی کچھ بھیڑ بکریوں کو اپنا لقمہ بنا ہی لیا۔ گنگزار کو بھی اس بارش سے موقع نہ ملا کہ وہ بھی اپنے آپ کو بھیگنے سے بچائے وہ بھی سر سے پاؤں تک اس بارش میں بھیگ گیا تھا اور اس کی بھیڑ بکریاں بھی حد سے زیادہ بارش میں بھیگ چکی تھیں۔ بڑی مشکل سے گلے کی باقی ماندہ بھیڑ بکریوں کو اکٹھا کرکے گھر کی طرف گرتے پڑتے اور سردی سے کانپتے ہوئے چل پڑا' کوئی مغرب کے وقت گھر پہنچتے ہی نڈھال ہو کر گر پڑا اور اس کی گویائی نے جواب دیدیا۔ گنگزار کی ماں گنجی روتی پیٹتی بولی "بدبخت بارو دوڑو کہ میرا گھر لٹ گیا" نوجوان بیٹا جس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ان دبلی پتلی بھیڑ بکریوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ دوسرے خیمے سے شیران آیا اور گنگزار کو اٹھا کر خیمے میں لایا' گنجی نے آگ جلائی اور ایک بچھونا آگ کے قریب بچھا دیا اور اس پر گنگزار کو سلا دیا دونوں جانب سے آگ جل رہی تھی لیکن بارش یکساں برستی ہی جا رہی تھی۔ شیران نے کہا کہ "گنگزار کو بارش نے ہی مارا ہے۔ اس کو کوئی اور پوشاک پہنا دو" گنجی نے کہا "ہمارے پاس کوئی کپڑا ہے ہی نہیں اس پر شیران نے کہا کہ "میرے خیمے میں کھجوروں سے بھری ایک تھیلی پڑی ہے جاؤ اسے لاؤ اور اس میں کچھ کھجوریں نکال کر صاف کرکے مالیدہ بنا کر اس کے منہ میں ڈال دو تاکہ اس کے پیٹ میں کوئی چیز تو جائے اس کے دل کو اس سے سہارا ملے۔"

گنجی جاکر کھجوروں کا تھیلا لے آئی اور ان میں سے کھجوریں نکال کر مالیدہ بنانے لگی۔

ہوا بدل گئی۔ باران نے خیمے سے نکل کر ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا کہ "اے لوگو! ہلکی ہوا چل رہی ہے اگر یہ تند و تیز ہو کر یخ بستہ ہوا میں بدل گئی تو یہ جان لو کہ بھیڑ بکریوں کے گلے میں سے ایک بھی زندہ نہ رہے گی۔" کچھ دیر کے بعد گنجی مالیدہ تیار کرکے گنگزار کے منہ میں ڈالنے لگی۔ اب یخ بستہ ہوا اور بھی تیز تر ہو کر چلنے لگی۔ بادل ادھر ادھر منتشر ہونے لگے' سخت سردی تھی اور اس سے ہر ایک آدمی کانپ

رہا تھا۔ بھیڑ بکریاں بلک رہی تھیں اور ایک ایک کرکے دم توڑ رہی تھیں۔ مگر باران کو گنگزار کے غم سے فرصت ہی کہاں تھی' صدو پکارنے لگی کہ "ماں میں سردی سے مر گئی مجھے ڈھانپ دو" گنجی نے کہا تا مراد چپ کرکے سو جاؤ یہی نمدے ہیں جو گنگزار کے اوپر ہیں۔" صدو رونے لگی۔ گنگزار آنکھیں کھول کر پوچھنے لگا کہ "صدو کس واسطے رو رہی ہے۔" ماں نے کہا "بیٹا! اس کو سردی لگ رہی ہے۔" کہا "پھر اس پر نمدے کیوں نہیں ڈالتے ہو۔؟" باران نے کہا کہ "بیٹا نمدے یہ ہیں جو تم پر ڈالے ہوئے ہیں۔" گنگزار نے کہا کہ "ان میں سے ایک اس پر ڈال دو گنگزار ان باتوں کے کہنے کے بعد پھر بے ہوش ہوگیا اور اس کے بعد پھر کبھی ہوش میں آیا ہی نہیں اس کے ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ باران نے فریاد کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارے منہ کالے ہوگئے۔ گنگزار خدا کو پیارا ہوگیا" گنجی اور شاری رونے دھونے اور ماتم کرنے لگیں۔

یہ رات ختم ہونے والی نہ تھی یہ تو اتنی لمبی تھی کہ ختم ہونے سے ناآشنا تھی۔ مگر موسم بہار کی بارشیں دوسری رات بھی برستی رہیں۔

(بلوچی سے ترجمہ۔ پیر محمد زبیرانی)

محمد بیگ بلوچ

انعام

اس رات نیند مجھ سے کوسوں دور تھی!

کیونکہ اس دن میں گھر کے ایک دروازے کو رنگ کرنے کے لیے بازار سے رنگ کا ایک ڈبہ خرید لایا تھا۔ گھر پہنچ کر جب میں نے وہ ڈبہ کھولا تھا تو مجھے ڈھکن کے اندرونی حصہ پر چسپاں ایک ٹوکن ملا تھا۔ اس ٹوکن پر ایک نمبر اور کمپنی کے کسی ڈائریکٹر کے دستخط بھی دکھائی دیئے۔ میں نے توجہ نہیں دی اور اس ٹوکن کو ایک طرف رکھ دیا۔ رکھ نہیں دیا بلکہ ایک طرح گویا اسے پھینک دیا اور پھر دروازے پر رنگ کرنے کے کام میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ ٹوکن کو بھول ہی گیا۔

اسی بے خیالی میں دن رات میں تبدیل ہو گیا اور میں جی میں خوش ہوا' کیونکہ میری ایک بری عادت ہے کہ جب تک رات کے ڈیڑھ دو نہ بج جائیں' میں سوتا نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں کہ میں خدانخواستہ Insomnia یعنی بے خوابی کے عارضے میں مبتلا ہوں۔ نہیں۔ بس اس بری عادت کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ جب تک آدھی رات تک نہ پڑھوں اور کبھی کبھی نہ لکھوں چین نہیں آتا اور پھر میری اس بری عادت سے اہل محلّہ بھی خوش ہیں' کیونکہ میں بلا کسی معاوضہ یا تنخواہ کے ان کی چوکیداری اور پاسبانی کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دو تین گلیوں میں کتے ناپید ہیں۔ خیر میں اس رات بھی' ہمیشہ کی طرح' بیٹھا پڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ پاسبانی بھی کر رہا تھا۔ لیکن دوران مطالعہ نہ جانے کس طرح میرا خیال اچانک اس ٹوکن کی طرف گیا۔ ٹوکن کا خیال نہ آتا اور اس سے توجہ ہٹ جاتی تو اچھا ہوتا' لیکن ایسا نہ ہوا۔ کیونکہ ٹوکن کا خیال آتے ہی مجھے یاد آیا کہ دو ایک ماہ قبل' کسی اخبار میں اسی کمپنی کی جانب سے شائع کردہ کوئی اشتہار میری نظر سے گزرا تھا۔ اس اشتہار میں کمپنی نے کچھ "انعامات" کا اعلان کیا ہوا تھا۔ اب وہ انعامات کیا کیا تھے' باوجود کوشش کے یاد نہیں آ رہے تھے۔ ذہن پر زور دینے سے البتہ جیسے دھیرے دھیرے ایک موٹرکار' فرج اور رنگین ٹیلی وژن کے عکس پردۂ ذہن پر ابھرنے لگے تھے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ میں ان تینوں نعمتوں سے محروم ہوں۔ اندازہ لگائیے کہ مجھ ایسے خانماں برباد کے دل میں جب ایسے بڑے انعامات میں سے کسی ایک کے حصول کا گمان پیدا ہو جائے' تو نیند کس طرح آ سکتی ہے۔

پس اس رات' باوجود لاکھ کوشش کے' میری نیند حرام ہو چکی تھی!جی میں آیا کہ بچوں کو جگاؤں' تاکہ اس ٹوکن کو ڈھونڈ نکالیں' لیکن پھر دل بے قرار کو تسلی دی کہ اللہ مالک ہے۔ کل دل جمعی سے قدرت کی اس دین کو تلاش کر کے کمپنی والوں کے پاس جاؤں گا۔ اور اپنا انعام حاصل کر لوں گا۔

اب چونکہ نیند تو حرام ہو ہی چکی تھی' اس لیے دل ناتواں نئے نئے خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ خیال آیا کہ رنگین ٹیلی وژن اور فرج کی بات تو خیر اچھی بات ہے کہ یہ تو گھر کی زینت ہیں اور پھر میری اشد

ضرورت بھی، لیکن انہوں نے اگر مجھے انعام میں موٹرکار دے دی تو اسے رکھوں گا کہاں۔ مکان میرا اتنا چھوٹا اور تنگ ہے کہ سارے بچوں کو بیک وقت پاؤں پسارنے کی جگہ نہیں، ایسی صورت میں آخر اس بڑی موٹرکار کے لیے جگہ کہاں سے لاؤں گا۔ ہماری بدبختی یہ ہے کہ مکانوں کی طرح ہماری گلیاں بھی اس قدر تنگ ہیں کہ کار تو کار ہے، یہاں گدھا گاڑی کا گزر بھی مشکل ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ کمپنی تو ہمیں صرف موٹرکار دے گی، اس کے لیے پٹرول، رجسٹریشن، انشورنس اور مینٹی ننس وغیرہ کے اخراجات و مصارف کہاں سے آئیں گے۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ مجھے ابھی تک کار چلانی بھی نہیں آتی۔ ڈرائیونگ اپنی جگہ، کراچی میں بسوں کی سواری، بالخصوص منی بسوں میں سواری کی رسوائی اور اس کے نتیجہ میں کبڑا ہونے کے ہم اس قدر خوگر ہو چکے ہیں کہ ہمیں فی الحقیقت موٹرکار میں بیٹھنے کی تمیز ہی نہیں۔ حالات جب یہ ہوں تو بھلا ہم موٹرکار کے کیونکر قابل ہیں۔ چنانچہ اس خیال نے خوش کرنے کی بجائے مجھے زیادہ پریشان کر دیا، اور اس طرح نیند مجھ سے اور زیادہ دور ہو گئی۔

اس ادھیڑبن میں دل میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس موٹرکار کو لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کر دوں، کیونکہ میرے دو لڑکے گبھرو جوان ہو چکے ہیں اور ماشاء اللہ شادی کے قابل ہیں۔ پھر خیال آیا کہ یہ کیا حماقت کر رہے ہو۔ بجلی لس بیلہ میں کڑکتی ہے، تیرا دل یہاں بیٹھ جاتا ہے، اور تو شادی کرانے کے گمان میں ہے۔

مکان بنانے اور بچوں کی شادیاں کرانے کا خیال ابھی اپنی جگہ تھا کہ ایک اور خیال نے آن گھیرا۔ یہ خیال پیٹ کا تھا۔ پیٹ اور غم روزگار، جو سب سے بڑا مسئلہ ہیں۔ دل نے کہا کہ کب تک نوکری کرو گے۔ کب تک اوروں کی غلامی کرتے رہو گے۔ انہی پیسوں سے دوکان کیوں نہیں کر لیتے۔ کیونکہ دوکان کرنے کے تیسرے فائدے ہیں۔ اپنا مالک خود، غم روزگار سے آزادی اور سب سے اچھی بات یہ کہ لکھنے پڑھنے کے لیے زیادہ وقت کا میسر ہونا۔ بظاہر یہ ایک اچھا خیال تھا، اس لیے دل کو قدرے قرار آیا۔ لیکن پھر اچانک کچھ نئے خیالوں نے ہلہ بول دیا۔ ان خیالوں کا تعلق دوکان سے تھا۔ دوکان آخر کس چیز کی۔ کولڈ ڈرنک کی۔ جی نہیں۔ یہ تو صرف موسم گرما کی چیز ہے۔ موسم سرما میں کیا کرو گے۔ تو پھر جنرل اسٹور۔ جی نہیں۔ یہ ہمارے قرب و جوار میں بہت سی ہیں۔ ویڈیو کیسٹ کی دوکان۔ یہ بھی نہیں کیونکہ یہ شریفانہ کاروبار نہیں۔ تو پھر آخر کیسی دوکان ہو؟ سوچا میں بھی عجب احمق ہوں۔ خدا نے غیب سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے عطا کئے ہیں، اور میں اب تک یہ دوکان وہ دوکان اور یہ خیال اس خیال میں غلطاں و پیچاں ہوں۔ آخر دوست کس درد کے درماں ہیں۔ اتنی عجلت آخر کاہے کو۔ پہلے رقم حاصل کر لوں گا، اور پھر دوست احباب کو اطلاع کر دوں گا اور آرام سے ان کا مشورہ لوں گا۔ قصہ مختصر، رات کا آخری پہر بھی میں نے انہی خیالوں میں بسر کیا۔

صبحدم، سب سے پہلے میں نے اس ٹوکن کو تلاش کر لیا اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا جلدی جلدی ناشتہ کیا اور ایک بس سے لٹکتے ہوئے اپنے دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ اب اگرچہ بس کی سواری اس دن بھی کسی عذاب سے کم نہیں تھی، لیکن ایسے لگ رہا تھا جیسے اس دن کی دھکم پیل، ڈرائیور کا غرور، کنڈکٹر کی بدکلامی، سواریوں کا شور و غوغا اور کیسٹ پلیئر کی بے حیائی کا مجھ پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بس میں سواری کا وہ میرا آخری دن تھا۔ اب میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی اسامی تھا۔ اب مجھے اس چھکڑا بس کی ضرورت نہیں تھی۔

دفتر پہنچنے پر محسوس ہوا کہ ذہن کام کی جانب مائل نہیں۔ بڑا کوشش کی، کاغذوں کو ادھر ادھر کیا فائلیں اوپر نیچے کیں، قلم اٹھایا اور رکھ دیا، ٹیلی فون کان سے لگا کر کریڈل پر دے مارا، لیکن کسی طور پر بھی دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ دل لگے بھی تو کیسے۔ آدمی جب لاکھوں کا مالک بن جائے تو دل غلامی کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ اس لیے وقت کو چائے خوری اور کرکٹ کمینٹری سے دھکیلتا رہا۔ اور اس طرح آخر وہ وقت ہوا جب مجھے رنگ ساز کمپنی والوں کو ٹیلی فون کرنا تھا تاکہ ان سے معلوم کر سکوں کہ وہ مجھے انعام دینے کا فنکشن کب اور کس طرح ترتیب دیں گے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ٹیلی فون پر کمپنی کے پردازاں کو آگاہ کیا کہ مجھے ان کے رنگ کے ایک ڈبہ سے ایک انعامی ٹوکن ملا ہے۔ خوش ہونے اور مجھے مبارکباد دینے کی بجائے ان صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کتنے ٹوکن ملے ہیں۔ حیرانگی سے میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کے خیال میں انعام حاصل کرنے کے لیے کتنے ٹوکن درکار ہیں۔ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا کہ صاحب جب آپ کے پاس سات ٹوکن جمع ہو جائیں تو تشریف لائیں۔ ہم آپ کو ایک بڑا برش انعام دیں گے!!

(بلوچی سے ترجمہ: مصنف)

افضل مراد

دوسرا سچ

یہ سچ ہے کہ میں نے ذہنی طور پر کبھی بھی ان کو تسلیم نہیں کیا۔

میری ذہنی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں بالائی طبقہ استحصالی قرار پایا گیا ہے۔ گزشتہ برسوں میں ترقی پسندوں کی ایک گولڈن جوبلی کانفرنس میں شمولیت کے بعد تو میں خاصا ترقی پسند اور روشن خیال ہو گیا تھا۔ اب میں زندگی میں جمالیاتی پہلوؤں کو فن برائے فن کا حصہ جانتے ہوئے زیادہ سے زیادہ معاشرتی برائیوں، ظلم، ناانصافی اور روایت پسندی کے بندھے ٹکے رویوں پر لکھنے لگا تھا۔ کبھی کبھار کسی مضمون یا ادبی تنقیدی نشستوں میں مجھے ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے لکھا یا پکارا جاتا تو مجھے خوشی سی ہوتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ اب مجھے اپنی ترقی پر زیادہ خوشی نہیں ہوتی بلکہ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی ترقی پسندی پر تھوڑا تھوڑا شرمندہ ہوں۔ میں نے فیوڈل سسٹم پر بہت زیادہ اور بہت سخت لکھا تھا انہیں ہر لحاظ سے رد کر رہا تھا۔ میں ان کو علاقے کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا رہا ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے اس سسٹم کو قریب سے نہیں دیکھا تھا ان کے بارے میں حقائق سے ناواقف تھا۔ زیادہ تر ان رسمی اور رواجی باتوں کو دھراتا رہا تھا جو ترقی پسندی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔

اب سردار نیک بخت خان کے بیٹے میر رحیم جان سے ملاقات اور گہری دوستی کے بعد میری سوچ پوری طرح سے تبدیل ہو گئی ہے۔ یقین ہی نہیں آرہا وڈیرے، سردار، خان اور نوابوں میں اتنا شعور اتنی انسانیت اور خاص طور پر فنون لطیفہ سے لگاؤ بھی ہو سکتا ہے۔ میر رحیم جان سے میری پہلی ملاقات شدید ترین سردیوں کی ایک رات میں اخبار کے دفتر سے چھٹی کے بعد آتے ہوئے ہوئی۔ انہوں نے پجارو روک کر مجھے لفٹ کی آفر کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا حالانکہ سردی کی شدت سے گھبرائے ہوئے بدن کا یہ تقاضا تھا کہ کوئی سائیکل سوار بھی لفٹ دے تو انکار نہ کیا جائے۔ میر رحیم جان نے تکلف برطرف کے انداز میں گاڑی سے اترتے ہوئے اصرار کیا کہ میں ان سے لفٹ پر انکار نہ کروں۔ اس کے نئے ماڈل کی پجارو میں بیٹھتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ پجارو کے اندر اعلیٰ قسم کی پرفیوم اور سگار کے دھوئیں کی ملی جلی خوشبو نے ایک عجیب طرح سے معطر فضا تخلیق کر رکھی تھی۔ میر رحیم جان نے مختصر بلوچی احوال کیا لیکن میرے فن کے بارے میں کافی باتیں کیں، انہوں نے میری تحریروں کو خاصا سراہا خاص طور پر میرے ٹی وی ڈراموں کی خاصی تعریف کی، انہیں میرے ڈراموں کے کردار تک یاد تھے۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں خود کو اندر ہی اندر بے حد مسرور اور پرسکون محسوس کرنے لگا، گلی کے نکڑ پر اترتے ہوئے انہوں نے مجھ سے ملاقات کا وعدہ لیا۔ اور ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ چلتے چلتے اپنا ذاتی فون نمبر بھی عنایت کیا۔

ان دنوں میں ایک ٹی وی ڈرامہ سیریل کا اسکرپٹ لکھنے میں مصروف تھا۔ رات دن کرداروں کے گرد رہتا۔ صرف شام کو ایک آدھ گھنٹہ اخبار کے دفتر جاکر اپنا ڈیلی کالم لکھ آتا۔ واپسی پر اپنے لئے چائے اور سگریٹ کا کوٹہ بھی خرید لاتا۔ ایک دن شام گئے کبابش کے سامنے والی دکان سے ملک پیک خریدتے ہوئے میر رحیم جان کی گاڑی میرے قریب آکر رکی۔ انہوں نے اتنے روز ملاقات اور ٹیلی فون پر کنٹیکٹ نہ کرنے پر گلہ کیا میں نے بتایا کہ ڈرامے کے اسکرپٹ کی وجہ سے مصروف رہا ہوں اس لئے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی اور نہ ٹیلی فون کا موقع میسر آسکا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں اور میر صاحب کینٹ کی طرف نکل گئے۔ میں نے راستے میں انہیں اپنے تھیم کے بارے میں بتایا۔ اس پر انہوں نے بڑی واہ واہ کی۔ میں حیران رہ گیا۔ میر رحیم جان نے نہ صرف میری ساری علامتوں کو پوری طرح سمجھ لیا اور مجھے داد دی بلکہ رات کو میری ذہنی تھکان کو مٹانے کیلئے اعلیٰ قسم کی وہسکی کا بندوبست بھی کر لیا۔

میں میر رحیم جان کی کوٹھی میں پہلی بار آیا تھا۔ سب سے پہلے بلڈنگ کی بالائی منزل پر لگے ڈش انٹینا نے میرا استقبال کیا۔ کوٹھی میں داخل ہوکر ہم سیدھے رحیم جان کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ اتنے بڑے اور وسیع ڈرائنگ روم میں اپنے چھوٹے سے ۱۰ x ۱۰ کے کمرے کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑی تنگی کا احساس ہورہا تھا۔ چاروں طرف نرم اور ملائم صوفے سجے ہوئے تھے۔ میں نے ان پر بیٹھے ہوئے خود کو دھنستا ہوا محسوس کیا۔ میر رحیم جان کے نوکر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ وہسکی کے ارد گرد گلاس اور برف سجا گئے تھے۔ میں نے میر صاحب سے ریکوسٹ کی کہ نیچے بیٹھتے ہیں۔ میری عجیب سی عادت ہے کہ ایک پیگ کے بعد کسی نہ کسی چیز سے ٹیک لگاتا ہوں۔ میر رحیم جان نے میری مزید کامیابیوں کے نام جام کا آغاز کیا۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ وہ خصوصاً" میرے ساتھ گفتگو کرنے پر بے حد خوش ہیں۔ دھیرے دھیرے محفل سرور کی منزلیں طے کرنے لگی۔ میر رحیم جان نے ڈیک پر سرونز کی کیسٹ" کو بہت دھیما چلا دیا تھا جو ماحول کو زیادہ مسحور کن بنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میر صاحب نے مجھ سے شاعری سننے کی خواہش کی۔ میں نے چند ابتدائی دور کی رومانی نظمیں سنا ڈالیں۔ موڈ میں آکر وہ مسلسل فرمائشیں کرنے لگے۔ "تم شاعر لوگ بڑے حسن پرست ہوتے ہو۔ ویسے بھی ہر رات خوبصورت خیالات اور خوبصورت لوگوں کے درمیان رہتے ہو۔ فن کی دنیا میں یہی ایک خوبی ہے۔" قدرے توقف کے بعد گمبھیر آواز میں بولے "میرے اندر بھی ایک فنکار ہے لیکن میں اسے باہر نہیں لاسکا۔ بابا جان کہتے ہیں یہ ریڈیو ٹی وی پر گانا ہمارے لئے...... خیر اس تذکرے کا کیا کرنا یوں سمجھ لو کہ اب تمہارے جیسے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تسکین کر لیتا ہوں" میں نے موضوع بدلتے ہوئے سیاست میں فیوڈل کے رول پر ان کی رائے لینا چاہی لیکن میر رحیم جان نے تقاضا کیا کہ سیاست پر گفتگو نہیں ہوگی۔ "ویسے بھی رات دن بابا جان اور بڑے بھائی کی سیاسی میٹنگوں سے تنگ آچکا ہوں۔" شاعری پر کافی باتوں کے بعد نشست برخاست ہوئی اور میر رحیم جان کے ڈرائیور نے مجھے گھر پہنچایا۔

میر صاحب سے ملاقاتیں اب باقاعدہ ہو چکی تھیں۔ ان دنوں میرے ڈرامہ سیریل کا اسکرپٹ جی ایم کانفرنس سے منظور ہو کر آگیا(۲)۔ میں اور واجد جو میرے ڈرامے کے پروڈیوسر تھے ڈرامے کی کاسٹنگ پر غور و خوض کرنے لگے۔ ہاں یہ بھی بات بتاتا چلوں کہ اس دوران میں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اسٹیج ڈرامہ بھی پیش کیا جو بریخت کے مشہور ڈرامے کا ترجمہ تھا۔ میری خواہش پر رحیم جان ڈرامے کے چیف گیسٹ بنے اور انہوں نے ڈرامے کو بہت سراہا اور بیس ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ ڈرامے کے

اختتام پر پوری کاسٹ ان کی فرمائش پر شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے گئی۔ ڈرامہ کی ہیروئن شہلا میر صاحب کے آگے پیچھے جا رہی تھی میں نے میر صاحب کو الگ لے جاکر سمجھایا کہ "اسے لفٹ نہ کرائیں پیسے اور گاڑی دیکھ کر ایسی لڑکیاں پاگل ہو جاتی ہیں۔ چار دن بہتر جینے کیلئے دوسری ساری ساری زندگی اندھیر کر جاتی ہیں۔" میر رحیم جان میری بات پر مسکراتے ہوئے بولے "میں تو اخلاقاً" وش" کر رہا تھا۔۔ ویسے بھی کوئی اتنی خوبصورت تو نہیں ہے۔" اس بات پر ہم دونوں کافی دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ رات بہت سرد تھی میر صاحب نے میرا اگلا پروگرام دریافت کیا۔ میں نے بلا تکلف گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور ان سے لفٹ لی۔ چلتے ہوئے میر صاحب نے گاڑی کی اگلی سیٹ کے پیچھے ہاتھ ڈالا اور برانڈی کی بوتل میری طرف بڑھا دی میری تھکی ہوئی آنکھوں اور شل ہوتے ہوئے اعضا جیسے حرکت میں آگئے لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے پینے سے انکار کر دیا۔ گلی کے نکڑ پر اترتے ہوئے میر صاحب نے زبردستی برانڈی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے متشکر نظروں سے انہیں خدا حافظ کہا اور کمرے کی جانب روانہ ہوا۔

صبح دم واجد صاحب کا پیغام ملا کہ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ ہونی ہے' آپ تین بجے پہنچ جانا۔ مقررہ وقت پر میں ٹی۔ وی اسٹیشن پہنچ گیا پوری کاسٹ پہلے سے موجود تھی میں نے سیریل کے بنیادی تھیم اور کرداروں کے حوالے سے بریفنگ کا آغاز کیا۔ واجد نے اس مرتبہ ڈرامے میں دو نئی اور باصلاحیت لڑکیوں کو متعارف کرایا تھا۔ میں نے واجد کو اس حوصلہ افزا اقدام پر داد دی۔ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ میری توقع کے مطابق ہوئی۔ پہلی مرتبہ میرے کرداروں کے ساتھ واجد نے انصاف کیا تھا اور بڑی پرفیکٹ کاسٹنگ کی تھی۔ اس دوران میر رحیم جان نے دو مرتبہ ٹیلی فون کیا تھا میں نے اسے کہا میری ریہرسل ہے لیکن وہ ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ چھ بجے تک فارغ ہوں گا انہوں نے بتایا کہ وہ ٹی۔ وی اسٹیشن آجائیں گے۔ ریڈنگ کے بعد ہم کاسٹ کے ساتھ کینٹین جاکر بیٹھ گئے ٹھیک وقت پر میر رحیم جان گیٹ پر پہنچ گئے میں نے انہیں فون کرکے کینٹین بلوا لیا۔ اپنے اسلحہ بردار محافظوں کے ساتھ میر صاحب کینٹین آگئے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ آج شام سے پہلے ہی خاصے موڈ میں تھے میں نے سرسری ان کا تعارف کرایا اور انہیں لے کر الگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میر صاحب کا موڈ آج خاصا بگڑا ہوا لگ رہا تھا وہ بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے ان کا جی بہلانے کی کوشش کی لیکن میر صاحب میری گفتگو پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ان کی نظریں سامنے ٹیبل پر جمی ہوئی تھیں۔ واجد کاسٹ کے ساتھ باہر جانے لگا تو میر صاحب نے بل کی ادائیگی کی خواہش کا اظہار کیا واجد نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے کہا "دینے دو واجد کوئی بات نہیں' میر صاحب غیر تو نہیں ہیں نا" تھوڑی دیر بعد ہم بھی کینٹین سے باہر نکلے۔ چند فنکار گاڑی کے انتظار میں تھے۔ میر صاحب نے فرمائش کی کہ انہیں لفٹ دیں میں نے کہا "نہیں میر صاحب ٹی۔ وی کی گاڑی ہے ان کیلئے۔" انہوں نے گاڑی کی چابیاں کارندے کی طرف پھینکتے ہوئے ٹی۔ وی اسٹیشن کی بلڈنگ پر نظر ڈالی ور کہا "حمید یار تمہارا کیا فائدہ...." میں نے حیران ہوئے بغیر مسکراتے ہوئے میر صاحب کی جانب دیکھا-----۔" دیکھو نا تم ڈرامہ رائٹر ہو تمہاری مرضی اور پسند سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی آج تو تمہارے ڈرامے کی کاسٹ میں بہت خوبصورت اور نئی لڑکیاں بھی آئی ہیں۔ ان سے ہماری دعوت کراؤ----- انکار کریں تو ڈرامے کا اسکرپٹ واپس لے لو----- آخر کو تم ڈرامے کے تخلیق کار ہو----"

شدید سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آگیا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے مزدوروں کے کتنے ہی ہاتھ نظر آرہے تھے------ وہ ہاتھ جو اپنے لئے کچھ کر نہیں سکتے وہ ہاتھ جو ہتھکڑیوں میں رہن رکھ دیئے گئے ہیں--- وہ ہاتھ جو آرائش تخلیق کرتے ہیں۔ مگر وہ دوسروں کیلئے---- میرے ہاتھ سے اسکرپٹ ایسے گرا جیسے ہتھیلی پر بچھو نے ڈنک مار دیا ہو------!!!

(براہوئی سے ترجمہ۔ مصنف)

نظم

(۱)

کلام آسان ہے منظوم کرنا
پہ مشکل ہے خدا معلوم کرنا
خرابی کے ہیں باعث در جہاں دو
یکے نفس و دگر شیطان' جانو
بنا جانے ہر اک اقدام ناواں
کہ دل ہموار بارش کا ہے خواہاں
برستے ابر سے دنیا ہے شاداں
تو میکائیل اٹھ پرواز کرنا
علاج قحط ہے تیری توجہ
برسہا برس گذرے قحط ایسا
اسی کارن کیا مالوں کا دھندا
قرابت واروں کا ہر جور دیکھا
زبان طعنہ زن اندر کنایہ
ابھی تو ابتدائے شاعری ہے
خدا کے در پہ ہوں میں نالہ فرسا
وہ ہے واقف ہمارے حال دل کا
اسی پر ہے کھلا ہر بھید اپنا

(۲)

آدمؑ کی ہم اولاد ہیں
واوا جو نیک و بد کے ہیں

اک شخص ہے قرب و جوار
رنگت سیہ ہے خونخوار
آواز ہے مثل حمار
دانت اس کے ہیں خنجر کٹار
ہے طوق لعنت اس کے ہار
سر میں پڑا مٹی کا بار
معلوم ہوا شیطاں ہے تو
غارت گر ایماں ہے تو
سوچوں میں اس کے ہے لہو
ظلم اور بدکاری ہے خو

(۳)

مشتاقِ ساز و نغمہ ہے
منہ اپنے خود شیخی کرے
ناکردہ میں شامل رہے
چوپال میں نفرت ملے
فرمان کی رہ سے پرے
کذب و تکبر میں پڑے
ہم تو کہیں بکواس ہے
تم ساری باتوں سے گئے
ملعون گھر میں ہیں پڑے
دھتکار کر باہر کیا
قسمت نہ رکھے واسطا
کتا ہے منہ پر موتتا
شرمندگی میں ہے پڑا

عزریل کے قابل نہ تھا
ہے ڈھیٹ جو زندہ رہا
وسواس ہے دل میں تیرے
مٹی کے بھانڈے توڑ کے

(۴)

اندر سے کالا دل کئے
اک فتنۂ آتش لئے
ویران قلعۂ دل کئے
برباد کتنے گھر کئے
اک دردِ بزدل چوں شے
محروم سب کی بزم سے
دامِ خرابی میں پڑے
دوزخ ہے تیرے واسطے
امت ہیں پیغمبرؐ کی ہم
ہم پر محمدؐ کا کرم
دست اپنا' دامانِ رسولؐ
ضامن ہے امت کا وہ پھول
شاعر ہے عاجز کم عیار
قرآن کلمے پر مدار

(بلوچی سے ترجمہ : غوث بخش صابر)

جوانسال بگتی

نظم

(۱)

رنگین بادشہ
تیرا ہی آسرا

ہم ہیں مدح خواں
رب ہے مہرباں

دیا ہے جسم و جاں
تیرا ہے جہاں

گم کی حق کی رہ
جاں ہے پر گناہ

خوف مرگ ہے
ہونا ہے فنا

گردش میں ہے سپہ
کاٹے فصل جاں

چھپ جائیں ہم کہاں؟
دے گا کون اماں؟

(۲)

بیکس پر سدا
نامہ ہے کھلا

میزان عدل کا
فصل بد میرا

سوجھے ہے در تیرا
تیری ہی ہے پناہ

پروردگار کا
وہ ایک لاڈلہ

نور نور ہے
شہری ہے روا

تیری صد پناہ
چابک جور کا

ایذائے الیم
اللہ العظیم

محمدؐ بے ریا
والی ہے میرا

(۳)

بندہ غرہ سر
ناداں مثل خر
بے فرماں بشر

آخر ہے جہاں
ظاہر ہیں نشاں

ترقی پہ مجاز
ننگی پر ہے ناز

کوتاہ کم لباس
چھوڑا چناس

ناداں کم شناس

چھوڑی ہے نماز
خود سر کرباز

محروم نیاز
جولاں چوں جہاز

(۴)
جیفہ در حواس
عادی چلم و ناس
بدبو کی بھڑاس

آتش اندروں
مفلس اور زبوں

شیطان کا ہدف
پیمانہ بکف
تالے توڑتا
گٹھڑ کھولتا

عمر رائیگاں
شیطاں یار جاں

کر ڈالے زیاں
رسوا در جہاں

گم ہوں رہ نشاں
کھوئے دو جہاں

(۵)
بزدل ناتواں
حیراں بے اماں

پی کر کھونہ جاں
رزق خاکیاں

غافل بن نہ اور
حاصل خاک گور

چڑنے کو ہے زور
دے ڈالیں نچوڑ

تو ہے از کیاں؟
جاتا ہے کہاں؟

منہ زوری زباں
طوطی ساں اتاں

مہلت شب کی ہے
تجھ کو غم رہے

عاجز ہو گرے
اٹھنے سے رہے

(۶)

حرکت سر کو دے
چکرا کر گرے

روئے گی فکر
بے سود و بے اثر

کام آئے نہ زر
عیبوں کا ہو گھر

چشم و گوش کر
تجھ کو کیا خبر

آواز قہر
آئے گا حشر

تپ جائے گا لباس
پھٹ جائے گا جگر

آنکھیں کھول رکھ
دوزخ میں نہ کر

دنیا تیرہ و تار
عقرب اژدھار

(۷)

ہو گا جو بے صبر
دائم ہے سقر

ہم ہیں در بیاں
سچائی ہے نشاں
روحیں ہوں جواں

چشم اشکبار
آنکھیں کھول یار

کیا تیرا مدار
آیا بہرکار

کس کے ہتھ مہار
گم گشتۂ بہار

کرتا رہ وچار
گراں بن گذار

دیدہ ہوشیار
کھیتی پر ہے ڈار

کیسا یہ قرار
سر پہ مرگ سوار

اس کا تو شکار
شیر خونخوار

مائیں زار زار
روئیں دوست یار

چلدیں لے کے پار
کھودیں ایک غار

کم ہوتا مدار
آئیں گرز مار

اللہ برد بار
محمدؐ دیں کا یار

عرض و استدعا
پردہ رکھ گذار

فردا کر بہار
رحمت کی جوار

سب کچھ ہے بسیار
کلمہ کرو کار
(بلوچی سے ترجمہ: غوث بخش صابر)

غیرت

اہلِ نظر میں یوں ہے بلوچوں کا احترام
ہے رزق کی طلب میں بھی غیرت کا التزام
رہتے ہیں ساری عمر ہر الزام سے بری
اس واسطے حیات ہے آسودگی تمام
بھائی کو زر کے واسطے کھونا نہیں شعار
یہ زہر ہی بناتا ہے وحدت کو انتشار
جاگیر، مال و زر کہ محل، سب ہوں زیرِ پا
ہر دم جو اتحاد کا مضبوط ہو حصار

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

میر گل خان نصیر

مرا قلم، مرا سخن

میرے ہاتھوں میں امانت یہ قلم
حسن اور عشق کے قصوں کا روادار نہیں
دولت و شہرت و منصب اسے درکار نہیں
میں کہ شاعر ہوں مگر میرا ہنر میرا سخن
اک نئے طرز کا، آدرش کا آئینہ ہے
میرے اشعار امانت ہیں مرے لوگوں کی
میرا ہنسنا مرا رونا ہے انہیں کی خاطر

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

میر گل خان نصیر

دیا

چراغِ صورتِ جاناں
رہے تو روشن و تاباں

ابھی تک ظلمتِ شب ہے دو طرفہ نعرہ برلب ہے
درو دیوار ہیں دشمن نشانِ رہ عیاں کب ہے

چراغِ صورتِ جاناں
رہے تو روشن و تاباں

سیاہی ہے ابھی پیچاں ہے خانہ صورتِ زنداں
سگان کوچہ غوغائی نہ بانگِ مرغ کا امکاں

چراغِ صورتِ جاناں
رہے تو روشن و تاباں

دیے جلوہ فشاں ہرسو ابھی بجھنے نہ پائے تو
کہ اب تک غم نصیبوں کی نہیں گذری شبِ ہجراں

چراغِ صورتِ جاناں
رہے تو روشن و تاباں

شبِ تاریک میں حقا سہارا نور ہے تیرا
سمٹ آئیں گے تیرے گرد ترے پروانے اور شیدا

چراغِ صورتِ جاناں
رہے تو روشن و تاباں

(بلوچی سے ترجمہ: غوث بخش صابر)

میر گل خان نصیر

تو

مرا دل مری نوجوانی ہے تو | مری زینت و زندگانی ہے تو
غموں کے غبار اور ظلمات میں | ہوں شاداں' مری شادمانی ہے تو
مری شاعری موتیوں کی لڑی | زباں تیغ' اس کی روانی ہے تو
میں تاریک راہوں میں بھٹکا ہوا | مری چاند راتوں کی رانی ہے تو
مرا عشق ہے تیرا بے خود گدا | میں ہوں شہ مرید اور حانیؔ ہے تو
وطن مجھ کو سارے جہاں سے سوا | وطن کی محبت میں ثانی ہے تو
غموں سے' مصائب سے گر چور ہوں | غموں میں مئے ارغوانی ہے تو
قوی ہے مرا دل ہر اک حال میں | مری ہمت اور پہلوانی ہے تو

میں شعر و سخن کا خدا ہوں نصیر
کہ تیغِ زباں کی روانی ہے تو

(بلوچی سے ترجمہ: غوث بخش صابر)

کشار

بہت خوش ہوں
آہا، واہ، واہ!
کہ مسکراتی نوخیز کلیوں نے
زمیں کے تنگ داماں سے
اپنا سر نکالا ہے
خدائے لم یزل ان کو بچا رکھنا
زمانے کی بلاؤں سے
یخ بستہ ہواؤں سے
انھیں افلاک کے جور و ستم سے بچا رکھنا!
آہا، واہ، واہ!
دل خوش ہے کہ اپنی کشت ویراں
سرسبز و شاداب ہو گئی ہے
لہلاتی ہے اور چمکتی ہے
کہ جیسے تاجِ سرخ سر پہ سجا رکھا ہو شفق نے
آہا! واہ، واہ!
کتنے خوش نما اور خوبصورت ہیں

کہ جیسے خالقِ ہستی نے
انہیں اپنے دستِ قدرت سے
سینچا ہو، پالا اور پوسا ہو
انگشت بھر ہو گئے ہیں
آہا! واہ، واہ!

بڑے ہو گئے ہیں نونہالانِ چمن اب تو
مجھے یقین ہے کہ یہ اک دن
صبح کے ضوفشاں اور نور برساتے ہوئے
تارے سے مل لیں گے
آہا! واہ، واہ!
مجھے صد ناز ہے اپنی شادابیِ گلستاں پر
کہ انگشت بھر اب ہو گئے ہیں
اے چشمِ بد!
نیلگوں افلاک!
تیری آنکھیں ویران ہو جائیں
ہمیشہ کے لئے بے نور ہو جائیں
جو چشمِ بد سے دیکھیں
ہمارے لہلاتے گلستاں کو
کہ ہم نے اسے اپنے خوں سے
سینچا ہے اور پالا ہے
ان نرم و نازک ننھے پودوں کو
کہ جن کی کومل شاخیں

پھولوں کے بار سے جھکتی جاتی ہیں
خدا کرے اب تو
وہ آنکھیں ابل آئیں
جو چشم بد سے دیکھیں
ہمارے لہلہاتے اور مسکراتے
اس گلستاں کو

(بلوچی سے ترجمہ: واحد بزدار)

نہادی

چلے ہیں ششدر و حیراں
نکل پڑے ہیں
چلو اب ساتھیو!
عزم سفر کرلیں
کسی نیلام گاہ کا رخ کرلیں
بیچ ڈالیں
اپنا جو سب کچھ ہے
بیچ ڈالیں
آباؤ اجداد کی میراث و دولت کو
اس سیہ بخت ویراں بے صبح دن کو
بیچ ڈالیں
اس خانماں برباد ہستی کو
ان تیرہ بخت سالوں کو
ماہ و دن کو
کہ ہمارے معصوم پھول سے بچے
منہ بھر نوالے کے لیے ترس گئے ہیں

ڈالیں
سبھی اسباب و ساماں کو
اس بے ثمر بے کیف گذراں کو
اپنی ہست و نیست کے سارے امکاں کو
اے انسانو!
انسانوں کے فرزندو!
کچھ تو قیمت دو
ایک ' دو ' دس!
کیا کوئی ہے جی دار؟
جو خریدنا چاہے
میری زندگی بھر کے اثاثے کو
جو میرا ہی مقدر ہے
نہیں...!
کوئی ایسا نہیں جی دار!
جو میری اس متاعِ بے ثمر کی
کوئی قیمت دے
سراپا کرم خوردہ متاعِ بے قدر کی
کوئی قیمت دے

(بلوچی سے ترجمہ : واحد بزدار)

ایک بند

(مزدور سے خطاب)

تیرا خون بادۂ ناب ہے
ترا گوشت مثلِ کباب ہے
جو ستم گروں کے شکم بھرے
ترا خالی پیٹ مگر کبھی
نہ بھرے، نہ ان کو دکھائی دے

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

لوری

لوری سناؤں اپنے لال کو
میری مرادوں کا نشان ہے
اس کا ہر بول میری جان ہے
شکر خدا کا ہر آن ہے
لوری سناؤں اپنے لال کو
زندگی اس کی لازوال ہو
شب کے اندھیرے میں یہ اک دیا
یہ جو ملا تو سب کچھ مل گیا
پیر پیراں کی اس پہ ہو عطا
غوث اعظمؒ کی اس کو ہو دعا
لوری سناؤں اپنے لال کو
زندگی اس کی لازوال ہو
اس کی جوانی پر جمال ہو
شیروں جیسا اس کا جلال ہو
اس کی دلیری بے مثال ہو
ہاتھ شمشیر سینہ ڈھال ہو
لوری سناؤں اپنے لال کو

(بلوچی سے ترجمہ : امداد نظامی)

اے شبِ ماہ!

شب امشب تو اے شب
زندہ و پائندہ باد اے شب
کہ تیری چاندنی
ہے خوش اطوار، خوش پوشاک
زماں و آسماں روشن
زمیں روشن جہاں روشن
ہر اک جھاڑی چمکتی ہے
ہر اک ذرہ مچلتا ہے
چمکتی ہے ندی کے سنگ کھیتی
پہن کر زر نگاریں خلعتیں صحراؤں نے
خود کو سنوارا ہے
کہ مشاطہ ہوں جیسے
سنوری ہو پری جیسے
چمن میں سامری کے

○

اے شب ماہ، امشب
بلوریں چشموں کے
بہتے ہوئے مست پانی میں ہے،
نشتر آسا روانی
گیت گاتا ہوا، گنگناتا ہوا
اک ادا سے ہے پیچاں و رقصاں
شب ماہ کی شادکامی پہ نازاں
زندہ باد اے شب
مگر میں نہ چاہوں تجھے
گر ریاکار، غدار ہے
تو نہ آئے کبھی۔ تو نہ چھائے کبھی
اس لیے کہ غلامی کی خو سے
زمیں خون اور آگ اگلتی ہے
زندگی اپنے حسن ازل سے جو محروم ہو
مجھ کو ایسی شب ماہ کی آرزو ہے، نہ ہو گی
تو نہ آئے، نہ چھائے کبھی۔ اے شب ماہ!
(نامکمل)

(بلوچی سے ترجمہ: غوث بخش صابر)

میر محمد حسین عنقا

خانہ بدوش

میں ہوں خیمے میں' رہنے والا بلوچ
اس کی چھت ہی ہے آسماں مجھ کو
نیک نظروں سے دیکھ اس کی طرف
میری دولت ہے' سلطنت یہ ہے
میں ہوں گوہر تو یہ ہے میرا صدف

چاند تارے ہیں شب چراغ مرے
صاف' بے عیب پاک ان کی ضیا
کس قدر خوش ہوں کیا خبر تم کو
میرے مسکن میں میرا دل ہے دیا

آسماں ہے پہاڑ سے اونچا
میری حد نگاہ تک پھیلا
تم مگر غافلو یہ مت بھولو
آدمی آسماں سے ہے بالا

سنگ تکیہ ہے' ریت ہے بستر
میرا گھر غار' شہر ہے کہسار
یہ گپھائیں ہیں مورچے میرے
اور چرواہا دشت کا سنگھار

(بلوچی سے ترجمہ: ادارہ

محمد حسین عنقا

وطن کی خاک

وطن کی خاک گل یاسمین سے زیادہ معطر ہوتی ہے
حقیقت میں وطن کی پاک زمین کا پانی آب حیات سے بڑھ کر ہے
آنکھوں کے لیے اس کی صبح' حاکم کی الماسیں شال کی طرح ہے
دیدۂ بینا کے لیے اس کی شام محبوبہ گراں ناز کے خوبصورت عارض کا خال ہے
زمین پر یہ رحمت اسلام کی رحمت بن کر چھا جاتی ہے

اے میرے وطن تو تمام تر آلائشوں سے پاک ہے
دوزخ کی آگ سے دور تیری خاک بہشت کی بو لئے ہوئے ہے
عصر حاضر سے کہو ہم سے نجات کی راہ نمائی حاصل کرے

دشمن کے لیے تیرے پاس بپھرے ہوئے دریا ہیں
تیرے بلند و بالا' ناقابل تسخیر پہاڑ دشمن کی راہ روکے ہوئے ہیں
دل کو ہرگز بھی غم نہیں کہ تیرا حافظ خدا ہے
تو نے میرے دل کو ماں کے آغوش جیسا سکون دیا ہے
اے وطن میں تیری خدمت ماں کے فرماں بردار بیٹے کی طرح کروں گا
کیونکہ جنت تو ماں کے قدموں میں ہے
حقیقت میں وطن کی پاک زمین کا پانی آب حیات سے بڑھ کر ہے

(بلوچی سے ترجمہ: غوث بخش صابر)

باتیں کروں

دل سے میں باتیں کروں، باتیں کروں، باتیں کروں
دل کو پھر بوجھل کروں پھر شدتِ غم میں رہوں
اس کی بزمِ نور و نکہت کی صبا خوشبو جو لائے
راہ میں آنکھیں بچھا دوں نذرِ جان و دل کروں
اس کے بخشے رنج و غم رنجیدہ مجھ سے ہوں تو کیا
میں انھیں دل میں سجا کر محوِ آرائش رہوں
اس کی چاہت گر مٹے جل جائے یہ گلباغِ دل
اس کی خاکستر سے میں تازہ گلستاں ڈھال لوں
شدتِ غم کے یہ طوفان، وصلِ ہانل، کی امید
یہ محافظ ہیں مرے، ان کی پذیرائی کروں

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

ہانل: ظہور شاہ ہاشمی کی تصوراتی محبوب۔ اختر شیرانی کی سلمٰی کی طرح

قاضی عبدالرحیم صابر

امید

عزم کو اپنے پختہ رکھنا جیسے ایک چٹان
اہل توکل کو کرتا ہے فاتح رب رحمان

روز و شب کی محنت سے اک باغ کا اچھا مالی
گلشن کو پروان چڑھائے اور کرے رکھوالی

بنجر میداں، اجڑی کھیتی تم کو لاکھ ڈرائے
ہاتھوں سے امید کا دامن پھر بھی چھوٹ نہ پائے

برسیں گی گھنگھور گھٹائیں بن کر اک طوفان ء
فصل ہنسے گی، سونے سے بھر جائیں گے کھلیان

بند بنا کر تم سیلاب کو اک تالاب بناؤ
اس سے کرو سیراب زمیں کو کھیت اور باغ اگاؤ

ایک کرے جب خون پسینہ محنت کش دہقان
اس کی شان بڑھا دیتا ہے اللہ کا فیضان

آؤ مل کر جان لڑائیں آس کے دیئے جلائیں
خوشحالی کے دم سے ہوں گی اپنی دور بلائیں

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

سید خیر محمد عارف

قدر مشترک

ہاں گزر ہی جائے گی
زیست میری جو بھی ہو
ہاں گذر ہی جائے گی
زیست تیری جو بھی ہو
تو کہ کثرتِ زر سے
مردِ وقت کہلائے
اور میں کہ روٹی کا
ہوں سدا سے ہی محتاج
تو عجب اسی میں گم
کھائے جانے کیا اک چیز
اور میں یہ کہتا ہوں
جانے کھانے کو کیا ہو
قدرِ مشترک لیکن
پھر بھی ہم میں' اک یہ ہے
دونوں ہی کو مرنا ہے
خالی ہاتھ جانا ہے

(پشتو سے ترجمہ: علی دیپک قزلباش)

سید خیر محمد عارف

مجبوری

میں وفا کا بندہ ہوں
تم جفا کے بندے ہو
تم کہ جو بھی کرتے ہو
اس پر فخر کرتے ہو
میں کہ جو بھی کرتا ہوں
اس کو کم سمجھتا ہوں
فرق اک یہ البتہ
پھر بھی ہم میں ہے باقی
تم اجاڑتے ہو گھر
مجھ سے ہیں بنے کچھ دل
وہ تمہاری مجبوری
یہ ہے میری مجبوری

(پشتو سے ترجمہ: علی دیپک قزلباش)

محمد عیسیٰ قومی

پاکستان کے لیے دعا

اللہ ہماری دعا یہی ہے کہ پاکستان مستحکم ہو
ہم تمہارے حضور یہی امید کرتے ہیں کہ پاکستان مضبوط ہو

محمد صلعم ہم مسلمان تیرے ماننے والے ہیں تو ہمارا ہے
ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں کہ ہمارا پاکستان مضبوط ہو

اگر ہم غریب اور بھٹکے ہوئے ہیں لیکن تمہارے نام سے
عزت دار ہیں۔ تم ہماری شفاعت کرو کہ ہمارا پاکستان مستحکم ہو

اگرچہ ہم رسماً" مسلمان ہیں لیکن تیرے نام کے طفیل عزت دار ہیں
فجر کی دعا ہماری یہی ہے کہ ہمارا پاکستان مستحکم ہو

قومی کس لیے فریاد کرتے ہو جبکہ محمد صلعم تمہارا مددگار ہے
تمہاری فریاد کبھی خالی نہیں ہو گی کہ ہمارا پاکستان مستحکم ہو

(بلوچی سے ترجمہ: مصنف)

مہر عیسیٰ قوی

اے قائداعظم

ہم مسلمانوں کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ تمہارے
رخصت ہونے کے بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گا

ہمارے رہنماؤں نے آپس کے مکرو فریب سے
مشرقی حصہ کو اپنے ہاتھوں گنوا دیا

ہمارے خیالوں میں تم حیات ہو

تمہارے یقین محکم اور عمل نے ہمیں راستہ دکھایا
تمہارے قول نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں
تمہارے تمام ساتھی گذر گئے
ہمارے خیالوں میں تم حیات ہو
قائداعظمؒ تم ہمیشہ زندہ رہو گے

تم اکیلے نے دشمنوں کو ہستی سے مٹا دیا
خدائے لایزال کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں

تم جیسی قابلیت کسی اور میں نہیں
ہمارے خیالوں میں تم حیات ہو
قائداعظم تم ہمیشہ زندہ رہو گے

تم ہمیشہ غیرت مند اور عزت مند رہے ہو
کسی ڈر اور خوف کے بغیر اور جرات مندی کے ساتھ قوم کی رہنمائی کی ہے

تمہاری وجہ سے کوئی کسی کا غلام نہیں
ہمارے خیالوں میں تم حیات ہو
قائداعظم تم ہمیشہ زندہ رہو گے

تمہاری کوششوں سے پاکستان ملا جس سے ہم خوش ہیں
ہم اس کے بلبل ہیں اور وہ ہمارا پھول ہے

دیکھو دشمنوں کے منہ ہمیشہ کڑوے رہیں
ہمارے خیالوں میں تم حیات ہو
قائداعظم تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔

(بلوچی سے ترجمہ : مصنف)

جان کنی

عام نزع میں پتھرائی ہوئی
ساکت وصامت و خاموش نگاہیں بھی زباں رکھتی ہیں
ہے کوئی اہل بصیرت جو سمجھ لے اس کو؟
اس کو سننے کے لیے
اس کو سمجھنے کے لیے
ایک ملکوتی سماعت کی صفت ہے درکار

اس مرے عہد میں ہستی کی کشاکش کا یہ آشوب عظیم
آنے والی کئی نسلوں کے لیے
جاں کنی کا ہے نشاں
آنکھیں موجود مگر سب بے نور
کان احساس سماعت سے تہی
سانسیں چلتی ہیں
مگر روح کی حدت سے تہی

(نامکمل)

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

غزل

بدلہ الفت کا یہ دیا تو نے
نذرِ آتش مجھے کیا تو نے

تجھ سے مانگی تھی زندگی ہم نے
اجر اس کا اجل دیا تو نے

مجھ کو اندوہ' دائمی افسوس
اور رقیبوں کو خوش کیا تو نے

چاک دامن جنوں میں کم تو نہ تھا
چاک کچھ اور کر دیا تو نے

اب تو ساحر کے ہے گلہ لب پر
پیار جس کو تھا کل دیا تو نے

(بلوچی سے ترجمہ : غوث بخش صابر)

غزل

وہ ماہ وش جو کبھی بن سنور کے آ جائے
اسیرِ درد مرا دل بھی کچھ سکوں پائے

ہے اسکی چاہ جو دل میں تو کیا خطر ہے مجھے
غمِ حیات ستم جو بھی چاہے فرمائے

میں ہوش میں جو نہیں ہوں تو کیا خطا ہے مری
مری بساط سے بڑھ کر ستم ہی کیوں ڈھائے

ہنسی اڑاتے تو ہو میرے حالِ زار کی تم
کرو گے کیا جو یہی غم تمہیں بھی مل جائے

اسے بھلا کے کٹے کیسے زندگی ساحرؔ
اسے بھلانا جو چاہوں تو موت آ جائے

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

اکبر بارکزئی

کھو جانے والے کی تلاش

مری دولت مری ثروت مرا مال
مرا اک جانور گم ہو گیا ہے
ہے اس کے ساتھ اک ننھا سا بچہ
بڑی ہی دلنشیں جس کی صدا ہے

وہی خوشحال جس کے پاس ہے مال
مرا تو مال ہی گم ہو گیا ہے

مویشی، بھیڑ، بکری اور گائیں
ہیں رونق دشت کی ان کی صدائیں
جو میرے مال کی مجھ کو خبر دے
میں دوں انعام، لوں اس کی بلائیں

درندہ کوئی اس کو نہ لے اڑا ہے
یہ اندیشہ غمِ جاں بن گیا ہے

نجانے کون سے رخ چل دیا ہے
ہجومِ زندگی میں کھو گیا ہے
کہاں ڈھونڈوں کدھر جاؤں بتاؤ
خزینہ وہ تو اک صحرائی کا ہے

مرے دامن میں کیا باقی بچا ہے
مرا تو مال ہی گم ہو گیا ہے

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

اکبر بار

رو چکا کئے کشت کنت ــــــــــــ

رات تاریکیوں کی بھی بزم تو
شپروں نے کہا
تاجور زندگی کا وہ سورج جو تھا
مر گیا
ہم نے دفنا دیا
اور ہنستے رہے
رات کے دشت میں کھو کے رہ جائیں گے
چاند تارے زمین آسماں'
کہکشاں
ڈوب جائیں گے سب
تیرگی میں سبھی' ہمتوں اور جذبوں پہ موت آئے گی
ماند پڑ جائیں گے
پیار کے ولولے
مہر و اخلاص سولی پہ گڑ جائیں گے
شہریارِ جہاں روشنی کا خدا
فیبس زرفشاں

اور آرو ینس
جان افرونائی
گر نہ ہوں تو بھی
لوٹ کر پھر نہ آئے بہار وطن
روٹھ جائے سدا کے لیے
شاعری
ساز دم توڑ دیں
مار ڈالے جو سورج کو اور آگہی کو مقید کرے
کوئی ایسا نہیں
جراتوں کا امیں
تیغ زن سورما
رات کے دشت میں محو رقصاں رہے
اور ہنستے رہے
بھولے شپر مگر
جانتے تک نہ تھے
رات ڈھل جائے گی'
مست و جلوہ فشاں دن نکل آئے گا
رات کے باسیو
فینس وقت ہوں
سچ گویا ہوں میں
ضوفشاں زندگی ہوں امر ہوں کہ میں
جب بھی چھانے لگی رات کی تیرگی
مسکراتے ہوئے تا ابد میں تو ہوتا رہوں گا طلوع

مار ڈالے جو سورج کو اور آگہی کو مقید کرے
کوئی ایسا نہیں
جراتوں کا امیں
تیغ زن سورما

(بلوچی سے ترجمہ : اللہ بشک بزدار)

مبارک قاضی

اکیلاپن

میں کارزار حیات کی راہوں پر جب خود اپنی ہی تلاش میں نکلا' تو وہاں سے گذرنے والے قافلوں کے نشانات میں ایک منفرد نقش پا نظر آیا۔ جو واضح بھی تھا اور غیرواضح بھی۔ یہیں پر میری نظر زندگی کے ویراں راہگذاروں میں ایک بے برگ و ثمر درخت پر پڑی' جو میری تنہائی کی طرح تھا۔ تب میری تنہائی مجھ سے پوچھنے لگی "کہ سچائی کیسے بدی کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے' اور موت کیوں زندگی کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

(بلوچی سے ترجمہ : مصنف)

وطن

میں قوموں کی تواریخ کی امین زریں کتابوں میں اپنی لہو سے تحریر کروں گا
کہ میرے بعد،
وطن کے سرفروش نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے،
میرے اشعار دھرتی کے ہر در و دیوار اور تمام پتھروں پر کندہ کئے جائیں،
کہ انھیں اپنی مادر وطن کی آزادی کی اہمیت کا ادراک ہو۔
وطن جو صدیوں سے بنی نوع انسان کی آزادی کی علامت ہے
وطن جو ایمان بھی ہے اور مذہب بھی۔
وطن جو قوموں کی ناموس ہے۔
وطن قرآن، انجیل، توریت، زبور، وید اور گیتا جیسا تقدس رکھتا ہے۔
وطن جو کائنات کا حسن ہے۔
وطن جو صبح کی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔
وطن جو قوس قزح کے تمام رنگوں کا مظہر ہے۔
جب وطن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔
کیونکہ اسی کی بدولت ہماری شناخت قائم ہے۔

(بلوچی سے ترجمہ : مصنف)

بشیر بیدار

اے مری جاں، میری دوست!

اے مری جاں، میری دوست
مجھ سے رنجیدہ ہے کیوں
اتنی ، سنجیدہ ہے کیوں
صاف کر دل کی فضا
ایسی خاموشی بھی کیا
اے پری قہری نہ بن
لطف کر زہری نہ بن
اے مری جاں، میری دوست
یاد کرتا ہوں تجھے
پھر بھی برہم ہے تو کیوں
آزما جور و جفا
ان کو میں سہتا رہوں
اے مری جاں، میری دوست
تو محبت ہے مری
تو ہی چاہت ہے مری
زندگی بھی وار دوں
ان دعاؤں میں رہوں
تاقیامت تو جئے
مثلِ گل تازہ رہے
اے مری جاں، میری دوست

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

وطن کا نغمہ

اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

یہ تیری زمیں ہے خلد نشاں
ہے آنکھ کی ٹھنڈک راحتِ جاں
اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

رحمت کی گھٹائیں یوں چھائیں
بدخواہ ترے سب مٹ جائیں
اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

اے ارضِ تمنا ارض یقیں
ترے کوچے کھیت اور باغ حسیں
اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

ہر صبح دھمال ہو کرنوں کا
ہر روز ہو جشن بہاروں کا

اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

ترے جنگل بوٹے کوہ و دمن
تری گلیاں کوچے رشکِ چمن

اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

ترے شہروں قصبوں گاؤں میں
سب خوش ہیں امن کی چھاؤں میں

اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

بے دام ترے ہم خادم ہیں
تری خدمت پر ہم قائم ہیں

اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

تیار کھڑے ہیں فصیلوں پر
سینوں پہ سجائے تیغ و تبر

اے پاک وطن اے پاک وطن
سرسبز حسیں شاداب چمن

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

دل سمندر نگر

جگ ہے تاریک شب
دل سمندر نگر
ان کو پاٹے کوئی
ان کو بوجھے کوئی
جگ ہے تاریک شب
آ تجھے تھام لوں
کھو نہ جائے کہیں؟
اس نگر ہر نفس ہے اسیرِ ہوس
یاں پہ ہر خوشنما ساز محتاجِ زر
یاں پہ خیرات بھی ہے فریبِ بشر
یاں پہ جی جان و الفت ہے دیوانگی
یاں سے ان منزلوں کو کوئی رہ نہ جائے
واں پہ اپنی تمنا کی شمعیں جلیں
جگ ہے تاریک شب
آ تجھے تھام لوں
کھو نہ جائے کہیں؟

دل سمندر مگر
جاں! مجھے تھام لو
اس کی گہرائی میں
دیکھو ڈوبوں گا میں
ہاں، یہ بادِصبا
ہے کبھی جھولنا
اور کبھی لوریاں
جیسے ساون کی ہوں خوشنما بدلیاں
اور قامت ہے سازینۂ زندگی
ہے یہ سب کچھ مگر
دل کبھی بیکراں بحر، کوہِ گراں
اور کبھی اس میں پیچ و خم "زامراں" ☆
جس پہ یخ بستہ طوفانی اولے پڑیں
ان ہواؤں نے ہم کو بہت دکھ دیا
ہم کو جھلسا دیا، ہم کو بے خود کیا
دل سمندر مگر
جانے کس طرز سے تم نے پالا اسے
جانے کس ڈھنگ سے تم نے بوجھا اسے

(بلوچی سے ترجمہ: صبا دشتیاری)

☆ "زامر" ایک سدابہار درخت ہے جو دشوارگزار گھاٹیوں میں اُگتا ہے۔ مترجم

درد کا شجر

مرے ہمدم مرے ساتھی
تو کیا جانے
تیرے یاروں کا دکھ کیا ہے
الم کیا ہے
تیرے بد حال مستانوں کا
غم کیا ہے
مرے بیلی مرے ساتھی
تو کیا جانے
تری چاہت میں
تیرے شوریدہ سر' دل فگاروں نے
لٹا کر زندگی اپنی امر کر دی
مرادیں' حسرتیں
دل کی امنگیں
تیری چوکھٹ کی نذر کر دیں
مرے ساتھی مرے بیلی
تو کیا جانے
تیرے غم میں

شکستہ دل، غم کے ماروں نے
خزاں کے زرد،
افسردہ موسم میں
اپنی اشکوں میں برسات کا رنگ بھر دیا
مرے بیلی، مرے ہمدم
کہیں ایسا نہ ہو
کہ مرادوں کا یہ نرم و نازک
پھول مرجھائے
کہ جسے تیرے دیوانہ دل یاروں نے
اپنی لاکھوں حسرتوں کا خوں دے کر
بڑے ارمانوں سے سینچا ہے
مرے ہمدم مرے ساتھی
تیرے نامرادوں کو یقیں ہے
ان کا ایماں ہے
کہ ان کی محبت کا شجر اک دن
اک تناور درخت بن کر
پھلے گا اور پھولے گا
زمیں سے آسماں کی رفعتوں کو چھو لے گا
(کہ) جہاں پر تیرے یاروں کو
نہ کوئی دکھ ہو گا
نہ غم ہو گا
مرے بیلی، مرے ہمدم!

(بلوچی سے ترجمہ: مصنف)

منظور بلوچ

پرائی زمین

رحمتوں کے ابر ہیں ہر سمت باراں کھیت پر
ہو گئے ہیں کس قدر موتی درخشاں کھیت پر

خوشے خوشے پر ہیں کرنیں ضوفشاں اے دوستو
آجکل برپا ہے اک جشنِ چراغاں کھیت پر

جگمگاتی ہیں حسیں پگڈنڈیاں کس شان سے
آ رہی ہے دیکھئے وہ بنتِ دہقاں کھیت پر

نیلے پیلے آنچلوں کی لہر تاحد نظر
رنگ برسانے لگی ہیں خوب پریاں کھیت پر

بکھری مسکانوں کی کلیاں ہر طرف محوِ خرام
اور ہوائے عطر آگیں لالہ افشاں کھیت پر

ناچتے پھرتے ہیں گاؤں کے سجیلے نوجوان
چار سو خوشیوں کا اک سیلاب رقصاں کھیت پر

فصل کی بلقیس اب تو جلوہ گر ہونے کو ہے
مسند آرا ہے کساں بن کے سلیماں کھیت پر

آ رہے ہیں کچھ بگولے اس طرف اے ہم نشیں
دفعتاً" اٹھا ہے اک بے درد طوفاں کھیت پر

فصل ساری لے گیا ہے زور سے جاگیردار
اور رونے کو ہیں باقی چشمِ دہقاں کھیت پر

ہو گئیں معدوم ساری رونقیں اک آن میں
چھا گیا ہے پھر وہی رنگِ بیاباں کھیت پر

مائیں، بہنیں دیکھتی ہیں حسرتوں سے کھیت کو
غم سے بیچارہ کساں ہے، سینہ بریاں کھیت پر

پھر انہیں کھیتوں پہ جوبن آئے گا لیکن غضب
پھر گرے گی ظلم کی یہ برقِ سوزاں کھیت پر

ڈھونڈتے پھرتے ہیں بے کس حاکمانِ وقت کو
اک نگاہ لطف ڈالیں آ کے ویراں کھیت پر

جب تلک بدلے نہ آئینِ زمیں منظور تو
اس طرح ماتم کریں گے روز دہقاں کھیت پر

(بلوچی سے ترجمہ: مصنف)

ممتاز یوسف

آرزو

میں اپنے عہد کی
جھوٹی ہنسی کو اور
جھوٹے بین کو دیکھوں
تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ
گویا میری خواہش ہو
شہید شہرلاوارث
کے دل کی آرزو جیسی
جو پیوستہ نہ ہو یادوں کے دامن سے
نہ منزل زیست کی اس کا مقدر ہو

(بلوچی سے ترجمہ: صباد شتیاری)

ممتاز یوسف

رات مہرباں! آ جا

منتظر ہوں میں تیرا
دلربا سندیسہ تو
زندگی کنول دل کی
بن تیرے کھل کے مرجھائی
آ کہ تیری راہوں کو
خونِ دل سے اجیالوں
مہ وشوں، بہشتوں کی
کچھ ہوس نہیں مجھ کو
بس تمہاری یادوں سے
دل مرا بہلتا ہے
میری دید سے ہٹ کر
تیری زلف کے بادل
مست نین کے آنچل
خستہ تن جفاکش کو
راحتیں کبھی بخشیں
رات مہرباں! آ جا

تجھ بنا تو دہقاں کا
حق بھی چھن چکا ہے دیکھ!
نیند اس کی آنکھوں کی
لوٹ لی ہے ظالم نے
زندگی کی خوشیاں بھی
اس سے چھن گئی ہیں دیکھ!
رات مہرباں! آ جا
نازنین حسینوں کا
تار تار پیراہن
حسرتوں بھری آنکھیں
بوند بوند برکھائیں
بن سنور کے رہنا کیا؟
مانگ ان کی ویراں ہے
آ کہ نوجوانوں کی
بین کر رہی ہیں ماں
بے ردا بہن کے غم میں
جلتے ہی رہے بھائی
تجھ بنا زمانے کی
غم زدہ ہوائیں ہیں
آ کہ آدمیت کو
بے رحم زمانے کے
چلچلاتے سورج کی
دھوپ نے جلایا ہے

رات مہرباں! آ جا
آ کہ پھول کھل جائیں
دہر کے تعفن میں
خوشبوئیں بکھر جائیں
دن کی یہ تپش آخر
راحتوں میں ڈھل جائے
رات مہرباں! آ جا
تجھ بنا ہے دل بے کل
نیند دور آنکھوں سے
رات مہرباں! آ جا
تجھ بنا تو جیون یہ
دشت غم ہے' ویراں ہے
جب تلک یہ دنیا ہے
یا دہے امر' تیری
یاد ہے امر' تیری

(بلوچی سے ترجمہ : صبا دشتیاری)

حیات شوکت

اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں

میں یہاں کسی پر فخر نہیں کرتا
کہ دوست نما دشمنوں کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں
اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں
میری زندگی ایک مدت سے غموں سے دوچار ہے
خوشی کہتی ہے کہ مجھے تم سے کوئی سروکار ہی نہیں
اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں

اب تک قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے
کہ میرے لیے خوشیاں لے آئے
اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں

وفور غم میں میرا دل ڈوبا جاتا ہے
دل سے تنگ آکر اب میں گریہ و زاری کر رہا ہوں
اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں

زندہ ہوں، نیست و نابود ہو کر بھی زندہ ہوں
کاش اس حالت میں ایک پل بھی زندہ نہ رہوں
اپنوں میں غیر ہوا ہوں میں

(بلوچی سے ترجمہ: مصنف)

میر عبدالرحمٰن کرد

وطن

وطن سب سے زیبا وطن جاں سے پیارا
میرے وطن کی مٹی بھی لاثانی
پاک وطن کے دشت و دیار
پر بہار کہساروں، گل پوش وادیوں پر نظر ڈال

بلند پہاڑیوں، بہتی ندیوں
شفاف اور بلوریں پانی اور صحراؤں کی پہنائیوں کا نظارہ کر
پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے بغل گیر
ابھرتی اور چڑھتی مست گھٹاؤں کو دیکھ
ہواؤں میں پھیلی ہوئی پھولوں کی مہک
اور بادلوں کے گریز پا سائے
خیبر کی بلند اور پیچ در پیچ راہیں
بولان کی چوٹیوں پر برف کی سفید دستار
راوی، چناب اور مہراں
پاک سرزمین سرسبز و بہاراں
لالہ و گل کی شاداب دھرتی
میرے وطن کے نشیب و فراز
پھیلے ہوئے دھنک رنگ گلزار
ایک رنگ برنگ گلدستے کی مانند

(براہوی سے ترجمہ: نادر قمبرانی)

نادر قمبرانی

گل زمین

میرا وطن یہ گل زمیں
اس کی فضائیں عنبریں
اور ہیں چٹانیں مرمریں
اس میں ہے دنیا اور دیں
یہ ننگ و عزت کی امین

ہے جاں فزا اپنی زمیں
جھرنے ہیں شفاف و حسیں
دریا ہیں اس کے انگبیں
ہیں سنگ خارا بھی مہیں
اور کوہ و صحرا دل نشیں

موتی لٹاتی ہے گھٹا
عنبر فشاں باد صبا
کہسار پر پھیلی ہوئی
ہے لالہ و گل کی ردا
مہکی ہوئی ہر سو ہوا

میرا وطن میرا دیار
سارے جہاں میں نامدار
رکھے تجھے پروردگار
ہر دم رہے تجھ پر بہار
شالا رہے تو لالہ زار

(براہوی سے ترجمہ: مصنف)

پیر محمد زہرانی

قومی نغمہ

لیلاڈو لاڈو ☆☆☆☆ لیلاڈو لاڈو

ہر اونچی چوٹی
دولت ہے میری
ہر خود رو بوٹی
دردوں کا درماں
لیلاڈو لاڈو

ہر صبح گونجیں،
بلبل کی تانیں
ان کی صدائیں
راحت کا ساماں
لیلاڈو لاڈو

پھیلے اجالے
لائے گڈریے
ہیڑوں کے گلے
دولت فراواں
لیلاڈو لاڈو

ہر دن مسرت

ہر رات راحت

دکھ بھی نعمت

یہ دل ہے شاداں

لیلاڈو لاڈو

وہ آئیں کونجیں

پیاری اڑانیں

سب مل کے بولیں

ہے راحتِ جاں

لیلاڈو لاڈو

صد رنگ غنچے

مہکیں شگوفے

دھوئیں دلوں سے

ہر رنج و حرماں

لیلاڈو لاڈو

لیلاڈو لاڈو

(بلوچی سے ترجمہ: امداد نظامی)

پیر محمد زبیرانی

اب جاگ اٹھے ہیں ہم

اب جاگ اٹھے ہیں ہم
آزاد ہوئے ہیں ہم
ساون کی گھٹا بن کر
برسیں گے وطن پہ ہم
ہر کوہ و دمن پہ ہم
ہر دشت و چمن پہ ہم
سیراب کریں گے ہم
شاداب کریں گے ہم
کوہ و چمنستاں کو
اس اپنے گلستاں کو
خیبر ہو کہ ہو بولان
پنجاب ہو یا مہران
اب شاد وطن ہو گا
آباد چمن ہو گا!
اب جاگ اٹھے ہیں ہم
آزاد ہوئے ہیں ہم

(براہوی سے ترجمہ: نادر قمبرانی)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
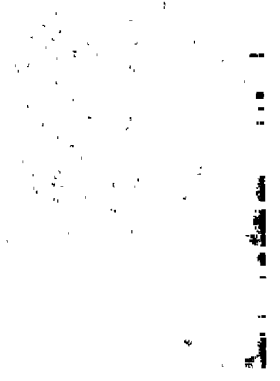
ممتاز مفتی: تعارف

نام	:	مفتی ممتاز حسین
قلمی نام	:	ممتاز مفتی
پیدائش	:	۱۱ ستمبر ۱۹۰۵ء بہ مقام بٹالہ (ضلع گورداسپور) پنجاب۔ (۱)
تعلیم	:	بی۔ اے۔ اسلامیہ کالج، لاہور: ۱۹۲۹ء
		ایس۔ اے۔ وی۔ سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج، لاہور: ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء
		ڈپلوما شارٹ ہینڈ / ٹائپ، لاہور: ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء

مختصر حالات زندگی:

مفتی محمد حسین کے ہاں پیدا ہوئے جو محکمہ تعلیم پنجاب سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم بٹالہ، امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں پائی۔ میٹرک ۱۹۲۱ء میں ڈیرہ غازی خان سے اور ایف۔ اے ۱۹۲۷ء میں ہندو سبھا کالج امرتسر سے کیا۔ اسلامیہ کالج، لاہور سے ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب کے سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر خانیوال، دھرم سالہ، گوجرہ، چک جھمرہ، جام پور، ساہیوال، باغبان پورہ، قصور، شیخوپورہ، سانگلہ ہل اور گورداسپور کے اسکولوں میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء پڑھاتے رہے۔ لاہور میں طالب العلمی کے زمانے میں سید فیاض محمود اور مجید ملک کے ساتھ دوستی رہی جس نے ادبی ذوق کو پیدا کیا۔ ۱۹۳۴ء میں ن۔ م راشد سے ملاقات میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ پہلے دو مضامین گوجرہ ہائی سکول کے جریدے اور رسالہ "نخلستان" لاہور میں شائع ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں بطور سٹاف آرٹسٹ/ سکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں اوائل ۱۹۴۷ء میں اداکار کمار اور بیگم کمار، اداکارہ پرمیلا (۲) کی فرمائش پر "سلور فلمز" مین روڈ، دادر بمبئی سے منسلک ہو گئے۔ کرشن چندر اور میراجی کے ساتھ قیام رہا اور سلور فلمز کے لیے فلم "رضیہ سلطانہ" کی کہانی لکھی، سکرین پلے اعظم مرزا نے تیار کیا تھا۔ یہ فلم فسادات کی نذر ہو گئی اور ممتاز مفتی ۱۹۴۷ء میں واپس لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء میں بطور سب ایڈیٹر ہفتہ وار "استقلال" لاہور نکالا۔ ۱۹۴۹ء میں پی۔ آر۔ سی پاکستان ایئر فورس میں سائیکالوجسٹ ہو گئے۔ لیکن یہ محکمہ ۱۹۵۰ء میں ٹوٹ گیا۔ اسی سال بطور سٹاف آرٹسٹ/ سکرپٹ رائٹر آزاد کشمیر ریڈیو، تراڑ کھل کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں ۱۹۵۱ء تک رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۷ء اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر، کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹریٹ، راولپنڈی رہے جہاں سے ۱۹۵۷ء میں تبدیل کر کے بطور فلم آفیسر D.A.F.P کراچی بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء ویلج ایڈ ڈائریکٹریٹ کراچی میں رہے۔ ۱۹۶۰ء میں قدرت اللہ شہاب (سکریٹری برائے اطلاعات) کے او۔ ایس۔

ڈی کے طور پر ایوان صدر راول پنڈی آ گئے جہاں ۱۹۴۳ء تک رہے۔ اب ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر وزارت اطلاعات، راول پنڈی کر دیا گیا جہاں ۱۹۶۵ء تک کام کیا۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء تک او۔ ایس۔ ڈی، وزارت اطلاعات، راولپنڈی رہے ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔ آخری زمانے میں وزارت اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ سے متعلق تھے۔ آپ کے اپنے بیان کے مطابق ابتدا میں دوستو فسکی، سگمنڈ فرائڈ، نطشے، (۳) برٹرنڈ رسل، ڈاکٹر سٹیکل اور ڈاکٹر یونگ نے متاثر کیا۔ (۴)

اولین مطبوعہ افسانہ:

"جھکی جھکی آنکھیں" مطبوعہ: "ادبی دنیا" لاہور ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "ان کہی" (سترہ افسانے) مکتبہ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۳ء

۱۔ آپا ۲۔ بیگانگی ۳۔ جھکی جھکی آنکھیں (اولین افسانہ مطبوعہ: ۱۹۳۶ء) ۴۔ آپ بیتی ۵۔ اندھیرا ۶۔ خلط ملط ۷۔ یہ دیوی ۸۔ نفرت ۹۔ محلّہ ۱۰۔ غسل آفتابی ۱۱۔ کرن محل کا بھوت ۱۲۔ مہندی والا ہاتھ ۱۳۔ اندھا ۱۴۔ ماتھے کا تل ۱۵۔ مورا ۱۶۔ انجام ۱۷۔ سیانی۔

مکتبہ اردو، لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۹، اپریل ۱۹۴۳ء کو طے پایا۔

۲۔ "گھما گھمی" (پندرہ افسانے) سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۔ بد معاش ۲۔ میاں کی مرضی ۳۔ وہ کمرہ ۴۔ حد ہو گئی ۵۔ جب اور اب ۶۔ چڑ ۷۔ دام خیال ۸۔ زندگی ۹۔ شرابی کا راز ۱۰۔ اس کوچے میں ۱۱۔ خواب ۱۲۔ الصدف ۱۳۔ ڈاکٹر کا استعمال ۱۴۔ وہ انجم ۱۵۔ کالے سلیپر

۳۔ "چپ" (پندرہ افسانے) مکتبہ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۷ء

۱۔ نیلی ۲۔ چپ ۳۔ پل ۴۔ احسان علی ۵۔ شائستہ ۶۔ باجی ۷۔ دوراہا ۸۔ پریم نگر ۹۔ تین خدا ۱۰۔ پاگل ۱۱۔ دروازہ ۱۲۔ گہرائیاں ۱۳۔ سارا ۱۴۔ لیڈی ڈاکٹر ۱۵۔ پیارا پالتو

مکتبہ اردو، لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۵، جنوری ۱۹۴۷ء کو طے پایا۔ اس کتاب کا دیباچہ فکر تونسوی نے لکھا ہے جبکہ مفتی کا خاکہ بشیر رومانی احمد بشیر کا تحریر کردہ ہے۔

۴۔ "اسمارائیں" (سترہ افسانے) مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول: ۱۹۵۳ء

۱۔ سمیع واسمارہ ۲۔ راں ڑیاں ۳۔ ہائے رے یہ نوجوان ۴۔ جوار بھاٹا ۵۔ اوئی اللہ ۶۔ احمق ۷۔ موقعہ ۸۔ وہ ہاتھ ۹۔ سوپور کی کھڑکی ۱۰۔ لکھ پتی ۱۱۔ ماں ۱۲۔ مسز کلیے کا خاوند ۱۳۔ خدا بخش ۱۴۔ گھور اندھیرا ۱۵۔ ریت کی لہریں ۱۶۔ آپ بیتی ۱۷۔ گوبر کے ڈھیر۔

مکتبہ جدید، لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۲، جنوری ۱۹۵۳ء کو طے پایا۔

۵۔ "نظام سقہ" (ڈراما) مکتبہ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۵۳ء

۶۔ "علی پور کا ایلی" (سوانحی ناول) داستان گو، لاہور، طبع اول: ۱۹۶۱ء

ایک زمانے میں یہ اردو کا سب سے ضخیم ناول شمار ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں حیات اللہ انصاری نے "لہو کے پھول" (پانچ جلدیں) لکھ کر مفتی کا یہ ریکارڈ توڑ دیا اور اب اوپندر ناتھ اشک کا "گرتی دیواریں" اس سے بھی ضخیم ناول آیا چاہتا ہے۔ مفتی صاحب کے اپنے بیان کے مطابق اس ناول کے مقامات کو "ڈی کوڈ" کریں تو خان پور (ملتان)، جاوا (گوجرہ) دیپال پور (خانیوال) اور بام آباد (ڈیرہ غازی خان) ٹھہرتے ہیں۔ اس ناول کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ طبع دوم، میری لائبریری لاہور ۱۹۶۹ء، طبع سوم، سنگ میل، لاہور ۱۹۸۵ء اور طبع چہارم سنگ میل، لاہور ۱۹۹۱ء۔ آخری ایڈیشن میں کرداروں کے اصل ناموں کی فہرست بھی شامل کر دی گئی ہے۔

۷۔ "گڑیا گھر" (چودہ افسانے) گلڈ اشاعت گھر، کراچی، طبع اول: ۱۹۶۵ء

۱۔ گڑیا گھر ۲۔ کھونٹ والا بابا ۳۔ چار گوت ۴۔ ذاتی معاملہ ۵۔ مینا کے پاؤں ۶۔ دودھیا سویرا ۷۔ سکارلٹ روڈ ۸۔ نیلی رگ ۹۔ عطیہ ۱۰۔ نومان اور منیرہ ۱۱۔ گھر کی عزت ۱۲۔ جادوگرنی ۱۳۔ میرا گھر ۱۴۔ پردہ سیمیں۔

۸۔ "پیاز کے چھلکے" (خاکے) نیشنل پبلشنگ کمپنی، راول پنڈی، طبع اول: ۱۹۶۸ء

۹۔ "لبیک" (روداد حج) التحریر، لاہور، طبع اول: ۱۹۷۵ء

۱۰۔ "ہند یاترا" (سفرنامہ ہند) اظہار سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۳ء

کتاب کا معاہدہ ۱۹۸۱ء میں طے پایا

۱۱۔ "روغنی پتلے" (اٹھارہ افسانے) حرمت پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اول: ۱۹۸۴ء

۱۔ سندر تا کا راکشش ۲۔ بش اور بشرہ ۳۔ پکنک ۴۔ باجوؤں کی ڈھونڈ ۵۔ کھلا بند ھنا ۶۔ روغنی پتلے ۷۔ ڈائری ۸۔ الپسرا حویلی ۹۔ آغا اور اسارائیں ۱۰۔ ہانندا مونا ۱۱۔ ایک تھا بادشاہ ۱۲۔ ایلمنیز ۱۳۔ پرانی شراب نئی دکان ۔ ۱۴۔ حلوائی کی، کان ۔ ۱۵۔ وہ ۱۶۔ ان پورنی ۱۷۔ وقار محل کا سایہ ۱۸۔ بت دیوتا اور سناٹا

کتاب کا معاہدہ فروری ۱۹۸۴ء میں طے پایا۔ کل صفحات ۲۴۲ ہیں۔

۱۲۔ "سمے کا بندھن" (افسانے) فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۶ء

۱۔ سمے کا بندھن ۲۔ ساری بات ۳۔ چٹ کپڑی ۴۔ چکٹ گاڑی، ہونکنا ہونٹرا اور موم بتی ۵۔ ایک ہاتھ کی تالی ۶۔ مانا نمانہ ۷۔ دیوی ۸۔ گرین ما ۹۔ عینی اور عفریت ۱۰۔ گرداس داس گروا ۱۱۔ دو موہنی ۱۲۔ کس لئے؟ کیا اسلئے؟ ۱۳۔ اندھا فٹ پاتھیا ۱۴۔ کمرہ نمبر ۱۵۱ ۱۵۔ ماؤ ہاؤس ۱۶۔ سیڑھی سرکار ۱۷۔ ا بھان اپ مین اپ ۱۸۔ تھرڈ مین

۱۳۔ "اوکھے لوگ" (خاکے) انٹر نیشنل ہجرہ پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۶ء

کتاب کا معاہدہ ۱۹۸۳ء میں طے پایا۔

۱۴۔ "حکایات" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۵۔ "تین لوک کہانیاں" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۶۔ "اولیاء اللہ" (دو جلدیں / بچوں کے لیے معلومات) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لا

۱۷۔ "تین لوک قصے" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۸۔ "منتیانے" (افسانوی کلیات) مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۲ء

۱۹۔ "اور اوکھے لوگ" (خاکے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اول ۱۹۹۲ء

۲۰۔ "الکھ نگری" (سوانحی ناول) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۲ء

۲۱۔ "کہی نہ جائے" (افسانے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۲ء

۲۲۔ "جماعت اسلامی" (تجزیہ۔ ممتاز حسین عاصی کے فرضی نام سے) مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۳ء

۲۳۔ "Delusion of Grandeur" (فرضی نام سے) مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۵ء

غیر مدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد ریڈیائی ڈرامے، ریڈیائی فیچر، نشری تقریریں، مضامین اور خاکے غیر مرتب صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔

مستقل پتا:

مکان نمبر ۲۲، گلی نمبر ۳۲ سیکٹر ایف ۱/۶ اسلام آباد

اعزاز:

۱۔ ستارۂ امتیاز، حکومت پاکستان۔

۲۔ "نقوش" ادبی ایوارڈ

۳۔ اکادمی ادبی انعام۔ دو بار

نظریہ فن:

"ایک مرکزی خیال یا تاثر ضروری ہے۔ افسانے میں تاثر ہونا لازم ہے۔ اگر قاری کے دل میں تجسس پیدا کرے کہ پھر کیا ہوا تو بہت اچھے۔"

(مکتوب ۷ نومبر ۱۹۸۴ء بنام مرزا حامد بیگ سے اقتباس)

(۱)

"ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی میں ۱۹۰۶ء درج ہے، جو درست نہیں۔ تعلیمی اور سرکاری ریکارڈ میں تاریخ پیدائش ۱۱ جنوری ۱۹۰۶ء درج ہے۔

(۲) فلم "میرا لال"، "مدر انڈیا"، "جنگلی کنگ" اور "بجلی" کی مشہور اداکارہ۔ اداکار کمار اور پرمیلا نے سلور فلمز کے جھنڈے تلے "جھنکار" اور "بڑے نواب صاحب" جیسی مشہور فلمیں بنائیں۔

(۳) مفتی صاحب نے ڈاکٹر محمد اقبال کے تتبع میں "نطشے" لکھا ہے، درست "نیچے" ہے۔

(۴) بہ حوالہ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی = خود نوشت از ممتاز مفتی

ڈاکٹر رشید امجد۔ جلیل عالی

ممتاز مفتی سے ایک گفتگو

سوال : مفتی صاحب پہلے تو آپ اپنے بارے میں کچھ بتایئے کہ آپ کے ابتدائی حالات کیا ہیں؟
جواب : ۱۹۰۵ء میں بٹالہ میں پیدا ہوا' بٹالہ ضلع گورداسپور کی ایک تحصیل ہے مشرقی پنجاب میں' والد میرے ہیڈ ماسٹر تھے اس لئے جگہ جگہ ان کی تبدیلی ہوتی رہتی تھی جس سے پرابلم پیدا ہوتے تھے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میری پیدائش کے بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے میری زندگی زہرآلود رہی اور میں ساری زندگی اپنے والد کے خلاف رہا اور اب بھی ہوں۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ دسویں ڈیرہ غازی خان سے کی۔ یہ گورنمنٹ ہائی سکول تھا جہاں والد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے اس کے بعد میں اسلامیہ کالج چلا آیا' والد سے ان بن کی وجہ سے میرا کیریر بڑا خراب ہوگیا۔ ۱۹۲۱ء میں میں ایف اے میں داخل ہوا ۱۹۲۹ء میں بی اے پاس کیا یہ صرف اس لئے کہ ان بن کی وجہ سے پڑھنے میں دل ہی نہیں لگتا تھا سب سے بڑی بات کسی محفل میں بیٹھنے کا چاہ ہی باقی نہ تھا' کلاس میں جانا میرے لئے مشکل تھا اس وجہ سے اتنے سال برباد ہوئے۔ ۱۹۲۹ء کے بعد نوکری تلاش کرنے کی کوشش کی نوکری کوئی نہ ملی' دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر معاشی بدحالی تھی تمام گریڈ ڈاؤن ہوگئے۔ مثلاً پروفیسر کا گریڈ ۶۵ روپے جبکہ پروفیسر کا ۹۰ روپے تھا لیکن ۶۵ روپے پر لیتے تھے اور ہمارا گریڈ ۶۵ تھا لیکن ہمیں ۴۵ روپے کے گریڈ پر جونیر انگریزی استاد لیتے تھے دس سال تک نوکری کی اور جونیئر انگلش ٹیچر کے طور پر ۴۵ روپے دس سال تک لیتا رہا۔ بے شمار جگہوں پر کام کرتا رہا۔ پہلے تو میں نے ملازمت شروع کی یہاں ایک ایس ایم شریف تھے وہ بعد میں وفاقی سیکرٹری تعلیم ہوئے اس زمانے میں وہ ہمارے ڈویژنل انسپکٹر تھے۔ وہ بدقسمتی سے میرے باپ کے دوست تھے اس لئے میرے باپ کا یہ خیال تھا کہ میں اتنا نالائق آدمی ہوں کہ ان کے حوالے کے بغیر مجھے نوکری نہیں مل سکتی۔
سوال : آپ ایک ہی بیٹے تھے؟
جواب : اس زمانے میں ایک ہی تھا بڑا بیٹا تھا۔
سوال : کن کن علاقوں میں آپ کو جانا پڑا؟
جواب : پہلے اس نے یہ کہا کہ نوکری تو کوئی ہے نہیں' پھر اس نے کہا کہ یہ نوکری مشکل ہے ڈسٹرکٹ بورڈ کی نوکری کر لیں کم از کم آپ بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے مجھے گوجرہ میں لگا دیا۔ گوجرہ کے بعد وہاں کا ہیڈماسٹر کہنے لگا کہ یہ شخص (یعنی میں) بڑا بے ہودہ آدمی ہے فضول آدمی ہے اس کو میں نہیں رکھتا۔ انہوں نے مجھے چک جمرہ بدل دیا۔ چک جمرہ کے بعد مجھے گورنمنٹ کی نوکری مل گئی۔ انہوں نے مجھے جام پور بھیج دیا۔ جام پور سے ٹرانسفر ہوکر ساہیوال آیا۔ وہاں سے پھر ٹرانسفر ہوکر لاہور آیا' وہاں سے قصور گیا میں بہت سی جگہوں پر گیا۔ سانگلہ ہل میں رہا' کافی علاقوں میں رہا۔

سوال : آپ پر یہ انکشاف کیسے ہوا کہ آپ کے اندر ایک ادیب ہے؟
جواب : مجھ پر یہ انکشاف بالکل نہیں ہوا۔ اور یہ انکشاف شروع میں تو نہیں ہوا اب شائد ہو گیا ہو میرا ہیڈ ماسٹر تھا گوجرہ کا' گوجرہ کا سکول بہت بڑا تھا۔ بینڈ باجے تھے ۱۲ بسیں چلتی تھیں اس کو خبط تھا' اس نے کہا ہم یہاں سے ایک پرچہ نکالیں گے۔ لہٰذا اس نے کہا کہ آپ چونکہ انگریزی ٹیچر ہیں اس لئے آپ بھی اس میں تعاون کریں۔ اس نے کہا کہ اردو میں لکھیں۔ میں نے کہا بابا اردو میں نہیں جانتا اردو میں کیسے لکھوں۔ اس نے کہا نہیں اردو میں لکھو۔ میں نے بڑا سمجھایا مگر وہ آدمی ایسا تھا کہ جو بات اس کے منہ سے نکل گئی وہ نکل گئی اس نے کہا نہیں بس آپ اردو میں لکھیں۔ میں نے پھر ایک مضمون لکھا انگریزی میں رو رو کر' پھر اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ میں نے اردو زبان آٹھویں جماعت تک پڑھی تھی اور وہ بھی نہ پڑھنے کے برابر' زندگی بھر میرے ساتھ کوئی آدمی ایسا نہیں رہا جو اہل زبان ہو' میں پنجابی ہوں۔ پنجاب میں رہنے والا اس زمانے میں لاہور میں کوئی اردو نہیں بولتا تھا۔
سوال : پہلی تحریر آپ کی ترجمہ تھی؟
جواب : ترجمہ نہیں تھی اسے ترجمہ نہیں کہہ سکتے' وہ انگریزی میں تھی' میں اب بھی انگریزی میں سوچتا ہوں۔
سوال : پہلی کہانی آپ نے کب لکھی؟
جواب : کہانی نہیں لکھی ایک مضمون لکھا وہ چھپ گیا' وہ مضمون ادبی دنیا کے ایڈیٹر نے دیکھ لیا۔ منصور احمد اس کا نام تھا۔ اس بے وقوف کو پتا نہیں کیا سوجھا اس نے میری تقدیر بدل دی۔ اس نے مجھے خط لکھ دیا کہ ہم ایک سالنامہ نکال رہے ہیں مہربانی کرکے ہمارے لئے کہانی لکھیں ایک چھوٹی سی تحریر جو اس نے حماقت کی وجہ سے مجھے لکھ کر بھیج دی' میں حیران ہوگیا۔
سوال : آپ نے کیسا محسوس کیا جب آپ پہلی کہانی لکھ رہے تھے؟
جواب : میں نے کہا کہ اتنا بڑا اردو کا پرچہ کہہ رہا ہے کہ ہمارے واسطے کچھ لکھو' ادبی دنیا میں منصور کے بعد عاشق آیا عاشق کے بعد مولوی آیا۔
سوال : آپ کی پہلی کہانی ادبی دنیا میں چھپی؟
جواب : ادبی دنیا میں چھپ گئی۔ میں حیران پریشان' میرے لئے لکھنا لازم ہوگیا۔ مجھے کبھی کہیں کسی بات پر اہمیت نہیں ملی تھی اب مجھ پر لازم ہوگیا کہ میں لکھوں' اب اس نے زیادتی یہ کی کہ پہلے مجھے خط لکھا اور ایک پرچہ چھاپنے کے بعد فوت ہوگیا' عاشق بٹالوی آگئے یہ ہمارے محلّے میں ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ' ضرور کچھ لکھے گا۔ میں نے ایک کہانی لکھ کر انہیں بھجوائی۔ انہوں نے تمام کہانی پر سرخ نشانات لگا کر واپس بھیج دی اور ساتھ ہی لکھا کہ کوئی طبع زاد چیز لکھیے مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر میں نے ساقی کو بھیجنا شروع کر دیا ویسے تو وہ اہل زبان بنے پھرتے تھے مگر میری چیزیں میں نے جو کچھ لکھا انہوں نے چھاپ دیا۔ بغیر تصحیح کیئے۔ اس طرح میں لکھنے والا بن گیا۔ مجھ پر کبھی انکشاف نہ ہوا۔
سوال : پہلا مجموعہ چھاپنے کا خیال کیسے آیا؟
جواب : ملازمت چھوڑ کر مجھے یہ پتا چل گیا کہ میں نوکری نہیں کر سکتا' میں سکول کے جن اساتذہ کے ساتھ

رہا وہ اتنے ان پڑھ اور جاہل تھے کہ ان میں زندگی گزارنا مشکل تھا۔ اخلاق سے گرے ہوئے' ایک دن ایک صاحب پرچہ لے آئے جس میں میری کہانی چھپی ہوئی تھی کہنے لگے لاحول ولاقوۃ یہ دیکھو ایک شخص ہے ممتاز مفتی ایسی خرافات لکھتا ہے' کچھ دیر کے بعد انہوں نے مجھے مخاطب کرکے کہا آپ تو نہیں؟ میں سکول میں ممتاز حسین تھا' میں نے ان سے کہا میں ایسی واہیات چیز نہیں لکھتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سکول چھوڑ دوں' پھر اتفاق سے ایک مرتبہ میں لاہور ریڈیو اسٹیشن میں آگیا' آپ یہ دیکھئے کہ انسان کی زندگی میں کیسے معمولی اور چھوٹے واقعات سے کتنے بڑے موڑ آتے ہیں اتفاق سے وہاں کسی نے کہا Chip چپ صاحب آپ کا پوچھ رہے ہیں' چپ وہاں کا سٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ میں ایک چھوٹا سا آدمی اندر گیا تو چپ کھڑا ہوگیا۔ میں حیران ہوگیا کہ اتنا بڑا آدمی اسٹیشن ڈائریکٹر کھڑا ہوگیا مجھ سے کہنے لگا کہ یہ میری خواہش ہے کہ میں آپ سے کہانیاں لکھواؤں اور انہیں انگریزی میں ترجمہ کرواؤں' وہ ہندو تھا وہ کہنے لگا کہ آپ کو اگر یہاں نوکری کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم شروع میں آپ کو تھوڑی تنخواہ کا آفر دیں گے' آپ یہ نہ کہہ دیں کہ مجھے منظور نہیں' اچھا مجھے اس زمانے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ بخاری برادران نے ہم پر کتنا بڑا ظلم کیا' اب بھی نہیں پتا لوگوں کو کہ بخاری برادران نے کیا ظلم کیا۔

سوال : زیڈ اے بخاری اور پطرس بخاری؟

جواب : پطرس نہیں۔ زیڈ اے' یہ لوگ اس قدر مغرور تھے کسی سے بات کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ادب ہمارے گھر کی پیداوار ہے انہوں نے کیا کیا جب کہ ان سے کہا گیا کہ ریڈیو کے محکمہ کی تشکیل کریں تو انہوں نے تمام جتنے بھی آرٹسٹ تھے سب کو کنٹریکٹ پوسٹیں دیں حالاں کہ وہ خود بھی آرٹسٹ تھے انہوں نے اتنا ظلم کیا کہ آرٹسٹ کے لئے کنٹریکٹ پوسٹ رکھی جو آج تک چلی آرہی ہے بعد میں احتجاج بھی ہوا کچھ ہٹ بھی گئے ہیں کچھ باقاعدہ بن بھی گئے اتنا بڑا ظلم کہ کہا گیا لکھنے والوں کو ریگولر سروس میں مت رکھو اس لئے کہ میٹر کہاں سے آئے گا۔

سوال : آپ کی ٹیچنگ والی ملازمت بھی ریڈیو کے ساتھ ساتھ رہی؟

جواب : نہیں وہ چھوڑ دی تھی' ریڈیو نے ڈھائی سو روپے کی آفر کی۔ میں چھوٹا آدمی تھا ۴۵ روپے سے اڑھائی سو کو میں نے کہا نہ مت کرو' اگر نہ کر دیا تو بجائے بڑھانے کے مجھے واپس نہ بھجوا دے چنانچہ میں آگیا۔ ریڈیو میں دو سال رہا' میرا ایک دوست آیا کہنے لگا ایک لڑکی پرمیلا آئی ہے۔ فلمی لڑکی ہے اسے کہانی چاہئے۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھ سے کہا آپ کے پاس آئیڈیا ہے میں نے کہا ہے! اس نے کہا کیا؟ میں نے کہا رضیہ سلطانہ' وہ کہنے لگی یہ کیسے ہو سکتا ہے رضیہ سلطانہ کا عشق ایک حبشی سے تھا میں نے کہا ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا مجھے آؤٹ لائن لکھ دیں میں نے آؤٹ لائن لکھ دی' اس نے کہا کہ آپ بمبئی آئیں' ۵۰۰ روپے اس نے ہمیں کرایہ کے لیے دیئے۔ ادھر میرا جو پبلشر تھا اس نے کہا وہاں سے فلمی پرچہ نکالو۔ وہاں احمد بشیر اور میں دونوں تھے۔ ہم بمبئی میں کرشن چندر کے گھر ٹھہرے اس کا گھر سرائے تھا۔ کرشن بہت بڑا ترقی پسند تھا اس سے بڑا ہیرو میں نے آج تک نہیں دیکھا' بیوی اور بچی کے ساتھ بھی اس کا رویہ یہی تھا۔

سوال : اس زمانے میں کون کون تھے آپ کے ساتھ؟

جواب : میرا جی بھی وہیں رہتا تھا کرشن نے ایک کمرہ رکھا ہوا تھا جو ادیب آتے وہاں ٹھہرتے تھے بمبئی میں کچھ ڈائیلاگ سپروائز کئے پھر ۴۷ء آگیا۔ ہم سمجھے کہ پارٹیشن کی ایک لکیر لگ جائے گی کاروبار بند اسٹوڈیو

ویران ہو گئے۔
سوال: آپ لاہور واپس آ گئے؟
جواب: میں مستقل واپس نہیں آیا تھا پیسے لینے کے لئے آیا تھا' ہمارے پاس پیسہ ختم ہو گیا تھا' آخری گاڑی میں آئے اس کے بعد گاڑی ختم ہو گئی۔ احمد بشیر وہیں رہ گیا۔
سوال: لاہور آکر کیا ہوا؟
جواب: ایک جگہ نوکری ملی۔ پہلی نوکری مہاجر کیمپ میں ملی وہاں سے نکلا تو استقلال پرچہ نکلتا تھا اس میں رہا تیسری نوکری ایئرفورس میں ملی تینوں سروسز کے چناؤ کے لئے ایک نفسیاتی بورڈ ہوتا ہے۔ ایک سال وہاں رہا وہ بہت اچھا محکمہ تھا وہاں سے شخصیات کے بارے میں بہت کچھ جانا۔
سوال: وہاں سے آپ اطلاعات میں آ گئے۔
جواب: نہیں جی اطلاعات میں کہاں آیا۔ وہاں چھ لڑکیاں آئیں وہ بڑی خوبصورت تھیں
سوال: یہ تو آپ کی عمر کا بھی ایسا ہی زمانہ تھا' آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسا حادثہ ہوا تھا کیا۔ یہ جو لڑکیاں آ گئیں بہت ساری پھر' آپ ادیب بھی تھے تو اس کے پس پردہ کوئی واقعہ بھی ہے؟
جواب: ہر وقت ایک نہ ایک عورت میرے پیچھے کھڑی رہی۔
سوال: پس پردہ بھی کوئی تحریک چلی یعنی تحریک والی کوئی ایسی خاتون جس کا نقش زیادہ ہو؟
جواب: میں نے کہا نا میرے پیچھے ہمیشہ ایک عورت کھڑی رہی۔
سوال: آپ نے افسانے لکھنے شروع کئے تو جنس آپ کا موضوع تھا؟
جواب: نہیں جی پہلے تو نفسیات رہا میں نے سب سے پہلے "ان کہی" کالفظ استعمال کیا۔ یعنی وہ بات جو آپ کے دل میں موجود ہے ہونٹوں پر نہیں آتی آپ کو اس کا شعور نہیں ہے۔ نہ آپ اپنے منہ سے کہیں نہ لکھنے والا اپنے منہ سے کہے لیکن قاری تک پہنچ جائے یہ بڑا مشکل کام ہے۔
سوال: اچھا مفتی صاحب جس زمانے میں آپ لکھ رہے تھے تو منٹو صاحب بھی لکھ رہے تھے؟
جواب: منٹو بہت بعد میں آیا
سوال: نفسیات اور جنس کے حوالے سے اور کون کون لوگ لکھ رہے تھے؟
جواب: کوئی نہیں۔ عصمت بعد میں آئی منٹو بعد میں آیا میرے زمانے میں جو لکھنے والا تھا وہ کرشن تھا۔
سوال: آپ کا پہلا افسانہ کس سن میں چھپا؟
جواب: ۱۹۳۶ء میں چھپا۔ منٹو کو میں ملا تھا۔ میں نے کہا یار یہ تو کیا ترجمے کر رہا ہے۔ اس نے مجھے کیا جواب دیا؟ اس نے کہا پہلے گھڑا بھر لے پھر چھلکے گا وہ گھڑا بھرتا رہا۔
سوال: مفتی صاحب آپ کی تحریریں پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ معمول سے ہٹے ہوئے پہلوؤں میں دلچسپی لیتے ہیں انسانی شخصیات کی طرف زیادہ متوجہ کرتے ہیں چاہے جنس پر لکھ رہے ہوں یا چاہے کسی اور موضوع پر؟
جواب: میری گذارش ہے کہ میرا کیریئر سیدھا ہے۔ معاشرہ کے کسی مسئلے پر آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی۔ مجھے سب سے زیادہ مسرور "میں" نے کیا اس "میں" کے کتنے ہفت پہلو ہیں رہی بات جنس کی تو میں سمجھتا تھا۔ کہ جنس ہماری ایک پرابلم ہے اس سے باہر نکل آؤ تو پتا چل جائے کہ جنس کیا چیز ہے؟

سوال : یہ بتائیں کہ آپ کے ہاں جو یہ سلسلہ آیا ہے اس میں آپ کا اپنا مزاج تھا یا پھر آپ کے مطالعے میں ایسی کتابیں رہیں یا کوئی ذاتی تجربہ بھی تھا آپ جس کی وجہ سے اس طرف آئے۔

جواب : میں مطالعہ کرنے سے پہلے جنس میں پھنسا ہوا تھا اور جنس میں اس لئے پھنسا کہ میرے باپ نے دوسری شادی کی تھی۔

سوال : تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جنس آپ کا ایک پرابلم تھا اور جنس سے گہرا تعلق محسوس کرتے تھے۔

جواب : میں جنس سے نفرت بھی کرتا تھا اور محبت بھی کرتا تھا بیک وقت دو متضاد خواہشات'

سوال : یہ دور ترقی پسند تحریک کا تھا ۱۹۳۶ء کے بعد تحریک شروع ہو چکی تھی آپ ظاہر ہے کہ اس وقت جنس کی باتیں کر رہے تھے اور نفسیات کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا نظریہ بالکل متضاد تھا آپ کا ان سے کیا تضاد تھا؟

جواب : تضاد یہ بنا کہ جب احمد ندیم قاسمی نیا نیا لاہور آیا تو ہم اس کی زیارت کرنے گئے کہ کتنا بڑا آدمی ہے اس کے پاس کتنا بڑا عہدہ تھا عہدے کو چھوڑ کر ادب کی خاطر آگیا' بڑے خوش ہوئے اس کے بعد ان کا رویہ دیکھا۔ ترقی پسندی پر مجھے کوئی اعتراض نہیں' آپ ضرور کرتے رہیں مجھے کیا' اصل میں ترقی پسندوں کا رویہ جارحانہ تھا وہ کہتے تھے ہماری بات مانو ورنہ ہم آپ کو باہر نکال دیں گے۔

سوال : آپ کے ساتھ اور کون کون لوگ تھے یعنی جن کا تضاد بنا؟

جواب : فیض اور منٹو وغیرہ۔

سوال : فیض کس وجہ سے فیض تو ترقی پسند تھے؟

جواب : نہیں نہیں یہ سوال ہی نہیں یہ ان کے خلاف بھی تھے بابا۔ ترقی پسندی کے علاوہ بھی ایک تحریک چل رہی تھی۔

سوال : یہ بتائیں پرچوں میں جو پابندی لگی تھی کہ غیر ترقی پسند نہیں چھپیں گے تو کیا ان لوگوں میں فیض صاحب کا نام بھی تھا؟

جواب : ہاں۔ فیض کا نام بھی تھا۔ کئی لوگ اور تھے کسی نے پرواہ ہی نہیں کی یعنی محمد حسن عسکری' ممتاز شیریں وغیرہ۔ ممتاز شیریں لائن پر بیٹھی ہوئی تھی' حسن عسکری بہت سمجھدار آدمی تھا۔ بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ جذباتی نہیں ہوتا تھا' ترقی پسندی کے حق میں کبھی بات کرتا تو ٹھیک کرتا تھا یہ Clash اس لئے ہوا کہ ترقی پسندوں کا رویہ بڑا جارحانہ تھا اب بھی ہے' فسطائیت پائی جاتی ہے۔

سوال : پاکستان بننے کے بعد شیریں اور عسکری نے پاکستانی ادب کا جو نعرہ لگایا تھا وہ کیا تھا؟

جواب : میں نے پاکستانی ادب کو کبھی نہیں مانا ادب کو ادب سمجھتا ہوں' یہ ایک بڑا جھگڑا ہے کہ اگر پاکستانی ادب کو اسلام کے نقطہ نظر سے لیتے ہیں تو یہاں میرا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے میں یہ کہتا ہوں اسلام انسانیت سے بڑا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ اسلام چھوٹا دائرہ ہے اور انسانیت بڑا دائرہ ہے یعنی اسلام جگہ جگہ انسانیت کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتا ہمارا دائرہ بہت بڑا ہے ہمارا تو نظریہ ہے کہ آپ کے جو دشمن ہیں ان کی بھی خدمت کرو ہندوؤں کی بھی کرو ان کے حقوق پہلے اپنے بعد میں۔

سوال : آپ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کے تعصب نے آپ کے اندر کے مسلمان کو بیدار کیا؟

جواب : میری گذارش سیدھی سی ہے' میں پیدائشی مسلمان ہوں تقسیم میں' میں منہ زبانی مسلمان ہوگیا' میں

نے کہا کہ میرا تحفظ اسی میں ہے کہ میں مسلمان رہوں مسلمان میں پھر بھی نہیں ہو سکا

سوال : یہ تو کیوئل رویہ تھا' آپ کے اندر ہندوؤں کے تعصب سے ایک مسلمان بیدار ہوا۔ آپ پہ انکشاف ہوا کہ آپ ہندوؤں سے مختلف ہیں لیکن روحانی تجربے سے ایک اور سطح پیدا ہوئی وہ سطح کیا ہے؟

جواب : مری کے رہنے والے ایک بزرگ تھے انہوں نے مجھ میں ایک تبدیلی پیدا کی یا کیوں کی؟ میں نہیں جانتا

سوال : کیا تبدیلی آئی؟

جواب : میں نے پہلی دفعہ سمجھا کہ روحانیت ایک آرڈر ہے دنیا کے ساتھ ساتھ ایک متوازن آرڈر۔

سوال : کیا اس وقت تک "لبیک" لکھی جا چکی تھی "لبیک" میں آپ کا رویہ اور تجربہ مختلف ہے؟

جواب : میں ۱۹۵۵ء کی بات کر رہا ہوں "لبیک" ۷۵ء میں لکھی گئی

سوال : آپ کے اندر تبدیلی ایک بزرگ کی وجہ سے آئی آپ نے تحریک پاکستان کے بعد اپنے آپ کو مسلمان محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ ظاہر ہے آپ کے نقطہ نظر میں وسعت آئی اور بہت سی نئی چیزیں آئیں تاہم جنس اور نفسیات کے حوالے سے آپ کا موضوع نہیں بدلا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : میں جنس کو کوئی بری چیز نہیں سمجھتا' میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے لوگ جنس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے! دیکھئے میرا جو رویہ ہے جنس کے بارے میں وہ منٹو سے مختلف ہے میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ میرا کیا رویہ ہے' میں جنس کو ایک بڑی چیز سمجھتا ہوں میرا یہ خیال ہے کہ اگر جنس کی مشکلات کو سمجھ لیں تو بات آسان ہو جائے مثلاً ایک چھوٹی سی بات یہ ہے کہ ایک آدمی وہ ہے جسے اپنی بیوی کی ضرورت روز پڑتی ہے' کچھ آدمی ہیں جنہیں سات دنوں کے بعد بیوی کی ضرورت پڑتی ہے' کچھ ہیں جنہیں سال کے بعد پڑتی ہے ایک آدمی کو ایک عورت سے بیاہ دیتے ہیں عورت ایسی ہے جسے خاوند کی روز ضرورت پڑتی ہے۔ ہر ایک عورت ایسی نہیں ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو ہر روز ضرورت پڑتی ہے یہ بالکل غلط ہے۔ ایک مرد ایسا ہے جسے ۶ ماہ بعد ضرورت پڑتی ہے ہم ڈس پیرٹی کا خیال نہیں رکھتے۔

سوال : یعنی انسانی شخصیت کے پس پردہ جنس اہم کردار ادا کرتی ہے؟

جواب : مجھے یہ شعور ہے کہ یہ کیا ہے۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ گھریلو خوش قسمتی نہیں تو پھر زندگی نہیں یعنی جنسی ہارمنی۔

سوال : اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ فرائڈ کے زیادہ نزدیک ہیں؟

جواب : فرائڈ کو بہت پڑھا ہے۔

سوال : منٹو سے آپ کا رویہ مختلف کیسے ہے؟

جواب : منٹو تو سوشل تھا۔ اس کی توجہ جنس کی طرف سوشل تھی میری نفسیاتی تھی۔ میں جنس کو برا نہیں سمجھتا اب بھی آخری دنوں میں جھگڑا ہوا "شہاب کے ساتھ" مجھے شہاب نے کہا کہ آپ شرم کریں کہ آپ ۴۵ سال سے عورت عورت کر رہے ہیں۔ بہت کچھ بتا دیا آپ نے چھوڑیں اب اس موضوع کو۔ کوئی اور بات کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے کوئی اور بات نہیں آتی۔ میں نے مزید کہا آپ نے ایک بات سیکھی اللہ اللہ کی بات کرنا تو یہ کام بہت مشکل ہے۔

سوال : اچھا یہ بتائیں کہ شہاب سے آپ کی ملاقات کیسے ہوئی؟

جواب : ۵۸ء میں ہمارا جھگڑا یہ ہوا کہ میرا افسر میرے خلاف تھا۔
سوال : کہاں تھے آپ اس وقت
جواب : کشمیر ڈائریکٹوریٹ آف پبلسٹی میں تھا بات یہ تھی کہ میں پہلے لاہور تین سال رہا بعد میں یہ مجھے لے آئے آزاد کشمیر ریڈیو میں تو میں وہاں رہا' وہاں سے ریڈیو یہاں آگیا میں بھی یہاں آگیا۔ یہاں سے مجھے پبلک سروس کمیشن نے منتخب کر لیا۔ تو یہاں ڈائریکٹوریٹ میں تقرری ہوئی۔ وہاں میرا افسر میرے خلاف تھا۔ آٹھ سال میرے خلاف رپورٹیں وزیر اعظم کے پاس گئیں' وزیر اعظم نے کہا کہ اس آدمی کے خلاف ایک ہی افسر کی رپورٹیں ہیں اس کا افسر بدلو۔ دیکھو دوسرا افسر کیا کہتا ہے۔ اس افسر نے مجھ پر سیکورٹی کے دو تین کیس بنا دیئے مجھ میں ایک عیب تھا' وزارت والے انکوائری کرتے تو ان کو سچ سچ بتا دیتا تھا یہ عیب مجھ میں اب بھی ہے کہ میں سچی بات یوں کر دیتا ہوں جیسے پانی پی لیا۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کرنے والی نہیں ہوتیں مگر کر دیتا ہوں' تو انہوں نے کہا کہ مجھ پر کیس ہے' میں نے کہا کہ ٹھیک ہے مجھ پر کیس ہے' مجھے ایک دن اشفاق احمد نے کہا کہ میرا ایک یار ہے وہ یہاں ایک بڑا افسر ہے تم کہو تو اس کی سفارش کرا دوں' اس بات کو تین ماہ گذر گئے۔ اشفاق بھی بڑا سست آدمی تھا میں بھول بھال گیا کہ آدمی کو کہا تھا سفارش کرانے کو۔ آدمی وہ قدرت اللہ شہاب تھا میرا اس سے کوئی تعلق نہ تھا' میں نے اسے کبھی پڑھا بھی نہ تھا۔ ایک دن سیکرٹری کی طرف سے بلاوا آیا میں سمجھا کہ شاید انکوائری کے سلسلے میں مجھے بلایا گیا ہے سیکرٹری کہنے لگے۔ آپ کا نام؟ میں نے کہا ممتاز مفتی کہنے لگے "جی آپ لکھتے ہیں؟" میں نے کہا کہ لکھتا ہوں۔ کہنے لگے آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں جی' کہنے لگے بالکل نہیں؟ میں نے کہا نہیں جی' کہنے لگے بالکل نہیں' میں نے کہا میں کبھی ملا ہی نہیں ان سے' کہنے لگے وہ بھی تو لکھتے ہیں۔ میں نے کہا نہ ضرور لکھتے ہوں گے اس نے ایک خط نکالا دراز سے اس نے کہا یہ خط آیا ہے قدرت اللہ شہاب کی طرف سے میں پڑھ کر سناتا ہوں دیکھئے میرے ایک بہت عزیز دوست آپ کے محکمے میں کام کرتے ہیں ان کا نام ممتاز مفتی ہے وہ بڑی مشکلات میں ہیں اگر ہو سکے تو مہربانی کر کے ان کی مدد کریں۔" وہ کہتے ہیں میرے بڑے عزیز دوست ہیں میں نے کہا کہ یہ بات آپ ان سے پوچھیں' بولے آپ کہتے ہیں کہ میں انہیں جانتا ہی نہیں۔ میں نے کہا بالکل صحیح ہے مجھے کہا کہ اچھا جی اسلام علیکم اور ٹیلی فون اٹھایا۔ میرا خیال ہے کہ شہاب کو میری یہ بات پسند آئی ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قدرت اللہ شہاب میری طرف متوجہ ہوتا۔ کوئی بات نہیں تھی جو سانجھی ہو' وہ کسی اور رنگ کا آدمی تھا میں کسی اور رنگ کا آدمی۔
سوال : آپ شہاب صاحب کے بہت قریب رہے۔ غیر محسوس طور پر بہت سارے اثرات آپ پر ہوئے ہوں گے کیا آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے اندر کوئی تبدیلی آئی ہے؟
جواب : میرا تو کباڑا کر دیا انہوں نے۔
سوال : شہاب صاحب کے روحانی پہلو سے آپ کب واقف ہوئے؟
جواب : نہیں جی میں واقف کب ہوا شروع میں تو میں نے کہا کہ یہ کیسا آدمی ہے خدا جانے انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ بڑا مشکوک آدمی ہے مگر ایک بات تھی عجیب سی' وہ نہایت Nice آدمی تھا۔
سوال : یہ کیسے آپ نے محسوس کیا؟
جواب : اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مثلاً یہ کہ ایک بزرگ میرے پاس آئے کہنے لگے آپ ممتاز مفتی

ہیں؟ میں نے کہا جی میں ممتاز مفتی ہوں کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ نوکری چھوڑ دوں' میں نے کہا جی مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ کا جی چاہتا ہے چھوڑ دیں' کہنے لگے نہیں میں آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا میری اس میں کوئی رائے نہیں تو کہنے لگے آپ کو پتا ہے قدرت اللہ شہاب کہاں رہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ آپ ان سے جاکر مل لیں! کہنے لگے نہیں میں انہیں جانتا ہوں۔ میں نے پوچھا کیسے؟ کہنے لگے کہ جی رات کو محفل محمدی میں ہماری روز ملاقات ہوتی ہے دیکھیں It is some thing shaking t یہ کون سی محفل محمدی ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ محفل محمدی کیا چیز ہے' ایک بزرگ آئے انہوں نے کہا آپ کا اس بات میں ایسوسی ایٹ ہونا بہت ضروری ہے۔ تو میں کہتا تھا کہ یہ کون آدمی ہے چھوٹی چھوٹی باتیں بڑھتی گئیں میں حیران ہوتا گیا' جس وقت ایوب خان نے مارشل لاء کا اعلان کرنا تھا شہاب اس وقت پارٹی میں نہیں تھا۔ پتا کیا ہوا؟ شہاب کو ہارٹ اٹیک ہوگیا دو دن ہوگئے۔ میں بڑا پریشان ہوا اور ہسپتال گیا۔ یہ وہاں لیٹا ہوا تھا۔ جب وہاں سے واپس آیا تو مجھے کہا ہارٹ اٹیک ہوا تھا میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگا میں اس میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔

سوال: روحانیت کی طرف آپ کو کس نے متوجہ کیا؟

جواب: میں اپنے طور پر آیا کیونکہ سائیکالوجی سیدھی آپ کو ٹیلی پیتھی کی طرف لے جاتی ہے' میں اس سے واقف تھا۔ میں ایسے رسالے پڑھا کرتا تھا مثلاً پروڈکشن ایک رسالہ ہوتا تھا۔ کئی جوتش کے رسالے تھے۔ کئی قسم کے رسالے پڑھا کرتا تھا جن میں اس قسم کی باتیں بڑی عام ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب وہ بزرگ ملے مری والے تو میں حیران ہوا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ باقاعدہ انڈر گراؤنڈ ایک سسٹم ہے جس میں سپاہی بھی ہے' حوالدار بھی ہے۔ باقاعدہ ہماری طرح نظام بنا ہوا ہے اس سے پہلے یہ شعور مجھے کسی اور نے نہیں دیا مجھ پر انہوں نے زیادتی کی کہ انہوں نے مجھ پر رقت طاری کر دی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کیوں روتا تھا؟ یہ ۱۹۵۵ء کا زمانہ تھا۔ میں Reasonable اور باشعور آدمی تھا ۔ میں حیران ہوا کہ میں اس طرح کیوں روتا ہوں کہ ہر پانچ منٹ کے بعد مجھ پر دورہ پڑتا تھا۔ دس دن دورے پڑتے رہے' ایسے تو کوئی موڑ نہیں مڑتا

سوال: اس سے تبدیلی کیا آئی آپ میں' یہ جو رقت طاری ہوتی تھی اس سے تحریروں کے رخ میں بھی کوئی تبدیلی آئی۔

جواب: سارا نظام ہی بدل گیا۔ میری بات سمجھئے' یہ احساس ہوا کہ ایکسٹرا سینسری پرسیپشن جو ہے وہ ایک روحانی نظام ہے اور کچھ نہیں۔

سوال: عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی اس دنیا سے واقف ہو جاتا ہے جو اس دنیا سے ماورا دنیا ہے یا اس کے انڈر گراؤنڈ دنیا ہے تو پھر وہ ادیب نہیں رہتا لیکن آپ نے اپنی ادبی حیثیت کو برقرار رکھا۔

جواب: آپ کی پہلی بات کو مفروضہ سمجھتا ہوں مفروضہ کہ پھر ادیب' ادیب نہیں رہتا یہ باتیں کہ رخ بدل جاتا ہے ادب کا' ہوا یہ کہ میرے پاس کوئی اہمیت کی چیز نہیں تھی ان سے ملا۔ میں بزرگ بننا نہیں چاہتا تھا۔ بابا وہ تو بڑا مشکل کام تھا میں نے دیکھا کہ انہوں نے مجھ سے کیا کیا کہا' دس یا پندرہ باتیں کہیں انہوں نے پہلی بات یہ کہی کہ پاکستان کی فکر نہ کرو' پاکستان کی فکر کرنے والے بڑے بڑے لوگ موجود ہیں۔ آپ صرف اتنا کام کریں کہ جب آپ کوئی قدم اٹھائیں تو اتنا سوچیں کہ یہ قدم میں پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں

اٹھا رہا؟ بس مجھے پاکستان کی اہمیت کا کوئی شعور نہیں تھا' سوائے اس بات کے کہ مسلمانوں کو جگہ مل گئی۔ مکانات مل گئے بس یہ ایک مفاد پرستی کی صورت تھی ورنہ پاکستان کا شعور مجھے نہیں تھا۔

سوال : پاکستان کے بارے میں جو تبدیلی آپ کے رویہ میں آئی وہ کیا ہے آپ کیا سمجھتے ہیں پاکستان کو؟

جواب : میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان حضورؐ کے حکم سے بنا ہے' ہماری بد اخلاقیوں اور بدکرداریوں کے باوجود یہ عظیم ہے اس لئے کہ یہاں پر آخری امامؑ نے آنا ہے یہاں آپ کا ظہور ہو گا۔ وہ یہاں آئیں گے مسلمان چاہے پاکستانی مسلمان ہو یا ہندوستانی' وہ کسی جگہ پر بھی ہو یہاں ان کی سیٹ ہے۔

سوال : آپ نے افسانے بہت لکھے' ناول بھی لکھا' افسانوں کے بعد ناول لکھنے پر کیا آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے تخلیقی عمل میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

جواب : یہ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں کوئی تخلیقی عمل کر رہا ہوں' یوں سمجھو کہ میں نے کبھی ادب کو اہمیت نہیں دی۔ میری ایک ضرورت تھی صرف کہانیاں لکھنا' اب میں نے کیوں لکھا' ہر کوئی کہتا ہے کیوں لکھا؟ میں نے کتابیں جتنی بھی پڑھیں' یہاں کی کتابوں اور انگلش لٹریچر میں ایک فرق تھا یہاں تکلف تھا وہاں بے تکلفی تھی' انگریزی میں صاف باتیں کرتے ہیں یہاں صاف باتیں نہیں کرتے' مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا کہ میں بھی لکھوں گا' مجھے پتا تھا کہ میں ادبی کارنامہ نہیں کر رہا۔ مجھے یہ پتا تھا کہ مجھے گالیاں پڑیں گی' برا سمجھا جاؤں گا۔ میں نے کہا چاہے کچھ بھی ہو میں ۴۷ء تک اپنی زندگی کی پوری ہسٹری بیان کر دوں گا۔

سوال : کیا آپ اسے ناول نہیں سمجھتے خود نوشت سمجھتے ہیں؟

جواب : یہ ہے ہی خود نوشت۔ ناول کی شکل اس لئے دی کہ مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی کہ میں لوگوں سے کہتا کہ بھئی یہ میں ہوں۔

سوال : جب ناول چھپا تو لوگوں کا خیال تھا کہ اسے ادبی انعام ملے گا لیکن اسے آدم جی ایوارڈ نہ ملا۔ اس زمانے میں اس کے بارے میں لکھا بھی گیا' آپ کا کیا خیال ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ادبی سیاست کارفرما تھی؟

جواب : اس کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہوں گا' ایک لابی تھی یہ ترقی پسند لوگ تھے وہ چاہتے تھے کہ اس کو انعام نہ ملے ترقی پسند مجھے ادیب نہیں مانتے' اگر وہ نفسیات کو مان لیں تو ان کی ترقی پسندیدیت ختم ہو جائے۔ آپ ایک بات سمجھئے کہ اگر آپ نفسیات کو مان لیں تو آپ ترقی پسند نہیں رہ سکتے' ترقی پسندی۔ ایک فلسفے پر کھڑی ہے' کہ آپ انسان کو جو روپ دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔

سوال : مفتی صاحب آپ نے اب اس کا دوسرا حصہ لکھا ہے وہ چھپ رہا ہے کیا وہ ۴۷ء سے شروع ہوتا ہے؟

جواب : جی ہاں

سوال : تو اس میں بھی آپ کی شخصیت ہی کی عکاسی ہے

جواب : کچھ نہیں میری شخصیت۔ میری بات صاف صاف ہے نہ وہ میں نے دل لگا کر لکھا' نہ میں نے اس میں کوئی بات کی جس طرح شخصیت ہونی چاہیے' جس طرح پہلے تھی ویسے نہیں لکھا' ہوا یہ کہ قدرت اللہ شہاب نے ایک آخری باب شامل کرا دیا آخری باب اس طرح ہے جیسے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگا ہو۔

سوال : آپ "شہاب نامہ" کے بارے میں کہہ رہے ہیں

جواب : "تلّل پر ٹاٹ" میں بتانا چاہتا تھا لوگوں کو کہ میں نے قدرت اللہ شہاب کو کیسا دیکھا' میں نے سوچا کہ ایک کتاب شہاب پر لکھوں' تو وہ بات بنے گی نہیں' اب جھگڑا پڑ گیا' اگر میں اپنی سچ لاکز میں لکھتا تو یہ کتاب ۵ ہزار صفحات پر پھیل جاتی میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا میں بیمار پڑا تھا' میں نے صرف قدرت اللہ کے بارے میں لکھا یہ کہ میں نے کیا دیکھا۔
سوال : آپ یہ بتائیں کہ جنس کے موضوعات پر لکھنے کی وجہ سے منٹو کو مسائل کا شکار ہونا پڑا ' اور کچھ مقدمے وغیرہ اس پر بنے' آپ کا بھی یہی موضوع تھا اگرچہ اس کا معاشرتی حوالے سے تھا اور آپ کا نفسیات کے حوالے سے! کیا آپ کو بھی اس قسم کے مسائل کا شکار ہونا پڑا کیونکہ جنس پر لکھنا ممنوعہ علاقہ سمجھا جاتا ہے۔
جواب : میں نے ایک کہانی لکھی بدمعاش یہ چھوٹی سی کہانی تھی۔ کچھ ہم خیال لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ ایک عورت ہے وہ ایک آدمی کے ساتھ یارانہ لگاتی ہے پھر دوسرے کے ساتھ پھر تیسرے کے ساتھ پھر چوتھے کے ساتھ پھر پانچویں کے ساتھ کبھی ایک کے پاس جاتی ہے کبھی دوسرے کے پاس اس لئے وہ قابل رحم ہے آپ اسے کیوں برا سمجھتے ہیں؟
سوال : اس پر کیا ردعمل ہوا؟
جواب : کچھ بھی نہیں ایک وہاں محمد حسین صاحب بیٹھا کرتے تھے ان کی حماقتیں کیا تھیں؟ جتنی اردو میں کہانیاں تھیں ان کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے' کہ انگریز کے سامنے رکھیں کہ دیکھو کہاں اس میں خرابی ہے' مجھے محمد حسین نے بلا لیا اور کہا دیکھ بات سن جیل میں جانا ہے' میں جیل بھجوا دوں گا۔
سوال : مفتی صاحب یہ بتائیں کہ ناول کی بات تو ہو گئی' آپ نے خاکے بھی بہت سارے لکھے ہیں ویسے تو یہ سب فکشن ہی میں آجاتا ہے' افسانہ بھی ناول بھی خاکہ بھی لیکن کبھی آپ کو لکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ آپ افسانہ لکھ رہے ہیں' خاکہ لکھ رہے ہیں یا ناول لکھ رہے ہیں؟
جواب : میں انسانی شخصیت میں دلچسپی رکھتا ہوں' شخصیت میں ایک بڑی بات ہے جسے ہم نہیں سمجھتے۔ جب ہم اسے سمجھ لیں گے تو اس روز تمام کائنات کا راز سامنے آجائے گا اور وہ ہے پولرائزیشن' خیر کا پہلو ہے تو اس کے ساتھ شر کا پہلو بھی لازم ہے۔
سوال : اپنی کتاب "اوکھے لوگ" میں آپ شخصیت کو ایسے اپروچ کرتے ہیں کہ جو وہ روبرو نظر آتی ہے اس سے متضاد ہوتی ہے جیسے دکھائی دیتی ہے' آپ اس کے الٹ کچھ اور چیز سامنے لاتے ہیں؟
جواب : پولرائزیشن ہے وہ بھی ہے' میں کیا کرتا ہوں' میں کوئی شخصیت نہیں لکھتا۔ شخصیت لکھنا کوئی آسان کام نہیں میں آپ کے ساتھ ایک سال رہوں تب جاکر مجھ پر کوئی راز کھلے گا' تو میں کیا کرتا ہوں کہ شخصیت کا جو بڑا رخ نظر آتا ہے وہیں ختم کر دیتا ہوں دوسرے رخ کی بات نہیں کرتا نہ اتنا وقت ہے نہ لوگ اس کے لئے تیار ہیں۔
سوال : آپ کی جو پہلی کتاب ہے خاکوں کی "پیاز کے چھلکے" میرا خیال ہے وہ جن لوگوں پر آپ نے لکھی ہے وہ آپ کے زیادہ قریب رہے ہیں؟
جواب : میرا جی پر میں نے بہت مختصر لکھا' بڑا گندا آدمی تھا۔ میں اس کی قابلیت کا قائل ہوں' اس نے SEX کی کتاب لکھی ہے "نگار خانہ" کیا خوبصورت ہے۔ میں ان سے جھگڑ پڑا' جھگڑا ہمارا اس بات پر ہوا

کہ میں نے کہا کہ آپ اپنا نام میرا جی کیوں نہیں بدلتے۔ کہنے لگا میرا نام ہی میرا جی ہے ہم تو ہیں ہی میرا جی' مجھے اس زمانے میں پتا نہیں تھا کہ میرا کوئی لڑکی ہے میں نے کہا کہ ٹھیک ہے: لیکن آپ اپنا اصلی نام تو بتائیں اس نے کہا کہ جی ہمارا کوئی اصلی نام نہیں۔ دوسری ملاقات بمبئی میں ہوئی اسے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ملا وہ بے چارا انتظار کرتا رہا کوئی ملے' شخصیت کے لحاظ سے بڑا آدمی تھا۔

سوال : سفرناموں کی بات بھی ہو جائے "ہند یاترا" "لبیک" اور "شاہراہ ریشم" لوگوں کا خیال ہے کہ حج پر جتنے سفرنامے لکھے گئے ان سے "لبیک" بالکل مختلف ہے یہ تو ایک تجزیہ تھا آپ کے حج کا جسے لبیک کی شکل میں لکھا گیا' کیا یہ سفرنامہ آپ پر وارد ہوا ہے؟

جواب : وارد نہیں ہوا۔ یہاں قاسم محمود تھا اس نے چٹھی لکھی کہ سیارہ ڈائجسٹ والے کہتے ہیں کوئی چیز مفتی سے قسطوں میں لکھوا دو' میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں نے کوئی چیز قسطوں میں نہیں لکھی' اس نے کہا کہ دو قسطوں میں لکھو میں نے حج پر لکھنا شروع کر دیا۔ تین چار قسطیں لکھیں وہ بڑھتا ہی گیا۔ چوتھی قسط چھپی تو قاسم کا فون آیا کہ اللہ کے واسطے بند کر دو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ یہ میرے مالک جو ہیں یہ مسلم لیگی لوگ ہیں انہیں بڑے جید مولوی ملے ہیں اور کہا ہے کہ یہ آپ کیا خرافات لکھوا رہے ہیں' انہوں نے کہا بند کردو۔ پندرہ بیس دن کے بعد قاسم محمود کا پھر فون آیا کہنے لگا کہ اللہ کے واسطے لکھو' میں نے کہا عقل کی بات کرو انہوں نے کہا لوگوں کے خط پہ خط آ رہے ہیں' میں نے کہا کہ تمہارے مالک تو مسلم لیگی ہیں اس نے کہا وہ کاروباری بھی ہیں۔

سوال : آپ نے محدود نقطہ نظر سے نہیں لکھا انسان پر جو روحانی تجربہ بیتا ہے اس حوالہ سے لکھا ہے؟

جواب : ہند یاترا جان بوجھ کر لکھی' اور مجھے شہاب نے کہا کہ آپ غلط بات لکھ جائیں گے' میں نے کہا کہ دیکھئے بات صرف بات ہے' مجھے نہیں پتا غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے میں نے جو دیکھا ہے وہ لکھا ہے میں ہندو سے بڑا متاثر ہوا۔

سوال : اس کی وجہ؟

جواب : اہل ہنود میں بڑی خوبیاں ہیں وہ بحیثیت قوم ہم سے بہتر ہیں' بحیثیت افراد ہم سے بہتر ہیں صرف ایک بات ہے کہ مسلمان کو برا سمجھتے ہیں اور اس کے دشمن ہیں۔

سوال : اس کی کیا وجہ ہے کیا اس کی سیاسی وجہ ہے؟

جواب : اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ذات پات کو مانتے ہیں' ہمیں ذات پات کا پتا ہی نہیں تھا اسلام جو ہے وہ ہندو ازم کے لئے زہر قاتل تھا۔

سوال : یعنی آپ سمجھتے ہیں کہ بدھ مت ان کے لئے چیلنج نہیں بنا مگر اسلام ان کے لئے بہت بڑا چیلنج بن گیا؟

جواب : وہ جس طرح بدھ مت کو ہضم کرگئے اسی طرح سکھ ازم کو بھی خاطر میں نہ لائے! وہ بڑے چالاک ہیں تاہم اسلام کو وہ جذب نہیں کر سکے۔

سوال : اسی لئے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں۔

جواب : سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ان کا ایک جذبہ بحیثیت قوم طے شدہ ہے۔ اور وہ ہے مسلم کشی

سوال : ہندوستان میں جو مسلمان ہیں آپ کے نزدیک ان کا مستقبل کیا ہوگا؟

جواب : وہ سچے مسلمان ہیں ہم سے بہتر مسلمان ہیں مسلمان ہمیشہ مصائب میں بیدار ہوتا ہے۔ مسلمان تکلیفوں میں باہر نکلتا ہے ہم تو عیاشی میں پڑے ہوئے ہیں' مسلمان کہاں ہیں۔
سوال : "ہند یاترا" لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ نے ہند کی جو حالت دیکھی اس کو نمایاں کیا جائے اس کا کیا ردعمل ہوا؟
جواب : مجھے علم نہیں لوگوں نے اسے کیا سمجھا کیا نہیں سمجھا! دوقومی نظریہ ایک حقیقت ہے۔
سوال : آپ سفرنامے کو کیا سمجھتے ہیں؟
جواب : میں سفرنامے میں مناظر کو اہمیت نہیں دیتا لوگوں کو اہمیت دیتا ہوں' میں جہاں بھی گیا تو وہاں بھی! مکہ مدینہ میں بھی لوگوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ انڈیا گیا تو لوگوں کی باتیں ہوتی رہیں' یہ کوئی غلط بات نہیں۔ شاہراہ ریشم گئے تو لوگوں کی باتیں کرتے رہے آپس میں۔
سوال : عام طور پر آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نقادوں سے بڑے ناراض ہیں؟
جواب : میں انہیں مانتا ہی نہیں
سوال : کیوں نہیں مانتے
جواب : اس لئے نہیں مانتا کہ دیکھئے نقد و نظر کو آپ بھی مانتے ہیں میں بھی مانتا ہوں' لیکن نقادوں نے اسے تخلیق سے زیادہ اہم بنا دیا ہے یہ غلط ہے' آپ ایک چیز لکھیں' اس کے بعد وہ بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں کیا خرابیاں ہیں' تخلیق کو مقام اولیت دیں۔ آپ دیکھیں کہ ایک پرچہ آئے گا اس میں پندرہ چیزیں ہیں کیا سارے لوگ ہمیں بتانے کے لئے بیٹھے ہیں کہ اس میں کیا کیا عیب ہے آیا نمک کم ہے یا پانی زیادہ ہے' نقاد اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ وہ عیب نکالیں۔ چیزیں تخلیق کرو ورنہ کل کس چیز پر بولو گے چیزیں تو ختم ہو جائیں گی۔
سوال : اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ تنقید کے خلاف ہیں۔ نقاد کے رویے کے خلاف ہیں؟
جواب : آج کل کی جو تنقید ہو رہی ہے اسی کے خلاف ہوں وہ اپنی اہمیت جتانے کے لئے بات کرتے ہیں
سوال : اچھا آپ کے خیال میں اردو تنقید میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟
جواب : میں تو پڑھتا ہی نہیں تنقید۔ کئی لوگ باتیں صحیح بھی کرتے ہیں لیکن کیوں اسے اولیت دی جارہی ہے۔ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ تنقید ہی سب کچھ ہے' تنقیدی رویہ اپنا لیں گے تو تخلیقی رویہ کمزور پڑے گا۔
سوال : آپ نے کہا کہ روحانی تجربے نے آپ کی تخلیقات کے رخ میں تبدیلی پیدا کی' بالواسطہ طور پر اشفاق احمد بھی کچھ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں روحانی رخ ہے اور آپ سے کوئی مختلف پہلو ہے؟
جواب : اشفاق صاحب سے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کہلوانا ایک تو وہ میرا قریبی دوست ہے دوسری یہ بات کہ خیالات مختلف ہیں' میں آپ کو بتاؤں کہ احمد بشیر اور میں جذباتی طور پر جیسے بھی پانی میں چینی ڈالیں تو شربت بن جاتا ہے لیکن ذہنی طور پر ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ جو کچھ کہتا ہے میں کہتا ہوں بکواس ہے جو میں کہتا ہوں وہ کہتا ہے بکواس ہے۔
سوال : اشفاق کے ساتھ خیالات کا اختلاف ہے؟

جواب : میرے بڑے اختلافات ہیں پہلا اختلاف یہ ہے کہ اگر وہ شہاب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو شہاب کی باتوں سے دور کھڑا ہوتا ہے! عملی طور پر دیکھئے میں اسے بہت قابل آدمی سمجھتا ہوں بہت قابل! میں خود سے چار گنا قابل سمجھتا ہوں اسے! اگر وہ خلوص سے ادب کی طرف توجہ کرتا تو آج بڑا مقام پاتا۔ اس نے یہ ظلم کیا کہ ادب لکھنا چھوڑ دیا ٹیلی ویژن پر چلا گیا اور باآواز بلند کہا کہ میرے لئے ادب چھوٹی اور محدود چیز ہے! میرے پیغام کو وسعت چاہیے اس لئے وہ ریڈیو پر چلا گیا دس پندرہ سال ادب کے لئے کچھ نہیں کیا میں نے اس سے کہا کہ ٹھیک ہے تو جہاں مرضی آئے جا مگر ادب کو نہ چھوڑ۔ یہ غلط ہے۔

سوال : باورچی خانہ چلانے کے لئے آپ کو بہت زیادہ کمرشل کام کرنا پڑا آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ کرنا پڑتا تو آپ کے ادب پر اور زیادہ مثبت اثر پڑتا؟

جواب : میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک ادب لکھنے کے لئے راستے میں رکاوٹیں حائل ہیں آپ زیادہ لکھ سکتے ہیں جس روز یہ رکاوٹ اٹھ گئی لکھنے کا عمل ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

سوال : آپ علم کا بڑا مذاق اڑاتے ہیں لیکن آپ کے افسانوں میں علم ہے۔

جواب : میں اس علم کا مخالف ہوں جو دشمنی پیدا کرتا ہے ایک ماسٹر ہے کسی علم کا وہ نفرت پیدا کرتا ہے' کسی عالم دین کو دیکھ لیں وہ خدا بن کر بیٹھ جاتا ہے علم آپ میں محبت پیدا نہیں کرتا ہمدردی پیدا نہیں کرتا' چھوٹے آدمی کے لئے آپ کے دل میں گرمی پیدا نہیں کرتا تو ایسا علم بے کار ہے۔ علم بڑی خشک چیز ہے اس کی افادیت کو مانتا ہوں یہ آپ پر حاوی ہو جائے گا۔ کیا کیا آج تک ہمارے علماے دین نے ہمارے ساتھ نہیں کیا۔ ہمیں اسلام کی طرف نہیں جانے دیا خدا بن کر بیٹھ گئے خیالات کا اختلاف برداشت نہیں کرتے۔

سوال : جس زمانے میں آپ نے لکھنا شروع کیا اقبال اس وقت برصغیر کی بڑی فکر کے طور پر موجود تھا آپ پر کوئی اس کا اثر ہوا؟

جواب : میں اقبال سے اس لئے مستفید نہ ہو سکا کہ میں نے فارسی نہیں پڑھی

سوال : آپ کی کوئی ملاقات ہوئی ان سے؟

جواب : جی دو مرتبہ ہوئی میں گیا وہ لیٹے ہوئے تھے' میں معمولی سا آدمی تھا کالج کا ایک لڑکا' گیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا میں سمجھتا تھا کہ یہ بزرگ ہے مگر وہ تو بات کرتا ہی نہیں تھا وہ اپنے عالم استغراق میں تھا دونوں دفعہ یہی ہوا۔ آج سمجھتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ کوئی شخص اقبال کو نہیں سمجھ سکا' اقبال کی روحانی زندگی سے متعلق اسے علم نہ ہو مگر اس میں روحانی زندگی تھی! کس کی اس نے بیعت کی! جب وہ لندن سے نیا نیا آیا تو وہ انگریز تھا لباس اس کا انگریزی تھا بات اس کی انگریزی تھی! آتے ہی اس نے جتنی نظمیں لکھیں وہ انگریزی نظمیں تھیں۔ پھر کب کہاں تبدیلی ہوئی۔

سوال : وحید الدین نے دو کتابیں لکھی ہیں روزگار فقیر کے نام سے اس میں اس طرح کے بہت سارے واقعات ہیں۔

جواب : صرف اشارے ہی ہیں

سوال : قائد اعظم سے آپ کی کوئی ملاقات ہوئی؟

جواب : جی نہیں!

سوال : تحریک پاکستان سے بھی کوئی تعلق ہے آپ کا؟

جواب : کوئی نہیں!
سوال : اس زمانے میں آپ کیا سوچ رہے تھے جب یہ تحریک چلی تھی؟
جواب : کچھ نہیں! میں کہتا تھا یہ کیا ہو گیا ہے' پاگل ہو گئے ہیں۔ ایک الگ ملک مانگ رہے ہیں میں سیکولر خیالات کا مالک تھا مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی' صاف صاف بات ہے۔
سوال : یہ جو ہندوؤں کے تعصب کی بات ہے فسادات کے نتیجہ میں آپ کے ہاں یہ تاثر آیا؟
جواب : بالکل فسادات کی وجہ سے میں نے کہا کہ چاہے میں دل سے مسلمان ہوں چاہے زبانی ہوں لیکن ان کے لئے مسلمان ہوں' فسادات کے حوالے سے ہمارے ہاں سب لوگوں نے اس زمانے میں کہانیاں لکھی منٹو نے شہاب نے ہر ایک نے۔
سوال : آپ کی بھی کہانیاں ہیں' آپ بھی فسادات کے عمل سے گذرے ہیں یا لاہور میں تھے۔
جواب : میں لاہور میں تھا اور وہاں جو گاڑیاں آتی تھیں وہ دیکھتا تھا۔
سوال : آپ اس زمانے کی اپنی کون سی کہانی کو نمائندہ سمجھتے ہیں؟
جواب : میں نے ایک کہانی لکھی' وہ تھی جب میں بچوں کو ۳۰ ستمبر کو لایا تھا بٹالہ سے' اس پر کہانی لکھی اس کے پہلے باب کا عنوان ہے "نہیں" کہ کبھی میرے دل میں خیال آیا کہ میں مسلمان ہوں' مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کہا تھا نہیں۔ تو اس کا نام "نہیں" تھا۔
سوال : آپ جب کوئی تخلیقی تحریر لکھتے ہیں تو کس ماحول اور عمل سے گذرتے ہیں؟
جواب : بابا بات یہ ہے کہ میرے لئے ایک بات مشکل ہے اور وہ یہ ہے کہ سنٹرل آئیڈیا کیا ہوتا ہے' اس کے اردگرد مصنوعی طور پر کہانی بناتے ہیں' سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو کیا کچھ کہنا ہے۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں پہلے نہیں کہا گیا' یہ نئی بات ہے تیسرا یہ ہے کہ اگر یہ نئی بات نہیں تو کوئی انداز نیا' کوئی رخ نیا' کچھ تو ہو اس کے بعد کہانی لکھتے ہیں۔ میری ساری کہانیاں مصنوعی ہیں تو پھر مواد اکٹھا کرکے کوشش کرتا ہوں۔ ضروری بات نہیں کہ میں ہر کہانی میں کامیاب ہو جاؤں۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ میں نہیں کہہ پاتا وہ آپ تک نہیں پہنچتا۔
سوال : مرکزی آئیڈیا تو فلیش کرتا ہوگا؟
جواب : فلیش نہیں کرتا' مرکزی آئیڈیا' میرے پاس بے شمار ہیں' میرے SEX کے جتنے آئیڈیے ہیں وہ مرکزی ہیں اس پر کہانی بنی نہیں جاتی' اس کے بعد مجھ پر ایک اور بات عائد کر دی گئی کہ اللہ کا نام لو۔ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤ' میں یہ کرتا ہوں۔
سوال : یہ کس نے کہا؟
جواب : یہ شہاب نے کہا۔ اس نے کہا شرم کرو کمینے آدمی' عورتیں ہی عورتیں' میں نے ان سے کہا کہ عورت کی بات کیا معمولی ہے۔ میں اس کا (شہاب کا) مرید ہوں مگر میں نے اس کی کسی علمی بات کو سیدھا قبول نہیں کیا۔ میں نے اس کی اکثر باتوں کو مسترد کیا۔ میں اس پر اکثر تنقید کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ جو آپ کا مقام ہے' آپ کا برتاؤ ہے' ایسا برتاؤ کرنے میں آپ اچھے نہیں لگتے۔ میں نے کہا کہ آپ کیا کر رہے ہیں آپ اشفاق کو شہ دے رہے ہیں کہ آؤ ڈرامے لکھیں! آپ کا خیال ہے یہ رویہ اسلام پیدا کرے گا؟ یہ اسلام کے لیے جذبہ پیدا کرتے ہیں! یہ ری ایکشن پیدا کرتے ہیں۔

سوال: بعض اوقات آپ منصوبے کے ساتھ کام کرتے ہیں یعنی دو تین آدمی مل کر ایک تصور کو لکھتے ہیں مثلاً ضیاء کے زمانے میں آپ نے اشفاق نے' بانو قدسیہ اور پروین عاطف نے افسانے لکھے' افراط زر پر اور فیشن پسندی پر' تو کیا مل کر آپ نے یہ فیصلہ کیا تھا؟

جواب: نہیں نہیں مل کر فیصلہ نہیں کیا' لیکن یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات کو صبح شام سنا مثلاً افراط زر پر میں نے جو لکھا ہے وہ چھپا ہی نہیں۔

سوال: آپ یہ بتائیں کہ کہانی لکھنے کا آپ کا کیا طریق کار ہے۔ کیا آپ ایک ہی نشست میں کہانی لکھتے ہیں؟

جواب: پہلے پکا کرتا رہتا ہوں' ڈھونڈتا رہتا ہوں اور سینٹرل آئیڈیا ملتا ہے تو اس کے بعد کہانی کو جوڑتا رہتا ہوں! آٹھ دن گذر جاتے ہیں پھر کہانی لکھتا ہوں ایک نشست میں نہیں لکھ سکتا جب میں ہاتھ سے لکھتا ہوں تو میرا ہاتھ تھک جاتا ہے دو چار صفحے آج لکھ دیئے دو چار کل پرسوں لکھ دیئے۔

سوال: پھر اس کو ٹھیک بھی کرتے ہیں؟

جواب: نہ! میں فیئر نہیں کرتا' اسے تبدیل کرتا ہوں مثلاً یہ کہنا چاہتا تھا اور یہ جملہ لکھا ہے۔

سوال: ایسی تحریریں جہاں ایک ہی بار بات بن گئی ہوں؟

جواب: نہیں یہ بہت کم ہوا ہے' ایک بات کہنا چاہتا ہوں یہ بڑے کام کی بات ہے جو لوگوں کو سمجھ نہیں آتی' یادیں کیوں آتی ہیں؟ جتنی آپ دیکھیں گے شام کو آئیں گی پھر ایک عجیب بات ہے کہ شام کو چیخوں والی موسیقی آتی ہے درد والی نہیں آتی آپ نے دیکھا کبھی' رات بھیگتی جائے گی درد والی موسیقی آتی جائے گی' کہانی لکھ کر اسے ختم کیسے کروں پھر اس کے آگے جو کیا وہ جھک ماری۔

سوال: آپ نے زیادہ تر جو کہانیاں لکھی ہیں وہ ساری کی ساری اس اردو زبان میں ہیں جو رواں چلی آرہی ہے لیکن بعض کہانیاں آپ نے ہندی محاورے میں لکھی ہیں' اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ کئی موضوعات ایسے ہیں جسے یہاں کا ماحول برداشت نہیں کرے گا آپ دیکھیں یہاں کا جو ماحول علماء نے پیدا کیا ہے اس میں بہت سی باتیں آپ نہیں کہہ سکتے' لازماً" پھر ہندی کا سہارا لینا پڑتا ہے' مجھے کوئی ہندی سے دلچسپی نہیں ہے۔

سوال: ہندی آپ نے باقاعدہ پڑھی ہے؟

جواب: بالکل نہیں' ہندی کو پسند بہت کرتا ہوں

سوال: اردو انگریزی کے علاوہ اور کون سی زبان آپ کو آتی ہے؟

جواب: کوئی بھی نہیں انگریزی تو اک علم ہے' انگریزی فکشن کوئی چیز ہے!

سوال: جو افسانہ آپ نے لکھا' اور آپ کے بعد جو افسانہ نگار آئے تو کیا آپ افسانے کی رفتار سے مطمئن ہیں؟

جواب: یہ بات مجھ سے نہ پوچھیئے مجھے کوئی اختیار نہیں۔ جو نئی کہانیاں لکھی گئیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ خالدہ حسین کو میں نہیں پڑھ سکتا۔ آپ کیوں اسے علامت میں لاتے ہیں' علامت بڑی خوبصورت اور حسین چیز ہے' علامت تو اوپر لگائی جاتی ہے آپ پاؤں کے نیچے لگا رہے ہیں' علامت تو شعر و سخن کی چیز ہے' میں کون ہوں کہ کہوں فلاں شخص کی کہانی کیسی ہے؟

سوال: آپ کے اپنے زمانے میں جو ترقی پسند لوگ کہانی لکھ رہے تھے ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ترقی پسندوں میں کچھ لوگ قابل ضرور تھے۔ اچھا کام کرتے تھے مگر عام طور پر جو رویہ تھا وہ واہیات قسم کا تھا۔ ترقی پسندی ایک تحریک تھی جو باہر کے ملک سے چلی اور ہمارے ہاں آئی جس کی بنیاد روس میں کمیونزم کی کامیابی تھی۔ انہوں نے اپنا نام ترقی پسند رکھا' اس میں کسی قسم کا خلوص نہیں۔ کہتے ہیں آپ ترقی پسند نہیں ہیں یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے' یہ لوگ کسان کو چھوڑ کر مزدور کو اٹھا رہے ہیں میں مزدور اور صنعتی انقلاب کے خلاف ہوں میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں امن چاہتے ہیں تو زرعی انقلاب لائیں ایک دن آرہا ہے روٹی کھانے کو نہیں ملے گی۔ آج روس میں نہیں تو کل امریکہ میں نہیں ملے گی۔ ہم زراعت سے باہر نکل آئے ہیں آپ موسم کو نہیں دیکھیں گے تو اللہ سے دور ہو جائیں گے۔

سوال: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ حلقہ ارباب ذوق کے ہمارے ادب پر کوئی مثبت اثرات ہیں؟

جواب: حلقہ ارباب ذوق کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ایک پلیٹ فارم دیا اور اس میں کوئی بندش نہیں تھی کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں' یہ بڑی خوبی ہے اس میں!

سوال: آپ جنسی مسائل پر لکھتے ہیں لیکن بات کرتے ہیں روحانیت کی؟

جواب: میں ڈگڈگی بجاتا ہوں۔ میں اللہ کی بات کرتا ہوں۔ لیکن بڑی چالاکی سے کرتا ہوں کہ آپ محسوس نہ کریں کہ میں کیا کررہا ہوں۔

سوال: ہمارے ہاں جو رسالے نکلتے رہے ہیں وہ شخصیات کے حوالے سے نکلے ہیں کسی ادارے سے نہیں' شخصیات کے حوالے سے ان کی پسند ناپسند ذاتی ہو جاتی ہے آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: یہ شخصیات کے اثرات نہیں' تنگ دلی ہے' ادب کے ساتھ خلوص نہیں۔ کوئی بات لکھو جو ایک پارٹی کو گوارہ نہیں تو وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو وہ اپنے پرچے میں نہیں چھاپیں گے۔ چھوٹی سی بات بتاتا ہوں آپ برا مانیں گے مگر بالکل سچی بات ہے' ایک اجلاس ہوا وہاں. آغا صاحب نے کہا میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ آپ نے کوئی کہانی وغیرہ نہیں بھیجی' میں نے کہا میں کہانی اسے بھیجتا ہوں جو مجھے ایک پوسٹ کارڈ لکھے۔

سوال: قاسمی صاحب نے لکھا؟

جواب: انہوں نے ایک خط لکھا ہے زندگی میں' مجھے جب انکا پرچہ ملتا تھا تو میں قاسمی کو خط لکھتا تھا کہ قاسمی جی اپنے ڈسپیچر کو سمجھائیں اس نے مجھے ایک پرچہ اعزازی بھیج دیا۔ قاسمی مجھے کیوں چھاپے میرا کوئی گروپ نہیں فردواحد ہوں' میں کیوں کھڑا ہوں؟ یہ معجزہ ہے میری کوئی حیثیت نہیں۔

سوال: بچوں کے حوالے سے آپ نے کچھ لکھا؟

جواب: بچوں کی کتابیں نہیں لکھیں بچوں کے لئے کچھ نہیں لکھا۔ ایک دن مجھے ثاقبہ نے کہا کہ کہانی لکھ دو' میں نے لکھ دی' ادبیات اور ماہ نو کا کوئی مقصد نہیں۔ خیالات ابھارنے کا سرکاری پروپیگنڈہ ہیں اب وہ صرف ادیبوں سے رابطہ کے لئے چل رہے ہیں۔

سوال: اردو زبان کا مستقبل؟

جواب: میرا کوئی نقطہ نظر نہیں ہے اردو سارے پاکستان نے قبول کر لی ہے اگر کچھ لوگ نہیں مانتے تو اس

کی سیاسی وجوہات ہیں اردو آج تک سرکاری زبان کیوں نہیں بنی؟ سرکاری وجوہات ہیں۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے تو وہ قبول کر چکے ہیں۔

سوال: سیاسی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: یہ سیاست ہے' کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اردو سرکاری زبان نہ بنے۔ اس میں کیا فائدہ ہے ان کا' مجھے نہیں معلوم' بے بہرہ آدمی ہوں سیاست سے بے بہرہ ہوں۔ سندھ بھی اردو کے خلاف نہیں ہے ہم کئی مرتبہ سندھ کے دیہات میں گئے ہیں انہوں نے کوشش کی ہے اردو میں جواب دینے کی۔

سوال: کیا اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کا کوئی تضاد ہے؟

جواب: سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ جو اردو بولنے والے لوگ یہاں آئے انہوں نے اردو کو ہتھیار کے طور پر اپنایا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں سپیریئر کلچر کی ضرورت ہے ان کی بات بجی تھی۔ ان کا کلچر ادب میں آنا چاہئے ورنہ ان کی تہذیب ختم ہو جائے گی' میں یہ سمجھتا ہوں اردو بڑی زبان ہے اردو پاکستان ہندوستان تک محدود نہیں ساری دنیا میں بھی بولی جاتی ہے اردو زبان والوں کو اسے ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ آج جو چیزیں اردو میں متعارف ہو رہی ہیں وہ بین الاقوامی معیار سے بھی اونچی ہیں ہمارا ادب کسی صورت میں کم تر نہیں ہے ہمارا مزاج کسی اور رنگ کا ہے اور اہل زبان کا کسی اور رنگ کا۔

سوال: کیا اس رویہ میں تبدیلی نہیں آرہی؟

جواب: گذارش یہ ہے برتری اندر سے نہیں گئی باہر سے چلی گئی ہے۔ میں آپ کو ایک قصہ سناؤں آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ ہوا یہ کہ میں اشفاق کے پاس گیا کہ یار مجھے اردو زبان نہیں آتی اور میں پھنس گیا ہوں مجھے اردو زبان میں لکھنا ہے' تو مجھے چند ایسے الفاظ کی فہرست بنا دے جو اردو میں بھی مستعمل ہوں اور پنجابی میں بھی اس بے وقوف نے باقاعدہ کتابچہ بنا دیا۔ اسے چھاپ دیا اس کتابچے کا نام رکھا "اردو کے خوابیدہ الفاظ" اس زمانے میں میرا بھی اردو بورڈ سے تعلق تھا۔ میں ایڈیٹر تھا تو جب میٹنگ ہوئی تو اس بورڈ کے جو ممبر تھے ان میں زیادہ تر لوگ اہل زبان تھے۔ انہوں نے یہ کتاب دیکھی اور کہا آپ نے یہ کتاب کیوں چھاپی' اشفاق نے کہا کہ کچھ لوگ جو پنجاب کے رہنے والے ہیں اور اردو سے اچھی طرح واقف نہیں ان کے لئے آسانی ہو جائے گی انہوں نے کہا کیوں؟' اس نے کہا کہ یہ لفظ ایسے ہیں جو دونوں زبانوں میں مستعمل ہیں' انہوں نے کہا آپ کو کس نے کہا کہ دونوں زبانوں میں ہیں' اس نے کہا کہ نوراللغات میں سے میں نے یہ فہرست بنائی ہے' انہوں نے کہا کہ کیا نوراللغات آج بھی اتھارٹی ہے؟ ہم نے ان لفظوں کو متروک کر دیا ہے۔

سوال: آپ کی مادری زبان پنجابی ہے آپ نے کبھی پنجابی میں بھی لکھا ہے اگر نہیں لکھا تو کیوں نہیں لکھا؟

جواب: نہیں جی میں نے نہیں لکھا میں لکھ نہیں سکتا پنجابی میں' دو سبب ہیں ایک تو صوفیا کا کلام' آج بھی جہاں پنجابی کا شعر دیکھتا ہوں لازما" پڑھتا ہوں مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔ پڑھتا ہوں سٹائل اچھا ہے۔ ایک آدمی نے جلسے میں کھڑا ہو کر کہا آپ پنجابی کیوں نہیں لکھتے میں نے کہا میری مرضی!

سوال: کیا ہم پاکستان میں لکھے جانے والے ادب کو پاکستانی ادب کہہ سکتے ہیں؟

جواب: ادب ہے' ٹھیک ہے ادب میں جو پیغام دیا گیا ہے وہ ادب سے ہٹ کر ہے۔ اگر وہ پیغام اسلام کا پیغام ہے۔ تو وہ تو پیغام ہے۔ اس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں اگر تحریر ادب ہے تو اس کے اندر جو پیغام ہے

وہ چاہے ہندوؤں کے حق میں ہو اس سے آپ کو کوئی تعلق نہیں۔
سوال : کیا آپ خیال کو ادب سے الگ چیز سمجھتے ہیں؟
جواب : میرا مطلب مرکزی خیال ہے۔ میں اس پر ایک کہانی لکھتا ہوں۔ مرکزی آئیڈیا کی کیفیت بعد میں آئے گی۔ آپ دیکھیں میری ساری تحریر ادبی ہے آپ میرے مرکزی خیال سے نہیں اتفاق کرتے نہ کریں۔
سوال : ہندی الفاظ کے استعمال کے بارے میں آپ کیا کرتے ہیں؟
جواب : ہندی بھی ادب ہے یقیناً" یہ بھی ادب ہے' میں نے جس زمانے میں تعلیم پائی ہے ہندی کے الفاظ آتے تھے ہندی ہندوؤں کی تو نہیں بابا' انہوں نے کہا اردو مسلمانوں کی ہے یہ غلط بات ہے۔
سوال : کیا ہندی ادب میں ہندو پیغام اور پاکستانی ادب میں اسلامی پیغام ہے؟
جواب : نہیں' اگر ہے تو وہ دوسری بات ہے۔
سوال : فرق ہم کیسے کریں گے؟
جواب : میرے دور میں' میں آپ کو بتاؤں کہ ہندی کے لفظ بہت آتے تھے اور میں یہ پسند کرتا تھا کہ فارسی کی آمیزش نہ ہو ہندی کی ہو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہندی میں موسیقیت ہے' اتنی خوبصورت چیز بند کر دی۔
سوال : کوئی فرق لسانی سطح پر پڑا؟
جواب : یہ مجھے نہیں پتا میں نقاد نہیں۔ سچی بات ہے میں اپنے تاثرات آپ کو بتا رہا ہوں۔
سوال : آج کل آپ کیا کر رہے ہیں
جواب : ایک کتاب لکھ رہا ہوں' مجھ پر عائد کیا گیا کہ کتاب لکھوں۔ وہ کتاب مجھے لکھنی آتی نہیں میں ہمیشہ عقیدت میں پھنسا رہا مجھے آخری دم تک شہاب کہتا رہا کہ عقیدہ پر لکھو اس کے فوت ہونے کے بعد مجھ پر عائد کر دیا گیا کہ عقیدہ پر ایک کتاب لکھو۔ میں الو کا پٹھا بنا بیٹھا ہوں مجھے سمجھ نہیں آتی اگلے کہتے ہیں کہ لکھنی پڑے گی۔
سوال : فارم کی سمجھ نہیں آرہی ؟
جواب : فارم کی سمجھ نہیں۔ عقیدہ تو سمجھ گیا' عقیدہ وہ نکلا جس کو ہمیشہ برعکس سمجھتا رہا' میں سمجھتا تھا کہ عقیدہ بھی کچھ ہے' اور عقیدہ جب میں نے پڑھا شہاب کی وفات کے بعد تو پتا چلا کہ عقیدہ ایک ہے۔ مجھے پتا چلا کہ مسلمان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ منکے پھیرے وہ اس لئے پیدا ہوا کہ دنیا پر حکومت کرے' میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ میری شرمندگی کی .ایک داستان سنیں کہ ۱۹۸۴ء میں مجھے کتنی اہم بات کا پتا چلا جو مجھے پتا چلنا چاہئے تھا شروع میں جب جوان تھا۔ میں مثال دے رہا ہوں مثلاً مجھ میں شدت ہے میں شدت کو خوبی سمجھتا رہا میں نے کہا کہ جس میں شدت نہیں اس میں خلوص نہیں۔ مجھے شہاب نے کئی مرتبہ سمجھایا کہ یہ غلط ہے' میں نے کہا کیوں اس نے کہا مثلاً ایک آدمی بزرگ تھا وہ بات کھل کر کہہ دیتا تھا۔ میں نے کہا یہ کیا کہ وہ بات کھل کر کہہ دیتا ہے۔ آپ بات ہی نہیں کرتے کھل کے بات کرنا نااہلیت ہے مثلاً وہ کہتا تھا جذبہ نااہلیت ہے میں نے کہا جذبہ نااہلی کیوں ہوتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے رجنیش ایک آدمی ہے اس کا ایک ٹیپ آگیا۔ اس کے ایک ٹیپ نے مجھ پر جادو کر دیا اس کا ٹیپ سننے کے بعد شدت سمجھ میں آگئی۔ یہ بات مجھے جوانی میں پتا چلتی آخر میں ایک آدمی ہوں۔

سوال : ۸۶ء میں بھی تو آپ جوان تھے؟
جواب : میں نے سب کچھ پڑھا ہے ایک بنیادی بات مجھے ۹۰ء میں کیوں پتہ چلی اس پر حیرت ہے۔
سوال : عقیدے پر لکھنے کے علاوہ آپ کے اور کیا پراجیکٹ ہیں؟
جواب : کوئی پراجیکٹ نہیں میں تو اب جارہا ہوں!
سوال : افسانوں کا مجموعہ؟
جواب : چھپ کر آنا تھا جنوری میں' جنوری ۱۹۹۱ء میں لیکن انہوں نے تاخیر کر دی
سوال : آپ کو اتنے سارے ایوارڈز اور اعزازات بھی ملے ہیں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟
جواب : میں یہ محسوس کرتا ہوں لبیک لکھنے کے بعد مجھ پر ایک عطا ہوئی۔ میں نے خود نہیں حاصل کی اس سے پہلے مجھ پر کیسے عطا ہوئی I dont know مجھے اس کا شعور بھی نہیں ہوا' حالانکہ میں نے اس کے لئے کوئی محنت نہیں کی اس کے بعد کیا ہوا کہ مجھے بغیر کسی وجہ کے نیک نامی مل رہی ہے شہرت مل رہی ہے۔ یہ میری وجہ سے ہے پتا نہیں کسی اور کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں روحانی طور پر ہیں مجھے تین مدیں مل رہی ہیں ایک رزق کی جب میں ریٹائر ہوا تو پینشن ۲۰۷ روپے تھی اب ۸۵۰ دوسرے مجھے تیسرے مجھے نیک نامی اور شہرت مل رہی ہے مجھے اتنے خط آتے ہیں کہ مجھے اب چاہیے کہ پیر بن جاؤں۔
سوال : آپ اپنی بیعت کرائیں۔
جواب : ہاں اللہ کی قسم مجھ سے عقیدت مند اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے میرے جیسا بزرگ پیدا ہی نہیں ہوا۔
سوال : ہومیو پیتھی کا بھی بڑا شوق ہے آپ کو!
جواب : کوئی تخلیقی نہیں' مجھے تکلیف تھی تکلیف میں مجھے ایک دوا دی گئی' اس دوا نے جادو کا اثر کیا میں بڑا حیران ہوا کہ یہ کیسے! میں نے کہا دیکھوں کیا چیز ہے' میں نے سات آٹھ سال پڑھی۔ میں ہومیو پیتھک ذہن کا نہیں۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ باقی سب کام چھوڑ دو۔ میں اپنی دوائیاں خود کھاتا رہتا ہوں جس روز میں نے یہ خیال کیا کہ یہ گفٹ میں نے خود حاصل کئے ہیں اس روز میں ختم ہو جاؤں گا۔
سوال : آپ کے ابتدائی زمانے میں آپا کا بہت ذکر ہوا اس کے بعد بھی کسی کردار نے آپ کو متاثر کیا؟
جواب : کردار---- بڑے کیریکٹر میں نے لکھے لیکن لوگوں کی سوئی جب اٹک جائے تو کیا کریں حالانکہ آپا ایک ایسا کردار ہے جو آج زندہ ہو جائے تو قابل نفرت ہو جائے اس کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں!
سوال : کوئی نام
جواب : نام اس وقت نہ پوچھیں' میرا ذہن دھندلایا ہوا ہے میں سوچ کر نام بتا سکتا ہوں میں نے بڑے بڑے کردار لکھے لیکن لوگوں کی سوئی وہاں نہیں اٹکی۔
سوال : یہ کردار آپ کے دیکھے بھالے بھی ہوں گے؟
جواب : تخلیق نہیں کئے تخلیق واقعات کرتے ہیں کردار نہیں کرتے کردار نظر آجاتے ہیں۔
سوال : اسلام آباد کی دفتری زندگی کو آپ نے بہت کم موضوع بنایا ہے؟
جواب : اس لئے نہیں کیا کہ یہاں ایک چیئر ہے ایک افسر ہوتا ہے ایک کتاب ہے جسے ہر دفتری آدمی کو پڑھنا چاہئے اس کتاب پر کہانیاں لکھی ہیں۔

سوال : یہ کیسا موضوع تھا؟

جواب : یہ تو ماحول کی بات ہے اس میں' میں نہیں رہا' میری گذارش ہے کہ غلطی سے اس طرف چلا جاتا ہوں میں کہتا ہوں آپ اپنی "میں" سے باہر آجائیں گنبد سے کھڑکی نکالیں میں آج کل کہانی لکھ رہا ہوں "کھڑکی"

سوال : آپ نے اپنا جو خاکہ لکھا ہے اس کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب : میں لکھنا تو چاہتا تھا بہت سی برائیاں مگر مجھے چاہئے تھا کہ ساری خوبیاں بھی لکھتا کہ بیلنس ہوتا' وہ نہیں کیا میں نے؛ اپنی بنیادی برائیاں جنہیں مثلاً میرا ہاتھ ہے جب بھی کسی کو خیرات دینے کا وقت آتا ہے تو یہ پیچھے ہو جاتا ہے دل کہتا ہے کہ یہ چیز دے دو لیکن ہاتھ پیچھے جاتا ہے مجھے ایک چیز اللہ نے خاص طور پر دی ہے ذاتی تجربہ جب میں آپ سے بات کررہا ہوں تو پیچھے ایک بندہ کھڑا ہوتا ہے کہتا ہے جھوٹ بول رہا ہے تو بکواس کررہا ہے تو اس پر اچھا اثر ڈالنے کی کوشش کررہا ہے۔

ممتاز مفتی

ایک ذاتی خاکہ

اس وقت اپنا یہ عالم ہے کہ اعضا بے رحمی کے گھگھے کو آوازیں دے رہے ہیں' کہتے ہیں ۸۶ سال سے ہم دن رات ٹک ٹک کررہے ہیں نہ کبھی جمعے کی چھٹی ملی ہے نہ عید شب رات کی اب بس کرو بہت ہو لیا ہم پر "قلم" بند کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہے کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کررہا ہوں کہ کب گاڑی آئے اور میں آپ کو ٹا ٹا کرکے رخصت ہو جاؤں' جناب والا میری تحریر اور شخصیت کے متعلق چند خوش فہمیاں چل نکلی تھیں سوچا رخصت ہونے سے پہلے احوال واقعی قلم بند کر جاؤں۔ حال ہی میں میں نے اپنی تحریر اور شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ عنوان ہے چھوٹا۔

ممتاز مفتی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے' سیانے کہتے ہیں دو جگہوں سے دیکھو تو ٹھیک سے نظر نہیں آتا:

دور سے!

بہت قریب سے!

چونکہ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے مضمون سند نہیں ہے۔

مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے بلکہ معذرت ہے' اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے بن گیا۔ تالی بج گئی۔ یوں زندگی بھر لکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اسے اردو زبان نہیں آتی۔ اس کی تحریر کی Roots اردو ادب میں نہیں ہیں' اس نے کبھی شعوری طور پر ادب کے لئے نہیں لکھا۔ اس نے اردو ادب پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ہی ادب کی خدمت کی ہے۔ الٹا اہل ادب نے مفتی پر احسان کیا ہے۔ اسے ادیب کا مرتبہ بخشا۔ اہمیت عطا کر دی۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔

اس کے گھر میں کسی کو ادب سے خصوصاً" اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں ہے بیٹے میں بڑی صلاحیت تھی لیکن اس نے کہا میں خود! میں خود! جیسے جان دار ضدی بچے کہا کرتے ہیں مطلب تھا میں اپنا راستہ خود تلاش کروں گا۔ پٹے ہوئے راستے پر چلنا گوارا نہیں۔ یہ تو بیٹے کا باپ سے تعلق ہے' بیوی کہتی ہے کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اب بھی توبہ کر لے۔

دوست کہتے ہیں۔ تجھے تو سچ کے زعم میں خود کو سربازار رسوا کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ نہ نہ نہ ہمیں معاف ہی رکھنا خبردار ہمارا تذکرہ نہ کرنا۔

مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے

اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں
ایک وہ جو جان بوجھ کر "اتراتا" الگ رہنا پسند کرتے ہیں محفل لگ جائے تو ڈوب نہیں تیرتے رہتے ہیں۔

دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے' ہیں کتراتے ہیں' لگ جائے تو ڈوب جاتے ہیں۔ مفتی دوسری قسم کا اکیلا ہے اگر آپ مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد آکر دروازہ کھولیں مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہوگا جیسے ابھی ابھی روزگارڈن کی سیر کرکے آیا ہو۔

دروازہ بجے تو مفتی کا دل ڈوب جاتا ہے۔ کوئی آگیا' ظاہر ہے جو ڈرتا ہو کہ کوئی آنہ جائے تو وہ مہمان نوازی کیسے کرے گا۔

مفتی نے کسی مہمان کو کبھی ٹھنڈا یا گرم نہیں پوچھا۔ جب مہمان چلا جاتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ اوہ ٹھنڈا گرم تو پوچھا ہی نہیں۔ یاد ہی نہیں رہا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے جس کا پنجابی میں ترجمہ یوں ہو گا "تریا نہ جائے تے پھٹے منہ گوڈیاں دا" لوگ انتظار کرتے ہیں کہ کب مہمان آئے اور وہ کھانا کھائیں' مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان جائے اور وہ کھانا کھائے' مفتی کو غصہ بہت آتا ہے۔ وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے دھول اڑاتا ہے' سدھ بدھ رہنے نہیں دیتا۔

عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ ایک خنجر ہے جو انسان اپنے ہی دل میں بھونک دیتا ہے۔ دوسرے کی خطا پر خود کو سزا دینے کا نام ہے خود کو چاٹی میں ڈال کر بلوہنے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود' مان لینے کے باوجود وہ آج تک خود کو چاٹی میں ڈال کر بلوہنے پر مجبور ہے۔ صاحبو ہائے کیا چیز ہے بسی ہوتی ہے۔ عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا رویہ کھٹ مٹھا ہے جسے انگریزی میں Love hate relationship کہتے ہیں' مفتی میں رڈار قسم کا ایک ریسور لگا ہوا ہے قرب و جوار میں کوئی عورت آجائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر وہ بانکی نار ہو تو ٹٹاوں ٹٹاوں کرتا ہے

مفتی کو ہر راہ چلتی عورت سے عشق ہے بلا لحاظ حسن خدو خال اور سٹیٹس' گورے رنگ پر تو اس کی جان نکلتی ہے دقت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آجائے تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ لوہیٹ رلیشن شپ اس لئے پیدا ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا وہ اس کی سوتیلی ماں تھی وہ بڑی حسین اور بارعب خاتون تھی۔

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں لیکن بڑی دیر کے بعد اسے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے کے عمل سے محبت تھی۔ اس کیفیت سے محبت تھی محبوب سے نہیں۔ محبوب کی حیثیت تو ضمنی تھی۔

اس کے نزدیک محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے خدو خال اہم نہیں۔ رنگ گورا ہو۔ عمر رسیدہ ہو۔ طرار ہو' جسم بھرا بھرا ہو' سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب میں ہرجائیت کی واضح دھونس ہو۔

مفتی کسی نیک یا وفا شعار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں کہتا ہے محبت لگانا ایک فن ہے یہ آج کل کی کھٹی مٹھی لڑکیاں کیا جانیں کہ محبت کیا چیز ہے مفتی کے نزدیک محبت میں ممتا کا ہونا ضروری ہے ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ ہرجائیت کی دھونس ہو تو سبحان اللہ۔

اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے وہ سمجھتا ہے کہ طوائف تن کے تقاضے سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے صرف من کی لگن کی بھوکی ہوتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔

اللہ میاں سے مفتی کے تعلقات ادلتے بدلتے رہتے ہیں بچپن میں وہ اللہ سے خوف زدہ رہا۔ سمجھتا رہا تھا کہ اللہ نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے اور اس کا من بھاتا شغل یہ ہے کہ لوگوں کو اس بھٹی میں جلائے۔

پڑھ لکھ گیا تو اللہ سے منکر ہوگیا اور مذہب پر شرمندگی محسوس کرنے لگا جیسے آج کے ہر پڑھے لکھے کا وطیرہ ہے' پھر پتہ نہیں ایک بزرگ نے کیا کیا۔ اس کا رخ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال پات پات میں اللہ نظر آنے لگا اسے اللہ سے گہری عقیدت پیدا ہوگئی اللہ سے یارانہ لگ گیا' لگایا نہیں لگ گیا۔۔۔۔۔ پھر اس پر حیرت طاری ہوگئی کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے قدم قدم پر کرم نوازیاں کیوں کرتا ہے' مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے عقیدت کی بھرمار ہے قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر یہ شکایت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے اس لئے مظلوم ہے۔

۱۹۹۰ء میں دفعتاً" مفتی کی نگاہ سے پردہ ہٹ گیا اور پہلی بار اسے حقیقت کی جھلک نظر آئی وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اسلام واحد مذہب ہے جو کہتا ہے۔ دیکھو سمجھو۔ غور کرو۔ عقل کو کام میں لاؤ۔ حقیقت پسند بنو علم حاصل کرو۔ اس دنیا سے ایڈجسٹمنٹ پیدا کرو۔ اپنے دور کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ چلو دوستو مفتی کتنا بدنصیب ہے جب عقل تھی اللہ سے منکر تھا اب عقل نہیں رہی تو اللہ کو ڈھونڈتا پھرتا ہے ممتاز مفتی شدت کا مارا ہوا ہے۔ اس کی شدت کا قوام کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔

کہتے ہیں ایک عالم حکیم کی دوکان پر گیا۔ کہنے لگا آپ کے پاس شیرا ہے۔ حکیم بولا جناب شیرا تو ہے پر وہ اتنا گاڑھا نہیں۔

مفتی کی شدت شین والی نہیں شوئے والی ہے' زندگی بھر اس کے دوستوں کو اس کی شدت کے مظالم سہنے پڑے شہاب نے کہا مفتی کی دوستی پھوڑے جیسی ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے' اشفاق احمد بولا نہیں' اندر ہی اندر سی سی کرتا رہا۔ احمد بشیر ہنستا رہا اور قہقہے لگاتا رہا چونکہ وہ خود شدت میں لت پت ہے' بانو نے کئی بار کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا' لیکن ممتا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پروین کے لئے شدت کے کولہو میں پسنا کوئی نئی بات نہ تھی' وہ احمد بشیر کہتا ہے مفتی میں صرف شدت ہی نہ تھی وہ شدت کو اک وصف سمجھتا رہا۔ اسی پر ناز کرتا رہا سمجھتا رہا کہ جس میں شدت ہے اسی میں خلوص ہے ٹھنڈے میٹھے کرداروں سے الرجک رہا' اکاسی سال کا ہوا تو اس نے پہلی مرتبہ جانا کہ شدت وصف نہیں عیب ہے اور زندگی ٹھنڈے میٹھے لوگوں کے دم سے ہری بھری ہے۔

مفتی نے اس حقیقت کو جان لیا' سچے دل سے مان لیا کہ شدت ایک عیب ہے ایک رکاوٹ ہے لیکن وہ اسے عملاً" اپنا نہ سکا چونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔

صاحبو کسی چیز کو جان لینا سچے دل سے مان لینا لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا یوں ہے جیسے پھانسی پر لٹک گئے لٹکے رہے۔ کاش کہ وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا۔

دوستو سچی بات یہ ہے کہ میں نے ممتاز مفتی جیسا خوش قسمت شخص نہیں دیکھا۔ اونہوں! خوش قسمت نہیں وہ تو ایک لکی ڈیول ہے

اس نے بڑی RICH بڑی بھرپور زندگی گذاری ہے۔ اللہ نے اسے بہت کچھ اور بن مانگے دیا ہے' ساتھ ہی اللہ نے اسے کئی ایک لعنتوں سے بچائے رکھا امارت سے بچائے رکھا۔ اقتدار سے بچائے رکھا' عہدے سے بچائے رکھا ذاتی اہمیت کے احساس سے بچائے رکھا۔

بلی ماراں دلی کے بزرگ حاجی رفیع الدین نے ۱۹۳۰ء میں سچ کہا تھا' کہنے لگے' جوانی میں وصول الٹے گی' بدنامی ہو گی' رسوائی ہو گی لیکن بعد میں آپ کو بڑے اچھے لوگ ملیں گے' واقعی مفتی کو زندگی میں بڑے اچھے اچھے لوگ ملے۔

اگر آج اللہ میاں ممتاز مفتی کے روبرو آ کھڑے ہوں اور کہیں۔۔ "مانگ کیا مانگتا ہے" تو سوچ میں پڑ جائے گا' کیا مانگوں۔ جسے زندگی بھر بن مانگے ملا ہو وہ بھلا کیا مانگے۔ اب تو وہ تکمیل کی خوشی میں سرمست پلیٹ فارم پر بیٹھا ہے' انتظار کر رہا ہے کہ کب گاڑی آئے اور کب وہ آپ کو "ٹاٹا" کہہ کر رخصت ہو جائے۔

عزیز ملک

مفتی بڑا ایدیشنک ہے

چالیس برس گذرتے ہیں ایک تنقیدی نشست رہی ہوگی جب میں نے ممتاز مفتی کو پہلے پہل دیکھا وہ گلوری بائیں کلے میں دبائے ہونٹوں پر ہلکا سا لکھوٹا پان کا جمائے خاموش بیٹھا تھا۔

پھر اسے افسانہ پڑھتے ہوئے سنا۔ اس کے جملوں کا دروبست۔ لہجے کے بودوہست۔ اناث و ذکور کے کردار و گفتار کے نفسیاتی تجزیئے کا انداز سامعہ نواز پایا۔

وہ خلوتوں کی دلچسپیوں میں گم افراد کی حرکات کا ماہر عکاس ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک داستان گو ہے۔ اس کے ہلکے پھلکے انشائیے افسانے اور بیانئے آس پاس بکھری ہوئی کہانیوں کے تکیے ہیں۔ وہ قاری کو چونکا دینے کا فن خوب جانتا ہے وہ زندگی بھر معاشرے میں در بدر بھٹکنے والوں کا مشاہدہ کرتا رہا اور ساتھ ساتھ ابن آدم کے گندم کی بھوسی کو چھانتا اور پھٹکتا بھی رہا۔

میں بہت دنوں اس سے خوفزدہ رہا اور اسے دیکھ کر حفظ بلیات کا وظیفہ پڑھا کرتا۔ مگر تابہ کے۔۔۔۔ ایک روز سرسری سا تعارف ہوا۔ ہوتے ہوتے تعلقات بڑھ گئے۔ پھر اندھا دھند دوستی ہوگئی جس کی حفاظت ہمیں ہتھیلی کے چھالے کی طرح کرنی پڑی۔

ان دنوں یہاں ایک روحانی حلقہ تھا۔ جہاں چند دوست لذت گفتار کی خاطر اور کچھ روح کی طلب و تشنگی کی تسکین کے لئے مل بیٹھتے' میں بھی ان کا شریک سفر تھا' محض یہ جان کر کہ اصحاب کیف کے پیچھے پیچھے ایک کتا بھی چلا گیا تھا۔ کتاب حکمت و آگاہی میں اس کا ذکر ہے اور جنت میں مقام بھی موجود ہے۔ میں نے ایک روز ممتاز مفتی سے کہا ۔

یہ دل آخر ہجوم آرزو ہے تم بھی آجاؤ
ہم اس کو زندگی کی آخری محفل سمجھتے ہیں

اور بقائمی ہوش و حواس وہ اس حلقے میں در آیا۔ لیکن مجھے جلد ہی محسوس ہوگیا کہ عقیدے کی گرمی نے اس کے ظاہری افکار کو باطن سے الگ کر رکھا ہے۔ اس کے محیط کی سطح ساکن اور تہہ میں' ہیجانی کشمکش بپا ہے جو بے سبب نہیں۔۔۔!

آخر ایک روز پتہ چلا کہ اس کے خاندان میں یہ مرض موروثی ہے اس کے نانا مرحوم سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت سید غوث علی شاہ پانی پتیؒ کے متوسلین میں سے تھے اور انہوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کرکے چھپوایا بھی تھا۔ یہ نایاب تذکرہ میں نے ممتاز مفتی سے لے کر مطالعہ کیا اور جانا کہ نواسے میں اپنے نانا کی نسبت سے ارادت کا وجدانی اثر موجود ہے اور ۔

واقعہ یہ ہے کہ نسبت کام دیتی ہے ضرور
روح تشنہ تھی در پیر مغاں تک آگئی

مفتی کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف ہے۔ وہ ردائے ابر کی اوٹ میں بیٹھ کر زمانے کی نگاہوں سے چھپ چھپ کر بادۂ مجاز کے گھونٹ لیتا اور کسی چاہت میں جلتا رہا ہے۔ خانقاہوں کی بیٹھک اور مزاروں کا پھیرا اس کی روح کے طبعی تقاضے تھے جن کا محدود حلقۂ یاراں کے سوا کسی کو علم نہیں۔ لیکن خود اس کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ آتشہ کی کشید جب سر کو چڑھتی ہے تو پھر کوئی ترشی اسے اتار نہیں سکتی۔ جرعہ جرعہ چڑھاؤ تو کیف شبانہ دریا دریا امڈ آتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بے قابو حواس کی یہ داستان اس کی شاہکار تصنیف "لبیک" کے صفحات پر بکھری ہوئی ہے۔

اس سے پہلے وہ کمال چابک دستی سے جنسی ماحول کی تصویر کشی کرتا رہا۔ پھر "علی پور کا ایلی" میں جنس کے ساتھ معاشرت کے رنگا رنگ مسائل کی نشاندہی کی اور ایسے کردار تلاش کئے جن کے عمل اور نیت میں مضحکہ خیز حد تک تضاد ہوتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کے بعد اردو ادب میں ممتاز مفتی ہی وہ تنہا قلمکار ہے جس نے بدلتے ہوئے دور کا جدید افسانہ آزاد تخلیق کیا ہے اس نے مدتوں آپاؤں اور اساء راؤں کو اپنے تخن کا پردہ اور ڈھال بنائے رکھا۔ تاکہ لوگوں کو اس کے مخفی مسلک کا پتہ نہ چلے لیکن ایک روز "آپاؤں" نے تنگ آکر اندر والے مفتی سے کہا

"پیارے یا تو گوکل کے بن میں مرلی کی رسیلی تان اڑا' اور
رادھا جی کا گردھاری بن کر شیام بہاری کا روپ سروپ دھار
لے' یا پھر بنسری کے مدھر راگ میں پریت ریت کے سنگیت کی
کوئی شیت لے چھیڑ اور الھڑ گوپیوں کا سندر کنہیا بن جا کہ بھیا
اساڑھ سمے کی کڑی دھوپ میں دو روپ ایک ساتھ نہ چل
سکیں گے ------"

مفتی نے سوچا پیشانی کی لکھت نے کہاں لا کے مارا۔ سلمیٰ سے دل لگا کے بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہوگیا ہوں۔ چنانچہ اس نے دھیرے دھیرے پردہ سرکانا شروع کیا اور آخر کار "لبیک" کے شائع ہوتے ہی یک بارگی بم پھٹ گیا۔ تاشقند کے ایک ادبی سیمینار تک میں ہاہا کار مچ گئی کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ماجرا ہوا مگر "لبیک" کی تصنیف ایک حادثے سے بیش نہیں' اس مرتبہ اندر کے مفتی کو چھپانے کے لئے باہر کا مفتی کوئی فن کارانہ ٹھگی نہ دکھا سکا۔ نقاب اتر گیا۔ اب آنکھوں والا تیرے جوبن کا تماشہ دیکھے۔ "لبیک" ہی کے جھروکے سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی نفسیات اور افراد کی نیتوں اور عمل کے تضاد کا مکمل شعور رکھنے والا "علی پور کا ایلی" کا مصنف کہ نام جس کا ممتاز مفتی ہے اپنی عقل و خرد کو روایت کے پشتارے میں باندھ کر مطاف میں پھیرے پر پھیرے لگا رہا ہے اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑتا پھرتا ہے۔

پھر وہ بطحا سے یثرب کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ اس چوکھٹ کو چومنے کے لئے جہاں ہر سحر نسیم جاں فزا پھولوں کی مہک نچھاور کرنے آتی ہے۔ جبرئیل امین عرش اعظم سے صلواۃ و سلام کا پیامی بن کر اترتا ہے۔ وہ جس کی محفل میں فصل اور فاصلے قربت اور وصل میں بدل جاتے ہیں------ سبز گنبد ہی وہ منزل ہے جسے کشتگان درد فراق اور راہ اشتیاق کے تمام راہی آخری حد مانتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر سفر تمام ہو جاتا ہے

اور جو کم نصیب اس سے آگے کسی منزل کا تصور رکھتا ہے وہ دائرہ ایمان سے یوں نکل جاتا ہے جیسے تیر کمان سے چھوٹتا ہے یا ا کہکستان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر اتھاہ اندھیاروں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ممتاز مفتی کے قلمی سفر کا تعلق ہے اس کی ایک اور "داستان پاستان" "الکھ نگری" کے نام سے طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔ اس میں اس نے اپنے مخفی مسلک کی کہانی بھرپور انداز میں بیان کی ہے۔

اس کا بچپن پریشان، اور شباب کا زمانہ معاشی اضطراب کے کارن ناآسودہ رہا ہے اگرچہ ؎

در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ

اوائل شباب میں وہ مدرس رہا۔ یوں تدریسی عمل کی جھلک بھی اس کے یہاں ملتی ہے کبھی کبھی وہ اپنے منفرد اسلوب کے پیچ و خم میں ہومیو پیتھی کی ہائی پوٹینسی بھی ٹکرا دیتا ہے، کچھ اس میں خلقی رندی و سرمستی کے علاوہ خانقاہی چھاپ بھی موجود ہے۔ نہ جانے اس نے زمانے کے کس کس سے خانے کی سیر دیکھی ہے۔ وہ دمڑی شاہ کی درگاہ سے لے کر بستی نظام الدین تک ہر آستانے پر گھوما ہے۔ اور وہ اپنے مشاہدات میں حسب ضرورت پہلا مول اور تیزابات کی بھی چٹکی لگا کر اپنا مسالہ تیار کرتا ہے۔

وہ لکھتا نہیں طلسم باندھتا ہے۔ اور پوری قوت اور مقناطیسی جذب کے ساتھ سامع یا قاری کو اپنی جادو نگری میں کھینچ لیتا ہے۔ وہ برگ حنا کی رگوں میں اتر کر پہلے اس کا رنگ نچوڑتا ہے اور پھر حسینہ ادب کی لوح جبیں پہ بندی لگا دیتا ہے۔

مسعود قریشی

مفتی جی

پہاڑ کی گود میں بیٹھ کر پورے پہاڑ کا ادراک ممکن نہیں۔ دور ہٹ کر دیکھیں تو چند چوٹیوں اور گھاٹیوں میں بٹ جاتا ہے۔ پہاڑ کو جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے' پورا پہاڑ طے کریں۔ اس کی گھاٹیوں میں اتریں۔ اس کی چوٹیوں پر چڑھیں' اس کے دل میں اتریں۔ بدلتے موسموں میں اسے دیکھیں۔ لیکن ایک زندگی میں یہ سب کچھ کیسے نصیب؟ تو پھر ممتاز مفتی کو جاننا بھی کسے نصیب!

اسے شامیں منانے سے بہت چڑ ہے' کہا کرتا ہے شامیں نوجوانوں کے ساتھ مناؤ اور صبحیں بوڑھوں کے ساتھ۔ ویسے مفتی فن کے لحاظ سے کبھی بوڑھا نہیں ہوا۔ وہی شوخ و شنگ فنکار۔ پھبتیاں کستا ہے۔ چٹکیاں لیتا ہے۔ چٹکیاں بجاتا ہے۔ حال کی حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے۔ اور انہیں افسانوں میں ڈھال کر ہتک عزت کے مقدموں سے بچ جاتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں مفتی کے فن میں یکسانیت تھی۔ اور اب اس عمر میں جب اکثر ادیب اپنی تخلیقات کی جگالی کرتے ہیں' وہ نہ صرف موضوع بلکہ انداز کے لحاظ سے بھی تازہ کار اور بو قلموں ہے۔ اس پچاسی سال کے بوڑھے کی ڈھٹائی دیکھیے کہتا ہے مجھے اپنا شاہکار تو ابھی تخلیق کرنا ہے! وہ آج بھی WHAT THEN قسم کے' بغیر سائیلنسر موٹر سوار نوجوانوں کی داستان معاشقہ لکھتا ہے' خود بھی جوانیوں سے سچ مچ کا عشق کر لیتا ہے تاکہ مشاہدے میں تجربے کی سچائی شامل ہو' پھر اپنی عمر دیکھ کر اس حرکت پر "حکم" کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ ویسے پردہ داری کے اسے کئی گر آتے ہیں۔ کہا کرتا ہے کہ راز پر برملا اعلان کا پردہ ڈال دو۔ پھر کوئی ٹوہ میں نہیں لگے گا۔ سرگوشیاں نہیں ہوں گی۔ اور راز راز ہی رہے گا۔

ممتاز مفتی کی ادبی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت سچ ہے۔ لیکن یہ الہامی سچ کی طرح ازلی و ابدی اور ہمیشہ کے لئے ایک ہی نہیں یہ انسانی سچ ہے۔ تغیر پذیر۔ ایک دفعہ ایک سادہ دل دوست نے ایک مقبول (ہر طرح سے مقبول) شاعر سے پوچھا کہ تمہارے نت نئے عشق مشہور ہیں' پھر عشق کے خلوص وفا اور استواری کا کیا ہوا جس کا دعویٰ تمہاری شاعری کرتی ہے۔ شاعر نے کہا میں نے بیک وقت ہمیشہ ایک ہی عشق کیا ہے اور اس دورانیہ میں پوری طرح مخلص اور وفا شعار رہا ہوں۔ مفتی کے سچ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ عمر کے ہر دور میں جس سچ پر وہ یقین رکھتا ہے اس کے اظہار میں اس نے کبھی مصلحت' مصالحت اور ریا کاری سے کام نہیں لیا۔ اسے صدق ہنر کا اتنا احترام ہے کہ شروع شروع میں جب اس کا سچ روائتی معاشرے کو قابل قبول نہیں تھا تو اس نے سچ میں ملاوٹ کرنے کی بجائے اپنے نام "ممتاز حسین" پر "ممتاز مفتی" کا پردہ ڈال دیا۔ طویل عرصے تک اس کے ساتھی اساتذہ اور اس کے شاگردوں کو معلوم ہی نہیں ہو پایا کہ ان کا ماسٹر ممتاز حسین' ممتاز مفتی کے نام سے کشت ادب میں کیا گل کھلا رہا ہے۔ ادبی زندگی کے آغاز میں شہرت اور عزت

کتنی عزیز ہوتی ہے۔ لیکن اس نے اپنی ذاتی شہرت اور ادبی عزت سچ پر قربان کر دی۔

ممتاز مفتی انسان کے شعوری اور لا شعوری جذبات کے تضادات کا مصور ہے۔ وہ ان تضادات سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتا ہے۔ اس کے ہاں جہیز دینے کی توفیق نہ رکھنے والا باپ آدھی رات کو گھر سے فرار ہونے والی بیٹی کی سیڑھی کے سرے پکڑے رہتا ہے تاکہ شور سے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے اور صبح کو اپنی بیوی کے ساتھ نا فرمان بیٹی کی اس حرکت قبیح پر زار و قطار روتا ہے۔ شادی شدہ زندگی کی یکسانیت سے تنگ آیا ہوا خاوند نیم شب کھڑکی کے راستے اپنے ہی بیڈ روم میں دوزدانہ داخل ہوکر زندگی کے رومان کی تجدید کرتا ہے۔ عقل مجسم حاجی۔ حج کے روایاتی پہلوؤں کا مذاق اڑاتے اڑاتے بارش شروع ہوتے ہی چھلانگ لگا کر میزاب رحمت یعنی خانہ کعبہ کے پرنالے کے نیچے جا کر چھینٹے اڑاتا ہے۔ خانہ کعبہ کا وفور جذب و شوق سے طواف کرنے والے وقوف عرفات میں رو رو کر میں حاضر ہوں اللہ میں حاضر ہوں' پکارنے والے متوالے حج سے واپسی پر اللہ کو اپنے ہمراہ لانے سے انکار کر دیتے ہیں۔

لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ ان تضادات' ان کمزوریوں کی بناء پر ممتاز مفتی ان لوگوں سے نفرت و حقارت نہیں بلکہ زیادہ پیار کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے حلقۂ احباب میں رنگین مزاج لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

ممتاز مفتی کی زندگی اور فن میں قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ایک موڑ ہے' اس حادثے پر میں نے ایک شعر کہا تھا ۔

اک اپنا یار تھا رنگین و خوش ادا مفتی
مگر اسے بھی جناب شہاب لے بیٹھے

مفتی ہمیشہ سے راہ طریقت میں شارٹ کٹ کا متلاشی رہا ہے۔ عقیدت کے نذرانے کبھی ایک "بابے" کی چوکھٹ پر ڈھیر کرتا کبھی دوسرے "بابے" کے آستانے پر۔ کچھ عرصہ کوئی اور نہ ملا تو اس نے اپنے بیٹے عکسی کو ہی طاق عقیدت میں سجا لیا۔ پھر اس کی ملاقات شہاب سے ہوگئی اور وہ اسی چوکھٹ کا ہو رہا۔ مفتی کی سرشت میں مجذوبیت تھی۔ شہاب کے اثر سے اس میں اعتدال آیا۔ اسے پردہ دری کا جنون تھا۔ اکثر دھمکی دیتا کہ میری آپ بیتی کے دوسرے حصے میں بہت سوں کی پارسائی کے لبادے چاک ہوں گے۔ شہاب نے اسے قائل کر لیا کہ عظمت پردہ داری میں ہے۔ اس قلب ماہیت سے اس کے بہت سے دوستوں نے سکھ کا سانس لیا اور اب وہ اطمینان سے اس کے نئے شاہکار کے منتظر ہیں۔

زبان و بیان کے سلسلے میں مفتی نہ لغت کا غلام ہے نہ گرامر کا۔ الفاظ اس کے لئے مقدس اکائیاں نہیں بلکہ اظہار کا وسیلہ ہیں۔ وہ مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لئے توڑنے مروڑنے سے نہیں جھجکتا۔ اس عمل میں روز مرہ یا محاورہ کی شکل بدل جائے تو اسے کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ لفظ ٹکسالی اردو کا نہ ہو تو وہ اسے کھوٹا سکہ نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی ٹکسال لگا رکھی ہے جو اب قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں ندرت ہے' انفرادیت ہے۔ زندگی کی دھڑکن ہے۔

ممتاز مفتی کی ایک نادر خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کسی میں کچھ بھی تخلیقی اہلیت دیکھتا ہے اسے لکھنے پر اکساتا ہے اور رہنمائی کے ساتھ ہمت افزائی بھی کرتا ہے' اس سے مفتی کی ادب سے بے لوث لگن کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں تو اس نے "لکھ یار" انجمن بھی بنا لی تھی۔ دنیائے ادب میں آج کئی معتبر

تاہم ہیں جنہوں نے مفتی کی تحریک اور حوصلہ افزائی پر لکھنا شروع کیا یا لکھنا جاری رکھا۔ ایک دفعہ ہم لاہا دہلی گئے جہاں ہم فوج کے مہمان تھے۔ مفتی کی تحریک پر کئی لفٹیننٹوں' کپتانوں نے افسانہ نگاری شروع کر دی۔ جب کمانڈر کو پتہ چلا تو اس نے ایک تقریب میں کہا کہ ابھی تو میں مفتی صاحب کی خاطر خاموش ہوں' ان کے جانے کے بعد تم سے نپٹ لوں گا۔

آخر میں ایک تخن گسترانہ بات۔ ممتاز مفتی کو آج بھی گھر کا چولہا گرم رکھنے کے لئے کثرت سے Hack Writing کرنا پڑ رہی ہے جسے وہ نہ ادب سمجھتا ہے اور نہ ادبی طور پر اپناتا ہے کیا مفتی جیسے عظیم ادیب کا یہ قیمتی وقت اس کار بے کار میں صرف ہونا چاہئے؟ اس شیشہ گر کے لئے خشت گری سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں؟

یہاں میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ مفتی کی ان تخلیقات کو میں نے Hack writing صرف ادبی نقطہ نگاہ سے کہا ہے۔ جس Medium کے لئے وہ لکھ رہا ہے اس کے تقاضوں کے مطابق یہ درجہ اول کی تخلیقات ہیں لیکن بہر طور یہ ادب نہیں۔ اور نہ مفتی انہیں ادب سمجھ کر لکھتا ہے۔

شمیم احمد

ان کہی سے علی پور کا ایلی تک

میں نے کہیں لکھا تھا، کہ نفسیات کے ذریعے انسانی وجود اور معاشرتی تقاضوں پر افسانہ لکھنے والے ہمارے ہاں بڑے کامیاب افسانہ نگار رہے ہیں، منٹو اور محمد حسن عسکری سے لے کر، ممتاز مفتی تک یہ صنف ہمارے افسانے کی، صف اول قرار پاتی ہے، اگر ہم اس کی درمیانی کڑیوں کو اس میں جوڑ دیں تو اوپر کے جملے کی وضاحت اور آسانی سے ہو جائے گی! یہ درمیانی کڑیاں، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور عصمت چغتائی کی ہیں کم از کم اردو کی مختصر افسانہ نگاری کے حوالے سے یہ نام بہترین نام قرار پائیں گے، یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے دو ایک نے ناول بھی لکھے ہیں۔

ہماری افسانہ نگاری کی تاریخ کے ہر عہد میں مندرجہ بالا ناموں کے علاوہ بھی بہت تو نہیں مگر دو تین نام ضرور ایسے قابل ذکر دکھائی دیتے ہیں جو افسانہ نگاری میں بڑا مقام رکھتے ہیں، مگر چونکہ ان کا امتیازی وصف زیادہ تر طویل مختصر یا طویل افسانوں یا پھر ناولٹ یا ناوں کے فن میں ظاہر ہوا ہے اس لیے فی الوقت وہ ہمارا موضوع نہیں ہیں، لہٰذا مندرجہ بالا نمایاں نام ہی مختصر افسانے کے وہ نام نظر آتے ہیں جو اجتماعی صداقتوں کو اور انسانی تقاضوں کو اس کے تمام تانوں بانوں کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں ان کی سماجی بصیرت، معاشرتی صورتحال اور اجتماعی مسائل اور فنی شعور بہت نمایاں ہو جاتا ہے اور انہیں ان افسانہ نگاروں سے مختلف کر دیتا ہے جو عموماً'' نفسیاتی حوالوں اور نفسی مطالعوں کی بنیاد پر کہانیاں لکھتے ہیں، اس اعتبار سے اوپر کی فہرست سے راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور عصمت چغتائی کو الگ کر دینا پڑتا ہے، چونکہ یہ سب لوگ اجتماعی شعور، فنی چابکدستی اور انسانی نفسیات کے حوالے سے سماجی، معاشرتی اور انسانی صورتحال کو ابھارتے ہیں، اور حقیقت نگاری کے اس رجحان کے قریب آجاتے ہیں جو پریم چند سے چلتا ہے اور پھر ان میں سے اکثر ترقی پسند تحریک کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں لیکن باقی حضرات کسی (situation) واردات یا لمحے کو کسی کردار کی نفسیاتی آگہی کے ذریعے زندگی کے بعض اہم حقائق اور صداقتوں کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ منٹو، محمد حسن عسکری اور ممتاز مفتی بنیادی طور پر کسی کردار کے ذریعے نفسیاتی عمل کو اپنے فن کی بنیاد بناتے نظر آتے ہیں۔

لیکن ان تینوں میں بھی ایک بہت بڑا فرق موجود ہے، منٹو اور عسکری کے ہاں پھر بھی کسی نہ کسی سطح اور قسم کا سماجی شعور موجود ہوتا ہے، جبکہ ممتاز مفتی وہ واحد افسانہ نگار ہیں جو خالصتاً'' نفسیاتی شعور کو کسی کردار کے نفسی عمل کا وسیلہ بناتے ہیں، البتہ ان کے ہاں کہیں کہیں کوئی اخلاقی یا سماجی قدر کا رد عمل ابھرتا ہے جو اس کردار کے نفسیاتی عمل کو نمایاں کرنے میں مدد دیتا ہے، مگر وہ سماجی اور اخلاقی قدر ان کے ہاں کوئی مسئلہ نہیں بنتی، نہ وہ اس کے محرکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اول تو ایسے لمحے ان کے ہاں

بہت کم آتے ہیں لیکن اگر کہیں آتے بھی ہیں تو وہ شعور کی زیریں سطح پر رہتے ہیں ممتاز مفتی کو کسی کردار کی نفسی کیفیت اور عمل کو نمایاں کرنے سے زیادہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں' اسی لئے ان کے ابتدائی افسانے ایک نازک اور نرم کیفیت اور فضا میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ایک جمالیاتی ارتکاز کے ساتھ وہ ایسے نفسیاتی گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں' جن سے عموماً" اس زمانے میں آگہی نہ ہونے کے برابر تھی' ان کے تینوں ابتدائی مجموعے' ان کہی' چپ اور گہما گہمی اردو میں نفسیاتی عمل اور محرکات کی سب سے کامیاب مثالیں ہیں اس زمانے کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ممتاز مفتی کے جس کمال کا احساس برابر رہتا ہے' وہ یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو کہیں اس کا احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کسی قسم کے نفسیاتی مطالعے یا آگہی کو کام میں لا رہے ہیں' یا نفسیات کو شعوری طور پر استعمال کر رہے ہیں' ان کا فن اتنا نازک اور خوبصورت تھا کہ ہر ایسا اہم افسانہ' زندگی کے کسی چھپے ہوئے انوکھے زاویے اور انسانی فطرت کے کسی گہرے اور پوشیدہ راز کو کسی کاوش کے بغیر آشکار کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے' جیسے کوئی حقیقی بڑا شاعر انسانی نفس میں چھپی ہوئی کسی صداقت اور خواہش کو اس طرح گرفت میں لے لیتا ہے کہ جب تک انسان اس تجربے سے گذرتا رہتا ہے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس شاعر نے اس کے باطن میں جھانک لیا ہو' شاید اس تجربے سے وہ پہلی بار گذرا ہو' یا بقول غالب اسے یہ محسوس ہوا ہو۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

ممتاز مفتی کا ایک وصف جس کا میں ہمیشہ شیدا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً" جب بھی کسی افسانہ نگار نے نفسیاتی مشاہدے یا نفسی عمل کو موضوع بنایا تو جنسی موضوعات کی رغبت نے اسے ضرور اپنی طرف کھینچ لیا ہے' ایسے افسانہ نگار تو بہت سے ہیں جنہوں نے کسی نفسیاتی موضوع کے معنی ہی جنسی موضوع کو سمجھا' جب سے فرائڈ کا چرچا ہمارے ہاں شروع ہوا تھا' نفسیات کے ذریعے انسان اور اس کی نفسیات کو سمجھنے اور نفسی کیفیتوں کے محرکات کو جاننے کا بے تحاشا شوق ساری دنیا کی طرح ہمارے ہاں بھی پیدا ہوا اور اسے علوم انسانیت کے لئے ایک سائنسی طریقہ کار کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی پھر جیسے جیسے [illegible] تحلیل نفسی اور اس کے ذریعے خوابوں کی تشریح اور نفسیاتی علاج سے واقفیت بڑھتی چلی گئی' ہر نفسی عمل جنسی محرکات ہی کا نتیجہ خیال کیا جانے لگا۔ چنانچہ آپ کو ہمارے ہاں ابتداء میں سلطان حیدر جوش سے کر عزیز احمد تک یہ رجحان عموماً" جنسی تحریک اور رغبت کی صورت میں نظر آئے گا' اور جب ترقی پسند تحریک کے ابتدائی مدعیوں نے "شعلے" اور "انگارے" کی صورت میں برصغیر کے سماجی ڈھانچے کو [illegible] ڈہلانے کی کوشش کی تھی تب بھی انہوں نے جنس ہی کے ذریعے بارود کا کام لیا تھا۔ اور پھر جب [illegible] حسن عسکری اور عصمت چغتائی نے خود کو متعارف کرانے کے لئے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تب بھی انہوں نے اپنے پختگی فن کا ثبوت نفسیات' جنسی محرکات اور سنسنی خیزی ہی سے فراہم کیا' بعد میں عصمت اور عسکری نفسیاتی عمل کے ساتھ ساتھ سماجی شعور اور معاشرتی تضادات کی طرف متوجہ ہو گئے' لیکن [illegible] جنس کو اپنا مستقل اور بنیادی موضوع بنائے رکھا' جس کے ذریعے بعض اوقات اس نے بڑے گہرے [illegible] عمل کے ذریعے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کا کام لیا' جو اس وقت میرا موضوع نہیں' میں جس بات کی [illegible] آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ صرف اتنی ہے کہ اس پورے دور میں ممتاز مفتی وہ واحد افسانہ نگار تھے جو صرف و محض نفسیات انسانی کے ترجمان رہے اور اگر کوئی جنسی محرک ان کی کسی کہانی میں نظر بھی آتا ہے تو

وہ اپنے جنس کے ننگے تار کو چھونے سے بچا کر صرف نفسی شعور تک اور ایک نازک Refine کیفیت اور جمالیاتی اعتبار سے زندگی کے حسن کو ہمارے شعور تک لانے میں کامیاب رہے' یہ ایک بہت ہی خاص پہلو ہے جو صرف ممتاز مفتی سے مخصوص ہے اور کسی افسانہ نگار سے نہیں۔

اس اعتبار سے یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ جدید افسانہ اور ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں بھی ممتاز مفتی نے کسی اور موضوع' رجحان' وقتی تقاضے اور "فیشن" کے زیر اثر لکھنے کی کوئی کوشش کبھی نہیں کی وہ اپنے موضوع اور اسلوب سے ہمیشہ وفادار ہے' ان کے ہاں تبدیلی آئی تو اس وقت جب انہوں نے "علی پور کا ایلی" لکھنا شروع کیا' یا اس کے بعد کے افسانوں میں۔ لیکن وہ برصغیر کے جدید افسانے کے عروج کے دور میں بھی اپنے انداز کے اتنے منفرد افسانہ نگار رہے ہیں کہ جنہیں نہ ترقی پسند تحریک کا پلیٹ فارم نظر انداز کر سکتا تھا اور نہ جدید ادب کا' ان کے ابتدائی تینوں افسانوی مجموعے اردو افسانے کی ایک ایسی جمالیاتی جہت کہے جا سکتے ہیں جس نے ہمارے افسانے ہی میں نہیں بلکہ برصغیر کے اجتماعی انسانی وجود میں جدید نفسیاتی شعور کو سمو دیا اور اپنی تخلیقی بصیرت سے انسان کے باطن میں چھپے ہوئے نفسیاتی محرکات کو ایک نئے طرز احساس میں بدل دیا'

ان کے پہلے مجموعے "ان کہی" کی کہانیاں' جھکی جھکی آنکھیں' آپا' مہندی والا ہاتھ' ماتھے کا تل اردو افسانے کی ایک نئی فضا' آگہی کی ایک نئی کروٹ اور منزل کا نام تھا' اسی طرح ان کے دوسرے مجموعے چپ کی کہانیوں انگلی' چپ' احسان علی اور باجی نے ان کے ان اولین نقوش کو نہ صرف اور گہرا کر دیا تھا بلکہ وہ ان کی افسانہ نگاری کی شناخت بن گئی تھیں البتہ ان کے تیسرے افسانوی مجموعے "گہما گہمی" میں کہیں کہیں موضوع کی یکسانیت اور تکرار کا تاثر ابھرنے لگتا ہے' لیکن پھر بھی "بدمعاش" اور "حد ہو گئی" میں ان کا زیر نفس جادو اتنا ہی پرکار اور دل آویز نظر آتا ہے جو ان تینوں مجموعوں کو ممتاز مفتی کے افسانہ نگاری کے نمائندہ مجموعے بنا دیتا ہے۔'

غالباً" ممتاز مفتی کو اس جادو کا پورا پورا احساس تھا' اس لئے وہ اپنے مخصوص طرز تحریر کو بدلنا نہیں چاہتے تھے مگر اب انہیں یہ احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ کہیں وہ خود کو دھرانے نہ لگ جائیں' ویسے بھی مختصر افسانے کا اسکوپ' اور ان کے مخصوص موضوع کا دائرہ تکرار کا متحمل زیادہ دیر تک نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا انہوں نے اپنا پہلا ناول لکھنا شروع کر دیا۔' "علی پور کا ایلی" اردو کا پہلا مکمل اور بھرپور نفسیاتی ناول قرار دیا جا سکتا ہے' گو کہ اس کی خامیاں اور کمزوریاں بھی اتنی ہی بڑی ہیں جتنا یہ ناول؟ جسکا ذکر ذرا ٹھہر کر آگے کروں گا۔

کوئی بھی اچھا ناول کردار کے نفسیاتی تجزیئے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا' اسی لئے ہر معاشرتی ناول تھوڑا بہت نفسیاتی ناول ضرور ہوتا ہے اور جب فنکار کا موضوع ہی (خواہ عورت ہی سہی) انسان کا نفسیاتی مطالعہ ہو تو نفسیاتی عمل دخل جتنا بڑھ جاتا ہے اس کی کوئی اور مثال علی پور کا ایلی کے سوا اردو میں نظر نہیں آتی' اس سے قبل عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں شمن کے کردار میں ہمارے متوسط طبقے کے بچپن سے نوجوانی تک کے جو نفسیاتی اور حقیقی خدو خال ابھارے ہیں وہ بے مثال ہیں' لیکن وہ اسے آخر تک نباہ نہیں سکی تھیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بعد کی زندگی اور عمر کے جو تجربے اس وقت تک ان کے مطالعے میں نہیں آئے تھے اس پر ان کی گرفت کمزور تھی' اسی طرح عزیز احمد نے بھی اپنے ناولوں میں کردار کے نفسیاتی

عوامل پر بڑا زور دیا ہے' مگر ان کے یہاں جنسی طرز احساس' نفسیاتی مشاہدے پر غالب آجاتا ہے اس حد تک کہ ان کا فن اس سے متاثر ہو گیا ہے۔

ممتاز مفتی کا ناول یقیناً ان کے ابتدائی افسانوں کے مقابلے پر جنس نگاری کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے بیشتر کردار اسی حوالے سے "ابنارمل" اور "غیر حقیقی کردار" معلوم ہونے لگتے ہیں' لیکن اپنے اسلوب اور اپروچ میں وہ نفسیاتی مطالعوں اور طرز عمل کی حدود ہی میں رہتے ہیں' "علی پور کا ایلی" میں گو کہ جنس ان کے ابتدائی مجموعوں کے مقابلے پر نفسیات سے آگے بڑھ کر بنیادی حوالہ بن جاتی ہے مگر وہ اسے محبت یا عورت اور مرد کے تعلق کی نفسی کیفیتوں کے مطالعے تک ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

دراصل ممتاز مفتی کا اصل موضوع عورت ہے' جس سے محبت یا جنسی تعلق قائم کرنا ہی ان کا مقصد حیات ہے' جس کے بغیر ان کے ہاں زندگی کا کوئی اور تقاضا' مشغلہ' مصروفیت' فطری عمل' معنویت' اہمیت اور معاشرتی ذمہ داری موجود نہیں ہے' یقیناً" عورت زندگی کا آغاز ہے لیکن وہ خود اپنی ذات سے جتنے تعلقات' مسائل' کردار' معاشرت اور زندگی کے تانوں بانوں کو پیدا کرتی ہے' ممتاز مفتی اسے اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں' ان کے ہاں وہ صرف ایک مسئلہ پیدا کرتی ہے مرد سے اپنا تعلق یا مرد کے لئے اپنے وجود کی گواہی؟ اسی لئے "علی پور کا ایلی" عورت اور مرد کے تعلق' حسیات' جنس' نفسیات اور جمالیاتی تقاضوں کے تانوں بانوں سے باہر نہیں نکلتا۔ ممتاز مفتی نے اس ناول کو عورت کے ہر نفسی روپ کا ایک مرقع بنا دینے کی کوشش کی ہے' مگر وہ عورت سے اپنے غیر معمولی انہماک میں اتنے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایک مکمل دور اور ایسے دور کو موضوع بناتے ہوئے جس نے برصغیر کی اپنی تاریخ اور اجتماعی زندگی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا اور اس کی اجتماعی زندگی کو ہر قسم کی سیاسی' معاشی' معاشرتی' اخلاقی اور ثقافتی دھاروں کی آویزش میں مبتلا کر دیا تھا' حتیٰ کہ برصغیر کی آزادی کی تحریکات تک کا کوئی اثر اس ناول پر نظر نہیں آتا' دراصل ممتاز مفتی کا یہ ناول ایک ایسے نگار خانے کا البم ہے جس کا موضوع صرف عورت ہے۔'

"علی پور کا ایلی" چھپتے ہی اس کے ابتدائی نقادوں نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا' بجائے ناول پر کوئی بات کرنے کے یا اس کی فنی اور تخلیقی اہمیت کو اجاگر کرنے کے' ایک تو انہوں نے اس کی ضخامت کا بڑا چرچا کیا دوسرے اپنی دانست میں یہ انکشاف کرکے بڑا کمال کر دکھایا کہ یہ ناول ممتاز مفتی کی آپ بیتی ہے مجھے ممتاز مفتی سے جو دلچسپی اور ذہنی تعلق ابتدا سے تھا اس کی وجہ سے میں ان کا ناول پڑھے بغیر ویسے ہی نہیں رہ سکتا تھا' لیکن مندرجہ بالا باتوں نے میرے شوق پر اور بھی مہمیز کا کام کیا' چنانچہ میں فوراً" یہ ناول لے آیا' ضخامت کے حوالے سے مجھے اس سے یوں دلچسپی تھی کہ میرا بچپن داستانیں پڑھنے میں گذرا تھا اور اس زمانے میں اکثر سردیوں کی چودہ روز کی چھٹیاں گذارنے ہم اپنی خالہ کے پاس اس چیلنج کے ساتھ جاتے تھے کہ ان دنوں میں طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں ختم کرکے آئی ہیں' "علی پور کا ایلی" کو میں نے سرشام سے پڑھنا شروع کیا تو صبح تک پڑھتا رہا اور پھر چھ گھنٹے سونے کے بعد جب دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو سرشام سے کچھ ہی وقت پہلے ختم کر دیا' حساب کیا تو کوئی اکتیس گھنٹے لگے' اس طرح اس کی "معروف ضخامت" سے سیری حاصل نہ ہو سکی' بڑی تشنگی سی رہی' ظاہر ہے اکتیس گھنٹوں میں ختم ہو جانے والی کتاب داستانوں کے سلسلوں کے مقابل کیا ضخیم ہو سکتی تھی؟

رہی دوسری بات وہ تو ویسے ہی غیر معتبر اور مشکوک بات تھی' ناول پڑھ کر اور بھی بے تکی لگی ان معنوں میں تو ہر مصنف کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی تخلیق میں شریک رہتا ہی ہے۔ "ممتاز مفتی کی آپ بیتی" اتنی سوچی ہوئی اور "نیم کتابی" کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ مجھے یہ ناول اس لئے بہت دلچسپ اور اچھا لگا کہ اس کے بنیادی کردار تقریباً" وہی تھے جو جھکی جھکی آنکھیں' آپا' سندی والا ہاتھ' ماتھے کا تل' نیلی' چپ' احسان علی' باجی' بدمعاش اور حد ہوگئی میں مجھے ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کو رجھا چکے تھے اور ہمارے ادب میں بچ بچ کی عورت اور اس کی نفسیات اور کشش کے ساتھ اس کی جمالیات کا ایسا طلسم قائم کر چکے تھے جو اس سے قبل صرف شاعری میں ہی نظر آتا تھا'

لیکن جب "علی پور کا ایلی" میں ممتاز مفتی نے ان کرداروں کو پوری طرح متعارف کراتے ہوئے ان کے کرداروں کے ارتقائی مراحل اور ان کی معنویت کو زندگی کے مقابل ابھارا تو وہ ان کے ابتدائی افسانوں کے خلاف "نفسیاتی مطالعے یا کیس" بن گئے اور بجائے انسانی صداقتوں اور شگفت گل ہائے نو کی جگہ وہ تقریباً سب Tipical اور ابنارمل کردار بن کر ابھرے' ناول کی ابتدا میں دو کردار ان کے ابتدائی افسانوں کے حوالے سے بڑے بھرپور گہرے اور خوبصورت نظر آتے ہیں' وہ افسانے کی محدود فضا سے نکل کر ناول کی وسیع فضا میں ایک خوشگوار اور مانوس انداز میں پڑھنے والے کی توجہ اپنے اوپر پوری طرح مرکوز رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' لیکن ناول کے نصف حصے کے بعد ہی کردار یا تو غیر فطری طرز عمل اختیار کرکے' ٹائپ کردار بن جاتے ہیں یا پھر مصنف کے ہاتھ میں ایک ایسا Tool جو ان کو نیم جنسی اور نیم نفسیاتی اثرات کا ابنارمل مرکب بنا کر دکھاتا ہے' ناول کے اس حصے میں ممتاز مفتی کے نفسیاتی مشاہدے اور مطالعے کا مصنوعی بوجھ اس پر اس طرح پڑتا ہے کہ آخر تک پہنچتے پہنچتے ناول ڈھیر ہو جاتا ہے' اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ان کو اپنی فطری تخلیقی نشوونما Growth سے محروم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی' چنانچہ وہ تمام کردار جو ناول کی ابتدا میں اس سے قبل کے افسانوں کی طرح زندگی کے ترو تازہ رویوں اور تجربات کی وجہ سے انتہائی پرکشش محسوس ہوتے ہیں' آخر میں مجہولیت کا شکار' نیم مریضانہ طرز احساس کے حامل اور صرف محض موضوعاتی کردار نظر آنے لگتے ہیں' ان کرداروں میں ایلی کے باپ علی احمد کا کردار تو ابتداء ہی سے غیر فطری انداز اختیار کر لیتا ہے اور پورے ناول میں اس کو ایک ہی انداز پر قائم رکھا گیا ہے' یہ ایک مکمل "ٹائپ" کردار ہے جس میں ارتقاء تو چھوڑ دیجئے وہ تھوڑی بہت لچک بھی نظر نہیں آتی جو بعض بنیادی کرداروں میں موجود ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ہمارے ہاں ابنارمل جنسی افراد نہیں ہوتے یا عورتیں اور بیویاں رکھنے کے شوقین افراد کی ہمارے ہاں کوئی کمی ہے' ان کی اولاد کسی کامپلیکس Complex کا شکار ہوکر اپنے باپ ماں اور ماحول سے نفرت نہیں کرنے لگتی؟ نفسیات کے حوالے سے تو ہمارے معاشروں میں اگر مغرب کی طرح نہیں تو کسی نہ کسی تناسب میں جنسی مریض خطرناک پاگل اور قاتل تک موجود رہے ہیں۔ لیکن ممتاز مفتی نے اپنے ناول کے اس "مسخ شدہ" بنیادی کردار کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس میں ایک غیر فطری انداز تو موجود ہی ہے لیکن مصنف کے رویئے میں بد مذاقی کا عنصر ہمیشہ غالب رہا ہے۔'

ممتاز مفتی کی سب سے بڑی خوبی کا میں ابھی اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ حقیقتاً وہ جنس نگار نہیں بلکہ نفسیات نگار ہیں' اور وہ جنس کو نفسیاتی حدود میں رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کی سب سے خوبصورت اور کمیاب مثالیں ان کے ابتدائی افسانوی مجموعے ہیں۔ لیکن اپنے پہلے ناول میں ممتاز مفتی نے ان دونوں کے

درمیان جو خطرناک فرق اور حد ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے گو کہ انہوں نے جنسی معاملات کو کھلے انداز میں موضوع بنانے سے پرہیز کیا ہے۔'

علی احمد تو خیر ہے ہی مریض کردار انہوں نے تو اپنے افسانوں کی نازک اور جمالیاتی ہیئت والی اور مختلف کرداروں کے پس منظر میں نمایاں ہونے والی ہیروئن کو بھی جو "علی پور کا ایلی" میں شہزاد کے کردار میں بہترین مرکب بن گئی ہے' کو بھی آخر میں ٹیپکل کردار میں ڈھال کر سخت مایوس کیا ہے' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ممتاز مفتی نے اپنے اس تاج محل کو تباہ کرنے میں اور "مارنے" میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تو بے جا نہ ہوگا' شاید اس کی وجہ وہی خوف ہو جس کی طرف میں اس مضمون میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں یعنی تکرار کا خوف' اس میں کوئی شک نہیں کہ گہما گہمی تک ان کے قاری کو یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے مخصوص موضوعات یعنی عورت کے نفسیاتی رخوں کو زیادہ عرصے تک تر و تازہ نہیں رکھ سکتے اور اسی وجہ سے انہوں نے ناول کے بھرپور کرداروں میں منتقل کرنے کے لیے "علی پور کے ایلی" کے ابتدائی حصے میں وہی کردار' وہی انداز وہی نفسیاتی باریک بینی دکھانے کی کوشش کی ہے جو ان تینوں مجموعوں کی سب سے بڑی صفت ہے' اس ناول کے بنیادی کردار کے خدو خال طرز احساس اور فنی نزاکتیں ہمیں ان کے تینوں ابتدائی افسانوی مجموعوں کی فضا میں پہنچا دیتی ہیں مگر تکرار کے خوف سے بھاگتے ہوئے ممتاز مفتی میں اس سے زیادہ صلاحیت موجود نہیں تھی جو ان کی "ان کہی" "چپ" اور "گہما گہمی" میں ان کی شناخت بن جاتی ہے' چنانچہ "علی پور کا ایلی" میں یہ شناخت ابتدائی نفسیاتی سحر سے آگے بڑھتے ہی غیر حقیقی' ابنارمل اور موضوعاتی کردار بن جاتی ہے۔ جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ نفسیاتی باریک بینی زندگی کے ٹھوس اور بنیادی تقاضوں سے آشنا ہو کر جس معنویت' انسانی تقاضوں اور زندگی کے اجتماعی عمل میں ڈھلتی ہے اس کو پیش کرنے کی صلاحیت ممتاز مفتی میں ایک سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔' "علی پور کا ایلی" کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے کردار' پلاٹ' موضوعات اور انسانی ادراک اور شعور کا حقیقی زندگی سے سوائے ایک جنسی اور نفسیاتی رابطے کے کوئی اور تعلق موجود ہی نہیں ہے' حقیقت یہ ہے کہ ناول کے بالکل آخر میں ایک غیر متعلق موضوع کو چھوڑ کر گیارہ سو صفحات کے اس ناول میں یہ معلوم کرنا انتہائی دشوار ہے کہ اس کے کرداروں کا اپنے ماحول معاشرے' زندگی کے تقاضوں اور زمانے سے کوئی تعلق موجود بھی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اس میں آصفی محلہ بھی ہے' لاہور اور امرتسر جیسے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے متعدد قصبوں اور شہروں سے دلی اور بمبئی کے شہر تک ہر جگہ اس کا مرکزی کردار چھاپے مارتا ہے مگر یہ سب مقامات اپنے وجود سے غیر متعلق رہتے ہیں اور اس کے کردار اپنی نفسیاتی یا جنسیاتی کیفیت کی اندھی گلی سے باہر نہیں نکلتے حد یہ ہے کہ اس ناول کا اصل زمانہ وہی ہے کہ جو برصغیر کی آزادی کی تحریکات کا پرشور زمانہ ہے اور سیاسی' نظریاتی اور مختلف قوموں کی آویزش کا ہر لمحہ پورے ہندوستان کے طول و عرض سے ابلا پڑ رہا تھا' مگر "علی پور کا ایلی" میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اس کا تعلق ایک ایسے زمانے سے ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ کسی ناول میں اس دور کی سیاسی' معاشرتی اور اجتماعی زندگی کو ضرور پیش کیا جاتا' مگر جس ناول کے کرداروں سے یہ پتا ہی نہیں چل رہا ہو کہ ان کا تعلق زندگی کے اجتماعی عمل سے قائم بھی ہے یا نہیں اسے سوائے نفسیاتی کابوس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے' اگر معاشرے میں محبت ہی کے زیر عنوان سہی مگر تمام انسانوں یا شہروں کی آبادی یا اجتماعی زندگی میں صرف جنس یا اس کے متعلقات کے علاوہ کچھ نظر نہ آرہا ہو تو وہ یقیناً

ایک غیر حقیقی اور غیر فطری رویئے کا مظہر ہوگا' چنانچہ اس کابوس کا ہر کردار (اور کرداروں کے اعتبار سے "علی پور کا ایلی" بڑا تنوع رکھتا ہے) خواہ وہ جوان ہو یا ادھیڑ' بچہ ہو یا بوڑھا ایک نیپکل کردار بنا دیا گیا ہے۔' یہی وجہ ہے کہ آصفی محلے کا ہر نوجوان لڑکا یا لڑکی مرد یا عورت جو اس ناول میں کردار کی حیثیت سے آیا ہے کسی نہ کسی اعتبار سے یا تو ابنارمل کردار ہے یا ٹائپ' ہاں اگر زندگی کی حقیقی اور نارمل فضا کا تھوڑا بہت احساس ہوتا ہے تو اس محلے کے اجتماعی ردعمل میں یا کسی غیر اہم یا ضمنی کردار کے رویئے میں جو بار بار ایک جیسے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ ایک بڑی قباحت اس ناول میں یہ بھی ہے جو اس کی ضخامت کا باعث بھی ہوئی ہے کہ اس میں بار بار ایک جیسے ردعمل اور مختلف کرداروں کی ایک جیسی نفسیات' واقعات اور رویئے کی مسلسل اور یکساں فضا ملتی ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ کردار کا احساس شدید ہو جاتا ہے اور ناول کی اس یکسانیت سے بعض اوقات بیزاری پیدا ہونے لگتی ہے' اس بات کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ پوری زندگی کو صرف و محض ایک محدود جنسی دائرے میں کولہو کے بیل کی طرح گھومتے ہوئے کوئی کیسے دیر تک دیکھ سکتا ہے یا اس میں دلچسپی لے سکتا ہے؟ جبکہ خود بیل کی آنکھوں پر بھی چمڑا یا پٹی اس لئے چڑھا دی جاتی ہے کہ اسے ایک دائرے میں مسلسل گھومنے سے بیزاری کا احساس نہ ہو مجھے حیرت ہے کہ ممتاز مفتی جیسے فنکار کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ ان کا ہر فین کم از کم بیل نہیں ہو سکتا۔

کولھو کے اس بیل کا احساس ایلی کے امرتسر پہنچنے کے بعد اس قدر شدت سے ابھرتا ہے کہ وہاں کا تقریباً ہر کردار صرف و محض ایک نفسیاتی یا جنسی کیس بن کر رہ جاتا ہے' اور یہیں سے ناول کی غیر حقیقی اور مصنوعی فضا کا آغاز ہوتا ہے اور اس فضا کی تعمیر ہونے لگتی ہے جس کا ہر فرد اور ہر کردار ایک نفسیاتی یا جنسیاتی طرزعمل کی علامت بن گیا ہے' امرتسر میں ایلی کا ایک ساتھی مولاداد' کالج کا پرنسپل اور کالج کے رسوئی خانے کے ملازمین جن کا ذکر بہت ہی مختصر طور پر اور یکساں انداز میں آتا ہے صرف وہی زندگی کے نارمل کردار کہے جا سکتے ہیں' باقی سب فضا غیر حقیقی اور نفسیاتی کیسوں کی صورت میں تعمیر کی گئی ہے' غالباً" مولاداد "علی پور کا ایلی" کا واحد ضمنی کردار ہے جو پنجاب کے دیہی نوجوان کے روپ میں نہایت مختصر عرصے کے لئے ابھرتا ہے مگر اس کا رویہ پوری طرح فطری اور نارمل نظر آتا ہے یا لاہور کے ہاسٹل میں بھی ایک دو پڑھا کو ضمنی کردار فطری اور حقیقی کرداروں کی طرح نظر آتے ہیں ورنہ یہ ناول اپنے ابتدائی کرداروں کے تعارف کے بعد زندگی کے ہر تقاضے سے محروم ہو جاتا ہے اور ہر قسم کے نفسیاتی بیمار ٹائپ کردار ناول کے پورے افق پر چھا جاتے ہیں' اس کا ایک واضح اور روشن ثبوت "علی پور کا ایلی" کے ساتھ یا بعد میں لکھے جانے والے افسانوی مجموعے ہیں یعنی "اسمارائیں" سے لے کر "روغنی پتلے" تک بلکہ "سمے کے بندھن" تک۔ بعد کے ان افسانوی مجموعوں میں ممتاز مفتی نے عورت کو اپنے عہد سے لے کر زمانہ حال تک علامتی انداز کے "نفسیاتی کیسوں" میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے البتہ کہیں کہیں کوئی افسانہ حقیقت پسندانہ اور فطری فضا میں داخل ہو جاتا ہے ورنہ "علی پور کا ایلی" اور اس کے بعد کے افسانوں کی صورت ان کے ابتدائی فن اور موضوع سے بالکل مختلف بھی ہے غیر تخلیقی اور غیر فنکارانہ بھی' ممتاز مفتی کا ہمارے ادب میں بہترین کارنامہ ان کے تینوں ابتدائی مجموعے اور کسی حد تک ان کا ناول "علی پور کا ایلی" ہے اس کے بعد ممتاز مفتی کا دور انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے بھی "علی پور کا ایلی" خاصا مایوس کرتا ہے جہاں تک اس کی کہانی کا تعلق ہے وہ

آدھے ناول کے بعد اچانک ختم ہو جاتی ہے جہاں اس کی ثانوی ہیروئن یعنی سادی اتنے بھونڈے طریقے سے "اسٹیج" سے غائب ہو جاتی ہے کہ مصنف کے فنی عجز اور تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے وہ کوئی کسی سیارے میں منتقل نہیں ہوگئی تھی اور نہ پتھر میں تبدیل ہوگئی تھی وہ اسی ملک کے ایک حصے میں تھی مگر ایلی اتنا درماندہ نظر آتا ہے کہ کبھی اس سے وہاں جاکر ملنے اور اس کا پتہ لگانے کی بھی کوشش نہیں کرتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی اس کردار کو کس فطری اور حقیقی انجام تک پہنچانے کی یا تو صلاحیت نہیں رکھتے یا اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں دراصل "علی پور کا ایلی" کا پلاٹ شہزاد کے مکمل طور پر "سرینڈر" کر جانے اور سادی کے اچانک غائب ہو جانے کے بعد فلاپ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ناول' ناول نہیں بلکہ ممتازمفتی کی شعبدہ بازی کا مظاہرہ ہوکر رہ جاتا ہے' ناول کے اس غیرفطری خاتمے کا بہت سے کردار شکار ہوئے ہیں' ضمنی اور مختصر کردار ہی نہیں بلکہ بعض اہم کردار بھی جن کی تخلیق میں ممتاز مفتی نے تھوڑا بہت زور بھی لگایا تھا وہ بھی اچانک اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں پھر ان کا سراغ ہی نہیں ملتا کہ وہ کہاں گئے' ایسے کرداروں میں سوائے ارجمند کے جس کا انجام فطری انداز میں ہوا ہے اور کسی کے بارے میں یہ بات بھی نہیں کہی جا سکتی۔' دراصل اصل کہانی کے بے تکے انجام ہی نے ممتاز مفتی کو شعبدہ بازی پر مجبور کیا تھا اور باقی ناول مصنوعی طور پر آگے بڑھایا گیا ہے یا علامتوں اور "نفسیاتی کیسوں" کی صورت میں۔ انہوں نے ناول کے آخری حصے میں عورت کے بارے میں نفسیات اور جنسیات کے تمام فارمولے آزما کر دیکھ لئے ہیں اور دنیا میں ان کی دانست میں عورتوں کی جتنی اقسام' جتنے رویئے اور نمونے ممکن تھے دکھانے کی شعوری کوشش کی ہے' لیکن اس کی سب سے حیرت ناک مثال شہزاد جیسی بھرپور ہیروئن کو بھی اس حصے میں اپنے تجربات کے لئے "معمول" بنا لینے کا عمل ہے جس سے نہ صرف قاری کے لئے انتہائی بے لطفی پیدا ہوتی ہے بلکہ ممتاز مفتی کے تخلیقی شعور سے بھی مایوسی پیدا ہوتی ہے۔'

بات یہ ہے کہ سادی کے غائب ہو جانے اور شہزاد کی شخصیت کی شکست کے بعد ممتاز مفتی نے جتنے کردار متعارف کروائے ہیں وہ سب کٹھ پتلی کے تماشے اور غیر حقیقی کرداروں میں ڈھل جاتے ہیں یہ وہ فارمولے ہیں جن سے اکثر عورتوں اور مردوں کے "ٹائپ" دکھانے کا کام بے روح' بے جان اور لکڑی کے کھلونوں سے لیا گیا ہے حیرت ہے کہ ممتازمفتی جیسا فنکار اس کو کیسے ناول کا حصہ بنا لیتا ہے' اگر وہ اپنی کسی بد مذاقی کی وجہ سے اس حصے میں عورتوں کی اقسام اور بعض مردوں کی نفسیات دکھانے کا کام اپنا اہم کارنامہ سمجھتے بھی ہیں تب بھی انہیں اس کے دوسرے ایڈیشن میں اس شعبدہ بازی پر یقیناً" نظرثانی کرنی چاہئے تھی کیونکہ یہ حصہ نہ صرف ایک اچھے ناول کو نہایت کمزور کردیتا ہے بلکہ اس سے بے زاری اور بے لطفی بھی پیدا کرتا ہے۔ خصوصیت سے سادی اور شہزاد کے انجام پر انہیں ضرور دوبارہ سوچنا چاہئے تھا اور ان کو زندگی کی بصیرت اور شعور کا مظہر بنانا چاہئے تھا۔'

اس سے بھی زیادہ مایوس کن اور کمزور حصہ "علی پور کا ایلی" کا بالکل اختتامی حصہ ہے جس میں انہوں نے تقسیم ہند کے وقت مشرقی پنجاب کے فسادات کو اور بعض فقراء اور مجذوبوں کے حوالے سے فرق' عادات' واقعات کو کرشماتی انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے یہ دونوں موضوعات اس ناول میں نہ صرف غیرمتعلق اور بے جوڑ نظر آتے ہیں' بلکہ یہاں تک آتے آتے مصنف یا تو ہانپتا ہوا محسوس ہوتا ہے یا نو سو چوہے کھا کر حج پر جانے والا مقولہ اس پر صادق آجاتا ہے ناول کی کہانی کے اعتبار سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے

اب ایلی پر بڑھاپا طاری ہوگیا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ بے کیفی اور بے لطفی کا احساس ناول کے اسی حصے میں ہوا ہے چونکہ کردار میں تبدیلی اچانک نہیں ہوا کرتی اس کی بنیاد کہیں نہ کہیں پہلے سے موجود ہوا کرتی ہے۔ فسادات کا ذکر بھی یہاں اس طرح آیا ہے کہا اگر ناول کو مخمل قرار دیا جا سکے تو فسادات اس میں ٹاٹ کا پیوند نظر آتے ہیں' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فسادات جن عوامل اور محرکات کا نتیجہ اور جس صورتحال کی بھیانک تعبیر تھے عین اسی زمانے سے یہ ناول پوری آب و تاب سے گذرتا ہے مگر اس کے کردار اپنے نفسی اعمال میں اس قدر غرقاب ہیں کہ دور دور تک یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کس پر آشوب دور سے گذر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ فسادات کا اچانک خونین اور غیر انسانی تذکرہ ایک اکراہ پیدا کرتا ہے اور اس ناول میں نہایت مصنوعی اور غیر فطری اضافہ معلوم ہوتا ہے' اور اگر یہ نہیں تو پھر یہ ثابت کرتا ہے کہ مصنف اپنے زمانے سے تو بے خبر تھا ہی ناول نگاری کے تقاضے سے بھی بے بہرہ رہا اور وہ مفروضے کے طور پر بھی کسی خارجی اور معاشرتی تبدیلی اور فضا کو اپنے کابوسی نگار خانے میں داخل نہیں ہونے دیتا اور آخر میں ایک غیر فطری طرز عمل کا شکار ہو جاتا ہے۔'

اسی طرح ایلی کا روحانی تجربات کا سلسلہ تو فسادات کے ذکر سے کچھ پہلے ہی' جب سے ایلی کے عشق کے شعلے سرد ہونے لگتے ہیں تبھی سے شروع ہو جاتا ہے' مگر اس ناول کے تمام روحانی کردار بھی سوائے ڈاکٹر کی کچھ اداؤں کے "علی پور کا ایلی" کے اور کرداروں کی طرح غیر فطری ہی معلوم ہوتے ہیں ان کے گیارہ سو صفحات کے اس ضخیم ناول میں جن کرداروں نے پوری عمر گزاری ہے' نصف سے زیادہ ناول گذر جانے کے بعد ان کرداروں میں کہیں روحانی تو روحانی کسی باطنی یا اندرونی پیاس اور تشنگی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا' لہٰذا جب پیروں فقیروں تک پہنچنے کی مہم ہی موجود نہیں ہے تو اسے بھی اسی تھکن یا بڑھاپے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے یا تخلیقی شعبہ بازی کا ایک مظہر "علی پور کا ایلی" کا نصف آخر اتنا غیر فطری اور فارمولہ بازی کا شکار دکھائی دیتا ہے کہ مصنف کے تخلیقی خلوص پر سے ہی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔'

دراصل "علی پور کا ایلی" کسی ایسے معاشرے اور خطے کی ترجمانی کرتا ہے جو جسم اور جسمانی خواہشات سے لطف اندوز ہونے' تسکین حاصل کرنے اور نشاط اندوزی کے علاوہ کسی باطنی یا روحانی صداقت اور حقیقت سے آگاہ ہی نہیں ہے' ایسا معاشرہ جو اپنے جسم کے اندر کسی غیر جنسی تشنگی کسی آواز دوست یا مادی تجربے کے سوا کسی ہستی کی چاپ سے آشنا نہیں ایسے معاشرے میں انحطاط اور تکان کے بعد ستانے کے لئے کسی فریب کسی فلسفے اور کسی کرشمے کا دامن پکڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا' جس معاشرہ میں روحانی تجربہ اس کے اپنے اندر موجود نہ ہو بلکہ اپنے روحانی افلاس عجز اور تلافی کے لئے اسے باہر سے "روحانی بت" تراشنے پڑتے ہوں وہ یقیناً مجذوبوں اور پیروں کی فرق عادات کا سہارا لئے بغیر روحانیت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر آپ ذرا گہری نظر سے اس کو دیکھیں تو یہ جسم کے بے مہار اور منہ زور جذبوں کے ردعمل اور تکان کے علاوہ جنم نہیں لے سکتا۔ محض پیروں فقیروں کا معاشرہ دراصل اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ اس کے اپنے اندر کوئی ایسی بنیادی صداقت اور کوئی ٹھوس حقیقت موجود نہیں' جس کی بنیاد پر فرد اپنے اندر سے چیزے دیگراست کی طرف بڑھنا شروع کرتا ہے۔' ایک ہزار صفحے کا یہ ناول بھی ایسے ہی معاشرے سے پیدا ہوا ہے' جو ہمہ وقت محبت کے عمل میں مصروف ہونے کے باوجود اپنے وجود کی حقیقی تشنگی سے ناآشنا ہے اور سینکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے محبت کے ہزار ہا حوالوں' اقسام اور چہروں کے باوجود اپنی

روح کی تشفی کے لئے باہر کے چہروں کا مرہون منت ہے' صوفیوں کے طرز احساس اور ان کی تاریخ کے معنی تو ممتاز مفتی پر کھلے ہی نہیں! بھری جوانی اور بھری دیوی بہار میں جسم پر ٹاٹ کا پیوند لگا لباس' روح پر خاک کا ذائقہ اور جسم سے پرے کی آگ کو محسوس کرنا اور بات ہے اور سب بہاریں لوٹ کر مجبوری اور بیچارگی کے عالم میں درویشی اور روحانی کرشموں کی پناہ لینا اور بات ہے!

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ "علی پور کا ایلی" کی ان کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود اردو میں اس کے علاوہ کوئی ایسا ناول موجود نہیں ہے جو صرف نفسیات کے موضوع پر لکھا گیا ہو اور جس میں عورت کے حوالے اور تعلق سے ایک بہت بڑا "پینوراما" تخلیق کیا گیا ہے۔' میں ذاتی طور پر افسانہ نگار ممتاز مفتی کو ناول نگار ممتاز مفتی پر ترجیح دیتا ہوں اور افسانہ نگار بھی وہ جو "علی پور ایلی" سے پہلے موجود تھا' انوکھے زاویوں اور زندگی کے جمالیاتی خدوخال کا خالق افسانہ نگار' جو ہمیں اندر کی بعض صداقتوں سے آشنا کراتا ہے یقیناً یہ ممتاز مفتی اردو افسانے میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کے ساتھ ساتھ علی پور کا ایلی بھی اپنی کمزوریوں سمیت اپنے موضوع کی انفرادیت کی بناء پر ہمیشہ حوالے میں آتا رہے گا۔ ایک منفرد ناول نگار اور بڑا افسانہ نگار۔ ممتاز مفتی

نسیم نیشور فوز

مغربی مصوری کے جدید تر رجحانات

امریکن سنگ تراش اور ادیب ڈونالڈ جڈ نے ۱۹۶۵ء میں یہ اعلان کیا کہ مصوری کی موت ہو چکی ہے۔ یہ مصوری اپنی تمام تر روایات سمیت تھک ہار چکی ہے لہٰذا اب اسے ویڈیو، فلم اور تھیٹر جیسے نئے میڈیا کے ساتھ مل جل کر کام کرنا چاہئے۔

آرٹ کی دنیا کے کئی دانشوروں کے نزدیک مغربی مصوری اپنے دھارے میں بہتے بہتے دم توڑ چکی ہے۔ ایسی مصوری کو اب سنڈے پینٹرز SUNDAY PAINTERS اور فٹ پاتھ آرٹسٹوں کے حوالے کر دینا چاہئے۔ مصور وکٹر برگن نے دوسروں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ..... "میں نے ۱۹۶۵ء میں مصوری اس سخت د کرخت وجہ سے چھوڑ دی کہ مصوری فرسودہ ٹیکنالوجی بن چکی ہے۔ کافی زیادہ پینٹنگز اور سنگ تراشی کے نمونے دنیا بھر کے آرٹ عجائب گھروں کے تہ خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، پھر زیادہ مصوری کیوں کی جائے؟" یہ ماحولیاتی طور پر غیرصحت مندانہ کام ہے۔ "دنیا بھر میں آرٹسٹ مصوری کر رہے ہیں، لیکن یہ بصری آرٹ کا اس طرح کا مرکزی عمل نہیں رہا جیسے صدیوں پہلے ہوا کرتا تھا۔"

ایسی مصوری جو اس وقت تخلیق کی جارہی ہے۔ رہتا" روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکی ہے۔ انسانی پیکر بنانے والے اکثر مصوروں نے اپنے سر ریت میں دبا لئے ہیں اور ایسی تصویروں کو روایتی طریقوں سے بناتے ہوئے جیسے اس موجودہ صدی میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی۔

پاپ آرٹ (Pop-ular) جو امریکی ابلاغ عامہ کی امیجری کا پسندیدہ آرٹ تھا۔ چیلنج کی بجائے محض فنکارانہ کاریگری کا آرٹ ہوکر رہ گیا ہے۔ یوں بھی پاپ آرٹسٹوں کی سب سے بڑی مخالفت تجرید نگار مصوروں سے تھی۔ تجریدی آرٹ کے نتائج کبھی کبھار خوبصورت ہونے کے باوجود خلائے محض کی طرح کھوکھلے تھے۔ یہ بیزارگی اور بوریت کی جمالیت تھی۔ ایسی مصوری کا اس زندگی سے بہت کم تعلق تھا جو ہمیں ایک سڑک پر رواں دواں نظر آتی ہے۔ یعنی عصر حاضر کی مصوری اکیڈمک آرٹ کی مانند فرسودہ اور بے معنی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود مغرب کی عصری مصوری کو مرکزی نقطے پر آنا ضرور تھا۔ ایسی مصوری کے مختلف روپ تھے۔ اس میں ایک سٹائل کا نام نیو پینٹنگ (NEW PAINTING) تھا۔ نیوپینٹنگ سٹائل کے مصور اپنے احساسات و جذبات، اپنے خواب اور جدید زندگی کی کشاکش کا اظہار چاہتے تھے۔ ان کے سٹائل کا وارودمدار ترقی پسند، روشن خیال اور انسان دوستی پر نہ تھا بلکہ اپنے عہد کی ثقافتی اور نفسیاتی شکست و ریخت پر تھا۔ نیو پینٹنگ کا مقصد ایسے اظہاریت پسند آرٹ کی گہری ضرورت تھی جو عصری عہد کی داخلیت کا اظہار ہو ایسی مصوری اپنی نمائندہ امیجری (IMAGERY) کے استعمال میں زندگی کے حقیقی تجربات سے

عبارت بھی کہلا سکے۔

مصور اور ناقدین فنون لطیفہ اس بات کا مکمل شعور رکھتے تھے کہ اکثر و بیشتر فن پارے مصوری کی تاریخ میں رسما" تک اپنا مقام نہیں پا سکے یعنی ایسے فن پارے نسبتا" سیدھی ترقی کی منزل نہیں پا سکے جو کیوب ازم سے شروع ہو کر تجریدیت تک پہنچ چکی ہے' ایک بڑھتا ہوا شعور یہ بھی تھا کہ کتنے مصور جنگ عظیم کے بعد اظہاریت اور پیکریت کا مناسب استعمال کر سکے۔ فرانسیس بیکن (FRACIS BACON) بالتھس (BALTHUS) گولب اور کوبرا (KOBRA) تحریک کے مصور ایسی اظہاریت اور پیکریت کے جانشین ثابت ہوئے۔

نیو پینٹنگ تحریک کے جرمن مصور جارج بیس لیٹز JEORGE BASELITZ اور مارکس لوپرٹز LUPERTZ ہیں جو کم از دو دھائیوں سے اظہاریت کے انسانی پیکر بنانے میں مشغول ہیں۔ عموما" نیو پینٹنگ تحریک سے منسلک مصور ہماری حقیقی زندگی کے مناظر اور انسانی پیکر دکھاتے ہیں حالانکہ یہ منظر اور پیکر متھ (MYTH) اور خوابوں کے جال میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ روایتی پیکریت کی صحیح حقیقت نگاری نہیں ہے۔ یہ مصور ایسی پیکریت اس مصورانہ حرکات و سکنات کے ساتھ پیش کرتے ہیں جسے ڈھیلی ڈھالی فاسٹ پینٹنگ کہا جاتا ہے اور یہ تکنیک تجرید نگاری سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی تجریدیت حقیقی دنیا کی امیجری اور تحت الشعور سے تعلق رکھتی ہے اطالوی مصور سانڈ روچیا (SANDRO CHIA) کی تصاویر خواب دنیا کی حسیات دکھلاتی ہیں۔ نیو پینٹنگ کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ہمارے تحت الشعور کی امیجز (IMAGES) دکھلائے۔ نیو پینٹنگ ہماری دنیا کے طبعیاتی تجربات دکھانے میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے۔

یہ بات ہسٹری آف ماڈرن آرٹ میں لکھی جا چکی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے اواخر میں اور ۱۹۸۰ء کے آغاز میں جب نیو پینٹنگ تحریک ابھری تو اس تحریک کا آغاز مغربی جرمنی اور اٹلی میں ہوا اور اس کا دائرہ کار بڑھتے بڑھتے امریکہ' برطانیہ اور فرانس تک۔ پھیل گیا اور جب نیو پینٹنگ کے رجحانات جاپان اور آسٹریلیا جیسے دور دراز ممالک میں پھیل گئے تو ۱۹۹۰ء کی آمد تک جدید مصوری کا پورا تناظر تبدیل ہوگیا۔ ۱۹۷۰ء تک جتنی بھی بین الاقوامی نمائشیں کی گئیں' ان نمائشوں کا مرکز و محور ایک بار جرمن آرٹ اور اس کے آرٹسٹ بن گئے۔ اس جرمن آرٹ کا اہم ترین نمائندہ مصور تھا.... جوزف بے یوز JOSEPH BEUYS ...... جس کے اعزاز میں گگن ہاؤس آرٹ میوزم نے امریکہ میں بھرپور اور جامع شو منعقد کیا۔ اس نمائش کا سنہ ۱۹۷۹ء تھا۔ اس کے بعد آنے والے سالوں میں جرمن آرٹ بین الاقوامی دلچسپی کا محور بن گیا۔ اس جرمن آرٹ کو نو اظہاریت NEW-EXPRESSIONIST کا نام دیا گیا۔ نیو پینٹنگ تحریک کی مخالفت کی گئی۔ مخالف ناقدین فن نے الزام لگایا کہ "آرٹ مارکیٹ میں اظہاریت پسند تصویریں بیچنے کا دباؤ بڑھ رہا ہے ..... یہ صداقت اور اچھے ذوق کے خلاف ایک سازش ہے۔" "آرٹ مارکیٹ کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ اس مارکیٹ میں اچھا آرٹ کبھی نہیں ہوتا جیسے جیسے آرٹ مارکیٹ بڑھتی ہے ویسے ویسے اچھا آرٹ کم ہوتا جاتا ہے۔"

ان ساری باتوں کے باوجود آرٹ کی دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ نیوپینٹنگ آرٹ اپنے عہد کی فطری تخلیق ہے' نیوپینٹنگ کی فنی اصطلاح کی شناخت بظاہر مشکل پیش کرتی ہے۔ آرٹ کی تاریخ کی کلاسیکی تحریکات کے برعکس نیو پینٹنگ کسی مخصوص سٹائل یا کسی رسمی نئی ایجاد کا نام نہیں۔ اس نئی مصوری کو کئی نام دیئے گئے۔ مثلا (نیو امیج NEW IMAGE)...... ٹرانز اوانٹ گارڈ' آزاد پیکریت جیسے متبادل نام...... دراصل

نیو پینٹنگ...... جرمن کی پرانی اظہاریت کو نئے عزائم کے ساتھ زندہ کرنا تھا مگر نیو پینٹنگ کو اظہاریت سٹائل دینے میں اتنی سچائی بھی نہیں کیونکہ اس تحریک میں کئی متوازی اور مختلف النوع رجحانات پائے جاتے ہیں لہٰذا مغرب کے ناقدین فن نے اس تحریک کو "نیو پینٹنگ" کا نام دینا ہی بہتر خیال کیا...... یا وی گا تھک پینٹنگ VISIGOTHIC PAINTING جیسا عجیب و غریب نام!!! اس تحریک کو یقیناً" پوسٹ ماڈرن ازم تحریک کا نام بھی دیا جا سکتا ہے یعنی اس پوسٹ ماڈرن ازم مصوری کا نام یا نظریہ۔ ماڈرن ازم کے نظریئے کے خلاف تھا پوسٹ ماڈرن ازم کا اصرار تھا کہ شاعری، فوٹو گرافی اور مصوری کو خود مختار تنظیمیں سمجھا جائے۔ پوسٹ ماڈرن ازم دو مسئلوں پر نگاہ رکھتا ہے اولاً" .... موضوع کی موت اور پورے وجدانی انسان کی اہمیت جو اپنی دنیا پر غالب آرہا ہو اور اسے ہدایت دے رہا ہو۔ ثانیاً"..... وہ راستہ جس پر دنیا کا وجود صرف اس کی اپنی نمائندگی سے ہو........ اس نمائندگی کی حقیقت کو ہم صرف ابلاغ عامہ کے ذریعے ہی سمجھ سکتے ہیں۔(مثلاً ٹیلی ویژن' ویڈیو ہالوگرافی HOLOGRAPHY اور پکچرز وغیرہ)

ماڈرن ازم کا تعلق امریکی تجریدی مصوری سے تھا جس کی شہرت یافتگی اور سنسنی خیزی (۱۹۵۹ء میں) تجرید اظہاریت پسند جیکسن پولاک اور ولم ڈی کوننگ (Kooning) کی وجہ سے خاص طور پر تھی مگر وہ تجرید اظہاریت پسندی انتہائی خود پسندی اور بے معنی نرگسیت میں گھر کر رہ گئی لہٰذا اس تحریک کو سنبھالا دینے کے لئے ناقدین فنون لطیفہ کا سہارا لیا گیا۔ پھر بھی ایک ناقد فن کو کہنا پڑا کہ اب ناقد فن "آرٹسٹ" ہے یعنی فنکارانہ اہمیت ناقدفن کے پاس ہے جبکہ آرٹسٹ اس کے بحث و مباحث کی خاطر مصوری کر لیتا ہے ایسی امریکن تجرید پسندی کے خلاف ردعمل ناگزیر تھا۔ اس ردعمل نے نیو پینٹنگ تحریک کو مشہور و مقبول بنا دیا ہے۔

رائل اکیڈمی آف آرٹس (لندن) نے ۱۹۸۱ء میں ایک نمائش بعنوان A NEW SPIRIT IN PAINTING منعقد کی۔ مارٹن گروپیئس باؤ نے برلین میں ۱۹۸۲ء میں ZEITGEIST کے عنوان سے نمائش کی۔ اس موضوع پر SKYART CONFERENCE کے عنوان سے میونخ میں ایک سیمینار ۱۹۸۳ء میں کیا گیا۔ بڑے بڑے ناقدین فن کی تحریریں پس پشت ڈالی دی گئیں تب عالمی آرٹ کے پس منظر میں نیو پینٹنگ تحریک پیش پیش تھی' بہت پہلے اسی قسم کا ردعمل ۱۹۶۰ء کے اوائل میں کیا گیا جبکہ جاسپر جونز' رابرٹ راشن برگ اور اینڈی وارھول جیسے مصور ابھر رہے تھے۔ کیونکہ یہ امریکی مصور اپنے ملک کے آرٹ کو بالکل امریکن مزاج دینا چاہتے تھے۔ ان مصوروں نے جدید امریکی آرٹ کو تجریدیت کی انتہاؤں تک پہنچا دیا مگر امریکی مصوروں کی فنکارانہ برتری ۱۹۷۰ء کے اواخر تک اپنے خاتمہ تک پہنچ گئی۔ یورپ اپنی پرانی روایات کی طرف لوٹ آیا اور اس کو آرٹ کی دنیا میں ایک بالکل ہی نئی شناخت مل گئی۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ نیو پینٹنگ کا اہم ترین نمائندہ جرمن مصور جوزف بے یوز Joseph Beuys ہے جسے ایک ہوائی حادثے میں سلامت بچ جانے نے یہ سکھایا کہ نیچر کے ساتھ جبلی واسطہ رکھو' عالم حیوانیات کے ساتھ اپنا رشتہ ناطہ مضبوط کرو..... جوزف بے یوز کو یقین تھا کہ اس طرح ہم ایک بہتر دنیا کی جانب بڑھ سکیں گے اور ایک ایسا مثالی معاشرہ بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے جس کا دارومدار ہر فرد کی قوت تخلیق پر ہوگا۔ جوزف بے یوز کے نزدیک آرٹ مادی اشیاء میں روحانی توانائی دکھلاتا ہے۔ اس کے تاریخی و سیاسی مسائل اتنے زیادہ ہیں جو ایک مجموعی زخم بن چکے ہیں' صرف آرٹ ہی ایسے

مجموعی زخم کا علاج ہے اس لئے ہر مرد اور عورت کو چاہئے کہ وہ حیوانوں اور نیچر کی طاقتوں کے ساتھ فطری اور تخلیقی آہنگ کے ساتھ رہے۔

نیو پینٹنگ میں ایک اہم بات ان مصوروں کا اپنا پورٹریٹ بنانا بھی ہے یعنی سیلف پورٹریٹ Self Portrait...... لیکن ان مصوروں کے سیلف پورٹریٹ ریمبران اور فنسنٹ وان گو کے پورٹریٹ سے بالکل مختلف ہیں ان کے اپنے پورٹریٹ محض چہرے یا نقاب نہیں۔ ان کے پورٹریٹس (PORTRAITS) میں عصر حاضر کا سارا اضطراب' اضمحلال چھپا ہوا ہے۔ کلاسیکی عہد کے مصورین کے پورٹریٹ فقط ان کے جذبات و احساسات کی عکاسی کیا کرتے تھے جبکہ نیو پینٹنگ کے مصورین کے سیلف پورٹریٹ اپنے چہرے کی خوف و دہشت نہیں بلکہ پورے عہد کی خوف و دہشت کو پیش کرتے ہیں۔

دوسرے بڑے جرمن مصور جورج ڈوکوپل نے ۱۹۸۴ء میں جو اپنی سیلف پورٹریٹ سیریز بنائیں اس میں اس کا خوفزدہ چہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ناک سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے سر سے ایک پھول ابھر رہا تھا جو مرجھا چکا تھا۔ یہ سلف پورٹریٹ تحت الشعور کا نگاہوں کو خوف زدہ کر دینے والا ایک ڈرامہ ہے۔

نیو پینٹنگ کا ایک خاص رجحان قوت خیال کی غیر عقلیت کی جانب ایک قدم ہے یعنی ایک ذہنی اخراج۔ دوسرا خاص رجحان تشدد آمیز حقیقت نگاری کو اپنانے کا رجحان ہے۔ انسان یا خود مصور زندگی کے علاوہ خالص روح نہیں رہا بلکہ وہ زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں گھرا ایک ایسا تار بن گیا ہے جو خدا جانے کب ٹوٹ جائے۔

نیو پینٹنگ تحریک کے دوسرے نام "نو اظہاریت" "نیو پینٹنگ" این کرونسٹک پینٹنگ Anchronistic painting کی پوسٹ گرافیٹی POST GRAFFITY وغیرہ ہیں...... نیوپینٹنگ کی ایمجری شاعرانہ ہے' آزاد خیال ہے مگر یہ ایمجری ہمارے گرد و نواح سے حاصل کی گئی ہے۔ اس میں حقیقت نگاری پیکر نگاری اور صورت نگاری ہے' تجریدیت سے لگاؤ برائے نام ہے۔

حرف آخر کچھ یوں ہے کہ نیو پینٹنگ اظہار پسندی کی ان نئی جہتوں کی تلاش میں ہے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔

انور زاہدی

اے۔ کے سجاد' ایک صوفی مصور

اے کے سجاد نے مشرقی پنجاب کے ایک متمول راجپوت گھرانے میں ۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو آنکھ کھولی اور اپنا بچپن ایک ایسے علاقے میں گذارا جو مناظر فطرت کے حسن سے مالا مال تھا۔ بچپنے میں وہ اپنا بیشتر وقت مصنوعی جھیلیں' نہریں' انواع و اقسام کے پلوں کے نمونے بنانے میں صرف کرتا جبکہ اس کے اردگرد پھیلی ہوئی دلفریب دنیا اپنے حسن و جمال اور تمام اسرار کے ساتھ اس کے اندر چھپے ہوئے فنکارانہ مزاج کی تسکین کا باعث بنتی۔ لیکن بچپنے کا یہ سحر آفریں دور سجاد کے لئے بہت مختصر عرصے پر محیط رہا' کہ ابھی وہ محض تین برس کا تھا جب اس کے والد کا (جو بہاولپور ریاست میں ڈپٹی کمشنر تھے) انتقال ہوگیا۔ والدین کا گھر سیلاب کی نذر ہوا اور بقایا تمام زندگی سجاد کی والدہ کو مصائب سے دوچار رہنا پڑا۔ ان تمام حالات نے اے کے سجاد کے ذہن پر چھوٹی سی عمر میں کبھی نہ مٹنے والے اندوہناک نقش ثبت کر دیئے' اس طرح اس کی بے فکر اور خوش حال زندگی میں عدم تحفظ کا کبھی نہ بھرنے والا ایک بے کراں خلاء پیدا ہوگیا' اور عدم تحفظ کا یہ خوف جو بچپن میں سجاد پر سایہ فگن ہوا تھا۔ آنے والی زندگی میں بھی ہمیشہ اس کا دامن گیر رہا۔

بہاولپور میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سجاد کو علی گڑھ یونیورسٹی بھیج دیا گیا' جہاں کے علمی ماحول نے اس میں فن مصوری اور علم تصوف کی چنگاری کو روشن کیا۔ گھنٹوں وہ یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھا عظیم مصوروں بوتیسیلی' لیونارڈو ڈاونسی' مائیکل انجلو اور رافیل کی صحبت میں وقت گذارتا۔ علی گڑھ کے دوران قیام اسی طویل مطالعے نے اس میں ایک مصور بننے کے جذبے کو ابھارا اور اس طرح اے کے سجاد کے دل میں مصوری کی تعلیم کے لئے روم جانے کا خیال پیدا ہوا۔ علی گڑھ کی تعلیم کے بعد کچھ وقت اس نے بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں لگایا' یہ اسکول اس وقت فن مصوری کی تعلیم کے لحاظ سے برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد مثالی ادارہ تھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد سجاد کو شملہ میں وزارت تعلیم میں نوکری مل گئی' جہاں سے کچھ عرصے بعد اسے نئی دہلی کی امپریل سیکرٹریٹ لائبریری میں جو وزارت تعلیم ہی کا ادارہ تھا' کام کرنے کا موقع ملا یوں سجاد کو اس بہانے فن مصوری اور فلسفہ پر کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے کافی مواقع میسر آئے' جس نے روم کے سفر کو مہمیز دی۔

تین سال تک وہ روم کے لئے کسی وظیفے کی جستجو میں سرگرداں رہا لیکن اس میں ناکامی ہوئی اسے اس تجربے سے بھی گذرنا پڑا کہ فنکار کی حیثیت سے زندہ رہنا مشکل ہی نہیں بے حد تکلیف دہ بھی ہے۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی وہ کراچی آگیا' جہاں اسے کئی برس سخت محنت سے وقت کاٹنا پڑا۔ اس عرصے میں تصویر کشی کے لئے شاذ ہی وقت میسر آتا لیکن کراچی کے دوران قیام میں سجاد والٹیر' روسو' کانٹ' نتشے' ڈارون' مارکس اور فرائیڈ کے مطالعے میں مستغرق رہا۔ بلاشبہ یہ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں دنیا بھر کو جدید فکر سے روشناس کرایا تھا' ۱۹۵۰ء میں سجاد کو روم میں پاکستان کے

سفارت خانے میں انتہائی کوششوں اور اس وقت وزارت خارجہ میں موجود جے اے رحیم کے توسط سے جو ایک عمدہ مصور اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کے پرستار بھی تھے' نوکری مل گئی' اس طرح سجاد کے روم پہنچنے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوئی۔ سفارت خانے میں وہ ایک اچھے منصب پر فائز رہا' یہاں کے دس سالہ قیام میں اسے اپنے شوق کے تمام مراحل سے گذرنا پڑا۔ روم میں سجاد نے آکیڈمی آف فائن آرٹس کو باقاعدہ جوائن کر لیا اور فن مصوری کو' جس میں فلسفہ اور علم اساطیر بھی شامل تھے بحیثیت طالب علم پڑھا۔

اسی اکیڈمی سے ۱۹۶۰ء میں فن مصوری میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد سجاد ایک سال کی چھٹی لے کر لندن چلا گیا جہاں' اسے برٹش میوزیم نیشنل گیلری آف آرٹس اور صیرا ممتہ کالج آف آرٹس میں عظیم مصوری کی شاہکار تخلیقات کو پینٹ کرنے کے مواقع ملے۔

۱۹۶۱ء میں اے کے سجاد کی تقرری پیرس کے پاکستانی سفارتخانے میں ہوگئی اور اسی سال وہ وہاں سے یونیسکو میں منتقل ہوگیا' جہاں ایجوکیشنل پلاننگ میں اس نے بیس سال تک کام کیا۔

اس مدت میں سجاد کو پیرس کی مشہور عالم ACADEMIE DE LA GRANDE اور دوسرے معروف اداروں میں فن موسیقی کی تاریخ کے علاوہ فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں کے مطالعہ کے لئے بھی وقت ملتا رہا۔

پیرس میں اس کی مصوری کی کئی نمائشیں منعقد ہوئیں جن میں اسے بے شمار انعامات بھی ملے۔

۱۹۶۸ء میں مصوری کے میدان میں تقریباً" بیس برس صحرا نوردی کے بعد سجاد نے اپنی پہلی کتاب THE SUFI HERMIT OF THE ROCKS پر کام شروع کیا۔ اپنی پہلی تخلیق کو سجاد نے جدید زمانوں کے لیے قدیم دانش کا نام دیا ہے۔ اس کتاب پر کام کرنے کے دوران اس نے قرآن مجید' بائیبل' بھگوت گیتا اور بہت سی دوسری مذہبی کتابوں کے علاوہ یونانی اور رومن دیومالائی قصوں' جدید اور قدیم فلسفوں کا بھی مطالعہ کیا۔ لیکن قدیم ایرانی صوفی شعرا کے مطالعے نے سجاد کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

۱۹۶۹ء کا سال اس کی زندگی میں سب سے بڑے المیے کی صورت میں سامنے آیا جب دسمبر کے مہینے میں اس کی ماں' جو والد کی وفات کے بعد اس کی زندگی کا مرکز و محور رہی تھی' اس جہاں سے کوچ کر گئی' ماں کے انتقال کی خبر سنتے ہی وہ فرانس سے وطن لوٹا' لیکن اسے اپنی ماں کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور یوں غم زدہ سجاد گرفتہ دل لئے ہوئے پیرس لوٹ گیا اس حادثے نے اس کی زندگی کو یکسر بدل کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔ انتقال کے وقت اپنی ماں کے پاس نہ ہونے کے احساس جرم نے اسے کہیں کا نہ رکھا اور ایک عرصہ وہ بے مقصد پیرس اور ورسیلز کے مضافاتی علاقے میں شاھرپل کے جنگلات میں گھومتا رہا۔

۱۹۷۰ء میں اس کی کتاب THE SUFI HERMIT OF THE ROCKS مکمل ہوگئی' لیکن اب اس مسودے کو چھاپنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ چھتیس مرتبہ مختلف پبلشروں نے جن میں پاکستان کے پبلشر بھی شامل تھے' اس مسودے کو رد کیا۔ جس کے نتیجے میں سجاد سخت مایوس ہوا اور ایک مرتبہ وہ شدید احساس تنہائی کا شکار ہوگیا۔ یہاں ایک بار اس کے دوستوں نے سجاد کی مدد کا ارادہ کیا اور قدرت اللہ شہاب' بیگم احسان قادر' نسیم نور بیگ اور ان کی بیگم نے مل کر سجاد کی شادی کا بندوبست کیا۔ اس طرح اے کے سجاد ۱۹۷۴ء میں طویل تنہا زندگی گذارنے کے بعد ایک پڑھے لکھے شریف خاندان کی لڑکی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا جس سے اس کی زندگی میں ایک تغیر رونما ہوا اور سجاد نے ازسرنو مصوری اور لکھنے

پڑھنے کے ادھورے کاموں کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ ۱۹۸۰ء میں مسودے کی تکمیل کے مکمل دس سال بعد سجاد کی مصور کتاب THE SUFI HERMIT OF THE ROCKS کو پہلی مرتبہ ہندوستان کے ایک پبلشنگ ادارے آریا بک ڈپو نے اہتمام سے شائع کیا۔

۱۹۸۲ء میں ہندوستان کی حکومت نے اس کتاب کو سینٹرل گورنمنٹ اسکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کر دیا۔ کچھ عرصہ میں اسی کتاب کو اسلام آباد کے ماڈرن بک ڈپو نے شائع کیا اور یوں اے کے سجاد کی شہرت ایک دوسرے ملک سے پاکستان پہنچی۔

اے کے سجاد کی تحریر میں زبان و بیان کی روانی اور فکر و مطالعے کی گہرائی کے ساتھ جہاں اصل حقیقت اور سچائی کی تلاش کی بھرپور جستجو ملتی ہے وہیں محبت، حسن، نیکی اور جذبے کی جھلملاہٹ بھی نظر آتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ، یہ کتاب سجاد کی روح پرور مصور تخلیقات سے مزین ہے۔

اے کے سجاد کی تصاویر بے حد خیال انگیز ہیں اور غور و فکر کی دعوت کے ساتھ زمین و آسمان کے مالک کی مدح کرتی دکھائی دیتی ہیں، تقریباً ۳۶ سال یورپ میں مصور کی حیثیت سے زندگی گذارنے اور فن مصوری میں نام پیدا کرنے کے بعد جب سجاد وطن واپس لوٹا تو وہ پہلے سی دنیا موجود نہ تھی۔ ماں کا انتقال ہوئے تو ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اب اس کے ہم عصر بہت سے عزیز و اقارب اور دوست بھی، جو کسی نہ کسی بہانے اس کے ہی خواہ رہے تھے موجود نہ تھے۔ جے اے رحیم جنہوں نے سجاد کو روم بھجوانے میں خاصی مدد کی تھی سجاد کی آمد کے ایک ماہ بعد ہی چل بسے۔ قدرت اللہ شہاب کو اس کی کتاب THE SUFI HERMIT OF THE ROCKS کا دیباچہ لکھنے کی فرصت مل سکی اور پھر وہ بھی اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ سجاد اپنے وطن میں ان عزیز ہستیوں کو نہ پاکر ایک بار پھر تنہائی میں کھو گیا۔ جس کے نتیجے میں اس نے اپنی پہلی کتاب کو دوبارہ ترتیب دیا اور دوسری تخلیق THE HEAVEN REPLIED اور ABANDON NOT THE PATH OF RIGHTEOUSNESS میں نئے ابواب کا اضافہ کیا۔

مختلف میڈیم اور وضع وضع کے اسٹائل میں کام کرنے کے بعد سجاد نے صرف اپنے لئے دو اسٹائل منتخب کئے۔ بین الاقوامی اسٹائل جس میں اس کی مصوری کا زیادہ کام ملتا ہے۔ اس اسٹائل میں وہ صوفیانہ تصاویر اور پینٹنگز بناتا ہے جن میں انسانی اجسام کی تصاویر سے اس نے اپنی تحریروں کو مصور کیا، یہ تصاویر ہمیں اپنے وقت کے عظیم مصوروں لیونارڈو، مائیکل اینجلو، بوٹیسلی وغیرہ کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ سجاد یورپ کے دوسرے بڑے مصوروں بوش، گویا، گوناؤور اور بلیک سے بھی متاثر نظر آتا ہے سجاد کی مصوری کا دوسرا اسٹائل خالصتاً مشرقی ہے جہاں وہ ایران مغل منی ایچر مصوری کو دہراتا دکھائی دیتا ہے۔ اس وضع کی بیشتر تصاویر زمانہ قدیم کے عظیم صوفی درویشوں اور اہل علم شخصیات پر مبنی ہیں۔ مصوری کے اس اسٹائل میں سجاد ایک طرف تو مشرق کی ان قدیم شاندار روایات کو زندہ کرتا ہے جو نو آبادیاتی نظام میں گم ہو چکی ہیں اور دوسری جانب جدید انسان کے مادی رویئے کو جو ساری انسانیت کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے رد کرتا نظر آتا ہے سجاد کی اس وضع کی مصوری نیکی کی اعلیٰ و ارفع قدروں کو تخلیق کرتی ہیں اور انکساری ندامت اور خدا ترسی جیسے بلند آدرشوں کی ہدایت بھی دیتی ہیں سجاد کی یہ تصاویر امید اور زندگی کی مقصدیت کا اشارہ فراہم کرتی ہیں جسے آج کے اس میکانکی دور میں ہم خود غرضی لالچ اور ہوس کے جال میں پھنس کر بھول چکے

ہیں۔

تیسرا اسٹائل جس میں اے کے سجاد آج کل کام کررہا ہے وطن واپسی پر' اس وقت والے معاشرے میں جب اسے ہر طرف لوٹ مار نفسا نفسی' سیاسی دہشت گردی اور اخلاقی گراوٹ کی صورتحال نظر آئی تو ایک نئے کرب سے دوچار ہوکر اس نے بالکل منفرد تصاویر بنانا شروع کیں۔ ان پینٹنگز میں سجاد نے انسانی اجسام پر گدھوں کوؤں' الوؤں' بھیڑیوں لومڑیوں اور دوسرے جانوروں کے چہرے دکھائے ہیں۔ سجاد کے بقول لاکھوں سال کے ارتقائی مراحل سے گذر جانے کے بعد بھی انسان میں.ان جانوروں کی جبلتیں ابھی تک پوشیدہ ہیں۔ ان تصاویر کو سجاد نے THE ANGELS OF REPAINTING کا نام دیا۔

سجاد کی دوسری کتاب THE HEAVEN REPLIED اس کے فلسفیانہ رویئے کی غماز ہے جس میں سماجی اور اخلاقی بحث کو اٹھانے کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کو اکیسویں صدی کے درپیش گھمبیر مسائل کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ اس کتاب میں سجاد نے روایت کے انحطاط کے ساتھ بھوک ننگ جنگ اور دوسری آفات کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے .سجاد کے بقول کہ ارض پر انسان خود اپنی تباہی کا باعث ہوگا ۔ اور اس کی دانست میں موجودہ شیطانی نظام بالآخر اسی طرح ختم ہو جائے گا جس کی پیشین گوئی پیغمبر اسلام آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی کر دی تھی۔ اور دوسرے مذاہب کے صوفیوں اور درویشوں نے بھی اپنے اپنے زمانوں میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کرہ ارض کے خاتمے کے بارے میں بات کرتے ہوئے سجاد بطور خاص آبادی کے بڑھتے ہوئے عذاب' دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی' ماحول کی آلودگی اور عہد جدید کے انسان کی خدا سے لاتعلقی کا شدومد سے ذکر کرتا ہے۔

مصوری کی کئی فلسفیانہ کتابوں اور 'THE SUFI HERMIT OF THE ROCK علاوہ سجاد نے اردو زبان میں رباعیات بھی کہی ہیں اور اس مجموعے کو ندائے سجاد کا نام دیا ہے۔ آج کل کی مصوری فلسفہ اور شاعری کے علاوہ انگریزی زبان میں تحریر کردہ اپنے افسانوں کے مجموعے HOW I LOST ALL MY GOD's کو ترتیب دیا ہے دیکھنا یہ ہے' کہ مصوری' فلسفہ شاعری اور صوفیانہ تصوف کے میدان میں عمر گذارنے کے بعد سجاد کے افسانے قاری پر کیا کیا انکشاف کرتے ہیں۔

عمل : اے ۔ کے سجاد

عمل: اے ـ کے ـ ج

عکس : اے ۔ کے سجا

پیٹر نکلس

مثال کے طور پر جوئیس ۔ ۴

"یہ جو ڈلن (Joe Dillon) تھا جس نے ہمیں (Wild West) وا یلڈویسٹ سے متعارف کروایا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سے لائبریری تھی جو (The Union Jack) '(pluck)' (The Halfpenry Marvel) دی یونین جیک' پلک اور دی ہاف پینی ماردل کے رسالوں پر مشتمل تھی۔ ہر شام کو مدرسہ کے بعد ہم اس کے پائین باغ میں اکٹھے ہوتے تھے اور ریڈ انڈین لڑائیاں لڑتے تھے۔ وہ اور اس کا موٹا ننھا بھائی' نکالیو' اصطبل کے اسٹور کی حفاظت کرتے تھے' جب کہ ہم اس کو ایک ہلے میں فتح کرنے کی کوشش کرتے تھے' یا ہم باغیچے میں میدانی جنگ لڑتے تھے۔ مگر خواہ ہم کتنی بہادری سے لڑتے تھے' ہم سے کوئی محاصرہ یا لڑائی جیتی نہ جا سکی' اور ہمارے سارے حملے جوڈلن کی فتح کے بھنگڑے پر ختم ہوا کرتے تھے۔ اس کے والدین ہر صبح آٹھ بجے کی چرچ سروس میں شرکت کے لئے گارڈ نیر اسٹریٹ جایا کرتے تھے اور مسز ڈلن کی پرامن بوباس گھر کی ڈیوڑھی میں پھیلی ہوتی تھی۔ مگر ہمارے مقابلے میں' جو چھوٹے اور ڈرپوک تھے' وہ بہت وحشیانہ انداز میں کھیلتا تھا۔ وہ کسی ریڈ انڈین سے کم ملتا جلتا نہ لگتا تھا' جب وہ ایک پرانی ٹیکوزی کو سر پر پہنے ہوئے باغ میں بھگدڑ مچاتا تھا' ایک ٹین کے کنستر پر مکے مارتا تھا اور چلاتا تھا:

یا' یکا' یکا' یکا!

کسی کو یقین نہ آتا تھا' جب کہا گیا کہ وہ پادری بننا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت تھی۔ ایک باغیانہ روح ہم میں پھیل گئی اور اس کے اثر کے تحت تعلیمی اور طبیعتی فرق مٹ جاتے تھے۔ ہم مل بیٹھتے تھے' بعض نزاع پسندی سے' بعض ظرافتاً" اور بعض ڈر کے مارے' اور ان خلاف مرضی ریڈ انڈین میں سے' جو گھس پیٹھیا یا کمزور طبع ہونے کی شہرت سے گھبراتے تھے' میں بھی تھا۔ مہم جوئیاں' جنکو وا یلڈ ویسٹ کا ادب بیان کرتا ہے میرے طبعی میلان سے دور تھیں' مگر انہوں نے کم از کم فرار کے لئے دروازے کھول دیئے۔"

میں نے آپ کو ڈبلینرز (Dubliners) میں سے "ایک ملاقات" نامی کہانی کا ابتدائیہ سنایا ہے۔ جیمز جوئیس (James Joyce) آج ۲ فروری ۱۹۸۲ء کے روز ایک سو سال کا ہوگیا ہوتا ۔ میرا خیال نہیں ہے کہ اسے یہ امر پسند ہوتا۔

بطور ناقابل فہم مصنف کے' وہ کبھی کا کلاسیک کا حصہ بن چکا ہے۔ بطور قابل فہم مصنف کے وہ کبھی کا مرچکا ہے۔ بطور ناقابل فہم مصنف کے' جس سے انسان نپٹ نہیں سکتا' وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ شرمندگی سے ہم اقرار کرتے ہیں' میں اقرار کرتا ہوں کہ ہم نے' کہ میں نے یولیسس (Uliysses) کو مکمل طور پر نہیں پڑھا ہے' مگر کسی قدر کم شرمندگی سے کہ ہم "Finnegans Wake" کو نہیں سمجھ

سکتے۔

بیس برس ادھر میں اپنے ہاتھ کی چھنگلی پر ایک چھوٹے سے، معمولی زخم پر فخر کرتا تھا، جو مجھے جوئس کی قبر کو تلاش کرتے ہوئے لگا تھا۔ قبروں کی قطار تقریباً درست تھی، مگر قبرستان پر مکمل چپ چھائی ہوئی تھی۔ میں پہلی بار وہاں گیا تھا اور ہاتھ سے کسی قبر پر سے برف کو ہٹا رہا تھا اور انگلی کو ایک لوہے کے تیز کنارے سے زخمی کر بیٹھا تھا۔ وہ جیمز جوئس کا نام تھا۔

یہ امر کہ وہ زیورک میں مدفون ہونا چاہیے، اسے میں نے اکیلے دریافت کر لیا تھا، اور یہ بات مجھے ایسے لگی تھی، جیسے میں واحد شخص تھا، جسے اس بات کا پتہ تھا۔ اکیلا میں اس کو دیکھنے گیا تھا اور وہ بالکل تنہا یہاں پر دفن تھا، اور وہ سرما کا موسم تھا۔

جو کچھ میں یہاں پر بیان کر رہا ہوں، وہ بیان کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ یہ امر بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ بیان حقیقت کے مطابق ہے، ادیبوں کی قبروں کی زیارتوں کا ادبی نمونہ جانا پہچانا ہے۔ وہ اس بات سے شروع ہوتی ہیں کہ آدمی قبرستان کے مالی سے پوچھتا ہے کہ اس کی قبر کہاں پر ہے اور اس ناقابل یقین اچنبھے کے ساتھ کہ مالی کو اس کا پتہ ہے۔ میں اس کہانی کو نہیں لکھوں گا۔ وہ اتنی بار لکھی جا چکی ہے اور یہ بات کافی ہے۔ اس قسم کی کہانیوں میں سے میری پسندیدہ ترین کہانی لوڈیک ہول (Ludwig Hohl) کی لکھی ہوئی کہانی ہے کیتھرین مینسفیلڈ (Katherine Mansfield) کی قبر کی زیارت کی۔

بہرصورت مالی کھڑا ہے اور جیمز جوئس کے نام کو جانتا ہے اور اس کی قبر کے نمبر کو بھی، تھوڑا سا بے دل لگتا ہے جب وہ نمبر کو روٹین کے انگ میں دوہراتا ہے۔ وہ تھوڑا سا فکرمند ضرور ہے کہ وہ یہاں پر نہ صرف دیکھ بھال کرتا ہے، بلکہ نظم و نسق بھی کرتا ہے۔ بہرصورت وہ ایک قبرستان میں کام کرتا ہے، جہاں پر نہ صرف مقامی لوگ آتے ہیں، بلکہ غیر ملکی بھی۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے قبر کے نمبر کو انگریزی اور فرانسیسی میں بھی یاد رکھا ہے۔

میں ایک اجنبی ہوں اور ایک اجنبی کے سامنے کھڑا ہوں، جو زمین کے نیچے دفن ہے۔ وہ جسے ہمیشہ انتقام کیے جانے کا خطرہ لگا رہتا تھا، قبرستان کے مالی کے نظم و نسق میں جا چکا ہے۔ وہ اس کے تحت ہے اور مجھے پیش کیا جاتا ہے۔ جیمز جوئس اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا کہ میں اس کی زیارت کے لیے آؤں اور اپنی رومانی سرما کی کہانی کا گواہ بنوں اور اس سے محظوظ ہوں۔

بیچارہ جیمز جوئس، وہ مر چکا ہے۔ یہ چیز کتنی عجیب ہے کہ انسان کو ادیبوں پر ترس آتا ہے، جب وہ مر چکے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح عجیب امر یہ بھی ہے کہ مردہ ہو کر وہ نہ صرف قارئین کے لئے رومانی بن جاتے ہیں، بلکہ غیر قارئین کے لئے بھی۔ میں جیمز جوئس کی چبھتی ہوئی طنز کو اپنی گردن کے پیچھے محسوس کر رہا ہوں، جب میں کہتا ہوں، اور مجھے میری سرما میں قبرستان کی کہانی کچھ ایسی نہیں بھاتی میں اسے استعمال کر رہا ہوں اور اس کو ناجائز طور پر برت رہا ہوں، یہ ٹھہرا اس کا انجام۔ اگر وہ زندہ ہوتا، تو میں اس کی آنکھوں تلے جانے کی جرات نہ کرتا۔ میں اس سے ناانصافی کرتا ہوں، جب میں اس کی قبر کی زیارت کے لئے جاتا ہوں۔ ناقابل فہم اس طرح قابل فہم بن جاتا ہے۔ میرا جذباتی پن اور میرا ترس کھانا اس پر اور خود اپنے آپ پر اکل کھرے آیرش کو ایک دھیمے کلاسیک مصنف میں بدل دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ انسان غلطی کا ارتکاب نہیں کرتا، اگر وہ اسے ماڈرن ادب کا باپ قرار دے۔ ایسا

باپ نہیں' جس نے اسے ایجاد یا دریافت کیا تھا۔ یہ کچھ دوسروں نے اس سے پہلے کر دیا تھا' بلکہ وہ جس نے اسے پیش کیا اور جتند اس پر قائم رہا' وہ' جو جانتا تھا کہ انسان کہانیوں کو نہیں سمجھ سکتا' اگر وہ انہیں صرف لکھنا چاہے' ورنہ بالکل نہیں' البتہ "باپ" میرا خیال ہے' اس کے لئے درست لفظ نہیں ہے۔

"..... اور ان خلاف مرضی ریڈ انڈین میں سے' جو کمس بیٹھیا یا کمزور طبع ہونے کی شہرت سے گھبراتے تھے' میں بھی تھا۔" وہ لکھتا ہے۔ گویا اولاً" ایک شخص' جو زندگی میں حصہ دار بننا چاہتا ہے' ایک شخص جو جوڈلن سے ڈرتا ہے' ایک شخص' جو جوڈلن کی طاقت اور اس کے قہر کا شکار ہے اور جس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے' جوڈلن کی کہانیوں میں' اس کی ریڈ انڈین کہانیوں میں داخل ہونے کے۔ ایک ابتدائی چرکے کا بیان' اپنی ناقابلیت کا ادراک۔

یونہی سرراہے اور سنجیدگی کے بغیر: مجھے ایک زمانے میں جنون تھا تمام مصنفوں سے' جن کے ساتھ میری ملاقات ہوتی تھی' پوچھنے کا کہ کیا انہیں اسکول میں جمناسٹک کی ورزش کے دوران بڑے گھوڑے پر سے کودنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ شاید ایک سو مصنف تھے' جن سے میں نے یہ سوال کیا تھا اور ان کے جوابات غم و محن کی داستانیں تھیں۔ صرف دو مصنف' اتنے ہی اچھے جیسے دوسرے' جمناسٹک کے ماہر تھے۔ معاف کیجئے' میں اس بات کو سنجیدگی کے ساتھ بیان نہیں کر رہا ہوں اور میں اس سے کوئی نتیجہ بھی نکالتا نہیں ہوں۔ میں اس کو شماریات میں بھی شمار نہیں کرتا ہوں' صرف ایک قابل اعتنا اتفاق۔ بہرصورت یہ ادراک کہ میں اپنے جسم پر پوری طرح قدرت نہیں رکھتا تھا' میری ابتدائی ترین' دل کی گہرائیوں میں بیٹھی ہوئی اہانتوں میں سے تھا' جنہوں نے زخموں کے نشان چھوڑے ہیں۔ بہرصورت مدرسہ کے میدان میں طاقت آزمائی جانے والی یا نہیں۔۔ جسمانی چیز تھی

جو شخص "خلاف مرضی" ریڈ انڈین ہے جیسے جوئیس' اس کے لئے صرف دماغ باقی رہ جاتا ہے۔ جو کوئی زندگی کو بسر نہیں کرتا' اسے اس کی کہانی سنانی پڑتی ہے۔ "مہم جوئیاں' جن کو وائیلڈ ویسٹ کا ادب بیان کرتا ہے' میرے طبعی میلان سے دور تھیں' مگر انہوں نے کم از کم فرار کے دروازے کھول دیئے۔"

یہ طاقت ور' زندگی کے قابل لوگ ہیں' جو کہانیاں بسر کرتے ہیں اور ریڈ انڈین کھیلتے ہیں۔ اگر ریڈ انڈین کھیل نہ کھیلے جائیں' تو کمزوروں تک ریڈ انڈین کہانیاں کبھی نہ پہنچیں گی اور وہ انہیں کبھی فرار کی خاطر دروازوں کو کھولنے کے کام نہ لا سکیں گے۔ جری' بے خوف اور بے رحم "سرخ زورا" (۱) کی زندگی میں مثال کے طور پر میرے لئے بطور ڈرپوک کے کچھ نہیں دھرا تھا۔ میں یقیناً" اس کے ٹھٹھے مذاق کا نشانہ بن گیا ہوتا۔ مگر اس کی کہانی میں میں بہت خوش تھا۔ اس سے بڑھ کر مجھے یہ احساس تھا کہ وہ مجھے خوب سمجھتی تھی اور میں اس کا قریب ترین راز دان تھا۔

مسٹر جوئیس کے ساتھ شاید میرا ذاتی طور پر سمجھوتہ نہ ہوتا۔ میں اس کی کتابوں میں سے بہت کچھ کو نہیں سمجھ پاتا۔ اور اس امر کو وہ روک نہیں سکتا۔ مجھے احساس ہے کہ وہ مجھے سمجھتا ہے۔ اس کہانی "ایک ملاقات" میں بے وقوف طاقت ور ڈلون نہیں تھا' جسے ایک سچ مچ کی کہانی' ایک اپنی کہانی' نہ کہ ریڈ انڈین کہانی بنانے کا خیال آیا۔ یہ واحد متکلم کہانی سنانے والا' گویا جیمز جوئیس تھا' جس نے مدرسہ سے کھسکنے اور کہیں اور بھاگ جانے کی تجویز پیش کی۔ اصل کہانی' جسے دونوں نے بنایا اور سرانجام دیا' ریڈ انڈین جیسی مہماتی کہانی نہیں بن پائی۔ دونوں ایک کشتی پر لیٹے ہیں اور کچھ نہیں کرتے' جس کا مطلب ہے' وہ سوائے

سمجھنے کے کچھ نہیں کرسکتے' اور یہ امر درحقیقت بہت کچھ ہے۔ ایک آدمی جو اتفاقاً" وہاں پر آن [illegible] ہے اس کے ساتھ کتابوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیتا ہے۔ دھوکے باز ڈلن کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر وہ پھر فوراً" کہتا ہے کہ اس نے ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ اس نے اگرچہ انہیں نہیں پڑھا ہے مگر وہ ایسا شخص ہونا چاہتا ہے' جو کتابیں پڑھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس چیز سے واقف ہیں' میں اس سے واقف ہوں۔

پھر آدمی سہیلیوں کے بارے میں' لڑکیوں کے بارے میں بولنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ان کی حقارت کرتا ہے' پھر بے ڈھنگی فینٹسی میں ان تمام لوگوں کو پیٹنے کی بات کرتا ہے' جو لڑکیوں کے ساتھ ــــ پھر وہ جلدی سے ایک طرف جاتا ہے اور کچھ کرتا ہے۔ قاری کو پتہ نہیں چلتا' کیا صرف یہ فقرہ اس بارے میں کہا جاتا ہے۔ "خوب' یہ کچھ دیکھو تو سہی وہ کیا کررہا ہے۔"

ایک کسی قدر کج رائے شخص' طاقت ور ڈلن کھسک جاتا ہے اور اک بلی کے بچے کے پیچھے میدان میں بھاگتا پھرتا ہے۔ کمزور اور شریف برابر دوستانہ رنگ میں مرد کے ساتھ باتیں کرتا جاتا ہے۔ مصلحت پرستی؟ مصلحت پرستی کا ڈر؟

کم عمر جوئیس ڈر جاتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور گھبراہٹ میں اپنے دوست کو آواز دیتا ہے۔ "کس طرح میرا دل دھڑک رہا تھا' جب وہ میدان میں میری طرف دوڑتا ہوا آیا۔ وہ یوں بھاگ رہا تھا جیسے وہ میری مدد کو آرہا تھا۔ اور میں شرمندہ ہورہا تھا' کیونکہ اپنے دل میں میں نے اسے ہمیشہ کسی قدر لائق تحقیر جانا تھا۔"

یہ جوئیس دنیا سے اتنا بھی بے تعلق نہیں تھا۔ وہ دنیا کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا اور اس کا تعلق ڈلن کے ساتھ مصلحت پسندانہ نہیں تھا۔ ڈلن اس کا دوست تھا' وہ کچھ جس کی انسان کو زندگی کے لئے ضرورت ہے۔

خواہ میں جوئیس کو کم ہی سمجھتا ہوں ـــ اور میں نے یقیناً" جرات نہ کی ہوتی اس کا یہاں پر ذکر کرنے کی' اگر آج ۲ فروری کی تاریخ نہ ہوتی ـــ مجھے یقین ہے کہ جوئیس زندگی کو قریب سے جاننے والا مصنف ہے' نہ کہ عالم فاضل آدمی اور نہ ہی درویش۔ شاید وہ ایک ایسا شخص تھا' جو زندگی کو اتنے قریب سے دیکھتا تھا کہ انسان بعض اوقات اس کو بالکل نہیں دیکھ سکتا تھا' ایک ایسا شخص تھا جو ہر چیز کے پیچھے کچھ ہونے کا شبہ کرتا ہے۔ ناقابل فہم چیزوں کے پیچھے بھی۔

بس اس قدر ــــ تھوڑا سا۔ میں اس کا ذکر کرکے صرف اس قدر چاہتا تھا' کہ وہ آج یہاں پر حاضر ہو' اور تاکہ' شاید آپ گھر جائیں اور مثال کے طور پر "ڈبلیز" کو پڑھنے کے لئے نکالیں' میں جاننا چاہتا ہوں کہ قبرستان میں مالی کیا سوچتا ہے' جب وہ "جوئیس" کا نام ادا کرتا ہے اور میرے مقابلے میں یہ بھی جانتا ہے کہ جوئیس کب مرا تھا۔ اور تھوڑا سا وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ میں بھی اس پر فخر کرتا ہوں ــــ یقیناً" ادیب کے طور پر نہیں' بلکہ قاری کے طور پر جوئیس ہم میں سے ایک ہے۔ اور اگر کوئی شخص آئے اور اس کو کوسے' کیونکہ وہ اس قدر بیہودہ ہے اور پاگل اور صرف بادشاہ کے نئے کپڑوں کی طرح ہے' تو ہم مصنف کے دفاع کے لئے اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: وہ ہم میں سے ہے۔

اس قدر آسان بات ہے اور یہ امر کتنا اچھا ہوتا' اگر بات اس قدر آسان ہوتی۔ جو چیز ہم نہ تو جان

سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں ـــــ خواہ ہم بیک گراؤنڈ سے واقف ہی کیوں نہ ہوں ـــــ کہ وہ کیوں کر ہم تک پہنچا ہے' کیوں کر اس جیسا ناقابل فہم ادب میں داخلہ پا سکا' اور یہ کیوں کر ہوا ہے کہ ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً" ہم اس کو سمجھنے کی کوشش مزے لیتے ہوئے کرتے ہیں' مگر مزا تو اس وقت آتا ہے' جب انسان اس کے لئے محنت کرتا ہے' اور اس مقصد کے لئے مصنف کا پہلے ادب میں ہونا ضروری ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ اس نے کس وجہ سے لکھا؟ ذہنائی کے ساتھ اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اور سالہا سال تک بغیر کامیابی کے؟ ہمیں یقیناً" "غلاف مرضی ریڈ انڈین" کے حوالے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ ایک قوی وجہ وہ اس طرح بہر صورت نہیں ہے۔ بغیر وجہ کے اور بغیر کسی قسم کے استحقاق کے ہم اس پر تھوڑا بہت فخر کرتے ہیں' جو آج ایک سو سال کا ہو گیا ہوتا۔ یہ ہمارا معاملہ ہے اگر ہم اس کا جشن مناتے ہیں نہ کہ اس کا کیونکہ کم از کم ـــــ میں اس کا حوالہ دیتا ہوں۔ اس کی کہانیوں نے "فرار کے لئے دروازے" کھول دیئے ہیں۔

میں نے کئی ہفتے قبل سوچا تھا کہ میں اس چوتھے خطبے میں لکھنے کے بارے میں بولوں گا: "میں کیوں لکھتا ہوں" اور "میں کیسے لکھتا ہوں" کے بین بین۔ تاخیر سے کی جانے والی دریافت نے' آج جوئیس کا جنم دن ہے' مجھے اپنے پروگرام سے بچ نکلنے میں مدد دی ہے۔ اب چونکہ یہ ہو چکا ہے' اس لئے میں بات کو آگے بڑھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے جوئیس کے بارے میں کہا ہے' وہ وہ نہیں تھا' جس کو کہنے کا میں نے تہیہ کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کے بارے میں بولنے کا اور میں بدستور سنجیدہ ہوں' مگر زبان کا بہاؤ مضمون سے زیادہ قوی ہے۔ کہانی ہمیشہ جیت جاتی ہے۔

تصنیف کرنا بہر صورت محض لکھنا نہیں ہے۔ میں لکھتے ہوئے سوچتا ہوں اور میں منہ سے بولتے ہوئے ایک جیسا نہیں سوچتا ہوں' کیونکہ کاغذ جو ڈھیرے ڈھیرے ٹائپ رائٹر میں سے نکلتا ہے' مقدار کا اندازہ کرواتا جاتا ہے۔ لکھے جا چکے ہوئے کی لمبائی اور شاید ابھی لکھے جانے والی کی لمبائی' اگر لمبائی کی مقدار صرف مضمون کے ذریعہ طے پاتی ـــــ اور یہ امر شریفانہ اور سنجیدہ ہوتا ـــــ تو پھر ہر تحریر کم لمبی اور بہت زیادہ لمبی ہوتی۔

میرے خطبات کی لمبائی یہاں پر' یہ امر معاملے کو آسان بنا دیتا ہے' مقرر شدہ ہے' لمبائی تعین کرتی ہے۔ ہر کہانی کا ایک وقت ہوتا ہے اور وقت ایک ایسی چیز نہیں ہے' جو اندرونے کے ذریعہ طے پاتا ہے' بلکہ بیرونی علامات کے ذریعہ۔ اگر بات یہاں پر ختم ہوتی' بالکل اختتام کو پہنچ چکی ہوتی' تب بھی اس کو آگے چلانا پڑتا' مزید ڈیڑھ خطبات تک۔

بہت کچھ جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے' مجھے پہلے معلوم نہ تھا۔ میرے لئے اس سے قبل کوئی محرک نہیں پایا جاتا تھا' پوری سند کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے کا کہ کہانی سنانا افسانے کا اہم ترین پہلو ہے نہ کہ اس کا نفس مضمون۔ آپ نے اس امر کو جان لیا ہے کہ میں اس معاملے میں کس قدر ہٹ دھرم بن چکا ہوں۔ میں خود اپنا شکار ہوں میں نے اپنے آپ کو لکھتے ہوئے جھانسہ دیا ہے اور پھانس لیا ہے ـــــ اسی طرح جیسے ایک قاری پڑھتے ہوئے جھانسہ دے سکتا ہے۔ قاری اپنے آپ کو پھانس لیتا ہے نہ کہ ادب اسے۔ وہ آلات کار بھی' جنہیں ادیب اختیار کرتا ہے' اپنے آپ کو جھانسہ دینے کے آلات ہوتے ہیں۔

خود جھانسہ دہی محرکات کا بدل ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ "آپ کیوں لکھتے ہیں؟" سوال تو یہ ہے "آپ اپنے آپ کو کیونکر لکھنے کا جھانسہ دیتے ہیں؟" اس کا مطلب ہے کہ سوال محض فلسفے سے نمٹنا چاہیے بلکہ ایک نسل بعد

سوال "آپ کیوں لکھتے ہیں؟" کا جواب آسان ہے۔

میں لکھتا ہوں کیونکہ ادب پایا جاتا ہے ـــــ یا میں لکھتا ہوں کیوں کہ میں فٹ بال کا گھٹیا کھلاڑی ہوں ـــــ یا میں لکھتا ہوں کیوں کہ میں ایک خلاف مرضی ریڈ انڈین ہوں۔ یا اگر میں اس سوال کا جواب فریڈرش شلر کے نام پر دینے کی جرات کروں: "میں لکھتا ہوں کیونکہ سڑے ہوئے سیبوں کی بو میری ناک میں ہے۔" (۳)

شلر پر مجھے شبہ ہے کہ اس نے سیبوں کو صرف اس دعوی کرنے کے وقت تک اپنایا تھا، یہاں تک کہ وہ اس کے لکھنے کا جزو لاینفک بن کر رہ گئے۔ جو کوئی سڑے ہوئے سیبوں کی بو کے سبب لکھنے پر مجبور ہے، اسے محرکات کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے اس وقت بھی لکھنا ہوگا، کیونکہ جب کہ وہ درحقیقت لکھنا نہیں چاہتا۔

خود اپنے آپ کو جھانسہ دینے کے آلات کار کا نقصان بھی پہنچ سکتا ہے، اپنے آلات کار خود اپنے آپ کو قید میں ڈالنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ امر محض ایک افواہ ہے کہ لکھنے والا اپنے آپ کو لکھنے کے عمل کے ذریعہ آزاد کرواتا ہے کہ وہ مثال کے طور پر اپنے تفکرات کو لکھ کر ان سے جان چھڑاتا ہے، کیونکہ لکھنے کا عمل اندر سے باہر کی طرف جاتا نہیں ہے، بلکہ باہر سے اندر کی طرف آتا ہے۔ چیزیں، تفکرات، خیالات اس طرح وزنی بنتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں لکھتا ہے۔ لکھنا بھی ایک طرح سے ملکیت پر قبضہ کرنا ہے۔ لکھے ہوئے سے انسان پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

جب میں مثلاً اپنی دادی کے بارے میں، جو مجھے پسند نہیں تھی، ناپسندیدہ بات کہتا ہوں، تو بات اس امر سے بالکل مختلف ہے، اگر میں اس کے بارے میں ناپسندیدہ بات مثلاً کسی خاندانی خط میں لکھتا ہوں۔ بولے ہوئے کو میں مٹا سکتا ہوں ایک لطیفہ کے ذریعہ، نشے میں ہونے کا حوالہ دے کر، غیر اہم ہونے کا اشارہ کرکے۔ مگر جب میں اس کو لکھتا ہوں، تو میں اس کو اپنا موضوع قرار دے دیتا ہوں اور ایک فکر کو پال لیتا ہوں، جس نے مجھے منہ زبانی کبھی کچھ ایسا پریشان نہ کیا ہوتا۔ اب وہ میرا موضوع ہے نہ کہ محض گفتگو کا مواد۔ زبانی ردعمل کا میرے شعوری احساس سے لکھے ہوئے کے مقابلے میں کم واسطہ ہے۔ محض اس وجہ سے بھی میں سب کچھ، جو میرے دماغ میں آتا ہے، نہیں لکھ سکتا۔ میں چناؤ کرکے لکھتا ہوں ـــــ چناؤ بمعنی ڈرتے ہوئے۔

اس سے میری مراد ہر قسم کا لکھنا ہے۔ شاید آپ کو بھی اس بات کا تجربہ ہے۔ میرے ساتھ بار بار یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی نوٹ بک کے اندراجات کی تشریح نہیں کر پاتا ہوں۔ مجھے اچانک پتہ نہیں چلتا کہ کسی کوڈ ورڈ (Codeword) کا مطلب کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں بات کو سیدھے سیدھے لفظوں میں استعارے درج کرتا ہوں، مثال کے طور پر "اخروٹ کا درخت۔" یہ بات مجھے دوبارہ پڑھنے پر ضرور سمجھ میں آجاتی، اگر اس کے پیچھے اپنی بیوی سے کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کارگر ہوتی۔ مگر یہ بات میرے مدنظر تھی، وگرنہ مجھے یاد آجاتی۔

کوئی نہ کوئی وجہ بہرصورت پائی جاتی ہے کہ میں خود ایسی خبروں کو بھی' جو میرے لئے ہوتی ہیں رمزی طور پر محفوظ کرتا ہوں' یہاں تک کہ میں ان کو حل نہیں کر پاتا ہوں۔۔۔ کہیں نہ کہیں مجھے یہ علم ہے۔ عام طور سے ان کا تعلق تعین اوقات سے ہوتا ہے۔ مگر میں انہیں اپنے اوپر ٹھونسنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں ان کی ملکیت سے اپنے آپ کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا ہوں' میں ان کی ملکیت نہیں چاہتا ہوں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میں ایک کوڈ اور اس کو حل کرنے کا سسٹم بناتا جارہا ہوں' بغیر اس کے کہ مجھے اس امر کا احساس ہو کہ پڑھنے والا ایسے حل کرنے کے سسٹموں کا عادی ہے۔ جہاں کہیں ضروری ہوتا ہے' میں اسے اشارے دیتا ہوں اور حل بتاتا رہتا ہوں۔ میں قاری سے چھپنا نہیں چاہتا ہوں۔۔۔ قاری کے ساتھ میں مفاہمت چاہتا ہوں۔۔ چھپنے کی سعی دراصل میں خود اپنے آپ سے کرتا ہوں۔

جب عمر رسیدہ ادیب لکھنے سے باز آجاتے ہیں' تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ انہیں موضوعات کی قلت کا سامنا ہے' یا توانائی کی کمی کا۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کبھی کا اپنے سارے پنڈے کو لکھائی سے بھر دیا ہو' اس قدر کہ نئی چیزوں کے لئے بالکل کوئی جگہ باقی نہ بچی ہو' کہ ان کی پیٹھ پر اس قدر لد چکا ہو کہ ان میں مزید بوجھ اٹھانے کی سکت باقی نہ ہو۔ اس لحاظ لکھنا ایک طرح سے صحت مندی کا سوال بھی ہے' کہ کس قدر بوجھ ایک مصنف اٹھا سکتا ہے یا اٹھانے کے لئے تیار ہے۔

اِس طرح یا اُس طرح ہر مصنف بہرصورت قاری کے لئے لکھتا ہے۔ اسے یقیناً اس مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے قاری سے کس قدر توقعات رکھ سکتا ہے یا رکھنا چاہتا ہے' وہ کس قدر قابل فہم ہونا چاہتا ہے' اور کیا وہ اپنے قاری کو دریافت کرنے کی خوشی سے محروم کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اسے ہمیشہ اپنے قاری کا لحاظ خاطر کرنا ہوتا ہے اور یہ امر باعث مسرت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک خارجی اثر ہے' جو متن میں ردو بدل کا باعث بن جاتا ہے۔

اس سے کہیں زیادہ یہ امر پیش آتا ہے کہ مصنف کو خود اپنا لحاظ خاطر کرنا پڑتا ہے۔ خود اپنے پر رحم کھاتے ہوئے انسان وہ کچھ نہیں لکھ سکتا' جو اسے لکھنا ہوتا ہے یا وہ لکھنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لحاظ خاطر اور اس سے نپٹنا اسلوب اور اسلوب سازی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قاری ہمیشہ یہ گمان کرتا ہے کہ مصنف عین وہی کچھ لکھنا چاہتا تھا' جو اس نے لکھا ہے۔

"میں کیوں لکھتا ہوں؟" اور "میں کیوں کر اپنے آپ کو جھانسہ دیتا ہوں" کے بارے میں جوزیف کونراڈ (Josef Conrad) اپنے ناول "جزیروں کا ملعون" کے پیش لفظ میں' جسے اس نے سالوں کے بعد اپنے دوسرے ناول میں شامل کیا تھا' لکھا:

"فی الحقیقت اس کتاب کی ذمہ داری ایڈورڈ گارنٹ کے ایک فقرے پر عائد ہوتی ہے۔ چونکہ وہ پہلا دوست ہے جسے میں نے قلم کے ذریعہ بنایا ہے' اس لئے یہ امر قدرتی تھا کہ میں نے اس زمانے میں اس سے کھل کر بات کی۔ ایک شام کو ہم نے مل کر کھانا کھایا تھا اور اس نے میری الجھن کا حال سنا تھا (مجھے خطرہ ہے کہ اس سے کسی قدر اس کا دل بھر گیا تھا) اس نے میری توجہ اس طرف مبذول کی کہ ابھی سے میرے مستقبل کو ہمیشہ کے لئے طے کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر اس نے اضافہ کیا: آپ صاحب اسلوب ہیں' آپ کی افتاد طبع موزوں ہے۔۔۔ جیسی خواہش ایک انسان دوسرے کی زندگی پر اثر ڈالنے کی رکھ سکتا ہے۔۔۔ کہ مجھے لکھنے کے کام کو جاری رکھنا چاہئے۔ اس وقت' اور میں یہ کر سکتا ہوں' اس زمانے

ہے اس نے ہمیشہ میرے ساتھ بہت صبر اور نرمی کا سلوک کیا ہے۔ جس چیز نے مجھے ابھی حوالہ دیے جانے والے فقرے میں، جو مجھے نہایت آرام کے ساتھ کہا گیا، سب سے بڑھ کر چونکا دیا، وہ اس کی روشن خیالی کی نہیں ہی نہ تھی، بلکہ واقعتاً" اس میں پائی جانے والی زیرکی تھی۔ اگر اس نے کہا ہوتا "لکھیے سبھی" تو اس نے مجھے شاید ہمیشہ کے لیے قلم اور کاغذ سے بھگا دیا ہوتا۔ مگر اس سادہ تجویز "ایک اور" لکھنے میں کوئی چیز پائی جاتی تھی، جو مجھ میں مزاحمت یا خوف کو بیدار کر سکتی۔ اور اس طرح میرے معاملے کے پیچیدہ مشکل ترین مرحلہ عیاری سے طے پا گیا اس لفظ "ایک اور" نے یہ کام سرانجام دیا۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ ایڈوارڈ اور میں لندن کی ایک بھلی رات میں ختم نہ ہونے والی سڑکوں پر گھومتے اور بہت سے امور کے بارے میں باتیں کرتے رہے، مجھے اب بھی یاد ہے کہ گھر پہنچ کر میں بیٹھ گیا اور سونے سے پہلے میں نے "جزیروں کا ملعون" کا نصف صفحہ لکھ ڈالا۔ اس امر کے ساتھ میں نے فیصلہ کر لیا تھا، میں نہیں کہ سکتا ایک دوسری زندگی کا، البتہ ایک اور دوسری کتاب کے حق میں۔"

میں جوزیف کونراڈ کی بے حد تعظیم کرتا ہوں۔ ناول نگاروں میں وہ میرا انتہائی پسندیدہ ہے ــــ حقیقتاً وہ شخص، جس کو میں عرصے سے ڈھونڈتا آ رہا تھا اور چند سال ادھر میں نے پالیا ہے "گویا یہ احساس رکھتے ہوئے کہ اس کا وجود پایا جانا چاہیے۔

بچپن میں ہی مجھے بچوں کی کتابوں کے مصنفوں سے شکایت تھی۔ وہ میرے نزدیک اکثر بے حد سادہ لوح تھے وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ان ناانصافیوں کے ذمہ دار نہ تھے، جن کا سامنا ان کے کرداروں کو کرنا پڑتا تھا۔ مجھے غصہ آتا تھا، جس ہیرو پر جھوٹا مقدمہ بنتا تھا، کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ مصنف اس بات کو جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ نہیں کرتا تھا، یا اس سے بھی زیادہ سنگین، ایسے وقتوں میں مصنف اکثر غیر حاضر ہوتا تھا اور ہیرو کو اور مجھے اکیلے چھوڑ دیتا تھا۔

جوزیف کونراڈ بھی اپنے کرداروں کی قسمت کو کھلا چھوڑ دیتا ہے، اس کی مجھے قاری ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ عادت ہو گئی تھی۔ مگر دوسرے مصنفوں سے مختلف وہ چا کے لمحے میں موجود ہوتا تھا، وہ مجھے شکار آفت کے ساتھ اکیلے نہ چھوڑتا تھا۔ جب ولیمز (Willems) نشے میں مدہوش اور لاچار کسی نیو گائن کی خاک آلودہ سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتا تھا، تو مجھے لگتا تھا کہ اس کے پیچھے ایک شخص کوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے جس کا نام کونراڈ تھا، چل رہا تھا اور میری، قاری کی، ہاتھ سے پکڑ کر رہنمائی کرتا تھا، اور جب میں گر پڑنے والے ولیمز کو اٹھانے کا ارادہ کرتا ہوں، تو وہ مجھے پیچھے کھینچتا ہے اور کہتا ہے: "وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا" یا "اب کچھ نہیں کیا جا سکتا" وہ قسمت کی ظالمانہ جزا کو دکھاتا ہے، مگر مجھے بطور عینی گواہ کے اکیلا نہیں چھوڑتا۔ مصنف ہر لمحے پر حاضر ہے۔

یہ امر سرا ہے ــــ اور اب حوالے کی طرف لوٹتے ہیں۔

ہر کسی کے لئے، جو لکھنے کے کاروبار سے واقف ہے، یہ دعوت "ایک اور لکھ ڈالیں" خوش قسمتی کے مترادف ہے کیونکہ عام طور سے کہا جاتا ہے: "لکھتے رہیے" میرے مد نظر ادب کے وہ دربان ہیں، جنہیں کسی ادیب کی پہلی کتاب کے بعد اور کچھ نہیں سوجھتا" سوائے یہ فیصلہ کرنے کے کہ کیا اس کو ادب میں داخلے کی ابھی سے اجازت دے دی جائے، یا اسے عارضی طور پر بطور امیدوار کے درج کر لیا جائے، یا اسے ادب کے ناقابل قرار دے دیا جائے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ادب کے اندر سے ہی شک کیا جائے گا "ایک اور

لکھ ڈالیں" وہاں پر کیا جائے گا: "لکھتے رہئے"
کیا کونراڈ کا اپنے قاری کی دھیرے سے پیش کردہ خواہش پر اطمینان کا سانس لینا اس چیز پر مطمئن ہونے کے مترادف تھا کہ انسان ادیب بننے کے بغیر لکھ سکتا تھا' بغیر اپنے پنجرے پر لکھنے کے؟ کیا اسے شاید خود اپنا پاس و لحاظ کرنے کی ضرورت کو عقل مندی سے حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ ٹھیلے پن کے ساتھ اور صیغہ حال کے سیانے استعمال کے ذریعہ؟
جہاں تک مجھے علم ہے' کونراڈ کی پرائیویٹ زندگی' اس کی بعد کی زندگی بطور ادیب کے بغیر بڑی الناکیوں' لطیفوں اور قابل ذکر باتوں کے ساتھ گزری۔ شاید اس میں کوئی سبق ہے۔ ایک چیز معلوم ہوتا ہے اس میں جوئیس کے ساتھ مشترک ہے: وہ اپنے پنجرے پر لکھنے کے مسئلے کو جانتا ہے' اور دونوں نے لگتا ہے اس سے بچنے کے لئے ایک خاص تکنیک کو اختیار کیا ہے۔ ایک نے کوڈ میں لکھنے کا طریق اپنا کر' دوسرے نے اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو معتدل مزاجی کے ساتھ اور دانستگی سے بطور مصنف کے تاریخ کے سامنے پیش کرتا ہے' کوٹ اور ہیٹ سمیت' جیسے میں تصور کرتا ہوں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ' کوڈ کا طریق البتہ آٹو بیوگرافیکل الجھاؤ کو پیدا کر دیتا ہے' ایک کہانی کو سنانے سے کہیں بڑھ کر جس کی رنگینی اور عظمت یقیناً" صرف ذاتی تجربے کے سبب پیدا ہو سکتی تھی مگر جسے ایک ایسے فاصلے سے بیان کیا جاتا ہے' جیسے وہ مصنف کی ذاتی کہانی نہیں ہے۔
پھر جوزیف کونراڈ "جزیروں کے ملعون" کے پیش لفظ میں بیان کرتا ہے کہ اس نے اس و ۔لمز کو ایک بار دیکھا تھا' کہ اس کے بارے میں بہت سی افواہیں پائی جاتی تھیں' کہ اصل و ۔لمز یقیناً" ایک مشکوک شخص تھا' کہ وہ یعنی کونراڈ' اس کی بقیہ زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ پیش لفظ اس فقرے پر ختم ہوتا ہے: "اب اصل و ۔لمز کا خواہ کچھ بھی حشر ہوا ہو' مگر کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس دستاویز میں میں نے اسے کہیں کم تیرہ قسمت کے حوالے کیا ہوتا۔"
میرا خیال نہیں ہے کہ جوزیف کونراڈ نے آسانی کے ساتھ یہ فقرہ لکھ دیا تھا۔ اس کے ذریعہ وہ ایک شخص کی قسمت کی' جسے اس نے تخلیق کیا تھا' پوری ذمہ داری اٹھا لیتا ہے۔ تخلیق البتہ اس نے صرف ایک کردار کو کیا تھا' جسے وہ بیان کرتا ہے' نہ کہ زندگی کو جو ایسے کرداروں کو انگیخت دیتی ہے۔
میری بچوں کی کتابوں کے مصنف اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس فقرے "زندگی کا یہی طور ہے" کے پیچھے چھپاتے تھے' اور انہیں اس خدشے کی خبر نہ تھی کہ "یہ امر کہیں زیادہ بار پیش آتا ہے کہ زندگی آرٹ کی نقالی کرتی ہے۔" کونراڈ اس خدشے کا مقابلہ کرتا ہے' اس طرح کہ' لکھتے ہوئے اس کا سامنا کرتا ہے' جوئیس اس طرح کہ وہ لکھنے میں فرار اختیار کرتا ہے۔
قبرستان سے جاتے ہوئے میں نے ایک دوسرے مالی سے پوچھا کہ کیا اسے پتہ تھا کہ یہ جیمز جوئیس کون تھا۔ "ایک انگلستانی" اس نے کہا۔ اگر اس کا اس سے مطلب تھا: "یہاں کا نہیں' ایک اجنبی" تو پھر وہ حق بجانب تھا۔

حوالہ جات

(۱) "مرغ زورا" بچوں کی کہانیوں کی کتاب کی ہیرو لڑکی تھی

انور سدید

بلھے شاہ کی ارضیت

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت بابا بلھے شاہ جو لاہور کے پڑوسی شہر قصور میں آسودگی اور طمانیت کی لمبی نیند سوئے ہوئے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں جاگ رہے ہیں --- پنجاب کے ایک عظیم صوفی شاعر تھے' انہوں نے مغلوں کے زوال کے اس دور میں جب احمد شاہ ابدالی لاہور سے گزر کر دلی پر پے بہ پے حملے کر رہا تھا اور ان شہروں کو نہ صرف تاخت و تاراج کر رہا تھا بلکہ ہر طرف لوٹ' مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا تو بلھے شاہ نے خلق خدا کے زخموں پر اپنے کلام کا افسوں پھونکا۔انہیں نہ صرف زندگی کی تکلیفوں' مصیبتوں اور دکھوں پر قابو پانے کا طریق سکھایا بلکہ عام لوگوں کو جو زیادہ پڑھے لکھے اور مسائل تصوف کے گہرے مطالعے کے قابل نہیں تھے زندگی کے جسمانی اور مادی تقاضوں سے بلند ہو کر کائنات کے انفس و آفاق میں اپنے وجود کی پہچان کا سلیقہ بھی دیا ان کے لیے ہوس دولت' خواہش مال اور آرزوئے دنیا سے نکالنے کی راہ پیدا کی۔ اور انسانوں کے ہجوم سے من و تو کا امتیاز ختم کرنے کے لئے ان کے مضبوط قلعے کو توڑنے اور اس ذات واحد کو تلاش کرنے ' پہچاننے اور حاصل ہو جانے کا سبق دیا جو ایک بھی ہے اور انیک بھی ۔ بلھے شاہ کا فقر ایک سچے اور خالص صوفی کا فقر ہے جس میں درویشی بھی ہے' قلندری بھی اور شطاریوں کی بے خوفی بھی' ان کی شاعری تصوف کی شاعری ہے جس کا مقصد تزکیۂ باطن بھی ہے اور ذات الٰہی سے گہرا رابطہ قائم کرنا بھی۔ فنا بہ حق ہونے کا جذبہ بھی موجود ہے اور بقا بہ حق کی آرزو بھی زندہ ہے۔ انہوں نے فرد کو مقام حیرت پر لے جانے کی کاوش بھی کی لیکن اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے قائم رکھے اور ارضی عناصر اور دھرتی کے تجربے کو اس خوبی سے اپنی شاعری اور بالخصوص کافیوں اور دوہڑوں میں شامل کیا کہ بلھے شاہ اپنے عصر کا ایک زندہ حوالہ نظر آتا ہے۔ بلھے شاہ کی شاعری ان کے گہرے سماجی مشاہدے کی آئینہ دار ہے لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جائے گا کہ ان کی ارضیت ان کے تصوف کے تذکرے میں دب گئی ہے۔ اور کچھ لوگوں نے اس طرف اشارا کیا ہے تو وہ واجبی اور سرسری سا ہے۔

واضح رہے کہ ارضیت سے مراد کسی نوع کی جسم پرستی' دھرتی پوجا یا بت پرستی نہیں ہے۔بلکہ اس سے مراد وہ خطہ ارض ہے جس کا ثقافتی' تہذیبی' تمدنی اور حیاتیاتی سرمایہ شاعری میں نہ صرف حوالہ بن جاتا ہے بلکہ شعر میں روح کی طرح موجود ہوتا ہے۔ شاعر کو مکانی حیثیت عطا کرتا اور اس کے جذباتی جزر و مد کا زاویہ متعین کرتا ہے۔ اس قسم کی ارضیت اس خوشبو کا تحفظ کرتی ہے جو شاعر کے کلام سے پیدا ہوتی ہے اور اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتی ہے۔ بلھے شاہ کا ارضی دیار پنجاب ہے۔ انہوں نے اس سرزمین میں زندگی بسر کی' اس خطے کے ماحول میں ان کی شرکت طویل' بھرپور اور پرخلوص ہے۔ وہ اس زمین کے ساتھ پوری طرح جڑے ہوئے ہیں اور اسی سے اپنا تجربہ کشید کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری اس تہذیبی شخصیت

کا ثمر ہے جس کی تعمیر میں اس زمین کی خوشبو، ہوا، پانی، دھوپ اور چاندنی ہی شامل نہیں بلکہ اس کے کسانوں، جلاہوں، لوہاروں، ترکھانوں اور مزدوروں کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاہ سید تھے، ان کا شجرہ چودہ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی سے جا ملتا ہے۔ والد سید [illegible] درویش کے ساتھ اوچ شریف کو جہاں وہ ۱۶۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے چھوڑا اور ملکوال ضلع ساہی وال ہوتے ہوئے قصور آ گئے جہاں انہوں نے مولانا غلام مرتضیٰ قصوری سے رسمی تعلیم حاصل کی، مولانا [illegible] الدین قصوری کے آگے جنہوں نے "امرت کنڈ" کا مطالعہ شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کے ترجمہ "بحرا[illegible]" کے وسیلے سے کیا تھا زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ لیکن بیعت شاہ عنایت قصوری سے کی جو قوم کے ارائیں [illegible] مرشد کے رنگ میں ایسے رنگے گئے کہ نام و نسب ان کے لیئے بے حقیقت ہو گئے ان کا نام عبداللہ تھا قصور کی زمین اور اس خطے کے عوام کے لیے وہ بلھے شاہ بن گئے اور جب زمین کے ساتھ ناطہ جڑ گیا تو کہنے لگے کہ۔

بلھے سانوں سید سدے دوزخ ملن سزائیاں
جو کوئی سانوں رائیں آکھے بہشتی پینگاں پائیاں

○

میں بے قید آں، میں بے قید: نے روگی نہ وید
نہ میں مومن، نہ میں کافر، نہ سید نہ سید
بلھے شاہ دی ذات کیہ پچھیں، نہ پیدا، نہ پید۔

یہ مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانے کا رویہ سب رنگوں کو ملا کر ایک رنگ بنانے کا رجحان اور بیج کو زمین میں ڈال کر پید سے ناپید ہو جانے کا عمل ہے۔ بلھے شاہ کے ہاں بلا شبہ یہ مضمون تصوف کے حوالے سے آیا ہے لیکن یہ ان کے ارضی رجحان کا آئینہ دار بھی ہے اور یہ مٹی کے ذکر میں بلا واسطہ طور پر یوں ظاہر ہوا ہے۔

ماٹی جوڑا، ماٹی گھوڑا، ماٹی دا اسوار
ماٹی نوں ماٹی دوڑائے، ماٹی دا کھڑکار
ماٹی قدم کریندی یار

ماٹی نوں ماٹی مارن لگی، ماٹی دا ہتھیار
جس ماٹی پر بہتی ماٹی، تس ماٹی ہنکار
ماٹی قدم کریندی یار

حضرت بلھے شاہ [illegible] میں جس [illegible] ایک عام آدمی کا تجربہ

چوں کہ گفتگو عوام سے تھی اس لیے انھوں نے عوام کی زبان میں ہی بات کی اور اس کے لیے جو تشبیہیں' استعارے اور اشارے استعمال کیے ان کا انتخاب بھی اپنے گرد و پیش کے ارضی کلچر سے کیا۔ یہ تشبیہیں اور استعارے کتابی نوعیت کے نہیں' بلکہ بلھے شاہ کے اپنے مشاہدے اور تجربے میں آئے ہوئے اشارے تشبیہیں اور استعارے ہیں' اس لیے ان کا ارضی عنصری متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی لازمانی صداقت بھی دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کافی ملاحظہ کیجئے:

چولسی' چینسی' کھدر' دھوتر
ململ' خاسا' اتا' سوتر
پونی وچوں باہر آوے
بھگوا بھیس گو سائیں دا
سب اکو رنگ کپاہی دا

بلھے شاہ کی شاعری میں نسوانی آواز بھی دھرتی ہی کی آواز ہے۔ لیکن یہ دھرتی بنجر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دھرتی پر ابر کرم کا ایک چھینٹا پڑ چکا ہے جس سے اس کے اندر کی پیاس ابل پڑی ہے اور اب یہ آسمان کی طرف نظر جمائے منتظر ہے کہ بادل کب آتا ہے' کب برستا ہے۔ بلھے شاہ نے دھرتی کی اس علامتی عورت کی کوک ہم تک یوں پہنچائی ہے۔

ہتھ کنگن' بانہہ چوڑیاں' گل نورنگ چولا
ماہی مینوں کر گیا' کوئی راول رولا
جل بل دھائیں ماریاں' دل پتھر تیرا
میں اڈیکاں کر رہی۔۔۔ کدی آ۔ کر پھیرا

○

تیرے جیہا ہور نہ کوئی
ڈھونڈاں' جنگل' بیلا' روہی
ڈھونڈاں تاں سارا جہان
میرے تیرے قربان
ویہڑے۔۔ آوڑ میرے

○

کا ثمر ہے جس کی تعمیر میں اس زمین کی خوشبو، ہوا، پانی دھوپ اور چاندنی ہی شامل نہیں بلکہ اس خطے کے کسانوں، جلاہوں، لوہاروں، ترکھانوں اور مزدوروں کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بلھے شاہ سید تھے، ان کا شجرہ چودہ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔ والد سید سخی محمد درویش کے ساتھ اوچ شریف کو جہاں وہ ۱۶۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے چھوڑا اور ملکوال ضلع ساہی وال سے ہوتے ہوئے قصور آ گئے جہاں انھوں نے مولانا غلام مرتضیٰ قصوری سے رسمی تعلیم حاصل کی۔ مولانا غلام محی الدین قصوری کے آگے جنھوں نے "امرت کنڈ" کا مطالعہ شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کے ترجمہ "بحرالحیوٰۃ" کے وسیلے سے کیا تھا زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ لیکن بیعت شاہ عنایت قصوری سے کی جو قوم کے ارائیں تھے وہ مرشد کے رنگ میں ایسے رنگے گئے کہ نام و نسب ان کے لیئے بے حقیقت ہو گئے ان کا نام عبداللہ تھا لیکن قصور کی زمین اور اس خطے کے عوام کے لیے وہ بلھے شاہ بن گئے اور جب زمین کے ساتھ ناتہ جڑ گیا تو برملا کہنے لگے کہ۔۔

جیہڑا سانوں سید سدے دوزخ ملن سزائیاں
جو کوئی سانوں رائیں آکھے بہشتی پینگاں پائیاں

○

میں بے قید آں، میں بے قید: نے روگی نہ وید
نہ میں مومن، نہ میں کافر، نہ سید نہ سید
بھلے شاہ دی ذات کیہ پچھیں، نہ پیدا، نہ پید۔

یہ مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانے کا رویہ سب رنگوں کو ملا کر ایک رنگ بنانے کا رجحان اور بیج کو زمین میں ڈال کر بیج سے ناپید ہو جانے کا عمل ہے۔ بلھے شاہ کے ہاں بلا شبہ یہ مضمون تصوف کے حوالے سے ہی آیا ہے لیکن یہ ان کے ارضی رجحان کا آئینہ دار بھی ہے اور یہ مٹی کے ذکر میں بلا واسطہ طور پر یوں بھی ظاہر ہوا ہے۔

ماٹی جوڑا، ماٹی گھوڑا، ماٹی دا اسوار
ماٹی نوں ماٹی دوڑائے، ماٹی دا کھڑکار
ماٹی قدم کریندی یار

ماٹی نوں ماٹی مارن لگی، ماٹی دا ہتھیار
جس ماٹی پر بہتی ماٹی، تس ماٹی ہنکار
ماٹی قدم کریندی یار

حضرت بلھے شاہ اپنی شاعری میں جس تجربے کو پیش کرتے ہیں وہ ایک عام آدمی کا تجربہ ہے، انھیں

چوں کہ گفتگو عوام سے تھی اس لیے انھوں نے عوام کی زبان میں ہی بات کی اور اس کے لیے جو تشبیہیں' استعارے اور اشارے استعمال کیے ان کا انتخاب بھی اپنے گرد و پیش کے ارضی کلچر سے کیا۔ یہ تشبیہیں اور استعارے کتابی نوعیت کے نہیں' بلکہ بلھے شاہ کے اپنے مشاہدے اور تجربے میں آئے ہوئے اشارے تشبیہیں اور استعارے ہیں' اس لیے ان کا ارضی عنصری متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی لازمانی صداقت بھی دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کافی ملاحظہ کیجئے:

چونسی' چینسی' کھدر' دھوتر
ململ' خاسا' اکا' سوتر
پونی وچوں باہر آوے
بھگوا بھیس گو سائیں دا
سب اکو رنگ کپاہی دا

بلھے شاہ کی شاعری میں نسوانی آواز بھی دھرتی ہی کی آواز ہے۔ لیکن یہ دھرتی بنجر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دھرتی پر ابر کرم کا ایک چھینٹا پڑ چکا ہے جس سے اس کے اندر کی پیاس ابل پڑی ہے اور اب یہ آسمان کی طرف نظر جمائے منتظر ہے کہ بادل کب آتا ہے' کب برستا ہے۔ بلھے شاہ نے دھرتی کی اس علامتی عورت کی کوک ہم تک یوں پہنچائی ہے۔

ہتھ کنگن' بانہہ چوڑیاں' گل نورنگ چولا
ماہی مینوں کر گیا' کوئی راول رولا
جل بل ڈھائیں ماریاں' دل پتھر تیرا
میں اڈیکاں کر رہی۔۔۔ کدی آ۔۔ کر پھیرا

○

تیرے جیہا ہور نہ کوئی
ڈھونڈاں' جنگل' بیلا' روہی
ڈھونڈاں تاں سارا جہان
میرے تیرے قربان
ویہڑے۔۔۔ آ وڑ میرے

○

کوٹھے تے چڑھ دیواں ہوکا　　عشق واجو کوئی نہ لوکا　　اس دا مول نہ کھاؤ دھوکا
جنگل بستی ملے نہ ٹھور　　واہ وا رمز سجن دی ہور

○

بلھے شاہ کی ارضیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو عمل کرنے اور تحرک میں رہنے کی ترغیب دی ہے۔ وہ عشق کی آواز پر "تھیا۔ تھیا" کرکے ناچتے ہیں اور "رانجھا رانجھا آکھدی میں آپے رانجھا ہوئی" کے مقام پر پہنچ کر اپنے اندر جھانکتے اور یہ کہتے ہیں کہ۔

"بلھا۔ کیہ جاناں میں کون؟

لیکن جب ان کا رخ باہر کی طرف ہوتا ہے تو وہ یہ صدا بھی دیتے ہیں کہ

اٹھ　جاگ　گھراڑے　مار　نئیں۔
ایہہ　سون　تیرے　درکار　نئیں

جو کچھ کرسیں، سو کچھ پاسیں، نئیں تے اوڑک پچھوں تاسیں
سونجی کونج وانگوں کرلاسیں، کھنباں باجھ اڈار نہیں

○

کرلے　اج　کرنی　دا　ویرا
مڑ　نہ　ہوسی　آون　تیرا
ساتھی　چلو　چل　پکارے
اب　تو　جاگ　مسافر　پیارے

اج　گھر　وچ　نویں　کپاہ　کڑے
توں　جھب　جھب　ویلنا　ڈاہ　کڑے
روں　ویل، پنجاون　جاہ　کڑے
کر　کتن　ول　دھیان　کڑے

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بلھے شاہ ایک دفعہ جب اپنے مرشد شاہ عنایت کے پاس پہنچے تو اس وقت ان کے مرشد کیاری سے پنیری اکھاڑ کر کھیت میں لگا رہے تھے۔ انہوں نے مرشد سے "بھید کی بات" دریافت کی۔ شاہ عنایت نے بلھے شاہ کا سوال سنا اور برملا کہا۔

بلھیا!　رب　دا　کی　پونا
ایتھوں　پٹنا　اوتھے　لاونا

اس تخیل میں شاہ حسین نے "رب کی تلاش" کو بھی زمینی عمل کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے مرید بلھے شاہ کے ہاں بھلا مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانے کی کیفیت ملتی ہے وہاں انہوں نے مٹی کو تخلیق کا منصب بھی سونپا ہے۔ جو بنیادی طور پر خدائی عمل ہے اس اظہار میں بلھے شاہ پر ایک والہانہ جذبہ طاری نظر آتا ہے:

ماٹی باغ، بغیچہ ماٹی، ماٹی دی گلزار
ماٹی نوں و بیکھن آئی، ماٹی دی اے بہار
ماٹی قدم کریندی یار

بلھے شاہ کی شاعری کا یہ زاویہ بے حد انوکھا ہے کہ انہوں نے ارضی حوالوں کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اپنے اظہار کے لیے خالص پنجاب کا ریختہ استعمال کیا ہے اور گرد و پیش کے مظاہر، اشیاء اور مناظر سے استفادہ کیا ہے لیکن یہ بات معرفت کی کی اور حقیقت کے پس پردہ ایک اور حقیقت کو پہچاننے کی دعوت دی۔ اہم بات یہ ہے کہ بلھے شاہ نے حصول مقصد کے لیے لمبا راستہ نہیں دکھایا۔ بلکہ تفصیل کو یوں اجمال میں سمیٹ لیا کہ

"ا"۔ اللہ دل رتا میرا مینوں "ب" دی خبر نہ کائی
"ب"۔ پڑھیاں کچھ سمجھ نہ آوے "ا" دی لذت آئی
"ع" تے "غ" دا فرق نہ جاناں ایہ گل "ا" بجھائی
بلھیا! قول "ا" دے پورے جیہڑے دل دی کرنا صفائی

ڈاکٹر محمد ریاض

شاہنامہ فردوسی' ایک عالمی شاہکار

ابوالقاسم فردوسی طوسی (وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ) بلاشبہ فارسی زبان کے عظیم شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تیس پینتیس سال صرف کرکے "شاہنامہ" کے نام سے موسوم ایک عظیم مثنوی لکھی جس کے اشعار کی تعداد ساٹھ ہزار بتائی جاتی ہے لیکن بعض قلمی نسخوں میں یہ اشعار اڑتالیس سے ستر ہزار کی تعداد میں ملتے ہیں۔ گویا متاخر نسخہ نویسوں نے شاہنامے کے بعض مضمون کی تلخیص کر دی اور بعض نے کچھ الحاقی اشعار شامل کرلئے ان الحاقی اشعار میں بعض وہ بھی شامل ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان میں سلطان محمود غزنوی کی ہجو کی گئی ہے کیونکہ ان اشعار کا زور سلطان کی مدح میں لکھے (۱) جانے والے اشعار کا سا نہیں ہے' اس میں کوئی کلام نہیں کہ مثنوی گوئی اور داستان سرائی میں فردوسی ایک بے نظیر شاعر ہے چنانچہ کسی شاعر کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے کہ جس طرح انوری قصیدے میں ممتاز ہے اور سعدی غزل میں' وہی کیفیت مثنوی میں فردوسی کی ہے

در شعر سہ تن پیغمبر انند گرچہ لانبی بعدی'
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

شاہنامہ پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں مکمل ہوا اور اس وقت سے اب تک نہایت مقبول اور دلپذیر تصنیف رہی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے اثرات معاصر شعراء نے قبول کئے اور اب تک بہت کم کوئی شاعر ہوگا جس نے فردوسی کے اسلوب اور شاہنامے کی تلمیحات سے استفادہ نہ کیا ہو۔ شاہنامے کو مکمل ہوئے کوئی ایک صدی گذری تھی کہ مسعود سعد سلمان لاہوری (و۵۱۵ھ) نے اس کتاب کا ایک خلاصہ تیار کیا تھا جس کا ذکر تذکروں (۲) میں ملتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں قوام الدین فتح بن علی بن محمد البنداری نے شاہنامے کا ایک خلاصہ تیار کیا اور اسے عربی میں ترجمہ (۳) بھی کیا۔ شاہنامہ کی بڑی عمدہ طباعتیں دستیاب ہیں اور ان میں ایک شاندار طباعت روس میں عمدہ نو جلدوں میں (۴) مکمل ہوئی۔ اس صدی میں شاہنامے کے کئی خلاصے (۵) شائع ہوئے اور اس کی بعض داستانیں جیسے رستم و سہراب' رستم و اسفندیار فرود اور سیاوش مستقل طور پر شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۹۰ء کو یونیسکو نے "سال فردوسی" قرار دیا اور اس سال دنیا کے مختلف ممالک میں فردوسی کی یاد میں اور ان کے شاہنامہ کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مقالات پیش کئے گئے۔ تہران میں ۱۹۹۰ء کے آخری عشرے میں بین الاقوامی فردوسی کانگریس منعقد ہوئی جس میں کوئی ڈیڑھ سو غیر ملکی مندوب شامل تھے اس موقع پر ڈاکٹر محمد جعفر یاحقی کا تیار کردہ شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ "بہین نامہ باستان" کے عنوان سے مشہد میں شائع ہوا جس میں آٹھ ہزار چار سو تئیس (۸۴۲۳) اشعار کا انتخاب ہے۔ انہیں کچھ نثری توضیحات کے ذریعے داستانی تسلسل دیا گیا ہے (۶)۔

فردوسی اور شاہنامے کا مختصر تاریخچہ

پانچویں صدی ہجری میں تاریخ سیستان (۷) کے نام سے ایک کتاب مکمل لکھی گئی جس میں فردوسی اور شاہنامے کا مختصر ذکر ہے۔ کوئی ایک صدی بعد نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ لکھا اس میں بھی فردوسی اور شاہنامے کا مختصر ذکر ملتا ہے۔ بعض بعد کی اہم ادبی کتابیں فردوسی اور شاہنامے کے ذکر سے معمور ہیں۔ فردوسی کے بارے میں زیادہ روایات یہی ہیں کہ وہ چار سو گیارہ ہجری (۴۱۱ھ) میں انتقال کر گیا لیکن بعض روایات میں ۴۱۶ھ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے ۳۷۰ھ کے لگ بھگ شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ اس کے پیش نظر دقیقی شاعر کے کوئی ایک ہزار شعر تھے جن میں سے بعض اس نے شاہنامے میں شامل کئے اور اس بات کا ذکر بھی کر دیا۔ اس کے علاوہ "خدائی نامہ" کے نام کی نثری کتاب کا مسودہ بھی اس کے پیش نظر تھا۔ اس کتاب میں ایران کے قدیم بادشاہوں کی داستان اور کچھ حقیقی تاریخ درج کی گئی ہے۔ فردوسی بتاتا ہے کہ اٹھاون برس کی عمر میں اس نے دوتہائی شاہنامہ مکمل کر لیا تھا چونکہ اس کا سال ولادت ۳۲۹ھ مشہور ہے لہٰذا اس کی اٹھاون سال کی عمر میں ۳۸۷ھ ہوتا ہے' یہ وہ سال ہے جس میں سلطان محمود کے باپ نے غزنی میں اپنے آقا الپتگین کی وفات کے بعد تاج و تخت سنبھالا تھا اور دو سال بعد خود محمود نے۔ ۳۹۴ھ میں شاہنامہ مکمل ہوگیا اور فردوسی نے اسے سلطان محمود غزنوی کے نام معنون کرنا چاہا۔ اس کے بعد ۴۰۲ھ میں شاعر نے اپنی اس عظیم تخلیق پر ایک نظرثانی کی' یوں ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کا شاہکار جیسے کہ وہ خود لکھتا ہے کوئی تیس یا تینتیس سال بعد مکمل ہوا(۸)۔

مشہور ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فردوسی کو ہر شعر کے بدلے ایک اشرفی صلے کے طور پر دے گا لیکن بعد میں وہ اس وعدے سے منحرف ہوگیا کیونکہ اسے شاہنامہ میں قدیم ایران کے فرضی یا اصلی کرداروں کی مبالغہ آمیز تعریف پسند نہ آئی لیکن بعد میں سلطان صلہ دینے پر آمادہ ہوا۔ البتہ یہ صلہ طوس میں اس دن پہنچا جس وقت فردوسی کا انتقال ہوا اور اسے دفن کیا جانے لگا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جس نے بہت اصرار کے بعد اپنے مرحوم والد کیلئے بھیجے جانے والا شاہی صلہ قبول کیا' مگر اس سے رفاہ عامہ کے لئے ایک کنواں بنوا دیا۔ اس صلے اور فردوسی کی مدح اور ہجو کے بارے میں محققین بہت کچھ لکھتے رہے ہیں۔ فردوسی کے مزار کی عمارت طوس میں حکومت ایران نے ۱۹۳۴ء میں ہزارہ فردوسی کے موقع پر تعمیر کروائی تھی'۱۹۹۰ء میں ہزارہ شاہنامہ کا جشن منایا گیا۔

شاہنامے کے مضامین اور اس کا اسلوب

شاہنامے کے داستانی حصے کا ماخذ پہلوی زبان کی کتاب "خدائی نامہ" ہے جو چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی۔ اس کتاب کو (۹) ابن مقفع نے سیرالملوک یا سیرالملوک فرس کے عنوان سے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابوموید بلخی' ابو علی بلخی اور ابو منصور محمد نے بھی نثر میں پہلوانوں اور ایران کے قدیم بادشاہوں کے قصے قلم بند کر رکھے تھے جن کا عصر فردوسی میں بڑا چرچا تھا اور جوان مرگ شاعر دقیقی نے ان قصوں کو نظم کرنا شروع کیا تھا دقیقی کو اس کام پر امیر نوح بن منصور سامانی (۳۶۵ تا۳۸۷ھ) نے مامور کر رکھا تھا مگر یہ شاعر اپنے ایک غلام کے ہاتھوں ۳۶۸ھ میں ہلاک ہوگیا۔

شاہنامہ فردوسی ایک بہت بڑا ادبی شاہکار ہے اور اس میں حکمت و دانش' رمز و ایما' جہانگیری اور

جانبازی اور انسان کو بہتر زندگی گذارنے کے جو اصول بتائے گئے ہیں ان کی بناء پر یہ ایک عالی شاہکار ہے۔ فردوسی نے داستانی واقعات کو نظم کیا اور ایرانی قوم کے لئے ایک عظیم حماسہ تیار کیا اس میں پہلوانوں اور بادشاہوں کی رزم آرائیاں ہی نہیں ان کی کامیابیوں کی اساس بھی فراہم کی گئی ہے۔ فردوسی کی داستان سرائی اس قدر دلپذیر ہے کہ اب تک ایران میں ان داستانوں اور قصوں کو سننے کے لئے باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔

فردوسی تجربات کو نہایت پختگی اور جزالت سے بیان کرتا ہے شاہنامے کے کئی اشعار اخلاقی' فلسفیانہ' معاشرتی' تمدنی اور سیاسی مضامین پر حاوی ہیں اور انہیں شاعر نے روح کی طہارت اور مکارم اخلاق سکھانے کے لئے داستانوں میں سمویا ہے۔ ایسے اشعار میں حمد خداوندی بھی ہے جن میں شاعر اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور اس کی پیدا کی ہوئی مجردات جیسے عقل اور روح کو نہایت موثر انداز میں بیان کرتا ہے مثلاً" شاہنامے کی بالکل ابتداء سے چند اشعار کا انتخاب دیکھیں:

بنام خداوند جان و خرد کزین برتر اندیشہ برنگذرد
خداوند نام و خداوند جائے خداوند روزی دہ و رہنمائے
خداوند کیہان و گردوں سپہر فروزندۂ ماہ و ناہید و مہر
زنام و نشان و گماں برتر است نگارندہ برشدہ گوہر است
بہ بینندگاں آفرینندہ را نبینی' مرنجاں دو بینندہ را
نیابد بدو نیز اندیشہ راہ کہ اوبرتراز نام و از جایگاہ
سخن ہرچہ زیں گوہر بگذرد نیابند بدو راہ جان و خرد
خرد را و جاں را ہمی سنجدا وے در اندیشہ سختہ کے گنجدا وے
ستودن نداند کس اورا چوہست میاں بندگی را ببایدت بست
خرد گر سخن برگزیند ہمی ھماں رہ گزیند کہ بیند ہمی
بدیں آلت و رائے و جان و رواں ستود آفرینندہ را کے تواں
بہستیش باید کہ خستوشوی زگفتار بیکار یک سوشوی

اسی طرح نعت' خدا' عقل و دانش کی جو توصیف فردوسی نے کی ہے وہ بھی بے نظیر ہے جیسے:

خرد افسر شہر یاراں بود خرد زیور نام داراں بود
کسے کو خرد را ندارد ز پیش دلش گردد از کردہ' خویش ریش
توانا بود ہرکہ دانا بود ز دانش دل پیر برنا بود
برنج اندر آری تنت را رواست کہ خود رنج بردن بدانش سزاست
بیاموز و بشنو ز ہر دانشی بیابی ز ہر دانشی را مشی
ز خوردو و ز بخشش میاسای ہیچ ہمہ دانش و داد دادن بسیچ
دگر با خرد مند مردم نشین کہ ناداں نباشد بہ آئین ودیں
کہ دانا ترا دشمن جاں بود بہ از دوست مردے کہ ناداں بود

ابو القاسم فردوسی ان شعراء میں شامل ہیں جنہیں حکیم کہا جاتا ہے یہاں حکیم طبیب کے معنی میں نہیں ہے بلکہ صاحب عقل و دانش اور حکمت و دانش کی تعلیم دینے والی شخصیت کے معنی میں ہے۔ وہ ہر چیز کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس معیار پر پورا نہ اترنے والی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا وہ اس لئے یہ تصریح کرتا ہے کہ ان کی کتاب میں بیان کی ہوئی باتیں حقیقت سے تعلق رکھتی ہیں یا رمزو ایما سے ان کے ظاہری معنوں پر ہی اکتفا کرکے انہیں جھوٹ اور افسانہ نہ کہہ دیا جائے چنانچہ اس سلسلے میں وہ عاقلانہ اور دلپذیر صورت میں عقل و دانش سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے تاکہ شاہنامہ کا پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔

حکمت و دانش کی تعلیم دیتے ہوئے فردوسی نے بعض مشہور عقلاء اور دانش مندوں کا ذکر کیا ہے' اس سلسلے میں نوشیرواں ساسانی (۵۳۱ تا ۵۷۹ء) اور اس کا دانش مند وزیر بوزر جمہر بہت مشہور ہیں چنانچہ فردوسی نے دربار نوشیرواں کی کئی پر حکمت و دانش محفلوں کا ذکر کیا ہے جن میں نوشیرواں' بوزر جمہر اور دوسرے اعیان و امراء حکمت کے موتی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

بزم ہائے حکمت

فردوسی نے شاہنامے میں سات بزموں کی کیفیت لکھی ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا ایک قسم کا خردنامہ ہے ابتداء میں شاعر نے نوشیرواں کی اصلاحات نقل کی ہیں مثلاً:

نبوداد گرتر ز نوشیراں ... کہ بادا ہمیشہ روانش جواں
ورا موبدے بود بابک بہ نام ... ھشیوار و دانا دل و شاد کام
بہ دیوان بابک خرامیدہ شاہ ... نہادہ ز آھن بہ سر بر کلاہ
نگہ کرد بابک پسند آمدش ... شہنشاہ را فرمند آمدش
چوبرخاست بابک زد یوان شاہ ... بیامد بر نامور پیشگاہ
پس آگاہی آمد بہ روم و بہ ھند ... کہ شد روئے ایراں چو رومی پرند
زمین را بکردار تابندہ ماہ ... بداد و بہ لشکر بیا است شاہ

ترجمہ: نوشیرواں سے زیادہ منصف کوئی نہ تھا۔ خدا اس کی روح رواں کو ہمیشہ جوان رکھے۔ اس کا ایک موبد تھا۔ اس کا نام بابک تھا جو بیدار مغز' عقل مند اور مسرور دوست تھا۔ بادشاہ سر پر آھنی خود رکھے بابک کے ہاں آنکلا۔ بابک کو یہ شکوہ مند بادشاہ کا شیوہ پسند آیا۔ (بابک بھی دربار میں گیا) جب دربار سے اٹھنے لگا تو بادشاہ کے حضور آیا۔ یہ ملاقات روم و ھند تک مشہور ہوئی اور ایران رومی ریشم کی طرح (منور اور زرق برق) ہوگیا۔ بادشاہ نوشیرواں نے ماہتاب کی طرح لشکر سجایا۔

بعد میں شاعر اس بادشاہ کی انصاف پسندی اور رعیت پروری کا ذکر کرتا ہے اس نے غریب رعایا کا ٹیکس معاف کر دیا تھا دوسری طرف اس نے جابر روم پر لشکر کشی کی۔ اس کے بعد شاعر اس بادشاہ کے عاقل وزیر بوزر جمہر کا ذکر کرتا ہے اور اس کے بعض حکیمانہ اقوال نقل کرتا ہے۔ نوشیرواں کی موجودگی میں ایک شاہی ندیم نے بوزر جمہر سے قضا و قدر کے بارے میں سوال کیا اور اس دانشمند وزیر نے اس طرح جواب دیا ۔

حکمت و موعظت

شاہنامہ کے عنوانات و مضامین کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ اس حکیم شاعر نے ایک ایک شعر میں بعض مضامین کا احاطہ و احاصرہ کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم شعرا بھی اس کے اشعار کی تضمین خاص عنوان سے کرتے رہے ہیں۔ مثلاً "شیخ سعدی مثنوی "بوستان" میں رحم و رحمدلی کے بیان میں شاہنامہ کے ایک شعر کی اس طرح تضمین کرتے ہیں:

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد   کہ رحمت برآں تربت پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است   کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

اسی طرح علامہ اقبال حکیم طوسی کے ایک بیت کو "خودی" کے عنوان سے تضمین کرتے اور اس شاعر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض   نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
یہ کہتا ہے فردوسی دیدہ ور   عجم جس کے سرمے سے روشن بصر
"ز بہر درم تند و بدخو مباش   تو باید کہ باشی' درم گو مباش"

رستم شاہنامے کا اہم تر کردار ہے۔ اس کی تین جنگیں تو بہت معروف ہیں جو اس نے سہراب' اسفندیار اور افراسیاب سے لڑیں اور کامیاب رہا۔ اس کے اور اسفند یار کے "ہفت خوان" مشہور ہیں۔ رستم نے عالم طفلی سے بڑھاپے تک کئی معرکے سر کئے مگر اپنے بھائی شغاد کی غداری اور دھوکا دہی سے اس عظیم ہیرو اور قہرمان کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

فردوسی مختلف واقعات سے حکمت اندوزی اور عبرت سامانی کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ مثلاً "کہتا ہے کہ آدمی جب ۶۰ سالی کی لپیٹ میں؛ ہو' تو اسے مرگ طبعی کا منتظر رہنا چاہئے۔ موت کا وقت متعین ہے ادھر وہ کسی لمحے وارد ہو سکتی ہے مگر۔ ۶۰ سال کے قریب پہنچ کر تو وہ طبعاً" قریب متصور ہونا چاہئے۔

کسے را کہ سالش بدوسی رسید   امید از جہانش بباید برید
چو آمد بنزدیک سر تیغ شصت   مدہ مے کہ از سال شد مرد مست
بجائے عنانم عصا داد سال   پراگندہ شد مال و برگشت حال
ہمان دیدہ باں برسر کوھسار   نہ بنیند ہمی لشکر بے شمار
کشیدن نداند ز دشمن عناں   اگر پیش مژگانش آید سناں
پر از برف شد کوھسار سیاہ   ہمی لشکر از شاہ بیند گناہ
گرایندہ دو تیز پائے نوند   ہماں شصت بد خواہ کردش ببند
سرایندہ ز آواز برگشت سیر   ہمش لحن بلبل ہم آوائے شیر
چو بر داشتم جام پنجاہ و ہشت   نگیرم بجز یاد تابوت و دشت
دریغ آں گل و مشک و خوشاب سی   ہماں تیغ برندۂ پارسی
نگردد ہمی گرد نسرین تذرو   گل نارون خواہد و شاخ سرو
ہمی خواہم از دادگر کردگار   کہ چنداں امان یابم از روزگار

اوپر ہم نے اسفندیار کا ذکر کیا۔ شاہنامے کے کرداروں میں رستم کے بعد' وہ عظیم تر پہلوان اور

بہادر تھا۔ اس کی اور رستم کی جنگ کو شاعر نے بڑے زوردار اور عبرت آمیز طریقے سے بیان کیا ہے فردوسی کہتا ہے کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ اسفند یار کو کبر و غرور نے کہیں کا نہ چھوڑا اور وہ اندھا ہو کر مرا قصہ اس طرح ہے۔

اسفند یار "گشتاسپ" شاہ کا بیٹا تھا۔ سخت جان ہونے کی بناء پر اسے "روئیں تن" (یعنی دھات کے جسم والا) کہتے تھے۔ باپ کے کہنے پر اس نے ارجاسپ سے جنگ کی اور اسے مار ڈالا۔ اب اس نے باپ سے تاج و تخت مانگ لیا۔ باپ نے وعدہ کیا کہ اگر وہ رستم کو گرفتار اور اسیر کرکے لے آئے' تو تاج و تخت اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اسفند یار' ہفت خون' سر کرنے والا پہلوان تھا۔ اس نے اس چیلنج کو معمولی جانا۔ اسے خبر نہ تھی کہ رستم کو "سیمرغ" کی مدد بھی حاصل ہے' چنانچہ اس نے رستم پر حملہ کرنا چاہا مگر رستم نے سیمرغ کے اشارے پر تیر چلایا اور اس کی آنکھ نکال دی۔ تیر کے زخم مندمل نہ ہو سکے اور اسفند یار بعد میں چل بسا۔ رستم نے اس موقع پر دو عمدہ کام کئے۔ ایک یہ کہ شہزادہ اسفند یار کی نعش تزک و احتشام کے ساتھ بھجوائی دوسرے اس کے بیٹے بہمن کی کفالت اور تربیت اپنے ذمے لی اور اس کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کی۔ البتہ رستم کو سب منع کرتے رہے کہ دشمن کے بیٹے کی پرورش نہ کرے کیونکہ وہ کبھی باپ کے قتل کا بدلہ لے گا مگر بعد میں اس کام کی نوبت نہ آئی البتہ اس نے رستم کے خاندان سے بدلہ لیا:

ز دهقان تو نشنیدی آن داستان — که یاد آرد از گفته باستان؟
که گر پروری بچه' شیر نر — شود تیز دندان و گرد دلیر
چو سر بر کشد زود جوید شکار — نخست اندر آید به پروردگار؟
ز بهمن رسد بد به زابلستان — به پیچند پیران کابلستان
نگه کن که چون او شود تاجدار — به پیش آورد کین اسفندیار
بدو گفت رستم که با آسمان — نتابد بد اندیش و نیکی گمان
من آن برگزیدم که چشم خرد — بدو بنگرد نام یاد آورد
گر او بد کند پیچد از روزگار — تو چشم بلا را به تندی خار

تاریخی واقعات

عجم و عرب کی جنگ اور سپاہ اسلام کا حضرت عمرؓ کے دور میں ایرانی قشون پر غالب آنا' مشہور تاریخی واقعات میں سے ہے۔ فردوسی نے انہیں شاعرانہ انداز میں بیان کیا اور عبرت و موعظت کے امور اخذ کئے ہیں۔ حضرت سعدؓ بن وقاص مسلمان افواج کے سپہ سالار تھے۔ ان کے مد مقابل ایرانی سپہ سالار' رستم کے نام سے موسوم تھا۔ ظاہر ہے شاہنامہ کا ہیرو "رستم" اور ہے یہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل کا رستم اور۔ ابتداء میں شاعر رستم اور حضرت سعدؓ کے نامہ و پیغام کے مبادلے کا ذکر کرتا ہے۔ رستم کے خط میں دھمکیاں تھیں اور حضرت سعدؓ کے نامے میں دعوت حق۔ انہوں نے لکھا کہ ایرانی دعوت حق قبول کر لیں تو مسلمان جنگ سے منحرف ہو جائیں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ یزدگرد سوم ساسانی کے سپہ سالار رستم نے جنگ کرنے کو ترجیح دی۔

فردوسی کی چابکدستی دیکھیں کہ وہ نامہ و پیغام کے تبادلے کا حال کس طرح بیان کرتا ہے:

چو بخت عرب بر عجم چیره شد — همی بخت ساسانیان تیره شد

برآمد ز شاہاں جہاں را قفیز   نہاں شد زرو گشت پیدا پشیز
چو آگاہ شد زاں سخن یزدگرد   ز ہر سو سپاہ اندر آورد گرد
بفرمود تا پور ہرمزد براہ   بہ جنگ آید و برکشد با سپاہ
کہ رستم بدش نام و بیدار بود   خرد مند و گرد و جہاندار بود
بدیں گونہ تا ماہ بگذشت سی   ہمی رزم جستند در قادسی
فرستادہ ای تیز چون برق رعد   فرستاد ازیں سو بزدیک سعدؓ
یکے نامہ ای بر حریر سفید   نوشتند برنیم و چندے امید
بعنواں براز پور ہرمز شاہ   جہاں پہلوان رستم کینہ خواہ
سوئے سعد وقاص جوئندہ جنگ   پر از رائے پر دانش و پر درنگ
بتازی یکے نامہ پاسخ نوشت   پدید آورید اندر و خوب و زشت
سرنامہ بنوشت نام خداے   محمدؐ رسولش بحق رہنماے
ز جنی سخن گفت و از آدمی   ز گفتار پیغمبرؐ ہاشمی

یعنی : جب عرب کا نصیب ایران پر غالب آیا تو ساسانیوں کی قسمت تاریک ہوگئی۔ دنیا کے بادشاہ جوہڑ میں ڈوبنے لگے۔ سونا غائب ہوا اور کوڑی نمایاں ہوئی۔ یزدگرد کو جب اس بات کا علم ہوا تو فوجوں کی گرد ہر طرف اڑنے لگی۔ اس نے حکم دیا کہ ہرمزد کا بیٹا روانہ ہو اور لشکر آرائی کرے۔ اس کا نام رستم تھا۔ وہ آگاہ حال، عقلمند، پہلوان اور سپہ سالار تھا۔ اس طرح جنگ قادسیہ میں تیس ماہ بیت گئے۔ آخر برق و رعد کی طرح ایک سبک رفتار قاصد کو اس نے سعدؓ کے پاس بھیجا۔ سفید ریشم پر ایک خط لکھا گیا۔ انہیں خوف زیادہ تھا اور امید کم۔ خط جنگجو رستم ابن ہرمزد کی طرف سے سعد بن وقاص کے نام تھا جو عاقل، صاحب رائے اور بردبار تھے۔ انہوں نے رستم کو عربی میں جواب دیا اور اس میں خوب و ناخوب اور نیکی و بدی واضح کر دی۔ خط اللہ کے نام سے شروع کیا گیا اور اللہ کی طرف رہنمائی کرنے والے اس کے رسولؐ کا نام بھی مذکور تھا۔ حضرت سعد نے رسولؐ ہاشمی کے اقوال کی روشنی میں انسان کے جن فرائض کا ذکر کیا۔ ان چند اشعار میں فردوسی نے کس ایجاز سے ساسانیوں اور عرب مسلمانوں کے درمیان نامہ و پیغام کے تبادلے کا ذکر کیا ہے۔ جب جنگ چھڑی تو یزدگرد بغداد میں تھا۔ اس نے قرب و جوار کے بادشاہوں سے مدد مانگی۔ ایک مکتوب ماھوی سوری کے نام تھا اس نے ساسانی بادشاہ کو پناہ دینے کا وعدہ کیا مگر اسے ایک آسیابان (آٹا پیسنے والے) کے ہاں پناہ لینا پڑی جس نے اس کا زرق برق اور قیمتی لباس ہتھیانے کی خاطر اسے قتل کر دیا۔ ماھوی سوری نے اس وقت اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اسے جلد ہی بیژن نے قتل کروا دیا مگر بیژن بھی اپنے انجام بد سے نہ بچ سکا۔ فردوسی طبعی نتیجے کو نمایاں کرتا ہے کہ جس کسی نے بھی برائی کی، اسے جلد یا بدیر انجام بد سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یزدگرد سوم دعوت اسلام کی مخالفت کرتے مارا گیا۔ ماھوی سوری اور بیژن کو آزِ حرص نے قتل کرنے پر آمادہ کیا اور دونوں اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

یکے مہتری بود نامش گراز   گز و بود ماہوی را نام و ناز
نگہبان مرو آمد آں روزگار   چو ماھوی شد کشتہ بر خوار و زار

فروزنده [illegible] مهر سپهر | همی ساخته از [illegible] [illegible]

چو ماهوی را تیره شد روزگار | به [illegible] [illegible] آمد [illegible] [illegible] سوار

[illegible] شهر و برآمد خروش | [illegible] آں [illegible] [illegible] جنگ و جوش

گراز اندر آں تیره گی کشته شد | [illegible] [illegible] را [illegible] برگشته شد

گنهکار بد بیژن ترک نیز | و را [illegible] بر سر آمد [illegible]

خرد زاں چناں مرد بیگانه گشت | ازاں پس شنیدم که دیوانه گشت

همی بود تا خویشتن را بکشت | زہے چرخ گردندۂ گوژپشت

بگیتی چنین است پاداش بد | ہر آں کس که بد کرد کیفر برد

یعنی : گراز نام کا ایک سردار تھا جس پر ماہوی کو فخر تھا۔ ماہوی جب ذلت و خواری سے مارا گیا' تو وہ سردار زادہ اس کے لئے تاج زر بنا رہا تھا۔ ماہوی کا زمانہ جب تیرہ و تار ہوا تو مرو میں ہر طرف سے سوار آ گئے شہر میں ہنگامہ برپا ہوا اور وہ سرحد شور و جنگ کی آماجگاہ بن گئی اس طوفانی جنگ میں گراز مارا گیا۔ اس کا سارا خاندان ہی تباہ و برباد ہوگیا۔ بد عمل بیژن ترک کی تباہی آگئی۔ اس کی عقل جاتی رہی سنا ہے کہ وہ دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس کی یہی حالت رہی تا آنکہ خود کو مار ڈالا۔ اس خمیدہ پشت آسمان کی یہی حالت ہے۔ دنیا میں برائی کا بدلہ یوں ہی ملتا ہے۔ جس نے برائی کی' وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

فردوسی نے اس طرح داستانوں کے ذریعے حقائق اخذ کرکے پیش کئے۔ فردوسی کا عصر بالعموم تعلیم تصوف کا عہد تھا۔ درباروں سے منسوب شعراء بھی متصوف بنے ہوئے تھے۔ وہ جذبہ اشراق و عشق کی دعوت دیتے تھے اور عقل و خرد کے کاموں پر حرف گیری کرتے تھے اس ماحول میں فردوسی کی دعوت عقل و خرد قابل توجہ ہے۔ اس کا بیان عاقلانہ تو ہے ہی وہ عقل و خرد کا داعی اور اس موہبت کبری کا ایک عظیم حامی ہے۔

اس سلسلے میں چند ابیات نقل ہو چکے۔ کچھ مزید اشعار دیکھتے چلیں:

ہنرمند با مردم بے ہنر | بفرجام ہم خاک دارد بسر

ولیکن از آموختن چارہ نیست | کہ گوید کہ دانا و ناداں یکے ست (۴)

خرد بہتر از ہر چہ ایزدت داد | ستایش خرد را بہ از راہ داد

خرد زندہ جاویدانی شناس | خرد مایہ زندگانی شناس

خرد رہنمائے و خرد دلکشائے | خرد دست گیرد بہ ہر دو سرائے

ازو شادمانی و زو مردمیست | ازویت فزونی و زویت کمی است

خرد تیرہ و مرد روشن رواں | نباشد ہمی شادماں یک زماں

چہ گفت آں ہنرمند مرد خرد | کہ دانا ز گفتار او برخورد

کسے کو خرد را ندارد ز پیش | دلش گردد از کردہ خویش ریش

ہشیوار و دیوانہ خواند ورا | ہماں خویش بیگانہ داند ورا

ازوئی بہ ہر دو سرا ارجمند | گسستہ خرد پائے دارد بہ بند

خرد جسم و جاں است چوں بنگری — کہ بے جسم شاداں جہاں نسپری
نخست آفرینش خرد را شناس (۱۲) — نگہبان جان است و آں سہ سپاس
سپاس تو گوش است و چشم و زباں — کزیں سہ رسد نیک و بد بیگماں
خرد را و جاں را کہ یارد ستود — و گر من ستایم کہ یارد شنود؟

یعنی: عقل مند بے عقل کے ساتھ دوستی رکھے تو اس کا انجام ذلت ہوتی ہے۔ سیکھنے سے چارہ کار نہیں کون کہے گا کہ دانا اور نادان ایک سے ہیں۔؟ جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے' اس میں عقل سب سے بہتر ہے۔ داد و دھش کی راہ سے بہتر عقل کی تعریف ہے۔ عقل کو زندہ جاوید اور سرمایہ زندگی جان' عقل راہبر ہے اور دل کشا بھی۔ وہ دونوں جہان میں مددگار ہے۔ خوشی اور مروت اسی سے ملے گی۔ کمی و بیشی اس سے ہے۔ عقل تاریک ہو تو روح کیسے روشن رہے گی۔ یوں انسان لمحہ بھر کے لئے بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ کسی عاقل نے کیا خوب کہا ہے کہ عقل مند کو اپنی بات سے فائدہ مل سکتا ہے۔ کسی نے عقل کو پیش نظر نہ رکھا ہو تو وہ اپنے عمل سے محروم رہے گا۔ غیر عاقلانہ کام کرنے والے کو دیوانہ کہتے ہیں' ایسے شخص کو اپنے غیر جانتے ہیں۔ عقل پر کاربند شخص دونوں جہاں میں سرخرو ہوتا ہے۔ تو غور کرے تو جسم و جاں عقل ہی ہے۔ اس جسم و جاں کے بغیر تو دنیا کی منازل طے نہ کر سکے گا۔ عقل کو خدا کی پہلی تخلیق جان۔ وہ روح کی نگہبان ہے اور اس کے تین پہلو قابل شکر ہیں۔ کان' آنکھ اور زبان باعث سپاس طے۔ بے شک نیکی و بدی ان ہی کے ذریعے پہنچتی ہے۔ عقل و روح کی توصیف کون کر سکے گا؟ میں جو توصیف کروں' اسے سننے کی کس میں ہمت ہے۔

فردوسی نے داستانوں اور تاریخی واقعات کی ابتداء' خاتمے اور متن کے بیچ میں عمدہ اخلاقیات بھی درج کی ہیں۔ ان کے درس میں شجاعت' شہامت' خرد دوستی' حب وطن' جوانمردی' راستی اور دین دوستی وغیرہ شامل ہیں۔ ان ہی تعلیمات اور شاعرانہ چابکدستی کی بناء پر فردوسی ایک عالمی شاعر قرار پاتے ہیں اور شاہنامہ ایک عالمی تخلیق' شاعر کا یہ بیان تعلی نہیں' بلکہ حقیقت ہے کہ ۔

بناہائے آباد گردد خراب — ز باراں و از تابش آفتاب
پے افگندم از نظم کاخے بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند
نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام — کہ تخم سخن را پراگندہ ام
ہر آنکس کہ دارد ہش و رائے و دیں — پس از مرگ بر من کند آفریں (۱۳)

توضیحات اور ماخذ

(۱) معاصر ایرانی محققین چند اشعار کی ہجو کو تسلیم کرتے ہیں مگر بیشتر اشعار ان کے نزدیک بھی الحاقی ہیں کیونکہ ان میں مدح سلطان محمود کا زور ہے اور نہ فردوسی کا یہ شیوہ ہی ہے:

چو کودک لب از شیر مادر بشست — بہ گہوارہ محمود گوید نخست
بتن زندہ پیل و بجان جبرئیل — بکف ابر بہمن بدل رود نیل
جہاندار محمود شاہ بزرگ — بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

(۲) دیکھیں محمد عوفی کا تذکرہ لباب الالباب، تصحیح استاد سعید نفیسی تہران، کتاب فروشی علی اکبر علمی، طبع اول ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۶۹۔

(۳) الشاہنامہ تصحیح از ڈاکٹر عبدالوہاب عزام تہران ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۔

(۴) شائع کردہ اکادمی علوم تاجکستان ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۸ء مؤلف کے پاس ہیں۔

(۵) یہ داستانیں استاد مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی اور محمد روشن نے شائع کروائی ہیں۔

(۶) مشہد ۱۳۷۹ش / ۲۰۰۰ء صفحہ ۳۴۴۔

(۷) مولف نامعلوم۔ ملک الشعراء بہار کا مرتبہ مجموعہ چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی کئی اشاعتیں ہو چکی ہیں۔

(۸) بسے رنج بردم درین سال سی عجم زندہ کردم بدین پارسی

(۹) نام عبداللہ اور لقب رودکی ہے۔ ۳۲۹ تا ۳۳۵ھ کے کسی وقت فوت ہوا تھا۔

(۱۰) بال جبریل، کلیات اقبال، اقبال طبع لاہور (شیخ غلام علی اینڈ سنز) ۱۹۷۳ء اور بعد ازاں، صفحہ ۵۳۔

(۱۱) قرآن مجید ۹ سورہ ۳۹ (زمر)۔

(۱۲) معروف قول ہے: اول ما خلق اللہ العقل۔

(۱۳) یعنی آباد عمارات بارش اور تمازت آفتاب سے ویران ہو جاتی ہیں۔ مگر میں نے شاعری کا ایک اونچا محل تعمیر کیا ہے جسے ہوا اور بارش سے نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں نے چونکہ اعلیٰ شاعری کا بیج بویا ہے، میں اس کے بعد زندہ رہوں گا اور مروں گا نہیں۔ جس کسی میں عقل و ہوش، قوت فیصلہ اور دینداری ہوگی، وہ میرے مرنے کے بعد میری توصیف ہی کرے گا۔

جمیل یوسف

باقی صدیقی۔ ایک ناقابل فراموش شاعر

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ بعض شعراء کے تخلص میں ہی ان کی شاعری کی قدرو قیمت کا پر تو موجود ہوتا ہے۔ میر تقی میر کو سب اردو شاعری کا میر کارواں تسلیم کرتے ہیں۔ غالب کا غلبہ آج تک اردو شعرو سخن کی سلطنت پر قائم و دائم ہے۔ اقبال ایک قوم کے عروج و اقبال کا نشان تو پہلے ہی بن چکا ہے اور ہماری قوم اس نشان منزل تک پہنچنے کی آرزو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہے دنیا بھر میں اقبال کا اقبال بلند ہو رہا ہے۔ ایران کے ملک الشعراء بہار نے اقبال کو کیا خوب خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔

عصر حاضرؔ خاصہ اقبال گشت

اسی طرح باقی صدیقی کا تخلص اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کا نام اور کلام باقی رہے گا اور اس کے کلام کی عظمت کو بقائے دوام حاصل ہوگا۔ جوں جوں اہل ذوق اس کو پڑھیں گے اور اہل نظر اس کا جائزہ لیں گے اس کے فن کی سچائی ان پر منکشف ہوتی چلی جائے گی۔ جس طرح کسی موتی کا سچا ہونا اور سونے کا خالص ہونا ان کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے اسی طرح فن کی صداقت ہی کسی فن کار کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل بنتی ہے۔ انسان کی روح ازل سے صداقت کی متلاشی ہے وہ کائنات اور زندگی کی حقیقت جاننا چاہتی ہے۔ غالب نے اس حقیقت کو حسن کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ ۔

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

اس حسن کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک جہان معنی اپنے اندر رکھتا ہے۔ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والا ہر فن کار بالعموم اور شاعر بالخصوص اس جہان معنی کو پا لینے اور دوسروں کو اس تک پہنچانے کی سعیٔ پیہم میں مصروف رہتا ہے۔ چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ کائنات پیدا ہی اس لئے کی ہے کہ وہ پہچانا جائے اور دراصل وہی ایک جلوہ ہے جو ہر حقیقت ازلی اور صداقت ابدی کے پیچھے کارفرما ہے اور فن اسی جلوہ خداوندی کو اپنے آئینے میں منعکس کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہر فن کار جو اپنے فن کے مجاہدے میں مشغول ہے وہ دراصل عبادت میں مشغول ہے۔ بقول غالب ۔

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

اسی لئے میں نے عرض کیا ہے کہ کسی فن کار کا سچا ہونا اس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ سچا فن وہی ہے جو کسی نہ کسی صداقت کے چہرے سے پردہ سرکاتا ہے اور اس حسن خالص کی ایک جھلک دکھاتا ہے جو صرف صداقت اور سچائی ہی کا خاصہ ہے۔ جھوٹ، طمع، فریب اور دھوکہ ہرگز حسین نہیں ہو

سکتا۔ حسن سچائی ہی کا نام ہے۔ انگریزی شاعر جان کیٹس نے حسن کو سچائی اور سچائی کو حسن کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہم صرف اسی حسن کی حقیقت جاننے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہاں مجھے حضرت [illegible] کا ایک قول یاد آرہا ہے انہوں نے کہا تھا کہ میرا بہترین شعر وہ ہے کہ جب تو اسے لوگوں کے سامنے پڑھے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھیں "سچ کہا ہے"۔ چنانچہ کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے سچ ترین اور موزوں ترین پیمانہ یہی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرکے کہا ہے یا نہیں' یا محض شعر کہنے کے لئے دوسروں کے خیالات نظم کر دیئے ہیں دوسرے الفاظ میں اس کی شاعری سچی ہے یا نہیں۔ کیا وہ صداقت کی کوئی نہ کوئی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں اور پھر اس نے صداقت کی وہ جھلک ہمیں بھی دکھائی ہے یا نہیں' اسی کو ابلاغ کہتے ہیں۔ اگر ابلاغ نہیں تو تخلیق شعر کی ساری کوشش' کوشش ناکام اور سعی رائیگاں کہلائے گی۔

کائنات شعر میں بڑے بڑوں کا ڈنکا بجا۔ کئی شاعر اپنے اپنے وقت میں ملک الشعراء بنے' کتنوں کی شہرت دور دور تک پھیلی اور وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر کہلائے۔ محمد ابراہیم ذوق اور اختر شیرانی کی مثال آپ کے سامنے ہے' مگر وقت کی گرد نے ان کے مجموعہ ہائے کلام پر ایسا غلاف چڑھایا کہ وہ مجموعے ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہوگئے اب زیادہ سے زیادہ ان شاعروں کا نام باقی ہے کلام باقی نہیں۔ کسی کے دل میں ان کو پڑھنے کی آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی شہرت تاریخ کا ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی شاعری میں سچ کی مقدار بہت کم تھی یا نہ ہونے کے برابر تھی۔ دھوم دھڑکے اور بازی گری سے وقتی طور پر لوگ متوجہ تو ہوتے ہیں مگر پھر کچھ دیر یہ تماشا دیکھ کر آگے گزر جاتے ہیں اور یہ شور و غوغا خود بخود بیٹھ جاتا ہے۔ باقی صدیقی نے اس شور و غوغا سے دور چپ چاپ تنہائی میں اپنی شاعری کی شمع جلائے رکھی' وہ اس شمع کی لو اپنے خون جگر سے بڑھاتا رہا۔ اس کی دوستی فن سے تھی۔ واہ واہ کرانے اور واہ واہ کرنے والوں سے نہ تھی اور فن سے دوستی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر خود اپنی آگ میں جلنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی لئے تو اس نے کہا تھا کہ ۔

دوستی خون جگر چاہتی ہے
کام مشکل ہے تو رستہ دیکھو

اور ۔

جوئے شیر آتی ہے دل سے باقی
خود پہ ہی پڑتا ہے تیشہ پہلے

میں نے اوپر کہیں اشارہ کیا ہے کہ صداقت کی متلاشی ہونے کی رعایت سے شاعری بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ باقی کا ایک شعر سنیئے ۔

اک سجدہ کیا میں نے فقط لفظ کی صورت
ورنہ مری تخئیل ہے کیا' میرا قلم کیا

زندگی کے بارے میں مختلف شعراء نے بڑے بڑے اچھوتے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چکبست کا مشہور شعر ہے ۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

عالی کا شعر ہے ۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اصغر گونڈوی کا شعر ہے ۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

زندگی کے موضوع پر باقی صدیقی کا شعر نہایت منفرد اچھوتا اور سچا ہے اور پھر انداز بیان کی ندرت ملاحظہ ہو۔ باقی نے کہا ہے ۔

زندگی حرف غلط ہی نکلی
ہم نے معنی تو بہت پہنائے

اور پھر سیدھے سادے الفاظ میں ایک اور جگہ کہا ہے ۔

زندگی دل کا سکوں چاہتی ہے
رونق شہر سبا کیا دیکھیں

انسان کو حقیقی سکون و اطمینان شہر کے ہنگاموں میں نہیں بلکہ اپنے اندر کی تنہائی سے ہم کلام ہونے میں ملتا ہے۔ اس کا اظہار باقی نے متعدد جگہ پر اپنے اشعار میں کیا ہے ۔

جنگل کے سناٹے سے اک نسبت تو ہے
شہر کے ہنگامے میں پھرتا کون اکیلا
زندگی کا نشاں کہیں ملتا
اک نیا شہر بس گیا تو کیا

باقی صدیقی کے نزدیک سکون و اطمینان اور کیف و سرمستی کی دولت انسان کے ظاہر میں نہیں باطن میں ہے۔ اپنے بطون کے غار حرا میں ہے' اپنے اندر غوطہ زن ہونے میں ہے مگر المیہ یہ ہے کہ تقریباً" ہر شخص زندگی کا بیشتر عرصہ اور ایک عام آدمی ساری زندگی باہر کی دنیا میں مسرت و طمانیت کی تلاش رائیگاں میں لگا رہتا ہے بقول باقی ۔

ابھی ہے گوش بر آواز گھر کا سناٹا
ابھی کشش ہے بڑی دور کی صداؤں میں

باقی صدیقی کے ہاں گاؤں' سکون و اطمینان کی علامت بن کر ابھرا ہے اور اس کے مقابلے میں شہر ہنگامہ خیزی اور عدم اطمینان کا گڑھ ہے۔ اس کی شاعری میں پنجاب کا گاؤں اپنی پوری دلکشی کے ساتھ موجود ہے ۔

سر پہ ڈالی سرسوں کی
پاؤں میں کانٹا کیکر کا
خبر کچھ ایسی اڑائی کسی نے گاؤں میں
اداس پھرتے ہیں ہم بیریوں کی چھاؤں میں

اسے ہر روز اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے اپنے گاؤں سہام سے ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے دفتر آنا پڑتا تھا۔ وہ شہر اور گاؤں کے تضاد کے کرب سے ہر روز گزرتا تھا مگر وہ خوش قسمت تھا گاؤں سے اس کا رابطہ تو قائم رہا۔ اس کا فن گاؤں کی کھلی کھلی فضاؤں کی طرح سادہ، تر و تازہ اور پوتر ہے۔ سادگی بیان اور بات کہنے کا سیدھا سادا انداز باقی صدیقی کا امتیازی وصف ہے۔ غالباً اسی لئے اس کی بیشتر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔ چھوٹی بحروں میں شاعر کو خالی جگہ پر کرنے کے لئے، حشو و زوائد کی ضرورت نہیں پڑتی اسے بات بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باقی صدیقی کو میں سچی اور کھری شاعری کرنے والا شاعر کہتا ہے یہی بات لمبی نہیں ہوتی۔ مختصر ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے کسی اور شاعر نے اتنی زیادہ تعداد میں چھوٹی بحروں میں غزلیں نہیں کہیں۔ مجھے میر، داغ اور ناصر کاظمی کی شاعری سے آگاہی ہے اور میں باقی صدیقی کے متعلق یہ بات ان جملہ شعراء کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ پھر چھوٹی بحروں میں غزلوں کی تعداد ہی باقی کی دین نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چھوٹی بحروں کو جس استادی اور مشاقی سے باقی صدیقی نے نبھایا ہے اور اس کی ہر غزل میں اچھے اشعار کی جتنی تعداد ہے وہ اور کسی کے ہاں نہیں، لفظ کو جس خوش سلیقگی سے اس نے باندھا ہے وہ اس کا حصہ ہے۔ اس کی غزل پر کسی کی چھاپ نہیں۔ مثلاً ناصر کاظمی اور فراق گورکھپوری کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ میر کی یاد دلاتے ہیں۔ باقی صدیقی کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس نے کسی کے رنگ میں شعر نہیں کہے۔ اپنے رنگ میں کہے ہیں۔ وہ اپنی طرز سخن کا موجد اور خاتم تھا اس نے ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جن پر اردو کا بڑے سے بڑا شاعر عش عش کر اٹھے۔ مجھے بتائیے باقی صدیقی کے ہم عصروں میں اس طرح کے بے پناہ اشعار اور پھر اتنی زیادہ تعداد میں کس کے مجموعے میں ہیں۔

یوں بھی ہونے کا پتہ دیتے ہیں — اپنی زنجیر ہلا دیتے ہیں
پہلے ہر بات پہ ہم سوچتے تھے — اب فقط ہاتھ اٹھا دیتے ہیں
دل میں جب بات نہیں رہ سکتی — کسی پتھر کو سنا دیتے ہیں

○

سفر گل کا پتہ تھا پہلے — یہی رستہ تھا صبا کا پہلے
کبھی گل سے کبھی بوئے گل سے — کچھ پتہ ملتا تھا اپنا پہلے
اب تو ہر موڑ پہ کھو جاتے ہیں — یاد تھا شہر کا نقشہ پہلے
دور سے ہم کو صدا دیتا تھا — تیری دیوار کا سایہ پہلے
اب کناروں سے لگے رہتے ہیں — رخ بدلتے تھے یہ دریا پہلے
دیکھتے رہتے ہیں اب منہ سب کا — بات کرنے کا تھا چسکا پہلے

○

ہم تک آئے نہ آئے موسم گل — کچھ پرندے تو چہچہانے لگے
کارواں کے غبار کو دیکھا — دیر تک رہگزار کو دیکھا
زلف و رخ کے طلسم سے نکلے — حسن لیل و نہار کو دیکھا

کس لئے پہ اپنا نام لے تھا ۔ گردش روزگار کو دیکھا

○

صبح کا بھید ملا کیا ہم کو ۔ لگ گیا رات کا دھڑکا ہم کو
شوق نظارہ کا پردہ اٹھا ۔ نظر آنے لگی دنیا ہم کو
کشتیاں ڈوب گئیں ہیں ساری ۔ اب لئے پھرتا ہے دریا ہم کو
بھیڑ میں کھو گئے آخر ہم بھی ۔ نہ ملا جب کوئی رستہ ہم کو
گھر کو یوں دیکھ رہے ہیں جیسے ۔ آج ہی گھر نظر آیا ہم کو
لے گیا ساتھ اڑا کر باقی ۔ ایک سوکھا ہوا پتہ ہم کو

اگر یوں باقی صدیقی کے زندہ رہنے والے اشعار آپ کو سناتا چلا جاؤں تو یہ سلسلہ شاید صبح تک ختم نہ ہو۔ باقی نے اتنے اچھے اشعار کہے ہیں اور اتنی زیادہ تعداد میں کہے ہیں۔ مجموعی طور پر اس کی غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں مگر ان غزلوں میں اچھے اشعار کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے مشہور شعراء کی کلیات میں اس سے چوتھائی بھی قابل ذکر اشعار نہیں ملتے۔ میری عادت ہے کہ دوران مطالعہ جو اچھا شعر نظر پڑے میں اس پر نشان لگا دیتا ہوں ۔ میرے کتب خانے میں باقی مرحوم کے سب ہم عصر شعراء کا کلام موجود ہے اچھے شعروں کی جتنی تعداد باقی کے ہاں ہے' اور کسی کے ہاں نہیں البتہ سید عبد الحمید عدم ایک اور شاعر ہے جس نے بڑی تعداد میں اچھے اشعار کہے ہیں مگر اس نے کہا بہت زیادہ ہے اور اس کے اچھے اشعار کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ باقی کی تو ہر غزل موتیوں کی طرح دمک رہی ہے۔ یہاں عدم کا ذکر آیا تو برسبیل تذکرہ یہ بھی بتاتا چلوں کہ علامہ نیاز فتح پوری اپنے پرچے نگار میں کسی پنجابی شاعر کو کم ہی چھاپتے تھے۔ باقی صدیقی اور عدم ہی دو ایسے پنجاب کے رہنے والے شاعر تھے جو باقاعدہ ان کے پرچے کی زینت بنتے تھے۔ دونوں کا انداز اپنا اپنا ہے' دونوں میں یہی بات مشترک ہے کہ دونوں اپنی اپنی طرز اور اپنے اپنے رنگ کے خود موجد تھے البتہ دونوں میں سادگی بیان اور بات کو گھمائے پھرائے بغیر براہ راست کہنے کا رجحان بدرجہ اتم موجود ہے۔

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں باقی اپنی آواز اور اپنے انداز سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ بات کہنے کا اس کا اپنا ایک سلیقہ ہے۔ اس نے محض مشق سخن کے لئے شعر نہیں کہے۔ محض اس لئے شعر نہیں کہتا چلا گیا کہ ہر سال اس کا ایک نیا مجموعہ مارکیٹ میں آجائے چاہے وہ رطب ویابس ہی کیوں نہ ہو۔ یا اس کی ایک ضخیم کلیات چھپ جائے۔ شعر گوئی اس کیلئے خود کلامی کی ایک صورت تھی۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے اپنے آپ سے باتیں کرنے کا چسکا تھا۔ وہ صبح جب سائیکل پر گاؤں سے شہر آنے کے لئے نکلتا تو راستے میں اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لئے تخلیق شعر کا کٹھن راستہ اختیار کرتا' یہ عمل واپسی پر بھی جاری رہتا۔ اس کی اکثر غزلیں اسی سفر کی تنہائی اور روانی میں ہوئیں۔ شاعروں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی فلاں فلاں غزل ایک موڈ کی ہے ایک رنگ میں کہی گئی ہے' میں باقی صدیقی کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی ساری غزلیں بلکہ اس کی غزل کی ساری شاعری ایک ہی موڈ کی' شاعری ہے۔ یہ موڈ اس کی طبیعت کا موڈ تھا۔ ہر غزل میں وہ بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ جیسے عام زندگی میں ہر شخص اپنی آواز سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح باقی اپنی ہر غزل میں باقی ہے۔

ہر شاعر اپنے گردو پیش کے حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے مگر باقی کے ہاں ماحول کی تلخی اور

حالات کی سنگینی کی عکاسی زیادہ ہے۔ پاکستان کی قومی زندگی کا اگر مطالعہ اس کی غزل میں واضح طور پر نظر [illegible] ہے۔ خود مشرقی پاکستان تو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا مگر شروع سے ہی اس کی شاعری میں ہماری سیاسی زندگی کی تلخیوں کا زہر گھلا ہوا ہے مگر پوری شدت لئے ہوئے۔ ورنہ تو یہ ناقابل برداشت ہوتا۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد اس مشاعرے میں جس کی صدارت ابوالاثر حفیظ جالندھری کر رہے تھے' باقی نے یہ شعر پڑھا اور حفیظ کے اصرار پر اسے بار بار دہرایا ۔

آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میر کارواں ٹھہرے

اس وقت انگریز کی غلامی سے تازہ تازہ گلو خلاصی ملی تھی۔ حکومت پر تنقید کرنے کا رجحان عام نہ تھا۔ باقی کی انہی دنوں کی ایک غزل ہے ۔

ہم ذرے ہیں' خاک رہگذر کے
دیکھو ہمیں بام سے اتر کے

چپ ہوگئے یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پر کے

وعدہ نہ دلاؤ یاد ان کا
نادم ہیں ہم اعتبار کرکے

اے باد سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

فوزیہ چودھری

کمانڈانٹ جنرل آف ہیومر ـــــ شفیق الرحمٰن

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دن کے وقت جب سب لوگ جاگ کر محنت کرتے ہیں تو فقط دگنی ترقی نصیب ہوتی ہے ـــــ ادھر رات کو سوتے اور خراٹے لیتے ہوئے وہ چوگنی کیونکر ہو جاتی ہے۔"

یہاں یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کا کمرہ چار دیواروں' ایک فرش' ایک کرسی' چھت اور دو دروازوں' میز' دو کھڑکیوں اور ایک بلی سے مزین تھا۔"

"ان کا اونگھتا ہوا ملازم ہمارے لئے دو چھٹانک کی ہلکی ماڈرن کرسیاں لایا' جن پر ہم بیٹھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ وہ چبھتی تھیں' میز پر بیٹھنا زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے بعد وہ کھڑکیاں دروازے بند کرکے دیر تک ان چیزوں کو جلانے کے لئے ہوا دیتا رہا تھا۔ جنہیں وہ کوئلے سمجھ رہا تھا۔ اس کے پنکھے کی متواتر گردش سے کمرے کا ٹمپریچر نقطہ انجماد تک پہنچ گیا ہوگا ـــــ اس کا ثبوت وہ چھینکیں تھیں جو ہم سب کو دبا دب آرہی تھیں۔"

"بڑے نازک مزاج ہیں۔ ایک دعوت میں سری پائے نوش کئے تو ذرا دیر بعد سر میں درد ہوگیا اور پاؤں میں موچ آگئی۔"

"آپ کو خان صاحب کے استعفیٰ نہ دینے کی اصل وجہ معلوم ہے' وہ یہ کہ خان صاحب کہیں ملازم ہی نہیں تھے۔"

یہ ہنستی مسکراتی' شوخ و شنگ اور خوبصورت ظریف تحریریں عہد حاضر کے ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمٰن کے قلم کی مرہون منت ہیں۔ بلا شبہ شفیق الرحمٰن بلا شرکت غیرے گزشتہ چار پانچ دہائیوں سے طنز و مزاح کی ادبی مملکت کے تخت و تاج پر براجمان ہیں اور اردو کے مزاحیہ ادب میں کئی قیمتی کتابوں کا اضافہ کر چکے ہیں۔ ان کی ظرافت میں ان کا مخصوص مزاح' ان کا تہذیبی پس منظر اور رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی تحریروں کا یہی مخصوص آہنگ ان کی الگ پہچان کا ضامن ہے۔

گذشتہ کچھ عرصے سے تو یوں محسوس ہورہا ہے جیسے طنز و مزاح اردو ادب سے ختم نہیں تو کم ضرور ہوتا جارہا ہے۔ اگر مزاح کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو گنتی کے چند نام ہی سامنے آتے ہیں۔ مگر ان میں بھی مزاح نگاری کے باقاعدہ آثار نظر نہیں آتے اسی لئے مزاح نگاری کے اس بنجر دور میں جہاں گنتی کے چند نام موجود ہیں وہاں شفیق الرحمٰن کا نام اور کام ایک شاداب جزیرے کی مانند لگتا ہے۔ جہاں ہر طرف شادابی ہی شادابی ہے ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے۔ مزاح کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ ہنسی کے چشمے پھوٹتے ہیں' ہریالی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ شادابی روح کو سیراب کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں کا موسم ہمیشہ ہی سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ خوشبو اور ٹھنڈک انسانوں کو لطف مہیا کرتی ہے جہاں دور دور تک طنز کی باد سموم کا کہیں بھی گذر

نہیں ہوتا۔

اردو کے مزاحیہ ادب میں شفیق الرحمٰن کی مثال ایک ایسے خود رو پھول کی سی ہے جو اپنی خوبصورتی، نفاست اور خوشبو کے سبب دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا ہے۔ گویا شفیق الرحمٰن کو پڑھتے ہوئے ایک ایسی آہستہ خرام ندی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو نرم روی کے ساتھ ایک مخصوص آہنگ سے بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے بہاؤ میں ایسی روانی اور بے ساختگی ہے کہ اس کے ساتھ بہتے ہوئے ایک گونا تازگی اور لطف کا احساس رگ و پے میں اتر جاتا ہے۔ دراصل شفیق الرحمٰن کا انداز سادگی، شوخی اور پر کاری سے بھرپور ہے یہی سادگی اور پر کاری ان کے مزاح کی جان ہے۔ وہ کہیں بھی اپنی تحریر کو بھاری بھرکم تراکیب، مسجع مقفیٰ نثر سے مملو نہیں ہونے دیتے۔ درحقیقت مزاح کے لئے ایسی عبارت آرائی سم قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ عبارت کی آرائش و پیراستگی ایک سنجیدہ عمل ہے۔ اور ایسی سنجیدگی ہلکے پھلکے مزاح کو قتل کر ڈالتی ہے۔ ان کے ہاں برائے نام طنز بھی ہے۔ مگر زیادہ تر خالص مزاح ہی پایا جاتا ہے۔ ان کے انداز تحریر میں ایک طبعی ظرافت اور شوخی پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں مسکراہٹ قہقہوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی اچھا مزاح زندگی کی نا ہمواریوں ہی سے جنم لیتا ہے اور ایسے مزاح کی تخلیق میں مزاح نگار کی اپنی شخصیت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لہٰذا شفیق الرحمٰن کا مزاح ان کی اپنی فطرت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مزاح کا مواد حاصل کرنے کیلئے زندگی پر ہی ٹیڑھی ترچھی نظر نہیں ڈالتا بلکہ زندگی میں پیدا ہونے والی ناہمواریوں کو مد نظر رکھتا ہے۔ اور انھیں اپنے مزاح کا نشانہ بناتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں ہی ہمیں ایسی بنیاد فراہم کر دیتا ہے کہ ہم اپنی برائیوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ تکیہ کلام کا مذاق اڑاتے اڑاتے وہ ہمیں ایسے گر بھی بتا دیتا ہے۔ جس سے کسی کی یہ بری عادت چھڑائی جا سکتی ہے۔ اپنے مضمون "تکیہ کلام" میں مختلف افراد کے مزے مزے کے تکیہ کلام درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ہمیں صرف وہ تکیۂ کلام ناگوار معلوم ہوتا ہے جو کانوں کو ناگوار معلوم ہو مثلاً" کئی حضرات کا تکیہ کلام 'کمبخت' یا 'گدھا' یا 'الو' ہوتا ہے۔ بعض حضرات تو اس سے تجاوز کرکے گالیوں تک جا پہنچتے ہیں۔ ایسے حضرات کا علاج ہم بتائیں فرض کیجئے کہ ان کا تکیہ کلام ہے 'کمبخت' وہ آپ سے باتیں کر رہے ہیں فرماتے ہیں--- یہ کمبخت نوکر کہاں جا مرا۔ دن بدن بگڑتا جا رہا ہے کمبخت۔ اور یہ گھر والے کمبخت بھی ایسے کمبخت ہیں کہ نوکروں کو بالکل ڈھیل دے رکھی ہے جو چاہیں کریں۔ کیا بجا ہوگا اس وقت' یہ کمبخت گھڑی بھی بند ہے۔" آپ جواب دیجئے "مجھے افسوس ہے کہ کمبخت میری گھڑی ایک بد بخت گھڑی ساز کے ہاں عرصے سے پڑی ہے لیکن میں نے ابھی ابھی ایک کمبخت گھڑیال کی کمبخت آواز سنی تھی' شاید ڈاکخانے کا بدبخت گھڑیال تھا۔ کمبخت چار بجے تھے"--- اس کے بعد غالباً" وہ محتاط ہو جائیں گے اور اگر آپ نے کئی مرتبہ اسی طرح ان کا تعاقب کیا تو شاید ان کا تکیہ کلام بدل جائے۔" (پرواز)

شفیق الرحمان کا اگر ہم عصری مزاحیہ ادب کے تناظر میں جائزہ لیں تو بڑی حد تک اپنی طرز کے اس منفرد مزاح نگار کا اردو کی مزاحیہ روایت میں مقام و مرتبہ مقرر کیا جا سکتا ہے--- شفیق الرحمٰن کی تحریریں زبان اور رویے کے اعتبار سے رومانوی اسلوب کی نمائندہ ہیں۔ اور اپنے اندر دلچسپی کا عنصر رکھتی ہیں--- یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قارئین میں بے حد مقبولیت حاصل کی اور ایک خاص وقت تک شفیق الرحمٰن کی

کتابیں ہر صاحب ذوق کے بک شیلف کی زینت بنی رہی ہیں۔ کیونکہ ان میں ایک فطری تازگی اور اصلیت کی شگفتگی موجود ہے۔ جو کہ زندہ ادب کی دلیل ہے۔ یہ رومانوی طرز تحریر ان کی بیشتر تحریروں میں نمایاں ہے اور جا بجا ہمیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمٰن کی تحریریں اپنے عہد کی مروجہ افسانہ نگاری کے مزاج قریب تر ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میرزا ادیب' کرشن چندر وغیرہ کی افسانہ نگاری کا مزاج بڑی حد تک شفیق الرحمٰن کے اسلوب سے مماثل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شفیق الرحمٰن سے متاثر ہوں یا شفیق الرحمٰن نے بالواسطہ طور پر ان کا اثر قبول کیا ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اگر شفیق الرحمٰن کے کردار مضحک کیفیت پیدا کرنے کا سبب نہ ہوں اور وہ صورت حال کی مضحکہ خیزی کو قدرے مبالغہ کا شکار بنانے پر آمادہ نہ ہوں۔ تو ان کے اسلوب اور ان کے ہم عصر مذکورہ افسانہ نگاروں کے اسلوب میں شاید ذرہ برابر بھی فرق نہ ہوتا۔

صورت حال کی اس مضحکہ خیزی' مبالغے کا استعمال اور ان کی فطری شگفتہ مزاجی نے انہیں ہم عصر مذکورہ بالا افسانہ نگاروں سے نہ صرف ممتاز بنایا ہے بلکہ منفرد بھی۔ شفیق الرحمٰن کے مضامین یا کہانیاں بڑی حد تک خود نوشت کا سا تاثر لئے ہوئے ہیں۔ اور ان کے مطالعے سے یہ تاثر ملتا ہے۔ کہ وہ شفیق الرحمٰن کی ان مسرتوں کا اظہار ہیں۔ جن کی تکمیل شاید ان کی حقیقی زندگی میں ممکن نہ ہو سکی۔ نا آسودگی کا رنگ ان کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے کردار محبت کے متلاشی ہیں مگر اپنی کیفیت کو محبوب پر ظاہر کرنے میں اس سے روایتی جھجک کا شکار رہتے ہیں جو مشرقی معاشرے کا خاصہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیں۔

——— "نہایت دلفریب چاندنی رات تھی' پورا چاند درختوں کے جھنڈ سے طلوع ہوا تھا ہوا کے خنک جھونکوں سے پودے جھوم رہے تھے۔ میں فوارے کے پاس بیٹھا تھا۔ خیالات کے سلسلے کو جہاں کہیں سے بھی شروع کرتا تھا۔ ختم رضیہ پر ہوتا تھا۔ یکایک جو دیکھتا ہوں' تو رضیہ پلاٹ میں بیٹھی چاند کو تک رہی تھی۔ ان دنوں اکثر میں اسے تنہا گوشوں میں خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ آخر کس کے متعلق سوچا کرتی ہے یہ؟ میں بے چین ہوگیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور پہنچا سیدھا شیطان کے کمرے میں۔"

ایک اور جگہ رقص کی کیفیت بھی اسی ملتے جلتے انداز میں بیان کرتے ہیں۔— "چھنا نانن——— چھن ——— چھن اس کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی' ایک اچٹتی نگاہ ڈالتی ہوئی وہ اتنے قریب سے گذری کہ میرے بال اور بھی پریشان کر گئی گویے نے پھر استاد فیاض خاں کی طرح انترہ اٹھایا۔ فلاویا نے دونوں بازو پھیلائے میرے چہرے کو ہالہ بنا کر انگلیاں یوں نچائیں جیسے بلائیں یوں لیتے ہیں۔ بالکل یہی میں نے کیا۔ میں آگے بڑھا لیکن وہ تڑپ کر بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی———" (برساتی)

ہوتے ہوتے رہ جانا اور کچھ پاتے پاتے محرومی کا یہ احساس ہمیں شفیق الرحمٰن کی اکثر کہانیوں میں ملتا ہے۔ اور یہ ان نا آسودگیوں اور حسرتوں کا کھلا اظہار ہے جس کا سامنا مصنف کو یقیناً" اپنی زندگی میں کرنا پڑا ہوگا۔ شفیق الرحمٰن کی تحریروں کا ماحول اگرچہ بڑی حد تک مغربی ہے۔ مگر ان کے کرداروں کی نفسیات خالصتاً" مشرقی ہے۔

شفیق الرحمٰن کے ہاں مزاح اظہار کی مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ کہیں ان کے کردار اپنی حماقتوں' شرارتوں اور مضحکہ خیزیوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں تو کہیں مصنف خود واقعات کا ایسا تار و پود تیار کرتا ہے کہ مزاح انگور کے رستے ہوئے شیرے کی طرح ان واقعات سے ٹپکنے لگتا ہے۔ ان کی تحریروں میں

ہمیں دلچسپ لطیفوں کا استعمال تحریر کی خوبی کو بڑھاتا ہے [illegible] مبالغہ اور [illegible] بات پھر تحریر میں [illegible] رنگ بھرتا ہے اور تشبیہ، تجنیس، مترادفات، شوخ و شنگ اور شگفتہ اسلوب کی مثال یہ تحریریں [illegible] نمونہ ملتی ہیں۔

شفیق الرحمن کے مزاج میں جس چیز نے سب سے زیادہ رنگ آمیزی کی ہے وہ لطیفوں کا خوبصورت استعمال ہے۔ اگرچہ مشرقی اور مغربی ادب کے مطالعے سے ظرافت کی جملہ صورتوں پر شفیق الرحمن کی گہری نظر ہے۔ لیکن اپنی طبعی مناسبت کے باعث لطیفہ نگاری ان کا خاص میدان ٹھہری۔ اور اس میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا کمال بھی دکھایا ہے۔ بعض اوقات تو دوران مطالعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شفیق الرحمن کا حافظہ رنگا رنگ لطائف و واقعات کا نگار خانہ ہے۔ جنہیں وہ وقتاً فوقتاً اپنے مضامین میں ایسی ہنرمندی سے جڑتے ہیں کہ تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا ایک خوبصورت تاثر حاصل کرتا ہے اردو میں لطائف سے مزاح پیدا کرنے کی باقاعدہ کوشش شفیق الرحمن سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ البتہ فکر تونسوی کے ہاں ہمیں یہ رنگ قدرے نظر آتا ہے۔ فکر تونسوی کا مقصد لطیفے کے استعمال سے شگفتگی پیدا کرنے کی بجائے معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کرنا اور انھیں دور کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے لطیفے کو مزاح کے حربے کے طور پر استعمال کرنے سے زیادہ اپنی ذات کی وضاحت کے طور پر برتا ہے۔ یہی کیفیت ہمیں کنہیالال کپور کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ جبکہ شفیق الرحمن کے یہاں لطائف کے استعمال کا مقصد صورتحال کی مجموعی فضا کو پر لطف اور شگفتہ بنانا ہے۔ وہ لطائف کا استعمال واقعے کی شگفتگی کو مزید نکھارنے کے لئے کرتے ہیں۔ جبکہ مذکورہ بالا دونوں طنز نگاروں کے یہاں اس حربے کا استعمال واقعے کی سنجیدگی اور سنگینی کو Lime Light میں لانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ شفیق الرحمن کے بعد آنے والوں میں صرف عطاء الحق قاسمی کا نام اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے اپنے کالموں میں لطیفے کی صنف کو بڑی خوبصورتی اور کاریگری سے استعمال کیا ہے۔ عطا الحق قاسمی لطیفے کے استعمال سے نہ صرف اپنی بات کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ لطیفے کو مزاح پیدا کرنے کے کامیاب حربے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

--- ایک لندن پلٹ صاحب سے پوچھا گیا کہ صاحب آپ لندن میں کیا کام کرتے تھے؛ موصوف نے جواب دیا کہ وہ وہاں ریسرچ آفیسر تھے۔ اس پر سوال کرنے والا بہت پریشان ہوا اور بولا جناب آپ تو چٹے ان پڑھ ہیں، آپ وہاں ریسرچ سکالر کیسے ہوگئے، بولے میں دراصل آلوؤں پر ریسرچ کرتا تھا--- اس پر پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ جناب وہ کیسے؟ کیونکہ آلوؤں پر ریسرچ کرنے کے لئے ایگریکلچر میں ڈگری ہونا ضروری ہے۔ یہ سن کر ان لندن پلٹ صاحب نے جواب دیا، بات یہ ہے کہ وہاں سبزی کی ایک دوکان تھی اور میں وہاں بڑے آلو چھانٹ چھانٹ کر ایک چھابے میں اور چھوٹے آلو دوسرے چھابے میں رکھتا تھا۔"

یہاں تک لطیفہ بیان کرنے کے بعد اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اس لطیفے کے [illegible] مزید لکھتے ہیں:

--- "اور سچ پوچھیں تو ریسرچ کی یہ وہ قسم ہے جو ہمیں پسند آئی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دوست کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق بہت گہرا ہے وہ بھی کچھ اسی قسم کے ریسرچ آفیسر ہیں بلکہ ان کی زندگی کا مشن ہی یہی ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کو الگ الگ کر دیا جائے اور اس کے بعد چھوٹوں کی [illegible] وصول کی جائے

اور بڑوں کے دام علیحدہ کھرے کئے جائیں۔ ہمارے اس دوست کا نام اللہ رکھا زخمی ہے یہ ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔ وہاں انہوں نے یہی کیا کہ ایک ٹریڈ یونین بنائی اور چند ہی دنوں میں چھوٹوں اور بڑوں کو الگ الگ کر دیا چھوٹوں نے انہیں اپنا لیڈر تسلیم کیا اور بڑوں نے سودا کاری ایجنٹ کے طور پر انہیں تسلیم کر لیا اور یہ بہت اچھے ایجنٹ ثابت ہوئے کیونکہ انہوں نے بڑوں سے چھوٹوں کا سودا کیا اور یوں اپنے دام کھرے کر لئے۔" (دسویں آنگن)

شفیق الرحمن کے ہاں لطیفے کا استعمال بات کی وضاحت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صورت حال کو مجموعی طور پر خوشگوار بنانے کے لئے آتا ہے۔ اور بعض اوقات تو وہ دوران تحریر لطائف کے Patches لگاتے چلے جاتے ہیں ایک مثال دیکھیے:

---"اسی وقت ایک نہایت ہی دبلے صاحب ایک بہت زیادہ موٹے صاحب کے ساتھ داخل ہوئے۔ دونوں میں اس قدر فرق تھا کہ ایک دوسرے کو بری طرح نمایاں کر رہے تھے۔ شیطان بزرگ کے قریب سرک کر بولے۔۔ وہ دیکھئے جناب' ان میں سے ایک "استعمال سے پہلے" اور دوسرے "استعمال کے بعد" ---- وہ شاید سمجھ نہ سکے۔۔۔ شیطان بولے۔۔۔ آپ نے مقوی دواؤں کے اشتہار تو دیکھے ہوں گے۔ وہاں استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد کے فوٹو بھی ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ وہی چیز آپ یہاں دیکھ لیجئے۔۔۔" (شیطان)

شفیق الرحمن واقعات و لطائف کے اس استعمال سے دوسرے کو ہنساتے بھی ہیں اور پطرس کی طرح ہنسنے کا موڈ اور فضا بھی پیدا کر دیتے ہیں' دوسروں پر ہنسنے کا رجحان ان کے ہاں کم ملتا ہے گویا یہ رویہ اس تہذیب و شائستگی کی دلیل ہے جو ان کے شعور میں رچا بسا ہوا ہے۔ اور ان کی تحریروں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ شفیق الرحمن کی تحریروں میں اسی لئے شفا بخش تازگی اور توانائی موجود ہے۔

شفیق الرحمن کے ہاں ہمیں امریکی طرز کی ظرافت ملتی ہے یہ رنگ ان کی تحریروں کے ماحول' واقعات اور کرداروں میں نمایاں ہے۔ ماحول بڑا صاف ستھرا اور پولشڈ Polished ہے۔ اعلیٰ قسم کے مکانات سجے سجائے ڈرائنگ رومز' کھانے کی میزیں' اور خوبصورت باغیچے ہمیں مغربی انداز معاشرت کی یاد دلاتے ہیں۔ خصوصاً" اس دور کی جب برصغیر میں ایک خاص طرح کی "صاحبی" مروج تھی۔ ان کے کردار تو خالصتاً" مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا تہذیبی رکھ رکھاؤ' لباس' وضع قطع' نشست و برخاست' ہر چیز مغرب زدہ ہے۔ ان کے کرداروں کی گفتگو میں بھی مشرقی انداز کم ہوتا ہے بلکہ کانونٹ ماحول زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کے کرداروں کے پسندیدہ لوگ' ادیب' فلسفی' کھلاڑی سب مغربی ہیں۔ ان کرداروں کے پسندیدہ کھیل بھی وہی ہیں جو یا تو مغرب میں زیادہ مقبول ہیں یا اعلیٰ سوسائٹی کے پسندیدہ ہیں۔۔ مثلاً" کرکٹ' باکسنگ Swimming وغیرہ۔۔ مجموعی طور پر شفیق الرحمن کو پڑھتے ہوئے مغربی ماحول کا گمان ہوتا ہے۔ مزاح کی جو مشرقی روایت' ہمارے ہاں رائج ہے اس کے تحت مشرقی مزاح نگار دوسروں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ لیکن مزاح کی مغربی روایت میں دوسروں کی ہنسی اڑانے کا رجحان کم ہے۔ وہ صورت حال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مغربی انداز مزاح میں کرداروں کی تضحیک کا پہلو کم ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ معمولی بات ہے۔ اس کی خوبصورت مثال دیکھیں یہاں دوسروں کی ہنسی نہیں اڑائی گئی بلکہ صورت حال کی مضحکہ خیزی سے خوبصورت مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں مونچھوں کے اتار چڑھاؤ سے جہاں ایک طرف کردار کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا

کیا ہے جہاں واقعاتی مزاح کی بھی ایک خوبصورت مثال ہے۔ پرنسپل صاحب کی مونچھوں کے [illegible] ملاحظہ ہوں:

"---- ان کی دونوں نوکدار بڑھیا مونچھیں بجلی کی تیز روشنی میں ناظرین کو گھورتے ہوئے [illegible] تھیں۔ حسب معمول چھت کی جانب اشارہ کر رہی تھیں۔ جیسے کسی ٹائم پیس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہوں۔ نہ جانے انہوں نے روغن مونچھ استعمال کیا تھا یا کوئی خاص مونچھ کریم لگا کر آئے تھے۔"

"---- ان کی دونوں تنی ہوئی تاؤ شدہ مونچھیں یک لخت ڈھیلی پڑ گئیں اور اب وہ بالکل خط مستقیم سا رہی تھیں۔ جیسے گھڑی کی سوئیاں سوا نو بجے ہوتی ہیں۔--"

"---- پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعتاً اتر گیا۔ ان کی چمکدار مونچھیں نرم ہو گئیں اور یک لخت ڈھلک سی گئیں۔ جیسے گھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر بیس منٹ پر ہوتی ہیں۔--"

"----سوروانے سے جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ دونوں نوکدار مونچھیں بالکل لٹک رہی تھیں۔ پرنسپل صاحب کی بڑھیا مونچھوں میں ساڑھے چھ بج چکے تھے۔---" "---- تب سامنے رکھے ہوئے ٹائم پیس کے گرد ایک ہالہ بن جاتا ہے۔-- شام کو ساڑھے چھ بجے مجھے ایک جوڑی بڑھیا۔ نوکدار چمکیلی' تاؤ شدہ مونچھیں یاد آجاتی ہیں۔ جن پر پہلے گیارہ بج کر پانچ منٹ تھے۔ پھر سوا نو اور اسی طرح اخیر میں ساڑھے چھ بج گئے تھے۔"

(ساڑھے چھ)

شفیق الرحمٰن کے ہاں جو مغربی انداز پایا جاتا ہے۔ اردو مزاح کی روایت میں ہمیں اس کے آثار ملتے ہیں۔ ان سے پہلے پطرس بخاری اور پھر بعد میں محمد خالد اختر نے بھی یہ رنگ اپنایا ہے۔ مگر ان کے ہاں مغربی رنگ صرف اسلوب کی حد تک ہے یعنی وہ مزاح پیدا کرنے کے مغربی انداز سے متاثر ہیں۔ پطرس کے ہاں موضوعات میں "بجزبیل اور میں" ہر جگہ مقامی خصوصیات کا رنگ گہرا ہوا ہے اور کہیں بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ پطرس مغرب کے خوشہ چیں رہے ہیں۔ محمد خالد اختر کے ہاں بھی یہی انداز ہے کہ اگرچہ وہاں بھی مغربی رنگ براہ راست در آیا ہے۔ لیکن انہوں نے بھی یہ رنگ صرف اسی حد تک اپنایا ہے کہ ان کی تحریروں کا مشرقی ماحول متاثر نہ ہو۔ مگر شفیق الرحمٰن کے ہاں پس منظر بھی مغربی ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں بھی کہیں کہیں مقامی فضا نظر آتی ہے مگر مصنف کی تہذیبی مجبوری ہے کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں آخر وہ اس ماحول کا پروردہ ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیں جہاں مغربی رنگ موجود ہے۔

"---- کلب میں رقص تھا وہ مجھے ساتھ لے گئے۔ میرے لئے ہال کی سب سے حسین لڑکی چن کر لائے۔ جب ہم بلیو ڈینیوب پر رقص کر رہے تھے۔ تو میں کیسا اداس ہو گیا۔---- میں اتنا غمگین ہوا کہ کونے میں اکیلا جا بیٹھا۔ فرینکی مسکراتے ہوئے آئے' میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ سمجھایا تم بھول جاتے ہو کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور یہ لمحے کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔---- نہ جانے کتنی مرتبہ بلیو ڈینیوب بجے گا۔ ہر مرتبہ رقص کے لئے نیا ساتھی ملے گا۔ لیکن تمہیں ہر بار مسکراتے ہوئے رقص کرنا ہوگا۔ اپنے ساتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ یہ تمہارا فرض ہے ورنہ زندگی تم سے بیزار ہو کر تمہیں پیچھے چھوڑ جائے گی۔ جاؤ اس لڑکی سے پھر رقص کیلئے کہو"----

(بے بی)

ایک اور مثال دیکھیں جہاں نشست و برخاست کے علاوہ لباس سے بھی مغربی رنگ [illegible] ہے۔

"---- شام کو ان کے ہاں جانا تھا۔ میں نے وہی دھاریوں والا سوٹ پہنا [illegible]۔ جس نے

بھری گردن کو جکڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے بھی اپنی کار بھیجی تھی...... مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا۔ میں بڑی حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تین ریڈیو رکھے تھے، کام کا ایک ہوگا۔ وہ شاید تھکے ہوئے ہوں چھوٹے چھوٹے کتے، بلیاں، طوطے، بت، عجیب و غریب تصویریں۔ کارنسیں، میزیں، الماریاں سب کے سب ایسی چیزوں سے لدی ہوئی تھیں...... خوشبو کی ایک زبردست لپیٹ آئی اور پرنسپل صاحب داخل ہوئے۔ ایک بہت ہی چمکیلے سوٹ میں ملبوس، بال بہت اچھے بنے ہوئے تھے۔ بلکہ استری کئے گئے تھے۔ ان کی دونوں بڑھیا مونچھیں بجلی کی تیز روشنی میں نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں"۔۔۔ (شگوفے)

شفیق الرحمٰن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے مزاح نگاری کے فطری انداز کو اپنی تحریروں میں مغرب کی ساری رعنائیوں اور لطافتوں سمیت سمو لیا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ ان کے ہاں مغربی رنگ کا پتہ خالص مزاح پیدا کرنے والے ان حربوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جن سے مغربی مزاح نگار مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان میں واقعہ، کردار، موازنہ، مبالغہ اور قول محال کے حربوں سے کم و بیش تمام ان مزاح نگاروں نے کام لیا ہے جو مغرب سے متاثر ہیں۔ کرداری اور واقعاتی مزاح کے علاوہ ان کے ہاں مبالغے سے مزاح پیدا کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک مثال دیکھیں شیطان اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے ہیں:

"۔۔۔ جی قبلہ! جو چیز اڑتی ہے وہ پرندہ ہے، ہاں سب لڑکوں کا جی للچایا کہ اسے پکڑیں مگر بارش کی وجہ سے کسی کی ہمت نہ پڑی۔ آخر میں تیار ہوا۔ لڑکوں نے منع کیا کہ بھیگ جاؤ گے میں نے ایک نہ سنی اور باہر آیا۔ کھٹکے کا ماہر تھا۔ ایک بوند آئی اسے گردن کی جنبش سے بچایا دوسری آئی اسے ایک طرف ہٹ کے بچایا۔ تیسری آئی۔ اسے کمر کی جنبش سے بچایا۔ غرضیکہ اسی طرح بل کھاتا طرح طرح کے پینترے بدلتا ہوا ایسی موسلا دھار بارش میں جگنو کو صاف پکڑ لایا اور جب واپس برآمدے میں پہنچا تو میرے لباس پر ایک بوند بھی نہ تھی"۔۔۔ (شیطان)

Paradox یا قول محال کی برجستگی بھی ان کی تحریر کی ایک خوبی ہے انہوں نے مزاح کے اس حربے کو بھی کامیابی کے ساتھ برتا ہے قول محال سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو دراصل حقیقت نہ ہو مگر حقیقت معلوم ہو۔ آسکر وائلڈ اور چسٹرٹن کے ہاں یہ رنگ موجود ہے۔

شفیق الرحمٰن کے ہاں یہ رنگ یقیناً" مغربی ادب کے گہرے مطالعے سے در آیا ہے۔ "کلید کامیابی" میں انہوں نے بچوں کی تربیت کے جو طریقے بتائے ہیں وہ درحقیقت وہی ہیں جن پر عام طور پر والدین خود ہی عمل کرتے ہیں۔ لیکن یہاں مصنف نے آخر میں یہ دلچسپ بات لکھ کر کہ "آخری بچہ کیونکہ لاڈ میں بگڑ جاتا ہے لہذا آخری بچہ ہونا ہی نہیں چاہئے۔" اپنی شگفتہ طبعی کا ثبوت دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"۔۔۔ اگر بچے بے وقوف ہیں تو پروا نہ کیجئے۔ بڑے ہو کر یا تو جینئس بنیں گے یا اپنے آپ کو جینئس سمجھنے لگیں گے۔"

"۔۔۔ بچوں کو پالتے وقت احتیاط سے کام لیجئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں ورنہ وہ بہت موٹے ہو جائیں گے اور والدین اور پبلک کے لئے خطرے کا باعث ہوں گے۔"

"۔۔۔ دیکھا گیا ہے کہ کنبے میں صرف دو تین بچے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیئے جاتے ہیں لہذا بچے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہئیں تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔ اسی طرح آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہئے۔ (تربیت اطفال)

یہ قول محال کی بڑی اچھی مثال ہے۔ یعنی ایک ناممکن بات کا مضمون ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ اس پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اور ان تمام مشوروں کے بعد مصنف جب یہ کہتا ہے کہ "اس طرح سے اگر ایک کا بھی بھلا ہو گیا تو مصنف کی ساری محنت رائیگاں جائے گی" قول محال کی ایک اور عمدہ مثال ہے اور اس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ مصنف کی اب تک کہی گئی تمام باتیں بالکل غلط اور بیہودہ محض ہیں۔

شفیق الرحمٰن کی تحریریں ایک لطیف مذاق زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کا مزاح گدگدی پیدا کرتا ہے اور قاری کو زیر لب تبسم پر مجبور کرتا ہے۔ ان کی ظرافت شوخ رنگوں کا خوبصورت امتزاج ہے اور اس بے ساختگی نے شفیق الرحمٰن کے ہاں اظہار پا کر ایسی دھنک رنگ نثر کا اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ جس کے تتبع میں بہت سوں نے زور مارا ہے مگر ایسی بے ساختہ نثر لکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شفیق الرحمٰن کی بے ساختہ نثر کی ایک خوبصورت مثال دیکھیں۔

"۔۔۔ وہاں اس نے جس دلیری سے بزدلی دکھائی اس کا کوئی جواب نہیں"۔۔۔ (دریچے)

شفیق الرحمٰن اپنے طبعی رجحان کے باعث چھوٹی سے چھوٹی اور باریک سے باریک بات میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ بظاہر نہ تو وہ خود ہنستے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو ہنسانے کی دانستہ کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ چپ چاپ احساس کو اس طرح چھیڑ دیتے ہیں کہ قاری ہنسنے اور کبھی کبھار قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

زبان کے پھسلنے سے بعض اوقات بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بے اختیار ہنسی کا سبب بنتی ہے ایسی ہی بد حواسیوں کی دو ایک مثالیں دیکھیں:

"۔۔۔ ہم پہلی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ مولانا بھی ساتھ تھے اور نیچے جھانک رہے تھے غالباً" انتظار تھا انہیں کسی کا' اتنے میں ایک تانگہ گزرا۔ مولانا چلا کر بولے "بھئی ٹھہرنا تمہارا تانگی خالہ ہے کیا؟" ۔۔۔۔ ادھر تانگے والے نے سنا ہی نہیں' مجھے بڑی ہنسی آئی' لیکن شیطان بڑی سنجیدگی سے بولے۔۔۔ "قبلہ! اگر آپ یوں فرماتے تو بہتر تھا۔۔۔ کہ تمہاری خالہ تانگی ہے کیا"۔۔۔؟

"۔۔۔ تانگے کا انتظار ہوتا رہا۔ شیطان مولانا سے بولے "۔۔۔ کیوں صاحب آپ کی بگی پر کیا گھڑا ہے؟"

"قبلہ ان سیڑھیوں کے متعلق بھی ایک پر اسرار قصہ ہے' جسے میں اس اندھیرے میں سنانا نہیں چاہتا" اور مولانا اور بھی آہستہ آہستہ اترنے لگے۔ اجی آپ تو بچے کر کے اتر رہے ہیں ذرا جلدی کیجئے۔ شیطان بولے' ویسے ہی ذرا چکنی سیڑھیاں ہیں۔۔۔ کیں۔۔۔۔ وہ بولے جی ہاں! واقعی! سیڑھیاں اترتے چڑھتے وقت ضرور خیال رکھنا چاہئے کیونکہ پرسوں ہی کا ذکر ہے کہ میں جلدی جلدی زینے سے اتر رہا تھا۔ یکلخت جو ایک پھسلی سے سیڑھیا تو دور تک سیڑھتا ہوا چلا گیا"۔۔۔ (شیطان)

ان کا مزاح الفاظ و واقعات دونوں سے تعمیر ہوتا ہے وہ نہ صرف الفاظ کے الٹ پھیر سے محاوروں کا روپ بگاڑنے سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ فقروں کی ترتیب بدل کر ان سے نیا مفہوم پیدا کرتے ہیں اور پھر واقعات کو الٹ پھیر کر بھی مزاحیہ صورت حال پیدا کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل فقرے دیکھیں:

"——بادشاہ یک لخت جز بز یا بلکہ بالکل پا ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر کانپتا رہا پھر چلا کر بولا۔ او نادان لڑکی! ایسے بزرگ پر تہمت لگاتی ہے وہ خود میرا تھرماس اور روغن موچھ اٹھا کر لے گیا۔ لیکن میں نے تہمت نہیں لگائی۔ جا دفع ہو جا اور آئندہ مجھے پیٹھ بھی مت دکھانا"۔

"——جب تک سارا شہر کھانا نہ کھا چکتا' حاتم ایک لقمہ نہ اٹھاتا' اسی لئے وہ دوپہر کا کھانا رات کو کھاتا اور رات کا کھانا اگلے دوپہر کو"۔

لطائف و ظرائف اور لفظی الٹ پھیر کے علاوہ ذو معنی الفاظ اور رعایت لفظی ان کے مزاحیہ اسلوب کی جان ہے۔ ایسی صورتحال میں اگر ادیب فنکارانہ انداز اختیار نہ کرے تو اس کی تحریریں عام طور پر' عامیانہ پن کا شکار ہو جاتی ہیں——لیکن شفیق الرحمٰن کے ہاں یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔ انگریزی ادب کے گہرے مطالعے نے ان کے ہاں جو رنگ اور فضا پیدا کر دی ہے وہ اردو کے مزاحیہ ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔ ان کے مزاح کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں مسکراہٹ ایک واضح ہنسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ان کی کتاب "ریویو" سے ایک اقتباس دیکھیں

"——ہم نے شام کو کتاب خریدی اور علی الصبح ریویو لکھ کر پریس بھیج دیا۔ ریویو کچھ ایسا مقبول ہوا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ اس ریویو کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو—— کچھ اس لئے ہمارے ریویو بے حد طویل ہوتے ہیں..... ان گنے گنائے صفحات میں زندگی کی وہ تفسیریں پیش کی گئی ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔ حسن اور عشق کی گھاتیں چوری کی ملاقاتیں—— نفرت و عداوت کے قصے دیوانی اور فوجداری کے قضیئے زمین کاشت کرنے کے لئے نئے نئے طریقے—— جانور اور پرندوں کی دلچسپ باتیں' کھانوں کی ترکیبیں—— کیا ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے"—— (ریویو)

بات سے بات پیدا کرنا اور کچھ اس سادگی اور صفائی سے کہ قاری دنگ رہ جائے کہ ایسا تو ہونا ہی ہے شفیق الرحمٰن بظاہر بہت سہل نویس مصنف معلوم ہوتے ہیں اور ان کی نثر کی بے ساختہ روانی سے ہر ایک کو یہ گمان گزرتا ہے کہ اس جیسی سادہ اور سہل نویسی بہت آسان کام ہے مگر باوجود کوشش کے تقلید میں کوئی بھی ایک فقرہ ایسا نہیں لکھ سکا۔ ان کے اسلوب میں یقیناً" کوئی نہ کوئی ایسی خاص بات موجود ہے کہ اسے ادب میں اتنا بلند مقام حاصل ہے مگر اس سادہ اور پر کار انداز میں یقیناً" اتنی پرکاری موجود ہے جو قاری کو مبہوت کرتی ہے اور پھر وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شفیق الرحمٰن کے ہاں کرداری مزاح کی بہت ہی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ انہوں نے مزاح کے میدان میں چند ایک لافانی کردار تخلیق کئے ہیں۔ جو یقیناً" مزاح نگاری کی روایت میں اہم اضافہ ہیں۔ شفیق الرحمٰن کرداری مزاح تخلیق کرنے والے اس لحاظ سے تو پہلے آدمی نہیں ہیں کہ اردو مزاحیہ ادب کی تخلیق میں ان سے پہلے سید امتیاز علی تاج نے چچا چھکن جیسے کردار کو خلق کر کے اردو مزاح نگاروں کے لئے کرداری مزاح نگاری کی روایت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مگر چچا چھکن کا کردار امتیاز علی تاج کی اپنی تخلیق نہیں تھا۔ بلکہ انگریزی سے ماخوذ تھا۔ انگریز مصنف جیروم کے جیروم کی کتاب The Men in a boat کا مزاحیہ کردار انکل پوجر' کا چربہ ہے۔ ان دنوں اردو ظرافت نگاروں نے چونکہ ظریفانہ انداز میں کردار نگاری کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لہٰذا چچا چھکن کا مقبول و معروف ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ اردو ادب میں امتیاز علی تاج اور چچا چھکن کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس کے بعد والے ظرافت نگاروں نے ظریفانہ

کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی۔

امتیاز علی تاج نے چچا چھکن کی مضحک حرکات کے بیان میں جا بجا [illegible] سے کام لے کر ان کو مخصوص ماحول اور اقدار کے پس منظر میں رکھ کر مشرقی رنگ اور صورت دینے کی کوشش کی تھی مگر چچا چھکن [illegible] خالصتاً" گھریلو ماحول میں رکھے ہونے کے باعث ہندوستان کے وسیع طبقے میں مقبولیت نہ پا سکا اور [illegible] کردار کے ساتھ "چچا" کے الفاظ نے بھی اسے نامقبول بنانے میں کسی نہ کسی طور حصہ لیا۔ جبکہ شفیق الرحمن کے کردار نہ صرف نوعمر ہیں بلکہ ان کی اپنی افتاد طبع کا نتیجہ ہیں۔ وہ چچا کے کردار کی طرح غیر دلچسپ اور ماخوذ نہ تھے۔ شفیق الرحمن کے کردار نوجوان ہونے کے باعث مذکورہ عمر کے نوجوانوں کے رومانوی رویوں کے بھی بھرپور عکاس تھے۔ اس لئے انہیں نوجوانوں کی اکثریت نے پسند کیا اور اسی سبب سے شفیق الرحمن کو گریجویٹ مزاح نگار بھی کہا جاتا ہے۔۔۔ تاہم شفیق الرحمن کو اپنے پیش رو مزاح نگاروں پر یہ فوقیت ضرور حاصل ہے کہ انہوں نے مزاح کو ایک طبقے کی مسرت کا ذریعہ بنائے رکھنے کی بجائے عوامی سطح پر لا کھڑا کیا اگرچہ ان کے کردار ماحول اور تمدنی روایت کے حوالے سے طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی کہانیوں میں پیش کئے جانے والا ماحول نسبتاً" مراعات یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ مگر اس بات نے بھی شفیق الرحمن کی مقبولیت کو جلا ہی بخشی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شفیق الرحمن کے قارئین (جو عموماً" نوجوان ہی ہوا کرتے ہیں) ان کی کہانیوں میں پیش کئے گئے ماحول میں ان خواہشات کا عکس دیکھتے ہیں جن کو وہ مستقبل قریب میں پورا کرنا چاہتے ہیں۔ یا وہ ان کے خوابوں کا حصہ ہیں۔ ان کا پیش کردہ ماحول بڑی حد تک خوابناک اور طلسمی کشش کا حامل ہے۔

اس ضمن میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ شفیق الرحمن نے اپنی مزاح نگاری کے پس منظر کے طور پر جس ماحول کو خلق کیا ہے اس کی روایت کے ڈانڈے ماضی بعید کی ادبی روایت یعنی داستانوں سے ملتے ہیں۔ اور جس طرح ہم داستانوں کے کردار سے ایک اپنائیت محسوس کرتے ہیں اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں اپنی خواہشات کا عکس دیکھتے ہیں اور ان کے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں اور ان کی مسرت سے کھل اٹھتے ہیں اسی طرح شفیق الرحمن بھی اپنے طلسماتی ماحول میں ہمارے لئے ویسی ہی کیفیت پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ مگر داستانوی کرداروں کی طرح ان کی کہانیوں یا تحریروں کا ماحول بھی ہماری دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ انہوں نے بہر طور مزاح نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مقدور بھر حصہ لیا ہے اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ بنیاد ضرور فراہم کی جس پر مشتاق احمد یوسفی اور ان کے بعد کے لکھنے والوں نے اپنی نگارشات کے خوبصورت محل تعمیر کئے شفیق الرحمن کے مزاحیہ کردار واقعاتی مزاح پیدا کرنے اور مضحک کیفیت کو جنم دینے کے سبب سے شگفتگی پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں جہاں انہوں نے کرداروں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی وہاں وہ اپنے پیش کردہ کرداروں کی ناہمواریاں دکھانے کی بجائے ان کی شرارتوں پر ہی اکتفا کر بیٹھتے ہیں ان کا کردار شیطان ان کے مزاحیہ کرداروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاحیہ کردار مرزا کی طرح وہ بھی حماقتیں کرتا ہے اور اپنی شرارتوں سے قارئین کو ہنساتا ہے۔ عینک کے بغیر اسے قریب کھڑے ہوئے لوگ بھی نظر نہیں آتے [illegible] اور عورت اس کی دو بڑی کمزوریاں ہیں اور وہ ان کے ساتھ اور ان کے [illegible] کرتا ہے لیکن [illegible] سے بہر حال مختلف ہے کہ یہ اپنے لباس، نشست و برخاست اور [illegible] اور محض اپنی

دلچسپ حرکتوں اور شرارتوں سے دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کرتا ہے۔

محمد خالد اختر کے تخلیق کردہ کردار شفیق الرحمن کے پیش کردہ کرداروں سے بہت حد تک مختلف ہیں کیونکہ خالد اختر کے کردار خالصتاً مقامی رنگ لئے ہوئے ہیں اور زیادہ تر کسی نہ کسی خامی کا شکار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا لباس خستہ حال ہوتا ہے وہ ایسی وضع قطع کے حامل ہوتے ہیں کہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور بعض اوقات ان کی حالت پر رحم بھی آتا ہے۔ مگر شفیق الرحمن کے ہاں کردار کسی طرح بھی نا معقول نظر نہیں آتے بلکہ معقول اور قطعی نارمل ہیں کیونکہ نہ تو یہ اپنی وضع قطع سے غیر شائستہ معلوم ہوتے ہیں اور نہ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے ۔۔۔ بلکہ بظاہر دیکھنے میں بہت شائستہ معلوم ہوتے ہیں بلکہ جب سب آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو باہمی گفتگو اور اپنی حرکات سے مجموعی صورت حال کو آہستہ آہستہ مضحک بنا دیتے ہیں اور ایسی پر لطف صورت حال پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے کردار کم از کم دیکھنے سے تو مضحک کردار نہیں لگتے جبکہ خالد اختر کے کردار تو دیکھنے سے ہی مضحک معلوم ہوتے ہیں۔

شفیق الرحمن کے برعکس محمد خالد اختر کے ہاں ماحول اور پس منظر مغربی نہیں ہے بلکہ مقامی رنگ لئے ہوئے ہے مثلاً ان کے ناول "چاکیواڑہ میں وصال" کا پس منظرخالصتاً مشرقی ہے اور یہاں کی غربت' تنگ دستی اور مسرت کی فضا کا آئینہ دار ہے ان کے کردار اور معاشرت شفیق کی خلق کردہ مصفا معاشرت سے قطعی مختلف ہے۔ مثال کے طور پر خالد اختر کے ہاں پائے جانے والے کردار نچلے طبقے کے لوگ ہیں۔۔۔ بندر والے ہیں جن کے لباس نہ صرف میلے کچیلے اور گندے ہیں بلکہ خستہ حال بھی ہیں۔۔۔ یہ کردار تنگدستی کا شکار ہیں۔۔۔ یہ تنگدستی نہ صرف ان کے پھٹے پرانے کپڑوں اور نحیف و نزار جسموں سے ظاہر ہے بلکہ ان گھروں اور گلی محلوں' سے بھی ظاہر ہے جہاں وہ زندگی گذار رہے ہیں۔ جگہ جگہ گندگی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ بد روئیں بہہ رہی ہیں۔۔۔ گویا ان کے ہاں وہی گلی' محلے اور بازار ملتے ہیں جن میں ہم اور آپ رہ بس رہے ہیں حکومت آپا اور شیطان' شفیق الرحمن کا اپنا کردار اور مقصود گھوڑا سب ایک ہی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں: مثال کے طور پر روفی عرف شیطان کے کردار کی ایک ہلکی سے جھلک دیکھیں شفیق الرحمن اس دلچسپ اور شریر کردار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

۔۔۔ "رات اتفاق سے میں نے شیطان کو خواب میں دیکھ لیا...... چھوٹے چھوٹے نوک دار کان' ذرا ذرا سے سینگ' دبلا پتلا۔ بانس جیسا لمبا قد' ایک لمبی دم جس کی نوک تیر کی طرح تیز تھی۔ دم کا سرا شیطان کے ہاتھ میں تھا۔ میں ڈرتا ہی رہا کہ کہیں یہ چھوڑ نہ دے۔ نرالی بات یہ تھی کہ شیطان نے عینک لگا رکھی تھی۔ رات بھر ہم دونوں نہ جانے کس کس موضوع پر بحث کرتے رہے۔۔۔۔۔ اب صبح چائے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ روفی کی شکل بالکل شیطان سے ملتی تھی۔ شکل کیا حرکتیں بھی وہی تھیں۔ ویسا ہی قد [illegible] گردن [illegible] عینک وہی مکاری کی مسکراہٹ [illegible]
چکے سے رجسٹر کے [illegible] شیطان سے ملتے [illegible]
حجامت ذرا باریک کرالی [illegible]
توس کھانا شروع کیا۔۔۔۔ [illegible]
دیا کہ [illegible]

حکومت آپا نے چونک کر ہماری جانب دیکھا۔ ان کو پتہ چلا تھا کہ سارے کئے کرائے پر ... معلوم ہو گیا کہ [illegible]
شیطان کہلائے جائیں گے ۔۔۔۔۔۔ سے پھر کو چاہ پر رضیہ نے جان بوجھ کر لاحول پڑھ دی۔ [illegible]
حفظ کرنے سے نکل گئے حالانکہ ابھی چاہ شروع بھی نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا میں نے سب [illegible]
سنی لاحول سے بھاگتے ہیں اور ان کا حلیہ بھی شیطان سے ملتا ہے بس تب سے آج سے وہ مکمل شیطان ہیں [illegible]
(شگوفے)

شوقی کے کردار کے علاوہ شفیق الرحمٰن کا اپنا کردار اور حکومت آپا کا کردار بھی ایسے ہی ماحول کا پروردہ ہے۔ حکومت آپا کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

۔۔۔۔۔۔"میں جج صاحب کے ہاں رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ جہاں کنبے کے تمام افراد مجھے اچھے لگتے تھے وہاں ایک ہستی تو بہت ہی عزیز تھی۔۔۔۔ وہ تھی رضیہ! اور جن سے میں ڈرتا تھا وہ تھیں رضیہ کی بڑی بہن' جن کا اصلی نام تو اچھا بھلا سا تھا لیکن سب بچے انہیں حکومت آپا کہتے تھے۔ میری ہی عمر کی ہوں گی۔ یا شاید کچھ بڑی ہوں۔۔۔۔۔ انہیں میں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔۔۔۔۔۔ سارا دن لڑتی جھگڑتیں اور دوسروں پر خواہ مخواہ تنقید کرتی رہتیں۔ کسی بات کا شہر میں ڈھنڈورا پٹوانا ہو تو جاکر حکومت آپا کو بتا دو' فوراً" ہر ایک کو پتہ چل جائے گا۔۔۔ میں بالکل سمجھ نہ سکا کہ ان کی پالیسی کیا ہے؟۔۔۔۔۔ جب دیکھو تنقید کررہی ہیں۔ پہلے پہل تو میں اداس ہو جایا کرتا۔ بعد میں میں عادی ہوگیا اور تنقید کیسی ہوتی۔۔۔۔۔ شوقین لڑکا ہے۔ رنگین مزاج ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پہنتا ہے۔ خوشبو کیوں لگاتا ہے؟ اس کا سینہ کافی چوڑا ہے لیکن چہرہ کچھ دبلا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں (نہ کیجئے اعتبار کسی مسخرے نے التجا کی ہے آپ سے) ہر وقت بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولتا رہتا ہے (مضبوط پٹھے ہیں کیوں نہ ٹٹولیں) بیزاری کو بزاری کہتا ہے (یہ آپ کے کانوں کا قصور ہے) ہر وقت اکڑ کر چلتا ہے (تو کیا کبڑا ہو کر چلوں؟) رضیہ کے متعلق سوچتا رہتا ہے' اسے گھورتا رہتا ہے اور اسی کی باتیں کرتا ہے (رضیہ اچھی جو لگتی ہے)۔۔۔ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا (مجھے بھی آپ ذرا اچھی نہیں لگتیں)"۔۔۔۔

(شگوفے)

اس دلچسپ تعارف کے بعد نہ صرف حکومت آپا بلکہ خود شفیق الرحمٰن کا اپنا کردار بھی سامنے آگیا ہے۔ بہر حال شفیق الرحمٰن نے اپنے مخصوص اور شگفتہ اسلوب سے ان کرداروں میں زندگی کی حرارت ضرور پیدا کر دی ہے۔۔۔ اور اردو ادب میں ان کا ایک مخصوص مقام ہے۔

شفیق الرحمٰن پر ترقی پسندوں نے ایک برژوا مصنف ہونے کا الزام بھی لگایا ہے اور وہ دعوے کے طور پر کہتے ہیں کہ شفیق الرحمٰن اپنی کہانیوں میں خود کو گلیمرائز Glamourize کرتا ہے وہ ڈانس ہالوں اور "فاکس ٹراٹ" کی "کلاؤڈ گکو لینڈ" سے باہر نکلنے سے گریزاں ہے

اس قسم کے الزامات انتہا پسندی کے مترادف ہیں اور ان میں ہمدردی کی کمی پائی جاتی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے ہاں اگرچہ گلیمر اور قدرے مراعات یافتہ طبقے کی نمائندگی ضرور ملتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان کے ہاں یہ رنگ دانستہ نہیں آیا۔۔۔ بلکہ یہ مصنف کی تہذیبی مجبوری تھی۔ شفیق الرحمٰن کی سب سے خوبصورت ادا ہی یہی ہے کہ وہ ادب میں موجود کسی قسم کی دھڑے بندی سے بالکل بے نیاز ہیں اور ان کا تخلیق کردہ ادب موجودہ ادبی تحریکوں میں سے کسی کے کھاتے میں بھی نہیں ڈالا جا سکتا۔۔۔

شفیق الرحمٰن کے ہاں رومانویت کے گہرے اور انمٹ نقوش بھی ملتے ہیں۔۔۔۔ یہ رومانوی رنگ

مزاحیہ اسلوب سے ہم آہنگ ہوکر شفیق کی تحریروں کو ایسی خوبصورتی عطا کرتا ہے جو مصنف کی انفرادیت کا ضامن ہے۔۔۔ پھولوں' تتلیوں اور پریوں کا بچپن کے حوالے سے ذکر کر کے شفیق الرحمٰن اپنی تحریروں میں سحر انگیز رومانوی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس پر مستزاد شفیق الرحمٰن کا شگفتگی اور تازگی لئے ہوئے اسلوب پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتا ہے۔

شفیق الرحمٰن کی کہانیوں میں رومانیت اور حسن کی حس "الحمرا" کی دین ہے۔ اپنے لڑکپن میں شفیق الرحمٰن "الحمرا کی کہانیوں" سے بے حد متاثر تھے ان کی تحریروں کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ عظیم مزاح نگار ابھی تک لڑکپن کی اس رومانوی اور پر اسرار فضا سے (خوش قسمتی سے) باہر نہیں آسکا جس نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

محمد خالد اختر شفیق الرحمٰن کے "خاکے" میں لڑکپن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ شفیق کو جو کتاب سب سے اچھی لگی وہ "غلام عباس" کی (الحمراء کی کہانیاں) تھی ان کہانیوں کے اسرار' جادو اور رومان نے اسے بالکل مسحور کر لیا...... شفیق اکثر کہتا ہے کہ وہ جو کچھ ہے انہیں کتابوں کی بدولت ہے انہوں نے ہمیں اصل ادب کے حسن اور لطافت سے روشناس کیا اور ہمارے تخیل کو جلا دی۔ ہم دونوں میں سے ایک بھی ان کتابوں کے سحر سے نہیں نکل سکا....." (نقوش۔۔۔ شخصیات نمبر)

"مدوجزر" اور "پچھتاوے" کی کہانیاں خاص طور پر اس زمرے میں آتی ہیں۔ ان کا خوبصورت اور شاہکار افسانہ "برساتی" خاص طور پر ان کے رومانوی طرز تحریر کا نمونہ ہے۔۔۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیں:

"۔۔۔ لو یہ برساتی پہن لو۔۔۔ سردی ہے۔" بڑے اصرار سے میں نے اسے برساتی پہنائی۔ ہم وادی الکبیر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ رات ختم ہو چکی تھی۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔۔۔ "تو میں شام کو تمہاری گلی میں SERENADE کرنے نہ آؤں؟" وہ ہنسنے لگی۔۔۔ "ضرور آنا۔ میں سیاہ مٹیلا پہن کر بالوں میں پھول لگا کر دریچے میں انتظار کروں گی" ۔۔۔ "لیکن تم اپنے نازک پنکھے سے چہرہ چھپا لو گی"۔۔۔ تمہیں سب پتہ ہے۔۔ اچھا نہیں چھپاؤں گی"۔۔۔ جب اس کا گھر آیا تو مشرق میں روشنی پھیل چکی تھی۔ "تو پھر تم آؤ گے"۔۔۔ نہیں فلاویا' اب ملاقات نہیں ہوگی۔ میں آج قرطبہ جارہا ہوں"۔۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔۔ پھر اس نے برساتی کو سرخ ہونٹوں سے بار بار چوما۔۔۔ "میں تمہیں ہر نئے سال کی رات کو یاد کروں گی"۔ (برساتی)

شفیق الرحمٰن نے "دجلہ" کی صورت میں جرمنی' مصر اور عراق کا سفرنامہ پیش کیا ہے یہ سفرنامہ سفرنامے کے اس چلن سے ہٹ کر ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ اس میں غیر ملکی مناظر اور افراد کو نئے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ شفیق الرحمٰن صاحب اسلوب ہیں اور اپنے اس خاص اسلوب کے تحت انہوں نے دھند میں اپنے آزمودہ ہتھیاروں یعنی شیطان' حکومت آپا اور مقصود گھوڑے وغیرہ سے بھرپور کام لیا ہے۔

"دھند" کو ان کے مخصوص انداز کا رومان بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ "دجلہ" میں ہمیں شفیق الرحمٰن کے مخصوص مزاج کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ یہاں ان کے مخصوص کردار اپنی جملہ ہیئت کذائیوں کے ساتھ نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنی مسکراہٹوں اور لطافتوں سے آسودگی کی ایک ایسی فضا تخلیق کرنے کا باعث بنتے ہیں

جو ان کی تحریروں کا خاصہ ہے:

"—— ایک دن مقصود گھوڑا [illegible] بالکل [illegible] کرتے [illegible]
بتایا —— کہ ذرا دیر پہلے بادلوں اور کہرے کے لپٹے ہوئے دوربین سے کچھ دکھائی دیا ہے [illegible]
کولمبس نے امریکہ کے ساحل کو ہندوستان سمجھ کر بھی نہیں نکالا ہوگا۔ اسے پہاڑ پر [illegible]
آتی تھیں...... مقصود گھوڑے کے برعکس شیطان نے (واسکوڈی گاما کی طرح) ایک نئی دریافت بھی کی
تھی—— انہوں نے پچھلے قصبے میں ایک بے حد کثیر العیال شخص ڈھونڈ نکالا۔ کیمپ کی خاموشی یا [illegible] سے تنگ
آکر جب کسی کو شادی کا خیال آتا یا منگنی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں تو وہ فوراً" سب کو اس کے گھر لے جاتے
ہیں—— وہاں پہنچتے ہی یوں معلوم ہوتا جیسے کسی عالمی ٹورنمنٹ کے فائنل میں پرانے حریفوں کا [illegible]
مقابلہ ہو رہا ہے۔ وہ ریفری کی طرح انہیں بار بار گھرکتا، ڈانٹتا اور باہر بھی بھیج دیتا"—— (دجلہ)

"دجلہ" کے مضامین میں کہیں کہیں مسکراہٹوں کے عقب سے دردمندی اور پرسوزی بھی اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ لیکن اس دردمندی کا تاثر اتنا گہرا نہیں ہے کہ جلد زائل نہ ہو سکے۔ مصنف اگلے ہی لمحے اداسی کے اس ماحول سے نہ صرف خود نکل آتا ہے۔ بلکہ پڑھنے والے کو بھی اس ماحول سے باہر نکال لیتا ہے اور ایسے نازک مقامات پر ایک تفریحی نظر ڈالتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے گویا شفیق الرحمٰن کی تحریریں پڑھنے سے زندگی کرنے اور زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے زندگی اور زندہ رہنے کا یہ مخصوص رنگ شفیق الرحمٰن کی تحریروں کا اصل ماٹو Motto ہے—— محمد خالد اختر کے بقول:

——"وہ کبھی زندگی کے کھیل سے بور نہیں ہوا اور یہ بور نہ ہونا ہی میری نظر میں بذات خود ایک اچیومنٹ ہے"—— (نقوش۔ شخصیات نمبر)

شفیق الرحمٰن کے مزاج کا سب سے خوبصورت اظہار تحریف نگاری میں ہوا ہے انہوں نے تحریف نگاری کے فن کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور اردو کے مزاحیہ ادب میں چند دلچسپ تحریفیں لکھ کر ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

پیروڈی یا تحریف نگاری ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار اور طنز نگار دونوں نے اپنے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ تحریف یا پیروڈی کسی تصنیف کی اس نقل کو کہتے ہیں جس کی ہیئت تو اصل کے مطابق ہو لیکن الفاظ کی تبدیلی سے ایسے نئے معانی پیدا کئے جاتے ہیں کہ وہ مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تحریف کی کامیابی کا راز اس بات میں ہے کہ تحریف شدہ تصنیف زبان زد خاص و عام ہو لہٰذا ایسی کتاب کی تحریف مزاح کو فی الفور تحریک دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے پطرس بخاری نے اردو نثر میں تحریف کی ابتداء کی اور مولوی محمد حسین آزاد کی "اردو کی پہلی کتاب" کا مذاق اڑانے کے لئے "اردو کی آخری کتاب" لکھی—— شفیق الرحمٰن نے تحریف نگاری کو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کئی ایک تحریفیں لکھیں۔ انہوں نے بعض اصلی اور بعض فرضی کتابوں کی تحریف کی ہے—— "قصہ حاتم طائی بے تصویر"—— "تحت شعور اور لاشعور" "سفرنامہ ہند باد جہازی" "کلید کامیابی" —— "تزک نادری عرف سیاحت نامہ ہند" اور "زنانہ اردو خط و کتابت" ان کی تحریفات میں سے چند ایک کے نام ہیں وہ ان تحریفوں میں ہماری معاشرتی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے شفیق الرحمٰن کی دلچسپ تحریف کا اندازہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔

حاتم طائی' شہزادی کہلب شاہ کے لئے شہزادی غلام حسن بانو کے پوچھے گئے سوالوں کے دلچسپ جواب تلاش کرنے نکلا ہے۔۔۔ شہزادی صاحبہ کے پوچھے گئے سوالوں میں سے ایک سوال تھا۔۔۔۔۔۔ "شادی کر اور دریا میں ڈال" کو صاف طور پر واضح کرو"۔۔

حاتم اس سوال کے جواب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب ڈھونڈ نکالتا ہے۔۔۔ "اگلے روز حاتم کا خیمہ تمنا محل اٹھا اور اسے ایک ایسا شخص ملا جو بار بار کہتا تھا "شادی کر اور دریا میں ڈال"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس شخص کی والدہ کو اپنے بیٹے کی شادی کا بہت چاؤ تھا بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی لیکن اب والدہ خفا رہنے لگی کہ بیٹا زن مرید ہوتا جا رہا ہے۔ وہ بیٹے سے یہی کہتی کہ تو بیوی کی طرفداری کرتا ہے۔ ادھر بیوی بھی خفا رہنے لگی اور کہتی کہ تو اپنی والدہ کی طرف داری کرتا ہے۔ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس غریب کا دماغ چل گیا اور یہ چلاتا پھرتا ہے کہ "شادی کر اور دریا میں ڈال۔" بہت سے نوجوان اس ہدایت پر عمل بھی کرتے ہیں۔" (قصہ حاتم طائی بے تصویر)

شفیق الرحمٰن کی تحریر کردہ سب سے خوبصورت تحریف "تزک نادری عرف سیاحت نامہ ہند" ہے جس کا سہارا لے کر شفیق الرحمٰن نے "تزک نویسی" کے بلند بانگ لہجے کا مذاق اڑایا ہے۔ یقیناً" یہ بہت "نادر" اور کامیاب تحریف ہے۔ شفیق الرحمٰن نے لطیف طنز اور مخصوص مزاح سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے ماضی کی بعض سیاسی غلطیوں پر خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"تزک نادری عرف سیاحت نامہ ہند"

"ر قمزدہ۔ اعلیحضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ' سابق ابن شمشیر ابن شمشیر' سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ" نیچے "پیش لفظ' عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا" میں رقم طراز ہیں:

"۔۔۔خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے' دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوا دیں اور قتل عام؟ قتل عام کس مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا۔ اور بات یہ تھی کہ اہل ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس بات کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑی ہیں۔ مثلاً" شامت اعمال ما با صورت نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً" اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص ہوگا۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے"۔۔ (تزک نادری)

"تزک بابری" میں "کابل کی تعریف" اور کابل اور ہندوستان کے راستے کے ضمن میں واقعات کچھ یوں بیان کئے گئے ہیں۔

"۔۔۔۔ کابل کے پھلوں میں سے انگور' انار' سیب' زرد آلو' بہی' امرود' شفتالو' بادام اور چار مغز بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ان پھلوں کے علاوہ نیشکر اور شاہ دانہ میں نے اس جگہ بوایا ہے یوں تو چلغوزہ بھی کابل کے نواح میں پیدا ہوتا ہے لیکن زیادہ تر نجرود سے آتا ہے۔۔۔ کابل میں شہد بھی کافی مقدار میں نکلتا

یہ یہاں کا انگور تو خاصا لذیذ ہوتا ہے جس سے یہاں عمدہ و تیز شراب تیار ہوتی ہے۔۔۔۔ کابل کا محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ یہاں تک دشمن کی رسائی بہت آسان ہے۔ کابل سے ہندوستان کو چار راستے جاتے ہیں۔ ایک راستہ لمغانات میں سے ہو کر ہے جو درہ خیبر تک پہنچتا ہے دوسرا راستہ بنگش سے ہو کر جاتا ہے تیسرا راستہ نغر کا اور چوتھا راستہ فرمل سے ہوتا ہوا آگے جاتا ہے۔۔۔۔ ان راستوں تک پہنچنے کے لئے دریائے سندھ کو تین مقامات سے عبور کرنا پڑتا ہے جو کارواں' نیلاب کو پار کرتے ہیں۔ وہ لمغانات کے راستہ سے گزرتے جاتے ہیں۔ موسم سرما میں جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ دریائے سندھ دریائے سوات اور دریائے کابل کے سنگم سے پار ہوتے ہیں۔۔۔ میں جب ہندوستان میں داخل ہوا ہوں تو ان ہی دریاؤں سے پار ہوا ہوں۔ آخری بار جب میں نے پانی پت کی لڑائی لڑی اور ابراہیم لودھی کو شکست دی اور ہندوستان کو فتح کیا تو دریا نیلاب کے مقام پر کشتی کے ذریعے عبور کیا۔"

شفیق الرحمٰن نے "تزک نادری" میں ان واقعات کی تحریف بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے۔ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرنے کو سیاحت ہند کا نام دیتے اور لکھتے ہیں:

"۔۔۔ کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جنہوں نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ شاہی حکم' نادری قرض' نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔۔۔۔۔۔ شہباز خان الو شناس ہر روز ملک ہندوستان کی خبر سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار چنگ' چرس اور دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو الو شناس بھی چست ہو گیا' اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلا دی جو غالباً" ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر سنا تھا۔ نہ کبھی انہیں دیکھا تھا۔ نہ شرف ملاقات بخشا تھا چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی' سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحت ہند میں صرف کیا جائے۔۔۔ ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لئے اہل ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں۔

براہ افغانستان: خیبر ایجنسی۔۔۔۔۔۔۔ پشاور۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔۔۔۔ پانی پت

براہ بلوچستان: سرہ شہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھٹنڈہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دلی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے"۔۔ (تزک نادری)

بہر حال اس جائزے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک مزاح نگار اور پیروڈسٹ کی حیثیت سے شفیق الرحمٰن کی انفرادیت سب سے نمایاں ہے اور مزاح نگاروں کی جدید نسل میں اس مخصوص رنگ میں کوئی بھی ان کا حریف نہیں ہے۔

شریف کنجاہی

گھوڑیاں

کتاب	:	گھوڑیاں (لوک گیت)
مصنف	:	ارشد میر
صفحات	:	۲۳۶
قیمت	:	۵۰/= روپے
ناشر	:	لوک ورثہ اشاعت گھر، اسلام آباد۔

گھوڑی ایک مختلف نوعیت کی صنف اظہار ہے۔ اس کی عائلیت ہی میں اس کی انفرادیت ہے۔ بلاشبہ قدیم عائلی میلان اور اس میلان سے جذباتی وابستگی کی شاخ پر یہ پھول کھلے اور سدا بہار بن گئے اس صنف اظہار کا موضوع وہ عمرانیت تھا جس نے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو حیوان سے الگ شناخت بخشی۔ ورنہ کتنے ہی تقاضے دونوں میں مشترک تھے اور ہیں۔ اگر مشترک نہیں تو یہی ایک احساس کہ خونی اور نسلی رشتے نسبی ہیں اور اس قابل کہ عمر بھر ان کا احترام کیا جائے۔ "گھوڑیاں" اس احترام کی آرزو بھی ہیں اور اس کا اظہار بھی۔ ان کا دائرہ عام لوک گیتوں سے اسی لئے وسیع ہے کہ یہ دو نوجوانوں کے ایک عمر تک کے مخصوص تقاضوں تک محدود نہیں ہوتے۔ ان کا موضوع اولاد سے ماں باپ کی محبت بھی ہے اور بہن بھائیوں کی محبت بھی بلکہ ماں باپ کے حوالے سے ان کے بھائی بہنوں کی اولاد بھی ان کی اپنی شخصیتوں کے ساتھ ان کے دائرہ اظہار میں آتے ہیں۔ اور انسان کے تنہائی کے زہر کا تریاق بنتے ہیں۔۔۔ وہی تریاق جس کی تلاش غیر شعوری طور پر طبقاتی تقسیم کے باغی بھی اپنے ناموں کے ساتھ کوئی نہ کوئی دم چھلا لگا کر کرتے چلے آئے ہیں۔

عمرانی زندگی میں ہوتی چلی جارہی تبدیلیوں کے باعث ہمارے عائلی انداز بدلتے جارہے ہیں اور خدشہ ہے کہ آنے والی نسلیں شاید سمجھ ہی نہ سکیں کہ متحدہ گھریلو زندگی کبھی بہت وسیع ہو سکتی تھی۔ اسی لئے جب ان لوک گیتوں کو ارشد میر صاحب نے زمانے کی دستبرد سے بچانے کی کوشش کی اور لوک ورثہ نے اسے کتابی شکل دے کر محفوظ کر دیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اب پنجاب کا معاشرتی ماضی بالکل بے نشان نہیں ہوگا۔ ان کی اس کوشش کو میں نے وہیلر کی ان کوششوں کے ہم پلہ قرار دیا تھا جن کے ذریعے ہماری ماقبل آریائی تہذیب کے آثار مٹنے سے امکانی حد تک بچ گئے۔ وادی سندھ کی ان کھدائیوں سے ہاتھ لگنے والی چیزوں کو دیکھنے کا جس کسی کو بھی اتفاق ہوا ہوگا وہ ضرور تصدیق کریں گے کہ نہ تو وہ برتن بہت نفیس ہیں نہ زیور اور نہ مکان اس کے باوجود اس تلاش کو عمرانی تاریخ کا ایک بہت بڑا کارنامہ گردانا گیا ہے کیونکہ انسان کے ماضی کا افق اس سے بہت دور تک چلا گیا ہے۔ ارشد میر کی یہ تالیف بھی اسی لئے ماضی شناسوں کے لئے

اسی قدر اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہم کم سے کم اتنی دور تک ضرور جا کر دیکھ سکتے ہیں جب مثلاً پہلے گھوڑے سدھائے گئے یا سدھائے گھوڑے لائے گئے اور اگر کبھی معجزانہ طور پر کہیں سے کل کے پرانے لوک گیت مل جائیں اور ہم ان کو سمجھ بھی سکیں تو شاید ان میں گھوڑیوں کا ذکر نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے آمد و رفت کے طریقوں میں جس سرعت کے ساتھ تبدیلی ہوتی جا رہی ہے اس کے باعث گھوڑے گھوڑیاں ہمیں چڑیا گھروں میں ہی دیکھنے کو ملیں جس طرح آج ناروے وغیرہ میں ہے۔ اور جب گھوڑے گھوڑیاں نہ ہوں تو ان سے مخصوص صنف اظہار کیوں کر رہ سکے گی۔ اور اگر رہی بھی تو لوگ اس سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکیں گے اور ان کے بارے میں الٹے سیدھے اندازے لگاتے رہیں گے۔

ارشد میر نے اس مجموعے کے آغاز میں مضبوط دیباچہ لکھ کر بلاشبہ اس کا کافی حد تک سدباب کر دیا ہے اور دیہات سے شہروں کی طرف دوڑتے چلے آ رہے اور پرانے رہن سہن کو چھوڑتے چلے جا رہے لوگوں کی وہ ابتدائی باتیں تھیں بھی بہت ضروری تاکہ اگر کسی وقت وہ ماضی کے جھروکے کھول کر دیکھنا چاہیں تو اس دیئے کی ٹمٹماہٹ انہیں ٹھوکروں سے بچا سکے گی۔ "پیر خانے" یعنی بوڑھے ماں باپ کے لئے سرکاری آرام گھروں کے عام ہوتے جانے سے یورپ میں اولاد اور ماں باپ کے درمیان ایک دیوار سی اٹھنے لگی ہے اور وہ "بابیت" ختم ہوتی جا رہی ہے جس نے اس لوک کہانی کو جنم دیا تھا کہ ایک بادشاہ اور وزیر کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی گندم کے کھیت کے کنارے بیٹھا ہوا ہے بادشاہ نے اس سے فصل کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ اس میں سے ایک حصہ قرض اتارنے میں جائے گا۔ ایک قرض دینے میں۔ ایک حصہ وہ خود کھائے گا اور ایک کو دریا برد کر دے گا۔ آخری حصہ وہ تھا جو بیٹوں کی پرورش پر خرچ ہوتا تھا کہ ان سے واپسی کی کوئی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ آج بیاہے جوڑے کی زندگی وہاں شاید آسان ہو گئی ہو لیکن ان کو پیار کرنے والی بہنوں سے قربانی دینے والی ماؤں سے اور غرجی کاٹ کر بیٹوں کو پاؤں پر کھڑنے کرنے کے قابل بنانے والے باپوں سے محروم کر گئی ہے۔

یوں گھوڑیاں ہمارے مشترکہ رہن سہن کی تصویریں ہیں۔ جس میں دکھ بھی تھے مسائل بھی تھے لیکن جس میں ایک دوسرے پر مان کرنا بھی تھا۔ اگر بہن کہتی۔ ویرا وے واگ پھڑائی۔ تو بھائی بھی کہتا کہ ۔ جو کچھ منگنا ایں منگ لے۔ اور جو کچھ مانگا جاتا وہ اس قدر اہم نہیں تھا جس قدر یہ بات یہ احساس اور یہ مان کہ میری بات رکھ لی گئی۔ زندگی میں یہ احساس اور یہ مان بہت بڑی چیز ہے۔ آج کے ادب میں کرچی کرچی' ہو جانے کا جو رنگ گہرا ہوتا جا رہا ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ آج انسان کسی بات پر مان نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی میں ایک اکھڑ پکھڑ آ گئی ہے۔ اس کا کوئی پڑوس نہیں رہا۔ ساتھ والوں سے میل ملاپ شروع ہوتا ہے تو کسی اور جگہ اٹھ جانا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک ان لوک گیتوں کی حیثیت ان وٹامنز کی سی ہے جن سے ہماری جذباتی خوراک خالی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن جس طرح بازاروں میں میڈیکل سٹوروں پر وٹامنوں کی ڈبیوں کی کثرت اور بکثرت فروخت سے ضروری نہیں کہ وٹامن کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے ہمیں پوری طرح نجات مل جائے۔ اسی طرح گھوڑیوں کو یکجا کر کے بہت خوبصورت طریقے سے چھپوا لینے سے یہ پوری طرح توقع نہیں کی جاسکتی کہ وقت کی باگ کو واپس موڑا جا سکتا ہے۔ کسی دوائی کا پلے ہونا یا بازار میں ہونا کچھ نہ کچھ وجہ تسلی تو ہوتا ہے۔

تالیفات کی دنیا میں اس کتاب کے بارے میں یہ بتا دینا بھی بہت ضروری ہے کہ پورے برصغیر میں میری معلومات کے مطابق اپنی نوعیت کی یہ واحد کتاب ہے۔

ڈاکٹر محمد ریاض

اقبالؒ پیامبر امید

کتاب	:	اقبال پیامبر امید
مرتب اور جمع آور	:	ڈاکٹر تصدق حسین راجا
مصنف	:	علامہ حکیم محمد حسین عرشی امرتسری
ناشر	:	ادارہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ (راولپنڈی' لاہور' کراچی)
قیمت	:	۲۵/- روپے

محمد حسین امرتسری مرحوم کو علم طب میں مہارت کی بناء پر لوگ حکیم اور علمی تبحر کی بناء پر علامہ کہتے رہے ہیں۔ ان کا تخلص ان کے مقاصد اور اعمال و افکار کے عین مطابق عرشی تھا مگر اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ زندگی بھر فرشی اور خاک نشین ہی رہے چنانچہ ان کی توجہ کے مراکز مساجد اور یتیم خانے رہے اور ان کے' ہم نشین اور احباب بیشتر سادگی پسند علماء' ادبا' اور فضلاء و شعرا تھے۔ ان کی نثر و نظم فکر دین مین رچی بسی نظر آتی ہے۔ علامہ عرشی نے ۹۲ برس کے لگ بھگ مثمر عمر پائی۔ وہ تقریباً" ۱۸۹۳ء میں امرتسر میں متولد ہوئے اور ۴ جون ۱۹۸۵ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ تقسیم برصغیر کے بعد عرشی مرحوم لاہور کے علاوہ کراچی' ساہیوال' اوکاڑہ اور راولپنڈی میں قیام پذیر رہے۔ انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کا رسالہ کئی برس تک ان کی ادارت میں شائع ہوا اور اس دوران اس کے متعدد وقیع خاص شمارے بھی شائع ہوئے۔

علامہ عرشی نے غیر رسمی طور پر کئی نامور اساتذہ سے متعدد مشرقی زبانیں جیسے' اردو' پنجابی' عربی' فارسی اور ہندی سیکھیں اور درس نظامی نیز ادب و شعر کی درجنوں کتابیں مطالعہ کیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ذہن رساو فکور' ذوق نفیس اور مقاصد بلند تھے۔ ان کے مکتوب الیہم اور معاصروں میں علامہ اقبال کے علاوہ حکیم فیروز الدین طغرائی' علامہ محمد عالم آسی' خواجہ احمد الدین' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' ڈاکٹر محمد الدین تاثیر' حکیم نیر واسطی' ملا واحدی' مولانا جعفر شاہ پھلواروی' ابوالاثر حفیظ جالندھری' وارث سرہندی اور پروفیسر سید محمد عبد الرشید فاضل ایسے ارباب ذوق و کمال کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ علامہ محمد اقبال سے انہوں نے ۱۹۱۸ء میں ایک شعری تبادلہ خیال کیا۔ ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ کی اشاعت کے بعد آپ اقبال سے ملے بھی اور اس کے بعد متعدد نیاز مندانہ ملاقاتیں کی۔ ۱۹۱۸ء والا شعری مناظرہ خاصا مشہور ہے جب عرشی مرحوم نے علی برادران' کی طرح اقبال کے چند سالہ سکوت کو توڑنا چاہا اور مولانا ظفر علی خان نے بھی اس تحریک کی تائید کی۔ مگر اقبال نے اسرار خودی اور رموز بے خودی کی تخلیق کے دوران خاصا انہماک دکھایا اور جنگ عظیم کے

ردعمل یا معاصر تحریکوں" تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات" کے ساتھ زیادہ سرگرمی کے ساتھ [illegible] دکھائی۔

ادارہ فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ نے ڈاکٹر تصدق حسین راجا کا مرتب کردہ (اشاریے کے بغیر) [illegible] صفحات پر مشتمل "اقبال پیامبر امید" کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں جو مجموعہ شائع کیا، وہ علامہ عرشی کے ۱۸ مقالوں پر مشتمل ہے یہ مقالے ملک کے موقر اور محترم مجلوں میں شائع ہوئے تھے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ اقبال اپنے مومنانہ کردار و عقیدے کی بناء پر کبھی نا امید نہ ہوئے اور برصغیر کے شعراء کی روش کے خلاف، دوسروں کو بھی امید و اطمینان کا مدت العمر درس دیتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں لکھی جانے والی اپنی نظم "مسلم" میں انہوں نے فرمایا تھا:

ہکب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے خالی ہے ہمارا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کار زار

اس مجموعے کے سارے مقالے اور مباحث "اقبالیات" کے نقطہ نظر سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مقالے اور مباحث مختلف موقر مجلات اور رسائل میں شائع ہوگئے تھے، مگر ان سب منتشر تحریروں تک ہر صاحب ذوق کی رسائی نہ تھی۔ مرتب تصدق حسین راجا کی محنت قابل داد ہے انہوں نے ان تحریروں کو سلیقے سے جمع کیا اور کسی قدر وضاحتوں کے ساتھ شائع کر دیا۔

بعض تحریروں پر نگاہ بازگشت

ابتدائی عنوان، عرشی امرتسری اور اقبال ہے۔ پھر عرشی کے سوانح اور تصانیف کا ذکر ہے۔ "من و اقبال" عرشی کا مقالہ اول ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے اپنے ایک مدرس دوست شیخ عبید اللہ امرتسری کی تحریک پر علامہ اقبال کا سکوت شعر توڑنے کی خاطر چند فارسی شعر "روزنامہ زمیندار" میں شائع کرائے، جن کی تائید مولانا ظفر علی خان اور عرشی کے استاد حکیم طغرائی نے بھی کی۔ ان کے جواب میں اقبال نے چند فارسی شعر ارشاد فرمائے جن کا مدعا یہ تھا کہ وہ پیغام بیداری دینے سے غافل نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بھی وہ اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف تھے۔ عرشی، ظفر یا طغرائی صاحبان نے اچھا کیا کہ اقبال کے تاثرات جواباً" سن لئے کہ ۔

دارم ہنوز از کرم ساقی حجاز
آہے درونہ تاب کہ خیزدز سینہ مست

علامہ عرشی نے زیر حوالہ مقالہ میں (صفحہ ۳۵، ۳۶) کس خاکساری سے لکھا" (ان اشعار کا لکھنا) یہ تھا میرا ان سے قلمی تعارف اس کے باوجود مجھے اپنی ہیچ میرزی کے پیش نظر ان سے یعنی تعارف کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ تاہم یہ سعادت بھی میرے مقدر میں تھی۔ بات یہ ہوئی کہ ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ شائع ہوا......... ہم چند احباب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے......"

اپنے ایک دوسرے مقالہ" علامہ اقبال، ایک مرد خدامست" میں عرشی مرحوم نے لکھا ہے: "میں جب ملاقات کرکے آتا تو کئی دنوں تک اسی سرشاری میں رہتا۔ احباب سے بھی یہی باتیں رہتیں، آخری چند سال

عرشی کے ایام میں مدوح مادی اثرات سے بہت کچھ آزاد ہو چکی تھی۔ آپ کی صحبت میں ایک طالب حقیقت کو وہی کچھ حاصل ہوتا تھا جس کی طرف عارف رومی نے توجہ دلائی ہے۔

یک زمانے صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

میں نے حضرت علامہ کے وجود میں کیا پایا؟ ایک باخبر رفیق راہ جو کٹھن منزلوں میں پوری رفاقت کرے' ایک شفیق بزرگ جو کامل دل سوزی سے حل اشکال کر دے' ایک مرشد طریق جو نشیب و فراز جادہ و منزل سے آگاہ ہو۔۔۔۔۔۔۔(صفحہ ۲۴' ۳۷)۔

عرشی کی یہ انکساری دیکھیں اور دوسری طرف اس کتاب میں بعض حاشیہ آرائیاں اور اس کی تقریب رونمائی کی باتیں عرشی کو اقبال کے ہم پلہ بناتی ہیں اور کئی دوسرے پیران مرشد کا بھی اس میں ذکر ہے جنھوں نے اقبال کے ذوق فکر و نظر کو وسیع کیا۔ علامہ اقبال کے پاس وہبی علوم و فنون نہ تھے مگر فیاض ازل نے مجموعی طور پر انھیں جو ذہن دیا' وہ غالباً" ان کے معاصرین میں سے کسی کو ودیعت نہ ہوا تھا۔ ان کے معاصروں کی دلچسپیاں بہر حال محدود و معدود' ہی نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے ان میں نہ کوئی اقبال بنا نہ مثیل اقبال ہمارے مبالغہ آمیز قومی وطیرہ کے بارے میں یہ جملہ ہائے معترضہ ہیں۔ اب ہم علامہ عرشی کے دیگر مقالات میں سے بعض کا ذکر کریں گے! ان مقالوں کے عنوانات یوں ہیں:

عظمت قرآن بنظر اقبال' اقبال کے کرم فرما' اقبال شاعر فردا' اقبال اور ہنگام سحر' اقبال اور تشکیل کردار کتاب کے عنوانی مقالے "اقبال' پیامبر امید" کا ذکر پہلے ہو چکا۔ یوں تو علامہ عرشی کا کوئی مقالہ بھی سرسری نہیں' مگر مندرجہ بالا عنوانات والے مقالوں کی خاص اہمیت ہے

"اقبال اور قرآن" ایک وسیع مضمون ہے۔ ابو محمد مصلح' قاضی محمد ظریف اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان وغیرہ نے اس موضوع پر بہت لکھا ہے۔ علامہ عرشی نے بھی اپنے اس خطاب میں جو مقالہ پڑھا' پیغام اقبال کے قرآنی تو سیعی پہلو کو بیان کیا ہے۔ وہ اقبال کے فارسی اشعار کا ترجمہ اور کسی قدر وضاحت بھی پیش کرتے رہے۔ مثلاً" ۔

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ

اے قوم جو شبنم کی طرح زمین پر گری ہوئی ہے' مخالفین (یہود' نصاریٰ اور اشتراکیوں) نے تجھے پامال کر رکھا ہے' تیرے پاس ایک زندگی بخش نسخہ' ایک زندہ کتاب موجود ہے۔ اس کے سہارے دوبارہ زندگی حاصل کر۔ تو نے اس کی بجائے فرقہ وارانہ رسوم کو ایمان کا درجہ دے رکھا ہے ۔

اے گرفتار رسوم ایمان تو
شیوہ ہائے کافری زندان تو

تیرا ایمان یعنی' مسرفانہ' نمائشی اور گمراہ کن رسموں میں جکڑا ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تو مسلمان کہلاتے ہوئے کفر صریح کے قید خانے میں مقید ہو کر رہ گیا ہے ۔

قطع کر دی امر خود رادر "زبر"
جادہ پیائی الی شئی نکر'

"فرق" کے معنی ٹکڑے ٹکڑے اور گروہ گروہ کے ہیں۔ یہاں دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں۔ یعنی اے قوم تو نے اپنے اصول دین کو پارہ پارہ کر دیا یا کتاب اللہ کو چھوڑ کر بہت سی مختلف گروہوں کو اپنے اپنے فرقے کی طرح بنا لیا اور ایسے راستے پر چل پڑی جو تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے" (۵۷) آخری شعر کی تشریح بھی مناسب ہے' مگر اس نمونے سے واضح ہے کہ علامہ عرشی شرح و توضیح میں کمال رکھتے تھے۔ اس کتاب میں مرقوم ہے کہ ان کی نوشتہ شرح بانگ درا کا غیر مطبوعہ نسخہ (مسودہ) ادارہ فیض الاسلام" راولپنڈی میں موجود ہے۔ اس کی اشاعت شاید ایک مفید کوشش سمجھی جا سکے گی۔

زیر تبصرہ مجموعے میں دین و حکمت کے بہت گوہر ہائے آبدار ملتے ہیں اس لحاظ سے ناشر دونوں کو تحریک کہنا نامناسب نہیں۔ ایک اقتباس بحوالہ' قرآن اوپر نقل ہوا۔ قرآن مجید کے سلسلے میں عرشی کی تحریر بحوالہ' اقبال بالخصوص لائق توجہ ہے۔ ایک اقتباس ان کے مقالے اقبال کے کرم فرما سے نقل کرکے اس تبصرے سے دست کش ہو رہا ہوں کیونکہ مشتے نمونہ از خروارے کا تقاضا یہی ہے۔

"علامہ چشم پر آب اور قلب پر گداز کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ وہ قرآن پاک کو ایک عالم گیر اور غیر زمانی دعوت کا داعیؑ عظیم سمجھتے تھے۔ قرآن نے خود کم از کم بائیس مرتبہ "یا ایہا الناس" کہہ کر پورے عالم انسانیت کو پکارا ہے۔ چھ بار "امت واحدہ" کا مطالبہ دہرایا ہے ہر دور اور ہر ملک و ملت کے انسانوں کو "نفس واحدہ" سے ان کی تخلیق تین بار یاد دلائی ہے سات مرتبہ بنی آدم اور یا بنی آدم کہہ کر تمام نوع انسانی کے ایک کنبہ ہونے پر مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین' پیغمبر قرآن کا وصف رحمتہ اللعالمین اور خود قرآن کی شان ذکر للعالمین وارد ہوئی ہے۔ غور فرمایئے! جس عالی دماغ نابغہ روزگار کی رگ رگ میں ایسی وسیع الظرف اور محیط الکل کتاب کی آیات رچ چکی ہوں کیا وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص و محدود ٹولی یا انسانوں کے بنائے ہوئے کسی ازم میں محصور و مقید کر سکتا ہے؟ وہ ازم جو کل بنے اور تجربے کی کسوٹی پر آکر آج فیل ہو رہے ہیں کارل مارکس کی اشتراکیت کا جو تصور اس کے ذہن میں تھا آج اس کے نام نہاد پرو ملکوں کے کسی گوشے میں رائج نہیں۔ جتنے ممالک اشتراکیت کا دعویٰ کرتے ہیں سب اپنے اپنے ملک میں ایک دوسرے سے رقابت و ضدیت کی حد تک مختلف ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام قبل زمانہ نوح علیہ السلام سے آخری نبوت تک اپنے اٹل اصول کے لحاظ سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ آج تک کسی متاخر رسول نے کسی متقدم نبی کی تنقید و تردید میں ایک لفظ نہیں کہا' سب ہی اپنے سے سابق انبیاء کی تائید کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ ایک برہان قاطع ہے۔ اس حقیقت پر کہ اسلام انسانی دماغوں کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کا ماخذ و منبع ایک ہی واحد مطلق ذات ہے جس کی بات زمانہ گزرنے کے ساتھ ناقابل عمل نہیں ہو جاتی۔ قرآن بار بار اس عظمت اور ابدیت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لاریب فیہ لا تبدیل لکلمات اللہ لن تجد اللہ لسنت تبدیلا۔ علامہ اسی کا ترجمہ کرتے ہیں

حرف اورا ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

جو لوگ علامہ کو اپنے ساتھ خود ٹولے یا جماعت کا موید ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو قرآن اور علامہ دونوں کو نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر اپنی کسی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لئے وضع و جعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور علامہ کو اپنی آڑ بناتے ہیں.......... "صفحہ ۱۷"

ڈاکٹر محمد ریاض

بیدل

کتاب	:	بیدل
مصنف	:	خواجہ عباد اللہ اختر
طبع سوم	:	۱۹۸۸ء
ناشر	:	ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور ۳۔
صفحات	:	۲۹۴
قیمت	:	۷۰ روپے

مرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی ثم دہلوی، شاہجہاں، اورنگ زیب اور جانشینان اورنگ زیب کے زمانے میں فکر انگیز فارسی نثر و نظم پیش کرنے والی ایک جامع شخصیت تھے (۱۰۵۴۔ ۱۱۳۳ھ / ۱۶۴۴۔ ۱۷۲۰ء) انہیں ابو المعانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی نثر و نظم تازہ مضامین، بلند خیالات اور جدت ادا کے علاوہ زور بیان، نئی تراکیب اور پہلو دار اداؤں کے لئے قابل توجہ رہی۔ معاصرین سے لے کر تا ایں دم ارباب فکر و فن بیدل کے لفظ و معنی کے مداح رہے۔ غالب اور اقبال نے انہیں منظوم خراج عقیدت پیش کئے۔ اقبال نے ان کے بارے میں اردو اور انگریزی نثر میں بھی اظہار خیال کیا۔ بیدل کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے قابل توجہ شاعر ہیں۔ انہوں نے لاکھ سے زیادہ شعر کہے۔ ان اشعار میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ چہار عنصر ان کا نثری رسالہ ہے جب کہ نکات (رقعات) ان کا مجموعہ مکاتیب ہے۔ بیدل کے کلام کے منتخبات شائع ہوتے رہے مگر مکمل کلیات افغانستان میں شائع ہوا (۴ جلد ۱۹۶۳ تا ۱۹۶۵ء کے دوران) اور ان ہی سالوں میں ایران میں اس کی آفسٹ صورت میں تجدید طبع ہوئی۔ افغانستان تاجکستان اور ایران میں بزبان فارسی اور پاکستان و ہند میں انگریزی یا اردو میں بیدل کے بارے میں کوئی درجن کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اردو کتابوں میں زیر تبصرہ کتاب ایک ممتاز اور جامع کوشش کی مظہر ہے۔ اس کے مصنف خواجہ عباد اللہ اختر مرحوم ہیں جنہوں نے کوئی ۴۰ برس تک بیدل کی نثر و نظم پر مزاولت کرنے کے بعد یہ تالیف پیش کی ہے۔

کتاب "بیدل" میں ابوالمعانی مرزا عبد القادر بیدل کے احوال و افکار کا ایک عصارہ و خلاصہ ملتا ہے۔ مصنف نے بیدل کی پیچیدہ فنی نثر پر غور و فکر کرکے اس شاعر کے حالات زندگی مرتب کئے۔ پھر انہوں نے شاعر کی مثنویوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں کا حاصل مطالعہ پیش کرکے پورے "دیوان" پر ایک نگاہ ڈال لی۔ کتاب کا آخری عنوان "مقام بیدل" ہے مگر اس سے قبل مولف نے بیدل کے چند خاص موضوعات پر بھی داد تحقیق دی ہے ان عنوانات میں سے بعض حسب ذیل ہیں: امروز و فردا، تجدد امثال، ہیولی، خودی،

زنار' رسم و عادات' اتفاقات' عرض حال' کے عنوان سے مولف نے کتاب کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"ابو المعانی مرزا عبد القادر بیدل کا کلام میرے زیر مطالعہ گذشتہ زائد از چالیس سال رہا ہے مگر اس کے افکار کی بلندی تک میری رسائی نہیں' لیکن جو کچھ اور جہاں تک میرے فہم میں آیا' نقل کردیا ہے۔ یہ وہ بلند پایہ شخصیت ہے جسے مرزا اسد اللہ غالب ایسے "بحر بیکراں اور "محیط بے ساحل" اور ہمارے علامہ اقبال مرحوم "مرشد کامل" کہتے ہیں تذکرہ نویسوں نے بھی داد سخن دی ہے۔ اس کی نظیر متقدمین میں چند ہستیاں ہیں۔ متاخرین میں اس کا مثل بمشکل پیدا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے ساتھ فنون لطیفہ بلند درجے سے گرتے جاتے ہیں۔ یونان نے ہومر اور عرب نے ایام جاہلیت کے شعرا پھر پیدا نہیں کئے۔ تمدن کا ارتقاء پیٹ کے دھندوں سے فرصت لینے نہیں دیتا۔ فنون لطیفہ سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کی طرف توجہ تو ان حضرات کی ہوتی ہے جو گوشہ قناعت میں بیٹھ کر فقر و فاقہ قبول کرتے ہیں" (صفحہ)

فلیپ پر لکھی ہوئی ذیل کی عبارت گویا اسی بات کا تکملہ ہے کہ "..... بیدل نے عمر بھر فقر و فاقہ میں بسر کی مگر علم کی جو دولت اسے میسر تھی امراء اس کے لئے اس کے محتاج تھے۔ خداداد مقبولیت نے اسے پاکستان' ایران' افغانستان اور ہندوستان میں زندہ و تابندہ رکھا ہے وہ خود کہتا ہے:

اے مردہ دل' آرائش مرقد چہ تمناست
نام تو ہمہ بہ کہ لب گور نہ گیرد

مختصر ذاتی تذکرہ

رسالہ "چہار عنصر" سے خواجہ عباد اللہ نے بیدل کے خود نوشت حالات زندگی اخذ کئے ان کے مطابق وہ ترکوں کے قبیلہ برلاس سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد مرزا عبد الخالق کا پیشہ سپہ گری تھا وہ اپنے پیشے میں منہمک رہے اور بہتر مواقع کی خاطر ماورا النہر سے برصغیر میں منتقل ہوئے مگر بیدل ابھی پانچ برس ہی کے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا اور اس کے ڈیڑھ سال بعد ان کی والدہ بھی رحلت کر گئیں۔ بیدل کی تعلیم و تربیت اور سپہ گری کی آموزش ان کے چچا کے زیر نگرانی ہوئی جو مرزا قلندر کے نام سے مشہور تھے۔ بیدل اپنے مولد عظیم آباد میں شہزادہ شجاع بن شاہ جہاں کی فوج میں ملازم ہوئے اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی اور شاہ جہاں کی حکومت کا یہ آخری سال تھا (۱۰۶۹ھ /۱۶۵۸ء)' شاہ جہان کے چاروں بیٹوں نے اس وقت اقتدار اس طرح سنبھال رکھا تھا کہ دار شکوہ دہلی اور مرکزی علاقوں کا حاکم تھا اورنگ زیب کی عملداری دکن میں تھی' شہزادہ مراد گجرات کاٹھیا واڑ میں مقیم تھا اور محمد شجاع بنگال اور اس کے نواح میں۔ جیسے کہ تاریخ خوان جانتے ہیں کہ تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب دوسرے بھائیوں پر غالب آگیا۔ ان حالات میں بیدل کے چچا مرزا قلندر بنگال کے ایک گاؤں کالا طاق چلے گئے اور بیدل کٹک آگئے جسے اڑیسہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں ان کے خالو مرزا ظریف تجارت کرتے تھے۔ بیدل انہیں کے پاس رہے مگر ۱۰۷۵ھ میں مرزا ظریف کا انتقال ہو گیا تو' بیدل اکبر آباد اور متھرہ سے گذرتے ہوئے دہلی آپہنچے وہاں ان کا سرپرست کامگار خان تھا جو اورنگ زیب کے وزیر اعظم عمدۃ الملک جعفر خان کا بیٹا تھا۔ ۱۰۹۰ھ میں اورنگ زیب نے کامگار خان کو دکن بلا لیا۔ بیدل اس وقت تک دہلی میں خاصے معروف اور محترم شخص بن چکے تھے اب بادشاہ کا ایک معتمد عاقل خان رازی ان کا سرپرست بنا مگر بیدل ایک سیر چشم اور قناعت پسند شخص تھے انہوں نے

کسی امیر یا بادشاہ کی مدح کم ہی کی ہے' البتہ وہ امراء کی محفل میں شعر پڑھتے رہے اور اخلاقی موضوعات پر قطعہ پر بھی کرتے رہے رسالہ چہار عنصر کو بیدل نے اکتالیس برس کی عمر میں لکھا تھا دیگر معروف معاصر تاریخوں اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کی بیشتر زندگی دہلی میں ہی گذری اورنگ زیب کی وفات کے بعد بیدل تیرہ برس زندہ رہے جس میں انھوں نے کئی مہرتاک اقتدار کی جنگیں دیکھیں (۱۷۰۷ء تا ۱۷۲۰ء) اس میں بیدل کا کوئی ڈیڑھ برس کا عرصہ لاہور میں گذرا جب فرخ سیر کی موت کے بعد انہیں سادات بارہ کی وجہ سے کچھ پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اس کے بعد دہلی لوٹ گئے جہاں ان کا انتقال ہوا اس رسالے میں بیدل نے اپنی زندگی اور معاصر واقعات پر جس طرح عبرت انگیز طریقے سے تبصرہ کیا ہے کتاب "بیدل" میں اسے بڑی عمدگی سے ایک بھرپور تذکرے کے انداز میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے چہار عنصر کے علاوہ رسالہ رقعات اور رسالہ نکات تین نثری مجموعے ہیں جنہیں خواجہ عباد اللہ اختر کی اس کتاب میں منعکس دیکھا جا سکتا ہے۔

بیدل کا دفاع

بیدل کو سبک ھندی کا نہایت مشکل گو شاعر قرار دیا جاتا رہا۔ افغانستان اور تاجکستان وغیرہ میں بیدل کی مشکل پسندی کی کسی نے شکایت نہیں کی مگر ایران کے اکثر دانش وروں نے اور برصغیر پاکستان و ہند کے چند ناقدین نے بیدل کی مشکل گوئی کا شکوہ کیا اور ان کی نئی ترکیب سازی اور اصطلاحات کو ناپسندیدگی سے دیکھا اب یہ شکایات قصہ پارینہ بن چکی ہیں حقیقت یہ ہے کہ بیدل اب ہر کہیں مقبول ہیں اور لوگ بیدل کے حامیوں مثلاً" علامہ محمد اقبال' افغانستان کے ڈاکٹر صلاح الدین سلجوقی اور پروفیسر خلیل اللہ خلیلی یا تاجکستان کے صدر الدین عینی اور بیدل کے بعض معاصر باذوق افراد جیسے خان آرزو اور آزاد بلگرامی کے ہمنوا ہیں کہ بیدل ناقابل فہم نہیں بلکہ اس کی فکر اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اور اس کی تراکیب میں جدت اور ندرت ہی نہیں حرکت' سرعت اور ذوق بیداری کے رجحانات بھی موجود ہیں۔ خواجہ عباد اللہ اختر نے تذکرہ کے عنوان سے تذکرہ "خزانہ عامرہ" مولفہ میر آزاد بلگرامی مولفہ خان آرزو یعنی سراج الدین علی خان آرزو کے دفاع بیدل اور شعر العجم مولفہ علامہ شبلی نعمانی میں بیدل کے بارے میں ناقدانہ اور مخالفانہ امور کا دفاع پیش کیا ہے' مگر یہاں امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ بیدل کی مشکل پسندی کی شکایت صرف شبلی نے نہیں کی ان کے معاصر شمس العلماء محمد حسین آزاد بھی ایسا ہی لکھتے رہے ہیں۔ غالب کی بیدل دوستی میں کلام نہیں۔ مگر غالب کی تقلید بیدل میں ناکامی کے بارے میں شبلی نعمانی کے انداز کو علامہ اقبال جیسے متاخر مفکرین کی بھی حمایت حاصل رہی ہے کتاب بیدل میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے وہ مصنف کی بیدل شناسی کے غماز ہیں اس کتاب کی عام قارئین کے نقطہ نظر سے خوبی یہ ہے کہ مصنف نے بیدل کے اشعار کا یا ترجمہ دیا ہے یا ان کا مفہوم اردو میں پیش کر دیا گیا ہے اور اس طرح مضامین اور معانی کی غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ مصنف کا مطالعہ قابل رشک ہے انہوں نے بیدل فہمی کی خاطر عربی فارسی اور اردو کے کئی شعراء کے اشعار نقل کئے اور فلاسفہ اور متکرین کا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ مصنف شاعر بھی تھے اور انہوں نے کتاب کا اختتام بیدل کے ایک شعر کی توضیح میں اس طرح کیا ہے۔

بلبل بنالہ حرف چمن را مفسر است
یا رب زبان نکہت گل ترجمان کیست

"نالہ بلبل" اور "گل" دونوں پریشاں ہیں "حرف چمن" کی شرح تو نالہ بلبل ہے مگر بوئے گل کس کی ترجمانی کرتی ہے اور حسن و عشق کس کی نمائندگی کر رہے ہیں؟

شیرازہ گل تھا بکھرا ہوا' بے ربط عبارت نکہت تھی
یہ مصرع بہار ہستی کا موزوں نہ تھا' اٹھا ہو نہ سکا
کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی رنگت میں
انداز وہ شعر بیدل کا ابیات میں پیدا ہو نہ سکا

اردو میں طباعت کتب کا معیار تدریجاً بلند ہو رہا ہے مگر چند سال پہلے شائع ہونے والی کتابیں جو تجدید طبع کے مرحلے سے گذر رہی ہیں ابھی تصویر کا دوسرا رخ ہی پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ زیر تبصرہ علمی کتاب میں جہاں اغلاط افسوسناک حد تک ہیں وہاں اشاریہ بھی نہیں ملتا۔ حالانکہ ایسی کتاب کا اشخاص' کتب و جرائد اور موضوعات وغیرہ کے حوالے سے اشاریہ مرتب کرنا کتاب کی مقبولیت میں چند گنا اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔ کیا عجب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ارباب کار آئندہ ان امور کی طرف متوجہ ہوں۔

ڈاکٹر محمد ریاض

ملفوظات رومیؒ

کتاب	:	ملفوظات رومیؒ
فارسی سے اردو ترجمہ	:	عبدالرشید تبسم
طباعت	:	۱۹۹۰ء (چہارم)
قیمت	:	۶۰/- روپے
صفحات	:	۳۴۳
ناشر	:	ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ لاہور

مولانا جلیل الدین محمدؒ (۶۰۴ھ۔ ۶۷۲ھ) اور ان کی تصانیف کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی چھ دفاتر یا جلدوں پر مشتمل مثنوی اور ضخیم دیوان فکر انسانی کے نقطہ' کمال کی حامل کتابیں ہیں۔ مثنوی کا ڈاکٹر آر۔ اے۔ نکلسن (۱۹۴۴ء) کا مرتبہ متن (۲۸ ہزار ابیات کے لگ بھگ) اور دیوان مرتبہ از پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر (۱۹۷۰ء) دیگر طباعتولد سے بہتر بانے جاتے ہیں۔ رومیؒ کی تین نظم و نثر سے ممزوج کتب بھی ہیں۔ فیہ مافیہ (ملفوظات رومی کا فارسی متن) مکاتیب (۱۴۱ فارسی اور ۴ عربی خطوط) اور مجالس (سات یا نو خطبات)۔ چوتھی اور پانچویں کتاب ۳۷/۱۹۳۶ء میں ترکی میں شائع ہوئی اور دوسری بار ایران میں (مکاتیب ۱۹۵۶ء میں اور مجالس ۱۹۴۰ء میں) ان دونوں کتابوں کا اردو ترجمہ اس راقم نے۱۹۸۸ء میں مکتوبات و مواعظ رومی کے عنوان سے لاہور سے شائع کروایا (اقبال اکادمی پاکستان صفحات ۵۰۰ قطع طویل) مقدمے میں ضروری توضیحات موجود ہیں۔ فیہ مافیہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء میں تہران سے لیتھوگراف طباعت سے آراستہ ہوئی (مرتب حاج شیخ عبد اللہ حائری) اور ۱۹۲۸ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اسے اعظم گڑھ سے شائع کروایا۔ اس کی تیسری اشاعت ۱۹۵۶ء میں تہران سے استاد بدیع الزماں فروزانفر کے ذریعے ہوئی۔ ملفوظات رومیؒ اس متن کا ترجمہ ہے۔ استاد فروزانفر نے رومی کے حالات و آثار پر مبنی اپنی کتاب (طبع اول ۱۹۳۷ء اور طبع دوم ۱۹۵۴ء) نیز استاد سعید نفیسی (۱۹۶۶ء) نے اپنی کئی تحریروں میں رومی کے مکتوبات اور ان کی مجالس کا خاطر خواہ ذکر کر دیا تھا' مگر فیہ مافیہ کے مترجم کو ان تحریروں کی خبر نہ ہوئی اور وہ رومی کی ایک ہی نثری کتاب (یعنی ملفوظات) کی موجودگی میں مصر رہے یہاں اس امر کا بھی ذکر کر دیں کہ رومی کی نثری کتابوں (مکاتیب' مجالس خطبات اور فیہ مافیہ) میں دیگر مقدم یا معاصر شعراء کے ابیات کے علاوہ رومی کی مثنوی اور دیوان کبیریا دیوان شمس تبریزی (کل اشعار کوئی ۵۷ ہزار) کے متعدد اشعار منقول ملتے ہیں۔ ملفوظات رومی کو رومی کی دیگر چار کتب کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ پانچوں کتب آخر ایک ہی شخص کی تحریر یا گفتار ہیں۔ ملفوظات

رومی کے مترجم کے شغل و مقام کی اس عصر کو خبر نہیں۔ البتہ ملفوظات کے مجمل یا مشکل المطالب ہونے کی مترجم نے جو شکایت کی ہے (صفحہ ۲ سطر ۳ تا ۹) وہ بظاہر فکر رومی سے ان کی عدم مزاولت اور ناموانست کا مظہر ہے تاہم اردو ترجمہ خاصا معیاری ہے۔ بالکل آغاز سے مختصر نمونہ دیکھیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

رب تمم بالخیر قال النبی علیہ السلام شرار العلماء من زار الامراء و خیر الامراء من زار العلماء نعم الامیر علی باب الفقیر و بئس الفقیر علی باب الامیر

خلقان صورت این سخن را گرفته اند که نشاید که عالم بزیارت امیر آید تا از شرور عالمان نباشد معنیش این نیست که پنداشته اند بلکه معنیش انست[2] که شر عالمان آنکس باشد که مدد از امرا گیرد و صلاح[3] و سداد او بواسطہ امرا باشد و از ترس

شر العلماء من زار الامراء و خیر الامراء من زار العلماء نعم الامیر علی باب الامیر

علماء میں سے بدترین عالم وہ ہے جو امراء کی ملاقات کو جائے اور امراء میں سے بہترین امیر وہ ہے جو عالم کی زیارت کو جائے بہتر ہے وہ امیر جو فقیر کے دروازہ پر ہو اور بدتر ہے وہ فقیر جو امیر کے دروازہ پر ہو۔

لوگوں نے اس ارشاد نبویؐ کا یہ مطلب لیا ہے کہ عالم کو کسی امیر کی زیارت کے لئے نہیں جانا چاہئے۔ تاکہ اس کا شمار بدترین علماء میں نہ ہو۔ اصل مطلب وہ نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ عالموں میں سے بدترین عالم وہ ہے جو امراء سے مدد لے۔ جس کی بہتری اور استحکام امراء کے توسط سے ہو اور جو ان کے ڈر سے اچھے کام کرے۔

مترجم نے متن کی مناسبت سے گفتار رومی کے مختلف عنوانات رکھے ہیں۔ یہ چار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں (صفحہ ۱۳ تا ۱۶) ہم بعض عنوانات اور ان کے معنوی مشمولات سے قارئین کو مطلع کر دیتے ہیں۔

ایک عنوان ہے: خودی کی اہمیت صفحہ (۳۸ تا ۴۴)، اس میں خودی کے ایک پہلو عظمت آدم کا بیان ہے۔ رومی نے انسان کے اعلیٰ و ارفع مقام کا ذکر نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ ان کے نزدیک خدا نے انسان کو جو امانت سپرد کی ہے (سورہ احزاب کی آخری آیت) وہ اس کا نفس و خودی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرم اور اپنا خلیفہ بنایا۔ دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے ہے مگر وہ خدا کے لئے مخصوص ہے کہ اس کی رضا کے مطابق اہتمام کائنات کرے۔

ظاہرش

یعنی انسان کی ظاہری صورت تو یہ ہے کہ ایک مچھر اس کا ناک میں دم کر دیتا ہے، مگر ان کا باطن افلاک سبعہ کا محیط و مرکز ہے۔

عشق اور جدوجہد، (صفحہ ۴۷ تا ۴۹) کے عنوان سے رومی نے ایک محفل میں فرمایا کہ عشق جس چیز کا بھی ہو، وہ عمل اور جدوجہد کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ عشق بے جدوجہد ایک آرزوئے نایافت ہی رہتا ہے۔ عشق شمع کی طرح پگھلنے یا پروانے کی طرح جان دے دینے کا نام ہے۔ عاشقان حق بھی وہ ہیں جو صبغۃ اللہ میں رنگ جائیں خدا فعال لمایرید ہے لہٰذا عشق حق کا تقاضا فنا نہیں، عمل ہے: وہ آدمی جو خدا کے نور سے شکیب پاتا ہے اور جدوجہد نہیں کرتا، وہ آدمی نہیں۔ جس خدا کے ادراک کا وہ سوچتا ہے، وہ خدا ہے نہیں۔ آدمی وہ ہے جو جدوجہد کے بغیر نہیں۔ جو جلال خدائی کے گرد گھومتا ہے، وہ بے آرام اور بے قرار ہی

رہتا ہے (صفحہ ۲۱)

ایک عنوان ہے "استجابت دعا خلوص پر منحصر ہے" (صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴) رومی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خلوص پر مبنی ہو' دعا طلب نے نفس کی اصلاح کر رکھی ہو اور اس کی آرزو متناقض نہ ہو۔ بالخصوص خلوص اہم ہے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے "رات طویل ہے تو سو کر اسے مختصر نہ کر اور دن گذر چکا ہے' اسے اپنے گناہوں سے مکدر و تاریک نہ کر۔" حدیث پاک میں شب بیداری اور رات کو دعائیں مانگنے کی تلقین ہے' اور اس کے ساتھ دن کو محاسبے والی زندگی بسر کرنے کی۔ جو شخص دشمن درونی (نفس) پر غالب نہ آجائے' اس کی دعا کیا پوری ہوگی۔ صالح نفس والا شخص سفلی آرزوؤں سے دل کو آلودہ نہیں کرتا۔ اس کے مقاصد اور دعائیں محدود مگر بلند ہوتی ہیں۔

ایک دوسری گفتار کا عنوان "اعلیٰ منصب کی پھانسی" ہے (صفحہ ۲۷۰۔ ۲۷۱) رومی فرماتے ہیں کہ کاموں کا برملا انجام دیا جانا کبھی عزت و احترام کی خاطر ہے اور کبھی رسوائی کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات اس لئے تخلیق فرمائی کہ اس کی ذات وصفات نمایاں تر ہوں۔ اس کے لطف و کرم سے مخلوق میں سے بعض تو عزت و تکریم کی خاطر متعارف کروائے جاتے ہیں مگر اس کے قہر و انتقام بے پناہ۔ حکام رعب و دبدبے کی خاطر دوسروں کو تختہ دار کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کی سزا سے شاید لوگ مطلع نہ ہو سکیں مگر جب حکام و ملوک خود قہر الٰہی میں ماخوذ ہوتے ہیں' تو ان کا انجام عبرت تاریخ بن جاتا ہے۔ رومی نمرود و فرعون وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ گفتار پڑھتے ہوئے رومی کے معنوی تلمیذ اقبال یاد آتے ہیں ۔

آنکس کہ بسر دارد سودائے جہانگیری
تسکین جنونش کن با نشتر چنگیزی

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

برصغیر میں مطالعہ رومی کے سلسلے میں مثنوی شریف سے زیادہ اعتنا رہا ہے اور اس کتاب کا حق بھی یہی تھا۔ دیوان کبیر کی ضخامت مثنوی کے اشعار سے دو چند ہے مگر ظاہر ہے کہ دیوان کی مسلسل غزلوں کی دل آویزی اور معنی خیزی کے باوجود اس میں حکایات نہیں جو انسانی طبائع کو بہت بھاتی ہیں۔ رومی کی دیگر سہ گانہ تصانیف یعنی یہ ملفوظات' مکتوبات اور خطابات بھی حکایات سے مزین ہیں۔ "فیہ مافیہ" (ملفوظات) کے مطالب میں جیسا کہ ارشاد ہوا' دیگر چہار گانہ کتب رومی کے ساتھ اشتراک معانی کئی مقام پر محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً" آفتاب کائنات کی توصیف کے پردے میں منبع حیات اور آفتاب حقیقی کی توصیف۔ ملفوظات رومی کے مترجم نے عربی عبارات و اشعار کا اردو ترجمہ دے دیا مگر فارسی اشعار متن میں ہوں کہ حواشی میں' انہیں بے ترجمہ ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ راقم کے خیال میں اب فارسی کے اشعار بھی بے ترجمہ نقل کر دینے سے چند افراد کو ہی فائدہ مل سکتا ہے مترجم نے گفتار رومی کی توضیح میں ان کے اور دیگر شعراء جیسے سنائی اور عطار کے اشعار نقل کئے ہیں "ملفوظات رومی" ایک علمی کتاب ہے فکر رومی سے اعتنا کرنے والوں اور علوم اسلامیہ سے وابستہ افراد کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے اور عام تعلیم یافتہ افراد کے لئے اس کے اکثر مطالب لائق توجہ ہوں گے۔ امید ہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور اس کی اشاعت جاری رکھے گا۔ کوئی دوسرے صاحب علم اس کے متن پر اگر ایک ناقدانہ نظر ڈالیں اور اس کا اشاریہ بھی بن جائے' تو یہ کتاب مفید تر ہو سکتی ہے۔

شہر بدر

کتاب	:	شہر بدر (شعری مجموعہ)
مولف	:	اکبر حمیدی
سال اشاعت	:	۱۹۹۱ء
ناشر	:	تجدید اشاعت گھر ۷۔ ڈی فیصل ٹاؤن، لاہور، ۲۰۶، جی ۱/۱۰، اسلام آباد
قیمت	:	۱۰۰/- روپے

اکبر حمیدی ایک غزل گو شاعر اور ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے پاکستان کے جانے پہچانے اہل قلم میں سے ہیں۔ زیر بحث کتاب ان کی غزلوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔

اکبر حمیدی پیشے کے اعتبار سے معلم، مزاج کے اعتبار سے وسیع المشرب اور اپنی تخلیقی کارکردگی کے اعتبار سے مبصر حیات واقع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ کلام بھی ان کے انسانی اوصاف اور ان کی فکری خصوصیات کی عکاسی کر رہا ہے۔ انہیں انسان پرست انسان پسند ہیں بلکہ عزیز ہیں۔ وہ کسی کو فرقہ وارانہ مذہب و مسلک کی بنا پر نہیں چاہتے بلکہ صرف اس کے کردار و اعمال کی اچھائی کی بنا پر چاہتے ہیں، خواہ وہ محض ان کے جماعتی مذہب و مسلک کے اعتبار سے کافر ہی کیوں نہ ہو۔

انسانوں کا درد ہے جس کے سینے میں
وہ میرا دلدار ہے مجھ کو پیارا ہے
کافر ہو یا مومن، اس سے کیا مطلب
جو بھی خوش کردار ہے مجھ کو پیارا ہے

ممکن ہے یہ اشعار بہت اچھے نہ ہوں لیکن ان میں جو بات کہی گئی ہے وہ بجائے خود بہت اہم ہے۔ یوں تو کہنے کو خود مذاہب عالم میں خوش کرداری ہی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن عملی زندگی میں مذاہب کا اثر یوں کارفرما رہا ہے کہ جو لوگ اپنے مذہب کے ہیں وہ دوسروں سے بہر حال بہتر ہیں۔ انسانی ہمدردی خانوں میں بٹ گئی ہے۔ ہمدردی، مروت، محبت، احسان سب کچھ پہلے اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ۔ اس کے بعد کسی اور کے ساتھ۔ مذہب دنیا میں اولین رشتہ اتحاد رہا ہے پھر چونکہ ہر مذہب کے لوگ

دوسرے مذہب کے لوگوں سے برسرپیکار رہے ہیں اس لئے ہر مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کے لوگوں کو نفرت اور تعصب ہی کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں۔ مذاہب عالم نے انسانی اقدار کو فروغ دینے میں جس قدر بھی حصہ لیا ہو لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اقوام عالم میں مختلف تناسب کے ساتھ جو نراجی جنون پایا جاتا ہے وہ بھی مذہب ہی کے راستے سے آیا ہے۔ اسی لئے یورپ اور امریکہ کی آبادی کا بڑا حصہ مذاہب سے برگشتہ نظر آتا ہے۔ وہاں Humanism کی تحریک کے فروغ میں اس صورت حال کو بڑا دخل رہا ہے یہ تحریک اب ایشیا کے نوجوان ذہنوں کو بھی متاثر کرتی جا رہی ہے۔ نوجوان ذہنوں سے مراد تمام نوجوان ذہن نہیں ۔ بہت سے نوجوان اب بھی متعدد مذہبی جماعتوں میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ جیو اور جینے دو" کے اتنے قائل نہیں جتنے کہ خود شہید ہو جانے اور دوسروں کو جہنم رسید کر دینے کے قائل ہیں۔

لیکن انسانی صورت حالات کا ایک بنیادی (inherent) المیہ یہ ہے کہ اس کے بہت سے مقاصد کا حصول خون بہنے اور بہانے ہی پر منحصر ہے۔ اکبر حمیدی کا شعور اس المیے سے بے خبر نہیں ۔

بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہو گا
ظلم ۔ سہنے سے کچھ نہیں ہو گا
خون بہنے سے کچھ بہے تو بہے
اشک بہنے سے کچھ نہیں ہو گا

غرضیکہ انسان سے زندگی کے جو مطالبات ہیں وہ متضاد ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ مجبوراً حافظ کا یہ شعر پڑھ کر تھوڑی بہت تسلی حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا ۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

نتیجہ ؟ انسانی تاریخ انسان کی ناگزیر ناکامیوں سے بھری ہوئی ہے۔ انسانی صورت حالات پر اظہار اندوہ جتنا بھی کیا جائے اس کی اصلاح ممکن نہیں۔ ایسے میں شاعر کا فریضہ یہی رہ جاتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے رنگین حقائق سے لے کر سنگین حقائق تک کی نشاندہی کرتا چلا جائے۔ اکبر حمیدی بھی اپنی شاعری میں یہی فریضہ بقدر بساط انجام دے رہے ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھئے ۔

اتنی تحقیر نہ کر دنیا کی
زندگی ہے تو یہاں رہنا ہے

اپنی نظروں سے گروں کیونکر بھلا
یہ مسلماں ہیں تو میں کافر بھلا

کافر ہوں تو کافر سا ہے کردار بھی میرا
مومن ہے تو مومن سا وہ کردار دکھائے

خاموشی جرم ہے جب منہ میں زبان ہو اکبر
کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

وطن کے اہل قلم بھی عجیب ہیں اکبر
جلا رہے ہیں دیئے آندھیوں کی بستی میں

زیست پہلے بھی تھی کٹھن لیکن
اب ہے جینا محال لوگوں کا

ایک حالت رہی سدا قائم
اوج ان کا زوال لوگوں کا

نامرادانہ زیست کرتے رہے
بس یہی ہے کمال لوگوں کا

مجموعی طور پر زیر تبصرہ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر حمیدی کی انفرادیت کے نقوش نکھرتے جا رہے ہیں۔ ان کی سادگی میں پہلو داری آتی جا رہی ہے ان کے کچھ نہ کہنے میں بہت کچھ کہہ جانے کے پہلو ابھرتے جا رہے ہیں۔ ان کے لہجے کی کاٹ کہیں کہیں یگانہ چنگیزی کی یاد دلا رہی ہے۔ البتہ انہوں نے چنگیزیت سے اپنی زندگی اور شاعری دونوں کو بچائے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اس طرح کے شعر بھی مل جاتے ہیں۔

یہ سوچ کر کبھی ترک وفا نہیں کرتا
کہ بے وفا کو بہت اعتبار ہے مجھ پر

جیسے ہم پیدا ہوئے تسخیر ہونے کے لئے
آنکھ اٹھا کر جس نے دیکھا ہم مسخر ہو گئے

عجب ہنستی ہوئی آنکھیں ہیں اس کی
ہمیں وہ خوش نظر اچھا لگا ہے

ایسا لگتا ہے کہ چھوٹی بحروں اور بیان کی معنی خیز (pregnant) سادگی سے اکبر حمیدی کی طبیعت کو خاص لگاؤ ہے۔

مجھے لکھو وہاں کیا ہو رہا ہے — یہاں تو پھر تماشا ہو رہا ہے
یہ باتیں آپ مانیں یا نہ مانیں — حقیقت ہے کہ ایسا ہو رہا ہے

برے شعر کس شاعر کے ہاں نہیں ہوتے؟ اصل سوال یہ ہے کہ کچھ اچھے شعر بھی ہیں یا نہیں؟ سو اکبر حمیدی کی شاعری اچھے اشعار سے خالی نہیں "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

ظہیر صدیقی

عذاب شہرپناہ

کتاب : عذاب شہرپناہ
مصنف : انور زاہدی
سال اشاعت : ١٩٩١ء
صفحات : ٢٦٩
قیمت : ١٣٠روپے
ملنے کا پتہ : پوسٹ بکس ٢٣٢٠، اسلام آباد

انور زاہدی اردو ادب کے قارئین کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔۔۔ (١) دریچوں میں ہوا۔۔۔۔ جدید فارسی شاعری (ترجمہ) (٢) سنہرے دنوں کی شاعری (نظمیں) بارشوں کا موسم۔۔۔۔۔ ہرمن ہسے (ترجمہ)۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین رسالوں میں آ چکے ہیں۔ وہ ایک کثیر الجہت صاحب قلم ہیں۔ نثر و نظم دونوں سے ان کی دلچسپی مساوی ہے۔ اردو میں ان کی حیثیت ایک اہل زبان کی ہے۔ فارسی پر قدرت اتنی ہے کہ انہوں نے فارسی کے جدید شعرا کی نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ انگریزی پر بھی انہیں اتنا عبور حاصل ہے کہ وہ صرف مغربی ادب کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ انہیں جو چیزیں زیادہ پسند آجاتی ہیں ان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ چنانچہ ہرمن ہسے کی ایک کتاب کاترجمہ شائع کر چکے ہیں اور پابلو نرودا کی خود نوشت کا ترجمہ شائع کرنے والے ہیں۔

انور زاہدی کی طبیعت کا جھکاؤ کلاسیکی ادب سے زیادہ جدید ادب کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "عذاب شہر پناہ" حقیقت نگاری سے زیادہ علامت نگاری کا ترجمان ہے۔ ان کے افسانوں میں علامت نگاری کا دھندلاپن تو ہے لیکن وہ ابہام نہیں ہے جس کی وجہ سے علامت نگاری قارئین کے لیے ایک آزمائش بن گئی اور ادب سے قارئین کا رشتہ ٹوٹنے کے قریب آگیا۔

انور زاہدی کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ کم سے کم لفظوں اور کم سے کم اسپیس میں کہہ دیتے ہیں۔ ان کی مختصر نویسی عہد حاضر کی نہایت معروف زندگی کے تقاضے کے مطابق ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عہد حاضر کی نہایت معروف زندگی کے باوجود امریکہ کے جدید ناول نگاروں کے ناول نہایت ضخیم ہوتے ہیں۔ شاید وہ ناول امریکی ناول نگاروں کی خوش حالی اور فارغ نشینی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ کسی فن پارے کا طویل یا مختصر ہونا غالباً فن کے تقاضوں کا اتنا آئینہ دار نہیں ہوتا جتنا فن

کار کے فیصلے یا مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فن کار اگر چاہے تو معمولی سے معمولی واقعے کو صفحوں میں پھیلا سکتا ہے اور اگر چاہے تو صفحوں کو سطروں میں سمیٹ سکتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں فن کارانہ کمال کا ثبوت ہیں لیکن انسانی زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں کا تقاضا یہی ہے کہ اب صفحوں کو سطروں میں سمیٹنے کے آرٹ کو ترجیح دی جائے۔

انور زاہدی جدید افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے افسانے میں کہانی اور کردار نگاری دونوں ہی سے منہ موڑ لیا۔ اس نسل کے افسانوں کو فیبل کہا جائے یا فینٹیسیا یا کچھ اور اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ شاید یہ نسل مصوری کے ایک جدید مکتب کی طرح حقیقت کی عکاسی کی بجائے حقیقت کو دیکھنے والے کے تاثر کی ترجمانی کو اپنا فن کارانہ فرض سمجھتی ہے۔

انور زاہدی کے افسانوں کا موضوعاتی دائرہ (range) خاصا وسیع ہے۔ اس میں تقسیم ہند کے ہولناک نتائج سے لے کر وطن پاک میں خواتین کے برہنہ جلوس کے شرمناک سانحے تک کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ان کے افسانوں کا مرکزی موضوع جدید انسان کا المیہ ہے۔ جدید انسان کی ذات کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہے' اس کی شخصیت کتنی بکھری ہوئی شخصیت ہے' اس کے انتشار میں کتنا کرب اور اس کے کرب میں کتنا سوز ہے' اس کا وجود کس حد تک معنی سے اور اس کی کائنات کس طرح معنویت سے خالی ہو گئی ہے اگر آپ کو ان باتوں سے دلچسپی ہو تو انور زاہدی کے افسانوں کو پڑھنا نہ بھولئے۔ یہ افسانے ہماری آپ کی روز مرہ زندگی سے شروع ہوتے ہیں لیکن بہت جلد احساس دلانے لگتے ہیں کہ ان میں روزمرہ بہت جلد خلاف معمول اور ایبنورمل واقعات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور زندگی ایک Surrealistic جہت اختیار کر لیتی ہے۔ کچھ مثالیں دیکھتے چلئے:۔

"جناب یہاں انکوائری آفس کا کچھ پتہ ہے آپ کو کدھر ہے"

"انکوائری آفس ---- وہ تو صدیوں سے بند پڑا ہے' اور ویسے بھی اب اس کی ضرورت ہی کیا ہے' ایک ہی جیسے موسم میں بھلا کس قسم کی معلومات کی جا سکتی ہیں" کسی اور نے جواب دیا میں کچھ دیر چپ کھڑا رہا' پھر پوچھ بیٹھا

> "جناب آپ کہاں کا ٹکٹ لینے کے لیے یہاں کھڑے ہیں؟"
> یہ ٹکٹ دینے والے سے جا کر پوچھو" اندھیرے میں جیسے کسی نے میرے منہ پر گھونسا مار دیا ہو میری سوچ کی صلاحیتیں آہستہ آہستہ منجمد ہوتی جا رہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر یہ کیا سلسلہ ہے اتنے سخت اندھیرے کے باوجود یہ سب لوگ ٹکٹ لینے پر کیوں مصر ہیں اور نجانے کب سے یہاں کھڑے ہوئے ہیں باوجود اس کے کہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسے کہاں جانا ہے اور درحقیقت اس کا تو خود مجھے بھی علم نہ تھا کہ میری منزل کہاں ہے؟"

(اندھیرے موسموں کا سفر)

> اندر باہر ہر طرف ڈر کا مہیب سناٹا اپنی بانہیں کھولے کھڑا ہے اور آسمان پر تاریک بادلوں کے دیو گرج رہے ہیں۔ پہاڑوں پر ٹنوں برف پڑ چکی ہے۔ تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں اور میدان ژالہ باری کی زد میں ہیں۔۔۔ چنبیلی کی بیل میں موجود ننھی

چڑیا اپنا گھونسلہ چھوڑ کر اڑ گئی ہے ---- صحن کھلیں اور سوکھے ہوئے پھولوں
سے اٹے پڑے ہیں گھر کرنوں کو ترس گئے ہیں ---- سرد ہوا چل رہی ہے

(صبح ہوئی)

اندھیرے کا چرخہ چلتا رہتا اور انگلیوں کی پوروں میں زخموں کے پھول کھلنے شروع ہو جاتے۔ ایک ایک کر کے پوریں گرنے لگتیں' لیکن اندھیرے کے چرخے پر ساعتوں کے سوت کی کتائی ختم نہیں ہو پاتی اور جونہی کسی بھی لمحے اس اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کے پانیوں میں نیند کے بادل اترتے' اندھیرے کے چرخے کی گھر گھر رک جاتی اور آنکھوں کے بے جان پتھروں کے سامنے پورا شہر روشنی میں نمایاں نظر آتا' شہر پناہ پر سجے ہوئے کانسی کے بتوں جیسے چوب دار نقاروں کے سامنے استادہ نظر آتے۔

(عذاب شہر پناہ)

کہتے ہیں کہ بارش سے حشرات الارض زمین میں سے باہر نکل آتے ہیں اور پھر زمین انسانوں کے قابل نہیں رہتی

موسلا دھار برستی ہوئی بارش میں اس نے گھبرا کر گھر کی طرف واپس جانا چاہا لیکن سمت کا تعین مشکل تھا اور واپسی کا رستہ مسدود...... گھوڑا اسے چھوڑ کر کب کا بھاگ گیا تھا۔ بس بارش ہوئے جا رہی تھی اور شاید اب اسکی باری تھی۔

(بارش)

انور زاہدی ترجمے تو ہرمن ہیسے اور پابلو نرودا کے کرتے رہے ہیں لیکن اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو ان پر سایہ کافکا کا ہے کیونکہ ان کے بیشتر افسانوں میں فضا کا فکا کی پائی جاتی ہے جس میں بلیغ رمزیت اور گمبھیر پراسراریت دونوں عناصر موجود ہوتے ہیں۔

آج سے بہت پہلے جب لینن کے زمانے میں اشتراکیت اپنے عروج پر تھی لینن نے ادیب کو انسانی روح کا انجینئر قرار دیا تھا۔ اشتراکیت کا کارواں خوش امید لوگوں کا کارواں تھا۔ انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ بیسویں صدی کے نویں عشرے میں انسانی روح اور اس کے انجینئروں پر کیا کچھ گزرنے والی ہے۔ البتہ ترقی پسند مصنفین جن ادیبوں اور شاعروں کو بیمار روح کا مالک کہتے تھے وہ اس حد تک انسانی روحوں کے معالج ضرور تھے کہ اگر وہ انسان کی بیمار روح کے علاج پر قادر نہ تھے تو کم از کم اس کے امراض کی تشخیص کے ماہر ضرور تھے۔ اتفاق سے انور زاہدی پیشے کے اعتبار سے معالج ہی واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ایک ایسے معالج جو اپنے بعض افسانوں میں خود مریض نظر آتے ہیں۔ معالج کا مریض نظر آنا بھی عہد حاضر کے انسان کی ایک صحیح اور معنی خیز تشخیص ہے۔ اشتراکی ادب نے صحت مند ادب پر اتنا زور دیا کہ اشتراکیت پسند ادیب انسان کی علالت سے انکار ہی کو اس کی صحت مندی پر محمول کرنے لگے۔ انسان جسمانی طور پر جتنا بھی صحت مند نظر آئے روحانی سطح پر ہمیشہ بیمار ہی رہا ہے خصوصاً بیسویں صدی کا انسان۔ انور زاہدی کی یہ کتاب میرے اس برے تاثر کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔

افسانوں کے اس مجموعے میں انسان کو بڑی حد تک معذور اور مفلوج دکھایا گیا ہے۔ انور زاہدی کا انسان اپنے معاشرے کے ظلم اور زیادتی کے خلاف نہ تو نعرہ زن ہے نہ نعرہ زدہ۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے

کہ اس میں انقلاب کا حوصلہ تو ایک طرف' احتجاج کی طاقت تک نہیں ہے۔ اسکے باوجود انور زاہدی Establishment کے طرفدار نظر نہیں آتے۔ ان کے افسانوں کا ہر صفحہ دن کو دن اور رات کو رات کہتا نظر آتا ہے۔ روشنی اور تاریکی کے فرق کا یہ احساس بھی اس کتاب کاایک خوش آئند پہلو ہے۔

ڈاکٹر انور زاہدی کو اردو کے اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں خوش آمدید کہتے ہوئے مسرت ہونی چاہیے۔ انکی انفرادیت میں استواری اور ان کے فن میں بالیدگی کے امکانات واضح ہیں۔

عظیم تنذی

نصف النہار

کتاب	:	نصف النہار
مصنف	:	انور جمال
ناشر	:	بیکن بکس، گلگشت، ملتان
سال اشاعت	:	۱۹۹۱ء
صفحات	:	۲۴۰
قیمت	:	۷۵ روپے

صدیوں پہلے حضرت بایزید بسطامی نے فرمایا تھا
"دنیا میں تلاش کے باوجود مجھے چار چیزیں نہ ملیں
"طاعت بے ریا، یار موافق، عالم بے طمع اور لقمۂ حلال۔۔۔"

بزرگ کی یہ بات اس دور میں بھی درست لگتی ہے۔ آج بھی یہ چار چیزیں عنقا ہیں۔ اسی لئے آج کا معاشرہ عدل اور اعتدال کی راہ سے ہٹ چکا ہے اور عدل کے ناپید ہونے نے آشوب روزگار کو جنم دیا ہے۔ تاریخ ادب گواہ ہے کہ زمانہ پر آشوب ہو تو ہر زمین، ہر زمان اور ہر زبان کا حساس تخلیق کار شہر آشوب نظم کرتا ہے، اہل علم جانتے ہیں اردو ادب میں شہر آشوب لکھنے والے زیادہ تر اعلیٰ پائے کے شاعر گذرے ہیں دراصل شہر آشوب لکھنا غیر معمولی کام ہے اور اسے لکھنے والا عام شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ وجہ یہ کہ شہر آشوب لکھنے والے کے لئے جہاں مصلحت اور تحریص سے پاک قلب و ذہن، تنقیدی نگاہ، ولولۂ اصلاح اور جرات اظہار کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اعلیٰ تخلیقی شعور اور ارفع فنی صلاحیت بھی اس کی ذات کا لازمہ ٹھہرتے ہیں۔ تخلیق کا رفیع درجہ شہر آشوب کو، قارئین کے لئے پر کشش اور پر اثر بنا دیتا ہے۔ شاعر معیار تخلیق کے اعتبار سے بڑا نہ ہو تو شہر آشوب کیتھارسس، طنز و تضحیک، طعن و تشنیع اور نکتہ چینی کے درجے سے اوپر کبھی نہیں اٹھ پاتا اور سنجیدہ ذہن اسے شعر و ادب کے زمرے سے فوراً خارج کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہر آشوب لکھنے کا حق صرف بڑا شاعر ہی ادا کر سکتا ہے۔

انور جمال کے شعری مجموعے "نصف النہار" کے غائر مطالعہ سے مجھے یہ قوی تاثر ملا کہ یہ غزلوں کا مجموعہ نہیں، ایک نظم مسلسل بلکہ شہر آشوب ہے جو کرب ذات سے شروع ہو کر سماجی اقدار کے نوحے پر ختم ہوتا ہے۔ انور جمال جیسا توانا شاعر جب شہر آشوب نظم کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اس نے قاری کے سامنے جام جمشید رکھ دیا ہے جس میں وہ خود موجودہ دور کی ہولناکیاں اور سفاکیاں دیکھنے کے ساتھ ساتھ آنے

واسطے دور کی ویرانیوں کا تماشا بھی کر سکتا ہے۔ اس سے شاعر کا مقصد محض اپنی انا کی تسکین یا نفس کا تتمہ نہیں بلکہ اپنی تخلیقی شخصیت کا ترفع ہے۔ اس ترفع کے وسیلے سے شاعر نے انقلاب اور اصلاح احوال کی کوشش بھی کی ہے اور اسی صفت نے "نصف النہار" کی غزلوں کو بلند آہنگ اور باوقار بھی بنایا ہے۔

وہ شخص یقیناً کوئی اوتار ہے انور
اس شہر پر آشوب میں عزت سے جو جی لے

میں کلک غم سے جو دور حاضر کا نوحہ تالیف کر رہا ہوں
ادب کی تاریخ کا صحیفہ ہے اس کے بین السطور سچ ہے

ایسے آشوب سے گذرے کہ یہاں مشکل ہے
لمحے لمحے کی زباں مرثیہ خوانی مانگے

الفاظ کو مفہوم سے محروم کیا جائے
اس عہد کے آشوب کو منظوم کیا جائے

"نصف النہار" کا شاعر جب اپنی ذات کے آشوب کو منظوم کرتا ہے تو بڑے اہتمام سے انور حسین بھٹی اور انور جمال یعنی شخص اور شاعر دونوں کے آشوب کو الگ الگ رقم کرتا ہے۔ اس طرح جہاں آشوب ذات کی شدت دگنی ہو جاتی ہے' وہاں عدل سے عاری ماحول کی تصویر چیختے رنگوں میں غزل کے کینوس پر ابھر آتی ہے۔ اس طرح "آگ اور پانی" "اندھیرے اور اجالے" "چاہنے اور ہونے" ایسی متضاد کیفیتوں کا یہ کھیل انور جمال کی غزل کی معنویت اور دلچسپی میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ انور حسین بھٹی ایک ایسے سادہ دل مخلص اور وفا پیشہ شخص کا نام ہے جس کی خواہش ہے ۔

اے میرے رزاق مجھ کو وہ کمائی چاہیے	جس سے میرے خوں میں پیدا ہو' شرافت کی مہک
اس قدر آئینۂ دل کی صفائی چاہیے	منعکس ہو جائیں انسانوں کے دکھ' جذبۂ خیال

انور حسین بھٹی وہ محنتی شخص ہے جس نے اپنے تیشۂ ہمت سے حالات کے ستون پر ساری عمر ضربیں لگائیں' تب کہیں جاکر اسے عزت و شہرت کی "جوئے شیر" نظر آئی۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ اس کے "اپنے" کمین گاہوں میں بیٹھے اس کی وفا' اس کے خلوص پر تیر آزما رہے ہیں۔ اس کے "دوست" اس کی سادہ دلی اور راست گوئی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اسے جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی متاع آبرو کا سودا سربازار ہو رہا ہے تو اس کی ذات کے پر آشوب گنبد سے دل دوز صدا بلند ہوتی ہے

قیمتوں کی زد میں ہوں اے میرے پروردگار — جل رہی ہے کہ کبھی پانیوں سا عالم چاہئے
پھر سازشیں کتنی ہیں کی، میرے بھائیوں میں ہیں — کیا پھر ہلے گا مہر کا پلڑا کوئی تو

حد یہ ہے کہ غیروں نے مجھے آکے سنبھالا — جس وقت میں احباب کی ٹھوکر سے گرا ہوں
اس میر میں خوشبو ہے مرے اپنے بدن کی — کس شخص نے پھینکا ہے یہ معلوم کیا جائے
ہم نے جس شخص کو توقیر شناسائی دی — اس نے خوش ہو کے ہمیں عزت رسوائی دی
ساری دنیا نے ہمارے لئے سوچی ظلمت — ساری دنیا کے لئے ہم نے اجالا سوچا
اپنے بد خواہ کو بھی ہم نے دعائیں دی ہیں — تشنگی جس نے دی، اس کے لئے دریا سوچا

انور جمال کی تخلیقی ذات کا آشوب آج کے حساس شاعر کی روح کا کرب ہے۔ لیلائے سخن کے محمل تک رسائی کے لئے شاعر نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی لیکن اسے متاع زیست دے کر کیا ملا؟ اسے تخلیق شعر اور ریاضت فن سے کیا حاصل ہوا؟ انور جمال کا شعری عقیدہ بہت واضح ہے جب وہ کہتا ہے

اول تو آگہی کے دریچوں کو بند رکھ — لازم ہے سوچنا ہی تو پھر انقلاب سوچ
اسی لئے مجھے شاعر کہا گیا انور — کہ اس زمیں کے لئے انقلاب مانگتا ہوں
پت جھڑ میں فصل گل کا قصیدہ نہیں لکھا — ہم نے کبھی سراب کو دریا نہیں لکھا
اس اعتبار حسن بصارت کی داد دے — منظر جو آنکھ سے نہیں دیکھا، نہیں لکھا

اس راسخ اور راست عقیدے پر عامل شاعر جب ایک طویل تخلیقی سفر کے بعد منزل پر پہنچتا ہے تو اسے سکھ کی دیوی نہیں، دل آزاری کے عفریت دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں شاعر کی شخصیت کے گرد شہرت کا ہالہ دھندلا جاتا ہے اور شاعری کے صحن میں چٹکی ہوئی عزت کی چاندنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ تشکیک اور تذبذب کی اس کیفیت میں شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

بہتر تھا کہ ہم صاحب دستار نہ ہوتے — رسوا تو کم از کم سر بازار نہ ہوتے
سمجھوتہ اگر ہم نے کیا ہوتا، ہوا سے — صحرا کی طرح بے در و دیوار نہ ہوتے
رہ ذوق جستجو میں یہ خطا ہوئی ہے مجھ سے — کہ سفید کاغذوں سے میں نے آگہی طلب کی
میرے عہد کے دانش ور کی حالت دیکھنے والی ہے — پلکوں میں جل تھل سوچوں کے، سر پر بوجھ کتابوں کا

انور جمال کے ذہن میں جس طرح اپنی ذات کی تکمیل کا ایک خاکہ موجود ہے، اسی طرح اس کی لوح دل پر اعلیٰ اقدار سے آراستہ، مطمئن معاشرے کا نقش بھی کندہ ہے۔ ایسا سماج جس میں مذہب اور کلچر کے نام پر عوام کو لوٹنے والے نہ ہوں۔ جہاں انسانی اقدار کی شہ رگ پر خنجر چلانے والے نہ ہوں۔ جہاں دوستی کو غرض کی میزان میں نہ تولا جاتا ہو۔ جہاں مخلص اور روادار شخص کو پاگل کے لقب سے نہ نوازا جاتا ہو۔ انور جمال اپنے معاشرے کو دین فطرت کے تابع دیکھنا چاہتا ہے اس لئے کہ وہ انسان کو افضل اور انسانی معاشرے کو اشرف دیکھنے کی شدید خواہش رکھتا ہے انور جمال کے ذہن میں مثالی معاشرے کا نقشہ واضح ہے۔

کھلا جاتا ہے خود احساس اپنے اصل کی جانب — ہر اک اسی حسن کی فطرت ہے خدا سے رابطہ رکھنا
کچھ کچھ اور بھی وہ جالی ہے گردوں کی بلند — جب بھی کوئی کسی فرعون کو رب جانتا ہے
ہاتھ میں انساں کے ہے نبض مہ و انجم تو کیا — مفلسوں کے دل کی دھڑکن تک رسائی چاہیے
جھک کے مل خاک نشینوں سے کہ ان لوگوں نے — ٹھوکریں کھا کے تجھے شوکت داراں دی
خواہش ہے گر خدا کی تو بندے تلاش کر — خدا کی جستجو ہے تو رستے تلاش کر
چاند تک کو جانے والو دل پہلے تسخیر کرو — ہر انسان کے دل کے اندر ایک خدائی ہوتی ہے

انور جمال معاشرے کے بارے میں اپنے تصور اور حقیقت کے درمیان گہری خلیج دیکھتا ہے جب اپنی خواہش اور حاضر و موجود کو دو انتہاؤں کے روپ میں دیکھتا ہے۔ جب معاشرے میں عدل کی جگہ ظلم اور امن کی جگہ فساد دیکھتا ہے۔ جب چاروں طرف مکر و فریب کا جال بچھا دیکھتا ہے تو مضطرب ہو کر آشوب روزگار لکھتا ہے۔ اس شہر آشوب کی زد میں محبوب مقصود، دوست دشمن، تقدیر تدبیر، روایات اقدار، رسم رواج، تاریخ ثقافت سب آجاتے ہیں۔ جب وہ تضاد اور نفاق کے اس جہاں میں خود کو لاچار اور بے اماں پاتا ہے تو چلا اٹھتا ہے:

عجب ضدیں ہوگئی ہیں باہم، سراب لکھنا، چناب کہنا
اسی کو دل سے برا سمجھنا اسی کو عزت ماب کہنا
سفید، بے صوت، بے معانی سمجھنا لکھے کتابچوں کو
خموش، ویران، کورے رخ کو کہانیوں کی کتاب کہنا

عجب تضادوں کی کیفیت ہے، دلوں میں شعلے، لبوں پہ خوشبو
سکھایا چہروں کو کس نے یہ فن حقیقتوں سے مجاز ہوتا
یہ زرد دھاتوں کا دور ہے، یاں گلاب سوچوں کی کیا ضرورت
کوئی دلیلوں سے کر دے ثابت بدن پہ سر کا جواز ہوتا

چپ رہیں دیکھ کے گر، سنگ اٹھاتا ہے ضمیر — منجمد ہونے کا خدشہ ہے اگر بولتے ہیں
حبس جس وقت وریدوں میں سرایت کر جائے — ہم نے دیکھا ہے کہ پھر دار پہ سر بولتے ہیں
جانے کس خوف سے ساکت نہیں ہوتا ماحول — رات سو جائے تو بستی کے شجر بولتے ہیں
اے قاسم اشیاء تیری تقسیم عجب ہے — دستار انہیں دی ہے جو سر ہی نہیں رکھتے
جینے کا یہی اب تو سلیقہ ہے کہ انسان — آنکھیں تو کھلی رکھے مگر ہونٹوں کو سی لے
اصحاب فیل بھی ہیں، مگر ابرہہ کے بعد — برسے نہ آسمان سے کنکر زمین پر
یونہی رہا تو بانگ سرافیل کے بغیر — برپا کرے گا آدمی محشر زمین پر

میں نے صرف کتاب زاہد اور کتاب روزگار کے حوالے سے "نصف باشد" کی [illegible]
اور تحسین کی کوشش کی ہے۔ ان غزلوں کی روح تک پہنچنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ [illegible]
آپ ان غزلوں کے باطن میں اترنے کے لئے جو بھی جہت' جو بھی راستہ اختیار کریں گے آپ کے [illegible]
آپ کی آگہی کی تشفی ہو گی' اس لئے کہ انور جمال اس دور کا ممتاز شاعر ہے اور اس کا لکھا ہوا شعر کتاب
نہ صبح کاذب کا اندھیرا ہے اور نہ شام سیاہ کا جھٹ پٹا۔ یہاں تو ہر طرف نصف النہار کی سنہری دھوپ کھلی
ہوئی ہے۔ آسمان نیلا ہے۔ زمین کی فضا دھند سے پاک ہے۔ ایسے میں شعر کی صحیح پہچان کی راہ میں بھلا کون
سی چیز حائل ہو سکتی ہے۔

∞

سہ ماہی "ادبیات" میں جملہ ادبی اصناف میں تازہ کتابوں پر جائزے شامل کرنے پر خصوصی
توجہ دی جا رہی ہے۔ جائزے کے لئے مصنفین اور ناشرین کی طرف سے مدیر اعلیٰ کے نام ان کی
تازہ کتابوں کے دو دو نسخوں کی ترسیل ضروری ہے۔
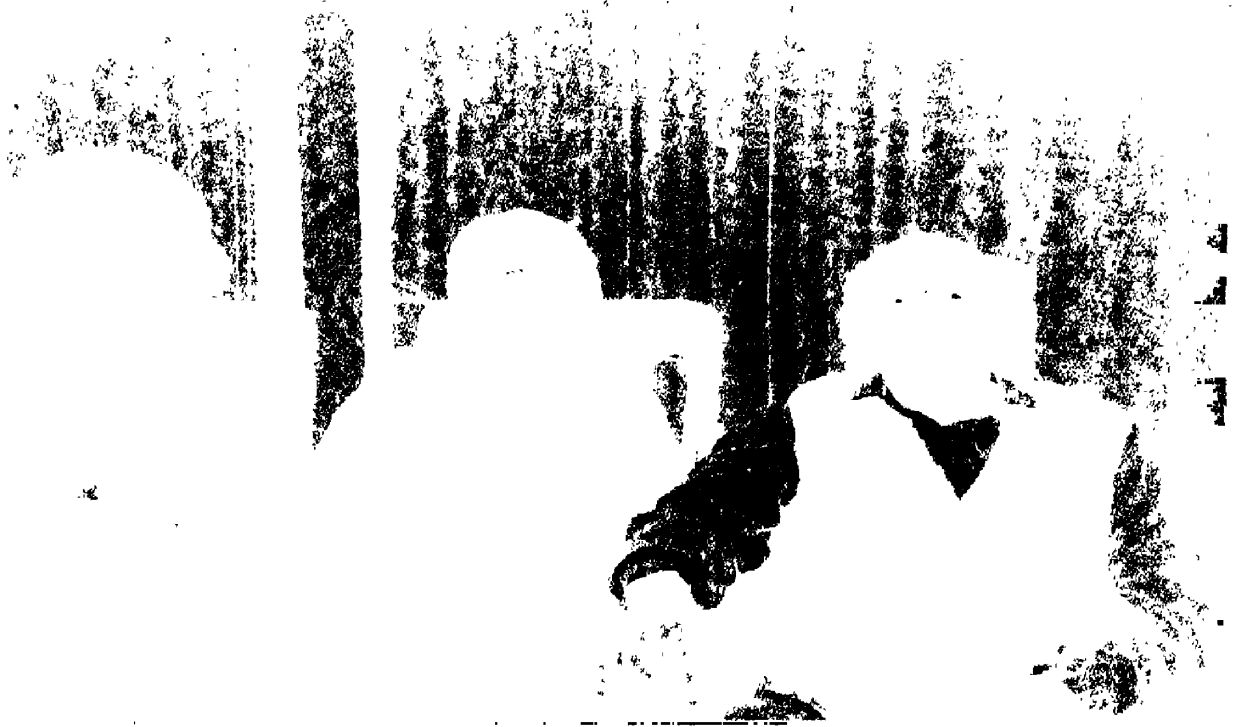
ڈاکٹر جمیل جالبی، بیگم نذیر احمد، نیلوفر اقبال

حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، جگن ناتھ آزاد، جون ایلیا اور پیرزادہ قاسم

عرفان صدیقی' شہزاد احمد' معراج فیض آبادی اور محسن بھوپالی

ڈاکٹر طاہر تونسوی' محمد افسر ساجد' ڈاکٹر سلیم اختر' محمد نواز کھچی

گفتار خیالی، بشیر احمد شبنم، ضیاء الحسن، عاصی کرنالی، فیاض تحسین، فاروق رودکوٹی، اقبال ارشد، حسین سحر اور اعظم یاد

عبداللہ جان جمالدینی اور غنی پرواز

میر تقی قوی

قلمی معاونین کے پتے

اسلم انصاری
شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج، بوسن روڈ،
ملتان۔

انجم رومانی،
۵۶۔ جہانگیر ٹاؤن، کچا سانده روڈ،
لاہور۔

(ڈاکٹر) انعام الحق کوثر،
۲-۴۷۔ اے او، بلاک ۳ سیٹلائٹ ٹاؤن،
کوئٹہ۔

(ڈاکٹر) انور زاہدی،
۱۹۱۸، گلی ۱۳ آئی ۲/۱۰،
اسلام آباد

انور محمود خالد،
شعبہ اردو گورنمنٹ کالج،
فیصل آباد۔

بشیر بیدار،
بمقام کوش قلات، براہ تربت،
مکران، بلوچستان۔

(ڈاکٹر) توصیف تبسم،
۶۸۷، گلی ۶، جی ۹/۳،
اسلام آباد

جلیل عالی،
۴۵۵، گلی ۱۶، چکلالہ سکیم نمبر ۳،
راولپنڈی کینٹ۔

جمیل یوسف،
۴۰۰/۱۴ لین نمبر ۷، پشاور روڈ
راولپنڈی

حیات شوکت،
شاہد ٹیلرز، بالمقابل، منظور میڈیکل سٹور
تربت بلوچستان۔

(ڈاکٹر) رشید امجد،
۵۵، سی، لین نمبر ۷ اے گلستان کالونی،
راولپنڈی۔

شرافت عباس،
شعبہ اردو، جامعہ بلوچستان،
کوئٹہ۔

شریف کنجاہی،
۶۱، مرغزار کالونی،
گجرات۔

شمیم احمد،
۸۱۷/۱۷، انچولی سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا،
کراچی، ۳۔

صبا دشتیاری
جامعہ بلوچستان
کوئٹہ۔

عبد الغفار چچی
ڈویژنل کمشنر
سبی

عزیز ملک،
۴۹۷، کوچہ فضل حق،
راولپنڈی صدر۔

عطا شاد،
ڈائریکٹر
آرکائیوز آف بلوچستان،
کوئٹہ۔

علی دبیک قزلباش،
فردوس میڈیکل سٹور، تحصیل روڈ،
لورالائی۔

غنی پرواز،
گورنمنٹ ڈگری کالج،
تربت بلوچستان۔

نمی طارق،
اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج،
پنجگور' بلوچستان۔

غوث بخش صابر،
۸/۲۰/۹۷' بلوچی سٹریٹ'
کوئٹہ۔

فوزیہ چودھری،
شعبہ اردو گورنمنٹ گرلز انٹر کالج
فورٹ عباس ۔ ۳۰۲۰

ماجد صدیقی،
ای۔ ۸٦۰ سکیٹر ٹو' خیابان سرسید' ڈاکخانہ پیرودھائی'
راولپنڈی

مبارک قاضی،
فشریز ڈیپارٹمنٹ'
پسنی مکران' بلوچستان ۔

محمد بیگ بلوچ،
معرفت بلوچ یوتھ' گلی نمبر ا گل محمد لائن' لیاری'
کراچی۔

(ڈاکٹر) محمد ریاض،
چیئرمین شعبہ اقبالیات' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد۔

مراد ساحر،
معرفت: آر ایس نمبر ۱۸۱۳' شاہ دوست ولیج'
پرانا گولیمار'
کراچی ۔ ۱٦

(ڈاکٹر) مرزا حامد بیگ،
اسسٹنٹ پروفیسر' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج برائے
طلباء سیٹلائٹ ٹاؤن'
راولپنڈی۔

مسعود قریشی،
این اے' ۲۴٦ سیونتھ روڈ' سیٹلائٹ ٹاؤن'
راولپنڈی۔

ممتاز مفتی،
۲۲' گلی ۳۲' ایف ٦/۱'
اسلام آباد

[illegible]
[illegible]
اسلام آباد

Dr. Munir D. Ahmad
Deutsches Orient Institute
Hamburg_13 Mittelweg 150
2000
GERMANY.

مومن بزدار،
بارتھی
ڈیرہ غازی خان۔

میر عیسیٰ قومی،
تربت مکران'
بلوچستان۔

نادر قمبرانی،
پاکستان سٹڈیز سینٹر جامعہ بلوچستان
کوئٹہ ۔

نسیم نیشوفوز،
۱۳۷' بہادر آباد'
کراچی۔

نظیر صدیقی،
۱۹۱٦' آئی ۲/۱۰
اسلام آباد

نعمت اللہ گچکی،
میڈیکل سپرنٹنڈنٹ' سول ہسپتال
کوئٹہ ۔

واحد بزدار،
نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پاکستان سٹڈیز'
قائد اعظم یونیورسٹی
اسلام آباد۔

یاسمین قاضی،
"الش محل" بروری روڈ'
کوئٹہ۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مترجم / مرتب	مجلد	پیپر بیک
۱۔	انتخاب اردو غزل (۱۹۷۶–۱۹۷۷ء)	ادارہ ۵۰ روپے		
۲۔	زینت (مرزا قلیچ بیگ کے سندھی ناول کا اردو ترجمہ)	امداد حسینی		۳۰ روپے
۳۔	مہکتے ہار (چینی نظموں کا اردو ترجمہ)	کوثر جمال	۲۵ روپے	
۴۔	ادبی تناظر (سندھی ادبی ثقافت پر مقالات)	ادارہ	۳۰ روپے	
۵۔	منتخب پاکستانی اردو افسانے (انگریزی میں)	پروفیسر احمد علی	۹۰ روپے	۷۰ روپے
۶۔	در چین (جام درک کے بلوچی کلام اردو نثری ترجمہ)	میر مٹھا خان مری	۴۰ روپے	۲۰ روپے
۷۔	در چین (جام درک کے بلوچی کلام کا پشتو ترجمہ)	حاجی پردل خٹک	۴۰ روپے	۳۰ روپے
۸۔	در چین (جام درک کے بلوچی کلام کا کا پنجابی نثری ترجمہ)	زینت قاضی	۲۰ روپے	۵۰ روپے
۹۔	کلام خوشحال خان خٹک (اردو نثری ترجمہ آٹھ جلدیں)	پریشان خٹک	۱۰۰ روپے	۷۵ روپے
۱۰۔	پیام کا باہو (کلام باہو کا اردو نثری ترجمہ)	ضمیر اظہر	۳۵ روپے	
۱۱۔	ارشادات بلھے شاہ (کلام بلھے شاہ کا اردو نثری ترجمہ)	ضمیر اظہر	۳۵ روپے	
۱۲۔	سندھی شاعری (قدیم و جدید شعراء کے کلام کا اردو نثری ترجمہ)	نیاز ہمایونی		۶۰ روپے
۱۳۔	پشتو شاعری (قدیم و جدید شعراء کے کلام کا اردو نثری ترجمہ)	حاجی پردل خٹک	۱۲۰ روپے	
۱۴۔	بھارت میں اردو (بھارتی ادیبوں کے مقالات)	ادارہ	۵۰ روپے	
۱۵۔	پشتو شاعری کی تاریخ (ایک تحقیقی جائزہ	پروفیسر پریشان خٹک		۳۵ روپے
۱۶۔	شب تاب موتی (چینی لوک کہانیوں کا اردو ترجمہ)	اعجاز احمد فاروقی		۷۰ روپے
۱۷۔	دجادو چاقو (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	قیصر علوی	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۱۸۔	طلسمی چاقو (چینی لوک کہانیوں کا اردو ترجمہ)	ڈاکٹر اقبال نسیم بیگ	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۱۹۔	دجادو مرغی (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	افضل رضا	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۰۔	طلسمی پرندہ (چینی لوک کہانیں کا اردو ترجمہ)	بہجت شبیر	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۱۔	خوزے قیسی	عبدالکافی ادیب	۶۰ روپے	۵۰ روپے
۲۲۔	دواور قوم قیسی (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	حیران خٹک	۷۰ روپے	۶۰ روپے
۲۳۔	جادو دا چاقو (چینی لوک کہانیوں کا پنجابی ترجمہ)	قیصر علوی	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۴۔	د ملغرو غلاء (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	تسنیم گلاب	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۵۔	داور قبیلے کے قصے	شمیم اکرام الحق	۷۰ روپے	۶۰ روپے
۲۶۔	پشتو لوک ادب	محمد افضل رضا	۷۰ روپے	۶۰ روپے
۲۷۔	کلام شاہ حسین (اردو نثری ترجمہ)	ضمیر اظہر ۶۰ روپے	۵۰ روپے	

۲۸۔	دیوان رحمٰن بابا (پنجابی نثری ترجمہ)	الطاف پرواز	۱۵۰ روپے	۱۲۰ روپے
۲۹۔	چادر دا پرندہ (پنجابی لوک کہانیاں)	فردوس حیدر	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۳۰۔	گل حق (شمالی علاقہ جات کی لوک کہانیاں)	مرتبہ امتیاز قزلباش		۵۰ روپے
۳۱۔	مست توکلی (چیدہ کلام سے شاعری)	الطاف پرواز	۲۰ روپے	۳۰ روپے
۳۲۔	پیر محمد کاکڑ (پشتو شاعری کا اردو ترجمہ)	عابد شاہ عابد	۸۰ روپے	۷۰ روپے
۳۳۔	سفر دوستی کا	یوان ینگ — چو منگ		۵۰ روپے
۳۴۔	رسالو ریکانی (سندھی شاعری)	شیخ محمد حسن		۳۰ روپے
۳۵۔	پنجابی ادب دا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق جاوید		۱۴۰ روپے
۳۶۔	پنجابی کتابیات (جلد اول)	ڈاکٹر شہباز ملک		۳۰۰ روپے
۳۷۔	مولانا صلاح الدین احمد — ایک مطالعہ	ڈاکٹر انور سدید	۱۲۰ روپے	
۳۸۔	یونس امرے (ترکی کے عظیم شاعر کے کلام کا اردو ترجمہ)	ڈاکٹر احمد اسرار		۷۵ روپے
۳۹۔	پاکستانی ادب ۹۰ (حصہ نثر)	رشید امجد	۲۰۰ روپے	۱۷۵ روپے
۴۰۔	پاکستانی ادب ۹۰ (حصہ نظم)	شہزاد احمد ۱۲۵ روپے	۱۰۰ روپے	
۴۱۔	سندھی لوک کہانیاں (انگریزی)	شیریں خان		۱۲۰
۴۲۔	کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء	سعیدہ درانی		۹۰ روپے
۴۳۔	جدید اردو انشائیہ	اکبر حمیدی	۸۵ روپے	۷۰ روپے
۴۴۔	اردو افسانے کی روایت	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۵۰۰ روپے	۳۵۰ روپے
۴۵۔	اردو مزاحیہ شاعری	سرفراز شاہد	۱۹۵ روپے	۱۸۰ روپے
۴۶۔	پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ	ڈاکٹر انور سدید	۱۵۰ روپے	۱۰۰ روپے
۴۷۔	ہیر وارث شاہ (اردو نثری ترجمہ حصہ اول)	پروفیسر شریف کنجاہی	۱۵۰ روپے	۱۰۰ روپے

رابطہ

سرکولیشن منیجر اکادمی ادبیات پاکستان

سیکٹر ایچ ایٹ ون اسلام آباد

ادبیات کے لئے ہمارے ایجنٹ

۱۔ گلزار نیوز ایجنسی' اخبار مارکیٹ ہسپتال
روڈ لاہور

۲۔ شیخ بک سٹال' بھوانہ بازار'
فیصل آباد

۳۔ افضل نیوز ایجنسی' چوک یادگار'
پشاور

۴۔ گوشہ ادب' سرکلر روڈ
کوئٹہ۔

۵۔ بیکن بکس گول باغ' گلگشت کالونی'
ملتان

۶۔ ملک تاج محمد' ملک نیوز ایجنسی' اخبار مارکیٹ'
راولپنڈی

۷۔ مکتبہ ہمدانی' رام دین بازار'
جہلم

۸۔ کریمی بک ہاؤس' ۴/ بالمقابل چاندنی سنیما'
حیدر آباد سندھ

۹۔ دائم اقبال اکیڈمی'
منڈی بہاؤ الدین

۱۰۔ اسلامی کتب خانہ' جدید بازار'
رحیم یار خان

۱۱۔ رحمان نیوز ایجنسی' جنگی سٹریٹ'
آئی/ ایس کابلی گیٹ' پشاور۔

۱۲۔ مسعود اختر زیب' القائم بک ڈپو' مین بازار
خوشاب

۱۳۔ نیشنل نیوز ایجنسی اسد چیمبرز گراؤنڈ فلور شمبوناتھ روڈ نزد پاسپورٹ آفس صدر
۳ کراچی

۱۴۔ مکتبہ دانیال' وکٹوریہ چیمبر نمبر ۲'
عبد اللہ ہارون روڈ' کراچی نمبر ۳۔

۱۵۔ نقش کتاب گھر ۳۸۰ ڈی سکیم نمبر ۲ سیٹلائٹ ٹاؤن
میرپور خاص (سندھ)

۱۶۔ محمد افضل راز' نیوز ایجنسی' عقب نشیمن ہوٹل
ریلوے روڈ' گجرات

۱۷۔ آزاد بک ڈپو' ۳۱۳ صدر بازار'
حیدر آباد (سندھ)

۱۸۔ فضل ربی راہی' شعیب سنز' اوصیانہ بازار' جی ٹی روڈ'
مینگورہ سوات

۱۹۔ ماڈرن بک ڈپو' عزیز شہید روڈ
سیالکوٹ۔

۲۰۔ البدر بک کارپوریشن' رنگیل چوک صدر'
نزد ریلوے پل' اوکاڑہ

۲۱۔ رحمت بک سٹال اینڈ نیوز ایجنٹ'
نزد ریلوے پل اوکاڑہ۔

۲۲۔ راجہ برادرز' متصل مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ رحیم بازار'
ڈیرہ اسماعیل خان۔

۲۳۔ مکتبہ ادب' ۳۵۳۔ پاک کالونی'
میرپور خاص (سندھ)

۲۴۔ گلشن بک ڈپو' اردو بازار
سیالکوٹ شہر۔

۲۵۔ حاجی گل بخشالوی' بخشالوی پبلشرز
اینڈ نیوز ایجنٹ' کھاریاں

۲۶۔ خالد بک سٹال' مسلم بازار'
گجرات

۲۷۔ بخاری نیوز ایجنسی' نزد گرلز ہائی سکول'
احمد پور شرقیہ۔

۲۸۔ اتحاد نیوز ایجنسی'
ایبٹ آباد

۲۹۔ شمع بک ایجنسی' بینک روڈ'
مردان

۳۰۔ پیرزادہ بک سینٹر' ایئرپورٹ روڈ'
گلگت

۳۱۔ چوہدری محمد شریف آزاد'
گجرات

مطبوعات کے ایجنٹ حضرات کی توجہ کے لئے

اکادمی کی مطبوعات کی فہرست اپنی پسندیدہ کتب سے آرڈر کی مالیت کا تعین کریں نیز اپنی قریبی بینک شاخ کا مکمل پتہ اور کتب کی ترسیل کی وضاحت کریں تاکہ بذریعہ ٹرک / ریلوے / بنک بلٹی جس میں آپ کو سہولت ہو' ارسال کی جائیں مال کی بلٹی آپ کی بنک شاخ کو ارسال کی جائے گی جہاں ادائیگی بذریعہ ڈرافٹ بنام اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد کرنے کے بعد آپ بلٹی حاصل کر سکیں گے ترسیلی اخراجات بذمہ پارٹی ہوں گے۔ فی کتاب کے آرڈر سرکولیشن منیجر کو ارسال کیئے جائیں تاکہ ان پر فور کارروائی کی جا سکے۔

اگر آپ کی دکان ہمارے صوبائی دفتر سے قریب ہے تو آپ اپنی مطلوبہ کتب وہاں کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر سے براہ راست بھی انہی شرائط پر حاصل کر سکتے ہیں جن کے پتے درج ذیل ہیں۔

کراچی

جناب آغا نور محمد پٹھان

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر

اکادمی ادبیات پاکستان

دسویں منزل' شیخ سلطان ٹرسٹ

۲۵۔ سول لائنز' کراچی

کراچی۔ (صوبہ سندھ)

فون: ۵۶۸۲۷۰۱

لاہور

جناب قاضی جاوید

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر

اکادمی ادبیات پاکستان

۲۳۰۔ گلشن بلاک' اقبال ٹاؤن

لاہور (پنجاب)

فون: ۴۳۱۲۳۷

کوئٹہ

جناب سید الطاف حسین بخاری

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر

اکادمی ادبیات پاکستان

ٹیکا نگی روڈ' بالمقابل وٹرنری ہسپتال

کوئٹہ (بلوچستان)

فون: ۷۳۱۰۱

پشاور

جناب بہزاد ابراہیم

(ریذیڈنٹ ڈائریکٹر)

اکادمی ادبیات پاکستان

مکان نمبر ۱۴۱۳ ملحقہ شوال ہوٹل

جی ٹی روڈ' پشاور شہر

پشاور۔
(صوبہ سرحد)

فون: ۲۶۰۵۰۳

شمارہ ۲۰
جلد ۵

گرما ۱۹۹۲ء

مدیر مسئول : غلام ربانی آگرو

مدیر منتظم : افتخار عارف

مدیر اعلیٰ : خالد اقبال یاسر

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

■ اشاعت کے لیے اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف صاف صاف لکھی ہوئی "مدیر اعلیٰ ادبیات، سیکٹر ایچ-۸/۱، اسلام آباد" کے پتے پر ارسال فرمائیے اور مضمون کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھیے۔

*

■ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

*

■ نگارشات کے نفسِ مضمون کی ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ اُن کی آرا کو اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

فی شمارہ -/۳۰ روپے ، سالانہ چندہ [illegible]

بیرونِ ملک

امریکہ، کینیڈا، یورپ، مشرقِ بعید، جنوبی افریقہ

فی شمارہ : ۱۰ امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ : ۴۰ امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

مشرقِ وسطیٰ، بھارت، شمالی افریقہ

فی شمارہ : ۸ امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ ۳۲ امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

ترسیل و اشتہارات : —— حمید قیصر

اہتمامِ طباعت : —— طارق شاہد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان ○ سیکٹر ایچ ۸/۱ ○ اسلام آباد

فون نمبر : ۲۵۴۵۶۷

طابع ● کرسٹل پرنٹرز، اسلام آباد ● [illegible]

مندرجات

		صفحہ نمبر
حمد	سید مشکور حسین یاد	۹
حمد	رفعت سلطان	۱۰
دعائیہ	عطیہ خلیل عرب	۱۱
نعت	کرم حیدری	۱۲
نعتیہ رباعیات	مقصود زاہدی	۱۳
نعت	ناصر شہزاد	۱۴
نعتیہ قصیدہ	انور جمال	۱۵
نعت	جلیل عالی	۱۸

افسانہ

اردو

مسئلہ حل ہو گیا ہے	میرزا ادیب	۱۹
نفسیاتی الجھن	ابو سعید قریشی	۳۰
گئے دنوں کا سراغ	الطاف فاطمہ	۳۴
نقطے سے نقطے تک	غلام الثقلین نقوی	۴۹
موتیا	رفعت مرتضٰی	۶۰
ابا جی	محمود احمد قاضی	۶۹
رفتہ کا آئندہ	یوسف چوہدری	۷۵
مٹی کے بت	عباس خان	۸۳
سیڑھیوں والا پل	حمید قیصر	۸۷

پنجابی

شام کا پہلا ستارہ	نواز	۹۵
گھر پیارا گھر	حنیف باوا	۹۹
چودہ	خیرالدین انصاری	۱۰۳

سندھی

آب حیات	غلام ربانی آگرو	۱۰۷
من اجلا تن اجلا	زینت عبداللہ چنہ	۱۱۳

پشتو

صرف شرفاء کے لیے	قلندر مومند	۱۱۷

بلوچی

ہائے غریبی	منظور بلوچ	۱۲۱

غزل

اس پر ہوائے دل کا اثر دیکھنا تو ہے	ظفر اقبال	۱۲۳
کب آئے گی آپ کی سواری	انور شعور	۱۲۴
کتاب عمر میں ہر ایک جا اداسی ہے	ریاض مجید	۱۲۵
شمار وقت نیا ہے نہ کوئی سال نیا	مسعود منور	۱۲۶
کہ "گوش ہوش کوئی" زیر آسماں بھی نہیں کیا؟	محمد خالد	۱۲۷
بن سے فصیل شہر تک کوئی سوار بھی نہیں	غلام محمد قاصر	۱۲۸
ابھی میرے جلو میں ایک ایسا آدمی ہے	غلام حسین ساجد	۱۲۹
خیال زہرہ و مریخ و مشتری تھا بہت	ستار سید	۱۳۰
قوس محراب، زماں اور مکاں	ناصر بلوچ	۱۳۱
ایک ظلمت سے نکلتا ہوا دل	جاوید احمد	۱۳۲
کشادہ رستوں کھلے جہانوں سے آ رہا ہوں	قمر رضا شہزاد	۱۳۴
طلسم شعر عجب مجھ پر وار کرتا رہا	اختر [illegible]	۱۳۵
میں کیسے قتل ہوا، منکشف نہیں ہوتا	[illegible]	۱۳۶
غبار خاک سے نکلوں گا کیا میں	[illegible]	۱۳۷

مقامِ عشق تک آپ چل کر کیوں نہیں آتا — عباس تابش — ۱۳۸
مرا عروج ہے اپنے زوال سے باہر — انجم سلیمی — ۱۳۹
ایک صورت مرے کمرے میں فقط ضو کی ہے — تصدق شعار — ۱۴۰

انشائیہ

ملاقات — غلام جیلانی اصغر — ۱۴۱

فنونِ لطیفہ

دنیائے تصویر کی تجریدی جمالیات — زوار حسین — ۱۴۵

عبدالغنی خان غنی۔ فن و شخصیت

عبدالغنی خان غنی سے گفتگو — عبدالکافی ادیب — ۱۵۱
غنی خان — غلام ربانی آگرو — ۱۶۱
پانچ نظمیں — غنی خان — ۱۶۷
ایک واقعہ (افسانہ) — غنی خان — ۱۷۳

نظم

زوال — ضیاء جالندھری — ۱۷۷
لہو لہو لمحوں کے زرتار — اختر حسین جعفری — ۱۷۸
نظم — جیلانی کامران — ۱۸۰
حرف کو حرمت دیدہ لکھ — مقبول الٰہی — ۱۸۱
میں مایوس نہیں — آفتاب اقبال شمیم — ۱۸۲
حقیقت کل — ادیب سہیل — ۱۸۶
رات کے رُوبرو — نذیر قیصر — ۱۸۷
آج کا چہرہ — محمود علی محمود — ۱۸۸
دوام وصل کا خواب — ابرار احمد — ۱۸۹
کشکول — گلزار بخاری — ۱۹۱
ابنِ آدم سے مکالمہ — محمد امین — ۱۹۳

ملاقات	محمد افسر ساجد	۳۰۰
تعلق	یاسمین حمید	۳۰۱
کالی بیک	یونس حسین	۳۰۳
ایک نظم صومالیہ کے لیے	انور زاہدی	۳۰۴
ابھی وقت ہے لوٹ جاؤ	رفیق سندیلوی	۳۰۶
لس کی تحریر جھوٹی ہے	اشرف جاوید	۳۰۷
مجھے خوشبو نے پاگل کر دیا ہے	عدنان بیگ	۳۰۹
میں گم ہو گیا ہوں	مقصود وفا	۳۱۰
شہر منحرف	محمد نذیر	۳۱۲
قسمت	خوشی محمد طارق	۳۱۴
میں تمہیں کل ملوں گا	سعید احمد	[illegible]

خود نوشت

اٹک سے وابستگی	آغا بابر	۳۱۹

فکر و نظر

کہانیاں جنہیں زندگی لکھتی ہے-۵	[illegible]	[illegible]

غزل

یہ منظر بام و در کے رہ گئے ہیں	محشر بدایونی	۳۶۳
جنونِ بے سر و ساماں بڑے شکیب میں ہے	شوکت واسطی	۳۶۴
جتنے بھی مجھ سے ملے ہیں	اختر ہوشیارپوری	۳۶۵
آ کر زباں پہ جو تخن ہو کے رہ گیا	[illegible]	۳۶۷
[illegible]	[illegible]	۳۶۸
کریں گے اپنے لہو سے گلشن کی آبیاری، سفر ہے جاری	[illegible]	۳۶۹
کیسے رفاقت کے پیاسے تھے کل میں 'رات' ہوا	[illegible]	۳۷۱
نہیں ٹھہرا بارشوں میں کسی سائباں کے نیچے	حزیں لدھیانوی	۳۷۲
اچھا رہا یا برا رہا ہوں---!	سید تابش الوری	۳۷۳

زلفِ دل کے ہیں انداز بدلے بدلے ہوئے — شہزاد احمد — ۲۷۴
دریا ساتھ چلے تو پانی ساتھ چلے — اکبر حمیدی — ۲۷۵
روشن چراغِ خونِ تمنا نیا نہیں — روحی کنجاہی — ۲۷۶
وہ ساجن ہو کے بھی ساجن نہیں ہے — شبنم شکیل — ۲۷۷
کوئی رت ادھر سے چلی گئی، کسی دوسری کا قیام ہے — جاوید شاہین — ۲۷۸
شریک سلسلۂ ماہ و سال ہو نہ سکی — شوکت کاظمی — ۲۷۹
رنگ ہی رنگ ہیں تصویر نہیں ہے کوئی — صابر ظفر — ۲۸۰
یہ جو اک عمر سے ہم فصل خزاں کاٹتے ہیں — خادم رزمی — ۲۸۱
کہو تو نام میں دیدوں اسے محبت کا — فاطمہ حسن — ۲۸۲
اس قدر بات ہے تسلیم شدہ — جان کاشمیری — ۲۸۳

تنقید و تحقیق

اقبال کا تصور عقل و عشق — ڈاکٹر این میری شمل — ۲۸۵
پطرس بخاری۔ سوانحی خاکہ — عبدالحمید اعظمی — ۲۸۹

جائزہ

ناممکن کی جستجو / حمید نسیم — نظیر صدیقی — ۳۱۳
کہتا ہوں سچ / شوکت واسطی — نظیر صدیقی — ۳۱۷
سوکھے ساون / ضمیرالدین احمد — ڈاکٹر مرزا حامد بیگ — ۳۲۰
خلف / احمد ظفر — ڈاکٹر توصیف تبسم — ۳۲۴
سنجیاں سانبیں / حسن رضا گردیزی (انگریزی ترجمہ) — علی تنہا — ۳۳۰
دریچہ دل / ناز سرحدی — انجم یوسف زئی — ۳۳۳
دکھ کا جزیرہ / اکرام تبسم — اشرف سلیم — ۳۳۶
توشہ / سید حسنین کاظمی شاد — ڈاکٹر توصیف تبسم — ۳۳۹
نقش رنگ / حزیں صدیقی — شعیب انصر — ۳۴۴
شجر ممنوعہ / منیرالدین احمد — امجد طفیل — ۳۴۶

جان پہچان

تصاویر
فلمی معاونین کے سچے

اشتر علی مرزا

سید منظور حسین یاد

حمد

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ

(اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔ سورۃ القمر آیت ۵۰)

آن ترا فرمان
آن تری پہچان

آن میں سارے زمانے گم ہیں
سارے تانے بانے گم ہیں
آن کی سب میناکاری ہے

آن کے سب مہمان
آن ترا فرمان

آن کے پیچھے ہر کوئی لاگے
آن کے پھر بھی الجھیں دھاگے
آن ہی سوئے آن ہی جاگے
آن ہی ٹھہرے آن ہی بھاگے

آن کھلا میدان
آن ترا فرمان

رفعت سلطان

حمد

یوں تو ہر جا ظہور ہے تیرا
آستاں پھر بھی دور ہے تیرا

مرہمِ زخمِ دل تری شفقت
درسِ عبرت غرور ہے تیرا

ہیں کرشمے ترے بہار و خزاں
خار و گل میں ظہور ہے تیرا

حسرتِ دید ہے عطا تیری
جلوۂ کوہِ طور ہے تیرا

صبیحہ عقیل عرب

دعائیہ

مری چھوٹی سی دنیا ہے
زمین و آسماں والے!
تو اپنی بیکراں وسعت کی دنیا میں
اکیلا ہے
مجھے اپنی زمیں پر
ایک چھوٹا سا مکاں دیدے
مکان ولا مکاں والے!
مجھے اک سائباں دیدے
مجھے میرا جہاں دیدے

کرم حیدری

نعت

مری چشمِ شوق میں جلوہ گر وہ بشر فرشتہ جمال ہے
کہ فلک پہ جس کا مثیل ہے نہ زمیں پہ جس کی مثال ہے

وہ چراغِ بیت احد کہ ہے ہمہ روشنی ہمہ زندگی
وہ مہرِ تمامِ حرم جسے نہ گہن ہے اور نہ زوال ہے

وہی نقش پرتوِ ذات کا، وہی آئینہ ہے صفات کا
وہی مبتدائے جمال ہے وہی منتہائے کمال ہے

مرا افتخارِ وجود بھی، مرا افتخارِ نمود بھی
مری بزمِ بود و نبود میں وہی حال ہے وہی قال ہے

ہے ہر اک سفر سے عجیب تر سفر اس کے پاک دیار کا
نہ شکن جبیں پہ تھکن کی ہے نہ ہی رخ پہ گردِ ملال ہے

تگ و تاز دہر میں ہے کرمؔ وہی مقتدا وہی رہنما
ہنر اس کا حسن کلام ہے سپر اس کا صدق مقال ہے

مقصود زاہدی

نعتیہ رباعیات

اس عالم امکاں میں کہاں اُنؐ کی مثال
میں اُنؐ کی ثنا کر سکوں کیا میری مجال
گو اپنے بشر ہونے پہ نازاں تھے رسولؐ
پر ان میں پیمبروں سے بڑھ کر تھے کمال

○

انساں کو رفاقتوں کا اک راز دیا
ہر پست کو احساسِ تگ و تاز دیا
امت میں ہے انؐ کی کوئی چھوٹا نہ بڑا
بس متقی کو اُنھوں نے اعزاز دیا

○

تاریخ میں عالم کی نہیں کوئی مثال
مانگا نہ کوئی فدیہ نہ کوئی زر و مال
اک ایسا عجب عہد اسیروں سے کیا
دس بچوں کو تعلیم دو آزادی بحال

○

اُمی تھا لقب علم کے شیدائی تھے
ہر فن کے ہنر کے وہ تمنائی تھے
کہتے تھے کہ "جاؤ چین گر علم ملے"
ہم جہل میں غرق، وہ تمام آگاہی تھے

○

ہم دین اور ایمان تمہیںؐ کہتے ہیں
اللہ کا فیضان تمہیںؐ کہتے ہیں
انسان کو جو کچھ بھی دیا تم نے دیا
ہم وارثِ قرآن تمہیںؐ کہتے ہیں

ناصر شہزاد

نعت

انگ آئینے، انجم، رنگ اعلا، پالا ہے
آپؐ کا بدن سرکارؐ روشنی کا پالا ہے

کتنے رتجگے کاٹے آپؐ کے خیالوں میں
کتنے ماہ، سالوں کو آپؐ نے اجالا ہے

دھیان آپؐ کا ہر آن.... روح کے زمستاں میں
آنگنوں میں جاڑے کی دھوپ سے نرالا ہے

علم، آگہی، ایثار.... پھول، چاندنی، مہکار
دل کے دوار کے اس پار کالی کملی والا ہے

جنگلی پرندوں کی نغمگی سے سُر لے کر
آپ کے لیے گوندھی گیت پریت مالا ہے

روحِ آدمیت پر، نیکیوں کی میت پر
آپؐ کی تجلی ہے، آپؐ کا اُجالا ہے

تجھ تک پانی چونچ چونچ دریا سے
دل نے ربط رک رک کر، آپ سے نکالا ہے

انور جمال

نعتیہ قصیدہ

خشک دھرتی پہ اُتر آئی ہے ایسی برسات
کھل کے برسی ہے گھٹا، دُھل گئے سب ڈال اور پات

ریگِ صحرا کی رگوں سے نکل آئے غنچے!!
سبزہ کاری سے ہے خالی نہ جمادات نہ دھات

شاخساروں پہ پرندے ہیں کہ چہکارتے ہیں
کہیں سبحان ترانہ، کہیں کُوکُو نغمات

مردہ لکڑی سے بھی پھوٹ آئے شگوفے، یعنی
لے کے آئی ہے یہ رُت نشوو نُما کی سوغات

رنگ و خوشبو کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے ہاتھوں
زرد موسم ہُوا تاراج، خزاں کو ہوئی مات

صبح دم خالقِ باری کی تجلّی چمکی!
آمدِ احمدؐ مرسل کی ہیں ساری برکات

ذکر اب تیرا ہے اے شاہِ رفیع الدّرجاتؐ
نعت اب تیری ہے اے ماہِ جمیع الحسنات

نعت مضمون ہو اور فکر و تخیل میرا
پرِ جبریل قلم، چشمۂ زمزم ہو دوات

لاکھ پہلو تیری توصیف کے رہ جاتے ہیں
کس قرینے سے لکھوں تیرے کمالات و صفات

نہ بلاغت میں سکت ہے نہ فصاحت کی مجال
نہ علامات میں ہمت نہ تشاکل کی بساط

کسی اعجازِ بیاں سے نہیں ہوتی تسکین
کسی تشبیہ و کنایہ سے بھی بنتی نہیں بات

حرفِ تشبیب و تلامیح بھی آتے نہیں کام
استعارات و تماثیل بھی دیتے نہیں ساتھ

منطق و فلسفہ و حکمت و دانش خاموش
علم و ادراک و تفکر ہیں کہ ہیں بے اوقات

کہیں انجیل میں لکھے ہیں محامد تیرے
کہیں اخلاق کی دیتی ہے گواہی تورات

تیری آمد ہے کہ ہے دولتِ تسکینِ وجود
تیری بعثت ہے کہ ہے صورتِ تزئینِ حیات

موسمِ گل ہے کہ ہے تیرے تبسم کا خراج
ابر پارے ہیں کہ ہے تیرے پسینے کی زکوٰۃ

تیری شفقت ہے کہ ہے مردہ گلوں پر شبنم
تیری رحمت ہے کہ ہے خشک زمیں پر برسات

تیرا خاموش تکلم ہے کہ ہے جوہرِ قند
حرفِ شیریں ہے ترے لب پہ کہ ہے شاخِ نبات

علم والوں کا جو ہے چرخ وہ ہے تیری زمین
عقل والوں کی جو صدیاں ہیں وہ تیرے لمحات

ماہ و خورشید کہ کرتے ہیں تلاوت تیری
شاخِ گل، برگِ شجر پڑھتے ہیں تیرے آیات

شب گزیدوں کے لیے تیری ہدایت خورشید
تیرہ بختوں کے لیے تیری قیادت لمعات

تیرے چہرے کی ضیا سے مستنیر ہوئی صبح
تیری آنکھوں کی کرن سے متوازل ہوئی رات

تیرے اقوال سے پھوٹا ہے شعور ہستی
تیرے افعال سے ٹوٹا ہے غرور ظلمات

تیرے ہونٹوں سے ہواللہ احد کیا نکلا!
گر پڑے ٹوٹ کے قدموں پہ ترے لات و منات

تجھ سے مخفی تو نہیں ہے مرے دل کی دنیا
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں مرے بگڑے حالات

زہد و تقویٰ کا سہارا نہ عبادت کا غرور
عاملِ صوم ہوں آقا نہ میں پابند صلوٰۃ

مرا اعزاز کہ میں نعت سرا ہوں تیرا
مجھ سے بے مایہ کو مل سکتی نہ تھی ورنہ نجات

اسم تیرا مری فریاد رسی کرتا ہے'
نام لوں تیرا تو سنتا ہے مجیب الدعوات

کون ہے بجھتے ہوئے دل کی تجلی؟ ترا نام
کون ہے بے سرو ساماں کی تسلی؟ تری ذات

کاسہ برکف تری دہلیز پہ شاہان و ملوک
ترے دروازے سے پاتے ہیں سلاطیں خیرات

تری سوچوں کے تقدس پہ مری عمر نثار
ترے سانسوں پہ نچھاور مرے ماں باپ کی ذات

جاودانی مرے حرفوں کو عطا کی جائے
زندگی میں ہی مرے نام کو مل جائے ثبات

نعت خوانی کی وہاں مجھ کو اجازت دی جائے
حشر کے دن یہ ترا مدح سرا ہو ترے ساتھ

نعت

دنیا کیا تسخیرے مجھ کو
شوق ترا تعمیرے مجھ کو

تیرے دھیان کے اپنے موسم
کیسے وقت اسیرے مجھ کو

تیرے گھر کی سمت رواں ہوں
کنکر پتھر ہیرے مجھ کو

اک تاریک مکاں دل میرا
یاد تری تنویرے مجھ کو

تک تک میل گناہوں والی
ذکر ترا تطہیرے مجھ کو

میں بے وصفا میں بے ہنرا
نام ترا توقیرے مجھ کو

تیری محبت بھید بھجائے
کیا کیا دھیرے دھیرے مجھ کو

میرزا ادیب

مسئلہ حل ہوگیا ہے

شیخ اسمٰعیل اینڈ سنز ایک بہت بڑی کاروباری فرم تھی جس کی شاخیں کم و بیش ملک کے ہر بڑے شہر میں مصروف عمل تھیں۔ فرم کے مالک شیخ اسمٰعیل اور ان کے دو بیٹے تھے۔

فرم کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی اور پھیلتی جاری تھیں۔ پہلے اس کا تعلق صرف تعمیرات سے تھا مگر ایک برس میں اس نے سڑکوں اور نہروں کی ٹھیکہ داری کے علاوہ مختلف اشیاء کی درآمد و برآمد کو بھی اپنے ساتھ منسلک کر لیا تھا۔

فرم کی لاہور شاخ کے سارے معاملات اس کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر ریاض الدین بخاری انجام دیتے تھے۔ بخاری طبعاً" سخت گیر آدمی تھے۔ جس کو بھی اپنے آفس میں بلاتے تھے وہ عملے میں کتنا بھی تجربہ کار کیوں نہ ہو۔ ان کے سامنے عموماً" خوف زدہ حالت میں ہی حاضری دیتا تھا۔ ان کی سخت گیری کی شہرت فرم کے مالکوں کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ فرم میں کام کرنے والے فرم سے شاکی ہوں اس لئے انہوں نے بخاری کو ہیڈ کوارٹر میں بلا لیا اور ان کی جگہ ملتان کی شاخ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر خان احمد یار خان کو لاہور شاخ کی ذمے داریاں سنبھالنے کا حکم دے دیا۔

لاہور کا عملہ جو پہلے ڈائریکٹر سے پریشان رہتا تھا اس تبدیلی پر خوش تھا مگر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کشمکش میں بھی گرفتار تھا نہ جانے نیا ڈائریکٹر کس طبیعت کا مالک ہے اور اپنے عملے سے کیا رویہ اپناتا ہے۔ یہ بنیادی وجہ تھی اس کشمکش کی۔

پہلے دن نئے ڈائریکٹر ایک گھنٹہ لیٹ پہنچے۔ عملے کا ہر رکن بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ چپڑاسی نے ہال کا دروازہ کھولا اور ایک صحت مند' دراز قد' سرخ و سفید رنگ کا پٹھان داخل ہوا۔

سر پر کلاہ دار پگڑی' ٹھوڑی پر چھدری داڑھی' آنکھوں پر نازک چمکتے دمکتے فریم والی عینک جس کے شیشوں کے پیچھے بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں اور دائیں ہاتھ میں سنہری مٹھ والی چھڑی۔

جیسے ہی انہوں نے دروازے کے اندر اپنا پہلا قدم رکھا ہال میں جتنا عملہ بیٹھا تھا احتراماً" کھڑا ہو گیا۔
"تشریف رکھیے۔"

یہ الفاظ ان کے سب سے بڑے افسر کے ہونٹوں سے نکلے۔ ہر فرد حیران رہ گیا مگر ابھی زیادہ حیرت کا موقع تو آیا ہی نہیں تھا۔

خان صاحب چند قدم چل کر رکے اور انگریزی میں بولے۔

"I am so sorry gentlemen"

مارے حیرت کے سب کے سب خاموش رہے۔

"I am late"

اب کے ہیڈ کلرک نیاز علی شاہی بولا۔

"سر کوئی بات نہیں"

"شکریہ جنٹلمین!"

یہ کہتے ہوئے خان صاحب نے اپنا سر بھی ذرا جھکا دیا۔ عملے کی حیرت اور خوشی میں اور اضافہ ہو گیا۔ چپڑاسی کرم الٰہی تیزی سے ڈائریکٹر کے کمرے کا دروازہ کھول کر خود ادب اور احترام سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"شکریہ ——— مسٹر"

چپڑاسی اکرم علی کا جی چاہتا تھا کہ ایک دم اپنے افسر کے سامنے بچھ ہی جائے مگر اس کا یہ جذبہ بے اختیار اس کے چہرے کی سرخی میں ڈوب گیا۔

افسر اعلیٰ اپنے کمرے میں چلا گیا اور چپڑاسی نے دروازہ بند کر دیا۔

عملے کے سارے لوگ ان کے جانے کے بعد بھی کھڑے رہے۔

وہ ایک دوسرے کو مسرت انگیز حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ دو تین نے تو اس طرح اپنے ہاتھوں کو جنبش دی جیسے کہ کہہ رہے ہوں خدا کا شکر ہے۔

ناز آرا جو ٹائپسٹ تھی اپنی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے والی دوسری لیڈی ٹائپسٹ سے بولی۔

"باجی کیا خیال ہے نئے ڈائریکٹر کے متعلق۔"

ریحانہ ادھیڑ عمر کی خاتون تھی اس لئے سارا عملہ اسے باجی کہہ کر ہی بات کرتا تھا۔

"تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" باجی نے اپنے مخصوص مفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

"باجی! میں کہتی ہوں یہ صاحب پہلے والے سے بالکل مختلف ہوں گے۔"

"بالکل رائٹ" یہ تائیدی جملہ عارف علی کا تھا جو دونوں کے پیچھے بیٹھا تھا اور عملے کا سینئر رکن تھا۔

"لگتا ہے اب ہمارے دن بھی پھر جائیں گے" یہ انور کا فقرہ تھا جو عارف علی کی طرح سینئر رکن تھا۔

ناز آرا ٹکٹکی باندھ کر ریحانہ کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی کلیک پر بڑا اعتماد تھا مگر ریحانہ کوئی چیز ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ نئے ڈائریکٹر کو اپنے کمرے میں گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ گزر گئے تھے اور عملے کے سارے اراکین وقت کی اس سب سے بڑی تبدیلی پر جو نئے ڈائریکٹر کے روپ میں آئی تھی محو گفتگو کر رہے تھے۔ ہر شخص کے ذہن میں ایک خوشگوار سوچ نے جنم لے لیا تھا چپڑاسی کرم الٰہی ابھی سوچ رہا تھا کہ پہلا ڈائریکٹر تو کمرے میں جاتے ہی زور سے گھنٹی بجا کر اسے بلاتا تھا اور کافی کا حکم دیتا تھا مگر نئے ڈائریکٹر نے ابھی تک اسے بلا کر ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

عارف علی اپنی جگہ سے اٹھ کر ہیڈ کلرک نیاز علی شاہی کے پاس چلا گیا تھا۔

"شاہی! لگتا ہے ———"

شاہی نے مسکرا کر اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔

"اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔"
عارف بھی مسکرانے لگا۔
"کیا تمہیں کوئی شک ہے؟"
"عارف! تم نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔ شکل صورت سے تو یہ بھلے آدمی لگتے ہیں۔ اس موصوف کے چہرے پر تو ہر وقت اکڑ پن ہی رہتا تھا' ان کا چہرہ ملائم ہے۔ ہو کا کچھ نہ کچھ۔"
"ہونا چاہئے شامی تین سال سے میری ترقی رکی ہوئی ہے"
"اور کس کی ترقی ہوئی ہے؟" شامی کو عارف کی بات پر غصہ آ گیا۔
"یار میرا مطلب ہے۔۔"
"تمہارا مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔"
"میں کہتا ہوں کہ ہر ایک کی ترقی ہونی چاہئے۔" عارف نے اپنی طرف سے ہیڈ کلرک کا غصہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
شامی چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔
"چلو لیڈیز انکلوژر میں چلتے ہیں۔"
دونوں ٹائپسٹ عورتیں جہاں بیٹھی تھیں اسے باقی سب لوگ لیڈیز انکلوژر کہتے تھے۔
عارف علی کی کرسی تو پہلے ہی خالی تھی۔ سرفراز نے بھی اپنی کرسی خالی کر دی۔ شامی اور عارف نے خالی کرسیوں کو کھسکا کر انکلوژر کے قریب تر کر دیا۔
"باجی! عارف کہتا ہے۔۔۔"
ریحانہ نے اس طرح سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو میں جانتی ہوں جو کچھ یہ کہتا ہے۔ اشارہ پا کر شامی خاموش ہو گیا۔
"باجی کہتی ہے تیل دیکھو۔۔۔۔"
"ہاں ہاں دھار بھی دیکھ لیں گے مگر میں سوچتا ہوں نئے افسر آئے ہیں ہمیں انہیں ویلکم کرنا چاہئے۔"
"یہ کیسے" باجی نے "سے" کو خاصا لمبا کر کے کہا۔
پہلے والے ڈائریکٹر کو جیسے کیا تھا"
"تمہارا مطلب ہے کسی شاندار ہوٹل میں چائے کی جائے" عارف علی نے کہا۔
"کیوں باجی؟"
باجی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"کس ہوٹل میں؟"
ابھی ہوٹل کے انتخاب کا مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ کرم الٰہی اس تیزی سے آیا کہ اگر اس نے تاخیر کی تو جو خبر وہ لے کر آیا ہے اس کی اہمیت شاید ختم ہو جائے گی۔
"کمال ہو گیا ہے" وہ اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔
"یہ خان صاحب انسان نہیں فرشتے ہیں۔"

"کیسے اندازہ لگایا تم نے" سجاد نے مسکرا کر پوچھا۔
"باجی! کیا کہوں۔ میں نے سوچا صاحب نے مجھے بتایا نہیں تو کیوں نہ خود ہی کافی لے کر چلا جاؤں۔
بس میں نے یہ کام کر دیا"
"کافی لے کر چلے گئے۔ بالکل رائٹ" عارف علی کی مداخلت کرم الٰہی کو پسند نہ آئی۔ اس نے ہاتھ
کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔
صاحب نے جو مجھے ٹرے اٹھائے ہوئے دیکھا تو بولے۔
"کرم الٰہی! کیوں لے آئے ہو۔ منگوائی تو نہیں تھی۔۔۔۔ خیر اب لے آئے تو اچھی بات ہے۔"
صاحب نے پہلا گھونٹ بھرا' مجھے دیکھا۔ پر کچھ کہا نہیں۔
"تمہارا نام بھی جانتے ہیں کرم الٰہی" عارف علی نے پھر مداخلت کی۔
اب کے کرم الٰہی نے برا نہ مانا۔
"میں کہتا ہوں کتنا اچھا آدمی ہے۔ میرا نام بھی جانتا ہے؟"
"پھر کیا ہوا کرم الٰہی" شامی نے سوال کیا۔
"پھر یہ ہوا جناب کہ بولے۔ کرم الٰہی! تم خوش ہو؟"
یہ بات سنی تو میرے دل نے کہا۔ کرم الٰہی بڑا اچھا موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ بتا دے صاحب کو اپنی چپ
اور۔۔۔ میں بولا "صاحب جی! کیا کہوں"
"کہو کرم الٰہی میں نے پوچھا جو ہے۔"
"میں نے کہا صاحب جی! چھ بچے ہیں۔ آپ جانتے ہیں بڑی مہنگائی کا زمانہ ہے۔ بڑی بچی شادی کے
قابل ہو گئی ہے۔ بچے پڑھتے ہیں۔ صاحب جی بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔"
میں نے دیکھا صاحب جی بڑے تردد سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے خود خبر نہیں کہ میں نے کیا کچھ کہہ
دیا تھا۔ وہ کافی پیتے رہے۔ پیالی ختم کر کے انہوں نے ٹرے پر رکھ دی اور بولے!
"کرم الٰہی! ٹھیک ہے ایک کام کرو۔"
"کیا صاحب جی!"
"ایک عرضی دو جس میں کہو کہ میری تنخواہ بہت کم ہے۔ اس میں اضافہ کیا جائے۔"
کرم الٰہی ایک لمحہ رکا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کوئی اور بولے۔
"بالکل رائٹ" عارف علی نے جب یہ لفظ کہے تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
"ہم سب کو ان سے الگ الگ ملنا چاہئے اور اپنے مسائل بتانے چاہئیں" شامی نے رائے دی۔
اب تک عملے کے بیشتر افراد وہاں آ چکے تھے۔
"کیوں باجی!" ایک جونیئر کلرک عبد السلام نے اس معاملے میں باجی کی رائے معلوم کرنی چاہی۔
"الگ الگ ملنے سے تو بڑا وقت لگے گا۔" باجی بولی "میرا خیال ہے کہ صاحب کا وقت زیادہ نہ لیا
جائے۔"

"تو پھر ہو کیا؟" شامی نے سوال کیا۔ "باجی! تم ہی بتاؤ؟"
"کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہمارے دو تین نمائندے صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان

سے کہیں کہ کرم الٰہی کی طرح ہم عملے کے بھی مسائل ہیں، پھر وہ جو تجویز کریں اس پر عمل کیا جائے؟"

ہر فرد اپنے قریب کھڑے ہوئے دوسرے فرد کو دیکھنے لگا۔

"بالکل رائٹ" عارف علی نے بلند آواز میں کہا۔

"آہستہ بھائی آہستہ" شاہی نے عارف علی سے مخاطب ہو کر کہا۔

اب یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ عملے کی نمائندگی کون کرے؟

"ایک تو باجی ہوں گی۔" ناز آرا نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"شاہی بھی نمائندگی کر سکتا ہے۔" عبدالسلام کی رائے تھی۔

اور ناصوں کی بھی تائید ہونے لگی۔

"نہیں ان کے کمرے میں ہجوم نہیں ہونا چاہئے" باقی کی رائے تھی۔

آدھ گھنٹہ لمبی گفتگو کی گئی اور یہ طے پا گیا کہ باجی اور شاہی، خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک تو انہیں چائے کی دعوت دیں۔ وہ جب چائے پر آئیں تو موقع محل دیکھ کر اپنے مسائل کا ذکر کیا جائے۔ ہوٹل کا مسئلہ بھی طے پا گیا۔

اس کے بعد سب اپنی سیٹوں پر چلے گئے۔ مگر اس وقت کام کرنے کا موڈ کسی کا بھی نہیں تھا۔ جو کچھ طے ہو گیا تھا اس پر سوچ بچار ہونے لگی اچانک شاہی کی نظر سامنے پڑی۔ نئے ڈائریکٹر صاحب اپنے کمرے سے باہر آ کر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

شاہی فی الفور تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ دوسرے لوگ بھی پہلے تو گھبرا گئے اور پھر کھڑے ہو گئے۔

خان صاحب مسکراتے رہے اور پھر انہیں ہاتھ اٹھا کر بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد واپس جانے لگے۔

یہ واقعہ ایک نئی دعوت فکر لے کر آیا تھا۔

خان صاحب نے ہمیں کام کرنے کی بجائے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ یہ مسئلہ موضوع گفتگو بن گیا چند منٹ کے بعد ہر ایک بادل ناخواستہ کام کرنے لگا۔

دوسرے روز پروگرام کے مطابق باجی اور شاہی نے دروازے پر رک کر حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔

"آیئے آیئے" خان صاحب نے گرم جوشی سے کہا۔

خان صاحب کے سامنے پہنچ کر شاہی کچھ کہنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ نئے ڈائریکٹر نے اپنے پیش رو کے عام رویے کے خلاف انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کچھ ہچکچاتے ہوئے دونوں بیٹھ گئے۔

"فرمایئے" خان صاحب نے باجی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جی ۔۔۔ وہ ۔۔۔ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"

خان صاحب نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"بے تکلفی سے فرمایئے باجی آپ باجی ریحانہ ہیں نا"

باجی ایک دم گھبرا گئی۔

"جی ہاں ۔۔۔ ذرا وہ ہوں نا ۔۔۔ بوڑھی کہہ لیں۔ اس لئے یہ لوگ مجھے باجی کہتے ہیں"

"آپ کا احترام کرتے ہیں بڑی اچھی بات ہے۔ اب فرمایئے۔"

"سب سے پہلے تو ہم آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ جیسے ہی یہاں تشریف لائے سارا عملہ آپ کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ محض آپ سب کا حسنِ ظن ہے اور اس کے لئے میں آپ کی وساطت سے پورے عملہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرا شکریہ پہنچ جائے گا؟"

"جی ہاں۔۔۔ ضرور ضرور"۔ شاہی اور باجی ۔۔۔ دونوں نے بیک وقت کہا۔

"یہ تو ہوگیا اور کچھ؟" خان صاحب نے بڑے ملائم لہجے میں استفسار کیا۔

اب کے شاہی نے جواب دیا۔

"بندہ پرور! ہم چاہتے ہیں کہ آج آپ اپنے وقت میں سے کچھ وقت نکال کر ہمارے ساتھ چائے پئیں"

"اس میں ہماری عزت افزائی ہے۔" باجی نے بات آگے بڑھائی۔

"عزیزو! چائے پی جائے گی مگر۔۔۔"

"بہت بہت شکریہ" دونوں بول اٹھے۔

"مگر کسی ہوٹل یا ریستوران میں نہیں اپنے دفتر ہی میں اور میرے کمرے میں اور یہ عزت آپ لوگ مجھے بخشیں گے۔"

"لیکن خان صاحب۔۔۔" شاہی فقرہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ خان صاحب نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔

"دیکھئے" خان صاحب نے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا "ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ ہمیں مختلف قسم کی ذمے داریاں پوری کرنی ہوتی ہیں کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں؟"

شاہی نے نفی میں سر ہلا دیا اور باجی نے نہیں کہہ دیا۔

"تو پھر"

کرم الٰہی اندر آکر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

"کافی لاؤ۔"

"بہتر حضور۔"

اور پونے گھنٹے کے بعد شاہی اور باجی نے باہر آکر خان صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔

واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

شام کے وقت خان صاحب کے کمرے میں عملہ بڑے خوشگوار موڈ میں پر تکلف چائے پی رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بے تکلف گفتگو بھی جاری تھی۔ شاہی نے ایک بار فرم کے معاملات کو زیر بحث لانے کی کوشش کی تو خان صاحب نے روک دیا۔

یہ بے تکلف اور نجی محفل ہے۔ یہاں فرم اور فرم کے معاملات کو الگ رکھئے۔

شام گہری ہوتی جارہی تھی اور عملے کے سارے رکن چائے پی کر فارغ ہوگئے تھے۔ اب خان صاحب سے نظر بچا کر باجی اور شاہی سے اشاروں میں کہا جارہا تھا کہ وہ بات کریں جس کے لئے ہم جمع ہوئے ہیں۔

شاید خان صاحب نے خود ہاجی کو اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا چنانچہ وہ کہنے لگے۔
"بہت اچھا وقت گزرا ہے۔ یہ عملے کی مہربانی ہے۔"
عملے کے دو چار افراد اٹھنے لگے۔
"یوں نہیں۔۔۔۔ کچھ کہیئے مثلاً کوئی مسئلہ۔۔۔۔ مگر عزم کا نہیں۔۔۔۔ آپ کا اپنا۔"
شاہی اور باجی نے اسے غنیمت سمجھا۔
"اگر آپ فرمائیں تو۔۔۔۔ کچھ عرض کریں" باجی نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہا۔
"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"
باجی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولیں۔
"خان صاحب! آپ کا انتہائی مہربانی کا رویہ دیکھ کر ہمیں جرات ہوئی ہے کہ کچھ عرض کریں۔ خان صاحب تین سال سے ہماری تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اس سے ہم سب مالی مشکلات میں گرفتار ہیں۔"
"ٹھیک ٹھیک۔۔" خان صاحب نے اثبات میں اپنی گردن ہلاتے ہوئے ملائم لہجے میں کہا۔
"خان صاحب! آپ جانتے ہیں منگائی کا زمانہ ہے۔"
"جانتا ہوں" خان صاحب نے تائید کی۔
"آپ بے حد مہربان ہیں۔۔" باجی نے نہ جانے آگے کیا کہنا تھا کہ خان صاحب نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ خاموش ہو گئیں۔
"سارے عملہ کا یہ مطالبہ ہے؟"
خان صاب کے اس سوال پر سب نے ہاں کی۔
"گویا آپ لوگوں کا یہ مسئلہ ہے۔"
"جی خان صاحب!" باجی بولیں۔
"آپ بیٹھ جائیں مجھے آپ کے مسئلہ کا علم ہو گیا ہے۔"
شاہی اور باجی۔۔۔ دونوں بیٹھ گئے۔
چند منٹ بعد سارا عملہ ڈائریکٹر کے کمرے سے باہر آنے لگا۔ ہر ایک چہرہ اطمینان کی روشنی سے تابناک تھا۔
روز مرہ باقاعدگی سے عملہ جمع ہوتا۔ کام کرنے کے دوران وقفے وقفے سے اس یقین کا اظہار کیا جاتا کہ خان صاحب خود یہ خوش خبری سنانے والے ہیں کہ ہر ایک کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔
پورا ایک ہفتہ بیت گیا۔ خان صاحب آتے' ہال کے درمیان میں سے مسکراتے اور ہاتھ ہلا ہلا کر تشریف رکھیئے کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔
پیر کا دن تھا اس روز خان صاحب اس وقت ہال میں داخل ہوئے جب نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے اور عملے کے آدھے سے زیادہ رکن ابھی نہیں آئے تھے۔
خان صاحب رک رک کر قدم اٹھا رہے تھے۔
"آپ سب خیریت سے ہیں۔"

خان صاحب نے یہ لفظ حسب معمول مسکراتے ہوئے کہے اور جس وقت اپنے کمرے میں چلے گئے تو ہر ایک کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔
محلے کا جو بھی رکن آتا اسے بھی یہی خوش خبری دی جاتی۔
بارہ بجے کرم الٰہی تیزی سے باجی کی طرف آیا۔
"باجی! مبارک ہو۔ خان صاحب نے بلایا ہے۔"
"صرف مجھے۔۔۔"
"نہیں شاہی صاحب کو بھی۔"
شاہی کے کانوں میں کرم الٰہی کے الفاظ پہنچ گئے تھے اور وہ باجی کی طرف قدم اٹھانے لگا تھا دونوں ایک ساتھ چلنے لگے تو محلے میں سے ہر ایک کی نگاہیں ان پر مرتکز ہو کر ساتھ ساتھ چلی جارہی تھیں۔
"آیئے بیٹھئے۔"
خان صاحب نے انہیں دروازے میں سے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
آج خان صاحب کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ دونوں نے لہجے کی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔
خان صاحب نے چپڑاسی کو حاضر ہونے کے لئے گھنٹی بجائی اور شاہی سے مخاطب ہوئے۔
"خیریت سے ہیں آپ؟"
"جی ہاں شکریہ۔"
"آپ بھی باجی"
"جی بڑی مہربانی جی"
"چائے چلے گی یا کافی؟" خان صاحب نے پہلے تو کبھی ایسا سوال نہیں کیا تھا آج کیوں پوچھ رہے ہیں دونوں کے ذہنوں میں ایک لمحے کے لئے سوال آیا اور وہ قدرے حیران ہو کر بیک آواز بولے۔
"شکریہ"
"ٹھیک ہے چائے چلے گی" اور انہوں نے کرم الٰہی کو چائے لانے کا اشارہ کر دیا۔
"دیکھئے میں نے آپ کو فرم کے کسی کام کے لئے تکلیف نہیں دی اس روز آپ لوگوں نے اپنا مسئلہ بتایا تھا۔"
خان صاحب خاموش ہو گئے۔ تین چار لمحے گزر گئے۔
"بتایا تھا نا۔"
"جی بتایا تھا" یہ باجی کے لفظ تھے۔
آج مجھے اپنا مسئلہ بتانا ہے۔
یہ کہہ کر خان صاحب پھر خاموش ہو گئے۔
"آپ کا مسئلہ امید ہے حل ہو جائے گا مگر میرا مسئلہ کیونکر حل ہو گا؟"
باجی اور شاہی بڑے غور سے خان صاحب کے لفظ سن رہے تھے۔ اور اب ایک مبہم خوف کا احساس ان کے دل میں دھڑکنے لگا تھا۔
"فرم کے پروپرائٹر شیخ اسمٰعیل نے کہا ہے کہ ہماری لاہور برانچ خسارے میں جارہی ہے۔ آدھا عملہ

فارغ کر دیا جائے۔۔۔"
یک لخت دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہے ہیں۔
"یہ میرا مسئلہ ہے۔"
وہ خاموشی سے خان صاحب کے پیچھے چکنی دکھتی دیوار کو دیکھے جارہے تھے۔
"اور آرڈر۔۔۔ آرڈر ہوتا ہے آپ سمجھتے ہیں نا؟؟"
وہ دونوں اب بھی خاموش تھے۔
"آپ کا بھی مسئلہ ہے میرا بھی مسئلہ ہے۔ خیر آپ چائے پئیں۔"
چائے پی کر خان صاحب یہ کہہ کر چلنے لگے۔
"میں تھوڑی دیر کیلئے باہر جارہا ہوں۔"
اور وہ کچھ دیر کے بعد چلے گئے۔
چائے کی پیالیاں ویسی کی ویسی ان کے سامنے پڑی تھیں۔ چپڑاسی حیران ایک طرف کھڑا تھا۔
دو دو گھونٹ لینے کے بعد باجی اور شاہی باہر آگئے۔
وہ سارے لوگ جو بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کررہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے؟
"معاملہ بڑا تکلیف دہ ہے۔"
ان تمہیدی لفظوں کے بعد باجی نے جو کچھ ہوا بتا دیا'
"یہ کیا ہوا؟" عارف علی بولا۔
"بس یہی ہوا۔" شاہی نے کہا۔
ان سب کے چہروں پر صرف ایک سوالیہ نشان ابھر آیا تھا۔ اب کیا ہوگا!
"خان صاحب جس کو چاہیں نکال دیں۔۔" عبد السلام کی آواز ابھری' اس آواز میں مایوسی کے علاوہ ایک دبا دبا استفہام بھی تھا۔
"یہ تو ہوگا ہی" شاہی نے عبد السلام کی طرف نگاہ ڈالے بغیر کہا۔
"خان صاحب تو بہت اچھے آدمی تھے۔۔" عبد السلام نے اسی انداز میں کہا۔
"اچھے آدمی ہیں۔۔۔ مگر یہ حکم ان کا نہیں فرم کے پروپرائٹر کا ہے۔"
باجی کے اس فقرے نے وہی کام کیا جو ڈوبتے ہوئے آدمی کے لئے ایک تنکا کرتا ہے۔
وقت گزرتا جارہا تھا اور عملے کے افراد چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اپنی مشکلوں' دقتوں اور مصیبتوں کا ذکر کررہے تھے۔ ہر ایک کا ذہن ایک خاص بوجھ سے دبا جارہا تھا۔
ناز آراء اپنی بزرگ کلیگ سے کہہ رہی تھی۔
"مجھے نوکری سے جواب مل گیا تو پھر میری شادی کا معاملہ ختم ہی سمجھو وہ لوگ انکار کر دیں گے اور میرے ابا امی کو بہت دکھ ہوگا۔"
باجی نے اپنا مسئلہ چھیڑا۔
"تم جانتی ہو ناز آرا میرے دو بیٹے ہیں۔ طلاق کے بعد شوہر میرے سپرد کر گیا تھا۔ ماشا اللہ جوان

ہیں۔ ان کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں۔"

عارف علی کو گھر کا کرایہ [illegible] کھا رہا تھا۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی کماتے ہیں تو سب کھاتے ہیں۔ میں بے روزگار ہو گیا تو کیا ہوگا؟

شاہی کو اپنے بوڑھے باپ کے علاج معالجے کی فکر ستانے لگی تھی۔

عبدالسلام کو اس قرضے کا خیال پریشان کرنے لگا تھا جو اس نے اپنی چھوٹی بہن کی شادی پر ایک بینک سے لیا تھا اور جسے قسطوں میں ادا کر رہا تھا۔

ہر ذہن میں یہی ایک مسئلہ زیر غور تھا کہ بے روزگار ہو گئے تو کیا ہوگا۔

وہ سب ایک ایک کرکے باجی کے پاس آ گئے۔

"میں خود پریشان ہوں کیا کہوں۔"

"آپ بڑی تجربہ کار اور سمجھ دار ہیں۔" شاہی بولا۔

"میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔"

باجی کے یہ لفظ سنتے ہی ہر ایک کہہ اٹھا۔

"کیا؟"

"خان صاحب سے کہا جائے کہ وہ پہلا مسئلہ پھر کبھی سہی۔۔"

"یعنی تنخواہ میں اضافے کا مسئلہ" عارف علی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔ اور ان سے گزارش کی جائے کہ کسی کو بھی نکالا نہ جائے۔ ہم اور زیادہ محنت اور ذمے داری سے کام کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سب نے تائید کر دی۔

خان صاحب آ گئے اور حسب معمول ہال میں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ خلاف معمول ان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"باجی!"

"جی؟"

"آپ ہی جائیں"

"اکیلی میں؟"

"آپ کا احترام کرتے ہیں۔ بات بن جائے گی۔"

باجی اٹھیں اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں چلی گئیں۔

"آیئے باجی" میں آپ کو بلوانے ہی والا تھا۔ اچھا کیا خود ہی تشریف لے آئیں۔ بیٹھئے"

باجی بیٹھ گئیں۔

"خان صاحب! آپ خوب جانتے ہیں حالات ایسے ہیں کہ زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے۔۔۔"

باجی کہتے کہتے رک گئیں۔

"ارے آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟"

"جی ــــ میں اپنی طرف سے اور سارے عملے کی طرف سے ایک التماس لے کر حاضر ہوئی ہوں"

"کہئے"

"یہ جو آدھے عملے کو فارغ کرنے کا مسئلہ ہے یہ آپ ختم کرا دیں ــــ آپ کا یہ احسان ہم عمر بھر نہیں بھولیں گے۔"

"ہوں"

خان صاحب نے سر کو ہلکی سے جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"چھانٹی کا مسئلہ ختم ہو جائے۔"

"جی خان صاحب ــــ آپ کی بڑی ہی مہربانی ہوگی ــ"

"ہو جائے گا بلکہ ٹھیک ہو گیا اور کوئی مسئلہ ــــ؟"

"بس خان صاحب۔ بے حد شکریہ ہمارا اور کوئی مسئلہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں شیخ صاحب کو قائل کر لوں گا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔"

"سٹاف نے کہا ہے کہ ہم بڑی محنت سے کام کریں گے۔"

"بہتر آپ سٹاف کو بتا دیں۔ انشاء اللہ چھانٹی نہیں ہوگی۔"

باجی خوش خوش کمرے سے نکلنے لگیں اور جس وقت وہ سٹاف کو یہ خوش خبری سنا رہیں تھیں کہ کسی کو ملازمت سے نکالا نہیں جائے گا تو خان صاحب ٹیلی فون پر فرم کے پروپرائیٹر کو بتا رہے تھے۔

"شیخ صاحب! مبارک ہو مسئلہ حل ہو گیا ہے۔"

نفسیاتی الجھن

حاجی نور الدین کاکا عملی سنگ مرمر کی سیڑھی پہ چپ چاپ کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اور پھر یکا یک جیسے زندہ باد کا سا شور اس کے گرد گلاب کے ہاروں کی طرح پھیل گیا اور اسے یاد آگیا کہ میں ساتواں حج کرکے واپس آیا ہوں اور تاجر برادری کے علاوہ گلشن نوبہار کے نئے نویلے شاندار بنگلوں والے رؤسا بڑھ بڑھ کے اس کو گلے لگانے اور ہاتھ چومنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فضا میں گلاب کے پھولوں کے ساتھ ساتھ چائے کی باتوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔

چائے کے چورے میں کیکر کی چھال کا برادہ، ایسی کڑک چائے کے لئے تانبے کا پیسہ ڈال دیا کرتے تھے جیسے اگلے وقتوں کے چاہ فروش حلوائی خوشبو کے لئے ڈھیروں گلاب میں بسا لیا کرتے۔ ایک مرتبہ جو ان کے یہاں چاہ پی گیا اور کہیں مزہ ہی نہ آیا۔ اور شہرت حاجی کاکا ٹیل کی۔ مہر بند ملتی تھی پکے وتنے سوا سیر کا پیکٹ۔ شوقین لوگ لے جاتے اور ایک ایک چسکی پر ہر مہمان کہتا واہ حاجی کاکا ٹیل۔ "کاکا کی چاہ" کا نام ہی سند تھا تاجر دوستوں کے یہاں بھی کاکا جی لقب ہو کے رہ گیا تھا۔

لیکن کاکا جی سوتے سوتے چونک اٹھا کرتے۔۔۔ کیکر کی خوشبو آرہی ہے۔ خشک چھال اور چھپکلیں "آپ کے بنگلے میں تو کیکر کا کانٹا بھی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "نفسیاتی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ تحلیل نفسی۔۔۔۔" "نہ نہ نہ!" برادے کا محل دھڑن تختہ ہو جاتا، انہوں نے سن رکھا تھا کہ نفسیاتی علاج والے گڑے مردے اکھاڑ لاتے ہیں۔۔۔ اور بات پھیل گئی تو دھڑن تختہ! دھڑن تختہ ہونے کو ہی آگیا تھا کہ انکم ٹیکس اور ملاوٹ والوں کی دوستی سے گری ہوئی ساکھ پھر بحال ہوگئی۔۔۔۔ پروپیگنڈا کی بات تھی بیچ میں مخالفوں نے اڑائی تھی۔ اور پھر جو سنبھلی تو کاکا چاہ کی کھپت ڈیڑھ گنا ہوگئی۔

مگر ان کا بیٹا احسان محتاط ہوگیا۔ اس کو برادری کے خلاف حاجی صاحب نے تعلیم کے چکر میں ڈال دیا تھا۔ لڑکیوں کو بھی ایف اے تک پڑھایا اور ان کی مرضی کے خلاف خواہشمندوں کے تقاضوں کے سبب دھوم دھام سے باراتیں رخصت کیں۔ کاروبار کو سنبھالنے کے لئے بیٹے کی خانہ آبادی بھی ہونی چاہیے تھی۔۔۔ اور ہوگئی۔ تین دن تو جہیز آتا رہا تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں سامان چھلکنے لگا۔ اور چند ہی سال میں بچوں کی آوازیں بھی۔

صاحبزادہ جہاں اپنے فرزندوں کو دیکھ کر خوش ہوتا وہیں ہزار گز کا بنگلہ سکڑ کے ریلوے لائن مین کا کوارٹر نظر آنے لگتا۔۔۔ چار بیڈ روم کا تو بنگلہ تھا۔ اور ایک کمرہ اور باتھ روم بڑے میاں نے سنبھال رکھا تھا۔ اشارے کنائے سے کہہ ہی دیا کہ جگہ کم پڑ رہی ہے۔ بچے بلونگڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بیوی سے بھی علیحدگی میں بات نہیں ہو سکتی۔۔۔ لیکن حاجی صاحب ایسے میں اونچا سننے لگتے۔

ضرورت بھی کیا تھی کہ الگ کمرہ ہی ہو ان کے لئے۔ یہ تو نئی نسل کی حق تلفی ہوئی نا۔ سسر نے بچی کو چار منزلہ بلڈنگ لے کے دی تھی۔ "چاند محل" نیچے دکانیں۔ اوپر تین تین فلیٹ ہر منزل پر کاروبار چلے نہ چلے کرایہ آتا رہے ماہ بہ ماہ۔ اپنی رہائش کے لئے حاجی صاحب کا بنگلہ۔ لیکن کورے کپڑے کی طرح وہ بھی سکڑ گیا تھا۔

آپ کو اب اللہ اللہ ہی کرنا ہے نا۔ لاؤنج میں دیوان پہ پڑ رہئے۔ سنگ مرمر کے فرش پہ مشینی قالین اور نماز کے لئے مصلیٰ بچھا لیا۔ کتنے ہی مصلے اور کتنی ہی تسبیحیں لائے تھے۔ اور لاتا بھی کیا تھا۔ جاپانی بیگم کے لئے کلیوں کی چیز۔ اپنے لئے جیبی گھڑی کا چین جو شیروانی پہ جھولا کرتا۔ کبھی کبھار کلائی کی گھڑی بھی باندھ لیا کرتے۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ حاجی کاکا خیل کے پاس ایک سے دوسری گھڑی بھی نہیں۔ صحت ان کی بہت اچھی تھی اس پہ حاذق حکیم مسیح دوراں سے دوستی۔ آنکھیں سرخ گال دہکتے ہوئے۔

ازدواج کے بارے میں بھی ان کا یہی فلسفہ تھا۔ لیکن مقدر کے آگے ایک نہ چلی۔ دولت کی کشش سے کم عمر لڑکیاں جو سن بلوغ کو پہنچ پائی ہوں حاجی کاکا خیل کی عقد میں آئیں لیکن سال سے زیادہ کاکا کا ساتھ نہ دے سکیں اور زچگی میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور لے دے کے پختہ عمر کو پہونچنے پر ان کے عقد میں وہ آئی تھیں جو ان کی پھوپھی کا انتخاب تھا' والدہ احسان ہی آٹھ دس سال کا ساتھ دے سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے پرانی روایت کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن کار کوٹھی اور ہزاروں زیورات اور کپڑے کے باوجود ان کے پیغام لاحاصل ہی رہے۔

اور اب پوتوں پوتیوں کے لئے جگہ کم پڑ رہی تھی۔ دولت بہت تھی۔ لیکن ان کا قول تھا کہ دولت وہ جو اپنے پاس ہو۔ پھر بھی سوچا کہ ایک منزل اوپر ڈال لو۔

"آپ کو تو عیاشی ہی کی سوجھتی ہے ڈیڑی سیمنٹ تراسی روپے بوری آرہا ہے۔ آپ نے بنگلہ بنوایا تھا تو نو روپے تھی۔ سو روپیہ دہاڑی مزدور لیتا ہے۔ جو کچھ ہے اسی پر گزر بسر کرنی پڑے گی۔ دیودار' ساگوان کے بھاؤ ملتی ہے۔ آرکیٹیکٹ' کاریگر' مزدور اور کیل سے لے کر سریئے تک یعنی جو کچھ آپ نے کمایا تھا چار تجروں کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اچھی نیک نامی دلوا رہے ہیں آپ!"

"تو پھر اس کا علاج بھی تو ہوگا برخوردار" انہوں نے بیٹے کی بات سن کر کہا۔

"آپ کو کچھ زحمت اٹھانا پڑے گی؟"

"یعنی اکیلے آدمی کے لئے اتنا بڑا بیڈ روم کیا کیجئے گا آپ؟"

"خلا میں تو رہنے سے رہا۔ بولو تو کہیں اور کرائے پر اٹھ جاؤں؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا کہے گی دنیا کہ باپ کو گھر سے نکال دیا۔ میں کوئی خدانخواستہ آپ کو ایدھی ٹرسٹ کے سپرد کرنے نہیں جارہا۔"

حاجی ہنسے "ہاں میرے ایک والنیٹر دوست جو وہاں کام کرتے ہیں کہہ رہے تھے کہ اولاد والے اچھے خاصے لوگ محض ذمہ داری سے بچنے کے لئے ماں باپ کو وہاں جمع کروا آتے ہیں۔ زندہ اور حیثیت والے ورثاء کے لاوارث مائی باپ کے بڑھاپے اور بیماری کی ناز برداری ہم سے نہیں اٹھتے ہے صاحب ورنہ بزرگوں کا تو وجود ہی برکت کا باعث ہوتا ہے۔ بوڑھا پاکھنڈٹ ڈال دیوے ہے برکت کے نچے۔"

"مثلاً ابا جی کو موسیقی سننے کا شوق ہے ایک تو زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا پر قوالی آپ کی وہیں پہ

بھی کی عادت [illegible] ہے۔ اور [illegible] بھی کرتا تھا ہے کہ [illegible] اور [illegible] لی دی میں
اٹھاں [illegible] کیسی لگتی۔ نعمت کی نمائش کیوں ہوتی ہے۔ اب تو تم خیال رکھو گے۔"
لیکن مرزا کی بیزاری پر [illegible] ۲۲ [illegible] چاہ والے اپنی چاہ کے [illegible] کی
طرح بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے۔

"کچھ کہا ہے آپ نے۔"

"میں ذرا کانوں کا کچا ہو گیا ہوں برخوردار ورنہ آواز تو سن رہا ہوں تمہاری۔ مرضی کے خلاف بات ہو گئی ہے کوئی؟"

"کتنے بھر سے بک رہا ہوں بابا جی کہ گھر میں جگہ کم پڑ رہی ہے۔ آپ کو الگ کمرے کی اب کیا ضرورت ہے!"

"یہ تو تم نے ٹھیک ہی کہا۔ بلکہ یوں کہتے تو اور ہی درست ہوتا کہ چند روز میں سرے سے ضرورت ہی نہیں رہے گی مگر بھلا زیر زمین۔۔۔"

"اوہ ایک تو آپ کی عمر کو پہنچ کر نوجوانوں کی نیتوں پر بھی شک گزرنے لگتا ہے۔۔۔ یہ کرسی کیوں ہٹائی۔ یہ تخت کیوں اٹھوایا۔ اور یہ پلنگ کیوں ہٹایا۔ تمہاری ماں کے جہیز کا تھا یادگار تو اس کی رہنے دی ہوتی۔۔۔ ہر بات کو آپ یوں موڑ دیتے ہیں جیسے بلی چوہے کی گردن کو موڑ دیتی ہے۔"

"صاف صاف کہو چاہتے کیا ہو؟ کمرہ خالی کر دوں۔ چلو کر دوں گا۔ لیکن اپنے مکان میں اس گناہ گار کو کونسی جگہ عنایت ہو گی؟"

"یہ آپ کی دقیانوسی عنایت وناتت کی بولی ہمیں تو آتی نہیں ہے۔ لاؤنج کیسا رہے گا؟"

"راہداری یعنی؟"۔۔۔ یعنی کہ بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں" مرزا غالب بھی شاید ایسے ہی کسی مسئلے سے دوچار ہوئے تھے۔

"غالب والب کو تو ہم جانتے نہیں بات سیدھی ہے ابا حضور سنگ مرمر کا فرش چمڑے کی پوشش کا صوفہ۔ دیوان نماز پڑھنے اور ستانے کو' مصلیٰ اٹھا کے پلنگ پوش بچھا لیا اور بستر بن گیا۔ جب تک جی چاہے ستائیے۔ باتھ روم ساتھ ہے۔ تہجد کے وضو کے لئے بھی آسانی ہو جائے گی۔

"ٹھیک تو لاؤنج کا لاؤنج اور۔۔۔"

"ڈرائنگ روم کا ڈرائنگ روم۔۔۔"

"اور چوکیداری کی چوکیداری۔ وہ تنخواہ بھی ہم کو ملے گی پھر؟"

"آپ کی زندہ دلی پہ تاجر برادری داد دیتی ہے ڈیڈی۔"

"ہٹاؤ میاں۔ وہ کیا داد دے گی اور تم کیا داد دو گے دل تو دل ہے وہ دماغ ہی نہ رہا۔۔۔"

"اور آپ کا برمحل شعروں کا انتخاب"

گمشدہ دیوان ہوں۔ کرم خوردہ"

"ایک تو آپ اپنے پہ ترس بہت کھانے لگے ہیں۔۔۔ خیر یہ شاید بڑھاپے کا حلیہ ہے۔ لیکن آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

"شعر کی حد تک تو ٹھیک تھا احسان میاں بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں۔ لیکن ہر

آنے جانے والے کی پذیرائی اب اس عمر میں ہم سے مشکل ہو گی۔"
"تو میرا پہلا خیال درست تھا بابا۔ اوپر کا کمرہ آپ لے لیجئے' خالی کروائے دیتا ہوں"
"سٹور یعنی؟"
"اس کو حجرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ والدہ مرحومہ کا آبنوس والا پلنگ۔ رنگین پڑھلہ۔ آرائش میز ان کی۔ پیچ دان' پشاور کا تحفہ۔ بیدر کا پاندان۔"
"یعنی کہ از کا۔ ہر کہاڑ۔ ہم بھی مال متروکہ کا حصہ بن جائیں گے!!!"
"جی نہیں۔ یادوں کی سیج کی تکمیل۔ فالتو سامان اور آپ کے درمیان کشمیر کا فولڈنگ سکرین آجائے گا۔ سر پر ٹیوب لائٹ ایک طرف گھومنے والا پنکھا۔ دیوار پہ حرمین شریفین کی رنگین تصویریں۔ اور آپ کو کیا چاہیے۔ اللہ اللہ کیجئے اور ہم لوگوں کو دعائیں دیجئے۔"
"ہاں بیٹا یہ تو ٹھیک ہے" حاجی صاحب کے ہونٹوں پر منجمد مسکراہٹ ان کی آنکھوں کی چمک سے ہم آہنگ ہو گئی۔ انہوں نے چاندی کی موٹھ لگے عصا کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کے گر پڑے۔ اور اس ساتھ ہی ان کا سر سنگ مرمر کے ستون سے ٹکرایا اور لہو کی ایک لکیر مرمر کی رگ کی طرح چمک کر سیاہ پڑ گئی۔

اس روز مرحوم کے اعزاز میں چاء کی مارکیٹ بند ہو گئی اور اخباروں میں ان کے سوئم کا اعلان جلی حروف کے چوکھٹے میں چمک رہا تھا

انا للہ وانا الیہ راجعون

کاکا چائے کمپنی کے ہر دلعزیز مالک حاجی نور الدین کے غمزدہ فرزند اور احباب نے ان کے بنگلے' "چائے گل" میں مرحوم و مغفور کی روح کو ایصال ثواب پہونچانے کے لئے قرآن خوانی اور طعام کا بندوبست کیا ہے لنگر خانوں میں کمپنی کی مشہور چائے مفت تقسیم کی جائے گی

المشتہر۔ احسان الدین کاکا خیل اور غمزدہ خاندان

گئے دنوں کا سراغ

گئے دنوں کا سراغ لے کر وہ شخص کہاں کہاں نہ گیا اور پھر تھک ہار کر اپنی مجبوریوں سے روٹھ کر خاک کا پردہ اوڑھ کر سو گیا۔

کہ ہی تو ہے کہ جو بھی در محبوب سے اٹھ گیا جس کسی نے آستانہ محبت کو چھوڑا اور در معشوق سے کنارا کیا عمر بھر بھٹکا ہی کیا۔ دورح کو نہ دل کو کبھی چین نصیب ہوا نہ لوٹ کر جانے کی ہمت کی تو پھر سلطان سے ایسی توقع لگانا اور ایسی کوئی آس امید کرنا عبث تھا اور بات یہ ہے کہ وہ اتنے بے امید تھے (کسی نے بے امید ہی کہا ہے نا امید نہیں۔) اتنے بے خواہش انسان تھے کہ انہوں نے اپنی ذات کی ایسے آسودوں سے وابستگی کا خیال ہی نہ کیا ہوگا۔

بہت لمبے اونچے اور اس قسم کے قد کاٹھ کا مالک کہ جس میں بڑھاپے اور کہولت کے اثر سے ذرہ برابر بھی جھول یا جھکاؤ نہ آسکا بس تاڑ ایسے سیدھے اور سربلند۔۔۔ روٹھی روٹھی غلافی آنکھوں پر چھایا ہوا کرکٹ کے میدان ایسا سیدھا اور سپاٹ ماتھا۔ بالوں سے بے نیاز کرمچی دار تامڑا سے سر کے ساتھ جا ملا تھا جس کے گردا گرد چاندی سے سفید بالوں کی جھالر نے ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ جلے فولاد کی سی کلیجھوں رنگت اور علی گڑھ کے مضافاتی دیہات کے راجپوتوں والی رجپوتی باڑ پر مارکین کا کرتا جس کی آستینوں میں کف ہوتے تھے اور جس کا گلا اونچا ہوتا مارکین کی گٹوں سے قدرے اونچی شلوار' پیروں میں فٹ بال کے کھلاڑیوں والے خاکستری موزوں پر کینوس کے ٹینس شوز پہنے وہ قدم دبا کر بے آواز رفتار سے چلنے والا یہ شخص ایک ایسا ہی عاشق تھا کہ ایک بار جو در محبت سے اٹھا تو پھر لوٹ کر آستانہ محبت کو نہ گیا۔ نہ ایک قدم ادھر اور نہ ایک قدم ادھر کو ڈالا بس تاڑ جیسا ایک بوڑھا سا لخوردہ درخت تھا کہ اپنی پوشامت اور ضدی پن سے اڑا کھڑا رہا۔ جہاں کا تہاں۔ کہ جس کی ایک جانب سے راہ نکل کر کوئے معشوق سے کوئے معشوق کو جاتی تھی۔ باقی تین اطراف کا ہر رستہ کھلا تھا اور کسی جانب بھی یہ بورڈ یا اشارہ موجود نہ تھا۔ اندر یا آگے جانا منع ہے۔ اور اس کے باوجود بھی کسی جانب رخ نہ کیا۔ بات یہ ہے کہ مناہی اور قدغن تو خود اپنے اندر موجود تھی۔ جو رہ رہ کر ٹوکتی تھی کہ خبردار جو راہ وفا سے ایک قدم آگے یا پیچھے کیا۔ تمام عمر راہ وفا کے درمیان اٹک کر وہ گئے دنوں کا سراغ لیا کئے کہ ان گئے دنوں کی یادوں کا اور قدروں کا ایک میلہ تھا جو ان کے گردا گرد لگا ہوا تھا۔ اور آگے یعنی اس میلے اور بارات سے آگے۔ نئی اقدار اور نئے زمانے کی ایک چکا چوند تھی ایک فروغ تجلی تھا کہ جس تک پہونچنے والی ایک بال برابر اونچی پرواز بھی بال و پر جلا دینے کو کافی تھی۔ خیر اس وقت کی بات تو اور ہی تھی اور ہم ہنستے تھے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب خیال آتا ہے کہ وہ یادیں اور گئے دنوں کی کھوج ہی تو ان کے پر تھے۔ بلکہ وہ شہپر تھے جن کے بل پر کالوں اور

لمحوں میں وہ دور محبوب کی جانب پرواز کرتے۔ اڑتے تھے پلٹتے اور جھپٹتے تھے اور پھر وہیں اپنی کل اپنے محور پر واپس آن کھڑے ہوتے تھے۔

پچھلے قصوں اور قدیم داستانوں میں ایک شاہزادہ ہوا کرتا تھا۔ بڑے آرام سے بڑے ٹھسّے سے اپنے ٹھکانے پر رہتا تھا پھر ایک دن یہ ہوا کہ اس کے کانوں یہ بات پڑی کہ ایک شہر آباد ہوا ہے' اچھا ہوا ہوگا' شہر تو آباد ہوتے ہی رہتے ہیں بستیاں بسا ہی کرتی ہیں۔ اور یہ بات کانوں میں بھی پڑا ہی کرتی ہے پھر ہمیں کیا وہ آرام سے اطمینان سے اپنی جگہ پر تھا۔ اور واقعی اسے کیا مطلب تھا۔ پر ہوا یہ کہ اس شہر کی خوبی' محبوبی اور بوالعجبی کے قصے اتنی بار اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائے کہ بالآخر وہ بیٹھا بیٹھا چونکا اور اس کو یاد آگیا کہ یہی تو وہ شہر تھا جس کی بستی اور آبادی کی ننھی سی موہوم سی آرزو اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپی تھی اور اس کو کب سے ایک ایسی خبر کا انتظار تھا جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خبر کیسی ہوگی اور کیا ہوگی۔ اور اب جبکہ خبر مسلسل آرہی تھی وہ الا اللہ کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گھر کی' اپنے شہر کی عافیت کو ترک کیا اور چل پڑا۔ منزلیں مارتا راستے کے جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں کو عبور کرتا ہوا۔

اچھا وہ ایک اکیلا شہزادہ نہ تھا بلکہ اس طرح کے بہت سے شہزادوں نے متعدد داستانوں کے حوالے سے ایسی مہمات کو اپنا مقصد اور نصیب بنایا۔

مگر اب جبکہ قدیم داستانی شہزادوں کی فصلیں کٹ چکی ہیں۔ بادشاہی کی کھیتیاں شہنشاہوں' شہزادوں سے خالی اس طرح ویران پڑی ہیں جیسے کوئی ٹڈی دل ان پر سے گذرا ہو اور ایسی تمام فصلوں کو چاٹتا چلا گیا ہو۔ تو پھر مہم جوئی کی یہ تمام کشتنائیاں سلطان خان جیسے کے حصے میں تو آنا تھیں۔ سو آئیں اور آکر رہیں۔ وہ چنگے بھلے۔ تازہ بہ تازہ یونیورسٹی کی پیراگیری سے ریٹائرمنٹ لے کر بیٹھے ہی تھے۔ اور اس فکر میں سرگرداں تھے کہ اب رزق کے حصول کا کون سا نمونہ اختیار کریں۔ اور اپنا مستقل ٹھکانہ کہاں بنائیں۔ تو خیر اب یہ سوال تو سرے سے ہی خارج از بحث تھا کہ وہ یونیورسٹی ایریا سے بیس قدم بھی دور کھسک کر زندگی بسر کر سکتے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا یہی تو ایک سحر تھا کہ جس نے اس طلسمات کے دائرہ میں ایک بار قدم رکھ دیا پھر اس کے حصار سے باہر نہ آسکا بس ایک گنبد بے در تھا کہ جو اس میں ایک بار داخل ہو گیا۔ وہیں کا ہو رہا——
اور بس یہی تو ایک سوال تھا کہ اس گنبد بے در سے نکلا تو کیونکر' اس شہر خوبی و محبوبی میں آیا تو کیسے۔ اور اگر آہی گیا تھا۔ تو واپسی کیوں نہ ہوئی۔ یہی تو وہ سوال تھا جو یہاں آجانے کے بعد کی بقیہ تمام عمران کے چہرے پر آنکھوں میں بلکہ تمام وجود پر طاری رہا۔ اور اسی بات کا سراغ لیتے وہ پردہ خاک میں گم ہوئے۔

آکر واپس نہ جانے والے سوال کا جواب تو بہت سہل اور مختصر تھا کہ قدیم داستانوں کا شہزادہ جب ایسے سفر پر نکلا تو راہ بلٹ میں جنگل بیاباں کے بیچ اپنی کٹیا میں بیٹھا صدیوں سال بوڑھا بزرگ اس کو متنبہ کرتا۔

"دیکھ اجنبی مسافر! دوران سفر پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا خبردار۔ ورنہ پتھر کا ہو جائے گا اور پھر نہ ایک گام آگے نہ پیچھے کو اٹھا سکے گا"

سو سلطان خان! تم نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اور تم پتھر کے ہوئے اور اب نہ ایک گام آگے نہ پیچھے——

تو ہاں یہ بات کون جان سکتا ہے۔ جس نے بچوں کا کام نہ کیا ہو' ہوسٹلوں میں ہوا گیری نہ کی ہو۔ وہ بھی ہماری پشاور جی کے لڑکوں کی' ارے وہ تو کبوتروں (کبوتروں) سے بڑھ کر معصوم اور بے بس ہوتے ہیں۔ نہ کسی پہ رعب جمائیں نہ بات بات پر اعتراض جڑیں۔ نہ ان کو یہ خبر کہ ہماری کپاٹ (کچہری) میں فیصلے پاپائے کٹتے ہیں۔ ہوتے کدھر ہیں قتل کہاں جاری ہے۔ تو یہ میلا ہے کہ گیا۔ کھانے پینے کی سدھ نہیں رہتی تھی' اپنے کھیل کود میں۔ بس ہمارے ہاتھوں میں جاگتا جیتا تھا ان کا تو (فرض غیر کے ہاتھ بیٹا ہے) اچھا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دل کے اور ہاتھ کے کھلے' اگر ہم نے دو مانگے ہیں تو چار پکڑا دیں گے۔

اتنی بات کر کے خان صاحب بالکل رومانی ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ دنیا جہاں سے اکتائے ہوئے وہ آسمان پر اڑتے چیل کووں کی طرف تاکنے لگتے۔

"اچھا ہاں خان صاحب آپ کہہ رہے تھے کہ ہمارے لڑکوں نے بنایا پاکستان۔۔۔ تو اتنے وہ بھولے اور مدہوش تھے تو پاکستان کیسے بناتے وہ۔۔۔ خاک بناتے۔"

میں ان کو چھیڑ دیتی۔ اور بس یہی وہ موقع ہوتا تھا کہ وہ جلال میں آجاتے تھے۔ ان کی ایک آنکھ میں پھلی تھی۔ وہ تک غصہ سے سرخ ہو جاتی' چہرے کی رنگت بگڑ جاتی' ایک دم بھڑک جاتے۔

اور نہیں تو پھر تم نے بنایا ہوگا۔ ہاں نہیں۔۔۔ تو کوئی پاگل دیوانے تھوڑے ہی تھے۔ بچے کس کے ہوشمند ہوتے ہیں' کیا کچھ نہیں کیا انہوں نے بیا (بی اے) ایل ایل بیا (ایل ایل بی) اور وہ کیا کہویں ہیں۔ اے سے (ایم اے) انجینئری کی کون سی ڈگری لے لے کر نہیں نکلے تھے۔ ایک سے ایک قابل لائق (لائق) ہمارا لڑکا۔ اب یہ ڈاکٹر توفیق کو ہی لو۔ یہ چھٹ پنے سے خاص میرے انڈر رہا۔ روز بستر بھگوے تھا۔ اور جو میں کتنا میاں ہوش رکھا کرو اتنے بڑے ہوگئے اب تو مجھے بھی شرم آوے ہے تو بڑی رازداری سے کہتا سلطان خان بس کیا کروں خواب میں دیکھتا ہوں کہ غسلخانے کی موری پر بیٹھا ہوں۔" "ارے یہ ڈاکٹر توفیق واقعی یہ آپ کے ہاتھوں میں پلے ہیں؟ یہ تو یہیں قریب ہی رہتے ہیں۔ اور آپ بیکار پھر رہے ان کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔"

رہا تو تھا کتنے ہی دن' پکڑ کر لے گئے۔ بڑے آرام سے رکھا مگر پھر وہ میم آگئی نا ان کی' بس پھر میں چلا آیا وہ مجھے اپنے رعاب میں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ کتنا میں بتاتا کہ یہ میرے ہاتھوں میں پلا ہوا بچہ ہے اس کی عادت اور طور طریق مجھ سے زیادہ کون جانے گا۔ مگر وہ ہر معاملے میں اپنی رائے مقدم سمجھتی تھی۔ میں نے بھی صاف بتا دیا اک دن' میاں یہ میم میرے بس کی نہیں تم ہی سنبھالو۔ ان کو تو۔ اور چلا آیا۔

اور ان کی خودگاری کا بھی ایک راز تھا کہ لے کر کراچی' پنڈی اسلام اور میرپور خاص ملکن (ملک) کوئٹہ' آزاد کشمیر مظفر آباد تک ان کے ہاتھوں میں سے نکلے ہوئے' ان کے انڈر پلے بڑھے بچے۔ ایک سا ایک بڑا افسر کا بڑا صاحب کرنل' جرنل' بریگیڈیئر (بریگیڈیئر)' وہ انگلیوں پر گناتے تم یہ دیکھو انجینئر سے لے کر ڈاکٹر [illegible] ان میں سے نکلے ہی ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہمارے انڈر پلے بڑھے ہوئے ہیں اور [illegible] ہی [illegible] ہیں۔ کی [illegible] سے لگے گا مگر عزت سے رکھا اور ان سے [illegible] [illegible] اور [illegible] کے [illegible] ہماری ان سے نہیں بن سکی۔

"بھئی کچھ نہیں تھی بیٹا چاہیے تو بن گئی تھی؟"

اس بات کا جواب ان کے پاس صاف تھا کہ ذکر نہ ہو۔ کہیں کہ وہ بچی ماں باپ والی صاحب کی، گلی اور چلتا پھرتا ہوتا تو بھی سی۔ مگر ہم کیسے مان جائیں کہ وہی حل ہوتی ہاں کہ بچوں کی قسمت اور کوسے اٹھے کھاویں۔ ہم نے بھی کہہ دیا (کہہ دیا) لو تم ہی کھلاؤ اپنا قبضہ پاکر۔ تو جی ہم آ گئے۔ مگر وہ ہم کہتے ہیں نا کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔۔۔۔ تو پھر ہاتھی تو ہمارا ہی ہوا نا۔

اتنا بول کر وہ افسردہ ہو جاتے، تھک جاتے تو زندگی کا سارا وہی نیلا آسمان اور اس پہ ادھر سے ادھر اڑتے چیل کوے ہی رہ جاتے تھے۔ بے کاری اور بے روزگاری کے دنوں میں بس یہی ایک کام تھا کڑی سے حدود وسعتوں میں بھٹکتے چیل کووں کی پرواز کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنا۔ یہی نہیں بلکہ انتہائی تنگدستی اور مفلسی کے زمانے میں بھی منگل کے منگل وہ گوشت لاتے پھر ایک طرف کو بیٹھ کر بوٹی بوٹی فضا میں اچھال اچھال کر چیل کووں کے جھپٹتے کھانے کا انتظام کرتے اللہ ہی جانے پاکستان کے کھونٹ کھونٹ پھیلے اپنے اندر سے نکلنے والے لڑکوں کا سرصدقہ دیتے تھے یا خود پاکستان کا جو ان کے لڑکوں نے بنایا تھا۔

ہاں وہ بات تو رہ ہی جاتی تھی بار بار ان کے خیال اور باتوں کے تسلسل کے بیچ بیچ میں۔ بہرحال ان کا کہنا تھا کہ جس دنا (دن) مسلم لیگ والوں کے ہاتھ جنا (جناح) صاحب نے پیام بھجوایا کہ فنڈ جمع کرنا ہے تو آپ یہ دیکھ لیں کہ ہمارے لڑکے اپنی اپنی کتابیں اٹھا کر کھڑے ہوئے کہ یہ چھوڑ کر جو کچھ چاہیں لے لیں۔۔۔۔

اتنا ہی کہہ کر ان کا گلا رندھ جاتا تھا پھر وہ آگے کچھ نہ بول پاتے تھے۔ پھر کسی دوسری نشست میں بات پوری کرتے کہ جب جنا صاحب نے پیام بھجوایا کہ پاکستان کے لئے ووٹ اکٹھے کرنے ہیں۔ لو بھئی پھر کیا تھا۔ اتی بات بہت تھی۔ ونوں نے (انہوں نے) کالی شیروانیاں گلوں میں ڈالیں۔ اور نکل پڑے، ہندستان (ہندوستان) کے کونے کونے میں پھیل گئے۔۔۔۔ لو بھلا یہ کالی اچکنوں اور ترکی ٹوپیوں کو ہندستان کے مسلمان نظر انداز کر سکتے تھے اور یہ کالی اچکنیں اور پھندنے والی لال ٹوپیوں ہی کی یاد تو انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی اول دن سے۔ وہ تو اچھے بھلے نواب ٹیکم پور کے باورچی خانے میں رکاب داری کریں تھے اور سلیقے سے ان کے ہاتھ کے پکے کھانے۔ اب کیا کیا نام گنواتے، ارنے دس طریوں (طرح) کے کباب۔ پسندے۔ اور دس طریوں کے قورمے فرنیاں، شاہی ٹکڑے۔ ان کے ہاتھ کے کھانے ہندستان کے کس بڑے نواب اور لیڈر نے نہ کھائے تھے، خیر جونا گڑھ اور بھوپال والے تو اپنے ہی لڑکے تھے گھر کی بات تھی۔ وہ تو علی گڑھ آکر نواب کاہے (کاہے) کو رہ جاتے تھے وہی کالی اچکنیں اور پھندنے دار روی ٹوپیاں۔ وہی شرارتیں وہی بے فکراپن۔ وہ جو اپنے تھے نا راس مسعود اور چھتاری ایک سے ایک بڑھ کر نامی گرامی صاحب لوگ مشاہور (مشہور) تھے مگر علی گڑھ کے اسٹیشن پر قدم دھرا نہیں کہ ساری جون ہی بدل جاتی۔ صاحب بہادری سوٹ کیسوں ہی میں بند کر دیا کریں۔ میں تو اس وخت انجان ہی ہوا کرتا، نواب ٹیکم پور کے باورچی سے کام ہی سیکھ رہا تھا تو یہ بات تو ہمارے ہیڈ باورچی ہی نے کھولی ارے یہ تو سرسید کا پوتا ہے۔

سرسید کا نام بھی سلطان خان کے منہ سے یوں نکلتا تھا گویا وہ لفظ سرسید نہیں۔ کوہ گراں کہتے ہوں۔

وہ اچانک ہی پھر آبدیدہ ہو کر آسمان پہ ادھر سے ادھر آتے جاتے چیل کوے گننا شروع کر دیتے۔ اللہ ہی جانے اس نیلے آسمان، اس چرخ اخضری کی پہنائیوں میں انہیں کس چیز کی تلاش تھی۔ خیر اب وہ اپنی

گردن جھکا کر پیروں تلے بچھے اس فرش خاکی کی طرف تو دیکھنے سے رہے۔ اور یقیناً اگر ان کو ایسا مشورہ دیا جاتا تو وہ چیخ پڑتے۔

ارے یہ خاک ہے لئیم۔ کیسی کیسی شکلیں اور صورتیں کھا بیٹھی ہے اور اب کون لے گا اس سے یہ حساب کہ کس کس کو۔ کہاں کہاں گم کیا۔ ایک نواب بیگم پوری کو لے لو اور ان کا نام آتے ہی ان کا ہی پھر بھٹک جاتا کہ ان کے خاصے کے لئے کس کس قسم کے کھانے نہ تیار کئے کن کن کے آگے کیسے کیسے دسترخوان نہ چنے تھے انہوں نے' سو ادھر نواب صاحب کا دسترخوان بڑھا اور ہاتھ سے کفگیر چمچہ چھوڑا نہیں کہ۔۔۔۔

اور وہ تو پتہ نہیں کب سے کالی شیروانیوں اور پھندنے والی سرخ ترکی ٹوپیوں' سفید پاجاموں والے میاں لوگوں کی شکل خدمت کا شوق اور ارمان دل میں سجائے بیٹھے تھے۔

اللہ جنت نصیب کرے میرولایت حسین کو اب یہاں پر یہ یاد رکھنے اور نوٹ کرنے کی بات ہے کہ سلطان خان کا دل میرولایت حسین کے لڑکے مسعود میاں سے صاف نہ تھا۔ بڑی شکایت یہ تھی کہ بھلا تم کو کیا سوجھی کہ اپنی یونیورسٹی اپنی کوٹھی بنگلہ چھوڑ کر یہاں اپنی اوقات خراب کرنے آگئے۔ پوچھو اب یہاں کون جانے ہے کہ یہ میرولایت حسین کا بیٹا ہے۔ یہاں پر آکر ایک جملہ معترضہ اور پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے مائی مسعود زیدی کے شاگرد ٹھہرے وہ ان کی حمایت میں سلطان خان کی بات کاٹ دیتے (یہ مجال) "کیوں سلطان خان آنے کو تو آپ بھی آگئے' زیدی صاحب تو پانی پت میں تھے فساد ہوا تو آگئے۔" یہ بات سلطان خان ماننے والے نہ تھے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیتے جلی بھنی آواز میں۔ "اب ایسا بھی پانی پت اور علی گڑھ کے درمیان آگ کا دریا نہ بہہ رہا تھا کہ الٹے بانس بریلی کو چل پڑے مسعود میاں کی بے وفائی اور بقول ان کے حماقت پر سلطان خان غصے سے تھرا جاتے تھے۔ اور ان کی اپنی جو بات تھی سو یہ کہ ہماری پوچھو تو ہماری دسری بات تھی۔ ہم کون سی چھاؤنی چھانے آئے تھے یہاں۔ ارے اپنے بچوں نے ایک چیز (پاکستان) بنائی تو ہم دیکھنے کے خیال سے آگئے۔ اب بھلا مسعود میاں سے کس نے کہا تھا۔ کہ اچھی بھلی تو تمہاری کوٹھی' باغ بغیچہ اور سب سے بڑی بات سر پر میرولایت حسین کے نام کا چھپر سا سایا اور تم آگئے ادھر" ویسے سلطان خان کی خفگی اور جوش و خروش ہنگامی ہی تھا کہ پہلے تو لارنس روڈ کی چار فٹ چوڑی عقبی گلی کے ادھر مسعود میاں کی رہائش تھی۔ اس کے عین مقابل بارہ نمبر کی دیوار تھی اور اسی کے ساتھ بنے کوارٹر میں یوں سمجھو کہ ان کے پچھواڑے برسوں روٹھے بیٹھے رہے۔ پر ان کے دروازے پر جاکر نہ کھڑے ہوئے بس میرولایت حسین کی باتیں ہی کرکے کام چلا لیتے۔ وہ نہ جانے کس طرح اور کب جاکر ان پر مسعود میاں کے موقف اور یہاں آنے کے سبب کا انکشاف ہوا تو کہیں دل صاف ہوا اور اس وقت جب مسعود میاں لارنس روڈ کی کوٹھی چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن کی رہائش اختیار کر چکے تھے۔ مگر چونکہ دل صاف ہو چکا تھا اس لئے مہینہ دو مہینہ چھوڑ کر حنولیں مارتے ماڈل ٹاؤن مسعود میاں کی خیر خبر لینے' پہونچتے پاکستان میں خود ان کی آمد ہنگامی اور عارضی اور قطعی اختیاری تھی۔ بس دل چاہوے تھا کہ بھلا جاکر تو دیکھیں کہ پاکستان کیسا بن گیا۔ کیسا لگے ہے۔ مگر تہہ میں اصل سبب یہ تھا کہ لگا کر ڈائننگ ہال سے ظہور وارڈ اور کچی بارک' پکی بارک اور یہ کھمبے کہ منٹو سرکل سے تا ایس ایس ہال (سرسید ہال) تک کی بیراگیری سے نبٹ کر فارغ ہوکر ریٹائرمنٹ (ریٹائرمنٹ) لی (گویا کہ خود مانگ کر لی) تو پھر جی میں یہی آیا کہ پہلا کام تو یہ کیا کہ جو جس کا لینا دینا آتا تھا۔

اس کی ادائیگی کی تیسری تو یہ کام تھا کہ استعفیٰ (یعنی استعفیٰ طلاق نامہ) لکھ کر نیک بخت کے ہاتھ میں تھما دیا جائے۔
اب یہاں پر پھر ایک جملہ معترضہ آتا ہے کہ جو کوئی یہ پوچھے کہ جبھی اگر واپسی کا خیال تھا تو نیک بخت کو استعفا (طلاق) دینا ضرور تھا۔ بس اس سوال پر سلطان خان غصے سے تھرا جاتے۔ وہ کھلا کھلا کر دیتے
اب انسان ہے بشریت تو ہے خدا تو نہیں کہ جو بات ٹھہر گئی سو ٹھہر گئی۔ انسان مر جاتا ہے پیچھے کو رہ کرتا ہے تو دس طرحوں کی بات راستے میں آہی جاتی ہے۔ ہم کیوں ان کو اپنا پابند بنا کر دلیز پر بٹھائے رکھتے۔
اب وہ ہماری دوسری ہی تو بیوی تھیں۔ عمر کی اتنی زیادہ بھی نہ تھیں۔ بس ہم اپنی طرف سے تو آزاد کر آئے تھے کہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں پر اب (یعنی پندرہ برس کے بعد) آنے جانے والوں سے پتہ چلا کہ وہ نیک بخت ہو گئیں (وہیں) دلیز پکڑے بیٹھی ہیں۔

"تو پھر یہ عذاب تو آپ کی گردن پر ہوا نا۔"

بس ناحق ہی ہماری گردن پر ہوا (اکلوتی آنکھ غصہ سے سرخ ہو جاتی) ہم تو اپنی طرف سے آزاد کر آئے تھے۔ بہر حال اس بات کے بھی بہت عرصے بعد جب نیک بخت کی وفات کی خبر آئی تو پہلے تو مرنے والی کو کافی سخت سست کہا۔ کہ ضدن تھیں وہی رجپوتی (راجپوتی) ہٹ۔ ارے کہو تم کاہے کو بیٹھی رہیں۔ دلیز کو پکڑ کے ۔۔۔۔۔۔ اب چونکہ وہ ضد کے اس دلیز کو پکڑ کر بیٹھی رہ گئی تھیں تو سلطان خان پر یہ واجب آیا کہ تیجہ چالیسواں یہاں بیٹھ کر ہی سہی وہ کریں۔

چنانچہ یہ سب کرتے جاتے تھے۔ اور اپنی حیثیت پر یہ رسوم انجام دیں۔ پر یہی کہے گئے۔ ہم نے کوئی منع کیا تھا کر لیتیں تو آج ہم پر یہ ذمہ داری تو نہ ہوتی۔

ہاں تو دوسرا کام یعنی استعفا نیک بخت کے ہاتھوں میں تھمانے کے بعد اب کوئی چیز راہ میں حائل نہ تھی تو انہوں نے دری میں ایک چادر اور پتھر سا سخت تکیہ لپیٹا جس پر نیک بخت کے ہاتھ کا لال سبز پھول کڑھا تکیہ غلاف چڑھا تھا جستے کے ٹین کا ایک چھوٹا بکسا جس کو وہ باصرار ٹی رنک ہی کہتے تھے اٹھایا اور چل پڑے۔ تو اس ٹرنک کی بھی حقیقت اور کل جمع جاپانی مارکین (جو اس وقت روپے بارہ آنے گز بکتی تھی) کے دو جوڑے اور کالی اچکن اور پھندنے دار ترکی ٹوپی تھی۔ اور بات یہ ہے کہ کلاہ لالہ رنگ (اپنی رسوائی کے بعد بھی علی گڑھ کا امتیازی نشان بنی رہی) دو قسم کی ہوتی تھی ایک گہری قرمزی اور بالکل نرم اور دوسری قسم لال ٹول جیسی سرخ رنگت کی سخت اور کھڑی کھڑی ٹوپی' سلطان خان کے ٹرنک میں یہی ٹوپی محفوظ تھی اور پاکستان میں وہ ہمیشہ خاص موقعوں پر خصوصاً" جب کسی میاں' یعنی ملک کی ملاقات یا خیر خبر کو نکلتے تو کالی اچکن (جس کی رنگت فرسودگی کے باعث بھوسلی ہو چلی تھی) کے ساتھ یہی کلاہ لالہ رنگ زیب سر ہوتی تھی جس کا پھندنا اخیر آخر میں آکر امتداد زمانہ اور مرور ایام کے ہاتھوں جانے کدھر غائب ہوا اور اب ٹوپی کے سر پر وہ چھوٹی انگلی جیسی ننھی سی دم ہی کھڑی رہتی تھی جس کے ساتھ سیاہ پھندنا منسلک ہوتا تھا۔

علاوہ اس کالی اچکن اور ٹوپی کے اس ٹرنک یعنی وہ بکسا جس کو علی گڑھ اور آگرے کے مضافات میں پیٹی بولا جاتا تھا۔ اس میں گرم خاکی پٹیاں جو کسی دور میں پولیس کے کانسٹیبلوں کی پنڈلیوں پر بندھی ہوتی تھیں۔ بڑی احتیاط سے ایک ٹین کی صندوقچی میں رکھی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ فٹ بال کے میچوں میں جیتے ہوئے تمغات بھی محفوظ تھے یہ واضح رہے کہ ڈائننگ ہال سے لے کر کے (لے کن) تمام ہوسٹلوں کے ہیراؤں کی الگ الگ ٹیمیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے درمیان باقاعدہ میچ ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں

جس میں تمام ہوسٹلوں کے لڑکے اس کالی شیروانی کہ جس کے کالر پر کھجور کے پیڑ والا چھوٹا سا مونوگرام لگا ہوتا تھا' سلطان خان کھجور کے پیڑ کے ساتھ تاج برطانیہ کا تام گول کر جاویں تھے اور اس کی وضاحت یوں کیا کریں تھے کہ اس کا کیا ہے وہ تو سرسید احمد خان نے ایک خاص مصلحت سے ٹنکی کیادا (کیا ہوا) تھا۔ پہن کر بیٹھتے ہر ایک ہوسٹل کے وارڈن اور سینئر پر اکڑ اپنی اپنی ٹولی سے کئے (قریب) بیٹھا کرے تھا۔ اور پھر پرافیسر صاحب خود آیا کریں تھے۔ ہر ہوسٹل اپنی اپنی ٹیم کو بک اپ کرتے تھے۔ اور لڑکے تو جوش میں آن کر کھڑے ہو کر' اچھل اچھل کر بک اپ کریں تھے۔ بس جانوں کی بازی لگی ہوتی تھی۔

۳

سلطان خان کے دم کے ساتھ حقیقت میں یادوں کی ایک بارات لگی رہتی تھی دل مجور کو کیا کیا نہ یاد آیا کرتا تھا۔ اب وہ اپنی ہی نہیں بلکہ پوری یونیورسٹی کے بیروں کی ٹیموں کے چیمپئن تھے۔ مانے ہوئے (واقعی کافی میڈل تھے) اور جب لڑکے اپنی ٹیموں کے ساتھ دوسرے شہروں میں جاتے تھے تو ان کے سنگ کئی کئی بیرے بھی جایا کرتے تھے جن میں ان کو ضرور شامل کیا جاتا تھا۔ اور ایک دفعہ تو ایسا وقت آن پڑا تھا کہ ایک لڑکا عین وقت پر بیمار ہو گیا تو نیچر صاحب نے سلطان خان کو اس کی جگہ میدان میں بھیج دیا۔

سو اب وہ آٹھویں دسویں دن اپنے کوارٹر کے کواڑ بھیڑ کر چپ چاپ بیٹھ کر صندوقچی کھولتے سارے میڈل سامنے پھیلا کر بیٹھ جاتے کتنی کتنی دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کو گھورا کرتے پھر براسو کی ڈبیا نکال کر دھیرے دھیرے بڑے پیار سے ان کو چمکاتے۔ سب سے آخر میں ایس ایس ہال کے ہیڈ بیرے کا مونوگرام جو ان کی پگڑی اور بلٹ کی زینت بنتا اٹھاتے۔ اور چمکا کر پھر صندوقچی میں محفوظ کر دیا کرتے۔

وہ تو قطعاً" اس موڈ میں آئے تھے کہ کچھ دن قیام کرکے سارا پاکستان گھوم پھر کر واپس چلے جائیں گے' وہی یونیورسٹی ہوگی' وہی کیفے ڈی پھوس اور چاؤ ہال ہوگا وہی لال ڈگی' میرس روڈ اور قلعہ ہوگا۔ ہاں قلعہ جہاں انگریزوں کی روحیں اب بھی مکھن کی ڈبل روٹی اور چائے کے آرڈر دیتی ہوئی آوازوں میں دیا کریں تھیں۔ جی! خود سلطان خان نے بار بار اپنے کانوں سے ایسے آوڈر وصول کئے تھے قلعے کے پاس سے گزرتے ہوئے' تو ہاں وہ تو واپسی کے بالکل موڈ میں تھے کئی سال پاسپورٹ ویزا سب سنبھال رکھا ہوا تھا پھر ایک دن سناؤنی آئی یونیورسٹی ہندو سرکار نے لے لیتی (لے لی) ڈاکٹر ضیاء الدین چل بسے اور خدا آپ کا بھلا کرے اب ہندو سکھ لڑکے بھی ساتھ برابر پڑھنے آئیں گے اور ہوسٹلوں میں رہیں گے اور پھر اگلی سناؤنی یہ آئی کی یونیورسٹی کے پہلے جو مسلم کا لفظ تھا۔ وہ بھی نکل جائے گا اور یونی فارم بھی بدلی کیا جارہا ہے۔ تو اب خاک رہ گیا وہاں کچھ۔ لو بھئی اب تو دھوتیاں پھر پھرا یا کریں گی کچی بارک اور پکی بارک پر۔ یہ بات نہیں ہے پہلے بھی ہماری یونیورسٹی میں ہندو ہوسٹل تھا پر وہ بچے بھی اسی یونیفارم میں رہتے تھے۔۔۔۔ خان صاحب کو جوڑی چڑھ آئی بخار نے دبا لیا۔ ہفتوں بے سدھ پڑے رہے کوارٹر میں نہ کوئی بڑ گی نہ ہذیان ہوا بس چپ چاپ پڑے بخار سے لڑا کئے۔ چند دن بعد لوٹ پوٹ کر کھڑے ہوگئے۔۔۔۔۔۔ روٹی کھائی پانی پیا۔ پاسپورٹ نکالا اس کو نیچے اوپر کیا۔ اندر باہر دیکھا کئے پھر اس کو چر چر پھاڑا پرزے پرزے کیا اور ردی کے ٹین میں ڈال دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب وہ اس قسم کے ذکر اذکار میری والدہ کے سامنے کھل کر کر لیا کرتے تھے۔ جب

انہوں نے سوال کیا۔

خان صاحب سنا ہے آپ نے پاسپورٹ پھاڑ دیا۔

تو انہوں نے جو جواب دیا کچھ یوں تھا۔

ارے پاسپورٹ کا اب کرنا بھی کیا تھا وہ جو مثل ہے نا" اس کی بلا سے کہ کون پیسے اور کہاں سے مگر جنت نسو یہ بھی جان لیویں کہ میاں کس کی بچی ہے اور کس کی رہی ہے۔ خیر وہ یہی دیکھ لیویں گے۔ ارے خدا کے بندے لڑکے ہی داخل کرنا تھے تو کر لیتے مگر یہ کیا ——— کہ ——— کہ آگے ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ یا ان کو ایسے الفاظ بولنے کا یارا ہی تھا۔

اگلی صبح اٹھے نہائے دھوئے کالی اچکن نکال کر زیب تن کی سر پر وہ کلاہلالہ رنگ (کہ جس کو وہ رومی ٹوپی کہتے تھے) دھری (پھندنا اس وقت تک اپنی جگہ برقرار تھا) نہ کسی کو سلام کیا نہ کہا سنا معاف کرایا۔ دری میں لپٹی چادر اور تکیہ کئی سال گزر جانے کے باوجود یہی بستر تھا جو لپیٹا کندھے پر دھرا اور چل پڑے۔

پتہ نہ چلا کہ سلطان خان کدھر رہے اور کدھر گئے' کوئی ڈھائی تین سال کے بعد ایک دن قلقلہ اٹھا کہ سلطان خان آگئے ہیں ——— کوارٹر میں دھرا ہی کیا تھا جو تالہ ڈال کر گئے ہوتے بس زنجیر کنڈے میں ہی اٹکا گئے تھے وہی کھولی کھڑی چارپائی سیدھی کی اور اس پر بیٹھ گئے۔

اب یہ دیکھئے کہ ملازمت تو انہوں نے کسی کی قبول ہی نہ کی تھی جو کسی کو ان کے چلے جانے سے فرق پڑتا اور تشویش ہوتی۔ البتہ رعب داب سے رہے اور کم سے کم بات کرنے کے باوجود ایک خلاء سا ضرور موجود رہا تھا۔ سو واپس آکر پھر پر کر دیا۔

سلطان خان ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کے خیالات جذبات اور مافی الضمیر کا سراغ کسی ایک نشست' سوال جواب یا انٹرویو کے ذریعہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اب جبکہ ان کا دل غم کا ایک اتھاہ سمندر بن کر ٹھہر گیا۔ اب تو ایسا کوئی کھوج لگانا ناممکن ہی تھا۔ جب کہ ان کا جواب دینے کا انداز انتہائی مختصر اور روکھا سوکھا ہو اور جو کبھی کوئی انگلی اور ان کی دکھتی رگ پر پڑ جائے تو اتنا تڑخ کر بولتے تھے کہ بات کرنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے۔ چنانچہ یہ بھی رفتہ رفتہ ان کی جستہ جستہ گفتگو سے کھلا کہ یونیورسٹی کے بارے میں سناؤنی سن کر دل برداشتہ ہوئے' یہ بھی ایک بات تھی کہ پاکستان کا کون سا شہر تھا جو علی گڑھ والے یا خاص ان کے اندر رہے ہوئے لڑکوں سے خالی تھا۔ جس شہر گئے کوئی نہ کوئی ضرور ملا۔ جہاں گئے خوش ہوئے بڑی کوٹھیاں بڑے گھر کیسا اللہ کا کرم تھا جن بچوں کی شکل خدمت انہوں کی وہ کیسے بڑے بڑے افسر لگے ہوئے تھے۔ سو جہاں بھی گئے ہاتھوں ہاتھ لئے گئے ان کے ہاتھوں پل بڑھ کر جوان ہونے والے کل کے لڑکوں اور آج کے افسران کے گلے میں بجھیاں ڈال ڈال کر ملتے اور ان کو روک روک کر رکھتے' پر ان کے گھروں اور کوٹھیوں میں چند ے قیام کر پاتے۔ بات یہ تھی کہ بیگموں سے ان کی نہ بنتی تھی۔ تجربہ اور تجزیئے سے یہی نتیجہ نکلتا کہ ذرا رکھ رکھاؤ نہیں۔ اب بھلا وہ سارے کے سارے کرنل بریگیڈیئر اور ڈاکٹر انجینئران کی نظروں میں تو بچے ہی تھے۔ وہی لا ابالی کھلنڈرے جن کو اپنے سر پیر کا ہوش نہ تھا۔ اب وہ ان کے معاملوں کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھنے پر اصرار کرتے تو بیگمیں متنغض ہو جاتیں۔ وہ اپنے طور طریقوں کو جاری اور زندہ رکھنے پر مصر اور بیگمیں تھیں کہ ہر بات میں اپنا عمل دخل چاہویں تھیں۔ ان کی بی بیبیوں کو وہ لاکھ سمجھاتے اور ہر دم جتاتے کہ یہ اور طرح کے چلے ہوئے لڑکے ہیں تم چار

وطن کی کمی ان کی مزاج دانی کا دعویٰ کرتی ہو۔ دراصل وہ ایسی ساس بن جاتے تھے کہ جس کو یہ وہم رہتا کہ بہو ان کے بیٹے پر قبضہ غاصبانہ جما رہی ہے اور خود ان کو طاق پر بٹھانے کی سوچ رہی ہے۔ اب لاکھ سمجھاتے سلطان خان آپ ہم سے واسطہ رکھیں۔ اس خاتون کو اتنا ڈھب اور سمجھ کہاں کہ آپ کو اور آپ کے طور طریقوں کو سمجھ سکیں۔ بس یہی بات ان کو کھا جاتی۔ ہاں بھئی ٹھیک ہے بیوی سے دبیں گے نہیں تو جاویں گے کہاں اچھا بھئی تم ہی چلا لو اپنا نظام۔۔۔ بات یہ ہے کہ علی گڑھ والے تو ان کی نظر میں ارضی مخلوق تھے ہی نہیں۔ اور بیویاں تھیں کہ ان کو آسمانی مخلوق کا درجہ دینے سے انکاری۔ ظاہر ہے کہ ایک دن چپ چاپ کوارٹر خالی چھوڑ کر ٹین کا بکسا اور دری میں لپٹا بستر کندھے پر اٹھا کر چل دیتے۔ اس تیس سال میں پاکستان کے کس کس شہر نہ گئے۔ لنکا کے پنجاب سے سندھ، سرحد، بلوچستان کے ہر اس مقام پر پہونچے جہاں جہاں کسی علیگ کی پوشش کا سراغ ملتا۔

وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ پنڈت نہرو نے جو یونیورسٹی کے نام سے مسلم کا لفظ نکال دینا اور ان کے جی کا زیان کر دینا ہے اب اس کی تلافی علی گڑھ والوں کے درمیان رہ کر ہی ہو سکتی ہے پر وہاں تو نقشے ہی دوسرے تھے۔ سو تھک ہار کر طے کیا کہ جب یہی ٹھری ہے تو پھر کسی بھی ملازمت پر کھڑے ہو جائیں گے سلطان خان کو بھلا ملازمت کی کمی تھی جس کسی نے بھی کسی اتفاق کے تحت ان کے ہاتھ کی کوئی چیز بھی چکھ لی اسی نے ان کی تمنا کی۔ ڈیمانڈ تو ہر طرف تھی مگر اس کا کیا علاج کہ کسی بھی ملازمت پر کھڑے ہونے سے پہلے خفیہ طور پر تفتیش کرتے تھے کہ کچھ کھانا، پکوانا بھی جانیں ہیں، ملازم رکھنے کے آداب بھی جانیں ہیں یا نرے نو دو لیتے ہیں۔ اور نو دو لیتے ان کی برداشت سے باہر تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ ہر طرح جدی پشتی ہونے کا یقین اور اطمینان کر کے ملازمت قبول کر لی ہے اور کھڑے ہو گئے ہیں نوکری پر، مگر ایک آدھ دن ہی کے بعد کسی نہ کسی سے کوئی نہ کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی کہ اسی وقت استعفا دیئے بغیر کوارٹر سے سامان اٹھا چل پڑتے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ صبح جا کر کھانا پکایا ہے (ملازمت کی جملہ شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ پہلے دن اور وقت کا کھانا مینو اپنی مرضی کا ہوگا)اور باورچی خانے میں خواہ کتنے ہی مرچ مصالحے موجود ہوں مگر وہ اپنی ہانڈیوں کے لئے مصالحہ از سر نو بنفس نفیس خود جا کر دیکھ پرکھ کر لائیں گے۔ ایک ایک چیز سونگھ کر چکھ کر ٹٹول کر خریدنا اور پھر اپنی مرضی کے ایندھن پر پکائیں گے۔ اب یہ نہیں کہ لے کر کے بیٹھ گئے پکانے چیز کی لکڑی پر حد یہ کہ سیخ کے کباب، خواہ عام کباب ہو۔ بوٹی کا ہو یا پسندے کے، وہ بازار کے کوئلے پر لگانا اپنے "فن کی توہین" سمجھتے تھے اپنی مرضی اور شناخت کی لکڑی سے ایک دن پہلے خود انگارے تیار کر کے ہانڈی میں بجھا کر کوئلہ بناتے۔ اور اب دیکھئے اس کوئلے پر لگے کباب کا اور عام بیزاری (بازاری) کوئلے پر لگے کبابوں کا فرق اور ذائقہ۔ مگر یہ ہے کہ سمجھنے کے لئے مذاق کی تمیز کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اور اگر ایسے میں یہ حادثہ ہو جائے کہ صبح تو اپنی مرضی کا کھانا کھلا دینا اور دوسرے وقت آپ کے ہاتھ میں مرغی اور پالک تھما دیا جائے کہ پالک مرغی پکالو۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ اس کم بخت مرغی کی ریڑھ مارنے کو ہم ہی رہ گئے ہیں۔ استغفراللہ اس گھر کا تو پانی پینا بھی حرام ہو جاتا۔

اور نتیجہ وہی رہتا ہے کہ سامان اٹھایا اور بخیر و عافیت واپس بارہ لارنس روڈ۔ اب یہاں تو الگ بات تھی اپنا گھر تھا۔ چاہو جب تک رہو۔ علی گڑھ کا ناطہ اس پر مستزاد، آئے دن علی گڑھ والے میاں لوگوں کی آمد۔ قدیر میاں ابو میاں اور انیس میاں تو تھے ہی اپنے بچے، پھر یہ کہ کبھی کنور مظفر سندھ سے آ رہے

ہیں تو کبھی کل ابھی سرگودھے سے چلے کوئی ایک تانتا لگا رہتا تھا علی گڑھ والوں کا۔ بس ان کو دیکھ کر ان کے جی کا سارا غبار دھل جاتا' نکھرے نکھرے نظر آتے۔ ٹاٹھ دو جو دست بستہ اور ایک مودب' گویا دوپ کر اور بیٹھ کر نکلی' خیر بارہ نمبر کی ایک یہی بات نہ تھی۔ یہاں والوں سے ان کا دل اول تو یوں صاف تھا کہ کسی نے کبھی بھی ان کو ملازم رکھنے کی گستاخی اور جرات کی نہیں۔ بس مہمان طریق رکھا (درسول' یہ عطا نام آخر) دوم یہ ایک ہی کوٹھی میں آباد ایک ہی خاندان کے دو کنبوں اور گھروں پر ان کا حق کچھ زیادہ ہی لائق تھا۔ جس کی توجیہ وہ یوں کرتے تھے کہ بجلی بیگم صاحب (میری والدہ) کا تو یہ ہے کہ یہ دیکھئے ان کے والد صاحب انجینئر تھے لگا کر کے یکی بارک' منٹو سرکل سے اولڈ بوائز لاج کے نقشے ان ہی کے اور ان کی (ان کی) ہی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ اور یہ وہ مقامات تھے کہ سلطان خان کی طریقت میں جن کا نام باوضو ہو کر لینا لازم تھا۔ اور یہ راہ محبت کی وہ ادب گاہیں تھیں کہ جہاں سلطان خان کا بس چلے تو سر کے بل جاویں بس یہ تو پنڈت جی کی بے ادبی تھی کہ وہاں لے کر کے ہندو سکھ اور نہ جانے کیسے کیسے لڑکے گھسیڑ (گھسا) دیئے۔

اور پھر اسی کوٹھی کے دوسرے باسی بڑے صاحب (پھوپا آبا) تھے جو شملے سے علی گڑھ جاکر پڑھے اور بیٹے کو بھی اول سے آخر تک انگریزی اسکولوں میں پڑھانے کے بعد بالآخر ایم اے کرنے علی گڑھ ہی بھیجا۔ اس کے علاوہ بھی بارہ نمبر کو ایسے اعزاز حاصل تھے کہ وہ ان کی میزبانی کا اعزاز پاتا۔ پھر بڑے صاحب کو یہ بھی اعزاز حاصل تھا کہ ان کا خانساماں خان صاحب کا رشتے میں بھتیجا تھا۔ اور پاکستان بننے سے کچھ عرصے پہلے یونیورسٹی کے ڈائننگ ہال سے بھی منسلک رہا تھا۔ اگرچہ وہ اس بات پر چڑتے تھے کہ وہ بھی وہاں بیراگیری کر چکا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ خاک بیراگیری کی ارے شلیوں میں لگوا تھا خیر وہ جو کچھ بھی لگا ہوا تھا ایک اس کا رشتہ اور تعلق ایک اور سبب بنا کہ وہ اس باورچی خانے سے مستقل کھانا کھانے ملازمتوں اور ملازم رکھنے والوں سے وہ اس حد تک بددل ہو چکے تھے کہ اب یہ خیال ہی انہوں نے ترک کر دیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ ہم کو رکھنے اور کام لینے والے بھی نہ رہے اور صاف بات یہ ہے کہ گھر کی نوکریاں کرنے لائخ (لائق) ہم بھی نہیں' ہمارا دل تو ہوسٹلوں کے لڑکوں کے کام ہی سے خوش ہوتا ہے یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ سو وہ رہی نہیں۔

ایسا تو نہ کہیئے خان صاحب لاہور میں تو یونیورسٹیاں' ہیں ایک انجینئرنگ یونیورسٹی اور دوسری۔۔۔۔۔۔

ارے بس دیکھ رکھی ہیں وہ یونیورسٹیاں بھی۔ آپ سمجھتی ہیں کہ ہم غافل بیٹھے ہیں سب بھیڑ لے آئے ہیں سب دیک بھال لینا (آواز میں حد بھر تلخی تھی)

پھر وہ ایک دم افسردہ ہو گئے سر جھکا لیا پھر چند لمحوں کے بعد منہ اٹھا کر آسمان پر اڑتے چیل کووں کے درمیان جیسے کچھ ڈھونڈتے رہے۔ پھر نہایت دل گرفتہ اور شکستہ آواز میں بولے۔

"اپنا تو بس ہمیشہ سے یہ رہا کہ لگا کے ہندوستان سے پاکستان کے جس جس شہر میں گئے۔ پہلا کام یہی کرتے کہ وہاں کی یونیورسٹی جاکر دیکھتے۔ کیا کلکتہ کیا بمبئی دلی۔ کراچی۔۔۔ مگر وہ علی گڑھ والی بات کہیں نہیں۔۔۔ ملی۔۔۔۔ ہاں مگر بس ایک ذرا کچھ پشاور کے اسلامیہ کالج اور وہاں کے لڑکوں میں کچھ ایک ذرا جھلک سی۔۔۔۔

آواز ٹوٹ گئی بولتے بولتے چپ ہو گئے۔
"پھلا وہاں پشاور کے کالج میں ایسی کیا بات نظر آئی" کئی بار پوچھنے پہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔
ایک تو ان کی یونی فارم وہی کالی اچکنیں وہی سفید شلواریں تمہارے بچے تو سفید علی گڑھ کٹ پاجامے پہنا کریں تھے۔ خیر یہ بھی دیکھ کر نقشہ سا گھوم گیا۔ نظروں میں۔۔۔
بات کرتے کرتے رک کے آنکھوں کی نمی کو اپنی ہتھیلیوں سے رگڑ کر خشک کیا۔
رہے نام اللہ کا!
یہاں پر ان کا گلا اتنا رندھ چکا تھا۔ بات کیسے جاری رکھتے۔

(۳)

اب تو مدت ہوئی ہجرو فراق کی ماری' داغ فراق صحبت شب کی وہ شمع بھی بجھ گئی۔ گئے دنوں کا سراغ لیتے لیتے۔ وہ شخص نہ جانے کدھر کو گیا۔ اور جو کہے ہیں نا کہ مدت ہوئی تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں۔

خان صاحب ذہن کے نئے تناظر میں اپنی جگہ برقرار نہ رکھ سکے اور مدت سے وہ یاد کے کسی گوشے میں موجود نہ تھے۔۔۔ کتنے سال گذر گئے' زندگی نے کتنے پلٹے کھالئے۔ اور اس جگہ کے تناظر میں جہاں وہ درد و فراق کی ماری وہ بھٹکی بھٹکی اداس روح جب زنتی ماحول اور اس کے تمام تر تناظر سے کہ جس کے درمیان وہ نہ جانے کن کن رویوں اور کیسی کیسی شکلوں اور ان کے ساتھ گئے دنوں کا سراغ لگاتے لگاتے مایوس ہو جاتی تو آسمان کی نیلمیں پنہائیوں اور اڑتے ہوئے کووں اور چیلوں کے درمیان تکا کرتی۔ اس پورے تناظر میں کتنی تبدیلی آچکی ہے اتنی کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بچ کیا ہے' حقیقت کیا تھی کہ وہ کوارٹر تک کہ جس میں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع اپنی خاموشی کے بیس بائیس سال گذار گئی وہ بھی تو اک تعمیر کی زد میں آکر معدوم و بے نشاں ہوا۔ وہ بچ ہی تو کہا کرتے تھے میاں کس کی بچی ہے۔۔۔ اور کس کی رہی ہے۔

سو اب سلطان خان کا کیا مذکور کہ جو اک گھر تھا کہ مدت ہوئی اجڑا غموں میں۔

(۴)

پھر آج کیوں ۱۹۹۱ء کے ماہ دسمبر کی جاتی تاریخوں کے اس یخ بستہ دن میں علامہ اقبال ٹاؤن کی اس جدید بستی کے اس کالج الموسوم بہ گورنمنٹ اسلامیہ کامرس کالج کے ٹھنڈے یخ بستہ ہال میں دو رویہ کرسیوں پر بیٹھے گھر گھر کے طالب علموں کی صفوں کے درمیان سے گذرتے گذرتے مجھے اپنے اندر سے ابھرتی ہوئی آواز کو باہر آنے سے روکنے کے لئے لبوں کو سختی سے بھینچ لینا پڑتا ہے۔ کہیں مجھے یہ وہم ہوا ہے کہ بس اب بہت بلند آواز میں میرے منہ سے نکل کر رہے گا۔

"تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے"

اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے اس آواز کو روکنا پڑے۔۔۔۔ اور پھر اچانک ہی ایسا لگا ہے کہ ہجر کا مارا وہ شخص انگڑائی لے کر اپنی تربت میں اٹھا بیٹھا ہے۔
اور ان بجھی بجھی سی آنکھوں میں ایک جوت سی ابھرتی دیکھی ہے۔

کیا واقعی اس کا سبب اس کالج کی تقریبات میں ملک بھر کے متعدد کالجوں سے آئے ہوئے طالب علموں کی ٹولیوں کے درمیان وہ کالی شیروانیوں اور سفید شلواروں والی یونیفارم تو نہیں ہے جس کو دیکھ کر گمان ہوکہ گویا ان بچوں کے درمیان سلطان خان کے میاں لوگ وہ صاحبزادے آن بیٹھے ہوں جن کو سلطان خان ہمارے لڑکے اور ہمارے بچوں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہاں بالکل وہی مخصوص پیٹرن وہی سیاہ شیروانی اور سفید شلوار کے امتزاج کا معصوم تقدس۔ اچانک ہی جیسے سلطان نے اپنی کچھ کچھ افسردہ اور کچھ طنز بھری آواز میں سرگوشی کی ہو۔

ہاں مگر۔۔۔ بس وہ پشاور کے اسلامیہ کالج کی بلڈنگ اور وہاں کے لڑکوں میں اپنی یونیورسٹی کی سی اک جھلک سی نظر آئی۔ وہی کالی شیروانیاں۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور پھر جیسے وہ آواز کانچ کے برتن کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی چلی گئی ہو۔

صبح آٹھ سے لے کر رات آٹھ بجے تک وہ مباحثہ جاری رہا تھا۔ خوبصورت جملوں اور ٹھوس استدلال سے تجی بنی تقریریں ایک بہتی ندی کے مدھر اور خوش آیند آہنگ کی طرح کانوں سے گزر کر جل ترل میرے اندر کے شیشوں میں اترتیں میرے آگے نمبر دینے والا کاغذ دھرا تھا اور بال پوائنٹ کی نوک مارکنگ میں مصروف تھی۔ مگر اندر اترتی ہر آواز ایک اور ہی آواز میں تحلیل ہو رہی تھی۔

"ہاں خان صاحب تم سچے تھے۔ اسلامیہ کالج پشاور کی بلڈنگ' یہ یونیفارم واقعی بس ایک ذرا جھلک سی ہے مگر کتنی مسرور کن۔"

تقریب تمام ہوئی سب اپنی اپنی منزل کو روانہ ہوئے کتنی عجیب بات تھی کہ اتنے یخ بستہ ہال میں اتنی دیر تک بیٹھ کر ٹھٹھرنے اور اتنی طویل اور زور دار تقریروں کے لفظ لفظ کو غور سے سننے کے بعد بھی بڑی تازگی اور سرور کا احساس تھا۔ شاید مجھے اس احساس سے سکون آرہا تھا۔ کہ آج اتفاقاً" ہی مجھے سلطان خان کی وہ فردوس گم گشتہ مل گئی۔ ایک عجیب سی خوشی اور تازگی کا احساس تھا۔ وہ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ یقیناً" آج سلطان خان کی روح کو قرار آگیا ہوگا اور وہ کتنا سکون محسوس کررہی ہوگی۔ آج کالی شیروانی اور سفید شلواروں کے یونی فارم میں ملبوس میاں لوگوں' صاحبزادوں کے قدموں نے اس خاک کو چھوا ان کے قدم اس دیار کی مٹی پر پڑے جس کے کسی گمنام گوشے کے بے نشان مرقد میں ایک ہجر کا مارا محو خواب ہے۔ گویا محبوب خود چل کر محبت کے در پر آن کھڑا ہوا۔

اس تمام رات ایک عجیب طرح کی خوشی اور سکون کے احساس نے بے خواب رکھا۔۔۔ رہ رہ کر ایک تصویر وفا نظروں میں بنتی اور بگڑتی تھی۔ کہ جس نے فقط ایک ناسٹلیجا کو اپنا کر سارا کچھ تج دیا تھا۔ اپنا آپ۔ اپنا فن اور اپنا کسب تک۔

اور اس ہجر و فراق اس ناسٹلیجا کی خاطر ان کا کسب اب ایک مختصر سی گٹھڑی رہ گئی تھی جس کو وہ اپنی اصطلاح میں بساط خانے کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جمعرات کے جمعرات وہ ٹین کے بکسے میں سے سیاہ (جو بھوسلی ہو رہی تھی) شیروانی نکال کر زیب تن کرتے سرخ رومی ٹوپی سر پر جماتے (پھندنا اب ٹوٹ چکا تھا صرف ہتھنکیا کی طرح اٹھی ہوئی ایک ننھی سی ڈنڈی سی کھڑی رہتی تھی) اور بغل میں بقچی (گٹھڑی) دبا کر چل پڑتے۔ داتا صاحب کی جانب جمعرات جمعہ بقچی میں بندھی بساط خانے کی اشیاء کو داتا صاحب آنے والوں کے ہاتھ فروخت کرتے اور ہفتہ کی سہ پہر کو واپس لوٹتے تھے۔ یہاں آنے کے کچھ عرصے کے بعد سے تا حیات

ان کا یہی دستور رہا۔۔۔ واپسی پر اکثر ایک گیندے کا ہار گلے میں پڑا ہوتا اور بس نہ کوئی تبرک نہ کوئی اور چیز کوئی ان سے زیادہ کلام کر نہیں سکتا تھا' بے دماغی میں کم و بیش میر صاحب (میر تقی میر) کے ہم پلہ نہ سہی بس انیس بیس ہی کے جا سکتے تھے۔ البتہ میرے معاملے میں طرح دے جایا کرتے تھے۔ یہ سبب اس کے کہ کیا نام کے کالج میں پڑھاتی ہیں۔ ان کی نظر میں استادی اور پھر وہ بھی پرافیسری سے بڑھ کر بلند مرتبہ شاید بادشاہ وزیر کا ہی ہو سکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ بدتمیز اور تو دھلتے نہ ہوں۔۔۔ غرض میں ان کی دی ہوئی اس رعایت سے کہ "ان کی بات دوسری ہے کالج میں پڑھاویں ہیں" فائدہ اٹھا کر ان کو تبادلہ خیال پر مجبور کر دیا کرتی تھی اکثر ان کی پوٹلی ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول ڈالتی کہ کوئی چیز ہمارے ہاتھ بھی بیچ دیا کیجئے وہ بساط خانہ بھی کیا۔ بچوں کی سیٹیاں۔ پلاسٹک کے ننھے ننھے کھلونے نائیلون کی کنگھیاں' لال سبز پلاسٹک کے فریموں والے چھوٹے چھوٹے آئینے کچی چینی کی چوڑیاں' نیلی پیلی تتلیوں کی شکل والے کلپ۔

وہ بے حد خجل ہو کر میرا ہاتھ جھٹک دیا کرتے۔ ہٹو یہ تمہارے لائخ (لائق) نہیں ہیں۔

"اے سلطان خان صاحب پھر کون خریدے گا انہیں" میں سوال کرتی

"بس غریب غربا کے خریدنے کی ہیں۔۔۔ تم سے کیا مطلب ہے" داتا دربار وہ کسی روحانی فیض یا صفائے باطن کی غرض سے قطعی نہیں جاتے تھے بلکہ بغرض تجارت اور مال بیچنے بساط خانہ کا۔ بات یہ تھی کہ مسجدوں میں مسجد (مسجدوں میں مسجد) تھی علی گڑھ کی مسجد اور مزاروں میں مزار تھا سرسید کا۔۔۔ اور بس یوں ہی بسر کر گئے۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی میں نے کبھی سراج کا یہ شعر

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

پڑھانے کا خیال کیا۔ خان صاحب سامنے آکھڑے ہوئے۔ کہ انہوں نے اپنی شاخ نہال غم کو سرسبز رکھنے کے کیا کیا جتن نہ کئے۔۔ مثلاً یہ کہ۔

بیروں کی فٹ بال ٹیم کے کپتان کی حیثیت میں پیروں اور پنڈلیوں کے پٹھوں اور جوڑوں کا دائمی عارضہ جو سردیوں کی بارشوں میں ابھرتا تھا۔ اسی شاخ نہال غم کی مانند ہرا ہو کر۔ ان پھولے ہوئے جوڑوں اور درد کی کسک کو محسوس کر کے جیسے زندگانی ان کے اندر جاگ اٹھتی پھر وہ پچھلے صحن کی اس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے جس کی دوسری جانب سینٹ انتھنی کی دیوار تھی (اب یہ بھی نکتہ نوٹ کرنے کے قابل ہے) اس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کا سبب یہ بنتا تھا کہ کچھ بھی ہو درسگاہ تو ہے لڑکوں بچوں کے کھیلنے شور مچانے کی آوازیں تو آویں ہیں' ہاں تو وہ اس دیوار سے ٹیک لگا کر اپنے پیروں کی پٹیاں کھولتے بڑی نرمی سے مرہم کی ڈبیا کا ڈھکنا اٹھاتے (یاد رہے یہ ڈبیا علی گڑھ سے ہی زاد راہ میں آئی تھی) جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا خاص فٹ بال کھیلنے والوں کے جوڑوں کے درد کی دوا ہے۔ ایک بار میں نے ان کو بڑے پیار سے اپنے پھولے ہوئے جوڑوں پر سہل سہل کر مرہم لگانے اور پھر دھیرے دھیرے ان پر گرم پٹیاں لپیٹتے دیکھ کر مشورہ دیا کہ ڈاکٹر توفیق سے ان کا علاج کروا لیں۔ تو مسکرائے اور بڑی سرگوشی میں بولے "بات یہ ہے کہ میں ڈاکٹر توفیق تو کیا اللہ میاں سے بھی نہ کہوں کہ ان کو ٹھیک کر دے۔"

"کیوں؟"

بات یہ تھی کہ جب یہ درد یہ کسک جاگتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس سہرے ماضی کی ایک ایک یاد جاگ اٹھتی اور انگڑائی لے کر کھڑی ہو جاتی۔ وہی بال ہوتی وہی [illegible] تھیں اور وہ تمام [illegible]

میں ان دنوں درد کو بڑھا رہی تھی۔ ایک دم ہی منہ سے نکلا۔ بے شک "[illegible] کسے ہے گلستاں کی احتیاط" اور اب آج وہ یاد آہی گئے ہیں تو یہ بھی خیال آرہا ہے اب میں کسی کی دعوت کرنے کے خیال سے کتنا گھبراتی ہوں اور وہ ہوا کرتے تھے تو بے دھڑک کر دیتی تھی کہ بس سلطان خان کی کوٹھی کے دروازے تک جاکر درخواست ہی تو کرنا ہوتی تھی۔ میری درخواست انہوں نے رد نہ کی کہ بڑا لحاظ کرتے تھے کاہے سے کہ ایک تو خود کالج میں پڑھاتا اور پھر علی گڑھ سے اتنا گہرا رشتہ کہ باپ نے ان کے ظہور وارڈ سے لے کر ایس ایس اور ایل ایل بیا تک علی گڑھ سے کیا رائڈنگ اسکول سے لے کر یونین تک تمام ایکٹیوٹی میں حصہ لینا' پھر وہ ان کے نیلی چھتری والے خالو ظفر عمر اور میرٹھ والے خالو آفتاب عمر اور اگلی نسلیں ساری کی ساری علی گڑھ سے انھیں کیا ماموں اور کیا ماموں کے بیٹے۔۔۔۔۔۔ رہے نام اللہ کا۔

اور پھر ذرا سیدھی سی ہے' اپنی قدر بھی نا جانے۔ ایسی ہی پھرا کرے ہے اس کو تو اتا بھی خیال نہیں رہوے ہے کہ یہ درجہ اول کی آفیسر ہے۔ بس یہی تمام خیالات انہیں مجبور کر دیا کریں تھے۔ حامی بھر لیتے ادب سے سر جھکا کے' میں پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتی۔ پھر وہ میرے باورچی خانے کی ہر چیز پر معائنہ [illegible] کر دیا کرتے تھے حد یہ کہ بڈھے کشمیری ملازم سے بھی کہہ دیتے' پتہ ہے تم بڑے خسماے گے وے ہو ان کے۔ پر آج ہٹ کے بیٹھو سو وہ ہنستا ہوا بیچ کے بدھو' ہٹ کے بدھو' کرتا چٹکیاں بجا کر کہتا چلو جی آج تو میری چھٹی ہے۔

مگر سلطان خان کھانا واقعی ایسا پکا دیتے کہ اب کیا کہوں۔ پر وہ مجھے اس بناؤ پر نہیں معزز لگتے تھے بلکہ اپنی یونیورسٹی کے استوار عشق کی بناء پر' سچ یہ ہے کہ ان کی تو جدھر آنکھ لڑی انہوں نے پھر وہیں دیکھا تھا۔

غلام الثقلین نقوی

نقطے سے نقطے تک

اس نے انٹر پاس کیا تو اسے فنانس ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی کیونکہ جنگ لگی ہوئی تھی اور نوکریوں کی بھرمار تھی۔ دو سال نوکری کرنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اکاؤنٹس اس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے نوکری چھوڑ دی اور سوچا کہ مجھے بی اے کر لینا چاہیے۔ کالج میں داخلہ لیتا تو اسے دو سال لگ جاتے۔ پرائیویٹ طور پر بی اے کرنے کے لئے ضروری تھا کہ کسی لائبریری یا سکول میں نو مہینے مسلسل تجربہ حاصل کیا جائے۔ اس نے اپنے ضلع کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کو درخواست دی کہ اسے کسی سکول میں ان ٹرینڈ ٹیچر کی تقرری دی جائے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ہندو تھے اس لیے بڑے اخلاق سے پیش آئے درخواست پڑھ کر بولے "کاکا! مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم بی اے کرکے پڑھنے پڑھانے کا پوتر پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔ تو پھر رشیوں منیوں کی طرح شہر سے دور چلے جاؤ۔ شہر میں رہو گے تو پھسلنے اور بھٹکنے کے بہت سے موقعے ہوں گے اور تم علم سے لو لگا کر نہیں بیٹھ سکو گے۔"

اب بتایئے اتنی رسان سے جو مشورہ دیا گیا' بھلا کاکا اس کا کیا جواب دیتا اتفاق سے ایک مسلمان اے ڈی آئی بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ڈی آئی نے اس سے پوچھا "کیوں شیخ جی! میرا مشورہ صائب ہے نا؟"

شیخ جی بڑی مشکل سے غصے کو دباتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے جناب!"

"کاکا! جاؤ دفتر سے تقرری آرڈر لے لو۔" ڈی آئی بولا۔

ڈی آئی کو سلام کرکے باہر نکلا تو برآمدے میں شیخ جی نے اسے آلیا ابھی تک ان کا چہرہ غصے کی وجہ سے سرخ تھا۔ کہنے لگے "اوہ بھائی لڑکے! کیا نام ہے تیرا؟"

"عبد المجید۔"

"میاں عبد المجید! جنگ زوروں پر ہے اور انگریز نے فوج میں افسروں کی بھرتی کے لئے دروازے چوپٹ کھول دیئے ہیں۔ تم مجھے ہر لحاظ سے فٹ نظر آتے ہو جاؤ کمیشن کے لئے اپلائی کرو۔"

"جی نہیں! میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔ میں انگریز کی بقاء کے لئے توپ کا ایندھن نہیں بننا چاہتا۔ میں ٹیچر بن کر قوم کی خدمت کروں گا۔"

"بکواس! قوم کی خدمت! نری بکواس! لڑکے! میں ایم اے بی ٹی ہوں۔ انٹر کرنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے کوئی معمولی سی نوکری مل جائے لیکن اس زمانے میں بڑی کساد بازاری تھی میں فوج میں جا سکا' نہ پولیس میں محکمہ مال میں بھی میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجبوراً بی اے کیا' پھر ایم اے کیا اور مقابلے کے ہر امتحان میں فیل ہونے کے بعد میں نے بی ٹی کر لی۔ پٹوار بھی مل گئی ہوتی تو آج میں اگر نائب تحصیلدار نہیں تو گرداور اور قانون گو تو ضرور ہوتا......"

"جی میں نے فیصلہ کر لیا ہے" وہ بولا "کیا آپ مجھے کسی قصبے کے مڈل سکول میں نہیں لگوا سکتے؟"
"لگوا سکتا ہوں لیکن نہیں لگواؤں گا۔ ڈی آئی نے تمہیں ایک گاؤں میں اس لئے بھیجا ہے کہ تم پی اے نہ کر سکو کیونکہ تم مسلمان ہو اور میں بھی تمہیں مڈل سکول میں اس لئے نہیں لگواؤں گا کہ تم مسلمان ہو اور وہاں بی اے کر لو گے نتیجہ ایک ہی ہے لیکن نیتوں میں فرق ہے۔" شیخ صاحب بولے۔

ایک دیہاتی نے کہا "چک نمبر پندرہ! بس سمجھ لو "سد چد" فاصلے پر ہے "سد چد" کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا تو اس نے کہا "یہ بتاؤ......... کتنے میل؟"
"یہ نہ پوچھو۔ بس یہاں سے آواز دو تو وہاں تک پہنچ جائے۔" دیہاتی بولا! وہ ایک نہر کے کنارے پر کھڑا تھا چک نمبر پندرہ کے پل پر اسے اتار کر ڈرائیور کنارے کی سڑک پر دھول اڑاتا ہوا بس کو دوڑا لے گیا تھا۔ وہ اس شاپ کا اکیلا مسافر تھا۔ اس کے سر پر شیشم کا سایہ تھا اور قدموں میں اس کا سوٹ کیس پڑا تھا اور اس کے اوپر بستر۔ گرمی اور لو میں اتنا سا ڈھیر اسے کنچن جنگا کی چوٹی سے بھی بلند نظر آرہا تھا۔ وہ کچی سڑک جو چک نمبر پندرہ کو جاتی تھی' ہر قسم کے مسافر نواز سائے سے محروم تھی۔ کناروں پر کچھ جھاڑیاں تھیں جو دھول سے اٹی ہوئی تھیں اور تیز دھوپ کے لہریئے ان پر اڑ رہے تھے کبھی کبھار کوئی ننھا سا بگولا بھی آتا اور جھاڑیوں کو تھر تھرا کر سڑک پار کر جاتا۔
اس نے بستر کندھے پر رکھا اور سوٹ کیس ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ گدھے پر سوار ایک جوان نے اس سے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"
"چک نمبر پندرہ!"
"چک نمبر پندرہ میرے رستے میں پڑتا ہے۔ میرے آگے صندوق اور بستر رکھ دو اور خود قدم سے قدم ملا کر چلتے رہو۔" وہ جوان بولا۔
چند گز چلنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہو تو گدھے اور آدمی کی رفتار میں بہت فرق ہے۔ ایک لطیفہ بے اختیار اسے یاد آگیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا۔
گدھے والے نے پوچھا "بابو! کیا بات ہے! بڑے خوش ہو۔"
"ایک لطیفہ یاد آگیا ہے اگر سننا ہے تو گدھے سے اترنا پڑے گا۔"
گدھے والا بھی یقیناً" حس ظریفانہ کا مالک تھا کہ فوراً" گدھے سے اتر آیا لطیفہ سن کر وہ بہت ہنسا کہنے لگا "میرا ایک گدھا بہت اڑیل ہے ایک چٹکی اس پر بھی آزماؤں گا۔"
"اور اگر گدھا تم سے آگے نکل گیا تو کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔
گدھے والے نے ذرا شرما کر کہا "پھر وہی چٹکی اپنے آپ پر آزماؤں گا۔"
"لیکن دونوں صورتوں میں نتیجہ تو ایک ہی رہے گا۔ پہلے گدھا آگے نکل جائے گا پھر تم گدھے سے آگے نکل جاؤ گے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ انسان اور گدھا قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔"
چنانچہ گدھے والے نے "چھٹ" میں ایک طرف بستر رکھا اور دوسری طرف سوٹ کیس۔ توازن ٹھیک کرنے کے بعد وہ اس سے ہم قدم ہو گیا۔ اثنائے سفر میں ایک دوسرے سے پورا پورا تعارف ہو گیا۔ وہ چک پندرہ سے اگلے چک یعنی نمبر سولہ کا کمہار تھا۔ گاؤں والوں کو مٹی کے برتن مہیا کرنے کے علاوہ بار برداری کا کام بھی، کرتا تھا۔ آج سے نصف صدی، پہلے ہر گاؤں ایک اقتصادی یونٹ ہوا کرتا تھا۔ کسان اناج پیدا کرتا

تھا۔ ترکھان، لوہار، موچی، نائی، دھوبی، کمہار اور بھنگی کا تفیر نظام معیشت چلانے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ اب بھی پنجاب اور سندھ میں بہت سے گاؤں ایسے ہیں جہاں یہ نظام زندگی کسی نہ کسی صورت میں چل رہا ہے۔ جس گاؤں میں وہ استاد لگ کر گیا تھا، وہاں ابھی تک اس نظام زندگی میں کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔

کمہار اسے گاؤں کے نمبردار کے ڈیرے پر لے گیا۔ یہ نمبردار ہندو تھا۔

اس نے پوچھا "منشی جی! آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"میں مسلمان ہوں۔"

اس نے کمہار سے مخاطب ہو کر کہا "لگتا ہے تو اس گاؤں کا رہنے والا نہیں؟"

"نہیں جی! میں چک سولہ کا رہنے والا ہوں۔"

"منشی جی کو نمبردار چوہدری مستقیم کے ڈیرے پر لے جا...... منشی جی! کوئی اور ٹہل سیوا؟"

"بس جی شکریہ! اتنی ہی ٹہل سیوا کیا کم ہے کہ آپ نے میری راہنمائی کر دی۔" وہ بولا اور نمبردار نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"چند قدم دور جاکر اس نے نوجوان کمہار سے کہا "یارا! میں تمہارا نام پوچھنا ہی بھول گیا۔"

وہ بولا "میرا نام پنوں ہے۔"

"واہ! واہ! کیا اچھا نام ہے۔"

اس نے پہلی بار پنوں کے سراپے پر بھرپور نظر ڈالی۔ چھریرا بدن، گندمی رنگ، موٹی موٹی آنکھیں اور اوپر کے ہونٹ پر مونچھ کی پتلی سے لکیر جسے ابھی قینچی بھی نہ لگی تھی اس کے سراپے میں اسے رانجھے، پنوں اور مہینوال والی ہر وہ ادا نظر آئی جو استاد الہ بخش مصور نے دیکھی تھی اور سطح قرطاس پر منتقل کر دی تھی۔

اس نے پوچھا "پنوں کو کوئی سسی بھی ملی یا نہیں؟"

پنوں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

"تمہارا نام تو مہینوال ہونا چاہیے تھا۔" اس نے کہا اور پھر اپنی بات پر خود ہی شرمندہ ہو گیا کہ سوہنی تو کمہارن تھی۔ کیا پتہ اس بات پر نوجوان کمہار کو کتنا دکھ ہوا ہو۔

اس نے بات بدل کر کہا "پھر سوہنی اپنے ہی گھر میں رہتی اور چناب عبور کرکے کسی عزت بیگ سے تو ملنے نہ جاتی اور ڈوب کر جان نہ گنواتی۔"

معلوم ہوا کہ پنوں نے اس کی کسی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

وہ کہنے لگا "منشی جی! نمبردار نے تمہیں لسی پانی بھی نہ پوچھا۔ کوئی پٹواری اس کے ڈیرے پر آتا تو اس کے آگے بچھ بچھ جاتا۔ تم پٹواری کیوں نہ بنے؟"

"آدمی وہی بنتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"منشی جی! پتہ ہے اس نمبردار کا نام کیا ہے؟...." اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولا "ماں باپ نے اس کا نام کرم چند رکھا تھا۔ لوگوں نے اس کا نام کھوتا رام رکھ دیا۔ اور اب چک پندرہ کو لوگ "کھوتی پور" بھی کہتے ہیں۔"

پنوں ہنسا تو وہ بھی بے اختیار ہنس پڑا حالانکہ نمبردار کے رویے سے وہ خاصا دل شکستہ ہو گیا تھا۔

نمبردار مستقیم کا ڈیرا گاؤں کے انتہائی شمال میں تھا۔

اس نے پہنچتے ہی کہا "اچھا تو تم ہو نئے منشی؟"
"جی ہاں!" وہ بولا
"معلوم ہے، تم جس منشی کی جگہ آئے ہو، اسے کس کی شکایت پر ہٹایا گیا؟"
"مجھے معلوم نہیں۔"
"میری شکایت پر اور یہ بھی پتہ ہے کیوں؟"
"جی نہیں!"
"وہ بودے واہ کر کاتن کی گلیوں میں پھرتا تھا اور ہماری وسیوں بہنوں کو تاڑتا تھا۔" نمبردار نے خضاب لگی مونچھ کو بل دے کر کہا۔

نمبردار مستقیم پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ سر پر رنگین صافہ، آنکھ میں کاجل اور پاؤں میں زری کا کھسہ۔ لگتا تھا کہ وہ چار مربع زمین کا مالک ضرور ہے اور ان عورتوں کا شوقین بھی جو دوسروں کے لئے وحشی بہنیں تھیں۔

"منشی کو مدرسے لے جاؤ" اس نے نوجوان کمہار کو حکم دیا۔
جب گدھا چل پڑا تو وہ بولا "منشی! کوئی خدمت تو نہیں؟"
"شکریہ چوہدری! اتنی ہی خدمت کافی ہے۔"
اس کے لہجے میں جو طنز تھی، وہ نمبردار مستقیم نے محسوس کر لی کیونکہ اس کی مونچھ کے دو چار بال تھرتھرا گئے تھے۔

سکول کی عمارت گاؤں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ دو کچے کمرے جن کے آگے برآمدہ تھا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی اور ایک پھونس کا چھپر۔ گاؤں کا ماحول ہرا بھرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین قابل ہے اور اسے پانی وافر ملتا ہے لیکن زمین کے جس ٹکڑے پر سکول کی عمارت بنی تھی، اسے کلر کھا گیا تھا۔ اور پھولی پھولی مٹی میں پاؤں دھنستے تھے۔ سکول کی کچی چار دیواری گری پڑی تھی۔ کہیں کہیں دیوار کے آثار باقی نظر آتے تھے اور اب کچے کمروں کو بھی کلر کھا رہا تھا۔ سکول کے صحن کے وسط میں اوکاں کا ایک بوڑھا درخت کھڑا تا اور اس کے سائے میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اوکاں کے سائے تلے زمین میں کلر نہیں تھا البتہ بھیگی بھیگی سی دکھائی دیتی تھی۔

وہ، بچوں اور گدھا کوٹھڑی کے سامنے جا کھڑے ہوئے، تو اندر سے ایک میلا سا دھوتی پوش برآمد ہوا۔

پوچھنے لگا "آپ کون ہیں؟"
"میں منشی لگ کر آیا ہوں۔"
"آپ کا نام؟"
"عبد المجید۔"
"منشی عبد المجید جی! میرا نام منسا رام ہے۔ آئیے! پدھاریئے! پر کیا آپ ایک ہندو کے ساتھ گزارا کر لیں گے؟"
"کیا مطلب"

"میرے ساتھ ایک کمرے میں رہ لیں گے؟"

"میں تو رہ لوں گا لیکن آپ کیا کریں گے۔ آپ کا دانہ پانی بھرشٹ ہو جائے گا۔۔۔"

"میرا بھی یہی مطلب تھا۔" لالہ نسا رام بڑی لجاجت سے بولا۔

تاہم از راہ مہمانداری اس نے ایک کھاٹ اندر سے نکال کر باہر بچھا دی جہاں مکان کا سایہ کھاٹ کے برابر رہ گیا تھا۔

"بیٹھیے!" اس نے کہا "کوئی جل پانی؟"

اس نے پنوں سے کہا "یار! تیرا بہت بہت شکریہ۔ اب تو جا۔ سامان اتار کر کھاٹ پر رکھ دے۔"

پنوں بولا "منشی! جب یہ گاؤں تجھے قبول نہیں کرتا تو میرے ساتھ میرے گاؤں کیوں نہیں چلتا؟"

"اسے گاؤں ہی لے جانا پر انہیں پہلے بڑے منشی جی سے تو مل لینے دے۔" لالہ نسا رام نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"وہ چک ہی میں رہتے ہیں۔" لالہ جی بولے۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا تو پنوں بولا "منشی! سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو؟ چلو میرے ساتھ کل صبح سکول لگے تو بڑے منشی سے مل لینا۔"

گاؤں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا' اس سے بچارے کا دل پژمردہ ہو گیا تھا گویا قومی خدمت کے بیج سے جو انکوا پھوٹ رہا تھا' اسے لو کا ایک جھونکا جھلس گیا تھا۔ گرد اٹھی دھول اس کے ہونٹوں پر پپڑی جما گئی تھی اور منہ کا ذائقہ حلق تک کڑوا ہو چکا تھا۔ ہینڈ پمپ پر اس نے اوک سے پانی پیا اور پنوں کو بھی پلایا۔ گدھا بڑے صبر شکر سے انہیں پانی پیتے دیکھتا رہا۔

چک نمبر پندرہ اور سولہ کے درمیان ایک چھوٹا سا راجباہ حائل تھا اس پر پلیا موجود تھی۔ یوں! اسے پھلانگا بھی جا سکتا تھا۔ اس ایک پھلانگ پانی سے! اس علاقے کی سرسبزی و شادابی قائم تھی بلکہ چرند' پرند اور انسانوں کی زندگی بھی جو اس علاقے میں بس رہے تھے چک سولہ میں داخلہ ہوتے ہی ایک احاطے میں اسے چاک چلتا ہوا ہوا نظر آیا۔ مٹی کے کچھ برتن دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ ایک کونے میں آوا سلگ رہا تھا۔ جونہی وہ احاطے میں داخل ہوئے چاک پر بیٹھا ہوا آدمی اٹھ کھڑا ہوا بولا "پنوں آج بہت دیر لگا دی؟" پھر اچانک اجنبی پر نظر پڑی تو پوچھا "یہ مسافر اسی چک کا ہے یا کہیں آگے جائے گا؟"

"آج رات یہیں رہے گا۔ چک پندرہ میں منشی لگ کر آیا ہے۔" پنوں بولا "کیا کہہ رہے ہو' یہیں رہے گا؟ ہمارے گھر میں؟ پگلے! سوچ تو لیا ہوتا' ہمارا گھر اس شہری بابو کے قابل بھی ہے کیا؟ پنوں کا باپ بولا "چک پندرہ نے اسے قبول نہیں کیا تو بے چارہ کہاں جاتا۔" پنوں نے سارا قصہ سنایا تو باپ کہنے لگا "چک پندرہ والے تو ازل کے کمینے ہیں۔ سنا ہے' ان کے بزرگ مہمان پر کتے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ جا! منشی جی کو چھپر تلے بٹھا۔"

ایک رنگیل پلنگ چھپر کے نیچے بچھ گیا۔ سرہانے تکیہ رکھا گیا اور پائنتی پر کھیس بچھایا گیا۔ پنوں نے اس کا سامان پلنگ کے پاس رکھ دیا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

پنوں نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا "منشی! اٹھ! کچھ کھا پی لے۔"

پہلے بچوں نے مٹی کے لوٹے سے اس کے ہاتھ دھلائے۔ پھر چھابا اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے دسترخوان میں لپٹی پھولی روٹیاں نکالنے سے پہلے پالا ہٹا۔ بچوں نے ایک کورے مٹکے سے لسی انڈیلی۔ لسی نمکین تھی اور ٹھنڈی بھی اور اس سے کورے گھڑے اور کوزے کی خوشبو آرہی تھی روٹیاں دیسی گھی سے چپڑی ہوئی تھیں اور ایک پیالی میں اچار تھا' لسوڑوں' اور آم کے اچار سے وہ بچی بچی دو روٹیاں کھا گیا۔ اتنی لذت آج سے پہلے اسے کسی کھانے میں نہ ملی تھی۔

اگلی صبح بچوں کے مشورے پر اس نے سامان وہیں رہنے دیا اور سکول جانے کے لئے اکیلا روانہ ہوگیا۔ راستے کی جھاڑیوں میں اس نے تیتر کی بولی سنی اور قسم قسم کی چڑیاں دیکھیں۔ ایک سانپ بھی گلی کا سہرا بن کر اس کا راستہ کاٹ گیا۔ چک نمبر پندرہ کے کتے بھی اس پر بھونکے۔

ابھی سکول میں ہو کا عالم تھا۔ لالہ منسا رام تکئے پر نہا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔

"سکول کب لگے گا؟" اس نے پوچھا

"جب لڑکے آجائیں گے۔؟"

"اور لڑکے کب آئیں گے؟"

"جب ان کا جی چاہے گا۔" لالہ منسا رام نے جواب دیا۔

پھر لڑکے اکا دکا آنے شروع ہوگئے اور مدرسے کے صحن میں دھول اڑنے لگی لڑکوں نے ٹاٹ جھاڑے اتنی دھول اٹھی کہ زمین آسمان ایک ہوگئے۔ کچھ لڑکوں نے بالٹیاں بھر بھر کر چھڑکاؤ کیا مٹی اتنی روکھی تھی کہ اس سے خوشبو بھی نہ اٹھی البتہ دھول بیٹھ گئی۔

جب چالیس پچاس لڑکے اکٹھے ہوگئے تو منسارام جی بھی اپنی کوٹھڑی سے نکل آئے ان کا کرتا دھوتی کچھ اجلے سے نظر آئے۔ اور سر پر مختصر سی پگڑی میں بھی کچھ وقار دکھائی دیا۔ البتہ اس میں سے اس کی بودی خاصے مضحکہ خیز انداز میں جھانک رہی تھی۔ انہوں نے لڑکوں کو قطار میں کھڑا کیا اور دو لڑکوں سے نہایت بے سری آواز میں حمد کہلوائی۔ اوکاں کے سائے تلے کچھ ٹاٹ بچھائے گئے اور ایک کرسی رکھی گئی جس کی سیٹ پر نہایت کھردرا سا پھٹا لگا تھا۔ کچھ لڑکے کمرے کے اندر چلے گئے' کچھ برآمدے میں بیٹھ گئے' ایک جماعت چھپر تلے چلی گئی اور باقی لڑکے جو بچے وہ اوکاں کے نیچے بچھے ٹاٹوں پر بیٹھ گئے۔

لالہ منسا رام نے کہا "منشی عبد المجید جی! اوکاں کے نیچے جو جماعت بیٹھی ہے وہ آپ کی ہے۔"

وہ بولا "لالہ جی! ابھی تو اپریل کا مہینہ ہے اور سائے میں کچھ خنکی ہے جون کی لو اور برسات کی حبس میں میری جماعت کہاں لگے گی؟"

کچھ مئی سے واڈھی' کی چھٹیاں ہو جائیں گی۔ مئی کا پورا مہینہ چھٹیاں رہیں گی اور جون میں واڈھی' ختم نہ ہوئی تو مدرسے میں خود بخود چھٹی رہے گی کیونکہ کوئی لڑکا پڑھنے کے لئے نہیں آئے گا۔ برسات اس علاقے میں لگتی ہی نہیں۔ ایک آدھ بارش ہو بھی گئی تو چھٹی کر دی جائے گی۔"

ابھی اول مدرس نہیں آئے تھے۔ لالہ منسا رام جی اپنی جماعت لے کر چھپر تلے چلے گئے۔ وہ کھردری سیٹ والی کرسی پر جا بیٹھا۔ لڑکے اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے' کچھ حیران' کچھ سہمی سہمی اور کچھ منتظر نگاہوں سے کہ دیکھیے مداری کی پٹاری سے کیا نکلتا ہے۔ وہ ان سے ہم کلام نہ ہوا کیونکہ وہ یکایک نہایت مایوس ہوگیا تھا اور ایک نہایت کڑوے کسیلے پچھتاوے نے اسے آ لیا تھا کہ وہ شہر کی گہما گہمی چھوڑ کر اس

ویرانے میں کھلا چلا آیا۔ اب ویرانے میں دل نہ لگا تو اسے چھوڑ کر کہاں جائے گا؟" کیا اس نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا؟

اس کے سامنے جو بچے بیٹھے تھے، کتنے میلے میلے اور اجنبی سے تھے۔ میلے کپڑے اور میلے چہرے۔ سکول آنے سے پہلے کسی ماں نے اپنے بچے کا منہ نہیں دھلوایا تھا۔ ان کے کپڑوں سے پسینے کی بو آرہی تھی۔ یہ بچے سکول آنے پر مجبور تھے کہ یہاں لازمی تعلیم کا ایکٹ نافذ تھا اور ہر بچے کے لئے چار جماعتیں پڑھنا ضروری تھا۔ دیہات کی معیشت میں بچے کی تعلیم منافع بخش بھی نہیں تھی بلکہ والدین بچے کی خدمات سے محروم ہو جاتے تھے۔ جونہی بچے کے ہاتھ میں اتنی سکت آتی کہ وہ کھرپا درانتی پکڑ سکے، باپ کا مددگار بن جاتا۔ اور کچھ نہیں تو مویشیوں کی دیکھ بھال تو کر سکتا تھا۔ بچوں کو لازمی تعلیم سے بچانے کے لئے لوگ افسر لازمی تعلیم کی خوشامد کرتے، سفارشیں کرواتے اور رشوت بھی پیش کرتے۔

اتنے میں اول مدرس آگئے اور اس کی سوچ کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ وہ درمیانی عمر کے سفید پوش آدمی تھے خشخشی داڑھی میں کچھ سفید بال بھی تھے۔ سر پر لٹے والی پگڑی تھی جس پر طرہ تھا اور بمقدار علم شملہ بھی۔

بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر بولے "منشی عبد المجید جی! کل آپ غریب خانے پر کیوں تشریف نہ لائے؟"

اس نے پورا قصہ سنا کر کہا جس طرز کے استقبال سے مجھے واسطہ پڑا اس سے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ کو نہ آزماؤں اور پنوں کے ساتھ چک نمبر سولہ چلا جاؤں۔

"بہتر تھا کہ آپ مجھے آزما لیتے۔" اول مدرس نے ہنس کر کہا "آپ کی رہائش کا انتظام یہیں ہو جائے گا۔ منشی فضل دین اکیلے رہتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہیں جب تک وہ آئیں آپ میری بیٹھک میں رہیں۔"

پھر انہوں نے پوچھا "آپ نے یہ محکمہ کیوں چنا؟"

"اس میں قومی خدمت کے بہت سے مواقع ہیں۔" وہ بولا لیکن اس کی آواز میں یقین، اعتماد اور وثوق کی قوت مفقود تھی۔

"لیکن! اس محکمے میں ترقی کے مواقع بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

اول مدرس نے کہا "کم از کم آدمی افسر نہیں بنتا۔"

ایک استاد بی ٹی کرکے ڈسٹرکٹ انسپکٹری تک تو ترقی کر سکتا ہے۔ کیا یہ افسری نہیں؟"

"ہے...... لیکن اس افسری کا ایک لطیفہ آپ سنیں گے۔"

"فرمایئے!"

"ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر ایک ایسے سکول کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جس کے راستے میں ایک برساتی نالہ حائل تھا جو اکثر خشک رہتا...... اتفاق سے اس دن پیچھے کے علاقے میں بارش ہوگئی اور نالے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بہہ رہا تھا۔ اے ڈی آئی نے کہا صاحب! چلئے واپس چلتے ہیں۔" ایک دیہاتی بھی وہاں کھڑا تھا اس نے صاحب کا لفظ سنا تو آگے بڑھ کر کہا میں صاحب کو دوسرے کنارے پہنچا آتا ہوں۔' چنانچہ اس نے صاحب کو پیٹھ پر بٹھایا جب نالے کے عین درمیان پہنچا تو پوچھا صاحب جی! آپ خیر سے کس محکمے کے افسر

ہیں؟ وہ بولے سکولوں کے مجھے سے" دیہاتی بابا "تو تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟" اور دھڑام سے اسے ٹاٹ سے نکال پھینک دیا۔

قصہ سنا کر وہ کہنے لگے "میرا مطلب آپ کو مایوس کرنا نہیں۔"

دوپہر تک اس نے اپنی جماعت کے لڑکوں کا جائزہ لیا۔ یہ دوسری جماعت کے بچے تھے انہیں قاعدہ بھی نہیں آتا تھا۔ بہرحال سال کا آغاز ہے محنت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا" اس نے سوچا۔

"لیکن تم یہاں پڑھانے کے لئے تو نہیں آئے۔ پڑھنے کے لئے آئے ہو۔" کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"پر ان بچوں کا کیا قصور جنہیں میری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ مجھے انہیں پڑھانے کا معاوضہ نہیں ملے گا؟" اس کی سوچ نے جواب دیا۔

اسی تذبذب اور بحث مباحثے میں پڑھائی کا اک دن ختم ہو گیا دوپہر کا کھانا اس نے اول مدرس کے ہاں کھایا جب وہ چک سولہ میں پہنچا تو سہ پہر کا وقت تھا اور پنوں اس کے انتظار میں تھا۔

اس نے دن کی پوری روداد سنا کر کہا "یار پنوں! مجھے منشی جی کہہ کر نہ پکارا کر، میرا نام مجید ہے۔"

پنوں نے اسے پھر بھی مجید کہہ کر نہ پکارا بلکہ کہا "یار منشی! میں نے بابا سے بات کر لی ہے ہم اس چھپر کو ٹھیک ٹھاک کر دیں گے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے، یہیں رہو گے۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

اس نے اقرار کیا ، نہ انکار، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔

ایک ہفتے کے اندر اندر چک سولہ سے مدرسے جانا اور وہاں سے واپس آکر پنوں کی خدمت تواضع سے لطف اندوز ہونا اور رات کو لالٹین کی روشنی میں دیر تک پڑھتے رہنے کا ایک معمول خود بخود قائم ہو گیا۔

منشی فضل دین کے چھٹی سے واپس آنے پر وہ تذبذب میں پڑ گیا کہ چک نمبر پندرہ میں آجائے یا سولہ میں پنوں کے پاس رہے۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

اس نے کہا "منشی فضل دین جی! واڈھی کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ ان کے بعد میں آپ کے ہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔"

چک سولہ کے قیام کا دسواں یا بارھواں دن تھا۔ دوپہر کی دھول میں خاصی چکا چوند تھی۔ سکول سے واپسی پر اسے خاصی گرمی بھی لگتی تھی اور چھپر کے سائے تلے اسے بہت سکون محسوس ہوا تھا کہ اچانک اسے یوں لگا جیسے دوپہر کی دھوپ چھپر کے سائے پر غالب آگئی ہو اور اس کی آنکھیں چندھیا گئی ہوں۔

پتہ نہیں وہ ایران کے کس شہر سے آیا تھا، اصفہان سے یا شیراز سے اس کا نام مرزا عزت بیگ تھا اور وہ گجرات شہر کی سیر کرتے کرتے اس بازار میں نکل گیا جہاں تلے کمہار کی دکان تھی وہاں وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا کہ وہاں ایک نازک اندام لڑکی، چندے آفتاب چندے ماہتاب، نازک نازک صراحیاں اور آبخورے بیچ رہی تھی۔

پھر عزت بیگ کا قدم اس گلی سے آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ اپنے وطن شیراز کے شاعر کی طرح اس کے سیاہ تل پر سمرقند و بخارا تو نچھاور نہ کر سکا لیکن اس نے بانات و کم خواب کے تھان اس کے قدموں تلے بچھا دیئے اور خود عزت بیگ سے مہینوال بن گیا۔

آج وہی لڑکی شرمائی لجائی چھابے میں روشاں اور گڑوے بھن نکیں، لسی بھرے اس کے سامنے موجود

تھی اور چبیر کے سائے تلے دھوپ کی چاندنی بچھ گئی تھی۔
وہ لڑکی چھاتا اور کٹورا چارپائی پر رکھ کر چند لمحے منتظر کھڑی رہی اور وہ چناب کے اس کنارے کھڑا عزت بیگ بن کر اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اپنی آنکھوں کے سوا اس کے قدموں تلے کیا بچھائے.......
اچانک اس کی نظر بپھرے ہوئے چناب کے دوسرے کنارے پر پڑی اور وہ پکار اٹھا "نہیں! نہیں! میں مہینوال نہیں بننا چاہتا۔"
اور اگلے دن اپنے دوست بٹوں کی ناراضگی کے باوجود چک نمبر پندرہ میں منشی فضل دین کے ہاں منتقل ہوگیا۔
واڈھوں کی چھٹیوں کے بعد سکول دوبارہ کھلا تو وہ شہر سے نصاب کی ساری کتابیں شرحیں اور خلاصے خرید کر لے آیا۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ اسے دنیا جہان کا ہوش نہ رہا۔ وہ سکول میں بھی جی لگا کر کام کرتا۔ گندے مندے بچوں سے اس کی نفرت بتدریج کم ہونے لگی اور ایک دن اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل میں ان بچوں کے ساتھ پیار کا بیج پھوٹنے والا ہے تو وہ ڈر گیا "نہیں! نہیں! میں اس بیج کو پھوٹنے نہیں دوں گا مبادا یہ نشوونما پا کر سایہ دار درخت بن جائے۔"
ایک دن اسے اچانک محسوس ہوا کہ اسے پڑھانے میں لطف آرہا ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا میرے اندر کوئی استاد چھپا بیٹھا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ جنم لے میں اس بیج کو بھی کچل ڈالوں گا۔
چنانچہ اس نے واجبی سا کام شروع کر دیا لڑکوں کا نقصان بھی نہ ہو اور اس کی انرجی بھی محفوظ رہے اور بچوں اور سکول کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی قائم نہ ہو سکے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے معلمی سے استعفیٰ دے دیا اور بی ٹی کی بجائے ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا اور ٹیوشنیں کرکے اپنا خرچ پورا کرتا رہا۔ تحریک پاکستان سے اس کی وابستگی زبانی کلامی رہی۔ عملی طور پر اس نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے متعلق اس کا رویہ خاصا معروضی تھا۔ اس نے تیسرے درجے میں ایم اے کیا ہی تھا کہ پاکستان وجود میں آگیا اور کالج انگریزی کے اساتذہ سے قریب قریب خالی ہوگئے تب اسے پاکستان کی افادیت کا احساس ہوا اسے فوری طور پر ایک کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ اب اگر وہ کمزور دل و دماغ کا آدمی ہوتا تو! اسی پر قناعت کر لیتا لیکن اس نے دن رات ایک کرکے مقابلے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوگیا۔
ایک اعلیٰ و ارفع زندگی کا آغاز ہوا تو وہ اپنا ماضی یکسر بھول گیا۔ اس کی ساری توجہ ترقی کے مدارج طے کرنے پر مرکوز رہی۔ ملک و قوم سے محبت کا اظہار اس کے پیشے کا ایک لازمی جزو تھا لیکن اگر وہ ہندوستان میں بھی ہوتا تو اسی قسم کے رویے سے کام لیتا اور نظر اپنے ذاتی عروج پر رکھتا۔ اس نے شادی بھی کی تو اس میں محبت نہیں صرف ذاتی عروج پیش نظر رہا۔ وہ جس محکمے میں بھی جاتا' وہاں کامیاب و کامران رہتا اور اس کی دیانت و امانت کے ڈنکے بجتے رہے' اگرچہ حلال کی کمائی میں برکت ضرور ہوتی ہے مگر اتنی نہیں کہ بنگلوں اور کاروں تک رسائی حاصل کر لے یہ معجزہ بھی اس کی ذات سے سرزد ہوا کہ ایک نہیں دو بنگلے اس نے بنوائے اور ہر بچے کو اس نے کار لے کر دی کیونکہ بچوں کی تعداد اس نے "دو" سے بڑھنے نہیں دی تھی۔۔۔۔ پر اتنے عروج کے باوجود بھی کبھی کبھار افسوس ہوتا کہ اس نے اے۔ ڈی۔ آئی شیخ کا مشورہ کیوں نہ مانا اور فوج میں کمیشن کیوں نہ لے لیا۔۔۔

وہ کسی دورے کے سلسلے میں ایک نہر کے کنارے سروس روڈ پر سے گزر رہا تھا۔ پھول جھکے ایک کار پر کہ اسے ایک پل نظر آیا جہاں ایک گدھے والا کھڑا تھا اور ایک بابو گدھے والے کی چھت میں اپنا ہوش گم اور بستر رکھوا رہا تھا۔

بغیر کسی ارادے کے اس کے منہ سے نکل گیا "ڈرائیور کار روکو۔۔۔۔" ڈرائیور نے کار روک لی اس نے سوچا کہ صاحب کوئی حاجت ضروریہ پوری کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن صاحب دیر تک آنکھیں پل پر جمائے اپنی سیٹ پر گم سم بیٹھے رہے تو اس نے پوچھا "صاحب جی چلوں؟" "نہیں ذرا پل تک جاؤ اور پوچھ کر آؤ کہ وہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"وہ کچی سڑک؟" ڈرائیور نے پوچھا؟

"ہاں! ہاں" وہ بولا "اور اس بابو سے بھی پوچھ لیے آنا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔"

"صاحب جی کون سا بابو۔"

"وہ جو گدھے کے پاس کھڑا ہے" اس نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے واپس آکر بتایا "وہ سڑک چک نمبر پندرہ جاتی ہے اور وہاں وہ بابو سکول میں استاد لگ کر جارہا ہے۔"

"مجھے چک نمبر پندرہ لے چلو۔"

ڈرائیور چند لمحے حیران پریشان رہا۔ پھر کار میں بیٹھ کر اس نے سٹیرنگ ہاتھ میں لیا۔ "صاحب جی! سڑک کچی ہے۔ دھول بہت اڑے گی۔"

صاحب نے کار کے شیشے چڑھا لیے۔

جب وہ گدھے کے پاس سے گزرے تو گدھے والا اور بابو دونوں بہت حیران ہوئے اور دیر تک حیران رہے کیونکہ کار سے اڑنے والی دھول نے انہیں بھوت بنا دیا تھا۔

جب دھول اڑاتے اور ہچکولے کھاتے چک نمبر پندرہ پہنچے تو صاحب نے کہا "ڈرائیور! مجھے سکول لے چلو۔"

"سکول؟" ڈرائیور نے کہا "کار کھڑی کرکے کسی سے پوچھ لوں۔"

"نہیں! ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر سکول آجائے گا۔"

اب تو ڈرائیور کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

صاحب نے دیکھا کہ چک کی آبادی خاصی بڑھ گئی ہے۔ بہت سے نئے مکان تعمیر ہو چکے ہیں اور ان میں سے کچھ پکے بھی ہیں۔ ایک پکے مکان کے احاطے میں کار بھی کھڑی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ نمبردار مستقیم کا گھر ہو۔ سکول کے قریب اس نے کار رکوائی اس نے دیکھا کہ چار دیواری کے بچے کھچے آثار بھی مٹ چکے ہیں۔ سکول کی عمارت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا گویا سکول ابھی تک پرائمری درجے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

صحن میں اوکاں کا بوڑھا درخت اپنی جگہ پر کھڑا تھا البتہ اس کا تنا کھوکھلا ہو چکا تھا اور سایہ بھی چھدرا پڑ گیا تھا۔ اس کے نیچے نلکے کا پائپ موجود تھا لیکن ہینڈل غائب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نلکا ایک عرصے سے نہیں چل رہا۔ اوکاں کے سائے میں جو بچے بیٹھے تھے، یا تو ان کے پھٹے پرانے ٹاٹ ٹکڑے ہوگئے تھے یا وہ بوریوں کے ٹکڑوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر لڑکا اپنا اپنا بوریا گھر سے لایا ہے۔

ابھی تک اس نے اپنے ماضی کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ اچانک از خود ماضی امڈ آیا جیسے سیلاب نے بند توڑ دیا ہو۔ یہ ایک فلیش تھا لیکن اتنا بھرپور کہ اس کے حال پر چھا گیا۔ چنوں' اس کا گودھا سوہنی کمارن' چناب کا دوسرا کنارہ کہ وہ مہینوال بننے سے ڈر گیا تھا اور چک نمبر پندرہ میں گذرا ہوا ایک سال...... یہ سب کچھ ایک لمحے میں بیت گیا۔

اس نے ڈرائیور سے کہا "واپس چلو!"

کلر اٹھی دھول کا ایک بگولا اٹھا اگرچہ شیشے چڑھے ہوئے تھے' پھر بھی حلق تک اس کا منہ کڑوا ہو گیا اور آنکھوں میں تلخی بھر گئی۔

تب اس کی آنکھوں سے کچھ آنسو ٹپکے جو کسی نے نہ دیکھے۔

کیا یہ آنسو ندامت کے آنسو تھے۔ ندامت! اس بات پر کہ وہ ایک کوٹھڑی سے نکل کر بنگلے میں پہنچ گیا تھا اور ایک تیز رفتار کار اسے اس سے بھی آگے کی منزل پر پہنچانے کے لئے مصروف سفر تھی اور دوسری طرف وہ سکول تھا' جہاں ایک قوم ایک نقطے پر ٹھہر گئی تھی' اس پرانے چھکڑے کی طرح کہ جس کے پہیئے کچی سڑک کی "کہل" سے نکل کر دھول میں پھنس گئے ہوں اور کسی قوت والے بازوؤں کا انتظار کر رہے ہوں کہ جو انہیں پھر "کہل" میں ڈال دیں۔

اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی پوری زندگی میں وہ لمحہ پھر سے نہ آسکا ہو جو اس نے چنوں کمہار کی دوستی میں بتایا تھا اور جسے اس نے سوہنی کمہارن کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ لیکن وہ مرزا عزت بیگ سے مہینوال نہ بن سکا تھا!

کون جانے!

رفعت مرتضیٰ

موتیا

سر پر فلوریڈا کا تپتا سورج سایہ کئے تھا مگر اس سائے کے نیچے بھرتی زندگی میں کیا تھا جو نہیں رہا تھا' یا شاید سب کچھ تو ویسے ہی تھا صرف اسی کی پیاس بھڑک اٹھی تھی۔ پول کنارے ڈیک چیئر پر دراز دور سے دیکھنے والوں کے لئے وہ شاید عناصر سے مکمل ہم آہنگی کی تصویر ہو تو ہو مگر یہ بس وہی جانتا تھا کہ وقت آہستہ آہستہ اس کے اندر سے باہر کی طرف رستا اسے خالی کئے دے رہا تھا۔ آنکھوں پر کالے شیشوں کی عینک تھی جو چلتے وقت فرمان نے اسے دی تھی کہ فلوریڈا کا سورج آنکھوں کے لئے اچھا نہیں۔ موتیا اتر آتا ہے اس نصف النہار سورج کے نیچے بھرتی غیر محتاط آنکھوں میں' ایئرپورٹ کی گفٹ شاپ سے اس نے تنکوں سے بنا چوڑے کنارے کا ہیٹ خریدا تھا۔ اس کے لئے بھی فرمان نے تاکید کی تھی کہ سن اسٹروک اور سن برن اور کینسر کی سوغات لئے زمین کی طرف آتی روشنی سے بچنے کے لئے وہ جب دھوپ میں جائے تو ہیٹ اور بدن پر سن اسکرین ملے ہرگز نہ جائے۔ وہی ہیٹ سر پر تھا اور برابر کھڑی میز پر لیموں کے گلابی شربت کا گلاس جس کے کنارے پر لیموں کا ایک باریک قتلا کمر میں بل ڈالے بڑی نزاکت سے کھڑا تھا۔ اس کے لئے بھی فرمان نے ہدایت کی تھی کہ پیاس ہو نہ ہو بس ہر دم پانی پیتا جائے۔ خوش وقتی کے اور لوازمات بھی تھے اور ماحول بھی مگر اندر۔۔۔ اندر کے کسی پاتال میں نہ جانے کیوں' ایک ناخوشی تھی کہ لبالب بھرتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے چہرے پر سایہ کئے ہیٹ کو ایک انگلی سے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور سیدھے ہو کر ڈیک چیئر سے اتر کر بھاری قدموں سے چلتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مارلا ہوٹل کی لابی کے آس پاس بنی دکانوں میں کہیں روپوش تھی۔ شاید ہوٹل کے بنگو پارلر میں نمبروں کا کھیل کھیلتی' ہار جیت کے شور کی لہروں میں ہلکورے لیتی' کوالٹی ٹائم گزار رہی ہو۔۔۔ شاید وہیں کہیں چہرے پر ماسک لگائے نیم دراز' اپنے ہاتھوں پیروں کے ناخن بنوا رہی ہو۔۔۔ کچھ بھی ہو۔ زندگی ابھی بھی اس کے لئے ایک رس رسیلا کھیل ہی تھی۔ ہادی سے بھی وہ یہی کہتی۔۔۔ "ہادی جی زندگی آج ہے اور ابھی ہے۔ کل کی فکر کیوں؟ کل سے تو کل ہی ملاقات ہوگی پر اس اندیکھے کل کی فکر میں آج کو۔۔۔ جو ابھی ہے اور سامنے ہے۔۔۔ کیوں غارت کریں!" وہ اس کی نیلے کنٹیکٹ لینسوں سے سجی آنکھوں اور سنہرے رنگے بالوں کو حسرت سے دیکھتا۔ کیسی سیدھی' گنجلکوں سے ناآشنا زندگی ہے۔ کتنی آسانی سے اس نے اپنی پرانی زندگی کو یوں اتار پھینکا ہے جیسے پرانا بوسیدہ لباس! ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ جب منہ پر ہیٹ ڈالے لیٹا تھا اور عینک کے کالے شیشوں اور ہیٹ کے تنکوں کی جھریوں سے پول میں پانی کی سطح پر چت لیٹی مارلا کو دیکھ رہا تھا تو کئی بار ایسا ہوا کہ پانی ہلکورے دیتا ہوا اسے پول کنارے لے آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کو الفاظ دیتا پانی ارادہ بدل کر اسے ہلاتا جلاتا کسی اور طرف لے گیا۔ ایک بار وہ کنارے سے کچھ زیادہ ہی قریب آگئی تو پول کنارے لیٹے ہادی کو

آواز دی۔۔۔ "وہاں کیا پڑے ہو۔ کھال جھلس جائے گی سورج میں۔۔۔ پانی میں آجاؤ لالہ۔۔۔" مگر اس نے سن کر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود اپنے ہی سوالوں کے جواب ڈھونڈتا رہا تھا اور یہ بھی اچھا ہی ہے کہ مارلا اسے سوتا ہوا ہی سمجھے۔ کوئی جواب نہ پاکر مارلا نے پانی کی سطح سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر آسمان پر اڑتے جہاز کی طرح ایک دم ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر پہلو سے اترتی پیٹ پر آگئی اور دونوں پھیلے ہاتھوں کو سامنے کرکے پانی کی سطح کو کھولتی نیچے چلی گئی۔ آدھا دھڑ پانی کے اندر چلے جانے کے بعد اس نے پشت اونچی کی اور جیسے مچھلی کی طرح پھسلتی ساری کی ساری پانی کے نیچے چلی گئی۔۔۔ ہادی اس کی انرجی اس کے کنٹرول اور زندگی سے اپنا حصہ بڑھ بڑھ کر چھیننے کا گواہ تھا اب اس اولمپک پرفارمنس کو دیکھ کر اور بھی رنجور ہو گیا۔ وہاں اپنے ملک میں اس عمر کی عورتیں زندگی بھر کا کام نپٹا دینے کے بعد اب نانیوں، دادیوں کے منصب سنبھالے راضی بہ رضا تھیں۔ مارلا کو اس صورت سے دیکھ لیں تو غش کے غوطے سے شاید ہی ابھریں۔۔۔ "ہادی جی۔۔۔ اگر مجھے یہاں رہنا ہے تو میں یہاں۔۔۔ یہاں کے جیسا ہی رہوں گی۔ آپ مجھے روکنے کی کوشش نہ کیجئے گا لالہ" مارلا نے اس کے سامنے کھڑے ہوکر سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر اس کے بعد کبھی مڑ کر اس طرف نہ دیکھا جہاں اس نے پرانے اتارے ہوئے کپڑوں کو ڈھیر کیا تھا، نہ ہی کبھی ان حرفوں کو چننے کی کوشش کی جو اس نے اپنے نام سے گرا دیئے تھے۔ پانی کے نیچے جل پری کی طرح تیرتی وہ کنارے پر آئی اور دونوں ہاتھ پول کنارے رکھ کر اچانک باہر آگئی تولئے سے اپنا بدن پونچھتے ہوئے اس نے پھر ہادی کے ساکت ڈھیر کی طرف دیکھا اور ہنس دی۔ "چھٹی منانے کا تمہارا جو انداز ہے وہ کاہے کو کسی نے دیکھا ہوگا۔۔۔ لوگ تفریح سے لطف اندوز ہوتے ہیں تم پر باہر قدم رکھتے ہی رقت طاری ہو جاتی ہے" ہادی نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ مارلا نے تولیہ کرسی پر پھینکا اور اپنے نہانے کے لباس کے اوپر ہی نکر اور ٹی شرٹ پہن کر کرسی پر بیٹھ کر جوتوں کے بند باندھنے لگی۔ "ہادی جی۔۔۔" اس نے ہادی کی ننگی ٹانگ پر ایک موٹی چٹکی لی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ کیا ہے؟" ہادی نے بناوٹی نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"میں نیچے جا رہی ہوں۔ گھنٹے دو گھنٹے میں آجاؤں گی۔ تم جب تک اپنی نیند پوری کر لو پھر اس کے بعد کھانا کھانے چلیں گے۔"

ہادی نے منہ سے کچھ نہیں کہا بس پہلو میں پڑا سستی سے بوجھل ہاتھ اک ذرا اونچا کرکے ہلانے کی کوشش کی پھر نیچے گرا دیا۔ مارلا ہنس دی۔ پھر سر ہلاتی اس پر افسوس کرتی۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بیگ کاندھے پر ڈالا اور تیز تیز چلتی لفٹوں کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی آہستہ چلتا جیسے کسی بوجھ تلے دبا، کمرے میں چلا آیا تھا۔ مگر اب کمرے میں پہنچ کر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کمرے میں کرنے کیا آیا تھا۔ بیچ کمرے میں کھڑے ہوکر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہوٹل کی ملازمائیں کمرہ صاف کرکے جا چکی تھیں۔ بستر پر خوبصورت پھول دار پلنگ پوش بچھا تھا۔ پلنگ کی پائنتی سے لگی نیچی میز پر دو ہلکے سے کمبل تہ کئے رکھے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے دل میں اٹھتی اس نک سک سے درست کمرے کو بگاڑنے کی خواہش کو دبایا۔ یہ بندھی ٹکی مشینی، سٹیریلائیزڈ sterillized زندگی اس کے کندھوں پر ایک بوجھ بنی بیٹھی تھی۔ وہ جلدی سے مڑا اور غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ دیر سے دھوپ میں بیٹھے بیٹھے اب غسل خانے کے ٹھنڈے اندھیرے اجالے میں آتے ہی اسے یوں لگا جیسے بدن سے بھاپ نکل رہی ہو۔

سنک میں ہاتھ دھوتے دھوتے اس نے یہ دیکھنے کو نظر اٹھائی بھی اس کے بدن سے [illegible] ہوا
یا نہیں۔ لیکن نگاہ کی تو جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ یہ بوڑھا آدمی کون ہے۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ بوڑھا نہیں؟ اس
نے خود ہی تصحیح کی مگر اس تسلی کے باوجود بھی وہ آدمی ہادی کو کہنہ اور قدیم ہی نظر آیا۔ [illegible] اور بوڑھا
بھی۔

ہادی نے اپنا گیلا ہاتھ ماتھے سے لگا کر سلام کیا۔ آئینے میں کھڑے اس شناسا مرد کہنہ نے بھی ماتھے
سے ہاتھ لگا کر جواب دیا۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ پھر رفتہ
رفتہ اس مرد کہنہ کی نگاہیں بدلنے لگیں، جیسے کچھ کہنے کے لئے بے قرار ہو۔ یا جیسے کوئی جھنجلاہٹ باہر آنے
کے لئے زور کر رہی ہو۔ آئینے کے اس طرف ہادی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا سنک کے
اوپر جھکتا ہوا آگے بڑھا اور دائیں بائیں دونوں طرف سے آئینے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

"بیٹا جی۔۔۔ میں تو بس یہ پوچھتا ہوں۔۔۔۔" ہادی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔
"صرف ایک ہی بات۔۔۔ کہ آخر کیا سوچ کر حضور نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا؟۔۔۔۔ اور اگر کر ہی لیا تھا
تو اب یہ گرمی کیوں دکھا رہے ہیں جناب عالی!!"

سامنے کھڑے مرد کہنہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، صرف بیزار اور غصیلی جھنجلائی آنکھیں اسے
گھورتی رہیں۔ پھر چہرے پر ایک لکیر کی صورت سے کھنچے لب کھلے اور ایک بے رخی سے اس نے نگاہیں پھیر
لیں اور کہا۔۔۔ "مجھے اب یاد نہیں۔۔۔" "یاد کرو۔۔۔۔ یاد کرو بیٹا جی۔۔۔"

"کیا یاد کروں؟"

"یاد کیجئے حضور۔۔۔۔ بچتے کیوں پھرتے ہیں اب؟"

"میری بیوی سے پوچھو۔۔۔۔" بھینچتے لبوں سے مرد کہنہ نے کہا۔۔۔ "جاؤ۔۔۔ اس سے پوچھو
جاکر۔۔۔ اسے ساری باتیں یاد رہتی ہیں۔۔۔"

"اجی واہ۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے ہم سمجھے نہیں آپ کو۔۔۔ خوب خوب جانتے ہیں جن باتوں کا
جواب نہیں، ان کا جواب یہ کہ بیوی سے پوچھو۔۔۔ جواب دینا نہیں چاہتے۔۔۔۔ تو بھی بڑی آسانی سے
بیویوں کو سامنے کر دیا۔۔۔۔ بیوی سے پوچھو۔۔۔ بیوی نے کہا تھا۔۔۔ بیوی کا فیصلہ تھا۔۔۔۔ خود آپ کی تو
کوئی مرضی نہیں تھی۔۔۔۔۔ تھی کیا حضور؟"

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا اور آہستہ چلتا کمرے میں واپس آگیا۔ ایک بار پھر کمرے کے بیچوں
بیچ کھڑے ہو کر اس نے کوئی فیصلہ کرنا چاہا مگر کیا؟ یہی تو راز تھا۔ بہت زور دیا ذہن پر مگر وہ ہٹ دھرم ساتھ
دینے سے انکار ہی کرتا رہا۔ اسی گومگو میں وہ کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی طرف چلا گیا جہاں سے نیچے جاری
سڑک نظر آرہی تھی۔ کاریں متضاد سمتوں کی طرف بھاگی چلی جارہی تھیں۔ ایک کار آہستہ ہوتے ہوتے مین
ہوٹل کے راستے کی طرف مڑی مگر پھر ارادہ بدل کر ہوٹل سے کچھ آگے نکل کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ایک
اور کار آئی اور اس کار کے پیچھے کھڑی ہوگئی سامنے کی کار سے ایک دبلی، لمبی عورت کالے چمڑے کی پتلون
پہنے اونچی ایڑی کے جوتوں پر لہراتی باہر نکلی اور پچھلی کار کی طرف چلی گئی۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھی چلتے
چلتے ایک بار اس نے سگریٹ منہ سے لگا کر دھواں چھوڑا جو فوراً ہی ہوا میں تحلیل ہوگیا، مگر اس ایک لمحے
میں جب وہ ابھی بکھرا نہیں تھا اسے یوں لگا اس کے بچپن کے کارٹون کا کیسپر easper ایک جھلک دکھا کر

دفت کی دوسری جانب آہستہ سے اتر گیا ہو۔ پچھلی کار سے کوئی اترا نہیں۔ یہی عورت کار کی کھڑکی میں جھک کر اندر بیٹھے کسی مرد یا عورت سے باتیں کرنے لگی دو ایک بار' باتوں کے دوران وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور سگریٹ کے کش لے کر ہوا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے سفید بادل اڑائے اور ہر بار یہاں اوپر کھڑکی میں کھڑے ہادی کا دل ایک بچگانہ امید سے پیچھے ہٹ کر آگے بڑھا مگر وہ کیسپر پھر نظر نہ آیا۔ بوجھل دل' وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر باہر نکل کر لفٹ میں گیا اور اوپر چڑھتا پھر پول کی طرف چلا گیا۔ لفٹ کی خاموشی میں اس نے پھر خود سے ایک سوال کیا تھا مگر ان سوالوں سے فائدہ کیا جن کا کوئی جواب ہی نہ ہو۔ پول کے کنارے کھڑے ہوکر' دیر تک کسی پرانے شناسا گیت کی مخزوہ دھن اندر ہی اندر بجتی ہوئی سنتا رہا مگر لفظوں نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا ـــــ مارلا ٹھیک ہی کہتی ہے ـــــ اس نے ایک آہ بھری ـــــ "ہادی ـــــ لوگوں کا خمیر نمکین مٹی سے اٹھا ہے تو تمہارا غمگین مٹی سے ـــــ جب کوئی غم نہیں تو تمہیں یہ غم کھائے جاتا ہے کہ کوئی غم کیوں نہیں ـــــ" ٹھیک ہی کہتی ہے مارلا ـــــ وہ اور بھی رنجور ہو گیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی اور پول کے پاس کی کرسیاں سب خالی ہو چکی تھیں سورج اب اس کے سر کے پیچھے تھا مگر پھر بھی اس نے اپنا ہیٹ اٹھا کر پہنا اور کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ مگر اب نہ تو آنکھیں بند کرنے کی ضرورت تھی نہ سوتا بن جانے کی' وہ تھا اور چار سو خاموشی اور سہ پہر کا ڈھلتا سورج' مارلا جہاں کہیں بھی ہوگی بنکو پارلر میں' لابی میں یا کسی بیوٹی سیلون میں ـــــ جہاں کہیں بھی ہوگی' وہ جگہ اس کی ہنسی' اس کی باتوں' اس کے ہونے سے بج گئی ہوگی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا وہ جہاں ہوتی لوگ خود بخود کھنچے اسی طرف چلے آتے۔ جبکہ خود ہادی کو اکثر بات کرنے بات کا جواب دینے کے لئے منہ کھولنے کے لئے بھی کوشش کرنی پڑتی تھی ـــــ مگر اب چاروں طرف چھائی خاموشی اور سناٹے میں پورے دن میں پہلی بار اس کے لب مسکرانے کی کوشش میں اک ذرا کھلے مگر فوراً ہی اس کا دل پھر سے غوطہ کھا گیا۔ سامنے لفٹوں کی طرف سے ہوٹل کا کوئی ملازم اس کی طرف چلتا چلا آرہا تھا۔ اب یہ چاہے کچھ بھی کہے پول ایریا بند ہوجانے کی اطلاع دے۔ وہ ہرگز بھی یہاں سے جانے والا نہیں ـــــ کسی کا پول کنارے دعوت پارٹی منانے کا ارادہ ہے تو بھی نہیں جاؤں گا ـــــ کسی ضدی بچے کی طرح جم کر مقابلہ کرنے کے لئے اس نے خود کو تیار کرنا چاہا۔

"آپ کے لئے ایک نوٹ ہے صاحب!" وہ قریب آگیا اور ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ مارلا کی طرف سے تھا۔ آخر میری پہچان کیا بتائی ہوگی مارلا نے؟ (وہ جو پول کنارے مگرمچھ لیٹا ہوا ہے!؟) سوچ کی ایک لہر اس کے ذہن میں آئی اور گزر گئی ـــــ "میں بنکو پارلر میں ہوں سات بجے لابی میں انتظار کروں گی۔ کھانا کھانے باہر چلیں گے ـــــ"

اس نے کارڈ میز پر رکھ دیا۔

"کوئی جواب صاحب؟"

"بس ٹھیک ہے ـــــ" اس نے آواز کو گرمجوش بنانے کی کوشش کی مارلا کو اس کے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے پیغام بھیجا تھا ـــــ بس اتنا ہی کافی تھا۔

"آپ ابھی بیٹھیں گے؟"

"ابھی بیٹھوں گا!"

"موسم اچھا جارہا ہے" لڑکا بات کرنے پر مصر تھا۔ شاید وہ بھی کہیں دور سے آیا تھا اور انسانی رابطے

کا خواہاں تھا۔ جسمانی رابطے تو حاصل ہو جاتے ہیں مگر یہ خالی جسمانی رابطے ذہنی رابطہ شاذ ہی کبھی کبھی بن پاتے۔ اس نے لڑکے کے چہرے پر نگاہ کی جہاں ڈھلتی دھوپ کے سایوں نے چہرے کے نقوش کو بچپنے بچپن کی سی معصومیت دے دی تھی۔ ہادی نے بھی آگے بڑھ کر اس کی بات چیت کی خواہش کا ہاتھ بڑھ کر تھام لیا۔

"اچھا تو ہے ——— اور پھر اسی موسم کے لئے تو لوگ یہاں آتے ہیں ———"

"میں پورٹ لینڈ سے آیا ہوں۔ آج کل کالج بند ہیں ایک طرح سے تو میں اپنی چھٹیاں گذار رہا ہوں یہاں ویسے بھی سردیوں کی چھٹیوں میں کون ٹھنڈے علاقوں میں رہنا چاہتا ہے۔ یہاں موسم اچھا ہے۔ کام اچھا ہے پیسے اچھے ہیں ——— اور کیا چاہئے؟" وہ خوشدلی سے ہنس دیا۔

"بالکل ـ بالکل اور بھلا کیا چاہئے"

"ایک ماہ ہونے والا ہے مجھے یہاں۔ میرا تو ارادہ ہے کہ جیسے ہی اپنی پڑھائی ختم کر لوں گا تو بس یہیں آجاؤں گا۔ ایک بار کچھ دن یہاں گذر جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں زندگی کتنی ادھوری ہے۔ نہ تو گرمیوں میں گرمی ہے' نہ سورج میں ایسی تیزی! سردیوں میں بس برف کاٹتے رہو' برف صاف کرو ——— گاڑی کا انجن فریز freeze ہکے فریز ——— رگوں میں خون فریز ——— کائنات فریز!"

وہ ایک بار پھر اسی بچگانہ خوشی سے زور سے ہنس دیا۔

ہادی کو بھی اچانک یاد آیا کہ فرمان نے بھی تو یہی کہہ کر اسے یہاں بھیجا تھا کہ اب جب اس پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں تو کیوں نہ وہ اپنی سردیاں کسی گرم علاقے میں گذار آئے ——— یہ الگ بات کہ جانتے ہوئے بھی وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ پٹی اس کی اطالوی بیوی کی پڑھائی ہوئی تھی۔ جب سے وہ ریٹائر ہوا تھا' اس کے آئے دن کے پھیروں سے وہ کچھ اکتائی ہوئی سی رہنے لگی تھی۔

"——— کہ کبھی گرم کپڑوں میں بنڈل کی طرح لپٹنا نہیں پڑے گا ——— وہاں تو اپنا وزن ایک طرف ایک کے اوپر ایک چڑھائے گئے کپڑوں کے' کئی پونڈ اور اٹھائے پھرو ——— سر پہ ٹوپی ——— ہاتھوں پہ دستانے' جوتوں پر جوتے ——— کانوں پہ ٹوپیاں ——— مونچھوں پر جمی برف ———"

وہ دونوں زور سے ہنس دیئے۔

"میں اب چلتا ہوں ———" لڑکا ہنستے ہنستے الٹے پیر چلا۔ "آپ سے بات کرنا اچھا لگا وہاں پورٹ لینڈ میں میرا دادا بھی ہے۔ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اب تو مگر' میرا بچپن اسی کا ہاتھ پکڑے گذرا ہے۔ سردی اچھی نہیں اس کے لئے۔ اگر میں نے اتنے پیسے بنا لئے تو شاید ایک ہفتے کے لئے اسے بھی یہاں بلا لوں گا مشکل یہ ہے کہ یونیورسٹی کی پڑھائی بہت مہنگی ہے ——— اوکے' اب چلتا ہوں' پھر کبھی ملیں گے تو بات کریں گے ———" وہ ماتھے سے ہاتھ لگا کر "بائے" کہتا ہوا چلا گیا کیسا اچھا بچہ ہے ——— آئینے کا بوڑھا پھر اس کے سامنے آکھڑا ہوا

"ہاں بھئی اچھا تو ہے ——— کیا خبر تمہارا پوتا جوان ہو کر کیسا نکلے ——— کیا خیال ہے؟ وہ بھی ایسے ہی بات کرے گا تمہارے بارے میں؟"

"اب کیا پتہ بھئی ——— نہ بھی کرے تو کیا کرلیں گے؟ مگر یہ تم مجھ سے ہی بار بار پوچھتے ہو۔ سوال پہ سوال کئے جاتے ہو۔ تم بھی تو کو آنا نہیں چاہتے تھے تو کیوں آئے؟"

مروکنہ اچانک بہت ناراض ہو گیا

"مارلا چاہتی تھی۔۔۔"

"بزدل۔۔۔ بیوی کا نام لیتے ہو؟" مروکنہ نے چڑانے کے سے انداز میں کہا۔

"بزدل کیوں؟" اس کا صبر و ضبط ختم ہو گیا۔

"تمہیں جاننا چاہیے تھا کہ جب ہم نے اپنا وطن چھوڑا تو دنیا میں اپنی جگہ اپنے مقام سے بھی دستبردار ہو گئے۔۔۔ اب کس لئے شکایت کرتے ہو؟" بوڑھے نے سختی سے کہا اور دیر تک چپ کھڑا سخت نظروں سے گھورتا رہا۔۔۔ ہادی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سامنے کئے اور بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ان پر نمودار ہونے والے بھورے سیاہ دھبوں کو گننا شروع کر دیا۔

رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر چھائی سختی نرمی میں بدل گئی۔۔۔ تمہیں یاد ہے ایک صبح جب تم بچپنے کی پیاری نیند میں کھوئے ہنستے خواب دیکھتے اٹھے تو دادا تمہارے پلنگ کے پاس گھٹنوں پر جھکے بیٹھے تھے۔ ان کی جھولی میں بڑی ہلچل مچی تھی، جیسے کوئی کسی کو گدگدا رہا ہو، ایک سہانا شور مچا تھا۔ تم نے جاننے کے لئے دادا کے چہرے پر نگاہ کی جہاں صبح صادق کا اجالا پھیلا تھا۔ انہوں نے ایک انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر تمہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ سے آہستہ سے اپنی جھولی کھول دی اور پیلی زرد روئی کے چھوٹے چھوٹے گولے سے کودتے پھاندتے تمہارے پلنگ پر آ گئے۔ رات میں کسی وقت لال سنہرے پروں والی مرغی کے انڈوں سے بچے نکل آئے تھے۔ دادا صبح کی نماز کے بعد جب مرغیوں کے ڈربے کی طرف گئے تو پوری کوٹھڑی ان کی چک چک چوں چوں سے بجی تھی، تم ان چھوٹے چھوٹے بے قرار چوزوں کو اپنی بانہوں میں بھرنے کی کوشش کرتے کھلکھلا کر ہنس دیئے تھے اور جھریوں میں چھپی دادا کی آنکھیں تمہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔۔۔ تمہیں یاد ہے۔۔۔۔۔۔؟ وہ چپ بیٹھا سہانی یادوں کے سنہرے دیس میں جا نکلا

"وہی دادا۔ جن کی انگلی پکڑے تمہارا بچپن گذرا تم انہیں چھوڑ آئے۔ ان کے ہر خط کے جواب میں تم یہی لکھتے رہے کہ بس آئندہ سال۔۔۔ بس ایک برس اور۔۔۔ وہ مر گئے تو بھی تم نہ گئے۔۔۔"

ہادی نے اپنا جھکا سر اٹھایا۔ چاروں طرف سیاہ رات پھیلنے میں اب کچھ ہی دیر باقی تھی۔ ہوا یک دم ٹھہر سی گئی تھی اور پول کا پانی ساکت تھا اسے کچھ یوں لگا جیسے اس چھائے سکوت میں دور کہیں موذن کی آواز ابھری ہو۔ کچھ دیر اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ پھر وہ اٹھا اور سامنے کھڑے آئینے کے بوڑھے کو نظر انداز کرتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

رات میں وہ اخبار لئے صوفے پر بیٹھا تھا اور مارلا آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ دونوں رخساروں پر گلابی رنگ کی کریم پھیلا کر اس نے نیچے سے اوپر کی طرف آہستہ آہستہ مالش شروع کی جیسے نیچے کو ڈھلک جانے پر مصر رخساروں کو کسی جادوئی مرہم پٹی کے سہارے اوپر اٹھا کر رہے گی۔

"کیا پڑھ رہے ہو ہادی؟" مارلا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں سے اپنے رخساروں پر بڑے پیار سے مالش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔" ہادی نے مبہم سا جواب دیا۔

"ہوں کیا؟ ہادی جی یہ بھی کوئی جواب ہے؟" مارلا ہاتھوں کو اوپر نیچے گردش دیتی آئینے میں دیکھتی

"ہوں۔۔۔" اس نے ایک بار پھر منہ ہی منہ میں کہا
مارلا نے ہنس کر سر ہلایا اور آئینے میں اس کی طرف دیکھا وہ بے خبر اخبار پڑھتا رہا۔ کچھ دیر اس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا اور مارلا کی طرف دیکھا۔
"مارک ٹوئین کے خطوں کی ایک اور کتاب بازار میں لانے کی تیاریاں ہیں۔۔۔ تمہیں پتا ہے کتنے خط لکھے اس نے اپنی زندگی میں اپنی دوستوں' عزیزوں کو؟"
"کتنے بھلا؟" مارلا نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کئے بنا کہا۔
"دس ہزار۔۔ ذرا سوچو مارلا۔۔ دس ہزار خط!!"
"کیوں؟۔۔۔۔ اور کوئی کام نہیں تھا زندگی میں؟"
"تم نہیں جانتیں میں کس کی بات کر رہا ہوں؟"
"ہاں بھئی نام تو کچھ سنا ہوا لگتا ہے۔۔۔" مارلا نے اب بھی اسی انداز میں کہا۔
"کس کا نام سنا ہوا لگتا ہے؟" ہادی چڑ گیا "مارک ٹوئین کا؟ اس کے خطوں کی پہلی کتاب آنے والی کتاب کا؟ کس کا؟ تم واقعی نہیں جانتیں وہ کون تھا؟"۔۔۔ "ہوگا کوئی۔۔۔" مارلا ہنس دی ۔۔۔ "دنیا میں کیا جانے اور کتنے مارک ٹوئین ہوں گے کون جانتا ہے ان کو؟ اور سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے ہادی جی کہ ماضی تو بس دوسرا ملک ہوتا ہے۔۔۔ پچھلا پڑاؤ۔۔۔ جہاں سے گذر آئے تو گزر آئے۔۔۔۔ کسی کے دس ہزار ماضی کے خطوں کا میرے حال میں کیا کام؟"
"تو تم نے ہکل بیری فن اور ٹام سویئر بھی نہیں پڑھے؟"
مارلا جواب دیئے بنا پھر ہنس دی۔ ہادی حیران اس کی صورت دیکھتا رہا
"ایسے نہ دیکھو میری طرف۔۔۔۔ چلو بتاؤ کیا بتا رہے تھے تم خطوں کی بات۔۔۔۔"
"تمہیں دلچسپی ہی نہیں تو میں کیا بتاؤں؟ کیا کہوں؟"
"تم بتاؤ گے تو ہو جائے گی۔۔۔۔"
"نہیں" اس نے مایوسی سے کہا مگر پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی نرم پڑ گیا۔
"ایک خط کی ایک لائن بھی ہے لکھی ہوئی یہاں۔۔۔ لکھا ہے۔۔۔۔ پڑھنے کے بعد اس خط کو جلا دینا میں نہیں چاہتا کہ میرے زمین میں بوئے جانے کے بعد کوئی بیکار میں یہ لٹریری نشانیاں اور مارک ٹوئین کے غیر مطبوعہ خطوط کے نام سے انہیں شائع کردے۔۔۔ دیکھا تم نے مارلا کسی نے بھی تو اس کی خواہش کا احترام نہ کیا۔ نہ اس نے جس کے نام یہ خط لکھا گیا نہ ان لوگوں نے جو اس کے دس ہزار خطوط کی کان کھود رہے ہیں"
"تو ہادی جان۔۔۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔ وہ تو بویا گیا۔۔۔"
"مگر خواہش کا احترام بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے!! کتنا بے بس ہے انسان اور کتنا شاطر ہے انسان کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے والا انسان۔۔۔"
"چلو ہو گیا ماتم شروع۔۔۔ تم کو تو ہادی رونے دھونے کے لئے بس کوئی بھی بہانہ چاہئے۔۔۔"
مارلا ہنس دی۔۔۔ پھر سامنے رکھے طرح طرح کے چھوٹے بڑے شیشے بند کئے' روئی کے پھائیوں سے

اپنا چہرہ صاف کیا۔ ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھے اور سر جھکا کر پہلے ایک آنکھ اور پھر دوسری آنکھ سے کونٹیک لینس کی نیلے رنگ کی ننھی ننھی کٹوریاں سی نکالیں اور ان کو ڈبیا میں رکھ کے اٹھ کر اپنے بستر کی طرف چلی گئی۔ پلنگ کی پٹی پکڑ کر وہ دو چار بار اٹھی بیٹھی پھر بستر میں گھس گئی۔ ہادی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سیاہ آنکھیں اب اس کے چہرے پر اجنبی لگتی تھیں۔۔۔ مگر ایسی باتیں کہنا اب کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

"کوئی اچھی خبر سناؤ اخبار دیکھ کر۔۔۔ مگر یاد رکھئے گا ہادی جی۔۔۔ کوئی آنسو بھری داستان نہیں۔۔۔ ہرگز ہرگز نہیں۔۔۔" اس نے ہادی کی طرف دیکھتے ہوئے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی تاکیداً" اٹھائی پھر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہادی نے صفحے پلٹے اور یہاں وہاں سے اخبار بلند آواز میں پڑھنے لگا جہاں مضمون کچھ بھاری بھرکم ہونے لگتا وہ دوسری خبر پر چلا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مارلا کی طرف دیکھا وہ دونوں ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھے' دونوں کہنیاں جوڑے اس کی طرف منہ کئے لیٹی سو چکی تھی۔ کیسا اطمینان تھا اس کے چہرے پر ایک ننھی منی سی مسکان بڑے مالکانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ کافی دیر اخبار کے اوپر سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک آہ بھر کر اخبار برابر کی کرسی پر رکھ دیا۔۔۔۔ دونوں کو کچھ ہو گیا تھا یا وقت الٹی چال چلنے لگا تھا ذرا خاموشی ہوتی' تنہائی آتی۔ کوئی چپکے چپکے یادوں کے ڈھیر کریدنے لگتا۔۔۔ کبھی سردیوں کی طویل شاموں میں دادا اسے اپنے کمرے میں بلاتے اور فسانہ عجائب سنانے کو کہتے۔ وہ جانتے ہوئے بھی ہمیشہ ان سے ایک ہی سوال کرتا۔۔۔ کیا شروع سے شروع کروں دادا جی۔؟ اور دادا کاسنی رنگ کا لحاف اوڑھے آنکھیں بند کئے اونچے تکیوں کے سہارے آدھے لیٹے' آدھے بیٹھے حقے کی نے منہ سے ہٹاتے اور اس کی طرف دیکھ کر کہتے ۔۔۔ "نہیں دادا کی جان۔۔۔ کہیں سے بھی پڑھو.... اور جب تھک جاؤ تو چلے جانا' میں شاید سو جاؤں۔ یہ داستان اس نے دادا کے لئے جانے کتنی بار پڑھی ہوگی مگر کبھی خود مکمل نہ کی۔ کبھی جانا ہی نہیں کہ داستان کا آغاز کیسے ہوتا ہے۔۔۔ اب اس نے دادا کی جگہ خود کو پلنگ پر لیٹے بیٹھے دیکھا تو پلنگ کے برابر رکھی کرسی پر نہ کوئی داستان تھی۔ نہ داستان پڑھنے والا۔۔۔ ٹونی؟؟ وہ اس کا دس برس کا پوتا جو اپنی بڑی بہنوں کی گڑیوں کے کھیل حقارت سے دیکھتا تھا۔ جو ہر ویک اینڈ پر بیس بال کھیلتا تھا۔۔۔ جو ہفتے میں دو دن رائڈنگ کے سبق لیتا تھا۔ جس کی منگل کے روز تیراکی کی کلاس ہوتی تھی جو جمعرات کو بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے ہیلتھ کلب میں جاتا تھا' کیمپ' پکنک' سکاؤٹ' وہ ٹونی۔۔۔ جس کے لئے ہفتے کے سات دن کم پڑ جاتے تھے؟۔۔۔ گو اسی ٹونی کو دیکھ کر جہاں اس کا دل فخر سے اونچی اڑانیں بھرنے لگتا وہیں ایک تسلی بھی دل کو ہوتی کہ وہ اس کا پوتا' ہجرتوں کے غم سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آئیڈینٹی کرائسس اس کو اندر ہی اندر چاٹتا نہیں رہے گا وہ کلچرل ایولیوشن کے بے جوڑ پھندوں سے نکل چکا تھا' وہ اب اس دھرتی کا بیٹا تھا۔۔۔ کچھ دیر بعد ہادی بھی اٹھا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا راہداری میں کچھ لوگ اونچی آواز میں باتیں کرتے گذر گئے' ایک عورت کی ہنسی کی آواز اور پھر خاموشی۔۔۔ وہ کافی دیر کان لگائے کسی کمرے کے کھلنے' بند ہونے کی آواز کا انتظار کرتا رہا۔۔۔ باہر رات نہ جانے کس سمت رواں تھی۔ یہاں چوتھے مالے کی کھڑکی میں تو آسمان بھی کہیں دور دور نہ تھا۔ صرف کھڑکی پر پڑے مہین پردوں کے پیچھے سے نیچے سے اٹھ کر آتی روشنی کمرے میں جھانکنے کی کوششوں میں لگی تھی' کبھی کوئی کار پوری روشنی دیئے بغیر گذرتی تو کمرے کی

دیوار پر چند سائے آگے پیچھے بھاگتے ابھرتے اور غائب ہو جاتے ـــــ نیند دور دور تھی۔

یونہی جب نیند کے انتظار میں چپ لیٹے رات پہر بھر رہ گئی تو اس نے آنکھیں بند کیں اور ایسے لڑکپن کے دنوں میں لوٹ گیا جہاں ایک چھوٹا سا لڑکا اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے درمیان تخت کے ایک پر سو رہا تھا، جہاں برابر کے کمرے سے بابا کے خراٹوں کی آواز آتی تھی ـــ وہی آواز جو اس کے لئے نیند کی ایک پناہ ایک حفاظت کا وعدہ ہوتی۔ جہاں رات گئے کبھی کسی ڈراؤنے خواب سے اس کی آنکھ کھل جاتی تو اماں اور ابا کے کمرے سے آتی یہ آواز اسے اپنی بانہوں میں لے کے تھپک تھپک کر سلا دیتی۔ جہاں نیند میں کھوئی ہموار سانسوں کے سائے میں گزرتی رات ایک نئی صبح ایک پر ہنگام اور بارونق دن کی نوید ہوتی جہاں باہر، سرما کی یخ بستہ رات چھتوں پر، کھڑکیوں پر اور گھر کی طرف آتے راستے پر کہر جاتی، آہستہ، آہستہ گزرتی، گزر جاتی ـــــ اس کی بند آنکھوں میں نیند اترنے لگی، جیسے پنجوں پر چلتی، کوئی آہٹ کوئی کھٹکا کئے بنا چپکے چپکے اس پر چھا گئی ـــــ مارلا نے نیند میں سسکی لی۔ شاید اس کو تنہا پا کر کسی ڈر، کسی خوف نے اس پر شب خون مار دیا تھا ـــ اس نے ہادی کی طرف کروٹ بدلی اور اس میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ نیند میں پوری طرح کھو جانے سے پہلے ہادی نے مارلا کو اپنے سینے سے لگایا اور اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا دیا ـــــ

محمود احمد قاضی

ابا جی

کل تم میرے ساتھ چلو گے!

گاؤں جانے کا سن کر میں بہت خوش ہوا۔ تقریباً بیس سال سے میں گاؤں نہیں گیا تھا۔ ابا جی کی مونچھوں کا نفی کا اشارہ اور پھر خود میری تعلیم اور اس کے بعد میری job کی مصروفیات نے گاؤں جانے ہی نہ دیا۔ اور اب ابا جی خود مجھے گاؤں چلنے کو کہہ رہے تھے اس لئے میں ایک تحیر آمیز خوشی میں بھیگ گیا تھا۔ مجھے یاد ہے میں اس وقت یہی کوئی آٹھ نو سال کا تھا جب ہم گاؤں سے یہاں شہر آ گئے تھے۔ ان دنوں ہمارا یہ شہر والا گھر ابھی پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوا تھا اور ہمیں یہاں آنا پڑا۔ ابا جی کے بقول وہ یہاں میری پڑھائی کی وجہ سے منتقل ہوئے تھے۔ اباجی ہر سال میں ایک دوبار گاؤں کا چکر لگا آتے تھے لیکن یہاں آنے کے بعد سے میری اماں اور میں دونوں ہی گاؤں دوبارہ نہیں گئے تھے۔ اماں تو پچھلے سال گاؤں جانے کی خواہش دل ہی دل میں لئے اس جہاں سے سدھار گئیں اور میں اپنی اس پرانی خواہش کی بانہوں میں ہلکورے لیتا رہ گیا۔ اور اس موجود لمحے میں اباجی کی طرف سے اوکے (o.k) کا سگنل ملتے ہی ابھی سے گاؤں کی فضا کو اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارا گاؤں چاروں طرف سے خوبصورت ہریالی اور باغات سے گھرا ہوا ایک صاف ستھرا گاؤں تھا۔ سارے گاؤں میں صرف ہمارا گھر ہی ایسا تھا جو پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا جسے عرف عام میں حویلی کہا جاتا تھا۔ یہ گھر مردانہ اور زنانہ دو علیحدہ علیحدہ حصوں پر مشتمل تھا۔ زنانے میں کسی غیر مرد کا داخلہ ممنوع تھا۔ اباجی جب زنانے میں آتے تھے تو ان کا اونچا کھنگورا سب کو خبردار کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ گھر کا کام کاج کرنے والی عورتوں کی چادریں خود بخود ان کے چہروں سے نیچے چلی جاتیں وہ لمبے گھونگھٹوں میں چھپی وہیں ادھر ادھر چلتی پھرتی رہتیں۔ صرف اماں کھلے چہرے ابا جی کے سامنے آتیں۔ وہ بھی چند لمحوں کے لئے کیونکہ ابا جی اپنی گرج دار موٹی آواز میں کوئی نہ کوئی حکم ہی دیئے آتے تھے۔

مثلاً

"صبح مجھے کچہری جانا ہے میری ضرورت کی تمام چیزیں تھیلے سمیت بروقت میرے کمرے میں پہنچ جانی چاہئیں"

یا

"کل دوپہر کو چند مہمان آ رہے ہیں ان کے لئے کھانا نہایت مناسب ہونا چاہئے"

اور اسی طرح کے دوسرے احکامات وہ دیتے اور بس یہ جا وہ جا۔۔۔

البتہ کبھی کبھار میری طرف دیکھ کر مسکراتے اور کہتے

"کاکا---- ادھر آؤ!"

میں ان کے قریب جاتا وہ مجھے ماتھے پر چومتے---- ان کے چومنے سے میرے ماتھے پر ان کی گھنی کھردری بڑی بڑی مونچھیں چبھنے لگتیں' میں کسمسا کر ان کی گرفت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے چھوڑ کر الگ ہٹ جاتے اور مردانے کی طرف گھوم جاتے۔ وہ بہت تیز تیز چلتے تھے اور یوں چلنے سے ان کی پگ کا اونچا شملہ ہاتھی کے کان کی طرح ہلتا رہتا---- ان کی کالی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی میں ان کی آنکھوں کی طرف اپنے بچپن سے لے کر آج تک دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ کم گو مگر ذرا سخت طبیعت کے مالک تھے۔ شام کو مردانے کی بہت بڑی بیٹھک میں گاؤں کا نمبردار' پٹواری' موچی' لوہار' نائی' دھوبی' جولاہے' ترکھان اور مسجد کا مولوی سب ہی حاضری دیتے تھے۔ وہاں مسائل بیان ہوتے گاؤں کے جھگڑے طے ہوتے ایسے تمام فیصلے میرے ابا جی کی مونچھیں ہی کرتی تھیں وہ انہیں ایک خاص طریقے سے حرکت دیتے اور ہاں یا ناں میں فیصلہ ہو جاتا۔ فیصلے کے خلاف کسی کو چوں تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بڑے چوہدری ہونے کے ناطے سے آل دوالے کے گاؤں کے فیصلے بھی وہی کیا کرتے تھے۔ ایسے اکٹھ اور اجتماعات کی اطلاع کے لئے ہمارے گاؤں میں ایک نوبت تھی جسے بجانے سے اردگرد کے گاؤں میں بھی اطلاع ہو جاتی تھی۔ نوبت بجانے کا طریقہ عجیب تھا۔ نوبت بجانے والا نوبت پر دو تین ضربیں لگانے کے بعد رک جاتا اس کے جواب میں قریبی گاؤں کی نوبت سے انہی ضربوں کی نسبت سے جواب آتا پھرباری باری یہ سلسلہ دہرایا جاتا اور یوں پیغام مکمل ہو جاتا۔ ہمارے گھر کے علاوہ گاؤں کے تمام مکان یا گھر ایک طرح کے کچی مٹی سے بنے ہوئے تھے جن کی منڈیروں کے بغیر ہی چھتیں ایک دوسرے سے یوں ملی ہوئی اور پیوست تھیں کہ اگر آدمی چاہے تو ایک مکان کی چھت پر چڑھ کر بڑے آرام سے ٹہلتا ہوا سارے گاؤں کا چکر لگا کر واپس پھر اسی چھت پر آسکتا تھا۔ کبھی کبھار میں اپنی حویلی کے قریب بنے اپنے نوکر گامو کے گھر کی چھت پر سے عجیب نظارا کیا کرتا تھا۔ گرمیوں میں سب لوگ مرد عورتیں بچے گھروں کی چھتوں پر چارپائیاں بچھا کر سویا کرتے تھے چاندنی رات میں اردگرد خاموشی میں جب کسی گھر کے صحن میں بندھی بھینس کے کھرمارنے کی آواز آتی یا کسی چھت پر لیٹا کوئی بوڑھا کھانستا تو اس کے جلو میں گلی میں سے گزرتا چوکیدار اپنے ہاتھ پکڑی لالٹین اور لاٹھی کے ساتھ "جاگتے رہنا بھئی اوئے" کی آواز لگاتا' یوں ذرا سی دیر کے لئے گاؤں کی خوابیدہ زندگی میں حرارت کی لہر در آتی اور ایک بار پھروہی چپ چاپ چھا جاتی۔ رات کے پہلے پہر بعض اوقات کسی ایک گھر کی چھت سے آواز آتی ----"اوئے امام دینا---- رحمیاں یا نوریا میرے حقے کی چلم بجھ گئی ہے کیا تمہارا حقہ چل رہا ہے (تازہ ہے) اور گاؤں کے دوسرے کونے کی چھت سے جواب آتا "ہاں میرے حقے کی چلم گرم ہے" اور پھر یہ حقہ ایک چھت سے دوسری چھت پر سے مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتا ہوا طلب کرنے والے کے پاس پہنچ جاتا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے نا---- مجھے آج بھی یہ منظر عجیب طرح کا لگتا ہے۔ گرمیوں ہی کے دنوں میں جب ہاڑ کا مہینہ اپنے عروج پر ہوتا تھا اور گرمی کی شدت سے انسان چرند پرند ڈھور ڈنگر سب بولائے بولائے سے ہوتے تھے تو گاؤں میں ایک اور طرح کی activity کا آغاز ہوتا کوئی ایک منچلا اپنے گھر کی چھت پر پانی سے بھری بالٹی سمیت چڑھ جاتا پھروہ گاؤں کے نہایت قنوطی اور غصیلے قسم کے کسی ایسے بوڑھے کی آمد کا منتظر رہتا جو اپنے ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا تھا یعنی صاف ستھرے سفید تہمد اور قمیض میں ملبوس اس بوڑھے پر گلی میں سے گزرتے ہوئے اچانک اوپر سے پانی سے بھری بالٹی الٹ دی جاتی وہ ٹھٹھک کر اپنے گیلے کپڑوں پر

نکلوڈاتا پھر قریبی چھت سے کسی کی آواز اس کے اندلی غصے کی آگ کو مزید بھڑکاتی اور وہ اس نوجوان اور پھر سارے گاؤں کی ماں بہن ایک کرتے ہوئے۔ پچھلی سات پیڑھیوں کو بھی نہ بخشتا یہ واقعہ فقط آغاز ہوتا اور پھر چلن سوچل۔۔۔ گلی میں سے ہر گزرنے والا مرد عورت بچہ پانی میں جل تھل اپنی گالیوں غصے اور کھسیانی ہنسی سے نوازتا ایک اور پانی سے بھری بالٹی کے ساتھ خود بھی اپنے گھر کی چھت پر پہنچ جاتا اور پھر اس کی زد میں بھی جب کوئی تازہ شکار آتا تو وہ بھی اس ٹھٹھے اور مخول کا حصہ بن جاتا جو اس وقت سارے گاؤں کی فضا میں رچ بس چکا ہوتا تھا۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد حویلی کے مکینوں کو چھوڑ کر گاؤں کا ہر مرد اپنے گیلے کپڑوں کے ساتھ چلتا پھرتا نظر آتا اور پھر ایک انہونی ہوتی کہ اس تفریح کے بعد پتہ نہیں کدھر سے ایک کالی گھٹا آتی اور سارے گاؤں کو نہلا جاتی۔۔۔۔ بارش زندگی اور ٹھنڈک کی نوید لے کر گاؤں کی رگوں میں اتر جاتی۔۔۔ سب لوگ شانت ہو جاتے گرمی کی شدت سے ہونٹوں پر جمی پپڑیاں جھڑ جاتیں اور مردہ چوپایوں میں ایک دم سے جان پڑ جاتی۔۔۔

گاؤں کی اس زندگی اور طلسماتی فضا میں وہ شام بھی آئی جب ہمارے گھر میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس شام کو ہمارے گھر کی جلانی (ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں دودھ وغیرہ گرم کیا جاتا تھا اور اپلے وغیرہ پڑے رہتے تھے) میں دودھ گرم کرتی صغراں (ہماری نوکرانی) کی چادر میں آگ لگنے سے ایک شور سا مچ گیا تھا۔۔۔ ہر کوئی ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔۔۔ دوڑ رہا تھا سب سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے تھے اور اباجی کی بھاری بھرکم آواز ساری حویلی میں گونج رہی تھی اور اسی وقت اچانک حکم ملا تھا۔ "ہم کل شہر چلیں گے"

جس طرح گزشتہ شام اچانک انہوں نے کہا تھا:

"کل تم میرے ساتھ گاؤں چلو گے!"

اور یوں میری دیرینہ خواہش' گاؤں جانے کی خواہش' اسے پھر سے دیکھنے' وہاں کے لوگوں سے ملنے وہاں کے ماحول میں سانس لینے کی خواہش پوری ہو رہی تھی ایک اور خواہش یہ تھی کہ میں اس واقعہ کی خود چھان بین کرنا چاہتا تھا کہ اس شام ہوا کیا تھا۔۔۔ صغراں بچ گئی تھی یا جل مری تھی۔

بڑی سڑک سے سولنگ لگی چھوٹی سڑک پر جو ہمارے گاؤں کی طرف جاتی تھی گاڑی گھماتے ہوئے اسی واقعے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اباجی مجھے بتا رہے تھے۔ "دیکھو اب سڑک پکی ہو گئی ہے۔۔۔ میں نے اس دوران دو اور باغ لگوائے ہیں۔۔۔ وہاں بڑا اعلیٰ کوالٹی کا کنو لگتا ہے۔۔ زیادہ تر ایکسپورٹ کوالٹی کا۔۔۔ کارندے زمینوں کی دیکھ بھال اچھی طرح سے کرتے ہیں۔۔ گندم چاول اور گنے کی فصلیں اچھے پیسے دیتی ہیں۔ کاکا تمہارے لئے اتنا کچھ ہے کہ تم کیا تمہارے بچوں کی آنے والی نسلیں اگر کچھ بھی نہ کریں تو آرام سے زندگی گزار سکتی ہیں۔۔۔ لیکن میں تمہیں پڑھانا لکھانا چاہتا تھا اس لئے تم کو گاؤں سے اتنی دیر تک دور رہ کر زندگی گزارنی پڑی' مگر یہ بھی تو دیکھو کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو آج تم اسسٹنٹ کمشنر نہ ہوتے۔"

میں سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے اباجی کی خضاب میں ڈوبی مونچھوں کی حرکت اور ان کی پگ کے اونچے سیدھے شملے کو ہاتھی کے کان کی طرح ہلتا ہوا دیکھے جارہا تھا۔ ان کی آواز کا کھردرا پن میری سوچوں کو ادھر ادھر بھٹکا رہا تھا اور میں بار بار اپنے سر کو جھٹک کر اپنے ذہنی ارتکاز کو بحال کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

گاؤں کا پہلا گھر ہمارا ہی گھر تھا۔ ہماری ہی حویلی تھی جس پر کی گئی قلعی ستھری اب کئی جگہ سے
مائل ہو چکی تھی گاؤں کے کچھ لوگ جن میں زیادہ تر ہمارے نوکر چاکر تھے ہمارے استقبال کے لئے گھر
سے باہر آئے تھے۔ مردانے کی بڑی بیٹھک میں اب بھی وہی پرانا صوفہ اور کرسیاں بچھی تھیں قالین پر بھی
پرانے ایرانی کے قالین کے رنگ اب پھیکے پڑ گئے تھے۔ ہر چیز کافی پرانی اور دقیانوسی لگ رہی تھی مگر
چاکروں نے ہر چیز کو اپنی اصل جگہ پر اصل حالت میں نہایت صاف ستھری حالت میں رکھنے کی بھرپور کوشش
کی ہوئی تھی۔ اس بیٹھک کے ادب آداب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی وہی لوگ ویسی ہی پراسرار
خاموشی ـــــ اباجی کی مونچھوں کا وہی مخصوص اشارہ اور ان کی پگ کا ہاتھی کے کان کی طرح ہلنے والا کلف دار
وہی شملہ ـــــ مجھے چونکہ ان خرافات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں تو نیم گرم دودھ کا ایک لمبا
گلاس (کہنی تک کی لمبائی جتنا) جوں کا توں چھوڑ کر زنانے کی طرف کھسک آیا۔ آج شاید بڑی مدت کے بعد
اس زنانے میں اباجی کے بعد کسی دوسرے بالغ مرد یعنی میں نے قدم رکھے تھے ـــــ میں نے اندر آتے وقت
اباجی کی طرح کا ایک فل سائز کا کھنگورا مار کر اپنے آنے کی اطلاع دینے کی کوشش کی مگر یہ ایک ناکام
کوشش تھی کھنگورے کی جگہ کچھ عجیب قسم کی مہین سی آواز میرے حلق سے برآمد ہو کر زنانے کے صحن
میں پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کام کاج کرنے والی عورتوں نے آج مجھے اپنے سامنے پا کر نہایت عجلت سے
اسی طرح اپنی چادریں اپنے چہروں پر سرکا لی تھیں جیسے کہ وہ اباجی کے آنے پر سرکاتی تھیں البتہ آج ان میں
سے کچھ دبی دبی ہنسی ہنس رہی تھیں شاید اس میں میرے چوہدری پنے کی ریہرسل میں کسی قسم کی غلطی کوتاہی
یا خرابی کا دخل تھا۔ میں سیدھا اس کمرے میں چلا آیا جہاں ایک بڑے پلنگ پر میں اپنی اماں کے ساتھ سویا
کرتا تھا۔ کمرے میں پرانی مٹی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار پر لٹکے لکڑی کے فریم والے پرانے گول آئینے
میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے میں نے اس پر جمی گرد کی ہلکی تہہ میں اپنے چہرے کے نقوش کو بنتے بگڑتے ہوئے
محسوس کیا۔ میں نے تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا منہ آپ چڑایا تو عمر رسیدہ آئینے میں موجود بہت سے
دھبوں نے میری شکل کو کافی ڈراؤنے رنگ میں پیش کیا۔ میں پلنگ پر جا بیٹھا پھر اٹھ کر ان دیواروں کو چھو کر
دیکھا جن پر کچی مٹی کا لیپ کیا گیا تھا ان میں سے عجیب سی خوشبو پھوٹ رہی تھی بلکہ یہ خوشبو تو اس کمرے
میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی یہ میری اماں کی محبت کی خوشبو تھی ـــــ میرا ماضی میرے سامنے تھا میں دیر تک
ایک طرح کی fantasy اور محبت آمیز تحیر کی زد میں رہا۔ کچھ دیر تک میں اسی کیفیت میں گھرا رہا پھر باہر
نکل آیا گاؤں کا حلیہ ہی بدل چکا تھا تقریباً سب ہی مکان اب پکی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے اور اب ان کی
اپنی منڈیریں اور چھتیں تھیں اب یہ گھر ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے بھی علیحدہ علیحدہ تھے۔ اپنی اپنی اکائیوں میں
جکڑے کھڑے تھے۔ ان گھروں کی اینٹوں سے مجھے اداسی اور پژمردگی سی امڈتی ہوئی محسوس ہوئی گاؤں کی
ساری فضا میں ایک پتھریلا پن سا نمایاں تھا۔ لوگ باگ مجھے دیکھ کر ذرا سا ٹھٹھکتے رکتے اور پھر چل پڑتے وہ
خاصی لاتعلقی کا اظہار کر رہے تھے کسی کسی گھر سے کیسٹ پر بکھرے فلمی گیت اور غلام علی کی غزلیں سنائی
دے رہی تھیں۔ ہر دوسرے گھر کی چھت پر ٹی وی انٹینا موجود تھا۔ گلیوں کے درمیان بہتی گندی نالیوں اور
ان سے اٹھتی بدبو کے علاوہ گاؤں نہایت بے ڈھب بے ترتیب اور کوڑھ کے طریقے سے زمانے کے جدید
تقاضوں اور ضرورتوں سے ہم آہنگ ہونے کی بھونڈی کوشش بلکہ وبا میں مبتلا نظر آتا تھا دبئی، سعودی عرب
اور سٹیٹس سے دولت کما کر آنے والوں کا جادو یہاں بھی سر چڑھ کر بولتا نظر آتا تھا۔ قدیم اور جدید کے اس

یہ بگڑا مزاج نے جلد ہی میری طبیعت مکدر کر دی۔۔۔ شام کو تھک تھکا کر بلکہ بور ہو کر واپس گھر کو پلٹا اور ابا جی کو میں نے اطلاع بھجوا دی کہ میں ادھر زنانے میں سوؤں گا ان کی طرف سے اجازت ملنے پر میں نے رات کا کھانا کھایا کپڑے بدلے اور اپنی اماں کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں ابھی آنکھیں موند ہی رہا تھا کہ چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سن کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔ اپنے چہرے کو چادر میں پوری طرح ڈھانپے ہوئے ایک عورت میرے سامنے کھڑی تھی

"لو کاکا دودھ پی لو"۔۔۔ اس نے دودھ کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دودھ۔۔۔ ہاں۔۔۔ اچھا۔۔۔ یہاں تپائی پر رکھ دو۔۔۔ مجھے ضرورت ہوئی تو میں بعد میں پی لوں گا"

وہ دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ کر جانے لگی تو میں نے اسے آواز دی۔

"ٹھہرو"

وہ رک گئی۔۔۔ دراصل اسے یوں ٹھہرانے کا ایک مقصد تھا۔ میں اس سے کچھ سوالات کر کے اپنی پرانی کسک کو مٹانا چاہتا تھا جس نے مجھے گاؤں سے شہر جانے والے دن سے پہلے کی ایک شام سے اب تک جکڑ رکھا تھا میں اس سے صغراں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا جس کی چادر کو اس شام جلانی میں آگ لگ گئی تھی۔

اپنے چہرے کو پوری طرح چھپائے ہوئے اس نے کہا۔

"؟کیا بات ہے کاکا۔۔؟"

"دیکھو۔ تم ذرا رکو۔۔۔ بلکہ یہاں بیٹھ جاؤ اور میری ایک بات کا جواب دو"

وہ وہیں فرش پر بوسیدہ ہوتی ٹیالے رنگ کی چٹائی پر بیٹھ گئی۔

"تم صغراں کے بارے میں کچھ جانتی ہو۔۔۔؟"

"ک۔ کون صغراں۔۔۔؟" وہ ہکلائی۔

"وہی صغراں۔۔۔ بیس سال پہلے جس کی چادر کو جلانی میں آگ لگ گئی تھی۔۔۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا کیا وہ زندہ ہے یا اس شام جل مری تھی۔"

"نہیں جی وہ کرماں ماری تو ابھی تک زندہ ہے۔"

"زندہ ہے۔۔ کہاں ہے وہ۔۔ کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتی ہو؟"

"کاکا۔۔۔ وہ صغراں میں ہی ہوں"

"ارے تم۔۔۔ صغراں۔۔۔ یعنی کہ تت۔۔ تم" اب ہکلانے کی باری میری تھی۔

"تم مجھے بتا سکتی ہو۔۔ اس شام کیا ہوا تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہاری چادر کو آگ کیسے لگی تھی۔"

"کاکا کیا کرو گے تم پوچھ کر۔۔۔ بس وہ ایک عام سی بات تھی۔"

"نہیں نہیں وہ عام بات نہیں تھی۔۔۔ یہ میرے لئے اس لئے اہم ہے کہ اس وقت حویلی میں ہونے والی کوئی بات ابا جی کے حکم کے بغیر لوگوں کے ہونٹوں پر نہیں آتی تھی اور اس شام کے بعد بھی اس واقعے کے بارے میں لوگوں نے اپنے ہونٹ سی لئے تھے کیونکہ شاید انہیں اذن ہی نہ تھا اماں نے بھی مجھے

اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"کاکا اس شام میں حسب معمول چولہے پر دودھ کا برتن چڑھائے بیٹھی تھی دودھ ابل رہا تھا کہ اچانک وہ انہونی ہو گئی ـــــ میاں جی ایک دم سے اندر آ گئے اور میں نے انہیں دیکھ کر چادر سے اپنے منہ کو ڈھانپنے کی کوشش کی تو بوکھلا کر چادر زمین پر گرا بیٹھی اسے اٹھانے کے لئے جھکی تو اس وقت تک چولہے کی آگ میری چادر کا ایک کونا چاٹ چکی تھی پھر اس آگ نے ـــــ"

ہاں ہاں کہو ـــــ آگے کیا ہوا؟؟"

اس آگ نے میرے آدھے چہرے کو جھلسا دیا کمرے میں ہر طرف دھواں پھیل گیا تھا سارا دودھ بھی چولہے سے نیچے گر کر بہ چکا تھا" اتنا کہہ کر اس نے اضطراری طور پر چادر کو اپنے سر پر اور زیادہ مضبوطی سے جمانے کی کوشش کی تو اسی کوشش میں اس کا چہرہ تھوڑا سا ننگا ہو گیا یہ اس کے چہرے کا وہی جھلسا ہوا حصہ تھا۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

جب اس نے دوبارہ ٹھیک طرح سے چادر اوڑھ لی تو میں نے پوچھا۔

"یہ تم کن میاں جی کی بات کر رہی ہو ـــــ؟"

وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔

"ارے کاکا وہی جو ہم سب کے میاں جی ہیں اور تمہارے ابا جی۔"

"ابا جی" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو صغراں اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی ـــــ!!!

یوسف چوہدری

رفتہ کا آئندہ

"تو جناب نے میرا غریب خانہ تلاش کر کے مالک مکان کو یہ پیغام دیا کہ میں یہاں اس وسیع و عریض کوٹھی میں آکر اپنا حساب بے باق کروا لوں۔ اس لئے کہ آج شام آپ سب بہن بھائی واپس امریکہ، کینیڈا اور سعودی عرب جا رہے ہیں۔ بڑے شیخ صاحب کو فوت ہوئے آج اکتالیسواں دن ہے۔ اور آپ نے سب ملازمین کو فارغ کر کے یہ کوٹھی فروخت کر دی ہے۔ اور اب آپ کو کسی طرح معلوم ہوا کہ بڑے شیخ صاحب نے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنی دل بستگی اور تنہائی کے لئے ملازم رکھا تھا۔ صرف اپنی موت سے سترہ دن قبل۔ پھر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ سب بہن بھائی اپنے مرحوم والد کا کسی بھی قسم کا قرض اپنے سر لینے کو تیار ہیں۔ خدا مرحوم کو بخشے۔ تو جہاں تک مجھ ناچیز کا تعلق ہے تو یہ معاملہ حد درجہ سادہ اور صاف ہے، وہ یہ کہ اگر میں نے قرض ہی وصول کرنا تھا۔ تو یہاں مختلف حیلے بہانوں سے آتا اور جتاتا کہ مرحوم میرے سترہ دن خدمت کا معاوضہ ادا کئے بغیر ہی رخصت ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ جی ہاں! یہ کیوں معاملے کی سادگی کو پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ تو محترم! معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ بڑے شیخ صاحب کے ساتھ اپنے معاملات کچھ اس ڈھب پر چل نکلے کہ ملازم اور مالک کا تصور ہی عجیب لگتا ہے۔ آپ سب تو بیرون ممالک زندگی کے مزے لوٹتے رہے اور یہ احساس نہ کر سکے کہ یہاں اس کوٹھی کے وسیع و عریض پنجرے میں بڑے شیخ صاحب قیدی پرندے جیسی زندگی گزارتے رہے۔ میری کڑوی کسیلی باتوں کا ذائقہ آپ کو چکھنا ہی ہوگا۔ کیونکہ ان کے تیمار داروں نے ناقابل فہم قسم کی کوفت کافی حد تک اٹھائی ہے۔ ان کے مفلوج جسم اور ذہن کو ہم نے ہی سنبھالے رکھا۔ لفظ بیمار ذہن پر چونکئے مت! یہ حقیقت ہے جو مجھ سمیت سب ملازمین پر عیاں رہی۔ ویسے آپ کو اختیار خاص ہے کہ پیش بندی اور بالادستی کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھے یہاں سے چلا جانے کو کہیں! میں ہرگز برا نہ مناؤں گا۔ چلا جاؤں گا۔۔۔۔ مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے گفتگو کا تسلسل برقرار رکھنے کو کہا ہے۔ مرحوم شیخ صاحب نے مجھے اکتیس امیدواروں پر فوقیت دے کر اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے ملازم رکھا تھا۔ یعنی اپنی موت سے صرف سترہ دن قبل۔۔۔۔ معاوضہ سو روپے روز ٹھہرایا گیا۔ بعد میں ۔۔۔۔ نہ نہ۔۔۔۔ جیب میں سے نوٹ نکال کر مت گنیئے۔ یہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اور نہ ہی بے باق ہونے والا قرض ہے۔ کچھ اس قسم کی بات مرحوم نے بھی دوسرے دن کی تھی۔ فرمایا۔ نعیم میاں! تم تنخواہ لو گے۔ معاوضہ یا انعام؟' میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے گنگ دیکھ کر انہوں نے بستر پر لیٹے لیٹے دونوں بازوؤں کے سہارے اپنا نچلا فالج زدہ دھڑ گھسیٹ کر اوپر کیا۔ ایک ایسی ریل گاڑی کی طرح جس کے اگلے مسافروں کے ڈبے پلیٹ فارم پر رینگ کر رکے ہوں اور پچھلے حصہ کے مال ڈبے دور تاریکی میں کھڑے رہ گئے ہوں۔ ان کا اوپر کا دھڑ اور نیچے کا دھڑ

ہمیشہ میرے ذہن میں ریل گاڑی کے مسافر اور مال والے ڈبوں کی سی تشبیہ لاتا۔ تو صاحب الحسن نے تشکیل پر خود کو لا کر سوال دوبارہ دہرایا۔ تو میں بولا۔ "حضور نے مجھے کیا سوچ کر ملازم رکھا۔ نوکر، ملازم چارہ یا خدمت خلق کا کوئی رکن۔۔۔۔" انہوں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور آنکھوں پر ہتھیلی کا سایہ کر کے مجھے بغور دیکھا۔ بولنے سے قبل ان کے کھنچے ہوئے ہونٹ جونہی ڈھیلے پڑے تو مجھے ان کے درمیان سیاہ دراڑ نمودار ہوتی معلوم ہوئی۔۔۔ بولے۔۔۔۔ "تم بھی عجیب شے ہو! میرا سوال درگزر کر دو! آؤ سائنس، مذہب، طب اور جنس جس موضوع پر چاہو مجھ سے بات کرو۔ آؤ۔۔۔۔" لیکن میں اڑ گیا۔ "آپ نے یہ سوال پوچھا تو پوچھا کیوں؟" وہ ہنس کر بولے۔ "بس ذرا مزا لینے کی خاطر اور کیا؟" تو جناب بھی تو کہیں مزا نہیں لے رہے۔ اب آگے کی سنئے جناب اپنی زندگی کے آخری سترہ دن تو انہوں نے مجھ ناچیز کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ ہم۔ میرا خیال ہے کہ وہ سامنے والے کمرے کے دروازے کے پردے کی اوٹ سے کوئی خاتون آپ کو بلانے کا اشارہ کر رہی ہیں۔ میں یہیں اس صوفے پر بیٹھا ہوں۔۔۔ آپ جائیے"

○

"بھائی جان! کیوں اس بے وقوف نوجوان کے ساتھ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس کے پیسے اسے تھمائیے اور چلتا کیجئے۔ خواہ مخواہ کی کتھا لے بیٹھا ہے سارا سامان بندھا پڑا ہے۔ کوئی پل جاتا ہے کہ ہمیں الوداع کہنے کو عزیز رشتہ دار آتے ہیں۔ ہماری شام کی فلائیٹ ہے اور آپ رات کو۔۔۔ اگر کچھ زیادہ مانگتا ہے تو دے دلا کر منہ پر ماریں اور دفعان کریں۔ میں نے سب بچوں کو باہر لان میں کھیلنے کے لئے بھیج دیا ہے تاکہ ضروری معاملات نمٹا سکوں۔ آپ جا کر اس سے گلو خلاصی کروائیے۔۔۔ توبہ ہے۔۔۔ جائیے۔۔۔!"

○

"آپ واپس آ گئے محترم! مجھے پتہ ہے پردے کے پیچھے میرے بارے میں کیا کچھ نہ کہا گیا ہوگا۔ اکثر لوگوں کو میری آنکھوں سے شکی پن اور عداوت جھلکتی نظر آتی ہے۔ حالاں کہ میں بالکل بے ضرر ہوں۔ ویسے میں ان رویوں کا عادی ہوں۔ حکم ہو تو ابھی کھسک جاؤں۔۔۔۔ اچھا۔۔۔ شکریہ! آپنے روایتی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے رکنے کا کہا ہے۔ تو جناب اس سے مجھ میں اب اتنی جرات آ گئی ہے کہ میں کہہ سکوں کہ مرحوم شیخ صاحب بعض اوقات مجھ ناچیز کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتے کہ شاید کالے کتے کے ساتھ بھی ایسا نہ ہوا' برا کیئے مت! میں ان کے اچھے سلوک کو بھی نہیں فراموش کرتا۔ اب وہ تو چلے گئے اللہ کے حضور میں اور میرے پاس چند یادیں اور باتیں رہ گئیں ہیں۔ وہ گوش گزار کئے دیتا ہوں۔ مرحوم کو نچلے دھڑ کے مفلوج ہونے کا پاگل پن کی حد تک احساس تھا۔ معذرت خواہ ہوں کہ ان کی شان میں لفظ 'پاگل پن' استعمال کیا۔ لیکن جو باتیں سناؤں گا مجھے سمجھنے میں مدد دیں گی۔ ایک مرتبہ نصف شب مجھے شیخ صاحب نے آوازیں دے کر جگایا۔ میں ان کے قریب ہی صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ میں بیزاری سے آنکھیں مل کر اٹھا تو سرد شائستگی سے بولے۔ نعیم میاں! کیا غضب کی نیند لے رہے ہو گویا شیر مادر پی رہے ہو۔ اور دیکھو اوپر سے کیا غضب کی صحت اور جوانی پائی ہے سبحان اللہ! کیا تو مند جثہ ہے۔!" میری آنکھیں اور جسم نیند سے بوجھل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ میری حالت دیکھ کر کھیسیں نکال کر بولے۔۔۔ "واہ میاں نعیم! ایک چھت کے نیچے دو

گاڑی ہوں۔ ایک تو گہری نیند سوئے اور دوسرا نیند کو ترسے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں بوڑھا اور مفلوج ہوں اور تم کیسے جوان اور صحت مند ہو۔" معاف کیجئے مرحوم دیر تک اپنی آنکھوں میں حرص حسد اور طمع لئے میرے جسم کے ہر ایک عضو کو گھورتے رہے۔ پھر جلد ہی میری خاموشی کا فائدہ اٹھا کر پر ترغیب انداز میں بولے۔ "آؤ ایک سودا بازی کریں۔" میں غنودگی اور بیزاری سے بولا۔ "شیخ جی! کیسی سودا بازی؟" بولے "تم کسی طرح اپنی جوانی۔ جسم اور صحت مجھے دیدو اور اس کے بدلے میرا سب کچھ لے لو۔ دولت جائیداد اور آل اولاد۔۔۔۔ میں زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بولو۔۔۔ سودا منظور!" میں بے ساختہ چلایا "جناب کو قدرت کا قانون اور اپنا مرنا یاد نہیں رہا۔" ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ اپنے ہونٹ مل کر مغموم انداز میں بولے۔ "ہاں واقعی ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟" تھوڑی سی خاموشی کے وقفے کے بعد ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ بولے۔ "ایک بات تو میرے بس میں ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت تمہارے بدن کی اچھل کود اور پھرتی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ادھر ذرا سارے کمرے میں دوڑ لگاؤ اور صوفے اور کرسیاں پھلانگو!" ملاحظہ فرمایا کہ مجھے کیا کچھ کرنے کا کہا گیا۔ دل میں ناقابل فہم درد اور کوفت لئے میں کمرے میں دوڑنے اور اچھلنے کودنے لگا۔ میری حالت دیکھ کر ان کے اوپر کے دھڑ میں بھی چستی آگئی۔ دونوں بازوؤں سے مفلوج دھڑ کو اوپر نیچے گھسیٹتے اور اپنے دل شکن جملوں سے مجھے اچھل کود پر اکساتے رہے۔" واہ بندر کی اولاد کیا جمپ لگایا ہے۔ ارے ہرنی کے بچے کیا چوکڑی بھری واہ رے واہ!" ادھر میرا سانسوں سانس برا حال ہو رہا تھا۔ اور وہ تھے کہ میری حالت پر محظوظ ہو ہو کر ہلکے ہلکے قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ میں دیوار کے ساتھ لگ کر سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرکے دکھاؤں! چاروناچار ایسا بھی کرنا پڑا۔ اگرچہ اس مشق میں دو تین بار بری طرح پٹخنی کھا کر گرا۔ تو انہوں نے سرکس دیکھنے والے بچے کی طرح تالیاں بجا کر داد دی اس پر بھی میری جان نہ چھوٹی کہنے لگے کہ الٹی قلابازیاں لگا کر دکھاؤں۔۔۔ تو جناب ذرا تصور کریں۔ نصف شب اور کمرے میں میرے کرتبوں پر تبصرے اور تالیاں بج رہی ہیں۔ ایک قلابازی لگاتے وقت میں بے توازن ہو کر گرا تو سر پر میز کا کونا لگا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا معمولی سا خون بہہ رہا تھا۔ شیخ ایک دم خاموش ہوگئے اور مجھے اپنے قریب پلنگ پر بٹھا کر گلے لگا کر رونے لگے۔ پھر کہنے لگے "تم میرے پہلوٹھی کے بیٹے عابد ہو عابد۔۔۔۔ کم گو مگر ضدی۔۔۔۔ صرف کھانے کے وقت ضد کرنے والے ۔۔۔۔ رونے والے! آں۔۔۔ آں۔۔۔ مجھے ایک بوٹی کم ملی ہے! آں۔۔۔۔ آں۔۔۔۔ میری چائے ٹھنڈی اور تھوڑی ہے۔۔۔۔ آں۔۔۔۔ آں تب میں کہا کرتا ۔۔۔۔ لے بیٹے۔۔۔ لے میرے حصے کی بوٹی بھی تو لے۔۔۔۔ یہ لے اور چائے لے لے۔ نہ رو۔۔۔ بڑا ہو کر بڑا کماؤ ہوگا تو۔۔۔!" تو جناب آپ ہی عابد ہیں۔۔۔ یعنی شیخ عابد صاحب۔۔۔ ارے آپ رو رہے ہیں۔۔۔ ایک لحاظ سے رونا اچھا ہے۔۔۔۔ دل و دماغ اچھا اور ہلکا ہو جاتا ہے۔ جناب میری گفتگو تو یادوں کا البم ہے۔ البم۔ لیجئے وہ سامنے دروازے کے پردے کے پیچھے سے پھر وہی خاتون آپ کو بلا رہی ہے۔۔۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ جائیے!۔"

○

"زیتون بہن! کیوں بار بار بلاتی ہو۔ وہ نوجوان غیر معمولی ذہن اور مزاج رکھتا ہے۔ وہ ابا مرحوم کے آخری دنوں کی مکمل یادداشت رکھتا ہے۔ میرے تو جذبات میں ابال پیدا کر رہا ہے۔ بالکل بے ضرر ہے۔ البتہ

کے ذہن والا دکھتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں جب تک ہمیں الوداع کہنے والے نہیں آجاتے۔ جب تک تم سب
ن آگر اس کی زبانی ابا مرحوم کے آخری دنوں کی باتیں سن لے۔۔۔ کہ بالکل یقین نہیں آتا کہ ابا مرحوم
ہ واقعی ایسا کیا ہوگا؟ بہرطور، کتنی ندامت کی بات ہے کہ ہم دنیا اور کاروبار میں اتنے غرق ہیں کہ بستر
یل پر اپنے پیدا کرنے والے کے پاس بھی نہ تھے۔۔۔ اور مجید۔۔۔ اکرم۔۔۔ نعمان اور زبیدہ۔۔۔ تم
ان کی واہیات یا دلچسپ باتیں سنیں۔۔۔ بھئی اپنے اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹیں وغیرہ چیک کر لیں تم
ہنستے۔۔۔ گاؤ۔"

"تو خواتین و حضرات میں کہہ رہا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح مرحوم نے مدرسہ کے لئے فرمان جاری کیا۔
۔ ان کے سامنے کھڑا ہو کر سلوٹ ماروں اور قومی ترانہ سناؤں! میں عجب مخمصے میں پھنس گیا۔ سلوٹ تو میں
ہ مارا مگر قومی ترانہ بار بار بھول جاتا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں میرے لئے تحسین اور پذیرائی
ہ جذبے کی جگہ کشتائی نے لے لی ہے۔ وہ لعن طعن کرنے لگے۔ "چپ ہو جاؤ!" میں اپنی ندامت پر چپ
رہا تو وہ مسلسل بڑبڑانے لگے آخر میں نے بھی تنگ آکر کہا! جناب نے اگر یہ ملک بنایا ہے تو صرف اپنی
طرا ہماری خاطر نہیں۔ ہم آپ کا کوئی احسان لینے کو تیار نہیں۔ یہ ہماری پیدائش سے قبل کی بات ہے۔
ر جناب حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ملک تو آپ سے بھی کئی نسل پہلے کے لوگوں کی جدوجہد کی وجہ سے بنا ہے۔
پ کی خوبی یہ ہے کہ یہ خواب آپ کی زندگی میں آپ کے سامنے حقیقت بنا۔ چلئے مان لیا کہ آپ نے یہ
ے حاصل کیا۔ ہمارے لئے ہی سہی۔ خدا کے نام پر ہی سہی۔ لیکن آپ ہمیں اور خدا کو بھول کر اسی لوٹ
ر میں مگن ہوئے۔ کہ ہم نوجوانوں کے حصے میں بے روزگاری جہالت اور بے انصافی ہی آئی۔ خود ان
زادی اور ملک کے وسائل کے مزے لوٹتے رہے۔ ہمیں تو وراثت میں احساس محرومی اور طعنے ہی ملے ہیں۔
را کیا دوش؟" انہوں نے دونوں بازوؤں سے خود کو اوپر تکیئے کی جانب گھسیٹا اور چلائے۔ "تم اگر اس
نت ہوتے تو آج یہ الفاظ نہ کہتے۔ صرف روتے۔۔۔ صرف روتے۔!" میں نے ان کی آنکھوں کے کونوں
ے آنسو بہتے دیکھے۔ تو اپنی کوتاہی پر معذرت کی اور وعدہ کیا کہ آیندہ سے قومی ترانہ یاد رہے گا۔ اور یقین
لایا کہ بخدا میرا مقصد ان کی دل آزاری نہ تھا۔ رہی ملک اور ترانے کی بات تو یہ محبت کے جذبے از خود
دا ہوتے ہیں۔ زبردستی پیدا نہیں کرائے جا سکتے۔۔۔ میں اپنی بدترین حالت میں بھی مرتے دم تک اپنے ملک
ور زمین سے محبت کرتا رہوں گا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب کھیل کے میدان میں ہماری
وئی ٹیم جیتتی یا ہارتی ہے تو ہمارے چہرے اور لہجے اس کی محبت کے امین ہوتے ہیں۔۔۔ میری باتوں سے ان
ا دل پسیج گیا۔ اور کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو! واقعی ہم نے اپنی پہلی نسلوں کی مشقت کا پھل کھایا۔ کاش انہوں
نے کانٹا اور شیشیاں ہم بکھار رہے ہیں۔ حالاں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے سے بہتر جانشین پیدا کرنے
ی ضرورت ہے۔ دیکھو لو نعیم میاں۔ ہماری نسل کا ظرف۔۔۔ ہم حقائق کو تسلیم بھی کر لیا کرتے ہیں۔
ہماری طرح گرم مزاج اور جذباتی نہیں۔ تم ہمارے رفتہ کا آیندہ ہو۔ تمہیں کیا کہوں۔ خود میرے اپنے لہو
کے لوتھڑے مجھے اس ملک میں اکیلا چھوڑ کر پرائے دیسوں میں جا بسے ہیں۔ اور میرا کوئی پرسان حال نہیں۔"
یہ کہہ کر وہ رونا شروع ہو گئے۔ وہ اپنا رونا بھول کر پوچھنے لگے کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ تو میں نے بلا سوچے
سمجھے کہا۔ "جی میں تو آپ کے نچلے دھڑ کے نہ رونے پر رو رہا ہوں۔" یہ سن کر انہوں نے مجھے پاس بلا کر
چھاتی سے لگا لیا۔ اب تصور کریں کہ ہم دونوں انسانوں کا رونا دھونا اور ملازمین کا ہمارے اردگرد جمع ہو جانا۔

آپ سمجھیں کہ وہ انسان نہیں۔ دیوتا صفت انسان ہو رہے تھے۔ کیونکہ مرحوم کے فالج زدہ حصے کو آدھا شمار کرتا ہوں۔ انہوں نے روتے روتے ملازمین کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور اپنے بستر کی نفیس چادر سے ناک کا مواد اور آنسو پونچھے اور مجھے بھی ایسا کرنے کا کہا۔ ذرا ہی جھجک آڑے آئی اور کہا۔ "شیخ جی! اتنی نفیس چادر سے میں بھلا کیوں منہ اور آنکھیں صاف کروں گا"۔ وہ معمولی سی جھلاہٹ سے بولے۔ "جیسا میں نے کیا ویسا تم بھی کرو۔ چادر نفیس ہے تو تم سے بہتر نہیں۔" رونے دھونے سے اب ان کا چہرہ اور مزاج کا ابر آلود مطلع صاف ہو چکا تھا۔ میں نے ان کے حکم کی تعلیم کی تو متبسم ہو کر کہنے لگے "یہ چادر زیتون نے بیرون ملک سے بطور خاص مجھے روانہ کی ہے۔ کتنی دلکش ہے اور ہمارے خوب کام آرہی ہے۔ مجھے تو اپنی جوانی کا وہ زمانہ ـــ وہ پیشہ یاد آرہا ہے۔ جب میں سر اور کندھوں پہ چادریں تولیئے دستر خوان اور جانمازیں اٹھائے پھیری لگا کر انہیں بیچا کرتا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ آج پھر اسی نوجوان پھیری والے کی آواز لگاؤں جو میرے اندر کہیں گم ہوگیا ہے۔ وہ پھیری والا جدوجہد کرکے مجھے تو امارت بخش گیا لیکن خود روپوش ہو گیا۔ آج تو میں اس کو ڈھونڈ نکالوں گا ـــ تم بس ذرا سا میرا ساتھ دینا۔ میں آواز لگاؤں گا۔ تم مجھے بلا کر بھاؤ تاؤ کرکے کوئی چیز خریدنا ـــ ٹھیک!" میں گڑ بڑا سا گیا اور وہ لگے آوازے پہ آوازے لگانے ـــ آ چار خانے کی چادر لے ـــ آ مکے مدینے کی جانماز لے ـــ آ ودھیا دستر خوان لے ـــ بازار سے سستا اور اچھا مال لے ـــ آ چار خانے کی ـــ" انہوں نے چادر تکیئے اور کمبل اپنے آگے رکھ کر سجا دیئے۔ اور مفلوج بدن کو ادھر ادھر لڑھکا کر مجھے بے تابی سے دیکھنے لگے۔ میں نے بدحواس ہوکر پوچھا۔ "شیخ جی کمبل کتنے میں دوگے؟"

جھلا کر بولے "در فٹے منہ! تم تصور کرو کہ میں اجنبی اور جوان پھیری والا ہوں اور تم ـــ تم ایک تنگ سی گلی میں واقع مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی میں کھڑی غریب طبقے کی ایک چالاک عورت ہو۔ یا خود کو چالاک سمجھتی ہو۔ اپنی آواز میں زنانہ پن پیدا کرو۔ شاباش! میں خوش ہوا تو تمہاری خدمت کا معاوضہ بڑھا دوں گا" تو خواتین و حضرات یہ سن کر میری تو سٹی گم ہو گئی۔ بولنا چاہا تو آواز ساتھ چھوڑ گئی۔ ایسے ہی مجھے نہ جانے کیوں گاؤں میں بسنے والے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی یاد آگئے۔ جن کو چھوڑ کر میں یہاں شہر میں تعلیم اور روزگار کے لئے کرائے کی بیٹھک میں رہ رہا ہوں۔ میری بگڑتی حالت دیکھ کر وہ بھی بگڑے۔ "ہمت کرو! چالاک عورت آج تم نے اجنبی نوجوان پھیری والے سے کچھ نہ کچھ ضرور خریدنا ہے۔ ہمت کرو ـــ لگاؤ قیمت ـــ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" میں مزید کچھ سنے بغیر وہاں سے یعنی یہاں سے بھاگ کر اپنی کرائے کی بیٹھک میں جا گھسا ـــ اور شدید خوف محسوس کرنے لگا۔ رات گھر میں گزاری تو طبیعت بحال ہوئی۔ اگلے دن میں خود بخود ان کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا۔ انہوں نے گود میں کالی بلی بٹھا رکھی تھی۔ جو کہ میری عدم موجودگی میں کسی ملازم کے ذریعے منگوائی گئی تھی۔ ہاں تو وہ بلی کہاں ہے؟ بلی ـــ بلی ـــ خیر چھوڑیئے تو مجھے ان کے بستر کے پاس ملازمین متفکر اور خاموش کھڑے نظر آئے جونہی مجھے دیکھا تو بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا اور بلی کو پچکارنے لگے۔ ایک ملازم نے سرگوشیانہ بتایا کہ انہوں نے نیند لانے والی ساری گولیاں کھا لی ہیں۔ ڈاکٹر کو بھی نہیں بلانے دیتے! غالباً" انہوں نے ملازم کی سرگوشی سن لی۔ تلخی سے بولے "ڈاکٹر کیا کرلے گا؟ کسی کو کیا پتہ! غم کا گھاؤ جتنا گہرا ہوگا۔ سکون آور دوا کم اثر کرے گی۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں تو اتنی مقدار کھا کر بمشکل ہوش میں آیا ہوں اور تم سب کم ذات مجھے ہوش میں نہیں دیکھنا

چاہئے۔ جاؤ رخصت ہو جاؤ تم سب کے سب۔" میں بھی ملاقات کے ساتھ چلے [illegible] تم
کہاں چلے۔ تم ٹھہرو۔" پھر لہجے میں خفگی اور ملامت محسوس کر کے کہنے لگے "تم ہی [illegible] ہو گیا
ہو سکتا ہے؟ ان کم بختوں کے پاس میرے ہونٹوں سوتوں کے ایڈریس لکھے ہیں۔ ادھر جینی مرے گی ادھر
ٹیلیگرام یا ٹیلی فون جا کھڑکا کوئی مسئلہ ہی نہیں؟ دیکھا کم بخت کیسے کھسک گئے۔ جینی مرے گی تو ان کو موت
نظر آئی ہے۔ بہرحال تم نے کل بھاگ کر اچھا نہیں کیا۔۔۔ تاہم تمہیں معاف کیا جاتا ہے۔" [illegible] ان
کی زبان میں معمولی سی لکنت اور لہجے میں تھکاوٹ تھی۔ لگتا تھا خواب آور گولیاں آواز کی صورت لے ان
کے منہ سے خارج ہو رہی ہوں۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور بلی کو اٹھا کر بستر سے
نیچے پھینک دیا وہ میاؤں کر کے ایک کونے میں جا کر دبک گئی۔ خواتین و حضرات وہ کالے رنگ کی بلی تھی
غالباً" سیامی نسل کی۔۔۔ کچھ اس کا اتہ پتہ معلوم ہے۔۔۔ بلی۔۔۔ بلی۔۔۔ پھر انہوں نے مسکرا کر مجھے قریب
آنے کو کہا اور بولے "کیا چیز ہیں یہ خواب آور گولیاں بھی؟ خواب آور یعنی خواب دلانے والی گولیاں اور
نعیم میاں ہوتا کیا ہے؟ خواب ندارد یعنی ذہن منجمد اور بے خبر ہو جاتا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ وقت کا
ناگ کس رخ سے ڈستا ہے۔ سنو! جب خوابوں کی آمد و رفت بند ہو جائے تو موت کے دروازے کھل جاتے
ہیں۔ کسی دشمن کو مارنا مقصود ہو تو اس کے خوابوں پر شب خون مار دو۔ اس کے خوابوں کو چرانے کے لئے
ترغیب، تحریص اور ترہیب جیسے ہتھکنڈے استعمال کرو۔ جیسے بڑی قومیں۔۔۔" "لیکن مجھے تو بہت خواب آتے
ہیں۔ ڈراؤنے اور عجیب سے!" میں نے ان کی بات کاٹی تو انہوں نے آنکھیں میچ کر دھیمی خفگی سے کہا۔
"خواب آزاد ہوتے ہیں۔ وہ زمان و مکان کی شکل ہی مسخ کر دیتے ہیں۔ خوابوں کو آزاد ہی رہنا چاہئے۔ چاہے
وہ کتنے بے معنی۔ ڈراؤنے اور عجیب ہی کیوں نہ ہوں۔ زندگی کے حسن اور بقاء کے لئے خوبصورت بدصورت
ہر قسم کے خوابوں کا ہونا لازمی ہے۔ مجھے دیکھو! میری مدت سے بانجھ آنکھوں میں خوابوں کا کوئی حمل نہیں
ٹھہرتا۔ نعیم میاں! تم ادب کے طالب علم ہو۔۔۔ کیا یہ سب کچھ شاعری نہیں؟ جو کچھ میری زبان سے بیان ہو
رہا ہے، بخدا میرے ارادے اور فہم سے بالاتر کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر ہو رہا ہے دل میں ہلچل سی مچ رہی
ہے۔ آؤ آج پھر ایک انوکھی سودا بازی کریں! ڈرو نہیں۔۔۔ آؤ آج خوابوں کی سودا بازی ہو جائے۔" میں
ششدر کھڑا سوچنے لگا کہ کل رات کے شیخ صاحب اور اس وقت کے شیخ صاحب میں کتنا فرق ہے؟ آج وہ
عقل و دانش اور خوبصورت گفتگو کا بھرپور مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں نے حیرت میں ڈوب کر پوچھا! "خوابوں کی
سودا بازی؟" ان کا دھیما خواب آلود لہجہ جاگا "ہاں میں ہوں تمہارے خوابوں کا خریدار میں ہوں۔" "لیکن
جناب! میں اپنے جسم، صحت اور جوانی کی طرح اپنے خواب آپ کو کیسے منتقل کر سکتا ہوں؟ یہ عمل کیونکر
وقوع پذیر ہو گا؟" انہوں نے مجھے اپنے قریب بستر پر بیٹھنے کا کہا اور کچھ دیر سوچ کر بولے! "میری پیشانی سے اپنی
پیشانی بھڑاؤ!" میں نے بعینہ ایسا ہی کیا۔۔۔ وہ سرگوشیانہ بولے "اپنے خواب مجھے دیدو!" "کیوں؟" "اس لئے کہ مجھ
سے میرے خواب چھن گئے ہیں۔ آنکھیں بانجھ ہو گئی ہیں اور جسم ناکارہ ہو چکا ہے۔ دیدو نا اپنے خواب۔"
" لیکن وہ تو ڈراؤنے بے معنی اور عجیب ہیں" "کوئی حرج نہیں! جینے کے لئے کافی ہیں اور پھر جیسا میں
نے کہا ہے کہ خوابوں کی آمد و رفت بند ہو جائے تو موت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور ڈراؤنے خواب
زندگی کا حسن پانے کا راستہ ہیں۔" "لیکن اگر ایسا ہے تو میں تو ابھی صحت مند اور جوان ہوں۔ مجھے ان کی
ضرورت رہے گی۔ میں ابھی تک زندگی کا حسن اور توازن دریافت نہیں کر سکا۔ تو جناب یہ سودا بازی بے کار

ہے۔ میرے خواب آپ ہرگز نہیں خرید سکیں گے۔ جی ہاں۔ میری طرف سے معذرت ہے حد معذرت!"
میں نے پیشانی ہٹانا چاہی تو وہ دونوں ہاتھوں سے میری پیشانی دوبارہ بجا کر بولے "ارے کیسے بے مروت ہو۔ ابھی
پیشانی نہ ہٹاؤ شاید کسی طرح بات بن جائے۔ جو جی میں آئے مانگو لیکن مجھے صرف ایک خواب بخش دو! صرف
ایک خواب۔۔۔ میرے محسن صرف ایک خواب!" پیشانی بجاتے بجاتے میں نے پوچھا۔ "ایسا کونسا خواب
ہے جو ابھی تک تشنۂ تعبیر ہے۔" خواب یہ ہے کہ میرا نچلا دھڑ صحت مند زندگی کی حرارت سے بیدار ہو گیا ہے۔ میرے
بیٹے بیٹیاں۔ داماد اور بہوئیں اور پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں سب یہاں موجود ہیں۔ میں بس لمبے سفر کے بعد
تھکا گھر آتا ہوں اور بڑے کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ میری کوئی بہو میرے کسی نو مولود پوتے کو گود میں
ڈالے دودھ پلا رہی ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے منہ ہٹا کر قلقاری مار کر میری جانب دیکھتا ہے۔ میری بہو
مارے حیا کے سر اور سینہ دوپٹے سے ڈھانپ لیتی ہے پھر شور ہی شور مچ جاتا ہے اور میں جیسے جی جاتا ہوں۔
بس" میں نے ان کی پیشانی سے پیشانی ہٹائی اور قدرے فاصلے پر بیٹھ کر کہا "جناب یہ خواب میرے خزانے میں
موجود نہیں۔ کیا معلوم مستقبل مجھے بھی اس خواب کی بھیک دیتا ہے یا نہیں۔ آپ کو خالی ہاتھ لوٹنا ہوگا۔
معذرت خواہ ہوں۔" وہ ایک دم چلائے "دفع ہو جاؤ یہاں سے! میں بھی کیسا بدنصیب ہوں۔ خواب کے روپ
میں اپنی چھنی ہوئی حقیقت اوروں سے مانگ رہا ہوں۔ تم جاہی رہے ہو تو ذرا میری یہ بلی پکڑ کر مجھے دے
جاؤ!" خواتین و حضرات دن گذرتے رہے اور ہم نے ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنا شروع کر دیا۔ ایک
مرتبہ یعنی مرنے سے صرف تین دن قبل جب میں ان سے ملنے ان کے کمرے میں گیا صبح کا وقت تھا اور
دھوپ کی کچھ شعاعیں روشندان کے راستے گذر کر شیخ صاحب کے فالج زدہ حصے پر پڑ رہی تھیں تو دیکھا کہ
انہوں نے بلی کو اگلے دو پنجوں سے پکڑ کر انسانی بچے کی طرح اٹھایا ہوا تھا۔ اور کہہ رہے تھے "آج کل تو مجھ
سے بہت پیار جتا رہی ہے' ارے نعیم میاں آؤ۔۔۔ دیکھو تو اس کے خواب چھچھوندوں کے علاوہ اور کیا
ہوں گے؟ قدیم کہاوت ہے کہ جب بلی مرنے کے قریب آتی ہے تو اپنے مالک سے بہت محبت کا اظہار کرتی
ہے۔ اب خدا معلوم کس کی قضا آئی ہوئی ہے۔۔۔ میری یا اس کی انہوں نے اس کے منہ پر ہلکے سے دو چپت
رسید کئے اور اسے بستر سے باہر پھینک دیا۔ وہ ہلکی سی میاؤں کرکے صوفے کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔۔۔ تو وہ
ہنس کر بولے۔۔۔ "کم ذات مجھے الوداع کہہ رہی ہے۔۔۔" تو خواتین و حضرات پھر وہ واقعہ پیش آیا جو نہیں
ہونا چاہئے تھا۔ اچانک میری نگاہ پلنگ کے ساتھ بائیں جانب فرش پر جا پڑی جہاں سو سو روپوں کے نوٹوں کی
گڈی پڑی تھی۔ شیخ صاحب کہنے لگے مجھے ذرا اونگھ آرہی ہے۔ تم چاہو تو ٹھہرو۔ چاہو تو کچھ دیر بعد
آجانا۔" یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ اور پھر بولے "آج گھر میں ماسوائے ایک ملازم کے اور کوئی
موجود نہیں۔ سب کو ایک دن کی چھٹی دی ہوئی ہے۔ تم بھی چاہو تو۔۔۔۔۔" شیخ صاحب یہ کچھ روپے نیچے
پڑے ہیں۔۔۔ ٹھہریئے۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ لیجئے!" میں نے ان کی بات کاٹ کر جھک کر نوٹوں کی گڈی اٹھا کر ان
کی گود میں رکھ دی۔ تو وہ دیر تک میری ایمانداری کو سراہتے رہے۔ میں نے ان کو رقم کے معاملے میں چوکنا
رہنے کا کہا۔ تو کچھ دیر سوچ میں گم رہ کر ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا کہ جس نے ہمارے تعلقات ہی ختم
کر دیئے۔ کہنے لگے "بھئی نعیم میاں! یہ روپے میں نے تمہاری ایمانداری جانچنے کے لئے جان بوجھ کر خود ہی
گرائے تھے۔ اور اس سلسلے میں گھر میں موجود ملازم کو پہلے ہی سے اعتماد میں لے لیا تھا۔ بھئی اگر تم وہ
روپے تین تین کر جاتے تو یہاں سے تمہارا بوریا بستر گول ہو جاتا۔ ہم کاروباری لوگ ملازمین کو ہر طرح سے

جانچ پرکھ کر رکھتے ہیں۔ بھئی تم تو سرخرو نکلے۔ اپنی ملازمت بچنے کا سمجھو میں دل ہی دل میں خوش تب کھل کر
بولا "یہ آپ نے اچھی حرکت نہیں کی! اگر میں حالات اور مجبوری کے ہاتھوں بھٹک جاتا تو۔۔۔؟ انسان
ہوں اور ضرورت مند بھی ہوں' بہرطور میں آپ کے امتحان میں سرخرو نکلا۔ شکریہ کی بات ہے آپ سے
لپٹ جاؤں۔۔۔" وہ کھیسیں نکال کر بولے تو "روکتا کون ہے آؤ گلے لگ جاؤ" تو خواتین و حضرات یہاں
اس مرحلے پر میں ایک قبیح حرکت کا اعتراف کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ اپنے دل کا غصہ نکالنے کے لئے میں ان کے
اوپر کے دھڑ سے تو لپٹ گیا۔ مگر نچلے مفلوج دھڑ پر دھڑا دھڑ مکے مارنے لگا۔ کس کس کر جو مکے لگے تو ان
کے اوپر والا دھڑ خود بخود ہلنے لگا۔ انہوں نے پر شبہ انداز میں پوچھا "یہ میرا جسم خود بخود کیسے ہل رہا ہے؟"
فالج زدہ حصے پر مکے کیا اثر کرتے' لیکن میرا غصہ رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوتا گیا۔ میں نے سانسوں پر قابو پا کر کہا۔
"شاید زلزلہ نہ آگیا ہو!" اس پر وہ کلمہ پڑھنے لگے اور قطعی طور پر یہ نہ سمجھ سکے کہ میں ان کی نظروں سے
چھپا کر مکوں کی مشق ستم کررہا تھا۔ مجھے احساس ہے! خواتین و حضرات! مجھے احساس ہے آپ کے پیارے
والد محترم کے ساتھ میرا یہ سلوک اس قدر قابل مذمت ہے کہ مجھے یہاں سے دھکے دے کر نکال دیا جاسکتا
لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک فوری ردعمل تھا جذبات کا۔۔۔ جس پر میں بعد میں بہت پشیمان ہوا۔ اور اسی
وقت دل میں عہد کرکے اٹھا کہ آج سے میں خود کو اس ملازمت سے آزاد سمجھوں گا۔ میں نے ایسا ہی کیا
تین دن بعد ان کی فوتگی کی اطلاع ملی۔ میں جنازے میں شامل تھا۔ اور آپ سب بھائیوں کو دیکھا اور لوگوں
سے آپ کے بارے میں سنا۔ اور چپکے سے کھسک آیا۔ شکرگزار ہوں آپ نے تحمل اور دلچسپی سے مجھے
سنا اور میری خوبیوں اور کوتاہیوں پر کوئی رائے زنی نہیں کی۔ لیکن اب آپ مرحوم کے قرض کا قضیہ لے
بیٹھے ہیں۔ تو یاد رکھیں۔ مرحوم کی صحبت میں گذرے یہ سترہ دن پورے کے پورے میری ملکیت ہیں۔ میں
خود شش و پنج میں ہوں کہ اپنی زندگی کی راہ میں آنے والے ان سترہ دنوں کو اپنے ساتھ کس حوالے سے
منسلک کروں۔ ایک بات طے ہے کہ میں ہرگز ہرگز کوئی رقم نہ لوں گا۔ جی ہاں۔ یہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے۔
غالباً باہر کچھ کاریں آکر رک رہی ہیں۔ بچوں کا شور بھی بڑھ گیا ہے۔ آپ کے عزیز رشتہ دار الوداعی
ملاقات کو آرہے ہیں۔۔۔ اچھا خدا حافظ!"

O

نصف شب کے قریب سمندر کے اوپر فضا کا شکم چیرتے ہوئے امریکہ جانے والے طیارے کے اندر
پائیلٹ نے جب جہاز کی رفتار سمت اور موسمی حالات سے مسافروں کو آگاہ کیا۔ تو شیخ عابد نے جماہی لے کر
اپنی بیوی کے استفسار پر بتایا ۔۔۔ "بے حد عجیب اور بد مغز انسان سے پالا پڑا۔ آخر وقت تک میں کوٹھی کے
بیرونی گیٹ تک اس کے ساتھ گیا اور پیسے دینے کی کوشش کی۔ ہمارے سامنے سکول کے بچے اور بچیاں بستے
کندھوں پر لٹکائے گذر رہے تھے۔۔ اس نے اس وقت ایک ایسی بات کہی کہ میں چپکے سے واپس لوٹ
آیا۔۔۔" بیوی نے ہلکی سی دلچسپی سے پوچھا "کیسی بات؟" شیخ عابد نے سیٹ کی نشست پر سر ٹکا کر کہا "اس
خود سر کا کہنا ہے کہ اس کے سترہ دنوں کا قرض اگر کسی نے چکایا بھی تو وہ ان ہی میں سے کوئی ایک
ہوگا۔۔۔ اس کا اشارہ واضح طور پر سکول سے آنے والے بچے بچیوں کی طرف تھا۔"

عباس خان

مٹی کے بت

مدثر کو اس کے والدین نے ہر طرح سے "سمجھایا" دوستوں نے منت سماجت کی اور پڑوسیوں نے کوشش کی لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے سب کو دو ٹوک الفاظ میں جواب دیا کہ وہ اللہ وسائی سے شادی نہیں کرے گا۔ جب وجہ پوچھی جاتی تو وہ بتاتا کہ وہ اس کو پسند نہیں۔ اس کی پسند کا معیار معلوم کیا جاتا تو وہ کہتا کہ وہ خوبصورت نہیں۔

اطہر کو اس کا عزیز ترین دوست ہونے کا دعوی تھا۔ ایک دن تنگ آکر اس نے اس کو اپنے ہاں بلایا۔ اس کو اپنے بیڈ روم میں بٹھا کر دروازے کو اندر سے تالہ لگا دیا اور کہا کہ وہ اس کی شادی کے متعلق فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کو وہاں سے نکلنے دے گا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ بات حسب سابق خوبصورتی پر پہنچی۔ مدثر نے کہا کہ وہ خوبصورت نہیں ہے لہٰذا وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کے نزدیک خوبصورتی کیا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ خوبصورتی کی تعریف کرنے سے قاصر ہے۔ اس کا خوبصورتی کا معیار یہ ہے کہ دل و دماغ پر خود بخود چھا جائے اور اس کے سحر سے آزادی حاصل نہ کی جا سکے۔ اطہر نے کمرے میں رسالوں کا انبار لگا رکھا تھا۔ ان رسالوں کے سرورقوں پر چھپی ہوئی تصویریں اس نے اس کو دکھانی شروع کر دیں کہ شاید کسی تصویر میں اس کا معیار مل جائے۔ ہر تصویر کو اس نے رد کر دیا۔ تصویر والیوں پر اس کے اعتراضات کچھ اس قسم کے تھے' یہ بہت باتونی ہوگی۔ اس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہوگی۔ یہ ہر وقت لپڑ لپڑ کھاتی رہتی ہوگی۔ یہ ہر مرد سے داد حاصل کرنا چاہے گی۔ یہ بہت مغرور ہوگی۔ یہ بہت لڑاکا ہوگی۔ جب رسالے ختم ہو گئے تو اطہر دنیا کی چند خوبصورت ترین ایکٹرسوں کی تصویریں اس کے سامنے لایا۔ ان سب کو اس نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ لفظ ایکٹریس اور لفظ خوبصورتی آپس میں متضاد ہیں۔ جو عورت خود نمائی کی اتنی شوقین ہو اور ہر ایک کے ساتھ فٹ ہو جاتی ہو وہ کبھی خوبصورت نہیں کہی جا سکتی۔ تھک ہار کر آخر اس نے کہا اللہ وسائی اس کی منگیتر ہے اور ظاہراً" اس میں کوئی خامی نہیں مگر وہ اس کو پسند نہیں۔ کسی اور لڑکی کی طرف اشارہ کرنے سے بھی وہ قاصر ہے تاکہ اللہ وسائی کی جگہ اس کو اس کی بیوی بنانے کا سوچا جا سکے۔ نیز اس کا خوبصورتی کا معیار بھی قابل فہم نہیں۔ معیار معلوم ہو تو کم از کم لاہور کالج آف آرٹس والوں کو کہہ کر اس کے معیار کے مطابق ایک بت بنوا کر اس کو دے دیا جائے جسے وہ بیوی کی جگہ گھر میں رکھ کر روحانی تسکین حاصل کرتا رہے' وہ واپس جا سکتا ہے۔ وہ اس موضوع پر آئندہ اس سے بات نہیں کرے گا۔ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ مدثر نے اس کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اپنی مجبوری کے حوالے سے اس سے معذرت کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس کے ایک اور عزیز ترین دوست ریاض نے اپنے طور پر کوشش کی۔ ریاض کا خیال تھا کہ تمام

عورتیں یکساں طور پر بے وقوف ہوتی ہیں لہٰذا انتخاب کیسا۔ جو بھی ملے اس سے شادی کر لی جائے۔ مرد کا مقدر اس زمین پر موجود عورت ہی بن گئی ہے۔ کسی دیگر خطے سے کوئی تعلق نہ آنے سے رہی۔ بہرحال ان بنیادی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اللہ وسائی اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ وہ اس کی بچپن سے منگیتر ہے۔ وہ اس کے چچا کی بیٹی ہے۔ وہ گھریلو کام کاج میں تکمیل ہے۔ وہ پڑھی لکھی بھی ہے۔ وہ باکردار اور نماز روزے کی پابند ہے۔ اس کی سادگی کو جدت میں بدل دیا جائے تو وہ مدثر کا دل موہ لے گی۔ سادگی سے مراد اس کی وضع قطع کی سادگی تھی۔ وہ طبیعت کی اتنی سادہ نہیں تھی۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز کو بخوبی سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ اللہ وسائی کی ماں کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں کو اس نے سمجھایا "خالہ جی! اس دنیا میں خوبصورتی کا کوئی عالمی معیار نہیں۔ ہر علاقے کا اپنا اپنا معیار ہے۔ ہر خطے میں موجود انسانوں کی شکلیں تقریباً" جدا جدا ہیں ایک کے نزدیک جو خوبصورتی ہے وہ دوسرے کے نزدیک نہیں ہے۔ معیار بس کیا ہے ذاتی پسند و ناپسند ہے۔ مدثر ٹھیک کہتا ہے کہ وہ خوبصورتی کی تعریف کرنے سے قاصر ہے۔ خوبصورت وہ ہے جو چپکے سے خود بخود دل پر اثر انداز ہو جائے۔ دیکھا جائے تو ہر لڑکی اپنی خوبصورتی کا معیار آپ ہے۔ اس معیار کو معلوم کرنا ضروری ہے۔ آج کل کے ہیئر ڈریسرز' درزی ' سلمنگ ہاؤسز والے اور بوتیک والے خوبصورتی کے معیار کو معلوم کرانے کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کی مدد سے اللہ وسائی کو تلاش کرے۔ وہ جب ان کی حالت کو بدلیں گے تو پتہ چلے گا کہ اللہ وسائی کس حد تک خوبصورت ہے۔ جب اس کی سادگی بدل جائے تو وہ ترغیبات کا سہارا لے۔ وہ کس طرح مدثر کو اپنی طرف راغب کرے' یہ فن اس کو آج کل کی ایڈورٹائزنگ کمپنیاں سکھائیں گی۔"

اللہ وسائی کی والدہ نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اس نے سب سے پہلے اللہ وسائی کا نام بدلا۔ اس کا نام روشنی معبد رکھا گیا' اس نام میں جدت' روحانیت' پاکیزگی اور شعریت بدرجہ اتم سمجھے گئے۔ اس کے بعد اللہ وسائی کو شخصیت سنوارنے والوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ شخصیت سنوارنے والے درزی' حجام اور عروس کی تیاری کے ماہرین تھے۔ ان کے ہاتھوں اللہ وسائی کی خوب لش پش ہو گئی۔ ان سے وقتی طور پر فارغ ہو جانے کے بعد ہمہ قسم کی ایڈورٹائزنگ کرنے والی کمپنیوں کے عملی پروگرام اللہ وسائی کو دکھائے گئے۔ آخر میں اللہ وسائی کو تقریباً ہر زبان کی کچھ وہ فلمیں دکھائی گئیں جن میں عورت مرد کا دل موہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس کو مدثر پر چھوڑ دیا گیا۔

اللہ وسائی طبعاً" جدید تراش خراش کی دلدادہ نہیں تھی۔ نیز وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتی تھی کہ وہ ہونے والے خاوند کو اپنی طرف مائل کرنے کا خود ذمہ لے۔ اس کی زیادہ تر پرورش دیہاتی ماحول میں ہوئی اور اسی ماحول کے آداب میں وہ اطمینان محسوس کرتی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ محض مدثر کی خاطر برداشت کیا۔ چنانچہ اس بے چاری نے مدثر پر ڈورے ڈالے تو مطلوبہ معیار پیدا نہ ہو سکا۔ بالکل ہماری فلموں والے محبت کے مناظر جیسی صورتحال پیدا ہو گئی اس بات نے مدثر کو اور دل برداشتہ کیا۔

کسی لڑکے کو شادی کی طرف مائل کرنے کے اور بھی حربے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت بڑا جہیز' لڑکی کے نام جائیداد یا پیسہ یا لڑکی کے والدین کی سماجی و سیاسی پوزیشن۔ ان امور کی مدثر کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی ورنہ کچھ لوگ اللہ وسائی کے والدین کو ان کی طرف توجہ دینے کا کہتے۔

ایک آخری دلیل رہ گئی تھی جو مدثر کے ماموں نے اس کے سامنے پیش کی "بیٹا اس دنیا میں

رشتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اتنے اہم ہیں جتنے کہ مذہب' آب و ہوا اور گھر وغیرہ۔ گھرانہ تو بالکل ہمارے معاشرے کی بنیاد ہے۔ جب رشتوں کی اہمیت مسلم ہے تو پھر یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ تم عمر بھر شادی نہ کرو۔ جب شادی کرنی ہے تو بروقت کرو عمر گزری جا رہی ہے۔ اللہ وسائی نہ سہی اور تمہاری پسند کی لڑکی سہی۔ کوئی فیصلہ ضرور کرو۔"

اس دلیل نے اس کو متاثر کیا۔ اس کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ اس نے اگر شادی کرنی ہے تو جلد از جلد کرے کیونکہ عمر گزری جا رہی ہے۔ بڑھاپے کی شادی تماشہ ہوتی ہے تعلق نہیں۔

مدثر ایک متمول گھرانے کا فرد تھا۔ اس کا والد ایک ٹرانسپورٹر تھا۔ اس کا ایک چچا علاقے کا سیاسی سربراہ تھا جبکہ دوسرا چچا آنکھوں کی بیماری کا بہت بڑا ڈاکٹر۔ اس نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اس نے تجارت کے پیشے کو اپنایا۔ اس نے قالینوں کے کاروبار شروع کیا۔ اس کا کام خوب چمکا۔ وہ والدین سے ہٹ کر بذات خود بہت خوشحال تھا۔ اللہ وسائی اس کے چچا کی بیٹی تھی جو علاقے کا سیاسی سربراہ تھا۔

مدثر میں کوئی قابل ذکر خامی نہیں تھی۔ وہ باشعور تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اخلاق اور ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ دنیاوی معاملات میں پوری سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ چال چلن کے لحاظ سے وہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ والدین کا فرمانبردار تھا۔ اس نے کبھی کوئی مسئلہ نہیں پیدا کیا تھا۔ بس شادی کے معاملے میں وہ اٹک گیا۔

ایک دن اپنی سوچوں اور دوسروں کے تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے اس مسئلے کو فوراً نپٹانے کا پروگرام بنایا۔ کسی اور ملک کی لڑکی سے شادی کرنے کا پروگرام اس کو خارج از امکان نظر آیا۔ وہ کافی عمر رسیدہ ہو گیا ہے۔ دنیا گھومنے میں اتنا وقت لگ سکتا ہے کہ وہ بالکل بوڑھا ہو جائے۔ اس صورتحال میں شادی صرف اپنے ملک کی لڑکی سے ہونی چاہئے۔ چنانچہ لڑکی کو تلاش کرنے وہ ملک کے مختلف شہروں کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے ان سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جانا تھا جہاں لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

ابتدا کراچی سے ہوئی۔ جس دن وہ کراچی پہنچا اس دن کراچی میں انگلینڈ اور پاکستان کی ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلا جا رہا تھا۔ تماشائیوں کے رش کی وجہ سے کسی ہوٹل میں اس کو ٹھہرنے کی جگہ نہ ملی۔ تنگ آ کر ریلوے کے ویٹنگ روم میں اس نے پناہ لی وہاں سے بھی اس کو ہٹا دیا گیا۔ وہاں کا ریلوے کا ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ایک اچھا انسان تھا اس کو جب پتہ چلا کہ وہ کس مشکل میں ہے تو اس نے اسے اپنے بنگلے میں ٹھہرنے کی پیشکش کر دی۔ اس نے وہ پیشکش قبول کر لی۔

ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک دن کی رفاقت کے بعد جب اس کی کچھ بے تکلفی ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو اس کو پتہ چلا کہ وہ خاندانی طور پر بہت ہی امیر انسان ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ اکیلے پن کو دور کرنے کے لئے وہ ملازمت کرتا ہے۔ شادی کے نکتے میں مدثر نے دلچسپی لی "عام طور پر تین قسم کے انسان شادی نہیں کرتے۔۔ وہ لوگ جو اپنے نصب العین کے پیچھے اس شدت سے پڑے ہوئے ہوں کہ انہیں شادی کا خیال نہ آئے۔ آوارہ ترین یا وہ جنہیں کوئی لڑکی ہی نہیں ملتی آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟؟"

اس کے ذہن میں شادی نہ کرنے والوں کی ایک چوتھی قسم بھی تھی اور وہ تھی بیمار لوگوں کی۔ اس

کے مانند اس قسم کا ذکر نہ کیا تاکہ وہ اس کی بات کا بالکل ہی برا نہ منا لے۔

"پسند کی لڑکی کی تلاش کی وجہ سے" اس نے جواب دیا۔

"آپ کو کیا لڑکی نہ ملی؟"

"ملی تھی" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا وہ لڑکی آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی؟" مدثر نے پھر اضطراب کے عالم میں بلا توقف پوچھا۔

"آپ کہتے ہیں وہ لڑکی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی' میں کہتا ہوں کہ اس کو تو مجھ سے عشق تھا۔ وہ دنیا کی ایک کامل ترین لڑکی تھی' میں زندگی میں کئی لڑکیوں سے ملا ہوں لیکن وہ سب کوتاہ اندیش' کم حوصلہ' جذباتی اور خطاؤں کی پتلیاں تھیں۔ میں نے ان کو دیویاں بنا کر دل کے طاقچوں میں سجا رکھا تھا۔ مگر وہ اوندھے منہ ان طاقچوں سے نیچے آگریں۔ ان میں دراصل دیوی بننے کی اہلیت ہی نہیں تھی۔ جس لڑکی کی میں بات کرتا ہوں وہ تو اس تمام دھرتی کے لئے راحت کی پیغام بر تھی۔ اس میں حسد' بغض' کینہ اور غرور نام کو نہیں تھے۔ میری ہر خطا کو معاف کر دینے والی' میرے والدین' بہنوں' بھائیوں' دیگر رشتہ داروں اور دوستوں کو اتنا چاہنے والی جتنا میں خود چاہتا ہوں' ہر رنج و الم میں میرے ساتھ قدم ملا کر چلنے والی' لباس رہن سہن اور خوراک کے معاملے میں میری ہم نوا' ذہنی سطح پر ایسے جیسے کوئی وسیع المشرب عالم......"

اس کی بات جاری تھی کہ مدثر رہ نہ سکا۔ اس نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے اس سے بے ساختہ پوچھا "آپ نے اس لڑکی سے شادی کیوں نہ کی؟"

"وہ مجھے صرف خواب میں ملی" جواب آیا۔

کچھ وقت کے لئے دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مدثر یہ جواب سن کر سکتے میں آگیا جبکہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اس خواب میں کھو گیا۔

اس کے بعد مدثر کا دل وہاں کسی شے میں نہ لگا۔ اپنے میزبان کو الوداع کہہ کر وہ سیدھا واپس اپنے گھر آیا اور اللہ وسائی سے شادی کے لئے ہاں کر دی۔

حمید قیصر

سیڑھیوں والا پل

تاری حسب معمول سورج نکلنے سے پہلے ہی ٹین کی صندوقچی' مٹیالے رنگ کی گٹھڑی اور طوطوں کا پنجرہ اٹھائے شہر کی جانب چل پڑا۔ آج پھر جیراں نے اسے بغیر چائے پیئے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا بلکہ اسے اکثر بغیر ناشتہ کیے دھندے کے لئے نکلنا پڑتا تھا۔

"کمبخت جیراں کو ہزار بار سمجھایا ہے کہ صبح چولہا گرمانے کے لئے خشک لکڑیاں دن کو ہی چن لایا کر مگر اس نامنجار کو عین وقت پر ہر شے یاد آتی ہے...... پھوہڑ کہیں کی...... جس دن بغیر ناشتے کے بھیجتی ہے...... دن بھر مندا رہتا ہے بھلا میں دن چڑھے تک اس موئی کے ناشتے کا انتظار کرتا رہوں تو سیدے اور مانی کے وارے نیارے ہو جائیں....... اور پھر مسافروں کا زیادہ رش تو صبح کی گاڑیوں میں ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک گاڑی بھی چوک جائے تو پھر اپنی فاقوں ہی میں گزرے گی۔"

وہ انہی سوچوں میں گم جیراں کو کوستا' مسائل کی گرہیں کھولتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ سورج کی روپہلی کرنیں شہر کے اونچے نیچے چوباروں کی منڈیروں پر جا بیٹھتیں' ستار شہر میں داخل ہو چکا تھا وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اور ہانپتا ہوا ریلوے پھاٹک پہنچا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دور سے اسٹیشن کے خالی پلیٹ فارم کی جانب دیکھ کر بجھ سا گیا۔ سات بجے کی گاڑی اسٹیشن چھوڑ کر جا چکی تھی۔ دھوئیں کی ایک لمبی سیاہ لکیر صبح کے دھندلے' بے رنگ آسمان کو گدلا کر رہی تھی۔---- اس کے ذہن پر مایوسی دھند کی طرح چھانے لگی۔

وہ اسی عالم میں اسٹیشن کی دوسری جانب سیڑھیوں والے پل پر بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنے ٹھیئے پر جا پہنچا اس نے دیکھا کہ مانی اور سید رسول اپنی چٹائیاں ڈالے ٹھیئے جما چکے تھے اور ان کے اردگرد بہت سے قسمت کا حال جاننے والے حاجت مند بھی جمع ہو چکے تھے۔ دونوں کے مشاق طوطے بڑی مہارت سے اشارہ پاتے ہی کارڈ اچک رہے تھے۔ مانی اور سید رسول تاری کو دیکھتے ہی قسمت کے کارڈوں پر لکھی مخصوص تحریریں اونچی آوازوں میں پڑھنے لگے۔

"وقت پر شروع کیا گیا ہر کام کامیابی سے تکمیل پاتا ہے۔" "اپنی عاقبت سنوارنی ہے تو دنیا کی فکر چھوڑ دے۔" "رشک کر جل چھوڑ اور اپنے زور بازو پر بھروسہ کر کامیابی خود چل کر تیرے پاس آئیگی۔" دونوں نے لگا تار کئی کارڈ پڑھ ڈالے۔

"ابے سیدے' دیکھ تیرا شہزادہ آن پہنچا ہے لگتا ہے آج پھر جو روٹے بن ناشتے کے گھر سے نکالا ہے" مانی نے تاری پر چوٹ کی اور اپنے------ کتھئی دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

تاری اندر ہی اندر دانت پیس کر رہ گیا غصے کے عالم میں ایک بار پھر جیراں کی شبیہہ اس کے ذہن کی سکرین پر گھوم گئی اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے جلدی جلدی صندوقچی اور طوطوں کا پنجرہ

ایک طرف رکھا اور کاندھے سے گٹھ اتار کر کھولنے لگا۔ دراصل وہ ملتی اور سپارے کے ٹھیلے پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر مایوس ہو چکا تھا۔

دن کے آغاز پر ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ آج وہ پھر کچھ زیادہ نہ کما سکے گا جس کا پتا سب کلموہی جیراں ہوگی۔ وہ چیزیں ادھر ادھر پھیلا کر پل کا جنگلہ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے اور مایوسی کے ملے جلے اثرات لئے ہوئے کپکپانے لگا۔

غصے میں بار بار جیراں کا سراپا اس کے ذہن کی سکرین پر گھوم جاتا۔ اس نے جب سے اپنی مرضی کے ساتھ جیراں سے بیاہ رچایا تھا اس کی بے فکر زندگی میں نحوست اور بے سکونی کا زہر گھل گیا۔ اب وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے قسمت کا فیصلہ الٹ نکلتا ہے۔ جب سے بستی چھوڑی ہے جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں رہتی۔ بڑی بے برکتی ہے' مجھ سے میرے اماں باوا چھین کر الٹا اپنے نکھٹو باپ کو بھی میرے سر منڈھ دیا ہے۔ لاوارث کہیں کی' خود تو سدا سے بے گھر تھی ہی' ساتھ مجھے بھی لئے لئے پھرتی ہے' کبھی جنگل میں تو کبھی شہر میں زندگی بالکل دربدر ہو کر رہ گئی ہے۔

پھر اس نے سوچا کہ "میں خود تو فٹ پاتھ پر ہوں لیکن دوسروں کو محلوں کے خواب دکھاتا ہوں۔ میرا اپنا تن بدن شکستہ ہے لیکن تقدیر کی خوش فہمیوں کے کچے دھاگے سے دوسروں کے تن کو جکڑے لگاتا رہتا ہوں۔ بہت سے لوگ یہ سب کچھ پا بھی لیتے ہیں' کوئی اولاد تو کوئی پسند کا جیون ساتھی' کسی کو قارون کا خزانہ تو کسی کے ہاتھ دوبئ کا ویزا لگ بھی جاتا ہے۔ مگر اے نیلی چھتری والے تو نے میری قسمت کا ستارا اور خوش کن کارڈ کہاں چھپا رکھا ہے؟ ترس ترس کر اولاد ملی تو وہ بھی محتاج اور معذور یہ جیراں کمبخت تو ازل سے ہے ہی منحوس جو کسی کی بات پہ کان دھرے' کوکے والی پڑوسن نے' اسے بہت پہلے سے سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ زیادہ وزن نہ اٹھانا سنبھل کر چلنا۔ یوں کرنا یوں نہ کرنا' لیکن سورج گرہن کو دو گاگریں سر پر ایک بغل میں لے کر چلنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ بس اس روز بدبخت ایسی گری کہ خود تو گر کر بچ گئی لیکن میری نسل کو بے کار کر گئی۔"

نحوست کا آغاز تو سویرے سویرے جیراں اور اس کے درمیان ہونے والی نوک جھونک سے ہی ہو گیا تھا...... رہی سہی کسر اس کے ساتھیوں نے پھبتیاں کس کے پوری کر دی تھی یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کے دل کا بوجھ بڑھتا چلا گیا۔ البتہ تھوڑی دیر بعد وہ بے یقینی کی کیفیت میں گرفتار اپنا ٹھیہ جمانے میں کامیاب ہو گیا۔

دس فٹ چوڑا یہ ریلوے پل شہر کے دو حصوں کے درمیان رابطے کا ایک بڑا ذریعہ تھا جس کی اہمیت کا اندازہ پیدل چلنے والوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں اور حشر سامانیوں سمیت پل پر جلوہ گر ہوتی جہاں سے ہر طرح کے لوگوں کا گزر ہوتا' سفر سے واپس لوٹنے والوں کا بھی اور سفر کو جانے والوں کا بھی۔ تاری لوگوں کے چہرے پڑھتا رہتا' خوش باش اور غم زدہ مایوس اور پریشان حال توانا اور کمزور ہشاش بشاش اور سوئے ہوئے چہرے اور انہی رنگا رنگ چہروں کے طفیل اسے زندگی متحرک نظر آتی وہ انہی چہروں کو پڑھ کر ان کے دکھ سکھ اپنے اندر سمو کر اپنے اندر کے سارے دکھ درد بھول جاتا۔

سرما کا مدھم سورج مشرقی سمت اس کے ماتھے کے سامنے چمک رہا تھا وہ سورج کی آنکھوں میں آنکھیں تو ڈال سکتا تھا لیکن اس کی نگاہیں اپنے اس کشمیری طوطے کے سامنے جھکی ہوئی تھیں جسے امرود اور

کھانا کھلانے کو اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ دونوں سے طوطے ابھی تک پنجرے سے باہر نہیں آئے تھے جبکہ کشمیری طوطا پنجرے کی چھت پر بیٹھا پروں میں سر دیئے اونگھ رہا تھا۔

”امرود کھائے گا بہت...“ دوسا اپنے کالے بدن پر گلی لیروں کے درمیان میلا کچیلا جھولا لٹکائے اس کے سامنے کھڑا رال ٹپکا رہا تھا جو اس کی داڑھی کے جنگل سے گزر کر چٹائی میں جذب ہو رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں آدھ کھایا امرود اور دوسرے ہاتھ میں پکوڑے تھے۔ تاری تشکیک نگاہوں سے دوسے کو دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو ”دوسے یار مجھ بدبخت سے تو تو سودائی ہی بھلا ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کا پیٹ پالنے کے بھی قابل ہے“ ”اوئے یہ تیرے لئے نہیں ہے۔ میں تو اپنے طوطے یار کے لئے لایا ہوں جو ہر روز میری قسمت کا کارڈ نکالتا ہے‘ کبھی تو تاجی سے میری شادی ہوگی ناں......“ دوسے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ کچھ اس انداز سے پیچھے کھینچا کہ تاری جھینپ کر رہ گیا۔

اتنے میں ایک مال گاڑی گڑگڑاتی ہوئی بڑی تیزی سے پل کے نیچے سے گزر گئی تھی جس کی تھرتھراہٹ پل پر کافی دیر تک محسوس کی جاتی رہی۔ بڑا طوطا جو ابھی تک اپنے پروں میں سر دیئے اونگھ رہا تھا‘ گاڑی کا شور سن کر پروں سے باہر آیا۔ دوسے کے ہاتھ میں لال لال امرود دیکھ کر ٹیں ٹیں کرنے لگا‘ دوسے نے بڑی آہستگی سے جھک کر ادھ کھایا امرود طوطے کے سامنے رکھ دیا‘ وہ جونہی چلنے کے لئے سیدھا ہوا اس کے جھولے سے دو امرود لڑھک کر تاری کے سامنے پھیلے ہوئے تکیے لفافوں پر آ گرے۔ دوسا پلٹا‘ وہ سمجھا شاید وہ اپنے امرود اٹھائے گا مگر وہ اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور بے شمار پھیلے ہوئے لفافوں میں سے ایک لفافہ اٹھایا اور تاری کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”میرا لفافہ کیا کہتا ہے“ دوسے کی رال اب لفافوں پر گر رہی تھی‘ تاری لفافے سے کارڈ نکال کر پڑھنے لگا‘ لکھا تھا ”تو سخی ہے اور سخی کا ہاتھ اور دل دونوں کشادہ ہوتے ہیں اس لئے سبھی لوگ ان سے فیض پاتے ہیں“ دوسا یہ سن کر ہی ہی ...... ہی ہی کرکے دانت نکالنے لگا اور بولا ”تیرے سارے لفافوں میں جھوٹ بھرا ہے۔ تو خود بھی جھوٹا ہے اور تیرا کاروبار بھی۔“ طوطا ایک امرود ختم کرکے دوسرے کو پکڑنے کے لئے لفافوں پر ادھر ادھر دوڑتے ہوئے ان کی ترتیب خراب کر رہا تھا تاری کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ پل کے دوسرے کنارے تک لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے پاگل دوسے کو دیکھتا رہا۔ جس کی باتوں سے کبھی کبھی اسے سچ کی بو آنے لگتی تھی۔ دوسے پر سے اس کی نظر ذرا سی پھسلی تو اس کی نگاہوں کو سامنے سے آتے ہوئے نو بیاہتا جوڑے نے جکڑ لیا۔ جنہیں زرق برق لباس میں دیکھ کر اسے لمحہ بھر کو اپنی شادی کا دن یاد آ گیا...... لیکن اس جوڑے کے الھڑپن اور دنیا سے بے خبر شان بے نیازی کی چال نے تاری کو اپنے خرابے میں نہ بھٹکنے دیا۔ وہ دونوں اس کے ٹھیئے کے سامنے سے گزرنے لگے ”ہائے شانی؟ دیکھو کتنا پیارا طوطا ہے“ لڑکی نے نوجوان کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا ”فال نکالوں میم صاحب؟“ تاری نے ان کی دلچسپی بھانپ کر جواب کا انتظار کئے بغیر طوطے کو اشارہ کیا‘ طوطے نے اپنے مخصوص انداز سے لفافہ نکال کر تاری کے سامنے ڈال دیا۔ تاری نے نوجوان کا اشتیاق دیکھ کر کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔ ”زندگی ایک سفر ہے جس میں لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں“ نوجوان نے کارڈ کی تحریر نصیحت کے انداز میں لڑکی کو سنائی۔ وہ مسکرائی اور پانچ کا نوٹ تاری کی طرف بڑھا کر چل پڑی۔

”اوئے لگتا ہے نویں نویں شادی ہوئی ہے دونوں کی“ نور محمد دندان ساز نے ایک ادھیڑ عمر شخص کی داڑھ کو چمٹی سے پکڑتے ہوئے رائے دی۔ تاری خاموشی سے اپنے بکھرے ہوئے لفافوں کو ترتیب دینے لگا

گیا وہ بکھرے ہوئے لفافے دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھا رہا ہو۔
"اوہ جلدی سے دو چائے لے آ" اور مرے نے تعجب سے گزرتے ہوئے چھوٹے کو [illegible]
سمجھ لگتا ہے آج صبح تجھے چائے نہیں ملی' اس لئے تیرا موڈ خراب ہے" اور مرے نے کسی [illegible]
انداز کی طرح تبصرہ کیا۔
"نہیں چاچا! ایسی تو کوئی بات نہیں بس آج ذرا طبیعت کچھ سست ہے۔" ناری نے [illegible]
جواب دیا۔ تھوڑی دیر میں چائے آ گئی وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چائے پینے لگے۔ اس دوران ناری کی
بھی اور مرے نظریں بچا کر سیدھے اور بائی کے ٹھیے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا' وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ صبح
صبح سے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد دو منچلے نوجوان بڑی بے فکری سے جن میں کتابیں
دبائے اٹکھیلیاں کرتے گنگناتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرے اور چند قدم آگے جا کر کھسر پھسر کرتے
واپس آ گئے۔ ابھی وہ دونوں ناری کے ٹھیے کے سامنے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ طوطے نے امرود کو ایک
طرف لڑھکا کے چٹائی پر پھیلے لفافوں کے اوپر ایک شان سے چکر کاٹا اور ان میں سے ایک لفافہ اچک کر ناری
کی گود میں ڈال دیا۔ ایک لڑکے نے لفافہ اٹھایا اور کارڈ پڑھنے لگا۔
"زندگی ایک کڑا امتحان ہے محنت کرو گے تو کامیابی یقینی ہوگی۔"
"اوہ یار نوی ایک تو قدم قدم پر نت نئے امتحان سکھ کا سانس نہیں لینے دیتے میں تو بالکل بور ہو
گیا ہوں یار۔" یہ سن کر اس کا ساتھی قہقہہ مار کر ہنسا "دیکھو ناں یار گھر جاؤ تو اماں ابا کی نصیحتوں کے پل
اور سکول میں یہ موٹی موٹی کتابیں منہ چڑاتی ہیں اور اوپر سے امتحانوں کا بھوت ہے کہ رات بھر سونے نہیں
دیتا...... ارے او بھائی قسمت والے! خدا را کوئی ایسا کر تا جس سے کچھ پڑھے بغیر دنیا کی ساری کتابیں یاد ہو
جائیں" اب کے وہ لڑکا ناری سے براہ راست مخاطب تھا ناری کچھ دیر بڑی بے بسی سے اس کی جانب دیکھتا
رہا پھر بولا "باؤ جی! کیوں مذاق کرتے ہو' بھلا بنا پڑھے بھی علم آیا ہے کسی کو.....؟" لڑکا یہ سن کر سنجیدہ ہو گیا۔
کچھ دیر سامنے پھیلے ہوئے گرد سے اٹے لفافوں کو غور سے دیکھتے اور دانتوں سے ناخن کاٹتے رہنے کے بعد
اس نے ناری سے ایک لفافہ اور نکالنے کی فرمائش کی۔ ناری کا اشارہ پاتے ہی طوطے نے سامنے پھیلے لفافوں
میں سے ایک لفافہ نکال کر الگ ڈال دیا' لڑکے نے لفافے سے کارڈ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔
"اپنے آپ کو بزرگوں سے بڑا اور سیانا سمجھنا چھوڑ دے ان کی خدمت کیا کر فیض پائے گا۔"
لڑکے نے بغیر بولے پینٹ کی جیب سے دو روپے نکال کر ناری کی طرف بڑھائے اور اپنے ساتھی کا
ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ناری انہیں پل کے دوسرے کنارے تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سامنے سے فریدا
حجام اپنی انگیٹھی اور صندوقچی لہراتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔
"میں نے کہا کیوں ستار باؤ تین دن سے شیو نہیں بنوایا لگتا ہے آج کل مندا جا رہا ہے۔" فریدے
نے اپنی صندوقچی کھنکھناتے ہوئے ناری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔
"لے یار فریدے! ذرا ادھر آ اور ولایتی کریم والی گرما گرم شیو بنا' ادھر تو طوطوں کی بجائے الو بول
رہے ہیں" ابھی ناری کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ سید رسول نے فریدے کو آواز دے کر اپنے ٹھیے پر بلا لیا دو
سے بولنے کا مقصد ناری کو تنگ کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اتنے میں پل کے دوسرے سرے پر بیٹھے کیسٹوں
والے شادے نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز تیز کر دی۔ گانے کے تیز سروں سے خاموش ہو کر سید رسول نے

فریدے کی ایجنسی سے سگریٹ سلگا اور سلیم کی چلتے ہوئے گانے کا لطف لینے کا تیار جلدی کر فریدے تو تو
بھائی وہاں تک چلا گیا ہے گاڑی سر پر آن پہنچی ہے۔" سید رسول نے اچانک دس بجے والی ٹرین کی وسل
سن کر کہا۔ فریدے غلام نے جلدی جلدی ہاتھ چلا لا ناشتہ بھر لیے تولئے سے جھاڑ صاف کر کے ریزگاری
جیب میں ڈالی اور سامان سمیٹ کر آگے چل پڑا۔

دس بجے کی ٹرین برق رفتاری سے وسل بجاتی پل کے نیچے سے بل کھاتی ہوئی گزر گئی۔ تاری نے
گردن موڑ کر ریلوے اسٹیشن کی جانب دیکھا جہاں پرسکون پلیٹ فارم پر ایک ہلچل سی مچ گئی تھی ساتھ ہی
اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد پل پر آنے جانے والوں کا رش بڑھنے لگا۔
گاہکوں اور خوانچہ فروشوں کے لین دین کی تکرار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ رنگین شیشوں کی
عینکیں بیچنے والے پٹھان لڑکے کے پاس حسب معمول رش بڑھتا جا رہا تھا اس کا ننھا سا بھائی اپنے بوسیدہ دامن
سے عینکوں کے بکس پر لگے شیشے کو بار بار صاف کئے جا رہا تھا۔ کیسٹوں والا گاہکوں کی فرمائش پر تیزی سے
کیسٹ بدل رہا تھا پان سگریٹ والا بھی فارغ نظر نہ آتا تھا۔ چاہے اسٹیشن پر گاڑی آئے یا نہ آئے۔

تاری کو بھی کچھ دیر بعد آگے پیچھے کئی گاہک ملے جن میں نوجوانوں کی تعداد قدرے زیادہ تھی۔ اکثر
نوجوان اسے لفافوں میں لکھے ہوئے کارڈوں کے علاوہ اپنے امتحان' شادی' عشق و محبت میں کامیابی و ناکامی کے
بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھتے جنہیں تاری عامل بابا کے پاس جانے کا مشورہ دیتا۔ بابا کے بارے
میں مشہور تھا کہ وہ علم نجوم کے علاوہ کالا علم بھی جانتا ہے اس کے پاس کوئی حاجت مند نہ بھی ہوتا وہ پھر بھی
ہر وقت خاموشی سے ناک پر نظر کے موٹے سبز شیشوں والی عینک رکھے اپنے حساب کتاب میں مشغول نظر
آتا۔

دوپہر تک تاری نے اتنے پیسے کما لئے تھے کہ اب اس کی پژمردگی دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔
اپنے لئے دال چاول کا آرڈر دینے کے ساتھ ساتھ وہ طوطوں کے لئے کشمش بھی لے آیا تھا۔ پل کا رش
ویسے کا ویسا ہی رہا۔ اکا دکا گاہک آتے رہے۔ اسٹیشن اور بازار میں کام کرنے والے مزدور جو پل بھر کو
ستانے اور دھوپ سینکنے پل پر آجاتے تھے اب ان میں سے اکثر جنگلے کا سہارا لئے گرد و نواح کا نظارہ کر رہے
تھے۔ لوگ پل کے جنگلے پر تاروں سے بندھے بورڈوں کو پڑھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بہت سے فارغ لوگ
اس کے طوطے کے بار بار کارڈ اچکنے کا تماشا دیکھتے رہتے۔ اتنے میں پاگل دوسا ایک کتے کو روٹی کا ٹکڑا
دکھاتے ہوئے بڑی تیزی سے دوسری جانب گزر گیا۔ اسے دیکھ کر تاری کو اچانک خیال آیا کہ وہ صبح پریشانی
اور مایوسی کے عالم میں روز کی طرح اپنا اور طوطے کی قسمت کا کارڈ نکالنا ہی بھول گیا۔ اس نے جلدی سے
طوطے کو اشارہ کیا جو دوسرے طوطوں کے ساتھ پنجرے کی چھت پر کھیل رہا تھا۔ پہلا کارڈ اس نے طوطے
کے نام کا نکلوایا جس پر لکھا تھا۔ "تو لوگوں میں خوشی بانٹتا ہے اوروں کے لئے جیتا ہے تیری عمر لمبی
ہوگی۔" کارڈ پڑھ کر تاری کا جی خوش ہو گیا۔ اسے اپنے کارڈوں پر لکھی تمام تحریریں زبانی یاد تھیں۔ اسے
یہ بھی احساس تھا کہ یہ کارڈ بہت کم نکلتا ہے۔ اس نے جلدی جلدی وہ کارڈ دوسرے کارڈوں میں ملایا۔ پھر
اس نے طوطے سے اپنے نام کا کارڈ نکلوایا۔ تاری نے لفافہ کھول کر پڑھا۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا وہی کارڈ
تھا جو تھوڑی دیر پہلے طوطے نے اپنے لئے نکالا تھا۔ اب تاری ذرا حیران ہوا اسے زندگی کے تھکے ہارے' غم
زدہ اور مفلوک الحال انسانوں میں قسمت کی خوش فہمیاں بانٹتے ہوئے سات سال ہو چلے تھے۔ اس طوطے کی

پوری کرکے اسے بھی جانے گا اور ہاں یاد آیا چھراں کے ابا کا گڑ والا تمباکو بھی تو ختم ہو گیا ہوگا۔ اس وقت اتفاق سے جیسے پر قسمت کا حال جاننے والا کوئی نہ تھا۔ دونوں طوطے آزاد فضا سے اکتا کر اپنے مانوس پنجرے میں چلے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ فضا کی خنکی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا بیدا طوطا اوہ کھائے امرود کو ادھر ادھر لڑھکا کے کھیل رہا تھا۔ اس نے اپنے کشمیری طوطے کی جانب دیکھا اور جیب ٹٹولتے ہوئے وہ اپنے دائیں طرف بیٹھے سرما اور دنداسہ بیچنے والے کی طرف چلا گیا۔

"کیا بات ہے تاری صبح تو تیرا موڈ بہت خراب تھا اور اب تو بڑی خریداریوں پہ لگا ہوا ہے' لگتا ہے آج جو رو کو دنداسہ دیکر مناتا ہے۔" مانی نے گویا اس کے دل کا چور پکڑ لیا' تاری یہ سن کر مسکرا دیا۔

ہاں بھئی! خریداریاں کیوں نہ کرے آج اس نے دیر سے آکر دیہاڑی جو تگڑی بنا لی ہے۔" سید رسول نے لقمہ دیا۔

اچانک شور بلند ہوا "ابے تاری وہ دیکھ..... مار دیا کالی بلی نے تیرے طوطے کو..... بھاگو..... بھاگو پکڑو..... پکڑو..... وہ رہی..... پکڑو" مانی پوری قوت سے چلائے جارہا تھا ایک ساتھ کئی لوگ بلی کی طرف لپکے۔ تاری سب کچھ چھوڑ کر دیوانہ وار بلی کے پیچھے لپکا' بلی اس کا طوطا منہ میں دبائے چھلانگیں لگاتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ سیڑھیوں پر بیر پہارے کیلے کھاتے ہوئے دوسے نے بھی صورت حال کو بھانپ کر بلی کے آگے اپنی ٹانگوں کی رکاوٹ بنائی لیکن اس کا ایسا کرنا بے سود گیا۔ تاری ماہر شکاری کی طرح تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ پھر نہ جانے "آنا" فانا" کیا ہوا تاری کا پاؤں پھسلا اور وہ بازار کو جاتی ہوئی سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے جاگرا۔ چار بجے والی گاڑی ایک دہشت ناک آواز کے ساتھ پل کے نیچے سے گزر گئی۔ تاری کی چیخ ریل گاڑی کے بے ہنگم شور کے ساتھ ہی سرد ہو گئی۔

سیڑھیوں کے نیچے بازار کی سمت جم غفیر کے درمیان تاری ایک میلی سی چادر کے نیچے زندگی کی تمام فکروں سے آزاد ہو کر پر سکون پڑا تھا۔ پل کے اوپر تاری کے ٹھیے کے پاس کچھ پولیس والے جائے حادثہ کا معائنہ کرنے کے بعد روتے ہوئے سیدے اور مانی کا بیان لکھ رہے تھے۔ سیڑھیوں والا پل جو کچھ دیر پہلے زندگی کی بھرپور علامت تھا اب اس پر ہونے والا کاروبار معدوم ہو چکا تھا۔

خوانچہ فروش' تھڑے والے اور مزدور تاری کی نعش کے قریب غمزدہ اور خاموش کھڑے تھے۔ دوسا تاری کے ٹھیئے پر بے ترتیبی سے پھیلی قسمت کی خوش فہمیوں سے لتھڑے میلے کچیلے لفافوں سے تمام کارڈ نکال کر ادھر ادھر بکھیرتے ہوئے بار بار کہے جارہا تھا۔ یہ سب کچھ جھوٹ ہے..... دھوکہ ہے..... فریب ہے..... پنجرے کے ایک کونے میں دونوں طوطے ابھی تک سہمے ہوئے تھے۔ دوسے کے پھٹے جھولے سے جھانکتے ہوئے کیلے کے چھلکے بے گناہ تاری کی موت کی چغلی کھا رہے تھے۔ بازار میں تاری کی نعش کے ارد گرد کھڑے ہجوم کے عقب میں کالی بلی ایک ریڑھے کے نیچے بیٹھی بڑے مزے سے مونچھیں چاٹ رہی تھی۔
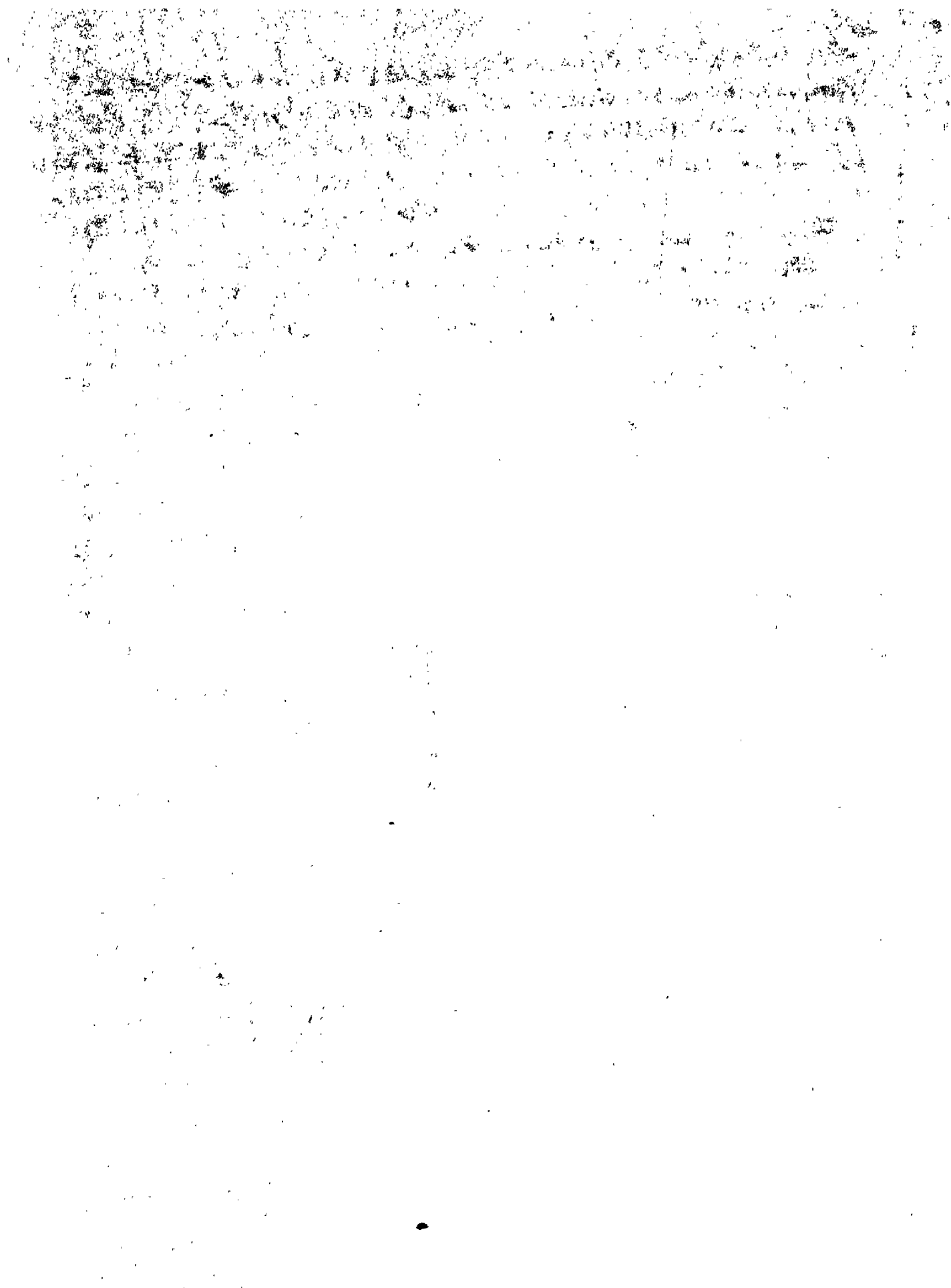
شام کا پہلا ستارہ

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کی ہلکی ہلکی چمک تیز ہونے لگے گی تو شہر کی کھلی سڑکوں پر لوگوں کی قطار بھی لمبی ہو جائے گی۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے پیچھے یوں چلے گا جیسے اس کا اس کے ساتھ بڑا پرانا رشتہ ہے جسے نہ تو چڑھتا سورج توڑ سکا ہے اور نہ ہی شام کا پہلا ستارہ۔ لیکن کچھ دور جاکر ان کے راستے آپ ہی آپ الگ ہو جائیں گے۔ ہلکی روشنی اور ہلکے اندھیرے میں چلنے والے لوگ آپ ہی ایک دوسرے سے الگ ہونے لگیں گے۔ سڑکوں پر لگی روشنیاں دھندلی فضا میں یوں لگیں گی جیسے یہ آنکھیں جھپکتے ہوئے راستہ بھولے مسافروں کو اپنی طرف بلا رہی ہوں۔ لیکن یونہی آنکھیں جھپکتے ان کی دنیا بھی اندھیر ہو جائے گی اور کوئی بھی ان کے پاس نہیں آئے گا۔ کوئی بھی ان سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تمہیں زندگی کا کون سا غم ہے جس نے تمہارے سینے میں یہ آگ لگا دی ہے۔۔۔ لیکن یہاں کوئی نہیں آئے گا! کوئی نہیں پوچھے گا!!

اس شہر کی ساری راہیں کرائے کے اس گھر کی طرح اچانک خالی ہو جائیں گی جن میں رہنے والے کی تبدیلی اچانک کسی دوسرے شہر ہو گئی ہو۔ سرکاری کاموں میں آدمی دخل نہیں دے سکتا اور آج کل تو چڑھتے سورج کو دیکھ کر بھی یوں لگتا ہے جیسے یہ بھی کوئی سرکاری ملازم ہے جو اپنے گھر کا آنگن چھوڑ کر ڈیوٹی دینے کے لئے نیلے آسمان پر آگیا ہے۔ سارا دن اپنی آنکھیں کھولے کسی بت کی طرح آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے گا۔ اور جب شام کا پہلا ستارہ آہستہ سے دن کے دروازے پر دستک دے گا تو یہ اپنے آپ ہی کسی سے کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کرکے اپنے گھر چلا آئے گا۔ نہ ہی کسی سے کچھ کہے گا اور نہ کوئی اس سے کچھ پوچھے گا۔!

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے۔

سارا دن سر جھکائے دفتروں میں کام کرنے والے لوگ تھکے ہوئے قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے لگے ہیں۔ ابھی شہر کی سڑکوں پر دن کی ہلکی روشنی آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ یونہی چلتے چلتے جب اس کا سانس بھی اکھڑنے لگے گا تو اس وقت کسی مشین کی طرح اچانک شہر کی ساری بستیاں روشن ہو جائیں گی۔ یہ سب سرکاری کام ہیں اور سرکاری کاموں میں آدمی کوئی دخل نہیں دے سکتا اور جب سڑکوں کی روشنی جھلملانے لگے تو اس وقت شہر کی کوٹھیوں میں روشنی وہ نوکرانی کرے گی جسے گھر کا مالک تنخواہ دیتا ہوگا۔ وہ نوکرانی جس کی ایک جوان بیٹی بھی ہوگی۔ وہ بیٹی جس کا باپ اسے پیدا ہونے سے پہلے ہی چھوڑ گیا ہوگا۔ وہ باپ، جو اسی مالک مکان کا بیٹا ہوگا۔۔۔ لیکن آج کا زمانہ پہلے زمانے سے بہت مختلف ہے۔ آج کا باپ اپنے بیٹے کی کوئی بات نہیں جانتا۔ وہ تو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کا وہ دن

بھی بھول جاتا ہے جب اس نے پہلی بار اس کے گھر آنکھیں کھولی تھیں۔ لیکن اس نوکرانی کی بیٹی کا وہ
وقت تو عمر بھر کے لئے ٹھہر جاتا ہے جب کسی مالک مکان کا بیٹا پہلی بار اس کے گورے بازو کو پکڑ کر آہستہ
سے اس کے کان میں یہ کہتا ہے۔

"نوری! تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو۔"

اور پھر نوری جھڑی سے ایک بازو چھڑا کر ساری ساری رات اپنے بازو کے اس حصے کو سہلاتی رہتی
ہے جو دن کی روشنی میں پکی دیواروں کی اوٹ میں کسی دوسرے کے ہاتھ میں آیا تھا۔ اسے وہ وقت بھی یاد
رہتا ہے جب وہ شہر سے باہر کسی تاریک جھونپڑی میں اس بچے کو جنم دیتی ہے جسے وہ ساری زندگی اس کا
باپ نہیں دکھا سکتی۔ شہر کی کوٹھیوں میں ایسی کوئی نوکرانی روشنی کرتی ہے تو اس کا اپنا دل گہرے اندھیروں میں
ڈوبنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہی پیروں پر کھڑی اپنے ہی دل کے اندھے کنوئیں میں اتر جاتی ہے اور کوئی بھی اس
کا بازو نہیں تھامتا۔ کوئی اس کے پاس آکر یہ نہیں پوچھتا کہ تمہیں زندگی نے کونسا غم دیا ہے۔ کس نے
تمہارے سینے میں آگ لگا کر تمہاری آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے۔ تمہیں یہ دنیا اندھیر کیوں لگتی ہے تمہیں
چڑھتے سورج کو دیکھ کر یوں کیوں لگتا ہے جیسے کسی نے اس کے چہرے پر کالک مل دی ہے۔۔۔۔ لیکن اس کے
پاس کوئی نہیں آئے گا! کوئی نہیں پوچھے گا!!

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کی ہلکی ہلکی چمک تیز ہونے لگے گی تو اس وقت شہر کی سڑکوں پر لگی ساری
بتیاں روشن ہو جائیں گی۔ سڑکوں پر روشنی سرکار کرے گی اور کوٹھیوں میں روشنی وہ نوکرانی کرے گی جس کا
مالک اسے تنخواہ دیتا ہوگا۔ اس گھر کی دیواریں بھی چمکنے لگیں گی اور کمرے میں پڑی میز بھی پل بھر کے لئے
اس روشنی کے سائے میں آجائے گی۔ اور پھر کوئی لڑکا آہستہ آہستہ آئے گا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے سامنے
کوئی کتاب رکھ لے گا اور اس کتاب کا وہ ورق نکال کر پڑھنے لگے گا جس میں اس لڑکی کی تصویر ہوگی جو
اپنے آپ سے چوری اس سے پیار کررہی ہوگی۔ وہ لڑکا اس تصویر سے باتیں کرے گا۔

"تمہارے بال تو نئے ماڈل کی کار سے بھی زیادہ لمبے ہیں۔"

"تم ہنستی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے اپنی نئی کوٹھی کا دروازہ کھول دیا ہے۔"

"تمہارا قد اس ایکٹریس کی طرح ہے جس نے اپنی ٹانگوں کا دس لاکھ ڈالر کا بیمہ کروایا ہے۔"

ساری رات وہ لڑکا اسی طرح اپنے پیار کی کار میں بیٹھ کر سیر کرے گا۔ اپنے پیار کی نئی کوٹھی کا
دروازہ آپ ہی کھولے گا اور آپ ہی بند کرے گا۔ اپنی محبت کی ٹانگوں کا آپ ہی بیمہ کروائے گا اور آپ
ہی انہیں توڑ کر ان کا بیمہ وصول کرے گا۔۔۔ اور یہ کہ جب دن چڑھے گا اور اس کے ماں باپ کو یہ پتہ
چلے گا کہ ان کا بیٹا اس سال پھر بی اے کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ آج کل کی
پڑھائی بہت مشکل ہو گئی ہے۔

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کی ہلکی ہلکی چمک تیز ہونے لگے گی تو اس وقت اس شہر کی کچی دیواروں میں
بھی دیئے جلنے لگے۔ کوئی بوڑھی سی عورت سر جھکائے اس مٹی کے دیئے کے پاس آئے گی۔ اپنے ہی گھر کی
دیواریں ٹٹولتی دیا تلاش کرے گی اور پھر جب پیار سے اس دیئے کو جلائے گی تو اس کی ہلکی روشنی میں اپنے

دونوں ہاتھ اٹھا کر جاناں کے خوابیدہ نیلے روشنی کی دعا کرے گی اور جب وہ اپنے ہاتھ اپنے منہ پر پھیرنے لگے گی تو اس کا جوان بیٹا بھی اس کے پاس آ جائے گا جوان بیٹی بھی اپنے بھائی کے پاس آ کر بیٹھ جائے گی اور پھر جب وہ بوڑھی ماں اپنی آنکھوں میں آرزوؤں کے دیئے جلائے ان کی طرف دیکھے گی تو اس کے کانوں میں ڈھولک کی آواز آنے لگے گی۔ گھر کے صحن میں کوئی لڑکی ڈھولک لے کر بیٹھ جائے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے گھر میں خوشیوں کا میلہ لگ جائے گا۔ اس لڑکی کے اردگرد اور لڑکیاں بھی آ کر بیٹھ جائیں گی اور پھر ڈھولک کی تال پر زندگی کا روگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو بن کر رقص کرنے لگے گا۔ جوان لڑکیاں اپنی لاج کے دروازے آدھے بند کئے آدھے کھولے ایک دوسری کی طرف دیکھیں گی۔ اور پھر کوئی جوان سایہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ اس دروازے کی طرف بڑھے گا اور چپ چاپ سانس روکے ان کے دلوں کے تہہ خانوں میں اترتا جائے گا۔ اس وقت ڈھولک کی تھاپ اچانک تیز ہو جائے گی اور وقت کی زبان پر ایک ہی بات، ایک ہی سوال گیت بن کر چلا آئے گا۔

کتناں لمیاں نی مائے
دھیاں کیوں جمیاں نی مائے!

یہ سوال سن کر، یہ بات سن کر دنیا جہان کی ساری مائیں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گی لیکن ان کے گھر بیٹیاں پھر بھی پیدا ہوں گی۔ شاید یہ بھی کوئی سرکاری کام ہے اور سرکاری کام میں آدمی دخل نہیں دے سکتا۔

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کی ہلکی ہلکی چمک تیز ہونے لگے گی اس وقت سارے شہر میں بھی روشنی ہو جائے گی۔ کہیں کم، کہیں زیادہ۔ لیکن روشنی ضرور ہو گی۔ اسی شہر کی سڑک پر اکیلے چلتے ہوئے ایک آدمی نے سوچا۔

"میں کس گھر کا دیا جلاؤں گا!"

یہ آدمی روز اس وقت یہی سوچتا تھا۔ وہ اپنی شکل و صورت سے تو مختلف لگتا تھا لیکن اس کی یہ سوچ دوسرے آدمیوں سے مختلف نہیں تھی۔

اس شہر میں ننگے پاؤں چلتے نہ جانے اسے کتنا وقت بیت گیا تھا لیکن ابھی تک اسے اس گھر کا وہ دروازہ نہیں ملا تھا جسے کھول کر وہ آہستہ سے اندر داخل ہو گا۔ اس گھر کی کچی دیوار سے لگے مٹی کے دیئے کو روشن کرے گا۔ اور پھر اس کی روشنی میں بیٹھ جائے گا۔ دروازہ بند نہیں کرے گا بلکہ ساری رات اس کھلے دروازے کی طرف دیکھتے کسی دوسرے کا انتظار کرے گا۔

یہ آدمی اس شہر کی سڑکوں پر بھی چلتا تھا اور گلیوں سے بھی گزرتا تھا۔ اس کے سر کے بال اس زمین کی طرح خشک تھے جس پر برسوں سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ گرا ہو، اس کے جسم پر جو کپڑے تھے وہ پورا بدن ڈھانپنے کے لیے ناکافی تھے۔ راستوں پر چلتے وہ خود ہی ہنس دیتا تھا اور خود ہی رونے لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگ اپنا راستہ یوں بدل لیتے تھے جیسے جلتی آگ کو دیکھ کر سیانے اپنا آپ بچا لیتے ہیں۔ لیکن شہر کے چھوٹے چھوٹے بچے کتنی دور تک بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے تھے۔ اگر سچ پوچھیں تو آج کل کے زمانے میں وہی بات اچھی ہوتی ہے جو بغیر سوچے سمجھے کی جائے۔

اس آدمی کے لیے اس شہر میں کوئی گھر نہیں تھا۔ کوئی روشنی نہیں تھی! یہ اکیلا تھا اور اکیلا ہی رہتا

تھا۔ یونہی چڑھتے دن کا سورج بھی طلوع ہوتا تھا اور یونہی ڈھلتے ہوئے اس کی زندگی کے آسمان پر شام کا پہلا
ستارہ بھی روشن ہوتا تھا۔ ستارہ دن ڈھلے تک نہیں ہوتا تھا لیکن شام کا پہلا ستارہ اسے [illegible]
اس کا خیال تھا کہ اس بھری دنیا میں شام کا یہ پہلا ستارہ ہی اس کا دشمن ہے۔

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے۔

آج پھر اس ستارے کو دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی لَو [illegible]
ہونے لگے گی اور اس شہر کے سارے گھروں میں بھی کہیں زیادہ کہیں کم روشنی ہو گی اس وقت تو اس کی دنیا
ہی اندھیر ہو جائے گی۔ چاندنی نوک دار کانٹوں کی طرح اس کے بدن میں چبھنے لگے گی اور جب یہ اس چاندنی
سے اپنا آپ بچاتے بھاگے گا تو اس کے پاؤں کے چھالے بھی دکھنے لگیں گے۔ اس کے چاروں طرف روشنی
کے زہریلے ناگ ہوں گے اور سامنے گھروں کے بند دروازے نظر آئیں گے۔ اس کا دکھ دیکھ کر پہاڑوں کے
پتھر ضرور روئیں گے لیکن اس پر کسی گھر کا کوئی دروازہ نہیں کھلے گا۔ یہ بھاگتا رہے گا اور چاند چمکتا رہے گا۔
یہ بچنا چاہے گا لیکن بچ نہیں سکے گا۔ گرے گا' زخم کھائے گا۔ زخم کھائے گا اور زخموں پر مرہم رکھنے والا
کوئی نہیں ہو گا۔ دل کے درد کے ساتھ ساتھ جسم کا درد بھی بڑھ جائے گا۔ وقت بھاگے گا' درد بڑھے گا۔
کیا ہو گا! پھر کیا ہو گا!!

اس کی سوچ کا یہ زہر تو شام کے پہلے ستارے کے ساتھ ہی اس کے بدن میں اترنے لگا تھا۔

پھر شام آ گئی ہے۔ پھر اس کے دل میں اندھیرا ہو گا۔ اس کے دل کے اس گھر میں کوئی دیا نہیں
جلے گا۔ اس گھر کا دروازہ یونہی کھلا رہے گا اور یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس گھر کے کسی کمرے میں کوئی سیج
نہیں ہو گی۔ کوئی کتاب نہیں کھلے گی۔ کوئی تصویر نہیں لٹکے گی۔ اس کے لیے اس شہر کی کسی بھی بوڑھی
عورت کے ہاتھ دعا کے لیے اوپر نہیں اٹھیں گے۔ اس کے دل کے گھر کے صحن میں کوئی لڑکی ڈھولک لے کر
نہیں بیٹھے گی۔ کوئی سایہ اس کے دروازے کی طرح نہیں بڑھے گا۔ بلکہ اس کے دل کی قبر میں ایک بار پھر
اپنا کفن بدل کر وقت کی لاش ہی اترے گی اور پھر وقت کی اس لاش پر وہ وقت کی مٹی ہی ڈالے گا اور پھر
آپ اس قبر کے سرہانے کسی کتبے کی طرف لگ کے کھڑا ہو جائے گا۔ پھر کیا ہو گا! پھر کیا ہو گا!!

آسمان پر شام کا پہلا ستارہ روشن ہو گیا ہے پھر اس کی سوچ کا یہ زہر آہستہ آہستہ اس کے سارے
جسم میں اترنے لگا ہے۔

آج وہ پھر مر جائے گا!

آج وہ پھر مر جائے گا!!

لیکن نہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی سے اتنا ہی پیار ہے جتنا آدمی کو اپنی موت
سے ہونا چاہیے۔

میں زندہ رہوں گا۔

میں زندہ رہوں گا۔

یہی کچھ سوچتے اس نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی دوسرے شہر میں کوئی اور آسمان ہو
گا جس پر شام کا پہلا ستارہ کبھی روشن نہیں ہو گا۔

اگلے دن اس شہر سے ایک پاگل اور کم ہو گیا تھا۔

(پنجابی سے ترجمہ مصنف)

حنیف باوا

گھر پیارا گھر

سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں اندر کمرے میں چارپائی پر پڑا لحاف اوڑھے منٹو کے سیاہ حاشیے پڑھ رہا تھا۔ اچانک کنڈی کھڑکی۔ "کون؟" میں نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر پوچھا۔ ایک بار پھر کنڈی کھڑکی۔ میں اٹھا۔ چارپائی کے پاس پڑے جوتے پہنے۔ دروازہ کھول کر دیکھا۔ باہر ایک سوٹڈ بوٹڈ بندہ کھڑا تھا۔

"یہیں کہیں مشہور افسانہ نگار یوسف لطیف رہتے ہیں۔ ان کا مکان کون سا ہے؟" میں نے ایک مرتبہ سر سے پاؤں تک اسے دیکھا پھر کہا۔

"حکم کریں۔ میں ہی یوسف لطیف ہوں۔ میرا یہی مکان ہے۔ فرمایئے؟"

"یوسف لطیف صاحب اخبارات میں آپ کی آج تصویر چھپی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ یعنی میرا مطلب ہے....."

"ہاں۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "تصویر میں میرا نقلی روپ ہوتا ہے اصلی روپ میرا یہ ہے۔ جیسا میں آپ کو اب نظر آرہا ہوں۔"

میری بات سن کر پہلے اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر ایک بھرپور نظر میرے مکان کے بیرونی حصے پر ڈالی۔ جس کی دیواروں پر سے اکھڑی ہوئی لپائی دنیا کا نقشہ پیش کررہی تھی۔

"لطیف صاحب۔ میں اخباری نمائندہ ہوں۔ میں دفتر کی طرف سے آپ کا انٹرویو لینے آیا ہوں۔" وہ ایسے بولا جیسے اس کی آواز ٹھنڈے یخ پانی میں بھیگی ہوئی ہو۔

"آؤ۔ اندر آجاؤ" میں نے کہا۔

وہ بوجھل قدموں سے اندر آیا۔ میں نے اسے گھر کی واحد کرسی پر بیٹھنے کے لئے اس ہاتھ سے اشارہ کیا جس میں ابھی تک منٹو کے سیاہ حاشیے تھامے ہوئے تھا۔

اشارہ کرنے کے بعد میں پھر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سردی سے بچنے کے لئے میں نے پھر لحاف اوڑھ لیا۔ وہ کرسی کے پاس ڈرتا ہوا گیا جیسے وہ کرسی نہ ہوئی کچی اینٹوں کا بنا ہوا چبوترا ہو۔

جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے تکیئے کے نیچے سے مارون کی ڈبیہ نکالی اور اسے سگریٹ پیش کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے۔ "نہیں شکریہ" کہہ کر سگریٹ لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا۔ میرے پاس اپنا برانڈ ہے۔ اس کے پاس گولڈ لیف کے سگریٹ تھے۔ اس نے ایک سگریٹ نکالا اور منہ میں اڑس لیا۔ میں نے جلدی سے تیلی جلائی۔ پہلے اس کی سگریٹ کو سلگایا پھر اپنی۔ ہم دونوں سگریٹ بھی پیتے جاتے تھے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔

"لطیف صاحب آپ کے پاس یہی ایک کمرہ ہے؟"

میرے جواب سے پہلے اس نے ارد گرد نظر دوڑائی شاید وہ کوئی دوسرا کمرہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سے خوبصورت

"جی ہاں۔ ایک ہی کمرہ ہے۔ اسے چاہے باورچی خانہ کہہ لیں۔ یہ سٹور ہے لیکن چاہے ڈرائنگ روم ہے۔"

"آپ ایسے خستہ حال کمرے میں بیٹھ کر اتنی اچھی کہانیاں کیسے لکھ لیتے ہیں۔"

وہ اپنی جیب سے پین اور کاغذ نکال کر کہنے لگا۔ اس کا یہ سوال سن کر میں چند لمحوں کے لئے سوچوں میں ڈوب گیا۔ لیکن جلد ہی سوچوں کی اس گہری غار سے نکل کر کہا۔

"جناب میں جب بھی کہانی لکھنے کے لئے بیٹھتا ہوں تو کمرے کا چھوٹا انداز میری سوچوں میں کھلبلی پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے میٹھے کڑوے اور کڑواہٹ سے بھرے ہوئے واقعات ابھرتے ہیں۔ اور میں انہیں کہانی کی لڑی میں پرو کر کہانیوں کا روپ دے دیتا ہوں۔ یہ کہانیاں خوبصورت ہوتی ہیں یا بد صورت یہ مجھے نہیں جانتا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ شاید ان کہانیوں کو پڑھ کر قلعی کئے ہوئے چہروں پر میل ضرور آجاتی ہوگی۔"

میرا یہ جواب سن کر اخبار نویس نے اپنا کھولا ہوا پین پتا نہیں کیوں بند کر لیا۔ میں پوچھنے ہی والا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا مجھے کیا۔ میں کیوں پوچھوں۔

"لطیف صاحب آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟" اس نے پین کو کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میری بیوی تو صحن میں چھپر کے نیچے بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے اور بچے پڑوسیوں کے گھر سکول کا کام کرنے گئے ہوئے ہیں۔ آپ نے میری بیوی سے کوئی سوال پوچھنا ہے کیا؟ اور پھر ہمارے جیسے لوگوں کی بیویاں بیویاں نہیں کچھ اور ہوتی ہیں۔۔۔ کیا خیال ہے بلاؤں اسے۔"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا۔ آٹا گوندھنے دیجئے انہیں۔"

"معاف کرنا۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ یعنی ابھی تک آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"میرا نام نگار صدیقی ہے" اس نے اپنا نام کچھ اس انداز سے بتایا جیسے وہ بتانا نہ چاہتا ہو اور بغیر بتائے کوئی چارا بھی نہ ہو۔

"اچھا۔ آپ ہیں نگار صدیقی جو اکثر بڑے بڑے لوگوں کے انٹرویو لیتے رہتے ہیں۔ اور وہ انٹرویو بڑی شان سے اخباروں میں چھپتے ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" مجھ سے مل کر اسے خوشی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ نہ تو اس کے چہرے کے تاثرات سے لگایا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کی گہری چمکتی آنکھوں سے۔ اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے مجھ پر اور سوال داغ دیا۔

"لطیف جی۔ آپ کی شادی آپ کی پسند کی ہے یا والدین کے کہنے پر ہوئی۔"

"نگار صاحب خستہ حال مکانوں میں رہنے والوں کی شادی اپنی پسند کی کیسے ہو سکتی ہے۔"

"آپ کے اور آپ کی بیوی کے درمیان کبھی جھگڑا ہوا ہے؟"

"ہم زندگی کی گاڑی کے دو خاموش مسافر ہیں۔ ہمارا جھگڑا کس بات پر۔"

"پھر تو آپ دونوں میاں بیوی بڑے پیار سے رہتے ہوں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ فنکار ہیں۔ ظاہر ہے فنکار تو ہوتا ہی پیار کا پتلا ہے۔ آپ کی بیوی تو آپ پر جان قربان کرتی ہوگی۔"

"میری بیوی کو مجھ پر جان قربان کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ یہ درست ہے کہ فنکار پیار کا پیاسا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کبھی اس پیار کے پھول نچھاور کرنے کا وقت نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں جاگ رہا ہوتا ہوں تو وہ محو خواب ہوتی ہے اور جب اس کا جاگنے کا وقت ہوتا ہے میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہوتا ہوں۔ جب گھر کے کام کاج کے بعد میری بیوی پیار کے دو میٹھے بولوں کی خواہش مند ہوتی ہے تو میں کہانیاں بیچنے کے لئے نکل پڑتا ہوں۔"

"لطیف صاحب معاف کرنا۔ سنا ہے فن بیچنا اولاد بیچنے کے مترادف ہوتا ہے۔"

"یہ بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہے' فنکار کی ہر تخلیق اس کی اولاد ہوتی ہے لیکن فنکار اپنی اس اولاد کا کیا کرے جو ننگی بھوکی نہیں رہ سکتی۔ ظاہر ہے صدیقی ایک اولاد کو زندہ رکھنے کے لئے دوسری اولاد کو بیچنا ہی پڑتا ہے۔"

جب اولاد کے بارے میں بات ہونے لگی تو میرے دونوں بچے پڑوسیوں کے گھر سے سکول کا کام کرکے آگئے۔ ان کے گلوں میں لٹکتے میلے کچیلے بستوں اور سیاہی سے بھرے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر صدیقی نے اپنی کوٹ کی جیب سے رومال نکالا اور اپنے چہرے پر پھیرنے لگا۔ شاید اسے میری میلی کچیلی اولاد کو دیکھ کر اپنے چہرے کی صفائی کا خیال آگیا تھا۔

انہوں نے اپنے بستوں کو چارپائی کے نیچے پھینکا اور میرے پاس چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے بڑے نے میرے کان کے پاس آکر آہستہ سے پوچھا۔

"ابا یہ کون ہیں؟"

"بیٹے۔ یہ اخبار نویس ہیں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا

"اخبار نویس کیا ہوتا ہے ابا جی؟"

"اخبار میں انٹرویو چھاپنے والا۔"

جب میرے بیٹے کے کچھ بھی پلے نہ پڑا تو وہ خاموش ہوکر بیٹھ رہا۔

"لطیف صاحب ان بچوں کے نام کیا ہیں؟"

"یہ میری کہانیاں ہیں۔ بغیر عنوان کے کہانیاں۔ آپ ان کہانیوں کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔"

"کیوں بھئی اپنے ابو کی بغیر عنوان کی کہانیو۔ یہ بتاؤ تمہیں ابو زیادہ پیارے ہیں یا امی۔" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"صدیقی صاحب یہ کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ یہ گونگے اور بہرے ہیں وہ اس لئے کہ یہ جواب دینا جانتے ہی نہیں جواب تو وہ دیں جو خوبصورت سے خوبصورت کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ جن کے پاس ریشمی لباس ہیں۔ جنہیں ان کے ابو بازار سے میٹھی میٹھی ٹافیاں لاکر دیتے ہیں جن کی مائیں انہیں گود میں اٹھا کر پیار کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نہ ہم میاں بیوی اور نہ ہی یہ بچے اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔"

"آپ انہیں بھی اپنے جیسا کہانی کار بنائیں گے؟"

"ہو سکتا ہے کہ یہ بھی میرے جیسے کہانی کار بن جائیں اگر ان کے ہاتھ ہمیشہ سیاہی سے بھرے رہے تو۔"

"یہ بتائیں۔ کسی مسئلے پر آپ دونوں میاں بیوی کے مابین اختلاف ہوا ہے کبھی؟"

"آپ یہ پوچھیں کبھی اتفاق بھی ہوا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ ہم دونوں کے مسائل بھی ایک سے نہیں رہے۔ اس کی مثال وہ یوں ہے کہ میری بیوی دریا کے اس کنارے پر بیٹھی ہے اور میں اس کنارے پر۔"
"آپ کی بیوی کی تعلیم کیا ہے؟"
"پہلے کبھی ہو گی۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں۔ اب تو وہ ہر کام کاج میں ماہر ہو گئی ہے۔ مثلاً بچے کی گلی میں جھاڑو دینے میں، کمرے کی کچی دیواروں کو لیپنے میں، جھوٹے بھانڈے مانجھنے اور میلے چکٹ کپڑے دھونے میں۔"

"جب آپ دونوں کے مسائل میں بعد المشرقین ہے تو آپ کی بیوی آپ کے تخلیقی کاموں میں حائل تو نہیں ہوتی؟"

"حائل کیا ہوگی وہ۔ آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم زندگی کی گاڑی کے دو خاموش مسافر ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے ہم دونوں دریا کے مختلف کناروں کے باسی ہیں۔"
"اب تک آپ کی کہانیوں کے کتنے مجموعے بازار میں آ چکے ہیں؟"
"صدیقی صاحب ابھی تک تو میں خود ایک کتاب ہوں۔ بوسیدہ سی دیمک خوردہ جسے پڑھنا تو ایک طرف رہا کبھی کسی نے چھوا تک نہیں۔"
"لطیف صاحب آپ کا پڑھنے لکھنے کے علاوہ اور کیا شغل ہے؟"
"شغل تو صدیقی صاحب ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے چہرے قلعی کئے ہوئے ہوں۔ میں تو صرف کہانیاں لکھتا ہوں۔ یہ کہانیاں اچھی ہوتی ہیں یا بری مجھے نہیں معلوم میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اگر یہ کہانیاں پڑھ کر قلعی شدہ چہروں پر شکنیں پڑ جائیں تو میں سمجھتا ہوں میری کہانیاں بہت کامیاب ہیں۔" میری یہ بات سن کر صدیقی صاحب نے ایک لمبی اباسی لی اور انٹرویو ختم کرتے ہوئے کہنے لگے:
"لطیف صاحب سگریٹ لیجئے" صدیقی کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر مجھے پیش کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"نہیں شکریہ۔ میرے پاس میرا اپنا برانڈ ہے۔ ڈار صدیقی صاحب باتوں باتوں میں چائے کا پوچھنا تو بھول ہی گیا۔"

"نہیں، نہیں اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ چائے تو میں دفتر سے پی کر آ رہا ہوں۔۔ ہاں یاد آیا۔ آپ کی تمام فیملی کی ایک گروپ فوٹو ہو جائے کیا خیال ہے؟" صدیقی صاحب کرسی سے اٹھ کر جانے سے پہلے کہنے لگے۔

"چھوڑو جی کیا ضرورت ہے گروپ فوٹو کی۔"
"ہاں اگر آپ پسند فرمائیں تو اک گروپ فوٹو سیاہی سے بھرے ہاتھوں والے میرے بچوں کی کھینچ لو جو میری کہانیاں ہیں۔ یا پھر میری بیوی کی تصویر اتار لو جو دریا کے اس کنارے پر بیٹھی ہے۔"
"ٹھیک ہے جی اگر آپ گروپ فوٹو پسند نہیں کرتے تو آپ کی مرضی اچھا لطیف صاحب اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

وہ جلدی سے کرسی سے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔

"لیکن صدیقی صاحب اپنا خالی کاغذ تو لیتے جایئے۔" ––– میں نے خالی کاغذ کو کرسی پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ تو اتنی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا جیسے اس نے کوئی لمبی قید کاٹی ہو۔

(پنجابی سے ترجمہ: مصنف)

نجم الدین انصاری

چور

"کون ہو تم۔ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس لئے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔ لیکن یہ شخص خدا جانے کس طرح اندر آگیا ہے۔ یہ کوئی بھٹکی ہوئی روح تو نہیں جو مجھے ستانے کے لئے یہاں آگئی ہے.........

چاروں اور اندھیرے کی سیاہ چادر تنی ہوئی تھی۔ لیکن سامنے کھڑے ہوئے آدمی کے نقوش مجھے اچھی طرح نظر آرہے تھے۔ اس کی خونی آنکھیں ابھرا ہوا ماتھا۔ گھنی بھنویں۔ الجھے ہوئے بال بڑی بڑی مونچھیں' موٹے ہونٹ اور غصے سے بھرا ہوا چہرہ اس کے اندر کے برے انسان کی نشاندہی کررہے تھے۔

خوف اور اندھیرے نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر میرے احساسات کو بری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

میں نے بلب روشن کرنا چاہا تھا تاکہ کمرے میں روشنی ہو جائے لیکن سوئچ بورڈ دکھائی نہ دیا۔ اس بورڈ کا رنگ سیاہ تھا اور اس پر لگے ہوئے بٹن بھی سیاہ رنگ کے تھے۔ اس پر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور ٹوہ ٹوہ کر بٹن ڈھونڈ لئے۔ بلب کو آن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس روشنی پر بھی کالک نے اپنا پہرہ بٹھا رکھا ہو۔

میرے سامنے کھڑا ہوا آدمی مجھے اپنے سے زیادہ جری اور حوصلے والا لگتا تھا۔ خوف کی وجہ سے میرا دل کانپ اٹھا۔ حلق میں کانٹے سے اگ آئے اور حواس جاتے رہے۔

"کیا یہ کوئی چور ہے؟" میں نے اپنے دل میں سوچا۔ "اگر یہ چور ہے تو مجھے شور مچا دینا چاہیے...... لیکن میرے پاس ہے ہی کیا جو یہ اٹھا کر لے جائے گا۔"

میں بالکل خالی تو نہیں ہوں۔ میرے پاس جو دولت ہے وہ دوسروں کے پاس نہیں ہے"

" میں سوچوں کے بھنور میں کی تہہ میں اترتا چلا گیا۔ اگر یہ واقعی چور ہے تو اس نے میرے مکان کو ہی کیوں تاڑا ہے۔ کیا اسے سامنے والی بلند بلڈنگ نظر نہ آئی جس کے مالک کے دو بیٹے دوبئی سے ڈھیروں دولت کما کے لائے ہیں۔

وہ اس مکان کے اندر کیسے جا سکتا تھا۔ اس کی دیواریں میرے مکان کی دیواروں سے زیادہ اونچی ہیں۔ ساتھ ہی اس نے اپنے مکان کے اردگرد بجلی کی ننگی تاریں بچھا رکھی ہیں جن میں رات کے وقت کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی چور بھول کر ادھر آبھی جائے تو یہاں سے کوئی چیز لے جانے کی بجائے ان تاروں سے لٹک کر اگلے جہان کو چلا جائے۔ اس کے مقابلے میں میرے مکان کا دروازہ اتنا پرانا اور بوسیدہ ہو چکا ہے کہ کوئی طاقتور جوان اپنے ایک ٹکے سے اس کی کھپچیوں کو توڑ کر اندر آسکتا ہے۔

"بھائی تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو۔"

میں نے مدھم سروں میں اپنی آواز اٹھائی لیکن یہ کمزور آواز میرے حلق کی دیواروں سے ٹکرا کر اندر ہی مر گئی۔

یقیناً یہ کوئی چور ہے۔ اگر میں نے شور مچانے کی کوشش کی تو ممکن ہے کہ یہ گلا گھونٹ کر مجھے مار دے۔ اس طرح معصوم بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اور میری بیوی بیوہ ہو کر لوگوں کے گھروں میں دھکے کھانے پر مجبور ہو جائے گی۔ مال کا کیا ہے۔ یہ آتا بھی رہتا اور جاتا بھی رہتا ہے۔

میں جو اپنی تحریروں میں جرات اور بہادری کے بعید از فہم کارنامے لکھ کر ادبی حلقوں میں پہچان کروا چکا تھا وقت پڑنے پر کتنا بزدل اور بے حوصلہ بن گیا تھا۔ میں نے مصلحت کا دامن پکڑا اور خاموشی سے اپنی رضائی کو اپنے منہ پر کھینچ کر اس طرح اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے کوئی آدمی بہت گہری نیند کے مزے لے رہا ہو۔ لیکن کبھی کبھی چور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا۔

وہ بلا خوف میرے کمرے میں اس طرح چل رہا تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو اور اس کمرے میں پڑی ہوئی تمام اشیاء اس کی اپنی ہوں۔ اس نے ہر ایک شے کو غور سے دیکھا لیکن اسے اپنے مطلب کی کوئی شے نظر نہ آئی۔

وہ میری بیوی کی چارپائی کے پاس گیا جو نزاکت حال سے بے خبر گہری نیند میں تھی۔ میری بیوی کے پاس اپنی شادی کی نشانی سونے کی ایک انگوٹھی بچی ہوئی تھی جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز گردانتی تھی۔ وہ کبھی بھی اس انگوٹھی کو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے جدا نہ کرتی تھی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس وقت اس کا انگوٹھی والا ہاتھ رضائی کے اندر چھپا ہو اتھا۔ چور نے میری بیوی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ میری بیوی کے لمبے لمبے بال اور اس کا سونے ایسا رنگ اب بھی کسی مرد کے لئے توجہ طلب تھا۔ شاید چور کو ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ میری بیوی کی طرف سے مایوس ہو کر وہ میری بیٹی کی چارپائی کی طرف گیا جو جوانی کی منزل تک پہنچنے سے پہلی ہی بڑھاپے کی راہوں پر گامزن ہو چکی تھی۔ میری بیٹی کی پیشانی پر میری غربی نے ایک درد ناک تحریر لکھ دی تھی۔ چور کو یہ تحریر پڑھ کر کچھ ترس سا آیا۔ پھر وہ چھوٹی بیٹی کی چارپائی کے قریب گیا جو گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اگر وہ جاگتی بھی ہوتی تو کیا وہ حالات کی مشکل صورت کو جان سکتی تھی۔

اب وہ چور پہلی جگہ پر آن کھڑا ہوا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اچھی طرح اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی غلط جگہ پر آگیا ہے۔ لیکن اس کی ہمت اپنی شکست کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نظروں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔

ایک کونے میں ایک صندوق پڑا ہوا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس میں سے کوئی بہت قیمتی شے مل جائے۔"

یہ سوچ کر وہ صندوق کے سرہانے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ اپنے رخسار پہ رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے صندوق کو کھولا اور بڑے غور سے اس کے اندر موجود چیزوں کو دیکھنے لگا پھر اپنا ہاتھ ان چیزوں کی طرف بڑھایا۔

اس وقت میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ دل اتنی تیزی سے حرکت

کر رہا تھا کہ مجھے اس کی دھڑکن دھماکے کی طرح لگ رہی تھی۔ ایک پل کے لئے مجھے حوصلے سے کام لے کر
اس چور کا ہاتھ روک لینے کا خیال آیا لیکن دوسرے ہی پل یہ حوصلہ کسی پہاڑ کی گہری غار میں جا گرا۔
"یا اللہ اب تو ہی ان ظالم ہاتھوں سے بچا سکتا ہے۔" میں نے پورے خلوص سے اپنے رب سے دعا
کی۔

"اس گھر والا تو کوئی پاگل آدمی لگتا ہے۔"
اب اس کے سوچنے کی باری تھی۔
اس صندوق میں کوئی کپڑا نہیں تھا۔ کوئی زیور نہیں تھا۔ کوئی برتن نہیں تھا۔ بس الٹے سیدھے
مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کاغذ، پرانے اخبار، رسالے اور کتابیں تھیں۔
اس نے اپنا خالی ہاتھ باہر نکالا۔ جس سے مجھے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ یہاں سے کوئی شے اٹھا
کر نہ لے جائے گا۔ کیونکہ اس میں کسی خوبصورت لڑکی کی تصویر بھی تو نہیں تھی اور نہ کسی محبوبہ کا محبت
بھرا خط۔ اس میں پڑی ہوئی چیزیں اس کے کس کام کی۔
لیکن یہ دیکھ کر میری حیرانی کی حد ختم ہو گئی کہ اس نے اپنے شانوں پر پڑی ہوئی چادر کو زمین پر
بچھایا اور پھر جلدی جلدی اس صندوق میں پڑی ہوئی تمام اشیاء کو ایک گٹھڑی میں باندھ لیا۔ وہ ایک ایسے
حریص انسان کی طرح خوش نظر آرہا تھا جسے اچانک ڈھیروں دولت مل جائے۔ اس نے گٹھڑی اپنے سر پر رکھی
اور کمرے سے نکل جانے کے لئے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔
اس وقت خدا جانے مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں سے آگیا۔ میں اپنے ہاتھوں سے جاتی دولت کو بچانے
کے لئے تڑپ کر اس کے راستے میں پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ پھر اپنا دوسرا ہاتھ
اس کی گردن کی طرف بڑھایا۔ ٹھیک اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میرے ڈر کی وجہ سے وہ میرے تن میں سما گیا
ہو۔

اب میں اس کی جگہ پر ایک ارنا بھینسا بن کر کھڑا ہوا تھا۔

(پنجابی سے ترجمہ: مصنف)

غلام ربانی آگرو

آب حیات

سندھ کے لوگ دریائے سندھ کو مہران کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی مہران کی روانی سے سندھ میں نو بہ نو زندگانی کی لہر دوڑتی ہے اگر یہ نہ ہوتا تو سندھ ایک بے آب و گیاہ خشک ریگزار سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ میں کشتی پر سوار ہو کر یہ دریا پار کر رہا تھا۔ اس وقت بڑا پیارا سماں تھا۔ میر بحر یعنی ملاح بڑے والہانہ انداز میں کشتی چلا رہا تھا۔ مہران کی شاہانہ روانی نے مجھے اتنا وارفتہ سا کر دیا کہ د فعتاً" بڑے عالم بیساختگی میں پکار اٹھا "اس میں کوئی تعجب نہیں کہ دور قدیم کے آریاؤں نے اسے ساگر تصور کیا اور اس کا نام' سندھو' رکھا"

میر بحر نے میری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ہم اسے مہران کہتے ہیں۔ مہر محبت کا دریا اور سچ پوچھو تو اسی نام سے اس کی بڑائی ہے۔"

"ایسا کیسے ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"تم پڑھے لکھے لوگ اس کا یقین نہیں کرو گے مگر یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ مہران' تو ایک شہزادے کا نام تھا جس نے اس دیس پر بہت دنوں تک راج کیا اور آج تک کوئی اس راجہ جیسا رحم دل' ہمدرد عقلمند اور غریبوں سے پیار کرنے والا نہیں ہوا۔"

میرا تجسس بڑھا اور اشتیاق پیدا ہوا کہ بوڑھے ملاح سے یہ دلچسپ کہانی سنوں۔ میرے اصرار پر اس بوڑھے میر بحر نے بتایا "بزرگوں سے سنا ہے کہ مہران اپنی جوانی کے دنوں میں بہت سرکش' مغرور اور خود سر تھا۔ سبب یہ تھا کہ نوجوانی میں اسے ایک بہت ہی سندر اور جوانی سے بھرپور دیوی کی آشیرباد ملی ہوئی تھی۔ مہران کی چمکیلی آنکھوں سے جوانی کی شراب چھلکتی تھی۔ اس کے گال ایسے تمتماتے تھے جیسے سرشام افق پر شفق پھولی ہو۔ اس کے بال اتنے سیاہ تھے جیسے گھور اندھیری رات کا سماں دکھا رہے ہوں۔ جب وہ بات کرتا تھا تو اتنا مدھر سنگیت پیدا ہوتا جیسے کانوں میں گھنٹیوں کی آواز رس گھول رہی ہو۔ جب وہ چلتا تو اسکی چال سے ایسا لگتا جیسے لوگوں کے دل اس کے قدموں میں فرش کی طرح بچھ گئے ہوں۔ مہران کی شان میں بہت سے شاعروں نے اشعار کہے جن میں اس کے لاثانی حسن کی توصیف کی گئی۔ اسے نشۂ اقتدار نے اپنے آپے میں نہ رہنے دیا وہ ایک خودمختار اور بہت ہی سرکش آمر بن گیا۔ بہت سے غریبوں کو اس نے ظلم وتشدد کا نشانہ بنا کر ہولناک زندانوں میں صرف اس خطا پر بھر دیا کہ ان بیچاروں نے اس وقت حیرت زدہ ہو کر ٹھنڈی آہ بھری تھی جب اسکی شاہانہ سواری ادھر سے گزری تھی۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے سروں کو ان کے تنوں سے جدا کر کے اس کے قہر و غضب نے خاک و خون کی نذر کر دیا۔

ایک دن مہران اپنے جواں سال ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ وہ بہت دور دور تک شکار کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہے۔ عین اسوقت جبکہ سورج ڈوبنے والا تھا وہ ایک پہاڑ کے نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے سر سبز و شاداب وادی میں ایک ہرن کو چوکڑیاں بھرتے دیکھا جو گھاس چرنے ادھر آیا تھا۔ انھوں نے اسکا تعاقب کیا اور ہرن خوف زدہ ہو کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگا۔ مہران اپنے سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا اس نے ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑا لیا۔ اسی عرصے میں مہران کی کمان کا ایک تیر ہوا میں چیرتا ہوا بھاگتے ہرن کے پچھلے پیر میں پیوست ہو گیا۔ وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مہران اس بیچارے ہرن کے قریب گیا جو آخری سانسیں لے رہا تھا وہ اسپر جھکا اور چمکدار خنجر سے اسکا گلا کاٹنے پر آمادہ ہوا لیکن جب وہ زندگی کے لئے تڑپتے ہوئے ہرن کے سر کو اس کے تن سے الگ کرنے کی کوشش میں لگا تو اچانک اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ انہی ساعتوں میں اس کے ساتھی بھی وہاں جمع ہو گئے اور یہ دیکھ کر کہ شہزادہ اپنے مقصد میں ناکام ہو رہا ہے ان میں سے ایک نے بڑھ کر ہرن کا کام تمام کر دیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکاتے ہی ہو گیا۔ تب اس شقی القلب شخص نے شہزادے کو مخاطب کرتے ہوئے طنزاً کہا "معاف کرنا آپ اتنے نروس کیوں ہو گئے جبکہ آپ نے تو کبھی بھی ایک لمحہ کے لئے جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتروانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔"

مہران نے یہ سنکر بڑی رسان سے جواب دیا "تمہیں کچھ انتظار کرنا ہو گا کہ ایسا کیوں ہوا۔ میں بتاؤں گا مگر اب رات کی تاریکی پھیلتی جاری ہے اور ہمیں فوراً کوئی پناہ گاہ تلاش کرنی چاہئے" اس پر وزیر کے بیٹے نے کہا "ہم ایسی ویرانی میں کہاں پناہ لے سکتے ہیں؟ کیوں نہ اسی پہاڑ کے دامن میں کچھ آرام کر لیں اور آج یہ شکار جو ہم نے کیا ہے اس کو مزے لے لے کر کھائیں۔" مہران نے رضا مندی ظاہر کی اور اس کے ساتھیوں نے وہیں خیمہ گاڑ دیا۔ آگ روشن کی گئی۔ ذبح کئے ہوئے ہرن کی کھال اتاری اور اسے بھون ڈالا۔

جب وہ بھنا ہوا گوشت کھانے کے لئے یکجا ہوئے تو مہران نے کہا "دوستو! اب مجھے وضاحت کرنا ہے کہ میں نے شکار کئے ہوئے اس ہرن کو ذبح کرنے میں ہچکچاہٹ کیوں محسوس کی تھی۔ بات یہ تھی کہ جب میں اس کی گردن کاٹنے کو اس پر جھکا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب کشش دیکھی۔ غالباً ہر ایک ہرن ایسی ہی پر کشش آنکھیں رکھتا ہو گا۔ اتنی خوبصورت جیسے کسی باغ میں کھلے ہوئے خوبصورت چمکتے دمکتے پھول تو اس کی آنکھوں میں میں نے نہ صرف ستاروں کی آب و تاب دیکھی بلکہ موت کے سیاہ سائے بھی نظر آئے۔"

مہران کے تمام ساتھی یہ سنکر پکار اٹھے "موت کے سیاہ سائے؟"

"ہاں۔" مہران نے گلو گیر آواز میں اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری آنکھوں نے موت کا سایہ دیکھا اور میرے کانوں نے اس زخمی ہرن کے گلے سے ابلتی ہوئی موت کی مہیب اور مایوس کن آواز سنی۔ یہ میرے لئے ایک تنبیہہ تھی کہ ایک نہ ایک دن میری باری بھی آئے گی جب یہ تمام خوبصورتی مٹی میں مل جائے گی۔"

وزیر کے بیٹے نے آہستہ سے کہا۔ "شہزادے! موت سے نہ ڈرو۔"

مہران نے برجستہ جواب دیا "خوف بھی زندگی کا حصہ ہے اور موت زندگی کے ہر جذباتی پہلو کو انجام تک پہنچا

وزیر زادے نے مہران کی بات کو تسلیم نہ کیا اور کہنے لگا "منزل مقصود اپنی خواہش خود پیدا کرتی ہے مگر کوئی اسکو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔"

وزیرزادے کی اس دلیل پر مہران فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "موت سے کسی کو کوئی رستگاری نہیں۔"

وزیر زادہ اب بھی قائل نہ ہوا۔ "آپ میری گستاخی معاف کریں گے۔ دراصل ایسا نہیں ہے کہ موت کو ٹالا نہ جا سکے۔ میرے والد نے مجھے سکندر اعظم کا قصہ بتایا تھا کہ وہ جب سندھ میں آیا تو اسی پہاڑ کے پاس سے گزرا۔ اس وقت اسے ایک گھومتے پھرتے گیانی جوگی نے بتایا کہ یہیں کسی غار کے اندر پانی کا وہ قدرتی چشمہ تلاش کرنا چاہئے جس کا پانی کیلے کے شربت کی طرح تروتازہ اور شہد جیسے میٹھے آم کے رس جیسا ہے۔ رنگ اتنا صاف و شفاف جیسے دودھیا پانی ہو۔"

اس چشمے سے جو کوئی دو چلو پانی پی لے تو بس اس کی کایا پلٹ جائے۔ اگر وہ سو سال کا بھی ہو تو اس کی تاثیر سے ازسرنو ۱۹ سال کا نوجوان ہو جائے گا اور اسے دائمی زندگی حاصل ہو گی۔ لوگ اسے 'آب حیات' کے نام سے پکارتے ہیں۔

سکندر اعظم اپنی فوج کے دو سپہ سالاروں خضر اور الیاس کی ہمراہی میں پہاڑ کی طرف بڑھا اور اس غار کا سراغ لگا لیا جو دو قدیم اور بلند و بالا گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس تاریک اور ڈراؤنے سے قفس میں جیسے ہی وہ "آب حیات" حاصل کرنے کے لئے جھپٹے ایک دوسرے کو دیکھنے سے محروم ہو گئے۔ خضر نے دور اندیشی سے کام لیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک زندہ مچھلی لے گیا۔ جب اس نے گہرائی میں اترنے کی جسارت کی تو غار کے اندر جاتے ہی مچھلی نے اچانک اپنے آپ کو اسکی گرفت سے آزاد کر لیا اور چشمے میں کود گئی۔ خضر نے پانی میں اس کے کودنے کی آواز صاف سنی۔ وہ فوراً" وہیں جھکا اور اسے آب حیات نظر آگیا جس میں بڑی حیرت انگیز آب و تاب تھی۔ اس نے فوراً" ایک چلو آب حیات اپنے ہاتھوں میں سمیٹا اسے نوش جاں کیا اور آن کی آن میں اسکا طلسمی اثر کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے اس نے دوسرا جنم لیا ہو۔ الیاس بھی خضر کے دوش بدوش موجود تھا اور اسوقت کسی رسمی دعوت سے بے نیاز ہو کر الیاس نے بھی آب حیات پر ہاتھ صاف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کو حیات ابدی حاصل ہو گئی۔ تب سے یہ کہا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی مسافر بھٹکتا بھٹکتا ادھر آنکلتا ہے تو خضر و الیاس اس کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ چشمۂ آب حیات تک اس کی رہنمائی کر سکیں۔"

یہ داستان جوشیلے مہران کے لئے بہت کافی تھی۔ وہ اسی وقت اٹھا اور یہ اعلان کیا "صدیوں پہلے سکندر اعظم نے یہاں اپنا مقدر آزمایا تھا اب میری باری ہے۔ جو کوئی بھی میری طرح محسوس کرتا ہو وہ حوصلہ کرے اور میرا ساتھ دے بصورت دیگر میں تنہا آگے بڑھتا ہوں۔"

مہران کے ساتھیوں نے شہزادے کو اس حرکت سے یہ دلیل دے کر باز رکھنا چاہا کہ "یہ محض ایک دیومالائی قصہ ہے اک بودی فرضی کہانی ہے ایک مفروضہ ہے آپ کو اس بارے میں سنجیدہ نہ ہونا چاہئے" مگر مہران نے پکا ارادہ کر لیا اور اسے کوئی اپنی مہم جوئی سے نہ روک سکا۔

مہران نے سرپٹ اپنا گھوڑا دوڑایا اور وہ ان پرانے درختوں کے نزدیک پہنچ گیا جو چٹانوں کی کوہستانی درشتگی میں درختوں کی بجائے صرف ٹھونٹ جیسے ہو گئے تھے۔ اس نے غار کے منہ کو خس و خاشاک اور

خشک ٹہنیوں سے صاف کیا اور جڑی گلت میں اندر داخل ہوا۔ اس لئے اسے صرف آبِ حیات ہی کا خیال تھا۔ وہ تیزی سے غار میں اتر رہا تھا کہ اسے ایک چھپاکے کی آواز سنائی دی۔ وہ [illegible] وہ اہمیت کے اس چشمے پر جھکا جو آبِ حیات سے پر تھا۔ اسوقت اس نے دیکھا کہ ایک مچھلی [illegible] ہے۔ وہ مچھلی اپنی مخصوص بولی میں شہزادے کا استقبال کر رہی تھی "خوش آمدید شہزادہ مہران" [illegible] مچھلی کی چمکتی دمکتی آنکھوں کو دیکھا جو مہران پر جادو سا کر رہی تھیں۔ مچھلی نے پھر دہرایا "میں نے کہا خوش آمدید شہزادہ مہران۔"

شہزادہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ جواباً" اپنی ہی صدا کو بس اسقدر سن سکا "تم ۔ ۔ یہاں؟"

"تمہارا مطلب ہے میں یہاں کیسے ہوں اور کب سے ہوں تو سنو میں تو یہاں اسوقت سے ہی ہوں جب خضر کے ہاتھوں سے اچھلی تھی۔ میں نے آبِ حیات پیا ہے اور اب میں امر ہوں ہمیشہ کے لئے جینے پر مجبور ہوں۔"

"ارے کیا تم اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتیں؟"

"ہاں شہزادے ! میرے مقدر میں یہی ہے کہ میں سدا زندہ رہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میرے الفاظ پر یقین نہ کرو مگر میں ایمانداری سے سچ کہہ رہی ہوں۔ شہزادے ! مہربانی کر کے بیٹھ جاؤ۔ میں نے اب تک عرصہ دراز سے کسی جاندار کو نہیں دیکھا۔ قریب آؤ تاکہ تم میری بات کو بہتر طور پر سن سکو۔ براہ کرم یہ پانی نہ پینا۔"

"پانی؟ نہیں یہ تو آبِ حیات ہے جو میں تلاش کر رہا ہوں"

"ہاں واقعی غیر فانی زندگی کا راز آبِ حیات' جس کے بارے میں تم نے صرف کتابوں میں پڑھا ہو گا۔ مقدس مذہبی صحیفوں اور غیر مذہبی کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ جس نے اس آبِ حیات کی تھوڑی سی مقدار بھی پی لی وہ پھر کبھی موت کا ذائقہ نہ جانے گا۔ اے شہزادے! اس کا ایک قطرہ تمہیں چونچال اور نوخیز نوجوان چھوکرے کا روپ دے دے گا اور ساتھ ہی وہ نہ ختم ہونے والی اذیت بھی تمہارے مقدر میں ہو گی جو صدیوں کی زندگی پر محیط رہے گی۔"

"صدیوں کی زندگی کا لامتناہی آزار؟"

"ہاں بالکل وہی" یہ کہہ کر مچھلی کچھ دیر کے لیے پانی میں اتر گئی اور دوبارہ نمودار ہو کر اس نے اپنی بات کو جاری رکھا "ہاں شہزادے! بالکل وہی جو اس کی خاصیت ہے۔ آبِ حیات کا حیرت انگیز اثر اور عمل اس پر ہوتا ہے جو بغیر کسی عدل و انصاف کے دوسروں' کو مصائب و آلام سے دوچار کرتا ہے۔ سرکش و خودمختار ظالم یقیناً لافانی زندگی پاتے ہیں لیکن یہ زندگی جیتے جی مرجانے کے مصداق ہوتی ہے' جسمانی اور ذہنی اذیتوں سے بھری ہوئی زندگی جو اسے دنیا اور آخرت دونوں میں خوار کرتی ہے۔ یہ زندگی اس زہریلے بچھو جیسی زندگی ہو گی جو ہر اس چیز کو ڈنک مارتا ہے جو اسے چھو جائے۔"

"اور ۔۔۔ اگر؟"

مچھلی نے شہزادے کے مافی الضمیر کو سمجھ لیا اور اس کے سوال کا جواب یوں دیا "اگر کوئی آدمی اپنی پوری زندگی میں طاقتوروں کے روبرو سچ بولتا ہے' کلمہ حق زبان پر لاتا ہے اور کمزوروں سے دوستانہ حسنِ سلوک روا رکھتا ہے وہ اس آبِ حیات کے ایک قطرے سے ایسی حیات ابدی پاتا ہے جو حور کے خوبصورت

پھول جیسی حسین اور قطب ستارے کی طرح مستقل ہوتی ہے۔"
یہ سنتے ہی مہران کے ہوش و حواس گم ہونے لگے لیکن مچھلی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "اے شہزادے! اگر اس بات کو یقینی بنانا چاہو کہ تم اس چشمے سے بدی کی سوغات لے کر جا رہے ہو یا نیکی' تو اس کے پانی میں جھانک کر دیکھو اور گہرائی تک غور سے دیکھو۔ یہ اس رقیق مادے کی طرح ہے جو انسانی آنکھ سے خارج ہوتا رہتا ہے شدید درد و غم کی کیفیت میں یا پُر مسرت خیز جوش و خروش کی صورت میں۔۔ جو کوئی بھی اس چشمۂ آب بقا کے پانی میں جھانکتا ہے وہ اپنی ہی روح کا عکس دیکھتا ہے۔ آنکھ انسانی روح کا آئینہ ہوتی ہے۔ اگر تم اپنی آنکھوں میں رحمدلی اور مہربانی کی نفیس چمک دمک کا عکس دیکھو تو یقین کر لو کہ تمہاری روح پاکیزہ ہے لیکن اگر تمہاری آنکھوں میں ظلم و ستم اور غلط کاری کی پرچھائیاں منڈلائیں تو سمجھ لو کہ تمہارے اندر تارکول جیسی سیاہ روح موجود ہے ایسی صورت میں آب حیات کے ہزاروں چشمے بھی تمہاری بد روح کو دھو کر صاف ستھرا نہ کر سکیں گے ہاں اگر برعکس اس کے تمہیں پاکیزہ اور اعلیٰ و ارفع روح کی نیکیاں حاصل ہوں تو تمہیں آب حیات پینے کی کوئی ضرورت نہیں تمہارا نام امر رہے گا اور صدیوں تک انسانوں کو تمہاری نیکیاں یاد دلاتا رہے گا۔"
شہزادہ خوف و ہراس کی معصومانہ سی کیفیت میں ڈوب گیا۔ ادھر وہ مچھلی پھر پانی کے اندر چلی گئی اور چند ساعتوں کے بعد دوبارہ باہر نکل کر کہنے لگی۔ "میرے پیارے شہزادے! مت بھولو کہ تم ایک بڑے ملک کے حکمران ہو اور کسی ملک کے حکمران کو آب حیات یا کوئی دوسرے ایسے ہی مشروبات تلاش کرنے کا کوئی حق نہیں جو اس کی حکمرانی کو طول دے سکیں اور اس کے دور حکومت میں رعایا مہلک بیماریوں سے دبی ہوئی مسلسل فریاد و فغاں سے نڈھال ہو کر اس کی جانب رحم وہمدردی کی نظریں گاڑے ہو" شہزادہ سراسیمگی کے عالم میں کانپنے لگا اور اپنی آنکھیں موند لیں لیکن مچھلی اس کو کہاں چھوڑنے والی تھی' وہ پھر بڑے اثر آفریں لہجے میں بولی "کسی حکمران کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو عیش و عشرت کی گاڑھی شراب سے مست رکھے جبکہ اس کی رعایا دانے دانے کو محتاج رہے۔ اگر ایک وقت کی روٹی مل جائے تو دوسرے وقت کی روٹی کے آسرے میں اپنے پیٹ سے محتاجی کا پتھر باندھ کر گزارہ کرے۔"
شہزادے نے آنکھیں کھولیں تو آنکھوں میں تاسف اور پشیمانی کے آنسو چھلک رہے تھے مچھلی پھر کہنے لگی "کسی حکمران کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے فانی جسم پر اطلس و کمخواب کی خلعت شاہانہ سجائے رکھے جبکہ اس کی رعایا پھٹے پرانے لباس کو بھی ترسے اور سخت سردی و گرمی کے آزار برداشت کرے۔ میرے شہزادے! ان تمام تلخ حقائق پر نظر دوڑاؤ اس سے پہلے کہ تم آب حیات پینے کا ارادہ کرو۔"
اب وہ مچھلی غائب ہو گئی اور مہران شدید پشیمانی کا احساس اپنے دل میں لیے ہوئے الٹے قدموں واپس ہونے لگا۔ پھر جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو اس نے فوری طور پر گھر لوٹنے اور آنے والی صبح کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔
دوسرے دن دربار عام میں نیک دل ہو کر شہزادے نے بلند اور مسحور کن آواز میں اعلان کیا "میری پیاری رعایا کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کمزور ترین شخص میری سلطنت میں میرے نزدیک اب سب سے زیادہ قوی ہے تاوقتیکہ میں اس کے تمام حقوق بحال نہ کروں اور تمام واجبات ادا نہ ہو جائیں۔ برعکس اس کے قوی ترین شخص اب میرے نزدیک کمزور ترین ہے جب تک میں اس سے مظلوموں کو وہ حقوق اور وہ سب

یکہ ڈھیں نہ دلوا دوں جو جرا" چھینا گیا ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ پھر مہران کے پورے دور حکومت میں کبھی قحط نہیں پڑا اور کوئی بھی شخص عدم مساوات کا شکار ہو کر ان مراعات سے محروم نہیں رہا جو اسے ملنا چاہیے تھیں اور جب مہران نے وفات پائی تو معصوم بچے بھی ایسے بلک بلک کے روئے جیسے وہ کسی بہت ہی پیارے کھلونے سے محروم ہو گئے ہوں۔ خواتین اس طرح گریہ و زاری کر رہی تھیں جیسے وہ تپتی ہوئی بھٹی میں جلا دی گئی ہوں اور بوڑھے مرد اس طرح آہ و فغاں کر رہے تھے جیسے ان کا اکلوتا بیٹا موت نے چھین لیا ہو۔

سلطنت کے تمام علاقوں کے لوگ مہران کا سوگ منانے کے لیے جمع ہوئے ان کو یہ بھی طے کرنا تھا کہ ایک ایسے اچھے اور ہردلعزیز حکمران کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے کیا یادگار قائم کی جائے کچھ نے ایک عالیشان مینارہ تعمیر کرنے کی تجویز دی۔ کچھ نے ایسا نیا یادگاری سکہ ڈھالنے پر زور دیا جو ساری دنیا میں لاثانی ہو مگر سب سے زیادہ دانشمندانہ بات ایک بوڑھے آدمی سے سنی گئی جس نے یہ نصیحت کی "بھائیو! شہزادہ مہران نے اپنے عادلانہ اور فیاضانہ دور حکومت میں ہمیں امن و سلامتی بخشی۔ اس کے نام کو رخشندہ رکھنے کا ایک ہی موزوں ترین طریقہ ہے اور وہ یہ کہ دریائے سندھ کو اس کے نام سے منسوب کیا جائے تاکہ نسل در نسل صدیوں تک اس کا نام زندہ رہے۔ اس مہربان دریا کی روانی کے بغیر سندھ ایک بنجر ریگستان ہی رہتا اس لیے اس دریا کو "مہران" کہنا اپنے پیارے حکمران کی سدابہار یاد کو تازہ رکھنے کے مصداق ہو گا۔"

اس طرح سندھ کے عوام نے اپنے دلوں پر "مہران" کے نام کو نقش کر لیا اور یہ رواں دواں دریا مہربانیوں اور مفادات عامہ کی زندہ جاوید علامت بن گیا۔

(سندھی سے ترجمہ: آفاق صدیقی)

نصرت عبداللہ چمہ

من اجلا تن اجلا

"شانا" "شانی" "شانی" میں نے اپنی آواز اور بھی بلند کرتے ہوئے کہا "او بہن شانی"۔۔۔۔۔ میرے سامنے پڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے کو حرکت ہوئی اور نہ ختم ہونے والی کھانسی شروع ہو گئی۔ میں نے اسے کروٹ دلوائی اور پیٹھ سہلانا شروع کی۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو رہی تھی میں نے اسے نہایت آہستگی کے ساتھ سیدھا کیا۔ اس کی سانسوں سے خر خر جیسی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک پردہ آگیا۔ صاف شفاف پردہ جس میں شفاف دودھ جیسا چمکتا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے بھنوؤں اور لمبی لمبی پلکوں کو دیکھا۔ سروقد حسن کے مجسمے کو دیکھا میں نے بے حد خوبصورت چمکتے ہوئے لمبے لمبے بالوں والی اپسرا دیکھی۔ اس کی لہراتی ہوئی چال تھی۔ وہ سراپا ناز تھی۔ اس کے بات کرنے میں رس تھا۔ میں نے پلکیں جھپکا کر اور گہرائی میں دیکھا۔ اتنا حسن و جمال اس پر اتنا غرور، ضد اور تکبر، میں اس پردے پر ماضی کے گہرے نقوش دیکھنے لگی۔

شانا میرے کالج کی ساتھی، میں نے اسے کالج میں جب پہلی دفعہ دیکھا تو میری آنکھیں اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔ قدرت نے اسے بے انتہا حسن سے نوازا تھا، اس کی چال میں ایک ایسا وقار تھا کہ آنکھ ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سارا کالج اس کا گرویدہ تھا۔ مگر ہائے احساس حسن! اس احساس نے ایسے فرشتے کو غرور کے بد زیب پاؤں دے دیئے تھے۔ مور یوں تو بہت حسین ہے لیکن اس کی ٹانگیں......... بس رنگ رچانے والے کے عجیب کھیل ہیں اتنی خوبصورت شہزادی دیکھ کر، اس کی غرور و تکبر والی بے ڈھنگی روش دیکھنے والے کا دل دکھا دیتی تھی۔ اسے جب بھی کوئی بات پسند نہیں آتی تھی اس پر وہ اپنے ناک کو اس طرح سکوڑتی تھی کہ اس کا حسین چہرہ سکڑی ہوئی ناک سے بھونڈا سا لگنے لگتا تھا۔ ساری جماعت میں وہ اپنے غرور و تکبر کے لئے عجیب نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ وہ کلاس مانیٹر بھی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں وہ بس واجبی سی تھی۔ لیکن اس کا معصوم چہرہ سبھی کو پسند تھا شاید اسی نے اسے مانیٹر بنوا دیا تھا۔ میں نے ہمیشہ شانی کو اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا اور شدت کے ساتھ اس کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔۔۔ میں ایک تو جماعت میں نئی نئی آئی تھی دوسرے شکل و صورت میں اس کا جواب نہیں ہو سکتی تھی۔۔۔۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور وہ میرے پاس سے منہ موڑ کر آگے چل دیتی تھی اس منہ موڑنے پر نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آجاتی تھی۔

ایک دن کی بات ہے میں میس میں سے کھانا کھا کر نکل رہی تھی شانو مجھے ملی اور مجھ سے آگے بڑھ کر جانے لگی میں نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا نہ جانے مجھ میں ایسی ہمت کیسے آگئی تھی۔ "باجی آخر میں نے کیا قصور کیا ہے؟ آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔" میرا اتنا کہنا تھا اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر چھڑایا

اور بولی۔ "ارے لڑکی تو مجھ سے جونیئر ہے۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے کبھی اپنی حیثیت کا اندازہ لگا لیا کر
اپنے برابر والیوں سے دوستی کر۔ انھیں اپنی سہیلی بنا۔ میرے پیچھے تو لڑکیاں مکھیوں کی طرح لگی رہتی ہیں۔ ورنہ کسی
دا مینڈکی کو بھی زکام ہوا ہے۔"

یہ ذلت دیکھ کر میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔ میں شرم سے وہیں گڑ گئی۔ جی چاہتا تھا
اور وہ یہ جا وہ جا۔ میں یوں ہی حیران، پریشان اور اداس کھڑی تھی کہ میری کلاس کی ایک سہیلی نے میری
بانہوں میں بانہیں ڈال دیں تو میں چونک پڑی اور اس سے جلدی میں سوال کر ڈالا "یہ تو بتا کیا دنیا میں حسن
ہی سب کچھ ہے؟" نسیم بیچاری شکل صورت میں مجھ سے بھی سادی تھی مگر اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔
نہیں بہن اگر حسن ہی سب کچھ ہوتا تو اللہ خراب شکلوں والے لوگ اکثریت میں پیدا نہیں کرتا۔ ارے پگلی
حسن تو انسان کا اس کے اندر ہوتا ہے تو نے سنا نہیں ہے کہ اندرائین حسین تو بہت ہے لیکن جب کھاؤ تو
اندر سے زہر کی طرح۔ من اجالے جیسی کوئی دوسری بات ہی نہیں ہے۔"

میں شکل و شباہت کے چکر میں پڑ کر احساس کمتری کا شکار ہو کر رہ گئی تھی اس دن سے من اجالے
پر دھیان دینے لگی تب میں نے دیکھا کہ تن اب پہلے سے بھی اجلا نظر آنے لگا۔ مجھ میں اتنی تبدیلی آئی کہ
خوبصورتی میں شائل میرا آئیڈیل بنتی چلی جارہی تھی اب میں نے اس کو اہم سمجھنا چھوڑ دیا۔ میں نے خود میں
ایسی تبدیلی پیدا کرلی تھی کہ مجھے ہر انسان شائل نظر آنے لگا تھا۔ سال بھر میں ہی میرا نام کلاس میں اہم ہو
گیا۔ میری ہوشیاری اور دانشمندانہ گفتگو سے سب متاثر ہونے لگے۔ میری اس کامیابی نے شائل کو جلا کر
راکھ کر دیا۔ وہ مجھ سے جلنے لگی۔ وہ ہر جگہ میری نقلیں اتارتی، ٹھٹہ کرتی اور میرا دل توڑنے کی ہر ممکن
کوشش کرتی۔ جب کچھ بس نہ چلتا تو میری چھوٹی چھوٹی شکایتیں پرنسپل سے کرتی لیکن قدرت ہمیشہ میرا ساتھ
دیتی رہی۔ وہ مجھے کہیں بھی زک نہ پہنچا سکی۔ امتحانات ہوئے میں اول آئی شائل فیل ہو گئی اس طرح وہ اپنی
ہی کلاس میں رہ گئی۔ وہ اس دن کمرہ بند کرکے سارا دن روتی رہی۔ وہ شام کو جب باہر آئی تو اس کا سوگوار
حسن ایسا تھا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی اور اس سے بغل گیر ہو گئی اور نہایت نرم اور ہمت بھرے
انداز میں کہا۔ "غم نہ کر شائل محنت کرکے تو دیکھ۔"

اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں جاکر دروازے کی چوکھٹ پر گری اور آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔
"بس اتنا سن پائی کہ چلی ہے مجھ سے ہمدردی کرنے میں تجھ جیسیوں سے بات کب کرتی ہوں۔ میں۔۔۔
میں۔۔۔ میں"

یہ میں میں میرے کانوں میں گونجی مگر میں اس میں۔۔۔ میں کے تکبر میں نہیں پڑی۔ میں نے تکبر کو
کبھی نہیں اپنایا۔۔۔۔ شائل نے آگے نہیں پڑھا اور وہ جلد ہی کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ قدرت کی طرف سے
اسے یہ عطیہ ملا کہ اس کے والدین نے ایک نشیلے مالدار شخص سے اس کی شادی کردی اور یہ خبر مجھے نسیم
نے سنائی۔ میں امتحان پاس کرکے ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس لگ گئی۔ جلد ہی میرے والدین نے میری شادی
کرادی۔ میرا خاوند گورنمنٹ افسر تھا اس لئے تبادلوں کی وجہ سے کبھی کہیں اور کبھی کہیں ماری ماری پھرتی
تھی۔ کچھ سالوں کے بعد ہمارا تبادلہ سانگھڑ ہو گیا۔ ایک دن میں بنگلے کے لان میں ٹہل رہی تھی کہ سامنے
والے گھر سے رونے کی آواز آئی۔ میں نے معلوم کیا تو کریم بخش چپڑاسی نے بتایا کہ یہ میری بہن ہے۔ اس
کا شوہر نشے میں مرگیا ہے اور مرتے مرتے اسے ٹی بی کا مرض دے گیا۔ اب یہ آخری سانسیں گن رہی

ہے۔ میں نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا میں اس کا علاج کراتی۔ کریم بخش نے روتے ہوئے کہا جب سے آپ آئی ہیں کوارٹر کی کھڑکی میں سے آپ کو دیکھتی رہتی ہے اور کہتی ہے بیگم صاحب اور میں ساتھ پڑھتے تھے۔ میرے بارے میں آپ کچھ نہیں بتایئے گا۔ کل سے تو اس کی آنکھیں بھی نہیں کھل رہی ہیں۔

"میرے ساتھ پڑھی ہے! اس کا نام کیا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا

"شانا" "شائل۔"

یہ سنتے ہی میں اٹھ کھڑی ہو گئی۔ میری آنکھوں کے آگے نشیلی آنکھیں' مسکراتے ہونٹ موتی جیسے جڑے دانت اور حسین شکل تھی۔ وہی پیکر' وہی حسن لیکن یہ یہ کیا؟ شفاف پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا۔ میری آنکھوں آگے ہڈیوں کے ڈھانچے پر کالی چمڑی منڈھی ہوئی تھی۔ دو گڑھوں میں دھنسے ہوئے دو چمکتے دیئے تھے اور جھڑے ہوئے بالوں کے کچھ آثار بھی تھے۔ میرے سامنے ایک بڑا تضاد تھا۔ اجلا تن یوں ساتھ چھوڑ جاتا ہے مجھے یہ خبر نہیں تھی۔

(سندھی سے آزاد ترجمہ: ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی)

قلندر مومند

صرف شرفاء کیلئے

روز جاتے ہوئے میری نظر' کابلی گیٹ کے کونے میں ایک ہوٹل کے بورڈ پر اچانک رک جاتی ہے۔
"۔۔۔۔۔۔ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ صرف شرفاء کیلئے"
اور میں جاتے جاتے چند لمحوں کے لئے رک جاتا ہوں' ہوٹل کے دروازے باہر سے بند نظر آتے ہیں اور میری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو پاتی کہ ان شریفوں میں سے کبھی ایک شریف کو تو دور سے دیکھوں' ہوٹل کے برآمدے میں کبھی کبھی ایک بیرا ہاتھ میں چائے کی ٹرے پکڑے دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ میں اسے شریف کہوں کیونکہ اس قسم کے تو کئی شریف قصہ خوانی بازار میں پھرتے رہتے ہیں۔۔۔۔ اور جب کبھی دفتر کے کینٹین میں مہمان کے ساتھ چائے پیتا ہوں تو اس قسم کے شریف تو ایک توندیل اور بڑی داڑھی رکھنے والے مالک کے حکم پر ہمارے اردگرد بھی گھومتے پھرتے ہیں۔۔۔۔

خدایا! میں ان شریفوں کو کبھی نہیں دیکھوں گا' میری یہ حسرت حسرت ہی رہے گی' کبھی بھی پوری نہیں ہوگی۔۔۔۔ اور اچانک پیچھے کی جانب سے ایک موٹر گاڑی ہارن دیتی ہے میں جلد ہی کھسک کے ایک طرف ہو جاتا ہوں۔۔۔۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال آجاتا ہے کہ قصہ خوانی میں تو ون وے ٹریفک ہے یہ مخالف جانب سے موٹر گاڑی آنے کا کیامطلب؟ میں اپنے ساتھی سے پوچھتا ہوں وہ چند لمحوں کے لئے مجھے گھور کے دیکھتا ہے جیسا کہ ٹریفک رولز میرے چہرے پر لکھے ہوئے ہوں۔

"میرے دوست! ون وے ٹریفک صرف تانگوں والوں کے لئے ہوتا ہے شریفوں کی موٹر گاڑیاں تو ہر جگہ آزاد ہوتی ہیں۔۔"

اور یک دم ہوٹل والا بورڈ میرے سامنے آجاتا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ۔ صرف شرفاء کے لئے۔"

اور جب کبھی میرا دل بھر آتا ہے تو میں پارک کی جانب چل پڑتا ہوں' وہاں بھی شریف اور غیر شریف کے درمیان امتیاز کی ایک سرخی مائل لکیر کھینچی ہوتی ہے۔

"شریف مردوں کے لئے۔"

"شریف عورتوں کے لئے۔"

اور جب میں جیب سے سگریٹ کا ڈبہ نکال کے پریشانی کو دور کرنے کی خاطر ایک کش کھینچنے کا ارادہ کرتا ہوں تو سبزی مائل رنگ کے ڈبے پر Capstan کا لفظ دیکھتے ہی میرا خیال ٹیلیفون ایکسچینج کی دیوار کے ساتھ کھڑے زردی مائل بورڈ کی طرف جا ٹھہرتا ہے۔

شریف لوگوں کی گذر اوقات کا بہترین ساتھی کیپسٹن سگریٹ ہے۔
یہ سگریٹ شریفوں کی طبیعت پر بہت راس آتا ہے۔
اور میرے ہاتھ سے سگریٹ کا ڈبہ زمین پر گر جاتا ہے' میرے ذہن میں بھی بکھر جاتے ہیں۔
"تو یہ شرافت بس کیپسٹن سگریٹ کو ہی کہا جاتا ہے۔"
مگر ایسا نہیں ہو گا۔ اگر ایسا ہو تو پرسوں جب قطب خان نے چرس پینے کے لیے کیپسٹن کا ایک سگریٹ خریدا تو مجھے میرے بھائی نے یہ کیوں کہا۔ "چل شریف لوگ یہاں کھڑے ہرے لگتے ہیں۔"
اور جب میں فلم دیکھنے کے لئے جاتا ہوں تو میرے ساتھی مجھے یہ کیوں کہتے ہیں۔
"گیلری میں بیٹھیں گے یہ شریف لوگوں کی جگہ ہے۔"
"تو شرافت گویا گیلری کو کہا جاتا ہے۔"
مجھے بھی اپنا آپ شریف لگتا ہے جب میں شریف ہوں پھر تو یہ سارے لوگ شریف ہیں یہ بھی میری طرح اٹھتے بیٹھتے' آتے جاتے اور باتیں شاتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ پر میں شریف نہیں ہوں اور اگر میں شریف ہوتا تو جشن پاکستان کے روز جب میں شریفوں سے ملاقات کے لئے ایک ہوٹل گیا تھا تو ہوٹل کا نوکر مجھے میلے چادر کے پلو سے پکڑ کے نہ کھینچتا اور یہ نہ کہا ہوتا۔
"تیرا بھلا ہو اندر منسٹر صاحب کے ساتھ شہر کے شرفاء چائے پیتے ہیں۔"
"تو یہ شریف لوگ کون ہیں' کیا یہ فرشتے ہیں جو ہماری نظریں انہیں نہیں دیکھ پاتیں۔ ہاں! ہم اتنے رذیل ہیں کہ ان کو دیکھنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے۔"
اور ذہن الجھ کے بکھر جاتا ہے۔
۔۔۔۔۔ اور جب ایک دن میرے دفتر کے ایک ساتھی نے مجھے یہ خوش خبری سنا دی کہ "کلرکس ایسوسی ایشن" کے سالانہ انتخابات کے موقع پر شہر کی Gentry (شرفاء) کو دعوت دی گئی ہے تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ گویا میرے پاؤں زمین پر نہیں ہیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میں گویا ہوا میں اڑا جارہا ہوں میں نے کہا اب اگر خدا نے چاہا تو میں شریفوں کا دیدار کر سکوں گا "شرافت" تو میرے گھر آگئی ہے۔
کل انتخابات ہونے والے تھے اور آج جب میں گھر پہنچا تو میری چھوٹی بہن دھیرے دھیرے میرے قریب آگئی۔
"لالہ بی بی حلیمہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میرا ایک دوپٹہ ہے اور وہ بھی دھوتے دھوتے پھٹے حال ہو گیا ہے۔ قمیض تو وہ عید الفطر والی ہے جسے میں نے آج اپنے لئے دھویا ہے لیکن۔۔۔"
اور میں سمجھ گیا کہ کل تنخواہ کا دن ہے میرے لئے تنخواہ والے دن کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ چھوٹی بہن یا تو دوپٹہ کی فرمائش کرے گی یا سینڈل کی اور جب سینڈل خریدنے بازار جاتا ہوں تو راستے ہی میں سے واپس لوٹ آتا ہوں کیونکہ اگر بہن کے لئے سینڈل خریدتا ہوں تو ماں کا دوپٹہ رہ جاتا ہے اور اگر ماں کے لئے دوپٹہ نہیں خریدتا تو میری ماں اپنے لئے بہو کیسے پسند کرے گی اور اگر میری ماں اپنے لئے بہو پسند نہ کرے تو اس کے دل کا ایک بڑا ارمان پورا نہیں ہوگا۔۔۔ اور جب کبھی میں اپنی ماں کے ساتھ اس بات پر جھگڑا سا کرتا ہوں تو وہ اپنی مسواک والی انگلی لبوں پر رکھ دیتی ہے اور حیرت کا سارا موڈ اپنے آپ پر طاری کر لیتی ہے۔

"ہائے میرے بچو! شریف لوگوں کی اولاد اس طرح کی باتیں کرتی ہے؟"
اور فی الفور میرے ذہن کی بارود کو آگ لگ جاتی ہے اور مجھے ــــــ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ بورڈ یاد آجاتا ہے
"ــــــ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ
صرف شرفاء کے لئے"
یہ شرافت کون سی بلا ہے؟ کہ ہر شخص شریف بھی ہے اور شریف نہیں بھی ــــ
اس رات میری بہن نے مجھے جو دو پٹے کے لئے کہا تو میں نے گردن کو جھکایا اس مہینے کے سارے خرچ کے علاوہ میرے پاس تین روپے بچ جائیں گے اور وہ بھی ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کو دے دوں گا تاکہ شہر کے شریف طبقے کے ساتھ دفتر کے کلرکوں کے ساتھ تعارف کے سلسلے مین چائے کا انتظام کرے۔
"بہن! ترے لئے میں دوپٹہ کہاں سے لاؤں' اس بار نہیں اگلے ماہ اچھا؟" میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
"لالہ! تم ہر مہینے یہی کہتے ہو تمہارا وہ مہینہ کب آئے گا۔"
وہ اٹھ گئی اور مٹکے سے پانی پیا ایسا لگ رہا تھا گویا وہ اپنے غصے کو ٹھنڈا کر رہی ہے اور پھر چلی گئی۔
"میں نے یہ کیا کہ پہلو بدل لیا اور لیٹ گیا۔"
انتخابات ہو گئے ہمارے ساتھی ہار گئے اور پاکٹ گروپ جیت گیا مگر میں خفا نہیں تھا کیونکہ سامنے لان (lawan) میں شہر کے سارے شرفاء جمع تھے اور چند لمحوں بعد ہم ان کے ساتھ چائے پی رہے ہوں گے۔

میرے اور "شرافت" کے درمیان چند قدموں کا فرق تھا فاصلہ کم ہوتا چلا جارہا تھا دو قدم' ایک قدم اور اب ایک بالشت (اتنا فاصلہ تو چاہئے تھا)
میں شہر کے دو شریفوں کے درمیان بیٹھ کے ان کے لئے چائے بنا رہا تھا ــــ کچھ کلرکوں نے چائے کا بائیکاٹ کیا تھا اور کچھ پہلے ہی گھروں کو چلے گئے تھے بہت سی کرسیاں خالی پڑی تھیں میرے ساتھ بیٹھے دو شریف آپس میں گپ مار رہے تھے۔
"دوست! کل تم کھیل میں نہیں تھے؟" ایک شریف نے سگریٹ سلگایا۔
"کل کارخانے میں مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔"
"ہڑتال!" پہلا شریف تقریباً تقریباً کرسی سے اٹھ گیا اس کی مٹھیاں بند تھیں اور ایک بڑی گالی دے کر کہا۔

" تو تم نے کیا بنایا ہڑتال کا۔"
"پولیس کے ذریعے خوب سبق سکھایا اگر انہیں یہ یاد ہو تو پھر کبھی نہیں کریں گے ہڑتالیں۔"
پہلا شریف ذرا آرام سے ہوا۔ سکھ کا سانس لیا اور بائیں آنکھ کو دبا کر کہا۔ "خان بہادر صاحب نے کل خوب نچایا ہے مجھے' تیس ہزار روپے جیت لئے ہیں۔"
"دانہ تھا یا فلاش۔"
"فلاش ہی تھانا۔"

شریف لوگوں کی گزر اوقات کا بہترین ساتھی کیپسٹن سگریٹ ہے۔
یہ سگریٹ شریفوں کی طبیعت پر بہت راس آتا ہے۔
اور میرے ہاتھ سے سگریٹ کا ڈبہ زمین پر گر جاتا ہے' میرے ذہن میں کچھ بکھر جاتے ہیں
"تو یہ شرافت بس کیپسٹن سگریٹ کو ہی کہا جاتا ہے۔"
مگر ایسا نہیں ہو گا۔ اگر ایسا ہو تو پرسوں جب قطب خان نے چرس پینے کے لئے کیپسٹن کا ایک سگریٹ خریدا تو مجھے میرے بھائی نے یہ کیوں کہا۔ "چل شریف لوگ یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔"
اور جب میں فلم دیکھنے کے لئے جاتا ہوں تو میرے ساتھی مجھے یہ کیوں کہتے ہیں۔
"گیلری میں بیٹھیں گے یہ شریف لوگوں کی جگہ ہے۔"
"تو شرافت گویا گیلری کو کہا جاتا ہے۔"
مجھے بھی اپنا آپ شریف لگتا ہے جب میں شریف ہوں پھر تو یہ سارے لوگ شریف ہیں یہ بھی میری طرح اٹھتے بیٹھتے' آتے جاتے اور باتیں شاتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ پر میں شریف نہیں ہوں اور اگر میں شریف ہوتا تو جشن پاکستان کے روز جب میں شریفوں سے ملاقات کے لئے ایک ہوٹل گیا تھا تو ہوٹل کا نوکر مجھے میلے چادر کے پلو سے پکڑ کے نہ کھینچتا اور یہ نہ کہا ہوتا۔
"تیرا بھلا ہو اندر منسٹر صاحب کے ساتھ شہر کے شرفاء چائے پیتے ہیں۔"
"تو یہ شریف لوگ کون ہیں' کیا یہ فرشتے ہیں جو ہماری نظریں انہیں نہیں دیکھ پاتیں۔ ہاں! ہم اتنے رذیل ہیں کہ ان کو دیکھنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے۔"
اور ذہن الجھ کے بکھر جاتا ہے۔
۔۔۔۔۔ اور جب ایک دن میرے دفتر کے ایک ساتھی نے مجھے یہ خوش خبری سنا دی کہ "کلرکس ایسوسی ایشن" کے سالانہ انتخابات کے موقع پر شہر کی Gentry (شرفاء) کو دعوت دی گئی ہے تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ گویا میرے پاؤں زمین پر نہیں ہیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میں گویا ہوا میں اڑا جارہا ہوں میں نے کہا اب اگر خدا نے چاہا تو میں شریفوں کا دیدار کر سکوں گا "شرافت" تو میرے گھر آگئی ہے۔
کل انتخابات ہونے والے تھے اور آج جب میں گھر پہنچا تو میری چھوٹی بہن دھیرے دھیرے میرے قریب آگئی۔
"لالہ بی بی حلیمہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میرا ایک دوپٹہ ہے اور وہ بھی دھوتے دھوتے پھٹے حال ہو گیا ہے۔ قمیض تو وہ عید الفطر والی ہے جسے میں نے آج اپنے لئے دھویا ہے لیکن۔۔۔"
اور میں سمجھ گیا کہ کل تنخواہ کا دن ہے میرے لئے تنخواہ والے دن کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ چھوٹی بہن یا تو دوپٹہ کی فرمائش کرے گی یا سینڈل کی اور جب سینڈل خریدنے بازار جاتا ہوں تو راستے ہی میں سے واپس لوٹ آتا ہوں کیونکہ اگر بہن کے لئے سینڈل خریدتا ہوں تو ماں کا دوپٹہ رہ جاتا ہے اور اگر ماں کے لئے دوپٹہ نہیں خریدتا تو میری ماں اپنے لئے بہو کیسے پسند کرے گی اور اگر میری ماں اپنے لئے بہو پسند نہ کرے تو اس کے دل کا ایک بڑا ارمان پورا نہیں ہوگا۔۔۔ اور جب کبھی میں اپنی ماں کے ساتھ اس بات پر جھگڑا سا کرتا ہوں تو وہ اپنی مسواک والی انگلی لبوں پر رکھ دیتی ہے اور حیرت کا سارا موڈ اپنے آپ پر طاری کر لیتی ہے۔

"ہائے میرے بچے! شریف لوگوں کی اولاد اس طرح کی باتیں کرتی ہے؟"
اور فی الفور میرے ذہن کی بارود کو آگ لگ جاتی ہے اور مجھے۔۔۔۔ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ بورڈ یاد آجاتا ہے
"۔۔۔۔۔ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ
صرف شرفاء کے لئے"
یہ شرافت کون سی بلا ہے؟ کہ ہر شخص شریف بھی ہے اور شریف نہیں بھی۔۔۔
اس رات میری بہن نے مجھے جو دوپٹے کے لئے کہا تو میں نے گردن کو جھکایا اس مہینے کے سارے خرچ کے علاوہ میرے پاس تین روپے بچ جائیں گے اور وہ بھی ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کو دے دوں گا تاکہ شہر کے شریف طبقے کے ساتھ دفتر کے کلرکوں کے ساتھ تعارف کے سلسلے میں چائے کا انتظام کرے۔
"بہن! تیرے لئے میں دوپٹہ کہاں سے لاؤں' اس بار نہیں اگلے ماہ اچھا؟" میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
"لالہ! تم ہر مہینے یہی کہتے ہو تمہارا وہ مہینہ کب آئے گا۔"
وہ اٹھ گئی اور مٹکے سے پانی پیا ایسا لگ رہا تھا گویا وہ اپنے غصے کو ٹھنڈا کر رہی ہے اور پھر چلی گئی۔
"میں نے یہ کیا کہ پہلو بدل لیا اور لیٹ گیا۔"
انتخابات ہو گئے ہمارے ساتھی ہار گئے اور پائلٹ گروپ جیت گیا مگر میں خفا نہیں تھا کیونکہ سامنے لان (lawan) میں شہر کے سارے شرفاء جمع تھے اور چند لمحوں بعد ہم ان کے ساتھ چائے پی رہے ہوں گے۔
میرے اور "شرافت" کے درمیان چند قدموں کا فرق تھا فاصلہ کم ہوتا چلا جارہا تھا دو قدم' ایک قدم اور اب ایک بالشت (اتنا فاصلہ تو چاہئے تھا)
میں شہر کے دو شریفوں کے درمیان بیٹھ کے ان کے لئے چائے بنا رہا تھا۔۔۔۔ کچھ کلرکوں نے چائے کا بائیکاٹ کیا تھا اور کچھ پہلے ہی گھروں کو چلے گئے تھے بہت سی کرسیاں خالی پڑی تھیں میرے ساتھ بیٹھے دو شریف آپس میں گپ مار رہے تھے۔
"دوست! کل تم کھیل میں نہیں تھے؟" ایک شریف نے سگریٹ سلگایا۔
"کل کارخانے میں مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔"
"ہڑتال!" پہلا شریف تقریباً تقریباً کرسی سے اٹھ گیا اس کی مٹھیاں بند تھیں اور ایک بڑی گالی دے کر کہا۔
"تو تم نے کیا بنایا ہڑتال کا۔"
"پولیس کے ذریعے خوب سبق سکھایا اگر انہیں یہ یاد ہو تو پھر کبھی نہیں کریں گے ہڑتالیں۔"
پہلا شریف ذرا آرام سے ہوا۔ سکھ کا سانس لیا اور بائیں آنکھ کو دبا کر کہا۔ "خان بہادر صاحب نے کل خوب نچایا ہے مجھے' تیس ہزار روپے جیت لئے ہیں۔"
"دانہ تھا یا فلاش۔"
"فلاش ہی تھانا۔"

اور میں نے کہا۔ "یہ تو وہ شریف نہیں ہیں Excuse me معاف چاہتا ہوں" اور میں دوسری طرف چلا گیا۔

"خواجہ صاحب خیر تو ہے نا تمہارا بیلنس دن بہ دن ڈی فسٹ ہو رہا ہے" اس دوسرے میز پہ دو خوش پوش نوجوان بیٹھے تھے۔

"منیجر صاحب نئے نئے کورٹ شپ ہیں' پیسے جب خرچ نہ ہوں تو بنے گا کیا" اس ایک شریف آدمی نے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔

"کیا کوئی نئی ہے؟" منیجر صاحب نے پوچھا۔

"نئی کیا ہے بیڑہ غرق کر دیا ہے ایک سو بیس روپے کی ساڑھی کل ہی بھجوائی تھی۔"

اور میں اچھلا جیسے کہ بچھو نے مجھے ڈنک مارا ہو شاید مجھے اپنی چھوٹی بہن کا دوپٹہ یاد آگیا ہو۔

میں کھانسی کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

"میں نے دس ہزار روپے کمشنر صاحب کو دیئے ہیں سینما مجھے الاٹ کرے گا۔"

وہاں ایک بڑی توند والا شخص اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوسرے شریف شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

"نجم کہتا ہے کہ میں نے تیرہ ہزار روپے دے دیئے ہیں۔"

اس شخص نے آہستہ بولتے ہوئے کہا۔

"نجم! اور میرے ساتھ مقابلہ! وہ چاہتا ہے کہ میں اسے اگلے روز بھرے بازار میں بے عزت کروں۔"

اور میں اس میز کو بھی چھوڑ کے ہٹا۔

یہ کیسے شریف ہیں میں نے سوچا ہزاروں سے تو کم باتیں نہیں کرتے۔

"صدیقی صاحب! کل ناچ' میں ممتاز کے ساتھ بہت چھیڑ چھاڑ کی۔"

"میں نے تو ایسی غیر شریفانہ حرکات نہیں کیں میں تو شراب کے نشے میں تھا۔"

اور ایک دم ایک ہی بار میں چائے کا پیالہ منہ میں انڈیل لیا ایک ترش اور بدبو ڈکار لے کر مجھے تیز تیز نظروں سے دیکھا۔

اور جب میں ایک اور میز کو جانے ہی کو تھا کہ ایسوسی ایشن کا سیکرٹری بول رہا تھا۔

"میں شہر کے شرفاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہماری دعوت پر اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیا اور یہاں آنے کی زحمت گوارا کی۔"

سامنے والی سڑک پر جب سارے دن کے بھوکے پیاسے مزدور اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو تار کے اس جانب چند لمحوں کے لئے رک گئے' چائے کی میزوں اور اپنی بے بسیوں کو دیکھ کر زبانوں کو اپنے لبوں پر پھیرا اور روانہ ہو گئے۔

میں اس وقت یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سارا وطن ایک بڑا ہوٹل ہے جس کے دروازے پر لکھا ہوا ہے۔

"صرف شرفاء کیلئے"

(پشتو سے ترجمہ پرویز مہجور خویشگی)

منظور بلوچ

ہائے غریبی

نیکو ابھی دو سال کا بچہ تھا۔ کہ اس کے والدین ایک حادثہ میں فوت ہو گئے۔ نیکو چند لمحے اپنے والدین کی جدائی میں رویا مگر عموماً صغر سنی میں ایسے زخم بہت جلد مندمل ہو جاتے ہیں۔ نیکو بھی کم سنی کی وجہ سے اس سانحہ جانکاہ کو بھول بھال کر اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ بظاہر تو اس عالم بے ثبات میں نیکو کا کوئی مخلص پرسان حال نہ تھا۔ ہر چند کہ نیکو کے والد کا ایک برادر یوسف تھا اسے نیکو سے تو کوئی ہمدردی نہ تھی لیکن لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے بادل ناخواستہ وہ اپنے یتیم بھتیجے کو گھر لے گیا۔ پہلے تو اس کی سنگ دل بیوی چلا کر کہنے لگی "کیا تم نے یہاں یتیم خانہ بنانا ہے۔" اس کے میاں نے جواب دیا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ آپ صبر سے کام لیں۔ دو تین سال کے بعد اسے ریوڑ کے ساتھ بھیجیں گے۔ ارے نیک بخت خدا کا شکر کریں کہ مفت کا نوکر ہاتھ لگا ہے۔" یہ سن کر اس کی بیوی کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم بکھرا اور وہ خاموش ہو گئی۔

اب نیکو اپنے چچا کے گھر رہنے لگا۔ چچا کے بچے اسے بات بات پر مارتے تھے۔ اور وہ بیچارہ معصومانہ انداز میں احتجاج بھی کرتا لیکن اکثر و بیشتر احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوتا دن گزرتے گئے اور نیکو بڑھتا رہا۔ چچا بیچارہ ہر وقت اس انتظار میں تھا کہ خدا جانے نیکو کب ریوڑ چرانے کے قابل ہوگا۔ تاکہ وہ اس کی مشقت سے مالی منفعت حاصل کرے۔ نیکو بھی یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ساتھ اپنوں کا سا سلوک نہیں کیا جارہا۔ بلکہ اسے غلام بے دام سمجھا جارہا ہے۔ اس لئے نیکو بھی ان سے چھٹکارا چاہتا تھا۔

اسی گاؤں میں ایک وڈیرہ رہتا تھا پورے علاقے میں اس کی دھاک تھی۔ اس کا ایک بیٹا تھا جو انتہائی بزدل اور احمق ہونے کے باوجود سب پر اپنی فوقیت ظاہر کرتا تھا۔ تمام بچے اس سے ڈرتے تھے۔ اور وہ ہمیشہ من مانیاں کرتا تھا۔ ویسے تو وڈیرے کا بیٹا کسی بڑے شہر میں زیر تعلیم تھا۔ گاہ بگاہ چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے گاؤں آتا تھا اس کی آمد پر قرب و جوار کے تمام لوگ وڈیرے کے گھر آتے اور مختلف قسم کے تحفے تحائف لاتے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کل یہی لڑکا یہاں کا سربراہ بنے گا۔ اب نیکو کے معصوم دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ کہ اس کے ساتھ بھی لوگ یہی سلوک کریں جو وڈیرے کے بیٹے کے ساتھ کرتے ہیں لیکن اس بیچارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ وڈیرے کے بچے چاہے فاتر العقل بھی کیوں نہ ہوں ہمیشہ وڈیرے ہی بنتے ہیں اور سماج میں وہی اچھے سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

نیکو کے گاؤں میں ایک خدا ترس آدمی رہتا تھا۔ وہ نیکو کی زبوں حالی اور بے سروسامانی پر ہر وقت دل میں کڑھتا اور یہ سوچتا رہتا تھا کہ کیوں نہ اس یتیم کو شہر میں لے جاکر یتیم خانے میں داخل کرا دیا جائے تاکہ یہ زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک مفید شہری بن جائے۔ کئی دن تک وہ اس ذہنی ابتلاء میں جتلا رہا۔

آخر کار ایک رات جب نیکو اور اس کے تمام گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس خدا ترس آدمی نے نیکو کو اٹھا کر شہر کا رخ کیا رات بھر چلنے کے بعد صبح اذان کے وقت وہ شہر میں داخل ہو گئے اور سیدھے ایک جاننے والے صاحب ثروت کے گھر گئے۔ دستک دینے پر صاحب خانہ باہر آیا سلیک سلیک کے بعد اس خدا ترس آدمی نے نیکو کے متعلق داستان سنا دی۔ اور اسے چھپا کر یہاں لانے کا مدعا کہا وہاں کیا۔ خندہ پیشانی سے ان کو اپنی بیٹھک میں لے گیا اب نیکو کی آنکھ کھل چکی تھی۔ اور وہ خود کو اس اجنبی ماحول میں پاکر اول تو سہم گیا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس کے لئے تو پوری دنیا ہی اجنبی ہے پھر اس دن نیکو نے شہر کی خوب سیر کی فلک بوس عمارتیں سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک اور بازاروں کی لہر بہر دیکھی۔ دوسرے دن نیکو کو ایک یتیم خانے میں داخل کرا دیا گیا۔ یتیم خانے کا ماحول نیکو کو پسند آیا کیونکہ وہاں طبقاتی تضاد نہیں تھا۔ اب نیکو نے باقاعدگی سے لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے مشفق اساتذہ نے بتایا کہ غریب بچے ہمیشہ اپنی محنت کے بل بوتے پر تحت الثریٰ سے اوج ثریا تک جاتے ہیں۔ لیکن امراء کے بچے سفارش کے زور پر اچھے عہدوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس لئے نیکو نے یہ سوچ کر پڑھنے پر خوب توجہ دی کہ شاید کبھی اسے بھی محنت کا پھل مل جائے۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے آخر کار وہ دن بھی آگیا جس دن نیکو نے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا پھر کالج میں بھی نیکو نے محنت شاقہ کی اور اس محنت کی بدولت ایف ایس سی بھی امتیازی نمبروں میں پاس کر کے زرعی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا وہاں پر بی ایس سی اور ایم ایس میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی وجہ سے اسے امریکی یونیورسٹی میں PHD کرنے کے لئے داخلہ مل گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ امریکی یونیورسٹیوں میں مخلوط نظام تعلیم رائج ہے لڑکوں کے شانہ بشانہ زہرہ جمال لڑکیاں بھی قیامت سامانیوں کے ساتھ کمرہ جماعت میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ ان مرمریں جسموں کو دیکھ کر "سکون رنداں کا پوچھنا کیا سکون زاہد ہے پارا پارا۔" یہاں امراء کے بچے صرف عشق و محبت کرنے کے لئے آتے ہیں کیونکہ وہ لوگ مالی طور پر آسودہ حال ہوتے ہیں انہیں تو وقت گزارنے کے لئے کوئی مشغلہ چاہیے۔ تاہم نیکو کو اپنی غربت کا احساس تھا اس لئے وہ ان کافر جوانیوں سے ہمیشہ کنی کتراتا رہا۔ اور اس نے حصول تعلیم پر پہلے سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دی اس کا خیال تھا کہ وہ ایک زرعی ڈاکٹر بن کر اپنے ملک و قوم کی خدمت کرے گا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وطن واپس ہوتے ہی اس پر ملازمت کے دروازے خود بخود کھول دیئے جائیں گے۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

وقت مقررہ پر نیکو نے PHD کے تحقیقی مقالات یونیورسٹی میں جمع کرا دیئے یونیورسٹی نے اسے PHD کی ڈگری سے نوازا اب وہ نیکو سے ڈاکٹر نیک محمد بن چکا تھا۔

چند دن کے بعد وہ ڈگریوں سمیت اپنے ملک میں آگیا۔ اور اس نے آتے ہی ملازمت کے لئے ادھر ادھر کوششیں کی لیکن کئی سال گزرنے کے باوجود ڈاکٹر نیک محمد کو کہیں بھی ملازمت نہ مل سکی۔ کیونکہ وہ کسی وڈیرے کا بیٹا نہیں تھا۔

اس پر ہوائے دل کا اثر دیکھنا تو ہے
ہونا تو خیر کیا ہے، مگر دیکھنا تو ہے

وہ ہے سو ایک منزلِ موہوم ہی سہی
ہم ہیں سو ہم نے خوابِ سفر دیکھنا تو ہے

کرلے گا اعتبار ہمارا بھی ایک دن
کچھ روز اس نے عیب و ہنر دیکھنا تو ہے

یہ چشمِ وا کشادہ خود اپنی سزا ہے اب
جو کچھ دکھائے شام و سحر دیکھنا تو ہے

اس کی بھی پیروی ہمیں لازم سہی، مگر
اپنا بھی ہم نے نفع و ضرر دیکھنا تو ہے

جو بھی وقوعِ وصل تھا سب پر ہے آشکار
بنتی ہے کس طرح سے خبر، دیکھنا تو ہے

بے موسے گلاب کھلاتے رہے ہیں ہم
اب خواہشوں کو خاک بسر دیکھنا تو ہے

آگے کی طرح چلتا ہے بے سمت ہی، ظفر
پھر بھی، نشانِ راہگزر دیکھنا تو ہے

انور شعور

کب آئے گی آپ کی سواری
اک عمر گزر گئی ہماری

مابینِ امید و نا امیدی
آتے ہیں خیال باری باری

دل چھوڑ کے وہ گیا ہے جب سے
سینے پہ ہے کوئی بوجھ طاری

رونے پہ مرے نہ مسکراؤ
یہ حال نہیں ہے اختیاری

انسان کو گھر نصیب ہو تو
جاگیر ہے کائنات ساری

غم جان کے کیا کروگے صاحب
آسان نہیں ہے غم گساری

سو دکھ ہیں شعور زندگی میں
پھر بھی ہمیں زندگی ہے پیاری

کتابِ عمر میں ہر ایک جا اداسی ہے
متن سفید، سیہ حاشیہ اداسی ہے

اترتی جاتی ہے جو تہہ بہ تہہ اندھیروں سی
کچھ ایسی مرحلہ در مرحلہ اداسی ہے

بہت اداس ہوں ہر ایک شے کو پا کر بھی
یہ انتہائے سکوں کی عطا اداسی ہے

ترے نہ ہونے سے ہر شے ہے آج افسردہ
تو کل ملا تھا یہ اس کی سزا اداسی ہے

عذاب ہے سفرِ زیست مجھ اکیلے کو
جو تو نہیں تو بھرا راستہ اداسی ہے

ملا نہ ہاتھ، تجھے بھی اداس کر دیں گے
ہمارے ہاتھ پہ لکھا ہوا اداسی ہے

ہے ہمرکاب کوئی اجنبی زمینوں میں
رفیقِ راہ کوئی آشنا اداسی ہے

مسعود منور

شمارِ وقت نیا ہے نہ کوئی سال نیا
کہاں سے حرف میں آئے کوئی خیال نیا

ہر ایک شے ہے پرانی نظر سے منظر تک
نہ تیرا حسن نیا ہے نہ میرا حال نیا

یہ تیرے کاغذی پھولوں کے رنگ و بو سراب
یہ مجھ غریب پہ احساں ترا کمال نیا

وہ ایک خواہشِ کہنہ، وہ خوابِ شامِ وصال
نہیں ہے عشق کے مقدور میں سوال نیا

نئے برس کی مبارک یہ رسمِ اہلِ جمال
یہ مجھ کو سحر میں رکھنے کا ایک جال نیا

ترے جوار و جوانب میں دھند ہے مسعود
سمائے ذہن پہ سورج کوئی نکال نیا

محمد خالد

کہ گوشِ ہوش کوئی، زیرِ آسماں بھی نہیں کیا؟
صدا کروں مرے بس میں مری زباں بھی نہیں کیا؟

بتاؤ کیسے اسیرِ فراغ ہو گئے ہم لوگ؟
ہمارے کھینچنے کو رنجِ رائیگاں بھی نہیں کیا؟

بس ایک گوہرِ کم یاب ہے یقینِ محبت
مگر ہمارا مقدر کوئی گماں بھی نہیں کیا؟

خبر یہی ہے کہ رُک جائے گی زمین کی گردش
دوامِ ہجر کی رہ میں یہ کارواں بھی نہیں کیا؟

دیارِ عشق میں آتش نصیب ہوں کہ نہیں ہوں
نصیبِ چوبِ شکستہ فقط دھواں بھی نہیں کیا؟

غلام محمد قاصر

بن سے فصیلِ شہر تک کوئی سوار بھی نہیں
کس کو بٹھائیں تخت پر گردِ غبار بھی نہیں

برگ و گل و طیور سب شاخوں کی سمت اُڑ گئے
قصرِ جمال پناہ میں نقش و نگار بھی نہیں

سائیوں کی زد میں آ گئیں ساری غلام گردشیں
اب تو کنیز کے لئے راہِ فرار بھی نہیں

میلے لباس کی دعا پہنچے شبیہہِ شاخ تک
شاہوں کے پائیں باغ میں ایسا مزار بھی نہیں

کل ہمہ تن جمال تھے آئینے حسبِ حال تھے
سنتے ہیں اب وہ خال و خد عکس کے پار بھی نہیں

غلام حسین ساجد

ابھی میرے جلو میں ایک ایسا آدمی ہے
جسے میری رعایا مجھ سے بڑھ کر چاہتی ہے

ضروری ہو گیا ہے اب اسے معزول کرنا
وفا میں اور امورِ سلطنت میں دشمنی ہے

نہیں جچتی فقط آنکھیں کھلی رکھنے سے دنیا
کہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ مانگتی ہے

حکومت کر نہ پاؤں گا زیادہ دیر تک میں
مری شمشیر بھی میری مخالف ہو گئی ہے

گریزاں ہے ابھی تک جنگ لڑنے سے عدو بھی
میں سمجھا تھا مرے لشکر میں جرأت کی کمی ہے

لڑائی لڑ رہے ہیں اپنے اپنے نفع کی سب
اسی کا نام دنیا ہے، یہی تو زندگی ہے

نہیں تختِ شہی یہ سیج کانٹوں کی ہے ساجد
جہانبانی وجودِ صبر و راحت سے تہی ہے

ستار سید

خیالِ زہرہ و مریخ و مشتری تھا بہت
زمیں سے ربطِ نشیں زاد سرسری تھا بہت

کوئی شریعتِ اہلِ ہوس نہ تھی درکار
جہانِ عشق کو دستورِ دلبری تھا بہت

رہے گی نقش بہ دل اس کی یاد بھی ہم کو
یہ تیرا عہدِ توجہ کہ سرسری تھا بہت

ملی جو رخصتِ پرواز ایک عمر کے بعد
تو عصفیروں کو احساس بے پری تھا بہت

وہ ایک قافلۂ مور تک نہ روک سکی
جہاں میں شہرۂ سدِ سکندری تھا بہت

سوادِ کذب میں حق گوئی فرض جب ٹھہری
وہ چپ ہوئے جنہیں زعمِ سخنوری تھا بہت

کمند موج میں آئے تو سانس چھول گئی
وگرنہ یاروں کو زعمِ شناوری تھا بہت

غبارِ رہگزرِ باد بن گئے سیدؔ
وہ ہم سفر جنہیں دعوائے رہبری تھا بہت

قوسِ محراب، زماں اور مکاں
حیرتِ خواب، زماں اور مکاں

اک صدا اور کہیں ایسی ہی
تہہِ مضراب، زماں اور مکاں

آتشِ شوق سے دہکے ٹکڑے
جن سے سیماب، زماں اور مکاں

یہ بھی ہے آنکھ میں، جب ہونے لگے
قریۂ آب، زماں اور مکاں

لامکانی میں کہیں کھوئے گئے
کیسے نایاب، زماں اور مکاں

ہم کہ اس موج میں ہیں، مثلِ حباب
کفِ سیلاب، زماں اور مکاں

جاوید اختر

ایک ظلمت سے نکلتا ہوا دل
صبحِ پُرنور میں ڈھلتا ہوا دل

اک فلک ہے کہ تمنا کا غبار
ایک سورج ہے کہ جلتا ہوا دل

ایک دنیا ہے کہ دانش کا سراب
ایک پاگل ہے کہ ہنستا ہوا دل

ایک زنداں ہے کہ تقدیرِ حیات
ایک زنجیر کہ روتا ہوا دل

اک سمندر کہ غمِ دل کا سکوت
اک سفینہ ہے کہ بہتا ہوا دل

ایک ذرّہ کہ کسی خاک میں گُم
اک ستارا کہ چمکتا ہوا دل

ایک شعلہ ہے کہ آنچل سرِ بام
ایک آنگن کہ سلگتا ہوا دل

ایک کیاری ہے کہ بکھرے ہوئے رنگ
ایک تتلی ہے کہ اُڑتا ہوا دل

ایک آمد ہے کہ اندازِ بہار
ایک رُخصت ہے کہ جاتا ہوا دل

ایک جنت ہے کہ خوشبوئے وطن
اور اک شہر کہ جلتا ہوا دل

قمر رضا شہزاد

کشادہ رستوں، کھلے جہانوں سے آ رہا ہوں
میں خاک کی سمت آسمانوں سے آ رہا ہوں

ابھی تو آغازِ جنگ ہے اور تمھیں خبر کیا
میں فتح کی سمت کن بہانوں سے آ رہا ہوں

جو آگ اور آفتاب کو جانتے نہیں ہیں
میں ایسے تاریک تر مکانوں سے آ رہا ہوں

میں جانتا ہوں مرا ہدف کون ہے یہاں پر
مجھے خبر ہے میں کن کمانوں سے آ رہا ہوں

بدلتا جاتا ہوں راستہ اور لباس شہزاد
میں اک زمانہ کئی زمانوں سے آ رہا ہوں

اخراج

طلسمِ شعر عجب مجھ پہ وار کرتا رہا
میں ایک سطر کو ہالہ شمار کرتا رہا

غبار شکل بناتا تھا، گرد روتی تھی
جنوں بھی کیا پسِ گرد و غبار کرتا رہا

تمام شب مری حبس و ہوا سے جنگ رہی
میں ایک تیر سے دو غم شکار کرتا رہا

مجھے متاعِ انا تک نہ اس نے واپس کی
مگر میں اس کی زمیں واگزار کرتا رہا

بجھا گیا ہے یہی حرفِ اعتراف مجھے
چراغ تھا تو اندھیروں سے پیار کرتا رہا

اطہر ناسک

میں کیسے قتل ہوا، منکشف نہیں ہوتا
جبینوں سے مگر منحرف نہیں ہوتا

بدن کو حجرۂ وحشت تپاں بناتا ہے
کسی کے سائے میں اب معتکف نہیں ہوتا

امیرِ شہر سے میں لاکھ منصفی چاہوں
کسی طرح بھی اسے معترف نہیں ہوتا

مجھے تراش کے رکھو نہ تم نمائش میں
میں قیدِ سنگ میں ہوں منکشف نہیں ہوتا

یہ عہد، عہدِ بغاوت ہے کاذبوں کے خلاف
کہ سچ کو غار میں اب معتکف نہیں ہوتا

مرے بھی سر کو نہیں جھکنا ظلم کے آگے
رویہ اس کا بھی کچھ مختلف نہیں ہوتا

ہم انعکاسِ خدو خال سے نکل آئے!
اور اب نظر سے تری منعطف نہیں ہوتا

ہُوا نہیں ہے یہ ماحول سازگار ابھی!!
بدونِ ذات ابھی منکشف نہیں ہوتا

ابھی یقین دلاتا نہیں تجھے اپنا!!
ترے گماں سے ابھی مختلف نہیں ہوتا

سنی سنائی پہ رکھنا نہیں یقین کبھی
کہے ہوئے سے کبھی منحرف نہیں ہوتا

مری نظر نے عطا کی ہے تجھ کو بینائی
مرے ہنر کا کبھی معترف نہیں ہوتا

میں لاکھ اپنے قصیدے لکھوں مگر ناسک
علاوہ اس کے کوئی متصف نہیں ہوتا

اقتدار جاوید

غبارِ خاک سے نکلوں گا کیا میں
غبارِ خاک سے نکلوں گا کیا میں

بہشتی پھول کھلتا جا رہا ہے
بہارِ خاک سے نکلوں گا کیا میں

مرا غیبی ستارہ جل بھی جائے
مدارِ خاک سے نکلوں گا کیا میں

مجھے دارِ فنا سے ہے نکلنا
سو دارِ خاک سے نکلوں گا کیا میں

طلسمِ روشنی بھی ہے عجب شے
شرارِ خاک سے نکلوں گا کیا میں

مرے سر پر چھتیں چھائی ہوئی ہیں
حصارِ خاک نکلوں گا کیا میں

عباس تابش

مقامِ تشنگی تک آپ چل کر کیوں نہیں آتا
سمندر سے کوئی پوچھے مرے گھر کیوں نہیں

ذخیرہ تو نہیں کرتا کہیں جنسِ جمال اپنی
ضرورت کے دنوں میں وہ میّسر کیوں نہیں

مری ہم عمر تنہائی نے میرے گھر سے پوچھا ہے
میں در سے کیوں پلٹ جاتا ہوں اندر کیوں نہیں

ہماری تشنگی کب تک رہے گی منتظر اس کی
زمیں میں کوئی چشمہ ہے تو باہر کیوں نہیں

ابھی اس خاک میں اپنی جڑیں مضبوط کرنی ہیں
پھر اس کے بعد سوچیں گے کہ پتھر کیوں نہیں

یہ کس نادیدہ دامن میں چلی جاتی ہے سب محنت
گرے بھی کوئی پھل تو اس زمیں پر کیوں نہیں

بہت اس کو بلاتا ہوں بہت سمجھاتا ہوں لیکن
یہ آئینے میں بیٹھا شخص باہر کیوں نہیں

محبت اور محبت میں کشش کیونکر نہیں تابش
سمندر کی طرف کوئی سمندر کیوں نہیں

انجم سلیمی

مرا عروج ہے اپنے زوال سے باہر
ٹھہر گیا ہوں کہیں ماہ و سال سے باہر

مجھے پلٹنا ہے اک روز اپنے فردا میں
نکالنا ہے گزشتہ کو حال سے باہر

گذارنی ہے کوئی عمر چشم و دل کے بغیر
پڑی ہوئی ہے جو خواب و خیال سے باہر

چمک اٹھی ہے پسِ آئینہ مری مٹی
نکل گیا ہوں کسی کی مثال سے باہر

وہی ہے آخری حد جو ہے نقطۂ آغاز
جواب کچھ بھی نہیں ہے سوال سے باہر

ہوا سے پوچھ رہا ہوں سنور گیا کیسے؟
جو عکس تھا مرے دستِ کمال سے باہر

تصدق شعار

ایک صورت مرے کمرے میں فقط ضو کی ہے
جگمگاہٹ سی جو آنچل میں رُخِ نو کی ہے

کیا اسے زندگی کرنا ہی کہا جائے گا
زندہ رہنے کی جو مرمر کے تگ و دو کی ہے

کچھ تو آیا ہے ادھر حدِ نظر میں اُس کی
میں بھٹک جاؤں یہ مرضی مرے ہمرو کی ہے

جیسے بنیادِ ضیا کوئی میسّر آ جائے
دیپ نے تیری ہتھیلی پہ بڑی لو کی ہے

کتنے احسان ہیں اس پر بھی زمانے بھر کے
ایک روٹی مری قسمت میں اگر جو کی ہے

آبگینہ سا وہ پیکر نہ ہو کیوں چٹکا چور
تیر جیسی جو نظر اس پہ کئی سو کی ہے

غلام جیلانی اصغر

ملاقات

کل جب میں ایک صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے ہاں پہنچا تو ملازم نے مجھے بتایا کہ صاحب غسل خانہ میں ہیں۔ میں نے یونہی بر سبیل اشتیاق سوال کر دیا کہ غسل خانہ کہاں ہے۔ ملازم کو گمان گزرا کہ شاید میں غسل خانہ کی تنہائی میں صاحب موصوف سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں' حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ غسل خانے کے جغرافیائی کوائف کے متعلق سوال تو محض میری Curiosity کا اظہار تھا۔ لیکن ملازم کے چہرے سے برہمی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ملاقات کتنی ہی بے ضرر کیوں نہ ہو اس میں اختلاف کے کچھ پہلو ضرور نکل آتے ہیں۔ اس لئے عقلمند حضرات (ممکن ہے اس میں خواتین بھی شامل ہوں) ملاقات سے بہت پہلے وقت' مقام' موضوع گفتگو اور موڈ کا تعین کر لیتے ہیں اگر اس اہتمام میں کوئی کمی رہ جائے تو نتیجہ تسلی بخش نہیں ہوتا۔ اکثر ملاقاتیں اس لئے بھی ناکام ہو جاتی ہیں کہ فریقین کو ایک دوسرے کے چہرے یا ملبوسات پسند نہیں آتے خواتین اس معاملہ میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ مجھے اس منگنی کا بہت دکھ ہے جو محض اس لئے ٹوٹ گئی کہ ہونے والی دلہن کا رنگ اس کے لباس سے میچ نہیں کرتا تھا۔ خیر پسند اپنی اپنی۔

ملاقات دراصل دو اشخاص کا محض ملنا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ دو انفاس (آپ اسے نفوس بر وزن خلوص بھی پڑھ سکتے ہیں) کا اتصال ہوتا ہے۔ ممکن ہے آپ یہ نکتہ نہ سمجھے ہوں۔ میں وضاحت کئے دیتا ہوں۔ دنیا میں ہر شخص ایک گمنام اکائی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے راشد کے ہاں لا مساوی انسان ہے۔ آپ یہ تو جانتے ہیں کہ لا کا وجود مفروضی ہے۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں۔ لا اس وقت تک بے وقار رہتا ہے جب تک دوسرے پلڑے میں کوئی ہم وزن شے نہ رکھی جائے مثلاً لا مساوی انسان۔ اگر آپ محسوس کریں کہ انسان غیرضروری طور پر وزنی ہے اور پلڑے میں نہیں آ سکتا' تو آپ اس میں کوئی غیرجانبدار شے بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس سے لا کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لا کا وجود محض ریاضی یا لسانیات کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ یہ ہماری روز مرہ زندگی کا ایک لازمی اور اہم جزو ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ہم سنجیدہ گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو ہم ایک بیکار شخص کو محض بیکار نہیں کہتے (کیونکہ اس طرح اس سے کئی مفہوم برآمد ہوتے ہیں لیکن ہم ایسے شخص کو لا شے کہتے ہیں۔ اور جونہی آپ کسی کے متعلق یہ کلمہ خیر سنتے ہیں تو آپ اس سے قطعی طور پر مایوس ہو جاتے ہیں' نہ اسے ملاقات کا شرف بخشتے ہیں' نہ اسے اپنے ہاں دعوت میں مدعو کرتے ہیں' نہ ہی اس کی دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر کہیں سرراہ اس سے گفتگو کا موقع نکل آتا ہے تو آپ اسے میر تقی میر کی طرح دو ٹوک الفاظ میں کہتے ہیں "سر راہ گفتگو شرفاء کا شیوہ نہیں۔" اب اس وضاحت سے آپ کو لفظ کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ لفظ محض لفظ ہی نہیں بلکہ از خود وجود ہے۔ لفظ

اشیاء کا کردار متعین کرتا ہے۔ یعنی وہی شخص جو بے چہرہ تھا' ایک مناسب لفظ کے استعمال سے ایک واضح شکل میں نمودار ہو جاتا ہے اور آپ کی ساری محبت یا نفرت آپ کے رویہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اب وہ چہرہ بدلے' نئے سے نیا سوٹ پہنے' ماڈرن حیثیت کے اظہار کے لئے لمبی داڑھی بڑھائے یا بال کٹوائے۔ آپ سے مسکرا کر بات کرے' یا اپنی گردن میں ذرا سا افسرانہ خم دے کر آپ کے وجود سے انکار کردے۔ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان سے ملتے ہی اس کی لاشیت آپ کے سامنے اس کا Persona بن کر دیوار چین کی طرح کھڑی ہو جائے گی اور یہ Persona اتنا حقیقی ہوگا کہ اس کی اصلی شخصیت اس کے عقب میں چھپ جائے گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ چھپی ہوئی شخصیت سے ملاقات کیسے ممکن ہے؟

ملاقات! جیسے میں نے ابھی عرض کیا ہے' دو انفاس کا مکمل اتصال ہے۔ اگر یہی صورت پیدا نہ ہو تو ملاقات میں اجنبیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ملاقات اسی وقت باثمر ہوتی ہے جب دونوں طرف معقول اور شریف نفوس ہوں' جو ایک دوسرے کی طبعی ضروریات سمجھتے ہوں۔ ایسی صورت میں گفتگو فورا I see کے محدود دائرے سے نکل کر معانقے کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہی دو غیر وابستہ اشخاص جو صرف نصف گھنٹہ پہلے اجنبی اور غیر متعلق نظر آتے تھے' اب ایسے شیر و شکر ہو جاتے ہیں کہ یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ شیر کہاں ختم ہوتا ہے اور شکر کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ دو قطبین ایک مقناطیسی قوت کے تحت ایک دوسرے سے ایسے چمٹ جاتے ہیں کہ حرکت ان کے باہمی ربط میں اضافہ کرتی جاتی ہے۔ ایک شخص جب چائے دانی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو دوسرا از خود شکر دان اٹھا لیتا ہے اور بڑی محبت سے پوچھتا ہے۔ ایک یا دو' "بس نصف" دونوں میں Free masonry کا ایک ایسا رشتہ استوار ہو جاتا ہے جہاں لفظ کا نصف حصہ' آنکھ کا ہلکا سا اشارہ' سر کی غیر محسوس جنبش گفتگو کی ساری وضاحتوں کا ماحصل بن جاتی ہے۔ دونوں جانب سانس بیک وقت چلنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو اجنبی سینوں میں ایک ہی دھونکنی سپلائی لائن کا کام کررہی ہو۔ ایسی ملاقات شاعری اور تصوف کی زبان میں وصال کہلاتی ہے۔ یعنی تاکس نہ گوید بعد از من دیگرم تو دیگری۔

ایک زمانے میں ملاقات کو ڈپلومیٹک سطح پر بڑی اہمیت حاصل تھی۔ برسوں ملاقات کا وقت طے کرانے میں گذر جاتے' سفیروں کا باقاعدہ تبادلہ ہوتا' تحفے تحائف بھیجے جاتے' لیکن جونہی طے شدہ ملاقات کا وقت قریب ہوتا تو خاندان کا کوئی فرد اس ملاقات میں اس لئے شامل ہونے سے انکار کر دیتا کہ اس سے ابتدائی مراحل میں مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ لیکن اب تو ملاقات کا مزاج انتہائی غیر رسمی ہو گیا ہے۔ یعنی آپ گھر سے سبزی گوشت خریدنے نکلتے ہیں اور بر سبیل ارتجال کسی دیرینہ دوست سے بھی مل آتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آدمی قصائی اور ہمسائی کے مابین فرق کو ہی نظر انداز کردے۔ ایسی ملاقاتوں پر تو تلافی مافات کا گمان ہوتا ہے۔ میرے زمانہ شباب میں (جو خط استوا کی طرح ایک مفروضی زمانہ ہے) ملاقاتوں کا ایک طریق کار تھا۔ ایسے موقعوں کے لئے آداب و تکلفات کا ایک باقاعدہ کوڈ تھا بلکہ لباس' گفتگو' وضع قطع کا اپنا ایک منفرد رنگ تھا۔ شرفا کے ہاں تو ملاقات کے لئے چہرہ بھی الگ تھا' جو عام طور پر شیروانی کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ چنانچہ جب آدمی گھر سے ملاقات کے لئے نکلتا تھا تو سارے محلے کو اس کا علم ہوتا تھا۔ عزیز و اقرباء ملاقاتی کو اس طرح رخصت کرتے تھے۔ جیسے گھر سے لڑکی کو رخصت کیا جاتا ہے۔ اور جب ملاقاتی اپنی یاترا سے واپس آتا تو لوگ یا ضیافت پر آتے تھے یا عیادت کے لئے۔ اس دور میں ہر ملاقات انسانی سائیکی کے لئے ایک

یادگار تجربہ۔ ایک نادر واقعہ ہوا کرتی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے پورس اور سکندر کی ملاقات۔

ہمارے آبائی کتب خانے میں جو احوال الآخرت 'نورنامہ' قصہ یوسف زلیخا اور لکھمی رام کے بارہ ماہ پر مشتمل تھا' ایک نہایت قیمتی کتاب ہمہ وقت جزدان میں پڑی رہتی تھی۔ اس کے ابتدائی اوراق تو کثرت مطالعہ سے ناپید ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے باہر ایک سفید ورق پر میرے دادا مرحوم نے "انگریزوں سے ملنے کے آداب" جلی قلم سے لکھ دیا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک عرصہ تک اس کا مصنف موضوع گفتگو رہا۔ میرے دادا مرحوم کا خیال تھا کہ یہ سرسید کی تصنیف ہے۔ کیونکہ اس کی طرز نگارش سے آثار الصنادید کی بو آتی ہے۔ لیکن میرے والد کا موقف تھا کہ اس کا مزاج مولانا نذیر احمد کے ابن الوقت سے ملتا جلتا ہے۔ بہرصورت ہمارے ہاں اس کتاب کو وہی اہمیت حاصل تھی جو کسی زمانے میں شرفا کے ہاں ڈیل کارنیگی کی تصنیفات کو حاصل رہی ہے۔ جب میں نے ایم اے کر لیا تو مجھے افسر ضلع سے باقاعدہ ملاقات کے لئے تیار کیا گیا۔ اس زمانے میں انگریز ضلع افسر سے ملاقات ایک انتہائی کٹھن اور دشوار مرحلہ تھا۔ چنانچہ مجھے ہفتہ بھر اس کتاب کے مطالعہ سے گزارا گیا۔ میں جب تفصیلی ٹریننگ کے بعد گھر سے روانہ ہوا تو خاندان کے بزرگ بس تک چھوڑنے آئے۔ کچھ خواتین و حضرات جو اس موقعہ کی نزاکت سے ناواقف تھے یہ سمجھے یا تو میں لندن جارہا ہوں یا محاذ جنگ پر (یہ زمانہ ۱۹۴۲ء تھا) میرا رنگ و روپ دیدنی تھا۔ بقول غالب کے چہرہ فروغ مے سے گلستان کئے ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ ملاقات کا وقت کیونکہ ریڈر صاحب کے توسط سے پہلے ہی مقرر ہو چکا تھا اور یوں بھی محاذ جنگ سے اچھی خبریں نہیں آرہی تھیں اس لئے صاحب بہادر نے مجھے فوراً بلا لیا۔ بلندی سے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور میرے شجرہ نسب اور وہبی و اکتسابی علوم کے متعلق کچھ استفسارات کئے جن کا میں نے فر فر جواب دے دیا۔ پھر اس نے میری چھاتی کی مجموعی وسعت کے متعلق انتہائی غیر متوقع اور مخصوص سوال کیا۔ اس زمانے میں میری چھاتی یونہی واجبی سی تھی اور میں یوں بھی مردانہ ضروریات کے لئے چھاتی کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے فوراً بے تکلفی سے جواب دیا۔ بتیس اور ساڑھے بتیس۔ میرا خیال تھا کہ ان اعداد و شمار کا غیر ملکی افسر پر خاطر خواہ اثر ہوگا۔ وہ مسکرایا اور پھر زور سے ہنسا اور خالص انگریزی لہجے میں کہا "you can go"۔ ریڈر صاحب نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ یہ رخصت کا طے شدہ اشارہ تھا۔ میں جب دوسرے دن گھر پہنچا تو مجھے افراد خانہ نے گھیر لیا۔ میرے دادا مرحوم نے ملاقات کے متعلق پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ صاحب نے میرے شجرہ نسب کے علاوہ میری چھاتی کے متعلق خصوصی سوال کیا۔ میرے دادا مرحوم میں بڑی عمدہ حس مزاح تھی کہنے لگے۔

"سالا ٹیلر جو ہوا (ہمارے صاحب ضلع کا نام ٹیلر تھا) خیر کوئی بات نہیں پہلی ملاقات ہے۔" اس وقت تو یہ جملہ مجھے بالکل بے ضرر سا لگا۔ لیکن کئی سال بعد جب میں نے لتا کا وہ گانا سنا جس میں ٹیپ کا مصرع "پہلی ملاقات ہے" تو مجھے دادا جان کی بصیرت اور اس ریلزم کا اندازہ ہوا جو ہمارے ہاں صرف جہاندیدہ بوڑھوں میں پائی جاتی ہے۔ دراصل پہلی ملاقات پہلی ملاقات ہے خواہ وہ ہونے والی بیوی سے ہو' یا کسی افسر سے' علاقہ غیر میں پہلے داخلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں طرف شک و شبہ خوف و ہراس دوسرے پر غالب آنے کی غیر شعوری کوشش' کھلنے نہ کھلنے کی درمیانی کیفیت کارفرما ہوتی ہے۔ برقیات کا ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے کہ بجلی کی ننگی تار آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور پیچھے بھی دھکیلتی ہے۔ لیکن جب آپ کا اس سے آشنائی ہو جائے اور آپ اس کے مزاج سے واقف ہو جائیں تو دونوں طرف ملاپ اور ہم آہنگی

کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ میں خود بجلی کے جھٹکے سے گذر کر عرفان کی اس منزل پر پہنچا ہوں۔ میں [illegible] پہلے ملنے کی ابتدائی سٹیج سے اس مہم کا آغاز کرتا ہوں۔ یہ ملنا عام طور پر رسمی سا تعارف ہوتا ہے جو مزاج شریف کی سرحد پر آکر رک جاتا ہے۔ اگر وہ عام سا آدمی ہو تو کومل سروں میں بات کرتا ہے۔ اگر وہ [illegible] made یا خود ساختہ آدمی ہو تو وہ بلندی سے آپ پر طائرانہ نظر ڈالتا ہے۔ گفتگو کرتے وقت خاص خیال رکھتا ہے کہ اس کی آواز کھرج کے سروں سے نیچے نہ آئے۔ یوں تو مجھے خود ساختہ آدمی پسند ہیں لیکن ان میں ایک نقص ہوتا ہے کہ وہ خود ساختگی کے عمل میں یہ بھول ہی جاتے ہیں کہ اس عمل کو کس مرحلہ پر رکنا ہے۔ یہی غلطی مینار بابل بنانے والوں سے ہوئی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مینار کی عظمت بلندی ہی ہوتی ہے اس لئے وہ مینار کو اتنا اونچا لے گئے کہ ان کا رابطہ الفاظ کی ارضی سطح سے بالکل کٹ گیا۔ اور بالآخر الفاظ کی پہچان ہی گم ہو گئی۔ بڑا آدمی اپنی خود ساختگی کے عمل میں غلط میٹریل پر اتنا وقت صرف کر دیتا ہے کہ اس کی پہچان ہی گم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب آپ اس سے ملتے ہیں تو آپ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ آپ اسے کس جہت سے ملیں۔ وہ اپنی بلندی کے طلسمی گنبد میں قید ہے اور وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کے مکان' اس کے عہدے' اس کے کاروبار' اس کی ذاتی وجاہت کے بارے میں گفتگو کریں لیکن آپ فوراً اس سے سوال کر بیٹھتے ہیں۔ "سناؤ چوہدری جی آجکل بھنڈی دا کے بھاؤ ہے" وہ برہم ہو جاتا ہے کیونکہ آپ نے دانستہ اس کے مینار بابل کو گرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش اتنی احمقانہ ہوتی ہے کہ آپ کی مہم ابتداء میں ہی ناکام ہو جاتی ہے۔ اور ملاقات کا دروازہ آپ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ تعارف کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رہے اور آپ ملاقات کے ایوان خاص میں داخل ہو سکیں تو تعارف کو مختصر رکھیں اور اس کے اندر خوشامد کی ہلکی سی برقی لہر چھوڑیں جو ایک متحرک شعاع نور کی طرح دن بھر صاحب موصوف کا چکر لگاتی رہے۔ اس رسمی افتتاح کے بعد آپ تفصیلی ملاقات کا ڈول ڈالیں لیکن یہ کبھی فراموش نہ کریں کہ ملاقات محض دو اشخاص کا ملنا ہی نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ سے گذرنے کا عمل ہے۔ اس عمل میں کئی ایسے مقامات آئیں گے جب گوش مہجور پیام اور چشم محروم جمال رہ جائے گی۔ لیکن پیمان وفا باندھنے سے بہت پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا صاحب ملاقات سے آپ کی ذہنی وابستگی ہے۔ اگر نہیں تو پھر آپ 'ملنے' پر ہی اکتفا کریں۔

زوار حسین

دنیائے تصویر کی تجریدی جمالیات

تخلیقی فنون میں پائی جانے والی تمام اشکال کو فطری اور تجریدی۔۔۔ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ فطری اشکال میں پودے، جاندار، انسانی شبیہیں اور مختلف عناصر فطرت شامل ہیں۔ یہ اشکال زمانہ قدیم سے مصوری، شاعری اور مجسمہ سازی کا موضوع خاص رہی ہیں۔ ان کا ماحصل فطرت کے پیچ و خم کی نامیاتی کشش اور گداز ہے۔ فطری اشکال کے پہلو بہ پہلو اشکال کا ایک اور قدیم شجرہ ہے جسے تجریدی، جیومیٹریکل اقلیدسی یا میکانکی جمالیات کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے اس شجرۂ اشکال پر ایک تعارفی نگاہ ڈالیں گے۔

تجریدی اشکال، قابل پیائش متعین نظم اور ریاضیاتی صحت و صداقت کی ترجمان ہوتی ہیں
یہ اشکال شاعرانہ حسن ابہام کی بجائے عقلی تیقن، قطعی صراحت اور فیصلہ کن حدود پر مبنی ہوتی ہیں۔

اس شجرۂ جمالیات کا ماخذ جیومیٹری کی سادہ اشکال ہیں۔ یعنی خط مستقیم و منحنی، مربع، دائرہ، مستطیل، مثلث اور بیلن۔

یہ سادہ اشکال ڈیزائن کے ہر عمل میں لازماً موجود ہوتی ہیں اور ان کے باہمی تعامل سے وضع آفرینی کا غیر محدود عمل شروع ہو سکتا ہے۔

یہ اشکال قدیم الا اصل ہیں اور ان کا اظہار و اطلاق ما قبلیاتی فنون سے عہد موجود کے بیشتر اسالیب ہنر پر محیط ہے۔ انھیں یونگ کی اصطلاح میں اجتماعی لاشعور کا سرچشمہ اوضاع خیال کرنا چاہیے۔ بظاہر ان اشکال کی رونمائی ایک بعید از فطرت مقام نظر کا تاثر دیتی ہے۔

یہ اشکال فنی عمل کے ساختیاتی اور ہیئتی مفہوم پر زور دیتی ہیں۔ ان کی نوعیت مکانی ہے اور انھیں کانٹ کی اصطلاح میں "اشکال فہم" تصور کرنا چاہئے۔

انھیں کالرج کے بیان کردہ تخیل اولی سے بھی منسوب کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ اوائلی سطح سے ہی انسانی فہم و تعقل کا نشان رہی ہیں۔

جدید دور کی مکعبی مصوری سے پیشتر ان اشکال کو تصویری سطح کی حدود میں رونمائی کی اجازت نہیں تھی۔ جبکہ نامیاتی اشکال کو تصویر کے مسلمہ اجزائے ترکیبی کا مرتبہ حاصل تھا۔

مکعبی تحریک نے پہلی مرتبہ ان اشکال کے جبلی حسن اور اقلیدسی وقار کو شعوری اور تنقیدی معنوں میں تسلیم کیا۔

جب ماضی بعید میں تصویری سطح کی اپنی باقاعدہ حیثیت متعین نہیں تھی اور یہ سطح عملی طور پر برتنوں

عمارتوں، چٹانوں، غاروں، زیوروں یا لباسوں میں منقسم تھی"۔ اس دور ابتداء میں بھی جیومیٹریکل اشکال اپنا موثر کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ آج جدید دور کے تمام حسنی، افادی اور صنعتی فنون میں ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔

یہ اشکال اپنی ریاضیاتی سرشت کے باعث فن تعمیر اور اس سے متعلقہ آرائشی ذریعوں سے مخصوص تعلق رکھتی ہیں۔

تکنیکی اعتبار سے ان کا تعلق، قالینوں، چٹائیوں اور چنگیروں کی بنت سے ہے۔ لباسوں کی تزئین سے متعلق بھی تمام فنون ان کی زد میں رہے ہیں۔

اس مختصر تعارف کے بعد ہم واپس اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں:۔

ما قبلیاتی چٹانوں کی مصوری ہزاروں برس کا سفر طے کرتے ہوئے رفتہ رفتہ موجودہ "سطح تصویر" تک پہنچی، یہ سطح اپنے مخصوص قوانین اور اوزاری ذرائع سمیت، روشنی، رنگ اور شکل ایسے بصری عناصر کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ بلاشبہ اس ضمن میں تصویری سطح کو اپنی فنی اور جمالیاتی حیثیت میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ لیکن جیسا کہ پیشتر ازیں بیان ہوا۔ مکعبی تحریک سے قبل یہ سطح نامیاتی اشکال کے لئے مخصوص تھی۔ موجہ خیالات کی رو سے مربع، دائرہ یا مستطیل ایسی اشکال کے لئے یہ مناسب نہیں سمجھا گیا تھا کہ وہ ایک شاندار تصویری تجربے کا حصہ بن سکیں۔ اس وقت بالعموم یہ خیال بھی واضح نہیں تھا کہ جیومیٹری کی اشکال فطرت کے تناظر میں مطلقاً" حسین ہیں۔ لہذا دریں حال ایسے تنقیدی شعور اور جمالیاتی نقطۂ نظر کی ضرورت تھی جو فن کی مبادیات اور وضع آفرینی سے متعلق نئے امکانات کو سامنے لائے۔ تاریخ فن کے اس موڑ پر جب فطرت کی سرسری ترجمانی اور "حقیقت" کے فنی بیان سے متعلق جدید کلاسیکی اور مدرسی تصورات میں زوال آچکا تھا۔ "تصویری سطح" ایک نئے سرچشمہ حقیقت اور کائناتی لغت اشکال کی متقاضی تھی جو قدیم گمشدہ کڑیوں کو ملائے اور مقامات اظہار و اثر کو یکسر بدل دے۔ تصویری تناظر کی اس نئی اور گہری مراقباتی خواہش نے " مکعبیت" کی داغ بیل ڈالی۔ جس کا مدعا جیومیٹریکل اشکال کو جمالیاتی فیضان اور فنی اصول تصدیق کے طور پر۔۔۔۔۔۔۔ تصویر کے عالی مقام تجربات میں حصہ گیر بنانا تھا۔

ہمیں معلوم ہے کہ جمالیات سے متعلق بیشتر معروف تصورات، انسان کے شاعرانہ تخیل سے ماخوذ ہیں۔ شاعری جو فطرت کی نامیاتی اشکال سے ربط خفی رکھتی ہے۔ اس کے مہذب لب و لہجے میں حسن آفرینی کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ اور اس نے جس نرم و نازک انداز سے انسانی احساسات کی تربیت کی ہے۔ اس کی تصدیق زندگی کی تمام سطحوں سے ممکن ہے۔ بہ ایں ہمہ شاعری حسن کی وسیع تر اقلیم کا محض ایک لسانی پہلو ہے۔اس سے متصل ایک اور رقبہ اظہار جسے "بصری تجربے" کا عنوان دیا گیا ہے۔ جو افادی فنون کے علاوہ مصوری، مجسمہ سازی اور فن تعمیر سے استفادہ کرتا ہے۔ یہ بصری تجربہ، جن مقامات کی خبر دیتا ہے اور جو کچھ دریافت کرتا ہے، ضروری نہیں کہ شاعرانہ تخیلات اس سے کامل مطابقت رکھتے ہوں۔۔۔۔۔۔ لہذا اکثر تو ایسا بھی ہوا کہ بصری فنون کی جمالیات بیک وقت غیر شاعرانہ، مخالف ادب Anti literary اور بعید از فطرت صورت اختیار کر گئی۔ اس کا بنیادی سبب نامیاتی اور جیومیٹریکل اشکال کا تضاد بصری ہے۔

شاعری کا دستور ہے کہ وہ لاابالی حد تک تخیل سے منسوب روح آزادی پر یقین رکھتی ہے اور پھر یہ روح آزادی حسن کے جو تصورات سامنے لاتی ہیں وہ بصری فنون کی بعض انتہائی منظم، بردبار اور سخت گیر تعلقاتی اشکال سے مناسبت نہیں رکھتے۔" لیکن کیا مربع، مستطیل اور دائرہ ایسی اشکال جو عملی خط کی پیداوار

انھیں اختیار حاصل ہے کہ وہ ایک فطرت سے معکوس سمت پر وضع آفرینی کے نئے انسانی معیار قائم
یں؟ فطرت اپنے نظام تابانی میں لاتعداد ستارے تخلیق کرتی ہے۔ لیکن ایک معمولی چراغ کی ہیئت اس کے
رۂ اختیار سے باہر ہے۔ یہی نوعیت ان تمام تجریدی اشکال کی ہے جن کی وساطت سے انسان اپنی کائنات
ں کو متشکل کرتا ہے۔ اس ضمن میں تجریدی اشکال کی اصولی قدر و قیمت پر اولین اور اہم نکات افلاطون کی
ب ذیل عبارت میں پائے گئے ہیں:۔

"اشکال کے حسن سے میری مراد وہ مفہوم نہیں جو اکثر لوگوں کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ یعنی زندہ
ں یا تصاویر میں بیان کردہ اشکال کا حسن۔"

آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ان سطور میں افلاطون مروجہ تصویری سطح پر پائے جانے والے نامیاتی
ں کو نظر انداز کرتے ہوئے حسین وضعوں کی ایک اور نوعیت کا ذکر کر رہا ہے۔ اب آگے چل کر افلاطون
تجریدی وضعوں کی جمالیات کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"میرے پیش نظر وہ مستقیم و خمدار خطوط یا وہ سطح دار ٹھوس اجسام ہیں جو خراووں' پیانوں اور گنیوں
مدد سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس نوع کی اشکال محض اضافی طور پر ہی خوبصورت نہیں ہوتیں۔ یعنی ان کا
کسی وجہ استعمال' مقصد یا باہمی تعلق پر موقوف نہیں۔۔۔ بلکہ یہ اشکال دائمی' خلقی اور مطلق طور پر
ن ہیں۔"

کسی عمل تجرید یا جیومیٹری سے حاصل کردہ اشکال اور ان کے حسن مطلق پر یہ وضاحتی بیان۔۔۔۔
ی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ نظریہ افلاطون کو تجریدی جمالیات کا ذہین ترین مبصر اور جدید دور میں ریاضیاتی
. کے تمام اسالیب مصوری کا نظریاتی پیش رو ثابت کر رہا ہے۔ تاہم افلاطون کے اس نقطۂ نظر کو اتفاقی یا
تی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ حسن کو ریاضیاتی اشکال سے منسوب کرنے کا رجحان قدیم یونان کے تعلقاتی
ں کا بااصول نتیجہ ہے۔ یونان میں حسن تناسب سے بھی یہ مراد نہیں تھا کہ ایک فرد اپنے ذاتی وجدان کی
پر جو کچھ چاہے فرض کر لے.......... غالباً" یونانی واحد تہذیب ہے جس میں ہندسی اشکال کا مطالعہ
ات کے نقطہ نظر سے کیا گیا۔ یہ دریافت کرنا کہ اشیاء کے اجزائے ترکیبی میں جو وپذیر نسبتیں موجود ہوتی
' انھیں اعداد کے ذریعے قطعی مفہوم کے طور پر کیسے متعین کیا جا سکتا ہے؟ اس عہد کے ہندسی علم کا اہم
امہ تھا۔ یونانیوں نے تناسب اجزاء کی اصطلاح کو قطعی اور باقاعدہ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس شعبہ
کا عنوان Golden section ہے۔ لاطینی زبان میں اسے "تناسب جاریہ" بھی کہا گیا۔ حسن کے اس
ن عقلی سے قطع نظر اب ہم پھر افلاطون کی ہدایت کردہ ریاضیاتی اشکال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ایک
ان عجیب و غریب نقوش پر ڈالتے ہیں جو اس وقت جدید دنیائے تصویر کی شناخت بن چکے ہیں۔

تجریدی جمالیات کا باقاعدہ آغاز مکعبی تحریک کی معرفت ہوا۔ اس تحریک کا معنوی تعلق ہیئت گری
ہے۔ کیونکہ یہاں روشنی' رنگ اور سائے ایسے متغیر عناصر کی نسبت تعلقاتی اور تجزیاتی خاکہ سازی کو
، اہمیت دی گئی۔ سیزان اولین مصور ہے جس نے قدرتی اشیاء کی تہہ میں پائے جانے والے ریاضیاتی حسن
تصوری طور پر محسوس کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر قدرتی اشیاء کی تحلیل کی جائے تو وہ بالآخر بیلن' قرص
مخروط میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مغربی ناقدین نے سیزان کی تصاویر کے مفصل' متانت و ذہانت آفرین
یے کئے ہیں۔ یہ عظیم مصور جسے جدید مصوری کا امام کہا گیا۔ فی الحقیقت تصویر کی سطح پر افلاطونی فکر کے

ان راستوں پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو ریاضیاتی جمالیات کے حسن مطلق کی طرف جاتے ہیں۔

ازاں بعد مکعبی تحریک نے پہلی مرتبہ جیومیٹری کی اشکال کو دنیائے تصویر کے باعزت اجزائے ترکیبی کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے انسانی معیار توجہ اور مذاق فن میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کی۔ پکاسو اور براک نے مکعبی خاکہ سازی کی جو روایت قائم کی۔ اس کی نوعیت فطرت اور جیومیٹری کے مابین خیال انگیز مکالمے ایسی تھی۔ جس میں دونوں فریقین باہم تربیت پاکر موجود رہتے ہیں۔ فطرت کا تصور بجائے خود دو جہتی مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی وہی فطرت جو انسان کے باہر نشوو نما پاتی ہے۔ انسان کے اندر ترقی پاکر ریاضیاتی تجرید میں منقلب ہوجاتی ہے۔ کانٹ نے سوال کیا تھا کہ اگر تمام تر مواد جس کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو انسان کی اپنی عقلی استعداد کیا ہوگی؟ اس سوال کو یوں بھی دہرایا جا سکتا ہے کہ اگر انسانی ذہن سے اشکال فطرت کا حسن چھین لیا جائے تو اس کا اپنا جمالیاتی سرمایہ کیا رہ جائے گا؟ یہ صحیح ہے کہ علامات' اعداد اور اشکال ریاضی۔۔۔ یہ ایسے آلات تخلیق ہیں جن کی مدد سے متنوع اور لا محدود جمالیاتی نظام ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔ تاہم ان کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ مواد حسن سے ان کا کوئی ربط معنوی نہیں' ایک دشوار امر ہے۔

فطرت کے حیوانی اور نباتاتی رقبے' جہاں نشوونما' آزادی اور تحریک کا رجحان تیز ہوتا ہے۔ ان رقبوں میں جیومیٹری واشگاف ہونے کی بجائے تہہ نشین رہتی ہے۔ درختوں کی شاخیں والہانہ انداز سے جھولتی ہیں تو ایک لمحے کے لئے جیومیٹری کا سخت گیر نظم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ فطرت اپنے مظاہر میں کچھ اس نوع کی سطح کاری کو فروغ دیتی ہے۔ وہ اپنی ساختوں کو مختلف رنگوں' چھلکوں' پروں اور فریب کار غازوں کی معرفت کچھ اس انداز سے سجا دیتی ہے۔ اس کے جلو میں آزاد منش ہواؤں کے ایسے جھونکے متحرک رہتے ہیں کہ ہم ریاضی کی سنجیدگی' سادگی اور سکون و انجماد کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری توجہ موسموں کے خس و خاشاک میں لرزتے ہوئے صرف ایک پتے پر ہی مرکوز ہو جائے اور ہم فطرت کے رگ و ریشے کو سمجھنے پر آمادہ ہوں تو یہی ایک پتہ ہمیں جیومیٹری کی موجودگی اور اس نشاط کار کا احساس دلا سکتا ہے۔

نامیاتی اشکال کی یہ صورت ہے کہ وہ اپنی شاعرانہ تاثیر اور جادوئی سرشت پر اصرار کرتی ہیں۔ جبکہ تجریدی اشکال اپنے لمحات دید میں فہم و فراست کے مطالبات بھی لئے ہوتی ہیں۔ یہی صورتحال مکعبی مصوری کے ہر زاویہ عمل سے مترشح ہوئی ہے۔ چونکہ مکعبی اسلوب ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور ہیئت کا عمل کاملتاً" خط کے کردار پر منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نوع کے ہر عمل کو سمجھنے کے لئے خطوط و خم کے فنی اور جمالیاتی اوصاف پر نظر رکھنا لازم آتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مصور نے دائرہ بنایا ہے اور پھر اس کے مقابل خط مستقیم کھینچا ہے تو یہ ایک طرح کا جدلیاتی عمل ہوگا۔ قوسی خط' حرکت' مصالحت' نرمی اور تسلیم و رضا کا مظہر ہے۔ جبکہ خط مستقیم' تناؤ' استواری' استحکام اور سکون کا تاثر دیتا ہے۔ اب اگر کسی نمونہ تخلیق میں دونوں خطوط موجود ہیں تو ان کی باہمی نسبتوں یا آویزشوں میں متعلقہ جمالیاتی صفات بھی شامل حال رہیں گی۔

جدید دور میں ریاضیاتی تجرید۔۔۔۔۔۔۔ کا منظر نامہ صرف مکعبی تحریک کی طرف سے پیش کردہ فنی تجاویز تک محدود نہیں بلکہ اس میں رفتہ رفتہ کئی مختلف قسم کی اسلوبیاتی وسعتیں رونما ہوئی ہیں۔ مکعبیت فطری عناصر و اجزاء سے مکمل طور پر دست بردار نہیں ہوئی۔ لیکن سپر میٹ ازم Suprematism ایک اور تحریک ہے جس میں فطری اشکال کی عدم موجودگی میں خالص تجریدی تصورات کو زیادہ اختصار کے ساتھ

بیان کیا گیا ہے۔ مشہور مصور Maleviteh نے مستطیل پس منظر میں چند سادہ دائروں اور مربع نما شکلوں کو مصور کرکے نہایت خصوصی مبادیات فن کو ایجاز و اختصار کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں فطرت سے غیر ملوث رہتے ہوئے فنی انبساط کی نوعیت سراسر جمالیاتی تھی۔ اس لئے کہ یہاں سادہ وضعوں کی بندو نشست' مربع شکلوں اور دائروں کے جبلی حسن اور ترتیب اجزا کے فنکارانہ تصور کو مکمل اہمیت دی گئی تھی۔ اڑان بعد Pelaunay اور Kupka دو ایسے اہم مصور ہیں جنہوں نے صرف قرص نما چکر دار پیتوں کو شوخ اور تابناک رنگوں سے آراستہ کیا۔ ان کی تصویر میں دلکشی کا تمام تر انحصار قوس قزح ایسے تیز رنگوں اور متحد المراکز دائروں کی مدد سے تشکیل کردہ متحرک نمونوں پر تھا یہ تحریک arfhism آرفزم کے عنوان سے تاریخ فن کا حصہ ہے۔

Neo plasticism کے بانی موندریان کا فنی موقف بھی ایسے ذرائع دریافت کرنا تھا جو فطرت کے ہمہ گیر تنوعات کو قطعی رشتوں کے صورت آفرین اظہار میں مختصر کرسکیں اور فن موجودات کے اساسی کردار کی ترجمانی کرتے ہوئے وجدانی معنوں میں ریاضی کی مانند صحت و صفائی پر مبنی دکھائی دیں۔

Constructivism کی طرف سے بھی یہ دعوی کیا گیا کہ فنی عمل کا انحصار عقلی دلائل پر ہونا چاہیے۔ ان مصوروں نے دنیائے فن کو حسن کے جدید اور تازہ تصورات سے آشنا کیا۔ یعنی میکانکی اشکال کی بصری شاعری........ جو عہد موجود کی تہذیب کا نمایاں وصف ہے۔ ریاضیاتی تجرید سے متعلق یہ تمام تحریکات مواد تخلیق کے عقلی بندوبست کو اہمیت دیتی ہیں۔ یہاں جیومیٹری کی آراستگی اور شکوہ کامل میں کوئی عنصر ایسا نہیں ہو سکتا جو ابہام کے کہرے سے ملوث ہو۔ لیکن کیا حسن۔ رومانوی دھندلکوں کی مدہوش کن از خود رفتگی کے بغیر محض اپنی تراشیدہ وضعوں کی بنا پر لائق اعتنا ہو سکتا ہے؟ یقیناً" اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ اس لئے کہ حسن کی ہمہ نوعی اور کائناتیت کو قصر خیال کے کسی ایک بارش زدہ' بے صیقل اور مخدوش جھروکے میں مقید نہیں کیا جا سکتا........... جمالیات کے طالب علم کے لئے تو صرف یہ ضروری ہے کہ وہ حسن شناسی کے تمام امکانات کو بروئے کار لائے..........

حسن کس طرح رونما ہوتا ہے؟ اس کے ذرائع کا مکمل تجزیہ تو شاید ممکن نہ ہو۔ لیکن محض جبلت کی اساس پر اور وحشت زدہ نگاہوں سے حسن کا سامنا کرنا۔۔۔۔۔ انسان کے شایان شان نہیں۔ تجریدی جمالیات کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ حسن کی ناوانستہ سحر کاری کو عالم نگاہ کی آزمودہ کاری سے مشروط کرتی ہے۔ اگر ہم شاعری کی بیان کردہ فطری جمالیات کا موازنہ مصوری سے حاصل کردہ تجریدی جمالیات سے کرنا چاہیں تو اس کی مختصر صفاتی فہرست حسب ذیل ہوگی۔

تجریدی جمالیات (بذریعہ مصوری)	فطری جمالیات (بذریعہ شاعری)
مراقباتی انہماک' بردباری	نوحہ گری' شکوہ طرازی
تجریدی متانت اور وقار	رمزو کنایہ' رنگین خیالی
مرتبہ شناسی' تعظیم و تکریم	بے تکلفی' وسیع المشربی
سکون و استحکام	وارفتگی' ہجرت پسندی
عقلی انضباط' احترام حدود	تجاوز پسندی' پیماں شکنی
تنویر عقلی' صفائی بیان	اوائلی وحشت' حسن ابہام

ریاضیاتی سچائی، سادگی
بصری علامت گری
معروضی بندوبست، تجسیم
ایجاز و اختصار
شعورِ مکانیت، پیمانہ سازی
تجریدی، تعمیراتی حسن
مرتکز، ثقلی کشش

آرائشِ جمال، حسنِ جمال
شاعرانہ استعارہ آفرینی
سراب نمائی، لاتعین
طول پسندی، درازیٔ خیال
احساسِ بے زمانی، ماورائیت
لازمانی، معصوماتی جہان
الحاقی، ارتقائی نہج

عبد الغنی خان غنی

عبد الغنی خان سے گفتگو

بعض شخصیتیں اپنے ہی دور میں لیجنڈ legend بن جاتی ہیں۔ عبد الغنی خان غنی بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہے۔ بیسویں صدی کا یہ عظیم دانشور، شاعر، ادیب، مصور اور تحریک آزادی کے بطل جلیل برصغیر کی جدوجہد آزادی کے بے مثل قائد خان عبد الغفار خان (باچا خان) کے ہاں ۱۹۱۴ء میں تولد ہوا۔ ادبی اور فکری فکر ورثہ میں ملی ہوئی ہے۔ اپنے نامور باپ خان عبد الغفار خان کے قائم کردہ آزاد ہائی سکول اتمان زئی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور مزید اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے ہندوستان، یورپ اور امریکہ گئے۔ بعد ازاں خارزار سیاست میں قدم رکھا تو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

ایام اسیری کے دوران انہوں نے جو نظمیں لکھیں۔ وہ جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں وجود میں آنے والے شعرپاروں میں لازوال حیثیت اختیار کر گئیں۔ عبدالغنی خان کے ادبی مرتبہ کے بارے میں جناب اجمل خٹک رقمطراز ہیں۔

"عبد الغنی خان غنی نے اگرچہ عشق و محبت کے نازک ترین اور لطیف احساسات کو بھی شعر کے سانچوں میں ڈھالا ہے اور ملی جذبوں کے زیراثر نہایت اچھی اچھی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن غنی خان پشتو ادب میں "لیونے فلسفی" (دیوانہ فلسفی) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس نے لیونے فلسفی کے ہی نام سے مزاح اور طنز سے بھرپور شاہکار نظمیں لکھی ہیں۔"

غنی خان کو انگریزی زبان پر بھی دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے انگریزی میں اب تک بے شمار نظمیں، مضامین اور مقالے لکھے۔ ایک کتاب "پٹھان PATHAN" کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود ایک جامع دستاویز ہے۔

علاوہ ازیں غنی خان فن مصوری اور مجسمہ سازی میں بھی بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعے انہوں نے لطیف ترین احساسات کو اظہار کا ذریعہ بنایا ان کی پینٹنگز اور مجسموں کی متعدد بار نمائش ہو چکی ہے۔

ادبی و فنی خدمات کے پیش نظر حکومت پاکستان نے غنی خان کو ستارہ امتیاز کے صدارتی ایوارڈ سے نوازا ہے۔

تصانیف:

پنجرے چغار (پنجرے کی فریاد): یہ غنی خان کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں شامل تقریباً تمام کلام زمانہ اسیری میں لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے آغاز میں تحریر ہے ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو اس کتاب کی تحریر کا آغاز کرتا ہوں۔ اور اسی کتاب کے اختتام پر مصنف کے ہاتھ کی تحریر موجود ہے وہ یوں ہے "آج مورخہ

۱۹۵۳ء کو ہری پوری جیل میں یہ کتاب اختتام کو پہنچی یہ مجموعہ کلام ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۵۶ء میں یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور کے زیر اہتمام چھپا۔ اس کا تعارف ماسٹر کریم نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کے شروع کے چند صفحات پر غنی خان کے چند منثور موجود ہیں۔

۲۔ د غنی پلوشے (غنی کی کرنیں): یہ غنی خان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ جو ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۳۳۹ش میں کابل میں چھپا۔ اس مجموعہ کلام کے شروع کے صفحات پر غنی کا تازہ کلام چھپا ہے۔ جبکہ باقی صفحات پر "د پنجرے چغار" سے چند منتخب نظمیں لی گئی ہیں۔ تمہید استاد الفت نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے اختتام پر غنی خان کی ایک یاداشت تحریر ہے جس پر ۲۰ جولائی ۱۹۴۹ء کے الفاظ مرقوم ہیں۔ اس یاداشت کے الفاظ کچھ یوں ہیں۔

"کتاب ختم ہوگئی۔ مگر اشعار ابھی بہت باقی ہیں۔ خیر کبھی سہی یہ زندگی بھی ایک عجیب شے ہے۔ اس کتاب کا پہلا شعر میں نے سمندری جہاز میں بیٹھ کر بحر ہند عبور کرتے وقت کہا تھا۔ اور آخری شعر ہری پور جیل کے کوارنٹین کی ایک چکی میں کہا۔ اس دوران مجھ پر مستی' خوشی' غم و ارمان' امید' خوف' ہنسی اور رونے کی مختلف کیفیتیں گذری ہیں۔ جو اس کتاب کے صفحات پر میں نے منتقل کی ہیں۔ مگر افسوس کہ میری زبان میں' میرے دل جتنی طاقت و ہمت نہیں۔ یہ بیان احساس کی نسبت کمزور ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہے وہ حاضر ہے میں نے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اسے طشت از بام کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ یہ میری ذاتی تصویر ہے جو کسی حد تک نامکمل اور ٹوٹی پھوٹی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں اپنے کھلے ضمیر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ جو کچھ بھی ہے وہ میرا ہے۔ بلا کسی غرض و لالچ کے میرا اپنا تحفہ ہے۔ جو میں اپنی قوم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ کاش کہ میں اس میں زبان کی دلفریبی اور فہم و کمال کے دریا بہا سکتا۔ مگر کیا کروں مجھ سے اتنا ہی کچھ ہو سکا ہے انسان اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس میں جس قدر بھی حسن پایا جاتا ہے۔ یہ اگر میری موت کے بعد زندہ رہا تو میں سمجھوں گا کہ واقعی میں نے آب حیات پا لیا ہے۔ اور اب یہ مجھے زندہ رکھے گا۔"

۳۔ پانوس (فانوس): یہ غنی خان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ جو ۱۹۷۸ء میں نامی مکتبہ پشاور کی جانب سے پنجاب آرٹ پریس لاہور میں چھپا۔ یہ مجموعہ ۲۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں بھی غنی خان کی نئی نظموں کے علاوہ "پنجرے چغار" (پنجرے کی فریاد) اور "پلوشے" (کرنیں) سے انتخاب شامل ہے اس مجموعہ کلام میں دو مرثیے حضرت امام حسینؓ اور والدہ محترمہ شامل ہیں۔ اس میں علامہ اقبال کی چند مشہور نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں اور ایک آزاد نظم لئون بھی۔

۴۔ کلیات غنی: اس میں غنی خان کے مذکورہ بالا تینوں مجموعہ ہائے کلام کو یکجا کیا گیا ہے آخر میں مختصر حالات زندگی اور غنی خان سے متعلق چند مشہور ادباء کی آراء بھی شامل ہیں کلیات ۶۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور افغانستان میں ۱۹۸۵ء میں چھپا ہے۔

۵۔ پٹھان (Pathan): غنی خان کی یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اس کتاب میں پٹھانوں کی مختصر تاریخ' ثقافت اور ادب کے موضوع پر مقالے شامل ہیں۔ اس میں غنی خان کی چند انگریزی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اور چند افسانے بھی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی ایجنسی کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اور دوسری مرتبہ ۱۹۹۱ء میں پشتو ادبی سوسائٹی اسلام آباد نے شائع کی تھی۔ یہ کتاب مختصر ہوتے ہوئے بھی کلاسیک کا درجہ

تی ہے۔
اس کے علاوہ غنی خان نے انگریزی زبان میں بے شمار مقالے لکھے جو ملک کے مشہور اخبارات و
ائل میں چھپ چکے ہیں۔ غنی خان اپنے مقالوں کو یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے
ہے

ل: جناب خان صاحب! آپ سے میرا پہلا سوال آپ کی ابتدائی زندگی اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں
اس بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے گا۔
ب: اس موضوع پر اب تک متعدد جرائد و رسائل میں بہت کچھ چھپ چکا ہے بہرحال میری پیدائش
جنگ عظیم کے آغاز کے دوران یعنی [illegible] کو ہشت نگر کے گاؤں اتمان زئی میں ہوئی تھی۔ میں اپنے
ین کی پہلی اولاد تھا۔ چنانچہ خاندان بھر میں لاڈ پیار کا مرکز تھا۔ کہتے ہیں کہ میں بچپن میں خوبصورت تھا۔
پر اپنوں کی جانب سے لاڈ پیار یوں نچھاور کیا گیا کہ مجھے ایک کان میں سونے کی چھوٹی بالی پہنا دی گئی۔
میں ایک سونے کے ہار کی قسم کا جسے پشتو میں "اوگے" کہا جاتا ہے سر پر اوڑھنے کیلئے ایک طلائی ٹوپی
میں طلائی پونڈ ٹانکے ہوئے تھے۔ اور نظر بد سے دور رکھنے کے لئے میرے گلے میں بے شمار قسم کے
یزات ڈالے گئے (یہاں تک کہہ کر خان صاحب کھل کھلا کر ہنسنے لگے) یہ میری ماں اور گھر کی دیگر
تین کا میرے ساتھ پیار و محبت کا عجیب برتاؤ تھا۔ مجھے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ میرے بعد ولی اور
ی ایک بہن پیدا ہوئی۔ مگر ماں کو مجھ سے زیادہ محبت تھی۔ اور پھر ایک روز وہ اپنی بے پایاں محبت کو
خر مجھ پر نچھاور کر گئی۔ ہوا یوں کہ جب میں پانچ سال کا ہوا۔ اس وقت ہندوستان میں وبا پھوٹ پڑی تھی۔
روز سینکڑوں کی تعداد میں لوگ مرنے لگے تھے۔ یہ وبا ہمارے گاؤں تک پہنچ گئی۔ اور بے شمار لوگ اس
کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ مجھ پر بھی وباء نے حملہ کیا۔ اور میں بیمار پڑ گیا۔ مشہور معالجوں کے علاج کے
ود میری صحت گرتی گئی میری مشفق ماں سے یہ دیکھا نہ گیا اور اس نے اپنی ممتا کو قربان کرنے کا فیصلہ
ا۔ مغرب کی نماز کا وقت تھا میں بیماری سے بے ہوش آنکھیں بند کئے ماں کے زانو پر سر رکھے پڑا تھا کہ یکا
ماں اٹھی اور میری چارپائی کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ اور پھر جاء نماز پر بیٹھ کر اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی یا
ند میرے غنی کو شفا دے۔ اور اس کے بدلے مجھے بیمار کر دے۔ خدا کی شان دوسرے دن میرا مرض جاتا
۔ اور میری ماں بستر سے جا لگی۔ دو تین روز بیمار رہنے کے بعد اس نے اپنی جان جان آفرین کو پیش کر
ی۔ (یہاں تک کہہ کر غنی خان کی آواز گلو گیر ہوگئی مگر اگلے ہی لمحے سنبھل گئے) اس وقت میری عمر پانچ
ل کی تھی۔ ولی تین سال کا اور میری بہن کی عمر ایک سال تھی۔ میں نے اپنی تعلیم کا آغاز بابا (باچا خان)
قائم کردہ آزاد ہائی سکول سے کیا۔ آزاد ہائی سکول کا قیام ۱۹۲۱ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس میں کوئی
وص قسم کا تعلیمی نصاب نہیں تھا البتہ عسکری تربیت دی جاتی تھی۔ اس دور میں ہمارے علاقے میں تعلیم
حصول کا اتنا رواج نہیں تھا۔ مساجد اور دیگر دینی مدرسوں میں دینی تعلیم کا بہت زور تھا۔ جو آج تک قائم
ہے۔ آزاد ہائی سکول میں زیادہ تر غریب طبقہ کے بچے داخل تھے۔ مجھے بھی میرے والد نے اسی سکول میں
ا کہ غریبوں کے مابین بیٹھ کر میری ذہنی تربیت ہو سکے۔ میں شروع سے نہایت تیز واقع ہوا چنانچہ میں نے
بہت کم عرصہ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت میری عمر کوئی چودہ برس تھی۔ مجھے بابا نے اعلیٰ
کے لئے لندن بھیجا۔ میں بمبئی کے راستے سمندری جہاز سے لندن پہنچا اور وہاں پر ایک پادری کے گھر

میں رہائش پذیر ہوا جو بابا کے واقف کار تھے۔ میں لندن میں ڈھائی سال رہا۔

سوال: آپ نے جب ہوش سنبھالا تو سیاسی سماجی اور ادبی ماحول کیسا پایا؟

جواب: اس وقت آزادی کی تحریک برصغیر میں پھیل چکی تھی۔ سرحد میں اس تحریک کا آغاز بابا [illegible] نے کیا تھا۔ پشتونوں میں تعلیم کی سخت کمی تھی۔ لوگ فرسودہ روایات اور رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لوگوں پر ملاؤں کا اثر و رسوخ زیادہ تھا۔ سرکاری سکولوں میں تعلیم کے حصول کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ لوگ تعلیم محض پیسوں کے حصول کے لئے حاصل کرتے ہیں جن کو دوزخ میں جھونکے جانے چاہییں۔ اس قومی تحریک کا براہ راست پشتو ادب پر بھی اثر ہوا اس دور کے مشہور شعراء و ادباء فضل محمود مخفی، خادم محمد اکبر، فدا عبد المالک، شاد محمد میکش، فضل الرحیم ساقی، فضل حق شیدا، سعادت خان جلیل اور ان جیسے دیگر بے شمار شعراء نے وطن اور آزادی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ نجی محفلوں میں چاربیتہ گو شاعر اپنا زور کلام دکھاتے تھے۔ ان کے ساتھ شاگرد بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ خوب دھوم دھڑکے کے ساتھ مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گاؤں میں کشتی اور کبڈی عام تھی۔ بٹیربازی اور بھینسا لڑانے کا بھی شوق عام تھا۔ عموماً علاقے کے خوانین اس قسم کے مقابلوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ ہمارے علاقے کے بیشتر خوانین حکومت کے مراعات یافتہ تھے انہیں قومی تحریکوں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ وہ نچلے طبقے کے افراد کو اپنے زیر اثر رکھتے تھے۔ انہیں مختلف مقدمات میں الجھائے رکھتے تھے۔ کاشتکاروں کی اقتصادی حالت بہت ابتر تھی۔

سوال: آپ ماشاء اللہ برصغیر کے ایک اونچے سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں یہ پشتو ادب کے میدان میں کیسے آنا ہوا؟

جواب: بے شک میرا تعلق ایک سیاسی گھرانے سے ضرور ہے مگر قدرت نے مجھ میں شروع سے شاعرانہ وصف ودیعت کر دیا تھا۔ یوں بھی میں بچپن ہی سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ میں گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا عوامی تحریکوں کے جلسے جلوسوں میں شعر و شاعری کے دور چلتے تھے۔ انجمن اصلاح افاغنہ کے زیر اہتمام ہر سال ہمارے سکول میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی سیاست کے ساتھ ساتھ ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ اور ادب میں قومی شاعری کو اپنا مقصد بنایا۔

سوال: آپ کو ادب اور سیاست کے مابین یہ رشتہ کیسے لگا؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ادب اور سیاست کے مابین چولی دامن کا ساتھ ہے ویسے بھی پشتون فطرتاً انقلاب پسند ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اور جب قدرت نے اسے شاعرانہ وصف سے نوازا ہو تو پھر سونے پر سہاگہ۔

سوال: آپ نے پہلا شعر کب اور کس موقع پر کہا تھا اور کس سے اصلاح لی تھی؟

جواب: میں نے پشتو میں پہلا شعر زمانہ طالب علمی میں کہا تھا۔ جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ آزاد ہائی سکول میں ہر سال پشتو کا ایک بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ عموماً طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور بہترین نظم یا غزل کہنے والے شاعر کو انعام سے نوازا جاتا تھا۔ اس سال مشاعرے کا مصرعہ طرح کچھ یوں تھا:

مرگہ زلی جاړے پہ جبل وطن قربان شی۔

میں نے اس طرح پر چند اشعار کہے۔ جو اپنے ساتھیوں کو سنائے۔ ساتھیوں نے خوب داد دی۔ تو میں نے وہی اشعار مشاعرے میں بھی سنائے جس پر خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں نے کسی شاعر سے اصلاح نہیں لی۔

سوال: آپ کے کلام کا زیادہ حصہ طنزیہ شاعری پر مشتمل ہے اس کی وجہ؟

جواب: جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میری طبیعت میں شروع ہی سے طنز و مزاح کا عنصر زیادہ پایا جاتا تھا۔ اور یوں بھی اس دور کا ماحول کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ میں اپنی شاعری میں گل و بلبل، محبوب کی زلفوں اور رخسار کے قصیدوں کا ذکر کرنے کی بجائے حقائق کی نشاندہی کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور یہ سب کچھ طنزیہ نظموں کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ میں نے اس طنزیہ شاعری کے ذریعے خود اپنی ذات پر حملے کئے۔ اپنوں کو نہیں بخشا۔ چنانچہ میری اسی عادت کی وجہ سے اپنے اور اغیار سب مجھ سے نالاں رہتے تھے۔ اسی بناء پر میں حکومت وقت کے زیر عتاب رہا۔ مگر میں نے اپنا مسلک نہیں چھوڑا۔

سوال: آپ کے کلام میں غزل کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ آپ کے بعض اشعار میں غزل کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کی وجہ؟

جواب: جی ہاں! میں شروع سے ہی غزل کے خلاف رہا ہوں۔ میری طبیعت نظم گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ میری جوانی قومی تحریک میں گذری ہے۔ غزل گوئی فراغت کے دنوں کا مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ جبکہ میں اس نعمت سے محروم رہا ہوں۔ اور جب اچھے دن دیکھنا نصیب ہوئے۔ تو غزل گوئی کا وقت گذر چکا تھا۔ ویسے بھی غزل سے عام مراد عورتوں سے باتیں کرنا ہوتا ہے۔ اب اس بڑھاپے میں عورتوں سے باتیں کرنا یعنی غزل گوئی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور ہاں میری بعض نظموں میں اگر کہیں کہیں غزل کے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ تو سمجھ لیجئے وہ غیرارادی طور پر ہے۔ نہ کہ ارادتاً"۔

سوال: آپ کے نزدیک شعر کا کیا نظریہ ہونا چاہئے۔ اپنی ذات کے لئے، ادب کے لئے، قوم کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے؟

جواب: میرے نزدیک شعر کا نظریہ صرف اور صرف مقصدی ہونا چاہئے۔ اور حسن کی تلاش بذات خود ایک مقصد ہوتا ہے۔

سوال: آپ کے پہلے مجموعہ کلام "د پنجرے چغار" کا لب و لہجہ بعد کے مجموعوں سے مختلف نظر آتا ہے، کہیں یہ ماحول کی تبدیلی کا اثر تو نہیں؟

واب: میرا پہلا مجموعہ کلام د پنجرے چغار (پنجرے کی فریاد) دوران اسیری کا کلام ہے۔ اور یہ قومی ٹریکوں کے وقتوں کی شاعری ہے۔ ادب پر ہمیشہ قومی تحریک کی گرفت رہی ہے۔ اس مجموعے میں قومی نظموں کے علاوہ میری اخلاقی نظمیں بھی شامل ہیں۔ جب مجھ پر ابتلا کا دور ختم ہوا اور فراغت نصیب ہوئی تب میری اعری کا لہجہ بھی بدل گیا۔ سوچ کا زاویہ بھی بدل گیا۔ چنانچہ میرے بعد کے دونوں مجموعوں "پلوشے" اور پانوس" کی شاعری کا موڈ بہت بدلا ہوا ہے۔ ویسے "د پنجرے چغار" میرا پسندیدہ مجموعہ کلام ہے۔

ال: آپ کے والد محترم باچا خان آپ کو ایک مذہبی سکالر بنانا چاہتے تھے۔ اور آپ نے کچھ عرصہ دینی لیم بھی حاصل کی تھی۔ مگر بعد میں آپ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی؟

اب: جی ہاں! بابا مجھے مذہبی سکالر بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوا تو لندن ایک پادری کے ہاں بھیجا۔ جہاں میں اڑہائی سال تک رہا۔ اس دوران پادری مجھے اپنا مذہبی لیکچر

چاہتے رہے اور اپنے وصب پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ بہرحال وہاں سے مجھے [illegible]
علاوہ ازیں میں نے موجودہ دینی تعلیمی اداروں سے تفسیر قرآن، احادیث، احسن المسائل، اور [illegible]
عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ مجھے عربی زبان بولنے پر عبور حاصل تھا۔ ایک دفعہ [illegible]
والی سکول میں دیوبند سے ایک مولانا آئے تھے۔ ایک تقریب میں سکول کے طلبہ نے تقریریں کیں۔ میں نے
عربی زبان میں تقریر کی۔ مولانا بہت متاثر ہوئے میرے بابا سے پوچھنے لگے۔ کیا یہ کوئی عربی النسل لڑکا ہے۔ بابا
نے جواب دیا جی نہیں یہ میرا بیٹا غنی ہے۔ افسوس اکہ بابا نے مجھے مذہبی سکالر بننے نہیں دیا۔ بعد میں "نیم
ملا اور نیم ایمان" کا مجسمہ بن کر رہ گیا۔

سوال: گزشتہ دور میں آپ کی بے شمار تحریریں آپ کے قلمی نام "لیونے فلسفی" (دیوانہ فلسفی) کے نام سے
چھپتی تھیں۔ اس میں کیا مصلحت درپیش تھی اور بعد میں آپ نے اس نام سے لکھنا کیوں بند کر دیا؟

جواب: بابا (باچا خان) نے جب پشتو رسالہ "پشتون" نکالا تو مجھے بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کا
بھرپور موقع ملا۔ "پشتون" میں میرا کلام چھپنے لگا۔ مگر حالات حاضرہ پر ایک فکاہی کالم "گڈے وڈے" لکھنے کی
سعادت بھی مجھے ہی نصیب ہوئی۔ میں نے خود کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر "لیونے فلسفی" کا قلمی نام اختیار کیا۔
اس فکاہیہ کالم کے ذریعے نہ صرف میں نے حکومت وقت کی پالیسیوں پر تنقید کی بلکہ معاشرہ پر بھی تندوتیز
چوٹیں کیں۔ خوانین بالخصوص میرے قلم کا نشانہ بنے۔ حتیٰ کہ خود میرے رشتہ دار تک اس سے نہ بچ سکے۔
میرے ماموں نے رسالہ کے لئے چندہ دینا بند کر دیا۔ مگر انہیں یہ علم نہیں تھا کہ لیونے فلسفی کے پردے میں
خود ان کا بھانجا طنز کے تیر برسا رہا ہے۔ دراصل کئی مرتبہ میں نے اپنے اشعار میں خود کو یعنی غنی خان کو بھی
مطعون کیا جس پر انہیں یقین ہو چلا تھا کہ "لیونے فلسفی" کے نام سے کوئی خفیہ شخص لکھ رہا ہے۔ یہ سلسلہ
کافی دیر تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ رسالہ "پشتون" حکومت نے بند کر دیا۔ تو میں نے بھی فکاہی کالم لکھنا بند کر
دیا تب علاقے کے خوانین نے سکھ کا سانس لیا۔

سوال: آپ نے نوجوانوں کی ایک تنظیم بھی چلائی تھی؟ اس کا کیا بنا؟

جواب: خدائی خدمتگار تحریک پر حکومت وقت نے بے تحاشا ظلم و تشدد شروع کیا تھا۔ چنانچہ ہم نے خدائی
خدمتگاروں کی حفاظت کی خاطر نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی۔ جس کا نام "زلمے پشتون" رکھا گیا۔ یعنی نوجوان
پشتون۔ باچا خان نے مجھے اس تنظیم کا منتظم بنایا تھا۔ "خدائی خدمتگار" تحریک عدم تشدد کی بنیاد پر چلائی جارہی
تھی۔ جبکہ میں نے زلمی پشتون تحریک اینٹ کا جواب پتھر کی بنیاد پر چلانی چاہی۔ مگر بابا نہیں مانتے وہ مجھے بار
بار عدم تشدد کی تلقین کیا کرتے تھے۔

سوال: آپ نے ایک طبی وفد میں شمولیت کی تھی۔ اور افغانستان گئے تھے۔ وہ قصہ کیا ہے؟

جواب: غازی امان اللہ خان نے افغانستان میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے متعدد منصوبے تیار کئے تھے۔
انگریزی استعمار نے اس تبدیلی کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ چنانچہ چند تنگ نظر لوگوں کی مدد سے
بچہ سقہ کو ملک میں انتشار پیدا کرنے پر اکسایا امان اللہ خان پر الحاد و کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ چنانچہ افغانستان میں
خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جس میں زیادہ تر بے گناہ پشتون ہلاک ہورہے تھے۔ باچا خان نے مجھے طبی وفد کے
ہمراہ افغانستان بھیجا۔ میں نے اپنے چچا ڈاکٹر خان صاحب کے مطب میں مرہم پٹی کی تربیت حاصل کی۔ اس
وقت میں دلی کے جامعہ ملیہ میں زیر تعلیم تھا۔ میں رضا کاروں میں شامل ہوگیا حکومت نے میری گرفتاری کے

وارث جاری کر دیئے۔ گھر میں نظر بچا کر لندن پہنچا اور وہاں ڈھائی سال کا عرصہ گزارنے کے بعد بابا کے حکم پر شوگر ٹیکنالوجی میں تربیت حاصل کرنے کے لئے امریکہ چلا گیا۔

سوال: سیاست سے دست بردار کب ہوئے؟

جواب: میں امریکہ میں فنی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ دو ڈھائی سال بعد انگریزوں نے بابا کو گرفتار کیا۔ اور انہیں قید کر دیا گیا۔ تو وطن سے خرچہ آنا بند ہو گیا۔ زندگی بے حد تلخ ہونے لگی۔ بالآخر ایک رشتہ دار نے میری واپسی کا بندوبست کیا۔ ہندوستان واپس آکر میں کچھ عرصہ الہ آباد میں جواہر لال نہرو کے ہاں مقیم رہا۔ ۱۹۳۳ء میں اپنے وطن آکر تخت بائی کی شوگر فیکٹری میں ملازمت اختیار کی۔ وقتی طور پر میں سیاست سے دستبردار ہو گیا۔ جب بابا کو انگریزوں نے دوبارہ گرفتار کیا۔ تو انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ملازمت چھوڑ کر گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال اور گھر کی حفاظت کروں۔ چنانچہ میں گاؤں آگیا۔ میں نے وقتی طور پر سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ مگر حکومت وقت مجھے بخشنے کو تیار نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء سے مجھے گرفتار کرکے ۱۹۵۴ء تک قید کی حالت میں رکھا۔ سردار عبد الرشید خان جب سرحد کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے تو انہوں نے مجھے قید سے رہائی دلائی اور سیاسی سرگرمیوں کی بجائے میں نے شعر و شاعری کی جانب اپنی توجہ مبذول کرلی۔

سوال: اب آپ ادب کے میدان آہی گئے تو یہ بتایئے کہ پشتو نثر میں آپ کی تحریریں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟ کیا آپ نے سرے سے اس میدان میں طبع آزمائی نہیں کی؟

جواب: جی نہیں۔ نثر بھی لکھی ہے۔ مگر نظم کے مقابلے میں کم۔ "پشتون" میں چھپنے والا فکاہی کالم "گڈرے وڈرے" نثر ہی میں تو تھا۔ مگر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ میری طبیعت شروع سے نظم گوئی کی طرف مائل ہی۔ میں شوگر فیکٹری میں ملازم تھا۔ بہت کام ہوتا تھا۔ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو کالم لکھتا ویسے نثر لکھنے کے لئے میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔

سوال: آپ نے انگریزی زبان میں پشتو ادب اور ثقافت کے موضوع پر ایک کتاب Pathans لکھی تھی۔ آج کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے انگریزی میں بہت کم لکھا وجہ؟

جواب: جی نہیں۔ "پٹھانز" لکھنے کے بعد بھی میں نے انگریزی میں بے شمار مقالے لکھے جو ملک کے مشہور انگریزی اخبارات و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ حال ہی میں میرا ایک مقالہ انگریزی اخبار میں چھپ چکا ہے۔ ایک مضمون لکھا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ "ادبیات" میں چھپنے کے لئے بھیج دوں۔

سوال: ضرور۔ ضرور۔ مجھے وہ مسودہ عنایت فرمائیں تو میں اس کا اردو ترجمہ تیار کرکے ادبیات کو بھیج دوں؟

جواب: اب میری عمر اور صحت کا بھی تقاضا ہے۔ لکھنا بہت کم کر دیا ہے۔ البتہ مطالعہ اب بھی جاری ہے۔ بستر پر پڑے پڑے مطالعے سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

سوال: آپ نے انگریزی زبان میں چند افسانے بھی لکھے ہیں۔ جو آپ کی کتاب پٹھانز میں شامل ہیں۔ مگر پشتو زبان اس نعمت سے محروم ہے۔ کیا کوئی خاص وجہ ہے؟

جواب: میں نے انگریزی زبان میں پشتون معاشرہ اور کلچر کے موضوع پر افسانے ضرور لکھے ہیں۔ مگر بہت عجیب بات پشتو زبان میں افسانے نہ لکھنے کی۔ تو میرے عزیز! پشتو زبان میں افسانہ نگاری کی روایت تو اب

چند برس ہوئے کہ چلی ہے۔ ورنہ اب تک تو وہی قصہ گوئی کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ انگریزی زبان میں مختصر افسانہ نگاری کا فن موجود ہے۔ اور اسی زبان میں افسانہ لکھنے کا لطف آتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں پشتو شاعری اور دیگر اصناف کو دیگر پاکستانی زبانوں میں منتقل کرنے کیلئے کیا کیا جائے؟

جواب: یہ کہ پشتو شاعری و نثرپاروں کو نہ صرف پاکستانی زبانوں میں بلکہ بیرونی زبانوں میں بھی منتقل کرنا چاہیے۔ اور یہ کام اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد بخوبی کر سکتا ہے۔ یہی ادارہ اس نیک کام کو سرانجام دے سکتا ہے۔

سوال: کیا ہمارا قومی اتحاد لسانیاتی سطح پر ممکن ہے؟ ادبی حوالے سے۔

جواب: کیوں نہیں۔ بالکل ممکن ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارا قومی اتحاد لسانیاتی بنیاد پر ہو جانا چاہیے تھا۔ میں نے اس موضوع پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھا ہے اور اس موضوع کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں پشتو شاعری آج کس مقام پر ہے؟

جواب: پشتو شاعری میں آج کل نت نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ تعلیم کی روشنی سے ہمارے شعراء بھی دنیا کی دیگر زبانوں کی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور یہ پشتو شاعری میں ایک خوشگوار تبدیلی کی ابتداء ہے۔

سوال: پشتو میں آزاد نظمیں عرصہ دراز سے کہی جا رہی ہیں بلکہ اب تو نثری نظمیں اور ہائیکو تک کہی جانے لگیں۔ پشتو شاعری کی اس تبدیلی کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے گا؟

جواب: نئی نسل کے شعراء میں مجھے کوئی قابل ذکر شاعر نظر نہیں آتا۔ پشتو زبان میں اب تک جو آزاد نظمیں کہیں گئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تیکنیکی لحاظ سے بالکل ناکام نظمیں ہیں۔ شاید ہمارے پشتو شعراء کو یہ علم نہیں کہ آزاد نظم میں امیجنری imaginary بہت تیز ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کا اپنا تخیل اور تصور ہوتا ہے۔ مقصدی ایکسپریشن ہوتا ہے۔ اور ان باتوں کو شاعری میں سمونا بہت مشکل کام ہے میں نے صرف ایک بار ایک آزاد نظم "لټون" (تلاش) کے نام سے کہی ہے جو میرے ایک مجموعہ کلام میں چھپی ہے یہ میں نے آزاد نظم کی تکنیک پر لکھی ہے۔

سوال: کیا تاریخی نشیب و فراز اور معاشرتی اتار چڑھاؤ ادب پر اثر انداز ہوتا ہے؟

جواب: ہاں ہاں کیوں نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کا نصف اول دور لیجئے۔ قومی تحریک کے شروع ہوتے ہی پشتو شاعری پر نکھار آگیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب کے موڈ میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ چنانچہ آج پشتو ادب میں زندگی کے مختلف مسائل پر بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔

سوال: آپ نے مصوری اور مجسمہ سازی سے بھی شوق فرمایا ہے۔ اور اس میدان میں آپ نے بڑا مقام حاصل کیا ہے۔ شعر و شاعری اور خارزار سیاست کے بعد اس میدان میں آنے کا سبب کیا ہے؟

جواب: جی ہاں! مصوری اور مجسمہ سازی سے بھی شغل کیا ہے۔ دراصل دونوں کا شاعری سے گہرا تعلق ہے مصوری تو لکیروں کی شاعری ہوا کرتی ہے۔ اور جب کبھی مجھ پر اس قسم کی کیفیت طاری ہوتی میں نے رنگ اور برش سنبھالا یہ نہ ملا تو چارکول کا استعمال کیا۔ اور جب یہ تمام چیزیں فوری طور پر دستیاب نہ ہو سکیں تو گندھی ہوئی مٹی کا استعمال کیا۔ مگر ایکسپریشن کا اظہار بہر طور میں کرتا رہا ہوں۔ میں تصاویر اور

بحثوں کی نمائش ہو چکی ہیں۔

سوال: پشتو رسم الخط کے بارے میں آج کل ماہرین لسانیات کے مابین مختلف بحثیں جاری ہیں گزشتہ دو سال کے دوران پشتو رسم الخط کے موضوع پر پشتو اکیڈمی پشاور کے زیراہتمام سیمنار اور ورکشاپ منعقد کئے جا چکے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے؟

جواب: پشتو زبان میں ہنوز ایسے حروف موجود ہیں جو متنازعہ فیہ حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ دو چشمی (ھ) کو لیجئے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ پشتو میں دو چشمی ھ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جبکہ قلندر مومند صاحب اس حرف کی اہمیت پر برابر زور دے رہے ہیں۔ بلکہ میرے ایک مجموعہ کلام میں اس قسم کی دو چشمی (ھ) کا استعمال ہوا ہے جو پڑھنے والوں کو عجیب سا لگتا ہے۔ ماہر لسانیات کو چاہئے کہ وہ آپس میں مل بیٹھ کر حتمی طور پر ان حروف کے بارے میں متفقہ فیصلہ کرلیں۔ کہ فلاں فلاں حروف پشتو رسم الخط میں مستعمل ہیں اور فلاں نہیں۔

سوال: آپ کی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

جواب: میری زندگی تو دلچسپ واقعات سے پر ہے۔ کون کون سا واقعہ بیان کروں۔ ایک واقعہ سناتا ہوں۔
جب بابا (باچا خان) نے مجھے شوگر ٹیکنالوجی میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے امریکہ بھیجا۔ تو میں بذریعہ سمندری جہاز امریکہ پہنچا۔ میرے پاس ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک تعارفی خط بھی تھا۔ اور میٹرک کا ایک سرٹیفکیٹ۔ جبکہ ان دنوں امریکہ میں صرف اسی طالب علم کو آنے کی اجازت تھی جب تک یونیورسٹی کی جانب سے اسے نامزد نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ میرے کاغذات نامکمل قرار دیئے گئے۔ اور مجھے بندرگاہ پر ہی روک لیا گیا۔ اور جہاز پر ہی مجھے نظر بند کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی خان ان دنوں امریکہ میں افغانستان کا سفیر تھا۔ اسے اطلاع ملی تو اس کی سفارش پر مجھے پانچ روز کی نظر بندی کے بعد امریکی بندگارہ پر اترنے کی اجازت ملی تھی جہاز پر قید کے دوران میرے پاس سگریٹ ختم ہوگئے تھے۔ مجھے بندرگاہ پر جانے کی اجازت نہیں تھی میں حیران و پریشان ڈیک پر کھڑا نیچے بندرگاہ کا نظارہ کررہا تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک لمبے تڑنگے نوجوان نے مجھے پکارا۔ پشتون ہو میں نے جواب میں کہا جی ہاں میرا نام غنی ہے اور باچا خان کا بیٹا ہوں،
نیچے اتر آؤ اوپر کیا کررہے ہو۔ اس نے دوبارہ مجھے پکارا۔ تو میں نے پوری صورت حال بیان کی۔ جواب میں اس نے پھر پوچھا۔ "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں" میں نے کہا "بھائی سگریٹ ختم ہوگئے ہیں وہ کہیں سے لادو۔" وہ نوجوان فوراً ایک سٹور سے میرے لئے بڑھیا کوالٹی سگریٹ کا ایک ڈنڈا خرید لایا اور ماچس لائٹر سمیت بنڈل کی شکل میں نیچے سے میری طرف اوپر اچھال دیا۔
وہ نوجوان کیلیفورنیا میں کام کرتا تھا اس کا نام ڈاکٹر اورنگ زیب شاہ تھا اور امریکہ میں وہ پشتونوں کا آرگنائزر تھا۔ بے حد شریف النفس شخص تھا۔ بیچارہ جوان العمری میں وفات پاگیا تھا اس کی لاش افغانستان پہنچا دی گئی تھی۔

سوال: کیا حکومت کی طرف سے کوئی اعزاز ملا ہے آپ کو؟

جواب: جی۔ مرحوم ضیاء الحق نے مجھے ستارہ امتیاز سے نوازا تھا۔ دو سال قبل مجھے ہلال امتیاز کیلئے نامزد کیا گیا مگر حکومت کی تبدیلی کے ساتھ وہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

سوال: ابھی پچھلے دنوں اکادمی ادبیات کی جانب سے پشاور میں آپ کے اعزاز میں شام ملاقات کے نام سے

ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں آپ کے سینکڑوں شیدائیوں نے شرکت کی تھی۔ اس موقع پر آپ کے احساسات کیا تھے؟

جواب: جی یہ اکادمی ادبیات والوں کا ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے مجھ جیسے پرانے لوگوں کو بھی ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ میں اکادمی ادبیات کے حکام کا شکریہ ادا کرتا ہوں البتہ میں نے جن حضرات کو مدعو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سرحد یونیورسٹی میں میرے بے شمار دوست ہیں جن سے مجھے ملنے کی خواہش تھی۔

سوال: زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

جواب: عمر کے اس سٹیج پر میری کیا خواہش ہوگی۔ اب تو چل چلاؤ کا دور ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہوں۔ تو میں خوش ہوتا ہوں۔

سوال: زندگی میں آپ کو کس بات سے زیادہ نفرت رہی ہے؟

جواب: جھوٹ اور منافقت سے یہ معاشرہ کے بدترین ناسور ہیں۔

سوال: ادیبوں اور شاعروں کے لئے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب: محنت، وطن سے محبت اور قوم کی بے لوث خدمت کیجئے یہی میرا پیغام ہے۔

غلام ربانی آگرو

غنی خان

سندھ کے ممتاز عالم پیر حسام الدین راشدی کے پورے پاکستان میں نامور عالموں' ادیبوں اور شاعروں سے قریبی مراسم تھے۔ کراچی کی ادبی محفلوں میں اکثر غنی خان کا ذکر کرتے تھے کہ بہت بڑا شاعر اور مصور ہے۔ پیر صاحب کی باتیں سن کر مجھے غنی خان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا' لیکن اس کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اس بات کو کئی برس گزر گئے۔ قسمت مجھے حیدر آباد سے اسلام آباد لے آئی وہاں سے غنی صاحب کا گاؤں (ناڑی۔ چارسدہ) تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ گزشتہ سال موسم سرما میں میرا بیٹا عزیز اور میں اپنے پشتو ادیب دوستوں غنی خٹک اور اقبال افکار کے ہمراہ چارسدہ روانہ ہوئے۔ مغرب کے وقت غنی صاحب کے گاؤں ناڑی پہنچے۔ غنی خان کا گھر پختون خاندانوں کے دستور کے مطابق ایک چھوٹے سے قلعہ کی طرح تھا۔ پھاٹک کے پاس ہتھیار بند پہرے دار کھڑے تھے' ایک پہریدار نے ہمیں سلام کیا۔ کار کا دروازہ کھولا اور گھر کے اندر لے گیا۔ غنی خان اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہوں۔ خوش مرحبا کے بعد پہلی بات انہوں نے یہ کی کہ بچے صبح سے پشاور گئے ہیں' ابھی تک واپس نہیں لوٹے۔ فون بھی کام نہیں کر رہا۔ کسی سے کچھ معلوم بھی نہیں ہو سکتا۔ سو پریشان ہوں ۔ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ بچے خیریت سے واپس آ گئے۔ غنی خان کا انتظار ختم ہوا تو ہماری باتیں شروع ہوئیں۔

میں نے کہا غنی صاحب "عمر کیا ہو گی؟" کہنے لگے کہ "مجھ سے ایک دفعہ کسی دوست نے عمر پوچھی۔ میں نے کہا "ساٹھ برس۔" ولی خان میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "بھائی ستر برس کا تو میں ہوں۔" میں نے کہا "تو پھر میں اکہتر برس کا ہوں۔" ہنس کر کہنے لگے کہ "دراصل میری عمر چوراسی برس ہے۔"

غنی صاحب اتنی عمر کے باوجود پھول کی طرح خوبصورت تھے۔ رنگ گورا اور جسم بھرا بھرا۔ اٹھنے بیٹھنے میں معذوری کی وجہ یہ بتائی کہ پانچ سال پہلے پنڈی کے ایک سرجن کی غلط دواؤں سے ان کا ایک پھیپھڑا متاثر ہو گیا۔ اب ایک پھیپھڑا کام کر رہا ہے دو قدم بھی چلتا ہوں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔ تمام دن بستر پر رہتا ہوں۔ کھانا یہیں کھاتا ہوں' لوگوں سے ملاقات یہیں کرتا ہوں۔ کتابیں اور رسالے بھی یہیں پڑھتا ہوں۔ مجبوراً" اٹھنا پڑے تو بستر کے ساتھ گھنٹی رکھ دی ہے۔ یہ کہہ کر گھنٹی بجائی تو نوکر اندر آیا۔ اسے قہوہ لانے کو کہا اور خود سگرٹ سلگا لی۔

ایک پھیپھڑے پر زندہ رہنے والے شخص کا سگریٹ پینا اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن ہر بے قرار روح کو اس دنیا کے صحرا میں کوئی نہ کوئی سایہ چاہیے۔ بادل کا سایہ بہت عارضی ہوتا ہے اور اگر بادل اور بگولے

تمباکو کے دھوئیں سے بچے ہوں تو بات اور ناپائیدار بن جاتی ہے۔ تمام میں خاموش رہا۔

غنی صاحب جوانی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے تھے۔ وہاں سے واپس آکر ٹیگور کے کہنے پر شانتی نکیتن چلے گئے۔ کہنے لگے کہ شانتی نکیتن میں اعلیٰ ڈگریوں والے استاد معمولی گاؤں پڑھاتے تھے۔ کلاس روم نہیں ہوتے تھے۔ استاد اور شاگرد درختوں کے نیچے بیٹھتے تھے۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھولتا۔ ٹیگور کی شخصیت نہایت شاندار اور پروقار تھی۔ کپاس کی طرح سفید داڑھی تھی جس کو شیپ کرتے تھے۔ امن پسند تھے۔ شاعرانہ خیالات رکھتے، مہاتما گاندھی کو ان سے اختلافات تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ جب تک انگریزوں سے آزادی نہیں ملتی تب تک شاعرانہ خیالات صرف کاغذی پھول ہیں۔

میں نے غنی خان سے کہا کہ ایک طرف تو آپ کے خاندان نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی، دوسری طرف آپ نے ایک انگریز خاتون سے شادی کرکے اپنا گھر اس کے حوالے کردیا۔ کہنے لگے کہ میری گھر والی انگریز نہیں تھی پارسی تھی مجھے ان سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ایک بیٹی کی شادی اپنے خاندان میں کی، لیکن میاں بیوی ایک ساتھ نہیں رہ سکے۔ ایک دن میری بیٹی اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اپنے ننھیال بمبئی چلی گئی۔ دوسری بیٹی کینیڈا پڑھنے گئی تھی اس نے وہیں شادی کرلی۔ ایک دفعہ شوہر کو میرے پاس لے کر آئی، میں نے اسے کہا کہ ہم تو ساری عمر گوروں سے لڑتے رہے اور تم نے گورے سے شادی کرلی۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔ کہنے لگی بابا ایسا کام نہ کرنا میرا بہت خیال رکھتا ہے۔

غنی خان کا داماد تو گولی سے بچ گیا لیکن اس کے اکلوتے بیٹے کو کسی نے گولی مار دی۔ غنی خان غم کا پیالہ پی گیا۔ لیکن قسمت میں بیٹے کے ساتھ بیگم کی جدائی بھی لکھی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد والد بھی وفات پاگئے۔ پھر خود کسی حادثے میں زخمی ہوکر ہسپتال داخل ہوگئے۔ اب گھر میں اپنی بہو اور انکے معصوم بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ پتہ نہیں کہ غالب نے کس کیفیت میں کہا تھا۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

میرے چھوٹے بیٹے مجیب نے مجھے بتایا تھا کہ عتیق فکری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "میں ۱۹۳۸ء میں دہلی گیا تھا اور ابو الکلام آزاد سے ملاقات کی، وزارت ہند کی کرسی نے ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اسی خلوص سے ملے اور ٹھہرانے پر مدعو کیا۔ اس دن عبدالغفار خان کے بیٹے غنی خان بھی ان کے مہمان تھے۔" یہ بات ذہن میں رکھ کر میں نے غنی خان سے کہا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد آپ کے خاندان کی حکومت پاکستان سے صلح صفائی ہو جاتی تو شاید آپ کو دکھ کے دن نہ دیکھنے پڑتے۔

غنی خان نے کہا کہ یہی تو بات ہے۔ دراصل آزادی کے بعد ہمارے خاندان کے ملک کی ہائی کمانڈ سے مذاکرات شروع ہوئے تھے لیکن ہمارے ہی صوبے کے کچھ لوگوں کو اس بات کی سن گن مل گئی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ایسے ہوا تو ہمیں کون پوچھے گا۔ سو شرارت کر کے انہوں نے اس قصے کو اسی وقت ختم کرا دیا۔

ملک میں غنی خان کی شناخت بحیثیت شاعر اور فنکار ہے۔ اس لیے میں نے پوچھا کہ خاندانی اثر کی وجہ سے کبھی آپ کو بھی سیاست کا شوق ہوا؟ کہنے لگے، کہ جب بھرپور جوانی تھی اور شانتی نکیتن میں اندرا گاندھی کے ساتھ پڑھتا تھا تو ایک دفعہ وہاں سے ہم کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں لے گئے۔ جب بڑے بڑے لیڈروں نے گرماگرم بحث شروع کی تو میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ نیند آگئی۔

غنی خان نے شانتی نکیتن کے کئی قصے سنائے۔ وہ ٹیگور سے بہت متاثر تھے۔ کہنے لگے کہ عمر خیام کی شہرت کو آسمانوں تک پہنچانے والا شخص اس کا مترجم فٹز جیرالڈ تھا۔ خوش قسمتی سے ٹیگور کو بھی اعلیٰ پائے کا مترجم نصیب ہوا لیکن ہر بڑے شاعر کی قسمت اتنی اچھی نہیں ہوتی۔

غنی خان کی باتیں بہت دلچسپ تھیں لیکن رات کافی بیت چکی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی خود ہی کہنے لگے کہ آپ کو سفر کی تھکن ہو گی۔ آرام کریں۔

ہم اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔ ہیٹر جل رہا تھا' کمرہ اور بستر گرم تھا۔ آس پاس کتابوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی لیکن سرد رات میں بستر اتنا گرم تھا کہ ریشمی تکیے پر سر رکھتے ہی نیند آ گئی۔

صبح سات بجے آنکھ کھلی۔ غنی خان خود نہ جانے کب اٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد نوکر ہمارے لئے ناشتہ لے کر آ گئے۔ میں اور عزیز تیار ہو کر غنی خان کے کمرے میں گئے۔ وہ ابھی ناشتہ کر رہے تھے۔ اقبال افکار ہماری تصویریں اتارنے کے لیے فوٹو گرافر کو ساتھ لے آئے تھے۔ غنی خان نے کہا کہ ٹھہریں' میں شیو وغیرہ سے فارغ ہو جاؤں۔ گھنٹی بجائی تو نوکر اندر آیا۔ وہ غنی خان کا باڈی گارڈ بھی ہے اور اردلی بھی خزانچی بھی اور معتمد بھی۔ اس کے پاس شیو کرنے کا سامان تھا۔ غنی خان بستر میں لیٹے رہے اور کہنے لگے کہ پاکستان بننے کے بعد ایک دفعہ گھر میں پولیس آ گئی۔ مجھے مصوری کا شوق تھا۔ حضرت عیسیٰ اور مہاتما بدھ کے کئی مجسمے اور تصویریں بنائی تھیں۔ میری گھر والی بڑی چاہ سے ڈرائنگ روم میں سجا کر رکھتی تھی۔ پولیس والوں کی جیسے ہی ان تصویروں اور مجسموں پر نظر پڑی تو کہنے لگے کہ "ہے نہ کافر' دیکھو کیسے کیسے بت تراشے ہیں!" کفر اور الحاد کے دو تین ایسے مزید الزامات لگا کر جیل بھیج دیا۔ جیل میں سخت تکلیف تھی۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ میری شاعری میرے پاس پلٹ کر آ گئی۔

میں نے کہا غنی خان کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خوشحال خان پشتو کا بڑا شاعر ہے اور کچھ رحمن بابا کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ کہنے لگے کہ دونوں ایک ہی بات ہیں۔ میں تو خود کو ہی پشتو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ ان کی بات سن کر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ کسی راجپوت سے پوچھا گیا کہ سچا راجپوت کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ جو اپنے علاوہ کسی اور کو سچا راجپوت نہ مانے۔

نوکر ان کی شیو بنا کر فارغ ہوا تو غنی خان نے کہا کہ مجھے اٹھاؤ۔ کچھ نوکر نے سہارا دیا کچھ خود ہمت کی۔ وہیل چیئر پر جا بیٹھے۔ نوکر وہیل چیئر دھکیل کر گھر کے آگے چمن میں لے آیا۔ ان کی بہو کی کچھ سہیلیاں آنے والی تھیں جن کے بیٹھنے کے لئے اس نے درختوں کے نیچے بان کی چارپائیاں گول دائرے میں ڈال کر ان پر گدے اور چادریں بچھا کر گاؤ تکیے رکھ کر پٹھانوں کے طرز کی بیٹھک تیار کی تھی۔ ہم وہاں بیٹھ گئے اور فوٹو گرافر تصویریں بنانے لگا۔ میں نے غنی خان کو کچھ ادبی کتابیں دیں تو فوٹو گرافر نے ان سے ان کی شاعری کی کتاب مانگی۔ غنی خان نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی کاپی نہیں۔ ان کے ڈرائیور نے کہا کہ میرے پاس ہے۔ بھاگا ہوا گیا اور کتاب لے آیا۔ اچھی خاصی ضخیم کتاب تھی۔ غنی خان کتاب پر آٹوگراف کرنے لگے تو میں نے ان سے پشتو کے ایک بڑے ادیب کا ذکر کیا۔ کہنے لگے اس پر بھروسہ مت کرنا۔ وہ ادیب کوئی معمولی ادیب نہیں تھا کہ غنی خان اتنی آزادی سے مجھے رائے دیتے لیکن ان کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی جیسے ہم جنم جنم کے ساتھی ہوں۔ قرب اور اخلاص کی خوشبو کتنی انوکھی ہوتی ہے۔

ایک دفعہ پتہ نہیں کس خیال میں ڈوبے ہوئے تھے' کہنے لگے کہ میں نے کسی زمانے میں شکر کا

[illegible] کا احساس ہو جاتا ہے۔ اب پھر کارخانہ لگانے کا خیال بہت مشکل ہے [illegible]
سوچتا ہوں شاید میں کسی قانونی [illegible] سے زمین لے کر کارخانہ لگاؤں۔

میں نے سوچا کہ قدرت نے انسان کے خمیر میں قوس قزح کے سات رنگ بھر دیئے ہیں۔ اگر چہ اسی برس سے زیادہ ہو، صحت اتنی کمزور ہو کہ اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہو پھر بھی اس دنیا کے دھندوں میں دلچسپی قائم رہے، یہ بھی انسانی فطرت کا ایک رنگ ہے، ورنہ اس گلشن کا کاروبار کیسے چلے گا؟ اگر انسان گوتم بدھ کی تعلیم کے مطابق خواہشوں کو یکسر ختم کر دے تو پھر گرمی اور سردی کے لئے ایئر کنڈیشنر اور ہیٹر کیسے ایجاد ہوں؟ انسان چاند پر کیسے قدم رکھے؟ لیکن میں نے غنی خان کی رائے پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ اتنا کہا کہ غنی کہتے ہیں کہ انسان جب تک کوئی نہ کوئی تخلیق کرتا رہتا ہے تب تک زندگی میں اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

کہنے لگے ہاں، لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے آہستہ آہستہ میرے اندر جنسی خواہش ختم ہو رہی ہے اور اس کا تخلیقی قوت سے گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ میں نے ان کو رائے دی کہ پشتو زبان اور ادب کی ترقی کے لئے ایک بڑا ادارہ قائم کرنا چاہیے۔

کہنے لگے کہ افسوس ہے کہ پشتو کی ابھی تک صحیح صورت خطی بھی نہیں بنی۔ پبلشر اچھے نہیں ہیں۔ اخبار رسالے کا اچھا انتظام نہیں ہے۔ درحقیقت پشتو کا سارا کام بکھرا ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ میری شاعری کی تازہ کتاب کی کیا صورت حال ہے؟ لیکن آپ کا مشورہ اچھا ہے، البتہ اس کے لیے وسائل ہونے چاہئیں۔ آپ ادارے کا خاکہ بنا کردیں تو میں با اثر لوگوں سے بات کروں۔

میں نے پوچھا کہ آپ نے کبھی انگریزی میں بھی شاعری کی ہے؟

کہنے لگے کہ نہیں میں پشتو کا شاعر ہوں۔

ہر شاعر کو اپنا کلام سنانے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن میرے ترغیب دینے کے باوجود بھی غنی خان نے کوئی شعر نہیں سنایا۔ ان کی نشست و برخاست میں بے حد بردباری تھی اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ غنی خان میں غم برداشت کرنے کا بڑا حوصلہ تھا۔ اپنے غموں کا اس طرح ذکر کر رہا تھا جیسے کسی دوسرے شخص کا ذکر کر رہا ہو۔

جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہاں چیل کے درختوں کی گھنی چھاؤں تھی۔ آس پاس پھلوں اور پھولوں کی مہک تھی۔ ہلکی پھلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ غنی خان کہنے لگے کہ یہ زمین زرعی لحاظ سے بہت زرخیز ہے لیکن آگے کچھ فاصلہ پر پہاڑی علاقہ شروع ہوتا ہے۔ افغانستان کی سرحد بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک دفعہ افغان حکومت نے مجھے پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس ہجرت کرکے آجاؤ تو ہم تمہیں باغ بستان، زمین اور مکان سب کچھ دیں گے۔ لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے اپنی مٹی سے محبت ہے۔ میں نے اور میری بیوی نے یہ مکان بڑی محنت سے بنایا تھا۔ آؤ تم کو دکھاؤں۔

غنی خان کا گھر دنیا سے نرالا تھا۔ برآمدے میں بھی پلنگ اور صوفے اسی طرح لگے ہوئے تھے جیسے ڈرائینگ روم اور بیڈ روم میں۔ انسان جہاں چاہے بیٹھ جائے۔ شانتی نکیتن نے غنی خان کے ذہن پر بہت گہری چھاپ چھوڑی تھی۔ ظاہر اور باطن کا فرق مٹا دیا تھا۔

برآمدے کا دھلا ہوا فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ غنی خان کہنے لگے کہ میری بیوی کو گھر کی

بتاتی کا بہت خیال رہتا تھا۔ سندھ کی ثقافت کو سامنے سے دھلواتی تھیں میں نے یہ روایت قائم رکھی ہے۔

برآمدے سے ہوتے ہوئے ہم ڈرائنگ روم میں آئے۔ ایسا ڈرائنگ روم میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وسط ایشیاء کے طرز پر سجایا ہوا تھا۔ درمیان میں آتش دان تھا۔ چاروں طرف گاؤتکیے سجے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ سردیوں کی راتوں میں کبھی اس آتشدان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہوں گے۔ غنی خان کی بیوی بچے اس کے چاروں اطراف مزے سے چائے پیتے ہوں گے۔ ہنستے ہوں گے۔ اب اس جگہ اتنا سناٹا کیوں ہے؟

ڈرائنگ روم کی دیواروں پر گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰ کی تصاویر آویزاں تھیں اور میزوں پر غنی خان کے دوستوں اور احباب کی۔ گزشتہ شب غنی خان نے ایک خاتون کا بار بار نام لیا تھا لیکن میں نے حجاباً ان سے نہیں پوچھا کہ کون تھیں وہ؟ ڈرائنگ روم میں ایک بے انتہا خوبصورت خاتون کی تصویر میز پر رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ قدرت نے جب حسن پیدا کیا تھا۔ اسے جادو کا لباس پہنا دیا تھا۔ غنی خان نے خاتون کا نام لیا تو سمجھ میں آیا کہ گزشتہ رات یہ نام ان کے لبوں پر بار بار کیوں آیا تھا۔ تصویر دیکھ کر مجھے فارسی کا ایک شعر یاد آیا۔

نہ شبم نہ شب پرستم نہ حدیث خواب گویم
ہمہ آفتاب بینم ہمہ آفتاب گویم

میں نے پوچھا کہ آج کل کہاں ہیں؟

کہنے لگے کہ وفات پا گئیں۔

غنی خان وہیل چیئر پر ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک اپنے گھر میں گھومتا رہا۔ میں Alice in Wonde کی طرح ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلتا رہا۔ جب غنی خان اپنی بنائی ہوئی تصویریں اور مجسمے دکھا رہا تھا اور بار بار اپنے بچوں کا ذکر کر رہا تھا۔ تو مجھے اپنے بچپن میں چارلس لیمب کا پڑھا ہوا ایک مضمون Dream Children یاد آیا۔ مصنف نے بڑی محبت سے اپنے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ پھر میرے بچے آہستہ آہستہ پچھلے پیروں مجھ سے دور ہوتے چلے گئے لیکن نگاہوں سے اوجھل ہونے سے قبل کہنے لگے کہ ہم تمہارے سچ مچ کے بچے تو نہیں ہیں۔ ہم تو تمہاری اداس آنکھوں کی حسرتیں اور خواب ہیں۔ میں نے سوچا کہ غنی خان کے بچے بھی اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر کتنی دور چلے گئے۔

جب ہم غنی خان کا گھر دیکھ کر باہر چمن میں آ گئے تو میں نے ان سے رخصت طلب کی۔ غنی خان کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر نظریں اٹھا کر کہنے لگے موسم بہار میں یہ سارا چمن پھول پھول ہو گا میں آپ کا انتظار کروں گا' لوٹ آنا۔

میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ہاں کی اور دل میں کہا کہ غنی خان اس چمن کے سب سے خوبصورت پھول تم ہی تو ہو۔ میں نے تمہارا دیدار کیا۔ برسوں کا خواب پورا ہوا۔

جب گاڑی دروازے سے باہر نکلی تو غنی خان نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ میں نے اسے جوابی سلام کیا۔ جب کار نہر کے کنارے سے راستے پر دوڑنے لگی تو مجھے غنی خان کے متعلق کراچی کی محفلوں میں پیر حسام الدین راشدی سے سنی ہوئی باتیں یاد آئیں اور پیر صاحب کی محفلوں میں بیٹھنے والے لوگ یاد آئے جو

اب ایک ایک کر کے یہ دنیا چھوڑ کر کسی اور دنیا میں چلے گئے ہیں۔ محمد علی خان کے ساتھ یار محمد چھتی
نے اسے اس دنیا میں ہی اکیلا چھوڑ دیا۔ ہادی کا گاؤں دیکھ کر دریائے سندھ کے کنارے اپنا گاؤں یاد آیا۔
جہاں شام کے وقت میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ گاؤں کے آگے چراگاہیں تھیں۔ شام کے وقت
جہاں وہاں لوگ جمع ہو جاتے۔ قصے کہانیاں اور داستانیں بیان کرتے۔ ہمارے ہاں رہٹ تھا جہاں سے صاف
شفاف پانی ایک نالی میں بہتا ہوا آس پاس کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔ قریب کے گاؤں سے ایک چرواہا ہر
دوسرے تیسرے دن ہمارے گاؤں آتا تھا اور رہٹ کے قریب منڈیر پر بیٹھ کر کافیاں گاتا تھا۔ اس کی آواز
میں عجب سوز تھا۔ کبھی کبھی ایک خاص کافی گاتا تھا جس کو سننے سے انسان پر وجد سا طاری ہو جاتا تھا۔ کافی
کے بول کچھ ایسے تھے جیسے کوئی کوہ ندا سے پکار رہا ہو۔

قافلے کاخِ مجازی کے تمام مشکل مرحلوں سے گذر کر
مالک حقیقی کے حضور میں حاضر ہو گئے۔

ہماری کار چارسدہ چھوڑ کر قومی شاہراہ پر آئی تو ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔ جلد ہی ہم
اٹک کے قریب پہنچے جہاں اب پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ اور دریا پر پل تعمیر کیا گیا ہے۔ پہلے تو اونٹوں کے
قافلے چلتے تھے۔ کار پل پر چڑھی تو میں نے دریا پر نظر ڈالی۔ صاف شفاف پانی پل کے نیچے سے بہتا جا رہا
تھا۔ کون جانے کب سے بہہ رہا تھا۔ سعدی نے جب ہی تو کہا تھا "خلیفے آتے جاتے رہیں گے، دجلہ بہتا
رہے گا۔"

میں نے اٹک کے پل سے سندھ میں اپنے گاؤں پر نگاہ ڈالی۔ گاؤں کے آگے میدان میں بچے کھیل
رہے تھے۔ رہٹ سے شفاف پانی کھیتوں میں جا رہا تھا۔ چرواہا وہی کافی گا رہا تھا جس کو سن کر انسان پر جادو
سا طاری ہو جاتا تھا۔

قافلے کاخِ مجازی کے تمام مشکل مرحلوں سے گذر کر
مالک حقیقی کے حضور میں حاضر ہو گئے۔

جب وہ پوری کافی گا چکا تو میں نے پیار سے اس سے پوچھا:
"انسانی زندگی کا انجام یہی ہے؟"
میرا بچپن کا یار تیز ہوا کے جھونکوں میں میرا سوال سمجھ نہیں سکا۔

(سندھی سے ترجمہ: سعیدہ درانی)

غنی خان

پانچ نظمیں

(۱)

خاموشی (Silence)

جب خاموشی پر محبت غالب آ جاتی ہے تو یہ نغمہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔
جب نغمہ بے معنی ہو جاتا ہے تو یہ شور میں بدل جاتا ہے۔
جب کسی خیال کو اپنے یقینی ہونے کا احساس ہو جاتا ہے تو یہ لفظ میں اُتر آتا ہے۔
جب لفظ اپنے وجود میں رقص کو محسوس کرتا ہے تو یہ موسیقی میں بدل جاتا ہے۔
اور جب موسیقی خواب آلود ہو جاتی ہے تو یہ خاموشی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔
خاموشی ازل ہے خاموشی ابد ہے۔

(۲)

قسمت (Fate)

قسمت کسی ساز میں پوشیدہ سروں کی مانند ہو سکتی ہے۔
وہ ساز کے تاروں سے پیدا ہونے والی آواز کو اپنی گرفت میں لیتی ہے اور اسے تنوع زندگی، ہیئت اور احساس دیتی ہے۔
ایک قلم کی طرح جو آفتاب کی سفید روشنی کو اپنے وجود میں لے کر اسے مختلف رنگوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔

زندگی بغیر حقائق کے بالکل ایسی ہے جیسے آواز بغیر نغمگی کے۔
یکسانیت ابد ہے' لاانتہا ہے۔

(۴)

روح (The Soul)

ایک باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے گلاب کے پھول سے پوچھا۔
"اے گلاب! کیا تمہیں اپنی خوبصورت پتیوں کے حسن کا احساس ہے' تم اپنے وجود کے حسن سے آگاہ ہو۔"
"نہیں" ۔ گلاب کے پھول نے جواب دیا۔
"میں صرف خزاں کو جانتا ہوں اور بہار کو کہ جو خزاں کے بعد آتی ہے۔"
میں نے تتلی سے پوچھا۔ "اے مکمل نغمے! کیا تم اپنے نغمے کی مٹھاس سے آگاہ ہو؟"
"نہیں" ۔ تتلی نے کہا "میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں تتلی ہوں۔"
میں نے بلبل سے پوچھا "اے محبت کرنے والی۔ کیا تم اپنے محبوب کے چہرے سے واقف ہو۔"
"نہیں" ۔ بلبل نے جواب دیا۔ "میں تو صرف اپنا نغمہ جانتی ہوں۔"
"آہ! بیچارے! بے وقوف!" میں نے کہا اور باغ سے فخر کا یہ احساس لیے لوٹا کہ میری روح بیدار ہے اور میں اپنے سر میں دماغ رکھتا ہوں۔
ایک لالہ صحرائی نے شرارت سے سر اٹھا کر مجھ سے پوچھا۔
"آقا؟ کیا تم جانتے ہو کہ تم کون ہو؟"

(ماخوذ و ترجمہ از "دی پٹھان" سعید الافغانی ادیب)

(۳)

ایک نکتہ

ہزاروں علم و دانش کی کتابوں سے
یہ نکتہ ہم نے سیکھا ہے
کہ کتنا ہی سیہ ہو
دلنشیں لگتا ہے کتنا تل
تمہارے روئے زیبا کا
گلِ گم گشتہ و بے نام و صورت
بے زباں گِل
لمسِ دست کوزہ گر سے ہی
خیالِ چشم کوزہ گر میں ڈھلتا ہے
کبھی بسرا ہوا بر طاق ویراں
ایک ننھا سا دیا بنتا ہے
یا پھر صندلی ہاتھوں کی
نازک انگلیوں میں جام بنتا ہے
یہی گم گشتہ و بے نام و صورت، بے زباں گل ہی
کبھی اک مدھ بھرا مدہوش تخیئل عمر خیام بنتا ہے
کبھی رنگیں جمال و حسن روئے ساقی گلفام بنتا ہے

(پشتو سے ترجمہ از عابد سلطان)

(۵)

تخلیق

اور اپنے واسطے
میں نے خود بنا لیا ہے ساز
اپنے خواب سے
اپنے ہی خیال سے
اپنے غم سے' مستی و خمار سے
خود ہی اپنے قول اپنے تال سے
میں نے خود بنا لیا ہے ساز اپنے واسطے

میں نے خود بنا لیا ہے ہار
اپنے سوز سے
اپنی آرزو سے' اپنے خواب و رنگ و روپ سے
اور گلوں سے' اور خزاں کی دھوپ سے
میں نے خود بنا لیا ہے ہار اپنے واسطے

میں نے خود بنا لیا ہے کرب و غم
قہقہوں سے سکھ سے اور

وصال سے، خمار سے
پیاری پیاری تتلیوں، بہار سے، نکھار سے
میں نے خود بنا لیا ہے کرب و غم
خوشی سے اور خمار سے

میں نے خود ہی زندگی بنائی ہے
ان گنت غموں سے اور جنون سے
روشنی و نور سے، امید کی فضاؤں سے
ظلمتوں سے اور بددعاؤں سے
میں نے خود ہی زندگی بنائی ہے

اور اپنے واسطے
میں نے خود بنا لیا ہے مرگ
زندگی سے اور
مستی و خمار سے
موتیوں سے، قوت شباب سے
موسم بہار کے
زرد رو گلاب سے۔

(پشتو سے ترجمہ: عابد سلطان)

ایک واقعہ (AN INCIDENT)

موسم سرما میں وادی پشاور کی شامیں نہایت طویل' سنسان اور ٹھنڈی ہوا کرتی ہیں جبھی تو ہر شخص الاؤ کے قریب بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے قصے کہانیاں سنتا اور حقیقتوں کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔ یہ بھی سرما کی ایک طویل سرد رات کا واقعہ ہے۔ میں حسب معمول آتشدان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ آتشدان میں سوکھی لکڑیاں چٹخ رہی تھیں کہ اچانک باہر سے میں نے اپنے قریبی دوست مرتضیٰ خان کی آواز سنی۔ "ارے یار! تم کہاں ہو" وہ پچاس گز کی دوری سے چلایا' میں نے بھی جواباً" چلا کر آواز دی اور دروازہ کھولا اس کے ہمراہ دو محافظ بھی تھے۔ جنہوں نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا۔ مرتضیٰ خان اندر داخل ہوا۔ وہ چھریرے بدن کا مالک تھا۔ بڑا گٹھا سا سر' کھلی پیشانی اور اندر کو دھنسی ہوئی ٹھوڑی۔ پہلی نظر میں وہ چھوٹے دہانے والے منہ کا ایک نٹ کھٹ لڑکا دکھائی دیتا ہے۔۔ ذہانت اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے۔ اس کے کندھے سے پستول جھول رہا تھا۔ اس کے کپڑے میلے دکھائی دے رہے تھے اور ہاتھ بھی میلے اور کھردرے تھے۔ عام طور پر ایسے حلیئے والے کسی بھی شخص کو میں اندر آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر وہ میرا یار تھا۔ اسے اندر آنے دیا۔ کیونکہ اس کا باپ میرے والد کا اور دادا میرے دادا کا دوست تھا۔

وہ ایک مغرور خان کا بڑا بیٹا تھا۔ بچپن سے ہی بڑا شیخی خورہ واقع ہوا تھا۔ اس نے پندرہ سال کی عمر میں ایک نامی گرامی خان کو قتل کر دیا تھا۔ جس نے اس کے باپ کی بے عزتی کی تھی۔ پندرہ سال بعد وہ پکڑا گیا۔ تب وہ بتیس برس کا ہو چکا تھا۔ اور قتل کے جرم میں چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی مختلف جیلوں میں قید کاٹی۔ رہا ہونے پر وہ قومی تحریک میں شامل ہوا اور دوبارہ جیل چلا گیا۔ وہ ایک گستاخ قیدی ثابت ہوا۔ اس نے کوڑے کھائے۔ مشقت کاٹی۔ وہ جیلروں کے لئے مسلسل درد سر بنا ہوا تھا اور ڈپٹی جیلروں کیلئے ایک عذاب۔

وہ سیدھا آتشدان کے قریب جاکر بیٹھ گیا اور میں اس کے سامنے والی کرسی پر۔ "کہو کمانڈر کیسی گذر رہی ہے۔" میں نے اس سے پوچھا میں اکثر اوقات اسے کمانڈر کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ۱۹۳۰ء میں سرخپوش (خدائی خدمتگار) تحریک میں کمانڈر رہ چکا تھا۔ اس نے آگ کے شعلوں کی طرف گھورنا شروع کیا۔ بولا "زندگی کا راز پانے کے لئے عمر کاٹ رہا ہوں۔" میں نے اس کی خواب آلودہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ "مرتضیٰ! یہ تو بتاؤ کہ گرفتاری سے قبل تم نے کس بات پر اپنے دوست عطا کو قتل کیا تھا؟"

اس نے آتشدان سے نظریں ہٹا کر کہنا شروع کیا۔ "اپنے چچا کی خاطر جس سے مجھے شدید نفرت تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں گذشتہ بارہ سال سے مجرم بنا پھر رہا تھا۔ میرے ساتھ مجرموں کی ایک ٹولی ہوا

کرتی تھی۔ جو عام طور پر پیدا گھستیں اور گاؤں والوں کو لوٹا کرتی تھی۔ لوٹ کی رقم میں میرا باقاعدہ حصہ ہوتا تھا۔ کیونکہ میں انھیں اپنے پاس کھانا کھلاتا تھا اور انھیں اسلحہ کارتوس لاکر دیا کرتا تھا۔ ان باتوں میں میرا چچا میری حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھے دعوتیں کھلاتا رہتا تھا اور اس کے بدلے میں اس کے حریفوں کو ڈراتا دھمکاتا تھا۔ انگریز افسروں کی نظروں میں اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور دیگر خوانین کے مقابلے میں اس کا وقار بڑھ گیا تھا۔ میں انجام سے بے خبر تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھ سے شفقت کرتا تھا۔ آخر کو میں انہی کے گوشت پوست سے بنا ہوا تھا۔ میں اس کے بھائی کا بیٹا تھا۔ اسی بات پر میں اس وقت اس کا نہایت احترام کرتا تھا۔

ایک شام۔ اس نے مجھے اپنے گھر بلا بھیجا۔ میں سخت محنت میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ اور اس کے گھر پہنچا۔ چچا میرا انتظار کررہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی بپتا سنائی کہ عطا نے اس کے دشمنوں کے ساتھ مل کر اس کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ چچا نے میرے پیر پکڑے اور گڑ گڑا کر کہا۔ "خاندان کی عزت کو بچاؤ" میں نے اس کے چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اور بڑھتے ہاتھوں کو نفرت سے دیکھا۔ اور اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ عطا میرا دوست تھا۔ میری چچی میرے سامنے آئی۔ اس نے نہ تو رونے دھونے سے کام لیا۔ اور نہ ہی میری منت ساجت کی۔ بلکہ اس نے افسوسناک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اور پھر بولی۔ "کیا تم اپنے باپ کے بھائی کو قتل ہوتے دیکھ سکو گے؟ یہ بوڑھا اور کمن سال ہے۔ اور تم ابھی جوان ہو اور توانا بھی۔ کیا تمہارا اس خاندان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں؟ کیا تم کو اس خاندان نے دنیا میں جنم دے کر تمہیں عزت نہیں دی؟ تمہارے باپ نے تو کبھی بھی بزدلی نہیں دکھائی تھی۔ وہ ایک خان کی حیثیت سے پیدا ہوا خان کی سی زندگی گذاری اور خان کی طرح مرا۔"

چچی کی باتوں سے میں موم کی طرح پگھل گیا۔ اور میں نے اس سے وعدہ کیا اور واپس چلا آیا۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے نہایت بے چینی سے پوچھا۔

"عطا۔ ایک بدنام اور سنگدل مگر دلیر مجرم تھا" اس نے دوبارہ واقعات کی کڑیاں ملانی شروع کیں۔ "اس نے حکومت کے قانون کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ اس نے لوگوں کے رسم و رواج اور دستور کا مذاق اڑایا مجھے ہمیشہ سے عطا سے سخت نفرت رہی ہے۔ اس کی دلکشی اور دلیرانہ قصوں سے مجھے نفرت تھی۔ اس نے ایک نہایت ہر دلعزیز اور شریف بوڑھے شخص کو قتل کیا تھا۔ جو میرے سکول کے دوست کا باپ تھا۔ دراصل وہ بوڑھا بھی جوانی کے وقتوں سے ایک قتل کا مقروض چلا آرہا تھا۔ اس نے جوانی میں جو کچھ بویا تھا بڑھاپے میں آکر اس نے وہی کچھ کاٹا۔ کیونکہ ایک پٹھان قتل کا قرضہ صرف قتل ہی کے ذریعے اتار سکتا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوا کرتی ہیں جو اسے دوسروں کی جان سے بھی عزیز تر ہوتی ہیں۔ وہ ہر دلعزیز بوڑھا شخص نوجوانی میں بے پروا تھا۔ اس میں چند کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں جسے عطا نے پالیا تھا۔ وہ جوان ہوا۔ تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں شرم سے اپنا سر تھامے رکھتی تھی۔ اس نے بھائیوں کی طرف دیکھا جو شرم سے زمین پر نظریں گاڑے رکھتے تھے۔ بہت ساری باتیں خود اس نے دوسرے لوگوں کی زبانی سنیں وہ فوراً بھانپ گیا۔ اب تو اس ہر دلعزیز بوڑھے شخص کو ہر صورت میں قتل کرنا ہوگا۔ یا پھر وہ بھی ماں کی طرح اپنا سر تھام لے یا بھائیوں کی طرح زمین پر نظریں گاڑے رکھے۔ اس کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔ خوبصورت اور غیرت کا مجسمہ تھا۔ اس نے اپنی بندوق اٹھائی۔ اور اس نے دنیا کی نظروں میں اپنا وقار بڑھانے کا عزم کر

لیا۔ مگر اسی بات کے لئے مجھے اس سے شدید نفرت تھی جبکہ مجھے اس بوڑھے شخص کے کرتوت کے بارے میں علم نہیں تھا۔ مجھے تو اس کی سفید داڑھی اور شفقت بھری باتیں یاد تھیں۔ اس کے گھر میں ایک خوبصورت بیوی بھی تھی۔ جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کن حالات نے اسے اس بوڑھے کی بیوی بننے پر مجبور کیا تھا۔ لوگ ایک مجرم شخص کی عزت کرتے ہیں۔ اگر وہ بہادر اور خوبصورت ہو تو لوگ اپنا سب کچھ اس پر قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ عطا خوبصورت بھی تھا اور بہادر بھی۔ وہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا ہوا تھا۔ اور ایک روز وہ میرے دادا کی پن چکی کے قریب مردہ پایا گیا۔

سارا گاؤں اس کی لاش دیکھنے کے لئے امڈ آیا تھا۔ اس کے مرنے کے فوراً بعد لوگوں نے اس کے بارے میں اپنا نظریہ بدل دیا۔ اور اس کے جرائم اور برے اعمال گنوانے شروع کئے۔ قاتل کون تھا؟ جو بھی تھا۔ لوگ اسے دعائے خیر دینے لگے۔ وہ قاتل میں تھا۔"

بالآخر مرتضیٰ نے اپنے پیارے دوست کے باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا۔ اور پھر جلد ہی میں نے اسے پابہ زنجیر دیکھا۔ پولیس کے ایک دستے نے بالآخر اسے گھیر لیا۔ گاؤں والوں نے بھی پولیس کا ساتھ دیا۔ وہ بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ مخالف گروہ سے اس نے آٹھ افراد کو اگلے جہاں بھیج دیا۔ جب اس کے پاس گولیاں ختم ہو گئیں۔ تو اس نے اپنی بندوق ایک قریبی کنویں میں پھینک دی اور روز روشن میں اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس نے رات کے اندھیرے میں خود کو اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو پولیس کے حوالے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ اس کے مخالفین نے انہیں رشوت دی تھی۔

میں نے اسے زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھا۔ اس کی پیشانی گولی لگنے سے خون آلود تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گاؤں کے بیچوں بیچ قہقہے لگاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے لوگوں سے پولیس کے تمام دستے کو ٹھنڈا شربت پلانے کو کہا۔ اس نے لوگوں پر لعن طعن کیا۔ میں بھی تماشائیوں میں شامل تھا۔ میں بڑے فخر کے ساتھ لوگوں کو بتا رہا تھا کہ مرتضیٰ میرا کزن تھا۔

برطانوی حکومت نے اس پر قتل کا مقدمہ چلایا۔ اور اسے بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ کئی سال بعد جب میں نے اس سے ملاقات کی تو اس وقت میں ایک امریکی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ہم اچھے دوست تھے۔ میں نے اس کے قتل کی وارداتوں کو دلچسپی کے ساتھ سنا۔ میں بھی قصے کہانیاں لکھتا رہا۔ جنہیں اس نے مخلوط تعلیم والی فرنچ حسیناؤں اور سپین کے نوجوانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"تم نے عطا کو کیسے قتل کیا تھا۔" کئی سال بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ تو بہت آسان کام تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو کہ وہ ایک ازلی قاتل تھا۔ اسے گاؤں میں رہتے ہوئے بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔ وہ میرا قریبی جاننے والا تھا۔ کہ میں بھی اسی راہ کا مسافر تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کسی شخص کے قتل کرانے میں مدد کیلئے کہتا اور ایک روز میں نے اس کی حامی بھر لی۔ میں اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ایک صبح منہ اندھیرے میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ اس کے بتائے ہوئے شخص کو قتل کرنے کی غرض سے۔ عطا کا کوئی ذاتی ملازم نہیں تھا۔ وہ دراصل ملازم کے اخراجات پورے کرنے سے قاصر تھا۔ جبکہ میرے پاس تین ذاتی ملازم تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو سمجھایا کہ جونہی میں تمہیں اشارہ دوں۔ تم اس شخص پر گولی چلا دینا۔

جیسا کہ عام مجرم کا قاعدہ ہوتا ہے۔ ہم ایک قطار میں قدرے فاصلے پر جا رہے تھے۔ ہم پن چکی کے

قریب پہنچے تو میں نے وہاں اپنے ایک نوکر کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود ستانے کی غرض سے ایک طرف ہو لیا۔ عطا میرے نوکر کو سمجھا رہا تھا کہ جس شخص سے اسے نفرت تھی اسے کس طرح مارا جائے۔ میں ابھی چند قدم چلا ہی تھا کہ فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً مڑ کر دیکھا میرے نوکر وہاں سے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ جبکہ عطا زمین پر گرا پڑا تھا۔ میں نے بھی بھاگنا شروع کیا۔ کھیتوں اور خندقوں کو پھلانگتے ہوئے بالآخر ہم اپنی کمین گاہ پہنچ گئے۔"

"مگر تم بھاگے کیوں تھے؟" میں نے پوچھا "یقیناً اس وقت کوئی بھی تمہارا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔" "ہم لوگ اس مردہ شخص کے خوف سے بھاگ رہے تھے۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا "میں نے خود کو دنیا کی نگاہوں سے چھپائے رکھا۔ مگر زیادہ دیر تک کامیاب نہ رہ سکا۔ زندگی میں وہ ہمیشہ میرے قریب رہا تھا۔ وہ مجھ سے ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔ وہ بڑا ہی دلیر اور خوش مزاج لڑکا تھا۔" "آخر اس سے تم کیوں خوفزدہ تھے؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"میرے دوست! تم جانتے ہو۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میں بیماری کی موت کے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اگر کسی کو نزلہ زکام ہو جائے تو۔ تو کوئی بھی اس شخص کے قریب جانا گوارا نہیں کرتا۔ مگر مجرم لوگ ہمیشہ عطا سے ڈرتے تھے۔ میں بھی اس سے خوفزدہ تھا۔ اس لئے کہ مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ اگر وہ میرے چچا کو قتل کر سکتا ہے تو ایک روز وہ مجھے بھی قتل کر ڈالے گا۔ میں دل ہی دل میں اس سے نفرت کیا کرتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اپنے چچا سے نفرت کرتا تھا۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے گہرے ہوگئے۔ میں نے اپنے چچا کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اور پھر میں پکڑا گیا۔ اور جب قید سے رہائی پائی۔ تو سرخپوش تحریک میں شامل ہوگیا۔ اس تحریک نے مجھے عدم تشدد کا درس دیا اسی درس کا اثر یہ نکلا کہ میرے چچا نے لمبی عمر پائی۔" یہ کہتے کہتے اس کے ہونٹوں پر زہرخند مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "عطا دراصل میرے چچا کو قتل کرنے جارہا تھا۔ اگر میں اسے قتل کرنے میں پہل نہ کرتا۔ مگر چھوڑو ان باتوں کو اور مجھے کچھ سریلے ساز سناؤ۔"

میں نے ستار اٹھایا۔ اور ایک غم آگیں راگ چھیڑا۔ وہ آتشدان کے قریب خاموش بیٹھا شعلوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ میں نے مرتضیٰ کو ہمیشہ مسکراتے ہوئے پایا۔ پتلے ہونٹوں پر اس کی مسکراہٹ بہت بھلی لگتی تھی۔ وہ ایک بدنام مجرم تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ سرخپوش بھی تھا۔ عدم تشدد کا نمونہ میں نے اس سے پوچھا "تم میں یہ اچانک تبدیلی کیسے آئی۔" اس نے کہا۔

"تم جانتے ہو ان چار سالوں میں میں ایک چھوٹا سا "بزرگ" بنا ہوا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میں اپنی خواہشوں کی بجائے اپنے خوابوں کو پالوں۔ یہ ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ میں نے اپنی خوش قسمتی کو ٹھکرایا۔ اور دوشیزاؤں سے محبت کرنے لگا مگرانہیں کچھ نہ کہتا کیونکہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی تھیں تم ان محبت کرنے والوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جو تم سے محبت کرتے ہیں اور تم ان لوگوں کو ایذا نہیں پہنچا سکتے جو تم پر بھروسہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی اسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی جو لوگوں کی خواہش کے مطابق تھی۔ تب وہ لمحہ بھی گزر گیا۔ میں نے خود کو بادلوں کی اوٹ سے باہر نکالا اپنی دنیا میں واپس چلا گیا۔ خواہشات' عیش و عشرت کی دنیا میں' اس لئے کہ میرے لئے بیک وقت ایک خان اور پارسا شخص بننا ناممکن تھا۔ ایک انسان یا

عمل: غنی خان

عمل: غنی خان

عمل: غنی خان

عمل: غنی خان

عکس: غنی خان

عمل: غنی خان

عمل: غنی خان

عمل: غنی خان

ضیاء جالندھری

زوال

غازۂ حرف و بیاں، روشنیٔ حیلہ گری

روغن و رنگ کی سج دھج میں چھپائے ہوئے داغ
دیدہ و دل کا عذاب آئینہ خانوں کے چراغ

عز و ناموس یہاں صورت سائل گریاں

سر بزانو ہیں کہ ان کا کوئی پرساں نہ رہا
وحشتیں نعرہ زناں شہر میں انساں نہ رہا

کیسے خوابوں کی ہے تعبیر یہ ویرانیٔ شہر

آگ رہ رہ کے لپکتی ہے خیالوں کی طرح
آنکھیں ہر سمت اب اٹھتی ہیں سوالوں کی طرح

اختر حسین جعفری

لہو لہو خلعتوں کے زرتار

لہو لہو خلعتوں کے زرتار
شامِ مقتل میں میری خاطر نہ کھینچ، رہنے دے
تیرا سہرا
اب ایسی عمروں میں میرے ماتھے پہ کیا سجے گا!

بُریدہ انگشت کی گواہی
بہت سپیدی، بہت سیاہی
مکرنے والے عمل میں ماہ گستر ہے اور
ترازو کا ایک پلڑا
تمہارے رخ تک پہنچ گیا ہے

میں ایسا قیدی نہیں جسے بادِ صبحگاہی رہائی دے گی
نہ ایسا آزاد
جس کا چھت سے لٹکتے جالوں سے
دھوپ کی دھجیوں سے، پورا کفن سلے گا
سو، طے ہوا ہے کہ

مہرِ نصف النہار تک جو نہیں پہنچے
پرانے محور سے اب ہٹیں گے
جزا، سزا پر
گداگروں، بندگانِ خدمت میں، قیدیوں میں
سلے سلائے کفن ہوں یا پیرہن ادھورے
نہیں بٹیں گے!

یہ درہم و داغ
تیر، دستار، زین، رہوار
واقعہ ہو کہ نظم تفصیلِ حال و احوال درج کرنے
شمار کرنے میں عذر کیسا!
لکھو، کہ رہوار تھک گئے ہیں
لکھو، کہ اس واقعے کے اندر جو تھی کہانی، بدل گئی ہے
گنو، ہیں قبروں پہ پھول کتنے
شمار کرنا کہ ترکشوں میں بچے ہوئے ہیں اصول کتنے!

جیلانی کامران

نظم

ایک پھول خواہش کا
اس نے کس تمنا سے میری سمت
پھینکا ہے
دل کی کیا حقیقت ہے سانس سانس
مہکا ہے!

کیا عجب زمانہ ہے موسموں کی صورت میں آشنا فسانہ ہے!

آشنا رہو! جب تک
زندگی کے منظر میں راز ہیں خدائی کے
منزلوں نے بھولے ہیں مرحلے جدائی کے!
صبح کی ہواؤں نے
اس کے شہر کا جھونکا
کس ادا سے بھیجا ہے!

روشنی سے اب کہہ دو
وقت کی فضاؤں سے نور کی کرن لائے
جو بھی دل فسردہ ہے
وہ نئی خوشی پائے!

حرف کو حرمتِ دیدہ لکھ

دیدہ لکھ، نادیدہ لکھ جو بھی لکھ فہمیدہ لکھ
صورتِ بوئے رمیدہ لکھ سیرتِ صبح دمیدہ لکھ
لکھ پھر لکھ پھر لکھ پھر لکھ قطعہ لکھ یا قصیدہ لکھ
پڑھ کر لکھ اور لکھ کر پڑھ باطبعِ شوریدہ لکھ
عقل کو اپنی رکھ بیدار چاہے پھر خوابیدہ لکھ
لکھ کے رو اور رو کے لکھ زلف کو خواہ بُریدہ لکھ
آہ کو خواہ رسا لکھ لے یوں نہ آرامیدہ لکھ
لکھنا ہے تو چکھ پہیں حرف کو حرمت دیدہ لکھ
نقطہ نقطہ دیکھ کے ڈال کششِ ک کشیدہ لکھ
الف اور ب متوازن رکھ زائے زلف خمیدہ لکھ
نقطہ خال کو خوب بنا ظاہر لکھ پوشیدہ لکھ
اک عالم کی تجھ پہ نظر قلقِ دلِ رنجیدہ لکھ

طنز و مزاح بھی اے مقبول
باذہنِ سنجیدہ لکھ

آفتاب اقبال شمیم

میں مایوس نہیں

یہ فنا کے گھاٹ اتارتے ہوئے
تجربے
یہ الم سلائی کی نوک سے جو لکھے گئے
مری آنکھ پر
یہ ہمیشہ سے
کسی شے پرست کی دسترس
کسی خواب پھونکتی آرزو کے طلسم پر
یہ دل و دماغ کی بے نتیجہ سی کاوشیں
فن و فلسفہ کی مشاورت
جو نہ ظلمتوں کو گھٹا سکی، جو نہ روشنی کو بڑھا سکی
یہ ضرورتوں کے معاہدے
جو سدھائے فہم کی فرض کردہ صداقتوں سے،
بنے بنائے مجرّدات سے
ناپتے ہیں مرے وجود کے بھید کو
یہ رجا و بیم کے جھٹپٹے کی مسافتیں
یہ ہجوم
ایک ہی دائرے میں گھسٹتے ہوئے چل رہے ہیں

حدوں کی بیڑیاں پاؤں میں
ہے گمان کیا؟ ہے یقین کیا؟۔۔ مجھے کیا خبر
رکھیں اپنی اپنی گرفت میں
یہ وسیلے ہندسہ و حرف کے
یہ دلیلیں، منطقیں اور زاویے سوچ کے
جنہیں مثل سکۂ رائج کیا معتبر
زر و زور نے
یہ نفاق نیت و فعل، معنی ولفظ میں،
یہ سدا سے بہری عدالتوں میں
سدا کی گونگی گواہیوں کی سماعتیں،
کئی اور ایسے ہی یاس خیز تلازمے
مجھے کیا بُرا تھا کہ ایسے جینے کے کرب سے
میں فرار ڈھونڈتا موت میں

مگر ایک رابطہ قُرب کا
مری چاہتوں میں کسک سی ایک جدائی کی
مری شاخِ دل کو بھری خزاں میں ہرا رکھے
نہیں بھولتا
وہ لڑکپنے کی زباں پہ ذائقہ پان کا
سرِ راہ
بھیگے ہوئے سے کی چنبیلیوں پہ
سماں عجیب سا جگنوؤں کی اڑان کا
وہ جو شفقتیں
میرے بچپنے میں ملیں مجھے

میں اسی سخاوت جاریہ سے نہال ہوں
وہ عجیب و سادہ سی چاہ جو
میری دھڑکنوں میں خلل سا ڈال دے
و فعتاً"
رخ دلنواز کو دیکھ کر
وہ چھلکتے نشے کی باس دیتے ہوئے
لبوں کی گلابیاں
وہ فسوں سا چشم سیاہ کا
غم روزگار سے مہلتوں کی گھڑی گھڑی میں رچا ہوا
وہ دنوں کی بھیڑ سے بچ کے
کنج گریز میں میرا بیٹھنا
بڑی دیر تک
میری اپنے آپ سے گفتگو
کسی آشنائی کے درد کی ہو شفق سی جیسے کھلی ہوئی
میرے گرد و پیش کے کاسنی سے سکوت میں
یہی گرمیوں کا وہ موڑ ہے
جہاں سبز جھاڑ سے جھانکتے ہوئے موتیے کی شگفت سی
میری صبح و شام کی راہ میں' مجھے ایک ثانیہ روک کر
کرے عطر بیز سوا گتیں
وہ وفور شکر کہ آنکھ میں اُمڈ آئے
اشک سپاس کا
وہ کھلے کنول کا سکون رات کی جھیل میں
وہ تھکن کے لمبے سفر سے واپسی
صفروقت کی سمت پر

سرِبامِ کوچہ شرر فشاں
وہ سلگتا گیت جسے جنوب کی بے مثال مغنیہ نے عطا کیا
مجھے اپنے مخزنِ سوز سے
دلِ درکشادہ کی بیٹھکوں میں وہ صحبتیں،
وہ نیاز یار فرید کے
وہی آستانۂ یادِ روز کی شام کا
مرا تخت ہے
جہاں دوستوں سے نشست ہوتی ہے چائے پر
یہ سپردگی کا خمیر میری سرشت میں
یہ محبتوں کی روایتیں
جو وراثتوں میں ملیں مجھے
جو مرے لہو میں تھکے بغیر سبک سبک سی
رواں رہیں
مرے حوصلے کی امین ہیں
میں ذرا سا پیکرِ خاک ہوں
مگر عندیہ کوئی غیب کا مرے سلسلے میں
ضرور ہے
کہ ہزیمتوں پہ ہزیمتیں
مجھے بار بار ہرا کے بھی نہ ہرا سکیں
یہ حصار ویسے تو دیکھنے میں ہے پست
قدِ غنیم سے
اسے کُل جہان کے حزن و یاس کی یورشیں نہ گرا سکیں

ادیب سہیل

حقیقتِ کُل

کسان کھیتوں میں اپنے کرتا ہے تخم کاری
یہ تخم مٹی کا سینہ شق کر کے
باہر آتا ہے
دیکھتے دیکھتے
جوانی کے رنگ چڑھتے ہیں
پھول لگتے ہیں
بالیاں جھومتی ہیں اس پر
جگر جگر کرتی بالیوں پر
کسان کو داد اس کی خلاقیوں کی ملتی ہے
اک حقیقت اگرچہ ہے یہ
حقیقتِ کُل نہیں ہے پھر بھی
یہ تخم کاری سے پھل کے لگنے تلک کے
سب مرحلوں میں
مٹی' زمین' آب و ہوا' حرارت' درانتی' ہل
سبھی ہیں تخلیق کے وسیلے
جو دیکھیے تو
کسان اکیلا نہیں ہے خالق
یہ سارے اسباب خلق ہونے میں ہیں معاون!

رات کے رُوبرُو

رات کی لہر پہ
ریت کے شہر پہ

صبح اور آسماں
دونوں جلنے لگے

ریت کی شاخ پہ
پھول کھلنے لگے

رات کے روبرو
ہونٹ ہلنے لگے

محمود علی محمود

آج کا چہرہ

کوئی راہ۔ گراہ نہیں ہے
نیچے۔ اک گھنگھور۔ گھنی۔ گھائی میں
آبِ زر اک تارا
ہلکا۔ لہاتی چمکارا
آنکھیں پھاڑے۔ منہ کھولے۔ سب
سب ہی۔ کود چکے ہیں
اک۔ ایک ضمیر کا جس بھی
اونچے۔ نیچے کلس بھی
اس بے جذب۔ اُجالے کی پہنائی۔ تنہائی میں
اک "تابوتی پکار" میرے ہونٹوں کی نگر پر
بے کل ہو کے اتر آتی ہے
ہچکی بن کر۔ جم جاتی ہے
اے جھولوں میں۔ کھلے گلابو! ۔ اے افرادِ فردا
ہم تو ۔ "آج کا چہرہ" ہیں۔ ہم مخلوقِ زر بستہ
بہرِ خدا۔ تم کوئی رستہ۔ اپنے باطن جیسا
خود کا پیدا کرنا......

ابرار احمد

دوام وصل کا خواب

پکی گندم کے خوشوں میں
مہکتے دن کے ڈیروں میں
درختوں کی گھنی شاخوں
پرندوں کے بسیروں میں
جھکے بادل سے گرتے نام کے اندر
اُترتی شام کے اندر
دوام وصل کا اک خواب ہے
جو سانس لیتا ہے
مہکتی سرزمینوں میں
مکانوں میں، مکینوں میں
ترے میرے علاقوں میں
ہمارے عہد ناموں میں
لرزتے بادبانوں میں
کہیں دوری کے گیتوں میں
کہیں قربت کی تانوں میں
ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی

اس چادرِ افلاک کے اندر
ردائے خاک کے اندر
دوامِ وصل کا اک خواب ہے
جو سانس لیتا ہے
ہماری نیند کی گلیوں میں
اپنی دھن بجاتا ہے
مکانِ خامشی کے بند دروازے گراتا ہے!

کشکول

اترتی شام گذرے دن کو رخصت کرنے والی تھی
اندھیرا کر رہا تھا رفتہ رفتہ اپنی صف بندی
سیاہ شب ابھی غالب نہ آئی تھی اُجالے پر
میں اک دفتر سے اٹھ کر سیڑھیوں سے فرش پر آیا
گلی میں کیا قدم آئے کھُلا دروازہ محشر کا
مرے پیروں سے لپٹی کم سن و معصوم بچی نے
حصارِ جسم و جاں کو لرزہ براندام کر ڈالا
بکھر کر رہ گیا احساس کا ملبہ دھماکے سے
اڑا دے جس طرح بارود سے کوئی عمارت کو
مچی جذبات کی شدت سے ہلچل ذہن میں کیسی
جواب آئیں کہاں سے ان خیالوں ان سوالوں کے
ابھی تو اس کے دن تھے کھیلنے کے مسکرانے کے
ابھی تو اس کا سن آیا نہیں تھا کوچہ گردی کا
دیا اس عمر میں کشکول کس نے اس کے ہاتھوں میں
یہ کیسی صورت حالات ہے اے خالق دوراں
کیا ہے تو نے وعدہ خلق سے روزی رسانی کا

پھر اس دنیا میں کیوں کثرت تہی دستوں کی ہے آخر
مری خواہش تو ہے پھولوں سے بھر دوں سب کے دامن کو
مگر میرے تصرف میں بھی خوابوں کے سوا کیا ہے

محمد امین

ابن آدم سے مکالمہ — ۱

مسافر سنو، میں وہی اجنبی ہوں
بھٹکتا رہا جو کئی سال شہرِ عدم میں
وہی شہرِ امکاں جہاں میری بانہیں ترازو بنیں
میرے ہاتھوں کے پلڑے بنے
ایک میں بنتِ حوا رہی دوسرے میں مرا آب و دانہ رہا
مگر بنتِ حوا کا پلڑا ہمیشہ ہی بھاری رہا
اور میرا آب و دانہ بہت کم رہا
مسافر سنو، یوں ہوا میرے پلڑے کہیں گم ہوئے
پھر کئی سال تک ایک اندھے کنویں میں لٹکتا رہا
اور اوندھا لٹکتا رہا میں
وہاں کی فضا نان و جو کی مہک سے معطر نہ تھی
میرے لب سیب کے ذائقے کو ترستے رہے
پھر کئی سال تک قیدِ تنہائی کاٹی
کئی عمر ایک چاکِ در سے کوئی روشنی کی کرن دیکھتے
کوئی چاند چہرہ کوئی خوبصورت بدن
پر وہاں کچھ نہیں تھا
یہاں سے رہائی ملی تو میں بھاگا
میں ہجراں زدہ، مضطرب قریہ قریہ پھرا
اور جدائی میں پہچان بھی کھو گیا
اسے ڈھونڈتے بابل و نینوا میں بھٹکتا رہا
اجنتا کے غاروں میں دیکھا
ہڑپہ کی آباد گلیوں میں اس کو پکارا
یہ میں اجنبی قرن ہا قرن سے بستی بستی اسے
ڈھونڈتے ڈھونڈتے، یوں بھٹکتے بھٹکتے، کہاں آگیا ہوں
یہ ملتان ہے میرا مسکن

مگر مجھ کو کیا
وہی رتجگے ہیں وہی قید تنہائی ہجراں زدہ کی
ہے مجھ اجنبی کا مقدر جدائی
میں پھر پوچھتا ہوں
مری ہم سفر جستجو کہاں ہے؟
وہ میرا سہارا، مرا حوصلہ، میری قوت کہاں ہے؟
مری جستجو کہاں ہے؟
اسے ڈھونڈ لاؤ۔

۲

سنو اجنبی، میرے بیٹے، جواں سال، و رعنا
مری بیٹیاں خوبصورت، حسین ہیں
مجھے فکر کیا میرے پاؤں تلے کی زمیں بھی مری ہے
سر پہ پھیلا ہوا آسماں بھی ہے مرا
مری بیٹیاں خوبصورت، بہادر جنم دینے والی
چلیں تو ہرن چوکڑی بھول جائیں
رکیں تو زمیں کانپتی ہے
ہنسیں تو چمن کے سبھی پھول مہکیں
مری بیٹیاں رونق زندگی ہیں۔ کہ جن سے مری سلطنت بھی حسیں ہے
مرے خوبصورت، جواں سال، کڑیل، گراں ڈیل بیٹے
بڑھیں تو پہاڑوں کو پل میں گرا دیں
رکیں تو ہواؤں کے رخ بھی پلٹ دیں
چلیں تو وہ دریا کی موجیں الٹ دیں
یہ بیٹے مرے پیارے بیٹے مری سلطنت کے یہ وارث
مرا فخر، آنکھوں کی ٹھنڈک، سدا خوش رہیں تا قیامت جئیں
سنو اجنبی،
مری سلطنت چار سو ہے کہ حد نظر تک کی ساری زمین ملکیت ہے
مجھے فکر کیا میرے بازو مری سلطنت کے نگہباں
میں خوش ہوں مری حکمرانی ہمیشہ رہے گی
خبردار! سن لو، مری حکمرانی مری راجدھانی میں پاؤں نہ دھرنا۔

۳

مسافر کہو حال کیا ہے
تمہارے بدن پر یہ کیا چیتھڑے ہیں
یہ چہرے پہ کیا جھریاں ہیں
یہ کیا زخم ہیں۔ اب اسے کس نے نوچا
مسافر بہت دور سے آئے ہو، کچھ کہو
تھکن سے بدن چور ہے۔ آبلوں سے ہیں پاؤں شکستہ
زباں میں یہ لکنت ہے کیسی
مسافر، مرے دل کے ٹکڑے، ذرا حوصلہ کر
بتا تجھ پہ بیتی ہے کیا

سنو اجنبی پا شکستہ مسافر ہوں میں
بڑھاپے کی دہلیز پر سلطنت کی فصیلوں سے باہر پڑا ہوں۔
مجھے کیا خبر تھی یہ کیا ہو گیا ہے
مری بیٹیاں اپنے ساتھی کے ہمراہ خوابوں کی منزل کی جانب رواں ہیں۔
جوان سال، کڑیل گراں ڈیل بیٹے
مجھے چھوڑ کر سلطنت کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں
سنو اجنبی ان کی ماں ان کی خدمت میں مصروف ہے اور خوش ہے
میں تنہا اکیلا یہاں دربدر ٹھوکریں کھا رہا ہوں
بہت دیر سے بیٹیوں کو بھی دیکھا نہیں
اب تو بیٹوں کے چہرے شناسا نہیں
انہیں دیکھنے کو ترستی ہیں آنکھیں مری
سنو میری آنکھوں کی ٹھنڈک مری بیٹیاں اب کہاں ہیں
وہ میرے جواں سال بیٹے کہاں ہیں
مری ہم سفر بنتِ حوا کہاں ہے

سنو اجنبی تم مری داستاں مختصر ہے
مرے چہرے کو بنتِ حوا نے نوچا
سنو میرے بیٹوں نے دامن کو کھینچا
مری بیٹیوں نے گریباں کو پھاڑا
مری داستاں مختصر ہے

بڑھاپے کی دہلیز پر سلطنت کی فصیلوں سے باہر
دعاؤں کا محتاج میں موت کا منتظر ہوں۔

۴

مسافر سنو' میں ہمیشہ سے شہرِ عدو میں رہا ہوں
مجھے میرے احباب نے دکھ دیئے ہیں
مجھے دشمنوں نے بہت ہی ستایا
مرے بھائیوں نے مجھے چاہ کنعاں میں پھینکا
مری ماں ہمیشہ مرے خالی ہاتھوں کو تکتی رہی
میری بہنیں ہمیشہ مرے خالی دامن کو تکتی رہی ہیں

یہ شہرِ عدو ہے کہ کوفہ کی بستی
مری عمر کا ہے یہ زندان
مسافر سنو' اہلِ دنیا تو سب دولت و منصب و جاہ کے ہیں پجاری
مگر میری دولت' مرا مال و زر' منصب و جاہ میرے لئے کچھ نہیں
میں تنہا کھڑا ہوں
بسیط آسمانوں کی وسعت میں گم
میں تنہائیوں کے سمندر میں گم تشنہ لب
سوچتا ہوں
کہ میرے دکھوں کا مداوا ہے کیا
میں تنہا ہوں کیوں' میری تنہائیوں کا مداوا ہے کیا
خدا کی زمیں پر خدا کا یہ نائب' یہ میں ابنِ آدم
نہایت ہی مجبور و مقہور ہوں
کہ انساں مشقت کی مخلوق ہے
مگر آدمی تو نہایت ہی کمزور ہے
کہو اجنبی یہ مرے خواب کیا ہیں۔ یہ خوابوں کی تعبیر کیا ہے
یہ بیماری' کمزوری' مرنا یہ جینا
یہ تقدیر کیا ہے؟
کوئی بادشہ ہے تو کوئی گدا ہے
کہو اجنبی روز و شب کی یہ زنجیر کیا ہے
کہ جس میں بندھا میں اکیلا

میں کوتاہ قامت، خمیدہ کمر، قرن ہا قرن سے
بوجھ اٹھائے دکھوں کا
کہاں جارہا ہوں
وہ منزل کہاں ہے کہ میں جس کی جانب رواں ہوں
مرے اجنبی کچھ بتا، زندگی، موت کیا ہے؟
یہ سب کھیل کیا ہے؟
تماشا یہ کیا ہے؟

۵

مسافر سنو
سنو اجنبی
یہ میں بنتِ حوا
کہ جس نے بڑے صبر سے ابنِ آدم کے شکوے سنے ہیں
وہی ابنِ آدم جسے میں نے جتنوں سے پالا
جسے میں نے ٹانگوں پہ چلنا سکھایا
جسے بولنا بھی سکھایا
سنا آجکل وہ بہت بولتا ہے
ہمیشہ مرا ہاتھ اس کا مسیحا بنا ہے
مرے مسکرانے سے رونق ملی ہے اسے
مجھے فخر ہے میں ہمیشہ دکھوں اور سکھوں، دھوپ اور چھاؤں
میں اس کے ہمراہ تھی
مگر کیجئے کیا
میں خود بھی دکھی ہوں
وہ میری رفاقت میں تنہا رہا
میں اس کی رفاقت میں تنہا رہی
الفراق الفراق الفراق الفراق
یہی المیہ ہے
کہ آدم سے حوا کا رشتہ ہی بنیاد ہے المیے کی
یہی المیہ ہے

۶

مسافر رکو اور سنو
میں سدھارتھ ہوں' میں گیان کی روشنی کا امیں ہوں
مجھے جانتے ہو' میں بدھ ہوں
مرے پاس آؤ' تمہیں شانتی ہو
تمہارے دکھوں کا مداوا ہے کیا
یہ میں جانتا ہوں
ازل سے ابد تک دکھوں کی حکومت رہے گی
کہ دکھ ہی امر ہے خوشی عارضی ہے
یہ دنیا جسے تم نے جنت ہے سمجھا
دکھوں کا یہ گھر ہے
یہ جیون دکھوں کا ہے چشمہ
فقط تشنگی ابن آدم کی تقدیر ہے
تمہارا بدن ہی تمہارے دکھوں کا جنم ہے
نہ ہونا ہی نروان ہے۔

مسافر رکو اور سنو
میں یونان کا فلسفی اک رواقی اپیقوریہ ہوں
تمہارا بدن لذتوں کا ہے چشمہ
مسرت کا پیکر
یہی مقصد زیست ہے
یہ لمحہ تمہارے لئے ہے اسے ہنستے ہنستے گزارو
یہ دنیا تو نعمت کدہ ہے
یہ دنیا حسیں لذتوں کی زمیں ہے
یہ دنیا حسیں ہے
یہی زندگی ہے

مسافر رکو اور سنو
کہ میں ابن عربی ہوں میں شیخ اکبر
مرے پاس آؤ کہ تم التباس شروخیر میں مبتلا ہو
کہ یہ خیر و شر تو تصور کا جادو

انا مخیر ہے اور خدا مخیر کل ہے
مسافر سنو'
تمہیں اجنبی ہو' تمہیں اک مسافر تمہیں اک حقیقت' تمہیں ایک دھوکا
حقیقت خدا ہے
یہ دکھ اور سکھ سب تصوّر ہیں۔ اور واہمے کا کرشمہ
حقیقت خدا ہے
زمانہ خدا ہے اسے تم برا مت کہو
تمہارا زمانہ تمہارے لئے قید ہے
مرے پاس آؤ
خدا کے زمانے میں آؤ
زمانہ خدا ہے
حقیقت خدا ہے

محمد افسر ساجد

ملاقات

آج پھر تجھ سے ملاقات ہوئی
پھر وہی طرزِ تغافل
کہ مری جانِ حزیں
اپنی نادیدہ تمناؤں کے انبار تلے
برزخِ دہر کی تاریک کمیں گاہوں میں
خواہشِ وصل کی جاں سوز عقوبت کے سیہ خانوں میں
اپنی ناکردہ گناہی کی (پشیمان) اسیر!

تیری بیداد بجز پاسِ تعلق جاناں
تیرے معتوب طلبگار کی (ہر ساعتِ بیدار کی)
دم ساز رہی
میں تجھے کیسے بتاؤں کہ تری چارہ گری
میرے احساسِ ندامت کا مداوا نہ بنی

چارہ گر تو نے عذابوں میں مجھے ڈال دیا
اب وہی میں ہوں' وہی شام' وہی تیرا خیال
اک روایت جو شعورِ غمِ جاں کی صورت
ایک احساس جو شرمندۂ تعبیر رہا!!

یاسمین حمید

تعلق

یہ کیسا ڈر ہے
جو منسوب ہے تم سے
یہ کیسے سائے ہیں
بھوپ کے سائے
جو میرے گرد ہر لحظہ
کسی وحشت کی بے آواز لے پر رقص کرتے ہیں
یہ کیسا زہر ہے
بے ذائقہ' بے رنگ
جو میرے لہو میں جذب ہو کر
دھیرے دھیرے
اس کے تازہ رنگ کو گدلا رہا ہے
آنکھ سے اوجھل
دیارِ ذات میں
دیوار سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
مری ہستی کے زنداں سے
نکلنے والے رستے بند ہوتے جا رہے ہیں
اور تمہاری مطمئن آنکھیں
درِ زنداں کو تھامے
میرے بے آواز اندیشوں پہ
پہرا دے رہی ہیں!

یونس متین

کالی یگ

اگر ہم سانس لیتے ہیں
برہما کے کلپ میں
تو منوانتر میں پہلے چترِیگ کی شاخ پر کھلتے ہوئے چاروں یگوں میں
یہ رواں یگ آخری یگ ہے
یہ کلجگ
کالی یگ ہے
شودروں کا' قاتلوں کا' بے وفاؤں' انتشار امن کا' مذہب کے بکنے کا
کہ مذہب تین ٹانگیں کھو کے مرگ ناگہاں کی زد میں رہتا ہے
اسی یگ میں مری سیما
مری جاں تم بھی زندہ ہو!
تمہاری چاند کرنوں ایسی صورت بھی
مہکتی' خوبرو' خوشبو بھری باتیں بھی' پاکیزہ محبت بھی
تمہاری پھول سی معصوم آنکھیں بھی
کہ جس میں ہر کرت یگ کا ستارا جگمگاتا ہے
کرت یگ اولیں یگ ہے

کسی مفروضے کی بنیاد میں رکھے ہوئے سب علم کی روشن شعاعوں سے فزوں تر ہیں ترے ہاتھوں
کی شمعوں کی ضیائیں جو ابد تک میری آنکھوں کے لیے رستے کی صورت ہیں۔
محبت انت ہے لا منتہا کا استعارہ ہے
مری سیما
تمہارے پارسا سینے کی سچائی
کسی منطق کی سچائی سے پہلے کا زمانہ ہے
کہ ہم انسان پہلے اور شودر بعد میں ہو گئے

○

میں پہلی جنگ میں ہارا
تو دنیا میں چلا آیا
اسی دنیا میں رہ کر دوسری بھی جنگ لڑنا ہے
ابھی میں امن کے عرصے میں ہوں کہ ایک جنگ اور دوسری کے
درمیاں کو امن کہتے ہیں
ہبوطِ آدم و دنیا
کی ان جنگوں کے بیتے درمیاں میں
تم بھی زندہ، میں بھی زندہ ہوں
وہ جیسے اک خزاں سے دوسری کے درمیاں میں پھول کھلتے
اور بہاروں کی مہکتی الپسرائیں مسکراتی ہیں
اگر ہم شانتی کے پھول ہیں اور امن کے عرصے میں رہتے ہیں
تو پھر یہ کالی یگ کیا ہے
برہما کا کلپ کیسا؟

○○

انور زاہدی

ایک نظم صومالیہ کے لیے

زمیں اک۔۔۔
خدا بھول بیٹھا جسے
جو رحمت کے سائے کو ترسی ہوئی
ہے یوں سوختہ تن، گھری قحط میں
کہ اب فصلِ گل
آب، اور سبزہ زار
حکایات ہیں کہر میں گم شدہ
جہاں فصلِ گندم فراوان تھی
وہاں آج تنکا بھی عنقا ہوا
سلگتی ہوئی ریت میں چارسو
گھسٹتے ہوئے ڈھور ڈنگر سبھی
بھٹکتے ہیں جینے کی پاداش میں
عدم کی طرف چلتے جاتے ہیں یوں
کہ بس موت ہی ان کا مقسوم ہے
ہوا شور۔۔۔۔۔۔
آئی دِساور سے بھیک

قطاروں میں استادہ لپٹے ہوئے
سسکتے ہوئے نیم مردہ سے تن
جو اشرف ہیں ساری ہی مخلوق میں
پریشان تکتے ہیں سوئے فلک
لپکتے ہیں تھوڑی سی خیرات پر
کہ ان کا خدا اب کہیں بھی نہیں

رفیق سندیلوی

ابھی وقت ہے لوٹ جاؤ

سنو! کثرتِ خاک میں بسنے والو
سنو! توسنِ برق رفتار پر کاٹھیاں کسنے والو
یہ پھر کون سے معرکے کا ارادہ
تمہاری نسوں میں یہ کس خوابِ فاتح کا پھر بابِ وحشت کھلا ہے
فصیلوں پہ اک پرچمِ خونچکاں گاڑ دینے کی نیت
کئی لاکھ مفتوح جسموں کو پھر حالتِ سینہ کوبی میں روتے ہوئے دیکھنے کی تمنا
یہ کس آبِ دیوانگی سے بدن کا سبو بھر رہے ہو
سنو تم بڑی بدنما رات کی دھند میں فیصلہ کر رہے ہو
ادھر سینکڑوں کوس پر اک پہاڑی ہے جس پر کوئی شے نہیں ہے
وہاں ہر طرف سے تمہیں آگ کے غول گھیرے میں لینے کی خاطر کھڑے ہیں
ابھی وقت ہے لوٹ جاؤ
سنو! عجلتِ فکر میں کوئی بھی کام انجام پاتا نہیں
پھر کسی ساعتِ شب گرفتہ میں کوئی ستارا بلاتا نہیں

لمس کی تحریر جھوٹی ہے

لہو روتے ہوئے لمحے
فصیلِ ہجر پر روشن ستارا جل بجھا آخر
بدن کے پار سانسوں کی تمازت کون چنتا ہے
سرِ محضر لکھے دعووں کا پس منظر بدلتا ہے
ہوائے شام کے ہاتھوں میں اک پیغام ہے
جس کی عبارت خط کشیدہ ہے
مگر ہم حرف کی تفہیم سے تو نابلد ٹھہرے
تری آنکھوں کے روشن پھول لفظوں کی طرح
مفہوم سے عاری

سفر کیسا!
کہ رستے رابطوں نے رہن رکھے ہیں
تعلق ریت کی دیوار ہے ـــ اور ریت کی دیوار کو
گرنے سے کوئی روک سکتا ہے؟

ہوا خود سر
حدِ ادراک تک چھائی ہوئی ریگ رواں ـــ اور
آسماں تک پھیلتا دشتِ فراقِ جاں

اندھیرا ہی اندھیرا ہے
بصارت چنتی آنکھوں میں گئی تصویر ٹوٹی ہے
کہیں پوروں میں عکسِ لمس کی تحریر جھوٹی ہے
لہو روتے ہوئے لمحے
بدن پر قرض لکھتے موسموں کے ساتھ زندہ ہیں
ہم اپنے آپ مجرم تھے
ہم اپنے آپ منصف تھے
ہم اپنے فیصلوں پر اب خطِ تنسیخ کیا کھینچیں
اگر محسوس، نامحسوس کو مرکز بنا ڈالے
تو کھلتے دائروں کے جال سے باہر نکل آنا
کبھی ممکن نہیں رہتا

عدنان بیگ

مجھے خوشبو نے پاگل کر دیا ہے

کبھی جب ابرِ آوارہ
زمیں کے خشک چہرے پر
محبت کی نظر ڈالے
محبت کے جزیروں کی
کشش بادل کے ٹکڑوں کو
بدن پر اوڑھ لیتی ہے
زمیں کو وصل ملتا ہے
زمیں کی سوندھی خوشبو سے
فضا میں گیت کھِلتے ہیں

میں اک بادل کا ٹکڑا ہوں
مجھے بوندوں میں ڈھلنا ہے
مجھے مٹی کے چہرے کی بشارت دو
فضا میں گیت کھِلنے دو
مجھے مٹی سے مِلنے دو

میں گم ہو گیا ہوں

پلٹ کر مہ و سال کی رائیگانی کو دیکھوں
تو کچھ یاد آتا نہیں ہے
کہ کن آنگنوں میں ان آنکھوں کو چھوڑا ہے....!
اور کس جگہ پر
دھڑکتے ہوئے دل کے ہمراہ رستہ چلا تھا!
مجھے یاد آتا نہیں ہے!
کہ دھندلا گئی آنکھ کی پتلیوں میں
کہاں ریتلے آئینے ہیں
کہاں پر مرا عکس پانی میں کشتی ہوا تھا
کہاں میرا سینہ
ہر اک سمت پھیلے ہوئے ریگ زاروں میں بکھرا...!

ہوا تیز تھی.......
اور فقط ایک لمحے کو
اس تیز چلتی ہوا کی فصیلوں میں
اک در کھلا...!

اور نظر آسمانوں سے آتی کرن سے پھسلتی ہوئی
جنگلوں کے اندھیروں میں گم ہو گئی ہے
کرن اور اندھیرے کے مابین تیزی سے گرتی ہوئی آنکھ سے
کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکا ہے!
بہت تند خو تھی ہوا اور مجھ سے
کوئی حرف بھی ریت کی تختیوں پر بنایا نہیں جا سکا ہے!
میں خاک سفر تو ہوا ہوں مگر۔۔۔۔۔۔۔۔!
گرد آوارگی میں کسی راستے پر
مرے پاؤں جمتے نہیں ہیں
یہ دشت اور دریا، ہوا اور مٹی
مرے دوست ہیں پر مرے ساتھ چلتے نہیں ہیں!

میں حیرانیوں کے سفر میں۔۔۔۔۔۔۔۔!
کہاں رہ گیا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔!
کہاں جی رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!
۔۔۔۔۔۔!
میں گم ہو گیا ہوں
کہیں اپنے اندر کے وحشت کدے میں
جہاں پر مرے سنگ ریزے تو بکھرے ہوئے ہیں
مگر میں نہیں ہوں۔۔۔۔۔!
۔۔۔۔۔۔ کہیں بھی نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔!

محمد نذیر

شہرِ منحرف

رات بے درد ہے۔اور دل کا یہ عالم جیسے
اجنبی دیس کی بے رحم گزرگاہوں میں
کوئی ناکام شب و روز مداوا ڈھونڈے
ناشناساؤں میں دلدار شناسا ڈھونڈے
سایۂ زلف میں کھلتے ہوئے آنکھوں کے کنول
کوئی غمزار نظر۔ عقدۂ دشوار کا حل
سمت منزل کے تعین کو ستارہ ڈھونڈے!

رات بیدرد ہے زنداں کے محافظ کی طرح
نیند کس برج میں پابندِ سلاسل ہو گی؟
راہ تکتی ہوئی دُکھتی ہوئی بے خواب آنکھیں
ڈوبتے چاند سے دل اور ہوا ہے بوجھل
کوچہ و روزن و در سب ہیں نظر سے اوجھل
دل کا یہ بوجھ یہ بے منزل و بے میل سفر
شہر کا شہر ہے جیسے کسی جادو میں اسیر!

کوئی دیکھو ہی مل جائے تو اس سے پوچھوں
باتوں باتوں میں اسے یا مجھے یاد آجائے
بندیٔ ثور میں تسکین کا پیامی کلمہ
جس کی تاثیر سے جادو کا عمل ہو زائل
بام و در اپنے خد و خال دوبارہ پائیں
سارے لوگ اپنے در و بام سے باہر آئیں
ورنہ بے منزل و بے میل سفر بھی کب تک
کل یہی پاؤں جو زخمی ہیں رہیں یا نہ رہیں!

خوشی محمد طارق

قسمت

دستِ زر میں ہر طرف پر تولتی
ہاتھ میں محنت کشوں کے —— ڈولتی
چُپ ہی چُپ، گُم سُم، نہ کچھ یہ بولتی
پھول پتوں کے بنا یہ خشک سوکھی ڈالیاں
حلقۂ زنجیر کی صورت عیاں
چند راہیں بے نشاں
دھول پر ناگن کی بل کھاتی پریشاں سی لکیر
یا کسی شہناگ کا دو شاخہ پھن
سیم تن
ایک اک شکن
مندمل سے زخم ہیں گویا دو دھاری تیغ کے
یا کسی ترکش سے نکلے دوڑتے اڑتے خدنگ
ابھی ابھی ڈور اونچے پیڑ سے اٹکی پتنگ
کاغذی گھوڑوں کے رتھ کی باگ!!!
موئے زلفِ حوّر
نازکی ایسی کہ چھو لینے سے چوّر

مثلِ کسبِ عنکبوت
شمع کے پیکر میں سوزاں تارِ سوت
ریل کی بے سمت پٹڑی کی طرح
جس کی ہر رہ اور ہر دروازہ بند
آڑھی ترچھی ہاتھ کی ریکھائیں چند

∞

سعید احمد

میں تمہیں کل ملوں گا

میں تمہیں کل ملوں گا
طلوعِ سحر سے ذرا دیر پہلے
کسی باغ کی نیم تاریک سی راہ پر
خواب خواب آنکھ میں
رتجگوں کی روانی لیے
شہر کے خوبصورت مکانوں کے بیچ
اک عجب خواہشِ لامکانی لیے
میں تمہیں کل ملوں گا
کسی کھیت سے پھوٹتی
نرم کرنوں کی ضو میں
امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے
اک جہاں کے سفر کی فقط رایگانی لیے
ایک لمبی مسافت کی سرشاریوں میں چھپی ناتوانی لیے
میں تمہیں کل ملوں گا
کہیں دوپہر کی چمکتی ہوئی دھوپ کے شامیانے تلے
دم بخود بے صدا

جسم کے موم کی قبر میں جلتا
ہاتھ میں حاصلِ عمرِ فانی لیے
سادہ ملبوس اندر مچلتی جوانی لیے
میں تمہیں کل ملوں گا
چراغِ شفق ماند پڑنے سے پہلے
کسی بام پر
پیار کے نام پر
بات بے بات پیڑوں میں ہنستی ہوا کے گھنے شور میں
شاعرِ دل رُبا کے اُجڑتے دنوں کی نشانی لیے
دکھ کی چادر میں لپٹی ہوئی بدگمانی لیے
میں تمہیں کل ملوں گا
کہیں خواب گاہِ شبِ تیرہ و تار میں
بستیوں سے پرے
غیر آباد قلعے کی خستہ فصیلوں کے پیچھے
ہر اک موئے تن میں رچی تشنگی کی کہانی لیے
ایک گمنام سی بے زبانی لیے
میں تمہیں کل ملوں گا۔

آغا بابر

ناٹک سے وابستگی

میں اور میرا چھوٹا بھائی الطاف بچپن میں کاغذ کی تیلیاں لے کر بیٹھ جاتے۔ کاغذ کو کاٹ کر اوٹ پٹانگ سے آدمی بناتے۔ ایک ٹیڑھا میڑھا آدمی تیلی پر جوڑ دیتے۔ بس کہہ دیتے کہ یہ شیخ چلی ہے۔ وہ شیخ چلی ہو گیا۔ سب مان لیتے کہ یہ شیخ چلی ہے۔ Seeing is believing کی یہ بہترین مثال ہے۔

ایک تیلی کے ساتھ چار چار پانچ پانچ آدمی لئی کے ساتھ جوڑ دیتے۔ یہ بادشاہ کی فوج بن جاتی۔ بادشاہ بھی اسی طرح کا ہوتا' اس کے سر پر تاج بنا دیتے تو وہ ذرا مختلف ہو جاتا۔ کبھی پیدل ہوتا کبھی گھوڑے پر بٹھا دیتے۔ ہماری قینچی بڑے عجوبے کرتی' ٹیڑھے میڑھے نمونے کاٹ لئے جاتے۔ کہہ دیتے یہ فوج ہے۔ دیکھنے والے کو ماننا پڑتا کہ یہ فوج ہے۔ یہ بادشاہ ہے جو فوج سے آگے آگے جا رہا ہے۔ دیکھنے والوں کو ماننا پڑتا کہ یہ بادشاہ ہے۔

شام کو اعلان کر دیا جاتا کہ آج سب تیار ہو جائیں۔ ڈراما دکھایا جائے گا۔ والدہ سے دوپٹہ مانگ کر اس کو دروازے میں لٹکا دیا جاتا۔ پیچھے روشن لالٹین رکھ دی جاتی۔

میں اور الطاف اپنا سامان اپنی اپنی طرف رکھ کر بیٹھ جاتے اور دوپٹے پر اپنے فرضی پتلے نچانے لگتے۔ ایک فوج اس کی طرف سے آہستہ آہستہ بڑھتی ایک میری طرف سے پھر ایک دوسری کو چونچیں مارتیں اور پیچھے ہٹ جاتیں۔ پھر آپس میں ٹکراتیں اور زور کی لڑائی ہونے لگتی۔ ایک تیلی دوسرے پر کھٹ کھٹ لگتی۔ کاغذ سے کچھ تیلیوں کی لئی اکھڑ جاتی اور وہ تیلی سے جھڑ جاتے۔ بعض دفعہ تیلی پر سے چار پتلے گر پڑتے ایک رہ جاتا۔ "گھمسان کا رن پڑا ہے"

میں دروازے کی اوٹ میں سے کہتا "ساری فوج ماری گئی۔ ایک سپاہی بچ گیا ہے وہ بھی زخمی ہے۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا ہے"

پھر میں نئی تیلی اٹھا لیتا۔ اس پر پانچ سپاہی ہوتے۔ کہتا کمک آن پہنچی ہے۔ فوج ہارنے والی نہیں۔ اتنے میں دوسری طرف سے الطاف اپنی تیلی آگے بڑھاتا۔ اس پر بھی پانچ سپاہی چپکائے ہوئے ہوتے دونوں طرف سے آہستہ آہستہ فوج آگے بڑھتی۔ پھر سے لڑائی ہونے لگتی۔ ایک کو جتا دیا جاتا۔ پھر بادشاہ دربار کرتا۔ غریب لوگ آتے بادشاہ ان کو اشرفیاں دیتا۔

یہ تو اس وقت کی بات ہے جب ہم مدرسے میں پڑھتے تھے۔ اس سے پہلے کی بات یہ ہے جب میں بہت چھوٹا نانی کی گود میں لیٹ کر کہانی سنتا' چولہے کے آگے نانی پیڑھی پر بیٹھی ہے اور میں اس کی گود میں لیٹا کہانی سن رہا ہوں۔ ایک بکری سے دو میمنے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھنکو اور منکو غار میں بند ہیں۔ ان کی ماں غار کے منہ پر پتھر رکھ کر باہر چلی گئی ہے اور کہہ گئی ہے دیکھو چھنکو منکو دروازہ نہ کھولنا۔

اب ان کو کھانے کے لئے بھیڑیا آتا ہے۔ دروازے کے ساتھ لگ کر کہتا ہے (اس مقام پر علی کمال کر جاتی۔ بھیڑیے کی آواز کو بھاری لہجہ میں دہشتناک بنا کر کہتی) "میں آئی تمہاری ماں کہ بوا کھول دیو دے۔"

اس دہشتناک آواز کے مقابلے میں بکری کا ایک بچہ سہمی سہمی ڈری ڈری آواز میں کہتا "نہ نی ھنکو نہ نی ھنکو کھا جاؤ گا پی جاؤ گا' دروازہ نہ کھولیں۔"

میری آنکھیں بند ہو جاتیں اور سو گیا ہوتا۔

کرداروں کی اونچی نیچی آواز' لہجہ کا اتار چڑھاؤ' کہانی کا بیانیہ' اس کی اندر کی طاقت کس پر اثر نہیں کرتی۔ کہانی کو جس طرف مرضی موڑ دو مڑ جائے گی۔ کہانی کے کردار آپ کے ساتھ ہیں جس طرح ان سے کہو وہ کریں گے۔ کہانی کا آغاز' درمیانی حصہ' خاتمہ۔ کسی کا خاتمہ اچھا کسی کا نہیں۔ کوئی کہانی خوش کرتی کوئی اداس۔ ہر کہانی کا اپنا انداز اپنا مزاج ہے۔ کہیں گولی چلے گی۔ کہیں تلوار کی لڑائی۔ کبھی بادشاہ بیمار پڑ جائے گا حکیم آئے گا علاج ہوگا۔ بادشاہ تندرست ہو جائے گا خوشی منائی جائے گی۔ پھر ملک پر حملہ ہوگا۔ وہ فوج لے کر لڑنے جائے گا۔ فتح مند ہو کر واپس آئے گا خوشی منائی جائے گی۔ خاتمہ اچھا ہو تو کہانی اچھی لگتی جاتی ہے۔ خاتمہ برا کم ہی ہوتا تھا۔

چھٹی جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک بڑھئی کی کہانی دوسری کہانیوں سے مختلف تھی۔ کہانی بیان نہیں کی گئی تھی بلکہ بڑھئی اور گاؤں کا کسان ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ بیچ میں ایک تصویر بھی تھی۔ چھکڑے کا ایک مرمت طلب پہیہ دیوار کے ساتھ کھڑا کیا ہوا۔ بڑھئی ہاتھ میں ہتھوڑا پکڑے کسان سے باتیں کررہا ہے۔ اس نے ہتھوڑا اس مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کہ کوئی طاقت اس ہتھوڑے کو اس کے ہاتھ سے الگ نہیں کر سکتی۔ بڑھئی کی گفتگو کو اس کی تصویر کے ساتھ دیکھ کر پڑھا جاتا تو مجھے لطف آتا۔ ایک دن میں نے اس لطف میں اپنے ہم جماعت سراج کو شامل کر لیا۔ کہا تم کسان کا مکالمہ پڑھو میں بڑھئی کا پڑھتا ہوں۔ سننے والے بلدیو سہائے اور حمید۔ جب ہم نے مکالمے پڑھے تو بلدیو سہائے اور حمید کو بہت لطف آیا۔ ہم نے کہا "کیوں؟" ان کو سننے کا اتنا لطف آیا کہ انہوں نے ہم دونوں سے کتابیں چھین لیں اور بولے "اب ہم پڑھتے ہیں تم سنو" وہ دونوں پڑھنے لگے۔ میں اور سراج سنا کیے۔ ہمیں پہلے پڑھنے میں لطف آیا تھا اب سننے میں آرہا تھا۔

کمال کی بات مکالمہ بولنے والے کو اپنی جگہ لطف آتا ہے سننے والے کو اپنی جگہ۔ واقعہ یوں ہے کہ جب ڈرامے کی شکل میں کہانی پیش کی جائے تو آنکھوں کے سامنے وہ انجام کو پہنچتی ہے۔ ہر کردار ہر فرد کہانی کا ذہن میں ثبت ہوئے جاتا ہے۔ وہی بات کرداروں کی اونچی نیچی آواز اور لہجہ کی ہے۔ ٹیلیویژن کے ڈبے سے پہلے ریڈیو کا ڈبا آیا۔ ریڈیو کا ڈراما کان سے سنو تصور کی آنکھوں سے دیکھو ان دو ڈبوں سے بہت پہلے کی بات ہے' ایک اور ڈبا ہوتا تھا۔ اس میں بھی ساری دنیا کا روح کیوڑہ تھا۔ زندگی کی تمام اقدار کا عرق تھا۔ جنس لطیف کی ازلی کشش سے لے کر دین و ایمان کی سلامتی تک کی داستان بند تھی۔ خیال کی رفعت' سائنس کی ترقی' آوارگی کی لذت' ماضی سے محبت' سب جادو اس ڈبے میں بند تھے۔

ایک مفلس الحال اس متمول کائنات کو اپنے کندھے پر اٹھائے جہاں ملا اسے ایک شوق خاص سے روکا' محدب شیشے کے طاقچے میں اپنا چہرہ گاڑھ دیا۔ تماشا دکھانے والا مداری تصویریں بدل بدل کر دل میں اتر

جانے والی آواز سے کہتا۔ "بمبئی کا بازار دیکھو۔ بازار کی رونق دیکھو ٹریم دیکھو۔ گھوڑا گاڑی دیکھو۔ کھیل تماشا دیکھو۔"

"اب ریل گاڑی دیکھو۔ پھک پھک چلتا انجن دیکھو۔ فراٹے بھرتے ڈبے دیکھو۔ مسافروں کی ریل پیل دیکھو۔ بہتی گنگا دیکھو بنارس کا بازار دیکھو۔ مندر تیرتھ دیکھو۔ گنگا کا اشنان دیکھو۔ دہلی دیکھو۔ قطب صاحب کی لاٹھ دیکھو۔ اونچا مینار دیکھو۔"

"مکہ مدینہ دیکھو۔ نور کا اجالا دیکھو۔ اللہ کا گھر دیکھو۔ حضور کا روضہ دیکھو۔"

"بارہ من کی دھوبن دیکھو۔ سات سنگار دیکھو۔ بازو کے کنگن دیکھو۔ موتیوں کی مالا دیکھو۔"

بچوں کے خیال کو بہلانے اور محسوسات میں اتر جانے والی یہ تصویریں بڑا مزہ دیتیں۔ آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے والا قطب مینار خیال کی رفعت کو اکساتا۔ بمبئی کی رونق میں زندگی کی ہمہ ہمی مچلتی دکھائی دیتی' ریل گاڑی کی حرکت میں زندگی کی دھکا پیل اور سائنس کی ترقی کا سراغ ملتا۔ گنگا اشنان میں ننگے بدنوں پر پانی کے ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹے اڑتے ہندو جاتی کے دھرم کو پوتر کرتے' مکے مدینے سے ایمان افروز مرکزیت کا احساس ابھرتا اور چھپرکھٹ پر اپنے حسن کی تمام رعنائیوں کے ساتھ موتیوں کی مالا پہنے بازو کا سہارا لئے نیم دراز گدرائے بدن کی بنی سنوری دھن واد دھوبن کیا غضب ڈھاتی۔

کارگہ انسانی کا یہ بصری کچومر اوپر ڈبے والے کی من موہنی آواز کا آڈیو ہمارے اعصاب پر پیار کا ہاتھ پھیر جاتا۔

جس نے یہ ڈبا بنایا اس نے زندگی کی صداقتوں کی نمائندگی کرنے والی یہ تصویریں کیا خود سے چنیں یا کوئی خاص بورڈ اس کام پر مقرر کیا گیا۔ اس نے عورت کی تصویر ڈبے میں کیوں بند کی۔ یہ تصویر مرد کی جنسی فعالیت بحال رکھنے کے لئے بڑی ضروری تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ تصویر دھوبن کی کیوں؟

دھوبی ہماری پردے والی تہذیب کے زنانخانہ میں دھلائی لے کر داخل ہو سکتا تھا' اجلے کپڑے پہنے نہائی دھوئی بنی سنوری دھوبن کپڑوں کی گٹھڑی سر پر رکھے کمر میں سو سو بل ڈالتی زنانخانے میں داخل ہو کر سلام بجالاتی

بیگمات کے زیر جامے جن پر مہینے کے نشان لگ جاتے تھے دھوبن کو الگ سے دیئے جاتے۔ پھر سینہ بند اور انگیا دھوبن کے حوالے کی جاتی کہ ہلکے ہاتھ سے دھوئے ہلکا کلف لگائے۔ زنانخانے میں لانے سے پہلے دھوبن کپڑوں کو ایک خاص ترتیب سے رکھتی تھی۔ اوپر تولئے کرتے چادریں جاجم شلوار پاجامے انگرکھے پھر اس کے نیچے تکئے کے غلاف دسترخوان رومال رکھے جاتے' زیر جامہ انگیا قسم کی چیزیں دھلائی کے نیچے رکھ کر لاتی۔ ایک طرف اندرون خانہ کے نو عمر لڑکے دھوبن کے ہار سنگار سے آنکھیں سینکتے اور دوسری طرف اس کے ہاتھوں محبت نامے بھی اندر پہنچ جاتے دھلائی دیتے دیتے وہ موقع ڈھونڈ کر ایک بی بی کے ہاتھ میں چپکے سے پرچہ بھی دے دیتی تو اس طرح دھوبن کا بڑا رومانٹک کردار تھا۔

بٹالہ میں محرم کے دنوں میں تعزیئے نکلتے دسہرے کے دنوں میں جھانکیاں۔ تعزیئے اپنی مقررہ جگہوں پر رہتے۔ سہ پہر کو ماتمی جلوس کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ یہ جلوس گلی محلوں بازاروں میں سے گذرتا۔ دسہرے کے دنوں میں ہندؤں کے محلوں میں رام لیلا کا ناٹک ہوتا۔ مقررہ روز کو جھانکیاں نکلتیں' جھانکیاں خوب نام تھا۔ رام سیتا کی کہانی کے مختلف مناظر کو جھانکنا ۔ مختلف مناظر کا سوانگ بھرا جاتا۔

ہمارا ہم عمر ملازم رکھا ہمارے ساتھ کھیلتا۔ میں اور الطاف چوراہے میں جاکر جھانکیاں دیکھتے چھکڑے پر لکڑی کے تختے رکھ کر اسٹیج بنائی ہوتی ارد گرد جمگھٹا ہوتا۔ دو تین گیس جل رہے ہوتے بہت سی جھانکیاں رام لچھمن اور سیتا پر مشتمل ہوتیں۔ لچھمن ہمیشہ بڑا خوبصورت ہوتا ہر چھکڑے پر ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی ہوتی۔ چوراہے میں چھکڑا دم بھر کے لئے رکتا طبلے پر تھاپ پڑتی ایک شخص ہارمونیم پر کوئی شبد گاتا پھر چھکڑا گزر جاتا۔

رکھا کہتا "کال نہیں آیا" ہم بھی دل میں کہتے کال نہیں آیا۔

وہ شخص جو کال بنتا سال بھر لکڑی کی صندوقچی بغل میں دبائے گلی محلوں میں ملائی کی برف بیچتا پھرتا۔ وہ میانہ قد تھا اور منحنی جسم مگر جھانکیوں میں انسانوں کا خون پینے والا خونخوار راکشش بنتا۔ عام زبان میں کالی کہتے۔ ہاتھ پیر منہ سارا بدن کالا کیا جاتا۔ آنکھیں اس کی بجو کی آنکھوں کی طرح خوفناک دکھائی دیتیں۔ وہ لمحہ بھر بس اداکاری کرتا ہم حیرت میں ڈوب جاتے۔ اس کی جھانکی آتی تو رکھا تاب شوق سے اعلان کرتا "کال آگیا!!!"

چھکڑا رکتا۔ کوئی ہارمونیم نہ ہوتا۔ طبلے پر صرف دھنن دھنن تھاپ پڑتی۔ پھر لمحہ بھر کی خاموشی۔ کالا بھجنگ آدمی کود کر اٹھتا۔ اپنے قد سے کہیں اوپر دکھائی دیتا۔ تین چار مرتبہ لکڑی کے تختے پر اس زور سے پاؤں مارتا کہ جیسے تختہ ٹوٹ جائے گا۔ اچھل کر بے حد خوفناک آواز سے کہتا "جو کچھ مروے کھاتا ہے میں وہ کال ہوں۔"

ہم حیرت میں ڈوبے واپس آرہے ہوتے۔ رکھا کہتا "پتہ ہے یہ کال شراب کی پوری بوتل پیتا ہے۔"

ہفتے دس دن بعد وہی ننھے جسم کا مردار سا آدمی صندوقچی بغل میں دبائے ہماری گلی میں سے صدا لگاتا ہوا گزرتا "ملائی کی برفے۔"

بھائی عاشق یعنی عاشق حسین بٹالوی نے میرے نام "نونہال" اور الطاف کے نام "پھول" لگوا دیا تھا بچوں کے یہ ہفتہ وار رسالے لاہور سے نکلتے تھے۔ "پھول" مکتبہ دارلاشاعت سے نکلتا تھا جس کے مالک سید امتیاز علی تاج کے والد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی تھے۔ "نونہال" کے ایڈیٹر حکیم احمد شجاع تھے۔ میں اور الطاف گرمی کی چھٹیوں میں لاہور گئے۔ میں ساتویں میں تھا الطاف پانچویں میں۔ آقا جان نے پوچھا "کیا کیا دیکھو گے؟"

الطاف بولا "عجائب گھر، چڑیا گھر۔"

میں نے کہا "تھیٹر، جہانگیر کا مقبرہ۔"

سب دیکھ لیا تو ایک شام تھیٹر کی باری آئی۔ بھائی دروازے سے باہر نیو الیگزنڈرا تھیٹریکل کمپنی کا منڈوا لگا ہوا تھا۔ ہم وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ اندر گئے تو اسٹیج کا دبیز پردہ گرا ہوا تھا مگر اس کے اطراف پر کیا کیا رنگ برنگ پھولوں اور پتیوں کے نقش و نگار اور پریوں کی تصویریں بنی تھیں کہ میری نظریں جم گئیں۔ ہال کے اندر کبھی ادھر کبھی ادھر ایک خوش پوش سا شخص تھیٹر کے کارکنان کو کچھ ہدایات دیتا پھر رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کشش تھی چہرے پر رعب اور مردانہ حسن تھا۔ اس نے آقا جان سے ہاتھ ملایا کچھ باتیں کیں۔ پھر مصروف دکھائی دینے لگا میں نے پوچھا "یہ کون تھا؟"

بولے "حکیم احمد شجاع۔"

ڈرامے کا نام "شیریں فرہاد تھا۔" ڈرامے کے کردار تھے کہ زور بیان کے جگمگاتے ستارے تھے جو ایک ایک کرکے میرے خون میں اترتے چلے گئے۔ لفظوں میں اس طرح کی گرفت اور مضبوطی تھی جیسے ہماری کتاب کے بڑھئی کے ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ ہتھوڑا پکڑا ہوا تھا۔ یہ تھیٹر کیا تھا لفظ کی طاقت کا مظاہرہ تھا۔ لہجہ کی گرمی و حلاوت تھی کہ جادو سے بنگالہ تھا۔

ان دنوں انگریز کو خوش رکھنے کے لئے تھیٹر کے نام بھی شاہی خاندان کے افراد پر رکھے جاتے تھے۔ اس کمپنی کا نام نیو الیگزینڈرا تھیٹریکل کمپنی تھا۔ الیگزینڈرا ملکہ وکٹوریہ کی سب سے بڑی بہو کا نام تھا۔ ایک کمپنی کا نام الفریڈ تھیٹریکل کمپنی تھا۔ پرنس الفریڈ ملکہ وکٹوریہ کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ ایک کمپنی کا نام ایڈورڈ تھیٹریکل کمپنی تھا۔ ایڈورڈ ملکہ وکٹوریہ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام تھا جو ملکہ کے مرنے کے بعد ایڈورڈ ہشتم کے نام سے تخت نشین ہوا تھا۔ ملکہ کے شوہر کا نام البرٹ تھا ایک کمپنی کا نام نیو البرٹ تھیٹریکل کمپنی تھا۔ یہ نام ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی خوشنودی یا انگریز حکومت کو خوش کرنے کی خاطر رکھے جاتے تھے۔ ہندوستان بھر میں یہ تھیٹریکل کمپنیاں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک گھوم جاتیں اور خوب پیسہ کماتیں۔ بنارس، سکندر آباد، دہلی، کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد، لاہور، پشاور، الہ آباد، لکھنؤ، فیض آباد، انبالہ، سہارنپور کہاں کہاں نہ جاتیں۔ ایکٹر لوگ خانہ بدوشوں کی طرح بستی بستی شہر شہر کی ہوا کھاتے۔ لفظ کی طاقت سے جس کو انگریزی میں figure of speech کہتے ہیں دلوں کو جیتتے اور اپنے گانے غزلیں دادرے اور ٹھمریاں پیچھے اہالیان شہر کو تبرک کے طور پر دے جاتے جو وہ بہت دنوں گاتے پھرتے۔ تھیٹر کو دیسی زبان میں منڈوا کہا جاتا تھا۔ کسی شہر میں منڈوے کا آجانا بہت اہم بات ہوتی۔ تھیٹر واحد تفریح تھی جس میں ڈراما بھی ہوتا گانے بھی سننے کو ملتے سین سینری کے مناظر بھی جی کو بہلاتے۔

ملکہ وکٹوریہ ملکہ معظمہ ہند کہلاتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سکھوں کے خلاف چیلیانوالہ کی لڑائی جیت کر پنجاب کا صوبہ بھی لے لیا تھا اور بقول شخصے سارا ہندوستان چاندی کی طشتری میں رکھ کر ملکہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا۔

ملکہ کو ہندوستان کی زبان اردو سکھانے کے لئے وائسرائے ہند نے میر منشی عبد الکریم کو لندن بھیجا جس کو رہنے کے لئے شاہی محل میں کمرہ دیا گیا۔ ایک مرتبہ ملکہ کو ایسا زکام لگا کہ جان چھوڑنے کا نام نہ لیتا تھا۔ مولوی عبد الکریم کے کہنے پر ہندوستان سے جوشاندے منگائے گئے۔ خطمی خبازی بنفشہ عناب ولائتی لعوق سپستان لعوق خیار شنبر۔ حال ہی میں بی بی سی لندن نے ٹیلیویژن پر مولوی عبد الکریم سے متعلق ایک فلم دکھائی جس میں عبد الکریم کا پارٹ ہمارے پاکستان کے مشہور ایکٹر ضیا محی الدین نے ادا کیا ہے۔

ملکہ وکٹوریہ کے دور حکومت میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں مثلاً کلکتہ، بمبئی، دہلی، لاہور اور راولپنڈی جیسی جگہوں میں ملکہ معظمہ ہند کے مجسمے نصب کئے گئے تھے۔ ملکہ جوانی میں بڑی خوبصورت تھی۔ اس کی جوانی کا ایک مجسمہ فوج کے جنرل ہیڈ کوارٹرز کے سامنے راولپنڈی کی مال روڈ پر نصب تھا جو پیرس کے ایک مشہور فرانسیسی مجسمہ ساز کے ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔ وکٹوریہ میموریل کلکتہ کے باغیچے میں جو مجسمہ نصب تھا وہ بھی ملکہ کی جوانی کا تھا۔ اختر شیرانی جب کلکتہ گیا وکٹوریہ میموریل کا منظر اس کے دل میں ایسا اترا۔ شام تک دس شعروں کی نظم ہوگئی۔ یہ دس شعر وکٹوریہ پر تو نہیں ہو سکتے۔ اختر شیرانی کا سا رومانوی شاعر پتھر کے مجسمہ پر نظم تو نہیں کہے گا۔ جاندار تصویروں پر نظم ضرور کہہ ڈالے گا جو اس کو وہاں چلتی پھرتی دکھائی دیں۔

اس نظم کو یہاں درج کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

چند زندہ تصویریں دیکھ کر

حسین چہروں سے رنگیں نقاب اٹھائے ہوئے
خرام ناز پہ مستانہ نازشوں کا ہجوم
سیاہ پردوں میں شاداب و نازنیں چہرے
گھنیری زلفوں کا سایہ بھی عارضوں کی بہار
سیہ نقاب میں روشن شفق نما رخسار
رخ صبیح پہ گیسوئے مشکبو کا ہجوم
فضائے کاکل مشکیں میں شعلہ گوں عارض
زبان حافظ و خیام میں تکلم ریز
ہر اک ادا مجسمیت کے رنگ سے سرشار

نگاہ شوخ میں سو بجلیاں چھپائے ہوئے
فضا کی گود میں بکھرے قمر تھرائے ہوئے
حسین تارے گھٹاؤں میں جگمگائے ہوئے
اندھیری شاخوں میں کچھ پھول لہلہائے ہوئے
چراغ رات کے پردوں میں جھلملائے ہوئے
فرشتے جانب افلاک پر اٹھائے ہوئے
سواد شام میں آتشکدے جلائے ہوئے
شراب و شعر کے بادل فضا پہ چھائے ہوئے
میموریل کو سواد حرم بنائے ہوئے

نگاہ یاس کو اذن کلام دیتی جاؤ
مسافران حزیں کا سلام لیتی جاؤ

وکٹوریہ کا جو مجسمہ لاہور کی مال روڈ پر چیرنگ کراس میں نصب تھا وہ اس کے بڑھاپے کی شبیہ تھی آزادی کے بعد اٹھوا کر لاہور کے عجائب گھر میں رکھوا دیا گیا۔ راولپنڈی چھاؤنی کی مال روڈ والا مجسمہ بھی جو فرانسیسی مجسمہ ساز کی اعلیٰ صناعی کا نمونہ تھا ۱۹۶۰ء میں اٹھوا دیا گیا مگر برسوں چیف انجینئر تعمیرات عامہ کی کوٹھی کے برآمدے میں پڑا پڑا ٹوٹ پھوٹ گیا۔ عجائب گھر لاہور نہ پہنچایا جا سکا۔

جیسا میں نے کہا بقول محاورہ منڈوا ٹوٹا ٹاٹ اٹھاؤ ٹٹو کھولو۔ جب تھیٹر والے شہر سے منڈوا اٹھا کر چلے جاتے تو اپنی یادیں اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ان کے گانے دادرے ٹھمریاں لوگ گاتے پھرتے۔ "شیریں فرہاد" کے ڈرامے کے ایک گانے نے مجھ کو بڑی لذت دی۔ ٹھیکے کی تھاپ دل پر ضرب لگاتی میں مدتوں اسے گاتا رہا۔ ایک منظر میں فرہاد کا گانا تھا۔

شیریں نام پیارا نام تیرا نام نام نام

نام نام نام پر طبلے پر ایسی تھپ تھپ تھاپ پڑتی کہ دل پر ضربیں لگتیں۔ کہاں بچپن کا وہ زمانہ کہاں ۱۹۷۲ء جب ٹیلیویژن پر میرے ڈرامے "دل بہشت" کی ریہرسل ہو رہی تھی "دل بہشت" مسخرے کا نام تھا جو کھلے ڈلے رنگ برنگے کپڑے پہنے ناچ ناچ کر گاتا ہے۔

میرا نام مسخرا دل بہشت
میرے قہقہے بے لگام میری ہنسی ہے سب کا کام
پیتا ہوں میں جام جم پلاتا ہوں میں صبح و شام

ایک تو مسخرا ٹھیک سے ناچ نہیں رہا تھا دوسرے لفظوں کی ادائیگی ٹھیک سے بیٹھ نہیں رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا سر پیٹ لیا جائے کہ مسخرے کا سر دیوار کے ساتھ دے ماروں۔

ایک پکے رنگ کا لاغر سا شخص کواڑ کی چوکھٹ کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔

بولا "بول کیا ہیں جی۔"

میں نے کہا "بول کیا بتاؤں۔ پاؤں بے سرے پڑ رہے ہیں۔ بات ہی نہیں بنتی۔ حماقت میری باندی شہرت میری غلام۔ میں ہوں مسخرا دل بہشت یہی ہے میرا نام۔ نام نام نام۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر بڑا سنجیدہ سا منہ بنایا اور بولا "شیریں نام پیارا نام تیرا نام نام نام" جب میری آنکھیں کچھ خوشی کچھ حیرت کے ساتھ اس کو تکنے لگیں تو بولا "یہ شیریں فرہاد کا گانا ہے میں چھوٹا تھا۔ اپنے دادا کے ساتھ آرکسٹرا میں بیٹھ کر سنا کرتا تھا۔ میرے دادا تھیٹر میں جوڑی بجاتے تھے"

اس نے طبلے پر تھاپ لگائی میری نگاہوں کے سامنے بچپن کا دیکھا "شیریں فرہاد" پیچ در پیچ کڑی در کڑی اتر آیا۔

میں سوچنے لگا شیریں نام پیارا نام تیرا نام نام نام برسوں تک میرے تحت الشعور کی تہوں میں کیسے چھپا رہا "دل بہشت" کا گانا لکھتے وقت سنگلاخ زمین کو چیر کر برگ سبز کی طرح باہر نکل آیا۔

مولانا گرامی کہتا ہے "از جہاں می رویند از کشت خیال ما چوں بود"

جو بات پہلے میرے خیال کی گہرائی میں جنم لیتی ہے وہ دنیا کے تختے پر نمو پذیر ہوتی ہے۔

جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچا تو نظم کو پڑھنا اور ادا کرنا سیکھا۔ اردو کی کتاب میں خوشی محمد ناظر کی ایک نظم تھی "جوگی" اس نظم میں جنگل کے بیان کے بعد پہاڑ کی چوٹی پر جوگی کا سمادھی میں جا کر بیٹھنے کا نقشہ' اس کی لمبی لمبی لٹیں' بدن پر ملا ہوا بھبھوت شاعر اور جوگی کا شعروں میں مکالمہ' نظم پڑھتا تو تصور میں ناٹک کا منظر دکھائی دیتا۔

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفاں کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماعِ طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرور سجائی تھی
بن میں گلشن اور آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دلکش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر مستانہ
یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یاں کلّۂ کوہ پہ رہتا تھا ایک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبھوت رمائی تھی

سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی متانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

نظم پڑھتا تو تصور میں ناٹک کا منظر دکھائی دیتا۔ نظم جیسے دل و دماغ کی سرزمین میں تخم ریزی کرتی آپ ہی آپ یاد ہو گئی۔ ہم جماعتوں کو سناتا جو سن کر لذت پاتے۔ اردو کے استاد کو معلوم ہوا اس نے سنی۔ انگلش ٹیچر کے کانوں تک پہنچی اس نے ورڈز ورتھ کی یہ نظم یاد کرادی۔

Under the green wood tree,

Who loves to lie with me,

And Turn his merry note,

Into the sweet birds throat,

Come Hither Come hither, Come hither.

Here shall we see no enemy,

But winter and rough weather

ہیڈ ماسٹر کھیم چند نے اپنے کمرے میں بلا کر سنی۔ میرا استاد پہلے نویں پھر دسویں کی کلاس میں لے کر پہنچا۔ جہاں میں نے اوائیگی کے ساتھ سنائی۔ تالیاں پٹیں۔

ہمارے بچپن کے پٹارے میں کئی پتلے بند ہیں۔ ملائی کی برف والے اجاڑ صورت مردار پتلے کے ساتھ ایک خوش لباس خوش شکل پتلا بھی تھا۔ ان دنوں "نیرنگ خیال" بڑی چوٹی کا رسالہ ہوتا تھا۔ اس میں یورپ کے تھیٹر کے متعلق ایک مضمون چھپا۔ کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا۔ آتش شوق بھڑکا گیا' لکھنے والا ملتان کا کوئی افتخار رسول تھا۔ جو بیرسٹری کے لئے لندن گیا تھا۔ اس کی دو تصویریں بھی مضمون کے ساتھ تھیں' ایک میں وہ عرب لباس پہنے ہوئے تھا دوسری میں لندن کا سلا ہوا اعلیٰ سوٹ۔ آج بھی وہ مضمون اور اس کا لکھنے والا خوش شکل خوش لباس گڈا میری یادوں کے گلستان یں سرو چمن کی طرح استادہ ہے۔ وہ عمر شریف سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس نے انگریزی فلموں میں بہت اداکاری کی۔ بہت نام پایا۔ مشرق کا Rudolf Valintine کہلایا۔ اس کا کوئی پوتا پڑپوتا نواسہ پڑنواسہ یہ مضمون پڑھے تو اس کو میرا سلام محبت پہنچے۔ مشرق کے اس رودلف نے شیڈو آف دی حرم' شہر زاد۔ **Serpent of the Nile** ۔ **Garden of Alla** جیسی فلموں میں اپنی اعلیٰ اداکاری کا لوہا منوایا۔

ناٹک سے دلچسپی کے سفر میں اس طرح کے چھوٹے چھوٹے سنگ میل آئے جو تاب شوق کو حسن و معنی دیتے چلے گئے۔

ہندوستان میں لاہور کا گورنمنٹ کالج سب سے پرانی تعلیمی درسگاہ تھی۔ جس کی علمی و ادبی صحبتیں' تہذیبی پرورش اور پروفیسروں کی قابلیت کا شہرہ دور دور تک تھا لڑکے اس درسگاہ سے منجھ کر نکلتے۔

میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔ فرسٹ ایئر کو فول بنانے کے لئے سینئر لڑکوں کو اچھی ترکیب سوجھی وہ وزن کرنے والی ایک چھوٹی مشین لے آئے۔ کالج کے ہال کے ایک کونے میں رکھ دی۔ چار لڑکے اس کام پر کھڑے ہوگئے۔ دو لڑکے فرسٹ ایئر کو گھیرتے۔ تیسرا وزن کرتا چوتھا رول نمبر لکھ کر وزن نوٹ کرتا ایک ایک روپیہ وصول کرتے۔ دو تین دنوں میں انہوں نے کتنے ہی روپے اکٹھے کر لئے۔

عام زبان میں گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب کو جی سی ڈی سی کہا جاتا تھا۔ جی سی ڈی سی کی بڑی دھاک تھی۔ جب میں کالج میں داخل ہوا پروفیسر بخاری ڈرامیٹک کلب کی روح رواں تھے۔ وہ سلیکشن بورڈ جس کے سامنے فرسٹ ایئر میں داخل ہونے والے امیدوار حاضر ہوتے تھے اس کے صدر پروفیسر بخاری تھے ان کی شکل و صورت ایرانیوں کی سی تھی۔ ان کی وضع قطع باتیں کرنے کے ڈھنگ لباس اور اطوار سے یورپی انداز ٹپکتا تھا۔ ایک روز ہم نے دیکھا کالج ہال کے ایک کونے میں ترکھان ٹھونکا ٹھاکی کررہا تھا۔ معلوم ہوا ڈرامے کا set تیار کیا جارہا ہے۔ نوٹس بورڈ پر نوٹس لگا تھا۔ پروفیسر بخاری کی ڈائریکشن میں جی سی ڈی سی اگلے مہینے ڈراما پیش کررہی تھی۔ ڈرامے کا نام بڑا دلآویز اور بڑا عجیب لگا۔ اتنا لمبا نام ڈرامے کا۔ ڈراموں کے نام تو چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے نام تھا "The man who ate the popomack"

یورپ کے ڈرامے سے شناسا ہونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ اسٹیج پر مغربی انداز کی سیٹنگ تھی جن طالب علموں نے حصہ لیا تھا وہ بخاری صاحب کی ڈائریکشن میں کیسے منجھ گئے تھے۔ لڑکیوں کا پارٹ لڑکوں نے کیا تھا۔ اس ڈرامے میں مہمان آرٹسٹ کی حیثیت سے امتیاز علی تاج نے بھی حصہ لیا۔ ان کے نام سے میں واقف تھا۔ ان کی اداکاری دیکھنے کا پہلا موقع تھا جس میں بڑا دھیما پن' سبھاؤ اور ٹھہراؤ تھا۔ اس ڈرامے میں اسٹیج ٹیکنیک اور بول چال کے اعتبار سے میرے لئے نئی نئی چیزیں تھیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا۔ مجھ پر مغربی ڈرامے کی نئی سطحیں اجاگر ہوئیں۔

اگلے سال پروفیسر بخاری نے R U R (آر یو آر) ڈراما کھیلا جو چیکوسلاواکیہ کے مصنف کارل چیک کا مشہور ڈرامہ تھا۔ ڈرامے کا پورا نام تھا Rosum's Universal Robots۔ ایف اے میں ہمارے انگلش کے پروفیسر ہریش چندر کٹھ پالیہ تھے۔ انہوں نے Robot کا اچھا پارٹ ادا کیا۔ تھا بھی وہ بدشکل منہ پر چیچک کے داغ' کمال کا روباٹ بنا۔ تھرڈ ائر میں ایک ہندو لڑکا شیودیال عابد داخل ہوا۔ مضافات کے کسی کالج سے ایف اے کر کے آیا تھا۔ پھپھورا بہت تھا۔ ہر ایک سے کہتا پھرتا "میں شاعر ہوں۔"

ایک روز بخاری سے کہنے لگا "میں شاعر ہوں اور ایکٹر بھی ہوں۔"

بخاری نے کہا "شعر پھر سہی ایکٹنگ ابھی دکھاؤ۔"

لڑکا خوش ہوا۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر رام لیلا کے مکالمے ادا کرتے کرتے کبھی گرتا کبھی اچھلنے لگتا پروفیسر بخاری مسکرا کر بولا "Keep it on"۔

ایک دن یہی لڑکا کالج میں ہرن لے آیا اس کی تھوتھنی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بولا "اس کی آنکھیں دیکھو' ہائے آنکھیں تو دیکھو اوئی میں مرجاؤں۔"

پھر ان کو چومنے لگا۔ لڑکے ہنسے۔ مجھے ہرن کی آنکھیں سخت بیہودہ دکھائی دیں۔ وہ لڑکا کچھ عرصے بعد نظر نہ آیا کالج سے نکال دیا گیا یا خود چلا گیا۔

بی اے میں پروفیسر بخاری ہمیں ڈراما پڑھاتے تھے۔ ان دنوں "ہملٹ" ہمارے نصاب میں تھا ان کی کلاس میں بڑا لطف آتا۔ ڈرامے کا ایک اور قابل پروفیسر اسلامیہ کالج میں تھا جسے شیکسپئر کا حافظ کہتے تھے۔ ان کا نام پروفیسر عبد الغنی تھا۔ پروفیسر بخاری کے کہنے پر میں اسلامیہ کالج میں کئی مرتبہ جاکر پروفیسر غنی کے پیریڈ میں بھی بیٹھتا۔ عجیب نشہ اور لذت پاتا۔

پروفیسر بخاری کی ایما پر ایک روز کسی انگریز ایکٹر نے آکر ہمارے کالج کے ہال میں شیکسپئر کے ڈراموں

کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈرامائی انداز میں زبانی سنائے۔ طبیعت نے زیادہ مزہ اس بات سے پایا کہ ہر ٹکڑا سنانے سے پہلے ہمارے سامنے لباس بدلتا۔ چہرے کا میک اپ ہمارے سامنے بدلتا۔ مختلف کرداروں کی وگ ہمارے سامنے پہنتا۔

یہ وہ وقت تھا جب پرانے تھیٹر کا زمانہ عروج گزر رہا تھا۔ لوگوں نے خاموش فلم کو دیکھا پھر بولنے والی ٹاکیز کا لطف اٹھایا۔ یہ بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر آغا حشر کاشمیری نے اپنے اسٹیج پر کھیلے جانے والے کئی ناٹکوں کا معاہدہ فلمسازوں کے ساتھ کر لیا۔ "یہودی کی لڑکی" اور "عورت کا پیار" کی فلمیں بڑی کامیاب ثابت ہوئیں۔ پرانے تھیٹر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مصری فلم کی گرمی میں پگھلنے لگی تھی' وقت نے پارسی تھیٹر کے پیندے میں ایسا سوراخ کیا کہ ہجوم سے بھرے پرے جہاز کے سنئے پانیوں میں یوں ڈوبنے سے دل کو الم تو ہوا مگر اس الم کو ایک نئی معنویت بھی حاصل ہوگئی۔ اس معنویت کی کچھ خوشی یوں ہوئی کہ فلم تھیٹر کا کباڑخانہ اٹھا کر لے گئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہماری فلموں کی کھمبیاں (Mushroom) اسی کوڑے میں سے اگ رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر دل ضرور جلا کہ وہ ایکٹر جو اسٹیج کے آفتاب و ماہتاب تھے ایسے گم نام ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے۔

نئی نسل مغربی ڈرامے سے کچھ آگاہ کچھ شناسا نئے افق پر نمودار ہو رہی تھی' مجھے اس نسل پر اس لحاظ سے سبقت حاصل تھی کہ میں نے قدیم تھیٹر کو دیکھا اور جدید تھیٹر کے ساتھ قدم ملا کر شیر و شکر ہوگیا۔

پرانے فروعات کے بار گراں سے نکل کر جب نیا ناٹک وجود میں آیا بڑا سادہ رو تھا بغیر کلپ لگائے بغیر نین مٹکائے' ٹھمری دادرانہ ٹھیکہ نہ پٹی' ایک حسن سادہ تھا۔ یہ اپنے وقت کی دیوی بنا کسی سنگار دو کپڑوں میں حسن معصوم بنی کھڑی تھی۔ جدید ناٹک نے اس کے سر پر چڑیا ڈالی' بہو بنا لیا اور کہا کل کا ناٹک اس کی کوکھ سے جنم لے گا' اس پیپل کے چھتنا ر درخت کی طرح جو مٹے مٹائے پرانے کھنڈروں کی بچی کچی درزوں میں سے اگتا ہے۔ ایسے بحران تہذیب اور معاشرے میں ہمیشہ آئے ہیں' ایسے کڑے وقتوں میں چند سرپھروں کی ضرورت ہوتی ہے جو بار گراں کو اپنے شانوں پر اٹھائے رکھیں۔ تھک جائیں تو دوسروں کو منتقل کر دیں۔

پروفیسر بخاری کے مزاج میں ناٹک کے شوق کی چنگاری دھری تھی۔ فتیلہ اس کا اس وقت آگ دیکھ چکا تھا جب وہ انگلستان میں اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے۔ انہوں نے پیٹ بھر کر لندن کا تھیٹر دیکھا اور اپنے ساتھ جو کتابیں لائے ان میں پایہ کے انگلش ڈرامے تھے۔ انہوں نے جب آل انڈیا ریڈیو کا چارج سنبھالا تو انہوں نے ریڈیو ڈرامے کی طرح ڈالی۔ جن لکھنے والوں نے اس میدان میں قدم رکھا ان میں راقم الحروف کو بھی شامل سمجھا جائے۔ میرا پہلا ڈراما لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ ریڈیو کے رسالہ Listner میں بحیثیت ڈرامہ نویس میری تصویر شائع ہوئی۔(۱)

آل انڈیا ریڈیو میں پروفیسر بخاری نے ایسے نوجوانوں کو ملازمت دی جن کو ڈرامے سے دلی شوق تھا اور جو ڈرامے کی نشریات پر دل سے محنت کرتے تھے۔ مثلاً ملک حسیب احمد' جگل کشور مہرؔ' رشید احمد' سومناتھ چپ' حفیظ جاوید' آغا بشیر احمد' عشرت رحمانی' سید انصار ناصری' محمود نظامی' بعد میں آنے والوں میں ابو سعید قریشی' ایس اے حمید اور میاں لطیف الرحمٰن۔

اسلامیہ کالج لاہور میں حفیظ جاوید پروفیسر ڈاکٹر تاثیر کے چہیتے طالب علم تھے۔ پروفیسر موصوف نے ان میں ڈرامے کا شوق پیدا کیا۔ کچھ عرصہ لکھنؤ اسٹیشن پر کام کیا۔ تبدیل ہو کر لاہور آئے۔ ڈراما لکھنے والوں سے

بیرا" فوراً چاکر بلے۔ مجھ سے ملنے آئے اور ڈرامے کا وعدہ لے گئے۔ بی کر بڑے موڈ میں آتے تھے۔ لکھنؤ میں جتنی دیر رہے گانے والیوں کے گھر رہے۔ منفیہ گوہر سلطانہ پر عاشق ہو گئے پھر شادی کر لی۔ گوہر نے ساری عمر ان کی غلامی میں گزار دی۔ بی بی سی لندن میں بھی رہے۔ انگریزی سے اردو میں نہایت عمدہ ترجمہ کرتے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" کا اردو میں ترجمہ کیا جو بی بی سی لندن سے خود پیش کیا۔ بعد میں یہ ڈراما گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامیٹک کلب نے کالج کے اوپن ایئر سٹیج پر کھیلا تھا۔

بی بی سی لندن سے واپس آئے گورنمنٹ پنجاب میں انفریشن آفیسر ہو گئے۔ پینے کی لت تھی۔ ایک روز coverage کے لئے گورنر ہاؤس گئے وہاں ایک سول سروس کے افسر سے تو تو میں میں' میں الجھ گئے پی رکھی تھی۔ نوکری جاتی رہی۔ پھر "پاکستان ٹائمز" اخبار سے وابستہ ہو گئے سٹاف والے چاچا حفیظ کہتے۔ بڑھاپا آجائے تو جاتا نہیں۔ مٹی کی طرف کو لے جاتا ہے ایک دن "پاکستان ٹائمز" میں خبر چھپی حفیظ جاوید سپرد خاک کر دیئے گئے۔ رہے نام اس کا جو خاک سے پھول اگاتا ہے۔

اس میں شک نہیں تھیٹر کی دنیا میں دیکھ دیکھ کر قدم رکھنا ہوتا ہے قدم قدم پر پھسل جانے کے مواقع آتے ہیں۔ پرانا تھیٹر کیوں تھا' کیا تھا' کیونکر تھا رسائل و جرائد میں ہم نے اس پر بہت روشنیاں ڈالیں۔ ریڈیو پر بہت کچھ کہا سنا۔ اس کی سمعی اور بصری خوبیوں پر بہت شہادتیں گزاریں۔ بہت ہوا باندھی۔ اگر قلبی واردات قدیم تھیٹر میں تھیں تو جدید میں بھی رہیں۔ تخیل ہمارا وہاں بھی سنورا۔ بیدار یہاں بھی ہوا اور زندگی سے شائستگی اور ذوق جمال کبھی بھی علیحدہ نہ ہو پایا۔

یوں سمجھئے کہ اسلامی اور ہندوستانی تہذیب کا ہندوستان میں ایک بہت وسیع و عریض دائرہ تھا جس کا ایک حصہ دہلی' آگرہ' لکھنؤ' دوسرا کلکتہ' ڈھاکہ' حیدر آباد' دکن' تیسرا لاہور' ملتان اور پشاور ۔ یوں سمجھئے کہ یہ تمام شہر تہذیب کے دائرے میں پھیلے ہوئے تہذیب و تمدن کے ستارے تھے۔ لاہور کا جہاں تک تعلق رہا حیرت کا مقام کہ اس کی ثقافتی تہذیبی ایسوسی ایشنوں میں ہندوؤں کی اکثریت رہتی۔ مگر ہمیشہ کمال کی بات یہ ہوتی کہ اداکاری مسلمان ایسی کرتا کہ ہندو ایکٹر اس تک نہ پہنچ پاتا۔

لاہور کی ثقافتی ایسوسی ایشنوں میں اکثریت والے ہندو آپس کی گفتگو انگریزی میں کرتے۔ یہ بھی اس وقت کا دستور تھا۔ ہندی آتی نہ تھی اردو سے نابلد تھے پنجابی بولنا Status سے کم تھا۔ ان کے ہاں پنجابی میں بہنوئی کو جیجا جی کہا جاتا تھا۔ بھائی کو بھرا تا جی ماں کو ماتا جی اور باپ کو پتا جی۔ پبلک میں وہ یہ لفظ بولنے سے کتراتے تھے۔ بھراتا جی کو Brother کہتے' جیجا جی کو Brother in law اور والد کو father۔ مسلمانوں کے ہاں اس سطح کی کمی نہ تھی ان کے ہاں بہنوئی والد والدہ بھائی کے لفظ موجود تھے دو چار سنگیت مہا ودیالہ جو لاہور میں تھے وہاں کانسرٹ ہوتی ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ میں اور آپ ایک طرف بیٹھے ہوتے اسٹیج پر ڈرامہ کھیلنے کو بہت جی چاہتا مگر نوجوانوں کی سماجی حیثیت صفر تھی اسٹیج ڈرامے میں مسلمان لڑکی کے حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مسلمان عورت چار دیواری میں بند تھی۔ کسی عیسائی یا ہندو گھرانے میں جاکر کوئی مسلمان لڑکا نوجوان لڑکی کو ڈرامے میں پارٹ لینے کے لئے کہتا تو اس کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا۔ اس طرح سے مسلمان لڑکے اپنے آپ کو گھٹتا اور کم ہوتا محسوس کرتے تھے۔

ایسی انجمنوں میں اگر کوئی بہت سمارٹ' ساڑھی باندھے ہوتی تو وہ نوے فیصد عیسائی عورت ہوتی یعنی انڈین کرسچین ان کا انگریزی کا لہجہ بھی زیادہ صحیح ہوتا۔ رلیا رام فیملی سرکار فیملی سنگھا فیملی سپرئین فیملی چیٹرجی

چیلی نیلوس چیلی منگت رائے چیلی حکیم چیلی داس چیلی پنجاب کے یہ وہ سربرآوردہ عیسائی خاندان تھے جن کے دادا یا پردادا عیسائی ہوگئے تھے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ تھے ایجوکیشن کے محکمے میں چلے گئے کوئی کوئی تحصیلدار ہوگیا۔ نیلوس(۲) پہلے تحصیلدار رہے پھر مجسٹریٹ ہوگئے۔ جہاں گئے ہومیوپیتھی کا بڑا ساتھ کیا اور بڑے بڑے لاعلاج مریضوں کو تندرست کیا۔

سی ای سنگھا تحصیلدار تھے ان کی بیٹی مانورما سنگھا چیتن آنند کی حوصلہ افزائی پر فلم میں کام کرنے کیلئے بمبئی چلی گئی چیتن کے بھائی دیو انند سے شادی کر لی۔

ایس پی سنگھا برسوں پنجاب یونیورسٹی کے کنٹرولر آف دی ایگزامی نیشن اور رجسٹرار رہے ریٹائر ہونے پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑ کر اسمبلی کا ممبر بنے۔ پاکستان کے قیام پر پنجاب اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے۔ ان کی لڑکی چمپا سنگھا نے انگلش ایم اے کیا جو اپنے وقتوں کی بڑی قابل اور ذہین لڑکی تھی۔ اس نے منگت رائے آئی سی ایس سے شادی کر لی اور انڈیا چلی گئی۔

نامور ادیب اور ڈراما نویس حکیم احمد شجاع کی چھ بہنیں تھیں۔ ان کی ایک بہن کا نواسا نذیر سید میرا دوست تھا۔ حکیم صاحب کو ماموں جان کہتا۔ سیکرٹریٹ میں ملازم تھا کچھ دیوانہ کچھ فرزانہ۔ ہم دونوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنون لطیفہ سے شوق رکھنے والوں کا ایسا گروپ تشکیل کیا جس میں اکثریت مسلمان نوجوانوں کی رکھی۔ مجھے ایکٹنگ کا شوق تھا نذیر کو نہ تھا مگر وہ منتظم اعلیٰ درجے کا تھا۔ ہم نے desperate ہوکر ایک ایک ایکٹ کے کئی ڈرامے پیش کر ڈالے۔ ڈرامے کے لئے وہ لڑکوں کو کہاں کہاں سے لاتا مجھے حیرت ہوتی۔ اس کے پاس ایک کوٹ ایک پتلون اور ایک سوٹ تھا جن کو وہ بڑی احتیاط سے پہنتا۔ جیب میں چھوٹا سا برش رکھتا۔ گرد و غبار کا تنکا پڑ جاتا تو جیب سے برش نکال کر کوٹ کو صاف کرتا۔ جیب میں کنگھی رکھتا۔ بال پریشان ہوتے تو کنگھی سے درست کرتا بجلی والی استری ان دنوں نہ ہوتی تھی۔ کوئلوں کو سلگا کر استری کو بھرتے۔ کوئلے دہکنے کے ساتھ استری گرم ہوتی کپڑوں پر پھیری جاتی۔ لمبا جھنجھٹ تھا۔ نذیر رات کو پتلون تہ کرکے اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیتا جس پر سر رکھ کر سو جاتا صبح پتلون بڑے مزے کی استری ہو چکی ہوتی۔ سفید پوش مسلمان گھرانوں میں اس طرح سے گزر ہوتی تھی۔ پیسہ پیسہ بچایا جاتا یہ نسخہ کہیں فضول خرچی نہ ہونے پائے حرز جان بنا رہتا' تنخواہ بھی پندرہ بیس تاریخ کو ختم ہو جاتی' نذیر سید خاموش طبع تھا بات کم کرتا تھا' بڑے سے بڑا لطیفہ ہو جائے وہ اپنے بچے بچے ہونٹوں کے بیچ میں سے فقط مسکراتا' سال میں کہیں ایک آدھ بار قہقہے سے ہنستا ہوگا۔ بات دھیرے دھیرے سچ سچ کرتا سننے والے کو اس کے خلوص کار پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہتی۔ مجھے ایک مرتبہ رضوی لاج لے گیا۔ ہمیں اپنے ڈرامے کے لئے ایک خوبرو کی ضرورت تھی جو لڑکی کا پارٹ ادا کر سکے۔ رضوی لاج نسبت روڈ کی نکڑ پر رنگ برنگ شیشوں والی سہ منزلہ عمارت تھی جس میں سید گھرانہ رہتا تھا یہ لوگ ناموں کے ساتھ رضوی لکھتے۔ نذیر سید نے حیدر رضوی سے ملایا جو عمر میں ہم سے بڑا تھا اس نے گرمجوشی سے استقبال کیا چند کمروں سے گزارتا اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس گھر کا ہر شخص خوبرو تھا۔ ایک لڑکا چائے کا ٹرے دوسرا پیسٹری کا اٹھائے داخل ہوا۔ یہ حیدر رضوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ایک بھائی نے لڑکی کا پارٹ کرنے کا وعدہ کر لیا مگر پورا نہ کر پایا۔ ظفر رضوی جو پیسٹری کا ٹرے اٹھائے کمرے میں آیا بہت سالوں بعد کرنل کی وردی میں ملا۔ گورا چٹا خوبرو ویسے ہی مگر فوج کی نوکری سے جسم ذرا بھر گیا تھا چہرہ ذرا ست گیا۔

اسٹیج کی تعمیر' سجاوٹ' ہدایت کاری' روشنی' میک اپ سبھی کاموں سے ہم خود نبٹ لیتے۔ اپنے تعلقات عامہ پر نذیر سید کو فخر تھا اور تھا بھی صحیح۔ ہم وائی ایم سی اے میں "بوکس اینڈ کوکس" اسٹیج کر رہے تھے۔ وہ سید امتیاز علی تاج سے مل آیا اور انہیں بحیثیت مہمان خصوصی مدعو بھی کر آیا۔ یہ تاج صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں جب ملتے رہے۔ "Box and Cox" کا ذکر کرتے جس میں میں نے مسٹر کوکس کا پارٹ کیا تھا سنبھلی سنبھلی ایکٹنگ میری ان کو اچھی لگی۔

"شوہر کی ڈائری" کے نام سے ایک مضمون "ادبی دنیا" رسالہ میں چھپا تھا جس کے لکھنے والے سردار سنت سنگھ سکھوں تھے جو خالصہ کالج امرتسر میں انگلش کے پروفیسر تھے۔ میں نے اسے ڈرامائی شکل دے کر وائی ایم سی اے ہال میں کھیلا اور شوہر کا پارٹ خود کیا۔ دیکھنے والوں میں سنت سنگھ سکھوں انکی اہلیہ اور ایڈیٹر "ادبی دنیا" مولانا صلاح الدین احمد موجود تھے جنہوں نے "ادبی دنیا" کے شمارے میں اس پیشکش پر ایک نوٹ بھی لکھا تھا۔ بیوی کا پارٹ اسلامیہ کالج کے طالب علم حیات محمد خان نے کیا جو آج کل کئی برسوں سے پاکستان نیشنل میوزک کانفرنس کے روح رواں ہیں۔ یہ کانفرنس بہت وسیع پیمانے پر ہر سال لاہور میں کلاسیکل موسیقی کی کانسرٹ منعقد کرتی ہے۔ نئے اور پرانے موسیقاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ موسیقی کے قدردان اور اہل دل ان کے فن سے روشناس ہوتے ہیں "شوہر کی ڈائری" کی ریہرسل اسلامیہ کالج کے پروفیسر باسط کے فلیٹ پر ہوتی رہی ڈرامے کی دوستی بھی دنیا کی دوستیوں میں بڑی پیاری دوستی ہے اس ڈرامے کے سبب حیات محمد خان سے ایسی دوستی ہوئی کہ ابھی تک قائم و دائم چلی آتی ہے۔ ان دنوں وہ مسجد وزیر خان کے پاس رہتے تھے میں وہاں ایک مرتبہ ملنے بھی گیا۔ ان کے والد متقی' پارسا' دیندار قسم کے بزرگ تھے۔ میک اپ نذیر احمد نے کیا حیات محمد نے ہمارے ڈرامے میں چھپ چھپا کر پارٹ کیا تھا۔ گولو پولو سے تھے۔ ساڑھی باندھنے میں میں نے مدد کی ساڑھی بندھی تو غلط بندھی۔ قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ دیکھنے والوں میں قلعہ گوجر سنگھ کی ایک خوبصورت عیسائی آئرین ڈ-تنل (بعد میں منورما) بیٹھی تھی۔ نذیر سید اس کو گرین روم میں لے آئے اس نے دوبارہ سے ساڑھی باندھی اور دیکھ دیکھ کر مسکراتی جائے کہ حیات محمد خان سر سے پاؤں تک بڑی خوبصورت لڑکی دکھائی دے رہا تھا۔

ڈراما ختم ہونے پر نذیر سید ہم سے ملوانے ایک شخص کو گرین روم میں لے آیا اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی مونچھوں میں مسکراہٹ چھپی تھی۔ اس نے تعریف کی تو میں نے بھی تعریف کے لہجے میں کہ "بہت کم لوگوں کو داڑھی اتنی جچتی دیکھی ہے جیسی آپ کو جچ رہی ہے" وہ شخص چلا گیا تو میں نے پوچھا "یہ کون تھا۔ اردو کو گھونٹ گھونٹ کر حلق سے بول رہا تھا۔"

نذیر نے کہا "علاؤ الدین صدیقی ہمارے ساتھ دفتر میں کام کرتے ہیں۔"

اس وقت علامہ علاؤ الدین صدیقی سول سیکرٹریٹ میں ملازم تھے۔ تاریخوں میں جس طرح سارے پیغمبر بکریاں چرایا کرتے تھے ہم بھی ناٹک کے شوق میں گھسیارے تھے۔ کہتے ہیں آسٹریلیا سے اونچی نسل کی بکریاں راجہ محمود آباد نے منگوا رکھی تھیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار ہاتھ میں لکڑی پکڑ کر ان بھیڑوں کو یہاں سے وہاں تک ہانکتے تھے۔ سنت پیغمبری کا لطف اٹھاتے تھے خوش ہوتے تھے۔ ہمارا اتنا اچھا ڈراما ہوا کہ گھسیاروں کی صدا یوں دوڑ گئی کہ ہمارا چرچا غیر مسلم اداروں تک جا پہنچا وہ ہمارے تعاون کے خواہاں ہوئے۔ نذیر سید حکیم احمد شجاع سے جن کو وہ ماموں جان کہتا تھا۔ ایکانکی یعنی ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھوا لایا۔ نام تھا

"نورتن" کمال یہ کیا کہ لڑکی کے پارٹ کے لئے قلعہ گوجر سنگھ کے عیسائی محلے سے مس آئرین کو لے آیا۔ بعد میں یہی لڑکی منورما کے نام سے فلموں میں چلی گئی جس نے بہت سی فلموں میں کام کیا۔ بعد میں کے فلمی فلم ڈائریکٹر سے شادی کر لی۔

ایک ڈرامے میں لڑکی نہ ملی نذیر سید دیال سنگھ کالج کے ایک خوبصورت طالب علم کرن دیوان کو پکڑ لائے۔ لڑکے سے زنانہ پارٹ ادا کرانا مشکل تو ہوتا مگر ہم قابو پا لیتے۔ اگلے ڈرامے میں کرن دیوان کو پھر سے رکھنے اس کو لینے میں اس کے گھر گیا" پتہ چلا تعلیم چھوڑ بمبئی چلا گیا (مشہور اداکار تھا "رتن" اس کی کامیاب فلم تھی)

میں بات اس وقت کی کر رہا ہوں جب سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل جی سی چیڑجی ہوتے تھے۔ یہ بنگالی ہندو خاندان تھا جس کے بزرگ عیسائی ہو گئے۔ پرنسپل بننے سے پہلے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلاسفی کے پروفیسر تھے۔ نذیر سید کا بڑا بھائی امین سید سنٹرل ٹریننگ کالج میں جی سی چیڑجی کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ راوی روڈ کے سرے پر ٹکسالی دروازے سے آگے ایک آبادی تھی جس کا نام لدے کا باغ تھا۔ نذیر سید اور امین سید وہاں رہتے تھے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج بھی راوی روڈ پر واقع تھا۔ اس کالج میں پروفیسر خادم محی الدین جو لیڈز یونیورسٹی کے ماسٹر آف ایجوکیشن تھے ریاضیات کے پروفیسر تھے۔ وہ بھی راوی روڈ کے قریب رہتے تھے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج کے پچھواڑے میں وٹرنری کالج کو عام زبان میں گھوڑا ہسپتال کہتے تھے۔ اس علاقے میں پروفیسر خادم محی الدین اور حکیم احمد شجاع رہتے حکیم صاحب کے بیٹے انور کمال پاشا اور خادم محی الدین کے بیٹے ضیاء محی الدین کا بچپن اسی علاقے میں گزرا۔ دو ستارے ایک برج میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ دونوں ایک طرح سے قران السعدین تھے۔ انور کمال پاشا فلمی آسمان پر شہاب ثاقب بن کر چمکا۔ اوپر تلے اتنی کامیاب فلمیں بنائیں کہ جعفادری فلمساز رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ضیاء محی الدین نے تھیٹر اور فلم میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

ہماری Dramatics کی اطلاعات نذیر سید کی زبانی حکیم احمد شجاع تک پہنچتی رہتیں اور ہمارے عالم شوق کا اظہار و بیان امین سید کی زبانی پروفیسر خادم محی الدین تک رسائی پاتا۔

بٹالہ سے میٹرک کرنے کے بعد میرا چھوٹا بھائی اعجاز حسین بٹالوی لاہور آکر کالج میں داخل ہوا۔ اس کو بھی شوق چرایا۔ میں نے کہا اب کے ہوا تو تمہیں بھی پارٹ دیں گے۔ پہلے ذرا lines بولنے کی مشق ہو ریہرسل ہو۔ رسالہ "ادبی دنیا" کا دفتر ان دنوں مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ میں ہوتا تھا۔ اوپر کی راہداری میں کھلی جگہ تھی۔ وہاں اعجاز اور اس کے دوست مسعود محمود کو ڈراما پڑھنے کی مشق کرائی گئی۔ کوئی دس ایک دن ہر شام ریہرسل ہوئی۔ مگر یاد نہیں کہ کس وجہ سے ڈراما اسٹیج نہ چڑھ سکا۔ ڈرامے کا نام تھا "شوہر کی بھوک ہڑتال" "ادبی دنیا" خاص نمبر میں چھپا تھا۔ ناکارہ حیدر آبادی کا لکھا ہوا بڑے مزے کا طربیہ تھا۔ واللہ انسانی زندگی کے بھی کیا کیا حزنیے اور طربیے کہ ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان نے اپنے عہد جلالت میں جو اسٹیج سجائی اس میں اعجاز حسین بٹالوی جو بیرسٹری میں ذوالفقار علی بھٹو کا لندن میں ہم جماعت رہا تھا عدالت میں وکیل استغاثہ کا پارٹ ادا کرتا ہے اور مسعود محمود جس کو بھٹو نے ڈائریکٹر جنرل فیڈرل سیکورٹی فورس بنا دیا تھا اس کے خلاف وعدہ معاف گواہ بنتا ہے۔

میں زیادہ عرصہ راولپنڈی میں رہا۔ صبح صبح چھ بجے فون آتا ہے وزیر اعظم کو رات دو بجے دار پر کھینچ

پڑا گیا۔ جی اداس ہوا۔ فون پر میں نے اعجاز کو مطلع کیا۔ اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ اعجاز نے سارا دن کھانا نہیں کھایا۔ بجھا بجھا رہا۔ کہا ڈرامہ کیسا خوب ہے ہمیں تو کچھ لکھنا نہیں آتا کوئی لکھنے والا لکھے گا۔ آج نہ سہی کل سہی۔

فرسٹ ایئر میں بولنے کا سلیقہ سکھانے کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں یہ مسعود اور اعجاز کی اپنی کوششیں تھیں کہ دونوں کالج میں Debator بنے۔ ٹرافیاں لائے۔

معترضے میں سخن گسترانہ بات آن پڑی تھی ورنہ بات نذیر سید کی ہو رہی تھی۔ ایک روز انصار ناصری کا لکھا ہوا تین ایکٹ کا ڈرامہ "نجمہ نوری" اٹھا لایا۔ بولا "اسے کھیلو" میں نے کہا "کاسٹ بہت بڑی ہے۔ لڑکی کا پارٹ کون کرے گا؟"

بولا "ہو جائے گا۔ تم تیاری کرو۔"

"تیاری تو ٹھیک ہے مگر۔"

"اگر مگر سب ٹھیک ہو جائے گی۔"

اس کی گفتگو سچ سچ دل میں گھر کر جانے والی ہوتی تھی۔ چند ہی دنوں میں لڑکوں کی ایک کھیپ کی کھیپ پکڑ لایا۔ میں نے پارٹ کچھ لڑکوں سے پڑھوائے اور بڑے والہانہ جذبہ کے ساتھ ریہرسل شروع کر دی۔ ایک روز ریہرسل دکھانے کو پروفیسر خادم محی الدین کو لے آیا۔ انہوں نے ہمارے خلوص کار سے لذت پائی۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں نذیر سید کے ساتھ ایک صاحب اردو فارسی میں تیز ریڈیو ڈراموں میں حصہ لینے والے کشمیری پنڈت چھوٹا قد گوری رنگت اوپر اچکن نیچے چوڑی موہری کا پاجامہ اردو کا تلفظ نہایت ستھرا چلے آرہے ہیں۔ یہ پنڈت دینا ناتھ زتشی تھے جو سیکریٹریٹ میں محکمہ اطلاعات کے دفتر میں ملازم تھے۔ (انڈیا کی فلموں میں ابھی تک دکھائی دیتے ہیں۔) زتشی صاحب نے ہدایت کاری میں میرا ہاتھ بٹایا۔ ایک اور قابل ذکر بات کہ پہلی بار میرے چھوٹے بھائی اعجاز حسین بٹالوی نے اس ڈرامے میں حصہ لیا جو سیکنڈ ائر کا طالب علم تھا۔

نذیر سید کی کھیپ میں ایک شوخ و شنگ لڑکا محمد فیاض بھی آیا تھا اس کو بھی ڈرامے میں پارٹ دیا گیا۔ بہت دیر کی بات ہے میں نے اعجاز سے پوچھا "تم لاہور رہتے ہو۔ "نجمہ نوری" والے فیاض سے کبھی ملاقات ہوئی؟"

بولا "ایک دفعہ بس۔ وہ کہیں بنک میں ملازم ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا "نجمہ نوری" کا بروشر چھپ کر آیا تو اس کا نام لکھا تھا۔ ایس ایم فیاض بی اے ہم بہت چڑتے تھے کہ وہ کون ہوا بی اے لکھوانے والا۔"

اتفاقات پر غور کیجئے اڑتالیس سال بعد محمد فیاض سے نیویارک میں ملاقات ہوتی ہے دو ہفتوں کے لئے اعجاز حسین بٹالوی نیویارک آیا تھا میری بیوی کے عزیز کامل مصطفیٰ نے اس کے اعزاز میں کھانے کا اہتمام کیا۔ میں نے دیکھا ساتھ والے کمرے میں اعجاز بڑی گرمجوشی کے ساتھ کسی سے مل رہا ہے۔ میرے پاس آکر کہنے لگا "آپ کو ایک شخص سے ملواؤں جس کو آپ مدت سے نہیں ملے۔"

گرمجوشی کے ساتھ فیاض میرے ساتھ لپٹ گیا۔ عورتیں دیکھنے لگیں۔ "مجھے کسی سے معلوم ہوا تھا تم نیویارک آئے ہوئے ہو میں نے سوچا اس وقت تک توند بڑھ چکی ہوگی۔ موٹے ہوگئے ہوگے تم ویسے کے ویسے۔ ادھر آؤ میری بیوی سے ملو۔"

میں نے مسکرا کر ان سے کہا "آپ کا میاں اگر میرے ساتھ رہتا تو یقین جانیے اس وقت ملک کا بہت بڑا ایکٹر ہوتا پر اس نے بینک میں نوکری کر لی۔"

وہ اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا۔ ہم ہنس ہنس کر "نجمہ نوری" کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"مجھے بتاؤ نجمہ نوری کا پارٹ کس نے کیا تھا۔"

بولا "نذیر سید کسی مسلمان چیف انجینئر کے لڑکے کو لایا تھا۔ مجھے یاد ہے تم نے دیکھتے ہی کہا تھا نذیر یہ نہیں پارٹ کر پائے گا۔ آخر تم نے مغز ماری کی۔ اسی نے پارٹ کیا تھا" پھر مسکرا کر بولا "جو کاغذات میرے ساتھ آئے ہیں ان میں "نجمہ نوری" کا بروشر بھی ہے" اس نے اگلے روز فون کرکے کہا "حسن کتا نے لڑکی کا پارٹ کیا تھا۔"

۲

مسٹر جی ڈی سوندھی پروفیسر گورنمنٹ کالج تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بہت بڑے پرموٹر تھے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسی کالج کے ڈراموں میں لڑکی کا پارٹ کیا کرتے تھے۔ نہایت خوبرو اور خوش شکل تھے۔ جو لباس پہنتے سجتا تھا۔ انہوں نے پنجاب میں ڈرامے کی ترویج و ترقی کے لئے ڈراما لیگ کی بنیاد رکھی اس ادارے کا نام انہوں نے پنجاب ڈراما لیگ رکھا تھا۔ لیگ کے مقاصد میں بہت بڑا مقصد لارنس گارڈن لاہور میں اوپن ائر تھیٹر تعمیر کرنا تھا۔ پروفیسر سوندھی کی بڑی باوقار شخصیت تھی بڑے بڑے لوگوں تک رسائی تھی۔ ہندو مسلمانوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ان کی بیوی عیسائی تھی اس لئے عیسائیوں میں بھی ان کی بڑی تعظیم تھی۔ اوپن ایئر تھیٹر کے لئے انہوں نے گورنر پنجاب کی نہ صرف صوابدید حاصل کر لی بلکہ گورنر پنجاب سرہنری کریک نے آکر لارنس گارڈن کی پہاڑی پر جس کا نام اس وقت سکندر ماؤنٹ تھا اوپن ائر تھیٹر کا سنگ بنیاد رکھا۔ (پتھر اب بھی موجود ہے) اس تھیٹر کی تعمیر کا کام اس چندے سے مکمل ہوا تھا جو پروفیسر سوندھی کی ذاتی کوششوں سے اکٹھا کیا گیا تھا۔

پنجاب ڈراما لیگ کی انتظامیہ کے سات ممبر تھے۔ دو ہندو دو مسلمان دو عیسائی ایک سکھ۔ ممبر ہونے کے علاوہ مسٹر سوندھی ڈرامہ لیگ کے چیئرمین بھی تھے۔ دوسرا ہندو ممبر ہائی کورٹ کا جج مہرچند مہاجن تھا۔ عیسائی ممبروں میں وائی ایم سی اے کے سیکرٹری مسٹر کے ایل رلیا رام تھے جن کو ڈراما لیگ کا سیکرٹری بنایا گیا۔ دوسری عیسائی ممبر مسز نورا رچرڈ تھی جو پروفیسر ایس پی رچرڈ مرحوم کی بیوی تھیں۔ میرے بڑے بھائی ذوالقرنین خان بتایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں پروفیسر رچرڈ اسلامیہ کالج لاہور میں ڈراما پڑھایا کرتے تھے۔ شیکسپیئر ان کو زبانی یاد تھا۔ کالج گھوڑے پر سوار ہو کر آیا کرتے تھے۔ نورا رچرڈ نے خاوند کے مرنے کے بعد پہاڑی صحت افزا مقام دھرم سالہ کے قریب پالم پور میں کچھ زمین خرید کر وہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ پالم پور سے جب ڈراما لیگ کی میٹنگ کے لئے لاہور آتیں تو ٹمپل روڈ پر سردار پرتاب سنگھ بار ایٹ لا کے یہاں قیام کرتیں۔ سردار پرتاب سنگھ بھی پنجاب ڈراما لیگ کے ممبر تھے۔ مسلمان ممبروں میں سید امتیاز علی تاج او راقم الحروف تھے' میرے ڈرامے کے شوق اور میرے بیک بلڈ ہونے کی حیثیت میں مجھے سید امتیاز علی تاج اور مسٹر رلیا رام کی تائید پر چنا گیا' مسٹر سوندھی کو چندہ اکٹھا کرنے میں بڑی مہارت تھی ان کا میل ملاپ بے حد تھا۔ اس لئے ڈراما لیگ کے خزانچی بھی وہی بنے۔

پروفیسر بخاری ریڈیو کے محکمے میں جا چکے تھے۔ اپنے یہاں اوپن تھیٹر کی کوئی روائت نہ تھی۔ کسی کو

اس کے استعمال کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ لوگ آتے تھے چاٹ کر چلے جاتے۔ چنانچہ اس معاملہ میں پروفیسر سوندھی کو خود ہی پہل رفتت کرنی پڑی۔ جو شو سب سے پہلے اس تھیٹر میں پیش کیا گیا وہ پنجابی دیہاتی میلہ تھا۔ کبھی ایک طرف سے کھلے میں سادھو سنت چلے آرہے ہیں دوسری طرف سے انگ پر بھبوت ملے جوگی آرہا ہے ساتھ چیلے ہیں۔ وہ ایک طرف سے نکل گئے تو دوسری طرف سے دیہاتی جوان بھنگڑا ناچتے داخل ہوئے۔ ایک کونے میں ملنگ اور فقیر محفل بنائے بیٹھے ہیں۔ بھنگ گھٹتی ہے نعرۂ مستانہ بلند ہوتا ہے اللہ بیلی اللہ بیلی کہہ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں جھومر اور کِکلی ناچتی نمودار ہوتی ہیں دو سکھ ریشمی لاچا باندھے ہاتھوں میں لمبے چمٹے بجاتے گاتے داخل ہوئے۔ جگا جمیا تے ملن ودھایاں تے وڈھا ہوکے ڈاکے ماروا۔ جگیا۔ دور پردیس گئیوں۔ بھوا وجیا۔ وہ غائب ہوئے تو دوسری طرف سے ماسٹر کے ساتھ لڑکوں کی ٹولی داخل ہوئی۔ ایک لڑکا دو کا پہاڑہ کہلوا رہا ہے' باقی لڑکے پیچھے پیچھے دونی کا پہاڑہ دہراتے ہیں' ایک دونی دونی دو دونی چار اے تن دونی چھ اے۔ جب پہاڑہ ختم ہو جاتا ہے ایک لڑکا ماسٹر سے کہتا۔ ماسٹر جی اج میلہ اے۔ سانوں چھٹی چاہی دی اے" گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ماسٹر کہتا ہے "جاؤ چھٹی"

لڑکے بالے "چھٹی اے چھٹی اے" کا شور مچاتے کوئی ادھر کے کوئی ادھر کے راستوں سے باہر بھاگ جاتے ہیں ایک طرح سے یہ دیہاتی میلہ ڈانس بیلے کے قریب قریب کی چیز تھی جو پروفیسر سوندھی کی ہدایت میں سید امتیاز علی تاج کے مشورے سے پنجاب ڈراما لیگ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اب اس شور سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ اوپن ایئر میں کس طرح کی چیز کس ڈھنگ سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اسٹیج کی زیبائش کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک آدھ چیز رکھ کر کام پورا کر لیا جاتا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اپ ٹا (IPTA) ہندوستان بھر کا دورہ کررہی تھی۔ اپٹا انڈیا پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کا مخفف تھا اس میں ایکٹر لوگ کلکتہ اور بمبئی کے زیادہ تعداد میں تھے پتلی پتلی بنگالی لڑکیاں سفید سادہ ساڑھیوں میں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ یہ پارٹی جب لاہور آئی اوپن ائر تھیٹر کی اسٹیج اور وہاں کی کھلی فضا ان کو بہت پسند آئی۔ یہ پیشکش بھی اسٹیج شو قسم کی چیز تھی جس میں کچھ ٹکڑے انگریزی میں کچھ اردو میں پیش کئے گئے۔ بنگلہ اور اردو میں کچھ چیزیں بھی گائی گئیں۔ ناظرین میں بیٹھے ہوئے کچھ اداکار وہاں سے مکالمہ بولتے اسٹیج پر آتے لاہور والوں نے یہ پہلی دفعہ دیکھا۔ ان دنوں بنگال میں جان لیوا قحط پڑا تھا جس سے کوئی بتیس لاکھ کے قریب بنگالی لقمہ اجل ہوگئے تھے۔ اپٹا کی پیشکش میں کئی ٹکڑے اسی دردناک قحط کی داستان تھے جو اس درجہ ڈرامائی سلیقے اور قرینے سے پیش کئے جاتے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ہندوستانی فوجیں دنیا کے مختلف محاذوں پر جنگ لڑرہی تھیں۔ انگریز کی غلط تدبیرکاری سے ہندوستان کا سارا چاول باہر بھیج دیا گیا۔ بنگال کے اس دردناک قحط سے متاثر ہوکر کرشن چندر نے مشہور افسانہ "ان داتا" لکھا۔ اپٹا کی پیشکش کا جہاں تک تعلق تھا اس میں زندگی کی تڑپ اور گرمی اس درجہ تھی کہ اشتراکی رجحان رکھنے والے دماغوں کو بے حد متاثر کر گئی۔ لاہور کے ایک صاحب ایمان صاحب دل نوجوان اپٹا سے اتنا متاثر ہوئے کہ اس قافلے کے ساتھ ہو لئے۔ ان کا نام صفدر میر (زینو) تھا۔ لاہور کا ایک اور جوشیلا عیسائی نوجوان آکسفورڈ کا گریجویٹ ایرک سپرئین بھی سخت اشتراکی دماغ کا آدمی تھا وہ بھی انڈیا پیپلز تھیٹر کی تحریک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے چند ہم خیال اکٹھے کرکے پیپلز تھیٹر گروپ بنایا۔ یہ لوگ کالی اور سفید چادریں ساتھ لے لیتے۔ ٹم ٹم میں بیٹھ جاتے گاؤں گاؤں جاتے۔ چادریں لٹکا کر پنجابی زبان میں ناٹک

پہلے وہ اسلامیہ کالج اور ایف سی کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر بھی رہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے
بڑے سرگرم کارکن تھے۔ کئی مرتبہ قید ہوئے۔ آج کل انگریزی روزنامہ "نیوز" کے لئے ہفتہ وار کالم
عمدہ انگریزی لکھتے ہیں۔

اجا کی پیش کش کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ اوپن ائر تھیٹر میں کس طرح ناٹک کھیلے جا
سکتے ہیں۔ لڑکیوں کے کینیرڈ کالج لاہور کی ڈرامیٹک کلب پیش پیش سرگرم عمل رہتی اوپن ائر کا شوق چرایا۔ انگریزی
کا ڈراما "پدما" چار جو کمرے کے اندر کھیلنے کی بجائے کھلے میں زیادہ رونق پیدا کر سکتا تھا۔ اوپن ائر تھیٹر میں
کھیلا گیا فلاسفی کے پروفیسر جی سی چیٹرجی کی بیٹی اوشا نے مہاتما بدھ کا پارٹ بڑی خوبصورتی سے ادا کیا۔ مولانا
صلاح الدین ایڈیٹر "ادبی دنیا" کو میں نے خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ ایک ساتھ بیٹھ کر ہم نے دیکھا وہ ڈراما ان
دی پارک دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ اندر لال داس (مقیم لندن) کے تحریر کردہ ڈرامے وہ "ادبی دنیا" میں
شائع کیا کرتے تھے۔ "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" میں میرے ڈرامے چھپتے۔ لاہور میں اندر لال داس کے ڈرامے
میں پڑھتا تھا۔ وہ میرے لندن میں پڑھتے اس طرح ہم ایک دوسرے کے ناموں سے واقف تھے۔

دنیائے ادب میں حکیم احمد شجاع کا پسندیدہ موضوع ڈراما اور تھیٹر رہا تھا۔ وہ عمر بھر دیدہ زیب اور
جامہ زیب رہے۔ علی گڑھ کے صحبت یافتہ مہذب شگفتہ آداب محفل سے آراستہ اپنی نو عمری میں شوقیہ
ڈراموں میں لڑکی کا پارٹ کیا کرتے تھے۔ انیس برس کی عمر میں شوقیہ ڈراما کھیلنے کی انجمن کی بنیاد رکھی۔ ان
کی صاحبزادی خورشید (یاور حیات ٹی وی پروڈیوسر کی والدہ) کو بہت دیر سے امتیاز علی تاج کا ڈراما "انارکلی"
کھیلنے کی بڑی خواہش تھی۔ ایک دن حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ لڑکیوں کا ایک گروپ بناؤ اور ریہرسل
شروع کر دو۔ کھیلنے والی بھی لڑکیاں ہوں گی۔ دیکھنے والی بھی لڑکیاں۔ اسٹیج کی تعمیر اور سیٹنگ ہو جائے گی۔

نذیر سید سے بات کی۔ وہ میرے پاس آیا۔ ہم دونوں پر یہ کام آ پڑا۔ یہ ڈراما پہلے لیڈی میکلگن کالج
میں ہوا دو روز بعد وائی ایم سی اے ہال میں کھیلا گیا۔

پردے کا سخت انتظام رہا۔ اس ڈرامے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں لڑکیوں نے مردانہ پارٹ
کئے تھے۔ بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھا گیا۔ انارکلی کا پارٹ حکیم صاحب کی صاحبزادی خورشید نے کیا اور
خود ہی ڈرامے کی ہدایت کاری کی۔ شہزادہ سلیم کا پارٹ چوہدری اللہ بخش کی صاحبزادی تاجی (ممتاز بیگم) نے
کیا۔ سکندرہ بابر میری اہلیہ شہنشاہ اکبر بنی اور اکبر کی بیوی رانی جودھا بائی کا پارٹ ممتاز دولتانہ کی چھوٹی بہن
روزی مہوز نے ادا کیا۔ بختیار کا پارٹ طاہرہ سکندر حیات نے کیا جو وزیر اعلیٰ پنجاب سر سکندر حیات کی
صاحبزادی تھیں بعد میں جن کی شادی مظہر علی خان حال ایڈیٹر ویو پوائنٹ سے ہوئی۔ تاریخی ملبوسات کا انتظام
انہیں گھرانوں کی لڑکیوں نے خود سے کیا۔ لاہور میں یہ بڑی اہم اور انقلابی پیش رفت تھی۔ تہذیبی اور ثقافتی
اعتبار سے اس ڈرامے میں حصہ لینے والی سب مسلمان لڑکیاں تھیں۔

رات گئی بات گئی ایک بات کہوں۔ نیویارک آتے وقت تین سو کتابیں پنڈی کلب کو دے آیا۔
کلیات نظیر اکبر آبادی کا جہازی سائز نول کشور کا چھپا ہوا قدیم نسخہ سلیم گیلانی کو دیا۔ اردو کی صرف دو کتابیں
لایا۔ دیوان غالب اور انار کلی۔ ۱۹۸۷ء میں اعجاز کے بیٹے سلمان کی شادی پر لاہور گیا۔ اپنے دوست اورنگ
زیب عالمگیر سے معلوم ہوا "الحمرا" میں "انارکلی" کھیلا جارہا ہے۔ سو کام چھوڑے۔ دیکھنے گیا۔ اور سو کام
چھوڑ کر یہ ریویو لکھا۔ نوائے وقت میں چھپا۔

"آج پطرس بخاری سید امتیاز علی تاج رفیع پیرزادہ اور حکیم احمد شجاع ہوتے تو سٹیج ڈرامے کو ڈوبنے سے بچانے کی کیا کیا تدبیریں کرتے۔ یہ وہ قد آور لوگ تھے جو سٹیج کے فدائی تھے۔ انہوں نے اسٹیج کو مزید ترقی دینے اور سنوارنے میں بڑا کام کیا اور بڑی غمال دلبستگی اور وابستگی ناٹک کے ساتھ قائم رکھی۔

امتیاز علی تاج کی تمثیل "انارکلی" کی مرصع کاری زندہ رہنے والی ہے۔ جب کبھی پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری موج میں آتے تو میکدہ میں سے تمثیل خوانی کرتے پھر "انارکلی" میں سے اکبر اور سلیم کے پارٹ کی خواندگی کرنے لگتے اور آواز کے زیر و بم سے کمال پیدا کرتے۔ سماں پیدا کرنے میں صرف آواز کو دخل نہ تھا "انارکلی" کے مکالمے بھی اتنے سادہ اور پرکار و پرکشش ہیں کہ صحیح طور پر سوچ سمجھ کر بولے جائیں تو بڑا اثر رکھتے ہیں۔

یہ کہنا کہ یہ ڈراما آج پہلی مرتبہ کھیلا جارہا ہے غلط ہے۔ ۱۹۳۹ء میں لاہور کی چند لڑکیوں نے ایک انجمن بنائی تھی جس کی روح رواں حکیم احمد شجاع کی صاحبزادی (یعنی یاور حیات ٹی وی فیم کی والدہ) تھیں۔ جنہوں نے یہ ڈرامہ پہلے لڑکیوں کے لیڈی میکلیگن کالج پھر وائی ایم سی اے میں صرف خواتین کے لئے کھیلا تھا۔ راقم کی اہلیہ شہنشاہ اکبر اور ممتاز دولتانہ کی ہمشیرہ روزی (مہروز) رانی جو دھابائی بنی تھیں۔ حکیم احمد شجاع کی صاحبزادی یعنی یاور حیات کی والدہ نے انارکلی کا پارٹ کیا تھا۔ انارکلی کا ڈراما لاہور کے علاوہ اور شہروں میں بھی وقتاً" فوقتاً" خواتین و حضرات الگ الگ یا مل کر پیش کرتے رہے۔

تاج صاحب نے ۱۹۵۷ء میں انارکلی کا آخری حصہ لاہور قلعہ کے شیش محل میں پیش کیا تھا۔ پھر محفل موسیقی منعقد ہوئی جس میں فیض صاحب کی بہت ساری غزلیں گائی گئیں۔ اس وقت پنجاب کے ڈائریکٹر اطلاعات عامہ محمود نظامی تھے جن کو ریڈیو کا بہت تجربہ تھا۔ بڑے طباع اور ذہین جنہوں نے ہسٹوریکل اسوسی ایشن لاہور سے مل کر اس تقریب کا اہتمام کیا تھا جس کی خاطر میں راولپنڈی سے لاہور گیا۔ قلعہ میں چراغاں کے علاوہ شیش محل کے قریبی نشیب میں کھانے کا اہتمام بھی ہوا تھا۔ داخلہ ٹکٹ سے تھا۔

سیکرٹری پنجاب ریڈ کراس میجر افضل کی اہلیہ پروین نے انارکلی کا پارٹ ادا کیا جو شیش محل کی چھت کے کنارے گھنگھرو باندھے چھم چھم کرتیں کلیلیں بھرتیں' وقفوں کے ساتھ ساتھ سپاٹ لائٹ کے دائروں میں نیچے اترتی رہیں تا آنکہ وہ شیش محل کے دالان میں پہنچیں جہاں شہنشاہ اکبر اپنی تخت گاہ پر براجمان تھا۔ وہیں غزل گائی گئی۔ اے ترک غمزہ زن کہ مقابل شد۔ وہیں رقص ہوا۔ وہیں شہزادہ سلیم اور انارکلی کی نگاہوں کی رم جھم کو آئینہ میں بادشاہ نے دیکھا اور غضبناک ہوگیا۔ شو ختم ہو جانے کے بعد بہت تالیاں بجیں۔

بھارت کے ایک ایکٹر سعید جعفری عنقریب نیویارک سٹی میں تاج صاحب کا ڈراما "انارکلی" پیش کرنے والے ہیں۔ یقیناً ان کی پیشکش بھی دیکھنے جاؤں گا۔ کیونکہ یہ ڈراما ہمارا بہت بڑا اثاثہ ہے جس پر ہمیں فخر ہے۔

خیال اس ڈرامے سے تاج صاحب کے دوسرے نثری ڈراموں کی طرف جاتا ہے مثلاً "جنوں و جہاد" "الو کی زبان" "قرطبہ کا قاضی" وغیرہ۔ بکھیڑا یہ پڑا کہ تقسیم ہند کے وقت کرتار سنگھ دگل ریڈیو اسٹیشن لاہور پر پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ تاج صاحب کے یہ ڈرامے جیب میں ڈال کر بھارت لے گئے۔ ان مسودوں کا گم ہو جانا ماتم کا مقام ہے۔ کوئی بھی صنف ادب ہو اس کی ساکھ بگڑ جائے تو سنورنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی بکھیڑا اسٹیج ڈرامے کی صنف سے ہوا۔ ان حالات میں سنجیدہ و غیر سنجیدہ حلقوں میں جب اسٹیج ڈرامے کا مطلب پھکڑ

بالکل لا یعنی مکالمے اور حرکت بالکل سمجھا جائے اور لکھے جائے بے منطق اور فہم کی بی فارسیقہ شکلیں لکھ لکیں "تو آبروئے شیوہ اہل نظر گئی" کے حالات میں امتیاز علی تاج کی سنجیدہ کہانی "انار کلی" کو عقل میں جاب کر چار دستے چڑھ کر اسٹیج پر آنا بڑی ہمت کی بات تھی پھر ڈرامے میں بولنا بڑی تیزی کی کھیپ ہے اسٹیج اور فرنٹ میں چلنا پھرنا نپا تلا ہوتا ہے۔ ایک قدم زیادہ نہیں اٹھایا جاتا۔ آج کل ایکٹر اسٹیج پر گھر گھٹ مارتے نظر آتے ہیں۔ تھیٹر کو بڑے نپے تلے پیمانے سے ناپا تولا جاتا ہے۔ بھٹکنے کی ذرا بھی اجازت نہیں۔ اسٹیج ڈرامے کی پیشکش کی باریکیاں اور نفاستیں چار چاند لگا دیتی ہیں۔ ایسے غیر سنجیدہ حالات میں جب ہمارا سنجیدہ تھیٹر روبہ انحطاط ہو تاج صاحب کے داماد نعیم طاہر قابل مبارک باد ہیں کہ وہ ان کا ڈرامائی موزیک (mosaic) لے کر ہرچہ بادا باد کا امام ضامن باندھ میدان میں اتر آئے۔

"انار کلی" دیکھ کر میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ انہیں اپنے ایکٹروں کی تراش خراش میں بڑا کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ ایکٹر وہیں تک سمجھ سکتا ہے جہاں تک اس کی صلاحیت ہو۔ اس کے آگے وہ نہیں جا سکتا۔ ایسے ایکٹروں سے راقم خوب واقف ہے۔ اس پیشکش میں راقم کو ایسے ایکٹر یقیناً دکھائی دیتے رہے۔ معمولی جملہ "دل آرام خوب نام ہے" کہئے کیسے کہیں گے۔ ڈائریکٹر کتنی طرح سے کہلوا سکتا ہے۔ کہ اس میں اسے اصلی معنی اصلی روح یک آشہ بن کر سامنے آئے۔ اگر ایکٹر ان لفظوں کی ادائیگی نہ کر پائے تو ڈائریکٹر کیا کرے۔ اس کی جان کو تو کئی روگ ہوتے ہیں۔ بختیار کی گفتگو اگر مردانہ سطوت کی سطح تک نہ پہنچ پاتے اور کبھی کبھی He man کم اور She man زیادہ دکھائی دے اور نہ جانے کہ اتنے سارے سب کے سب مکالمے کھڑے ہوکر اسٹیج پر کیسے بولے گا کہ آک ورڈ دکھائی نہ دے تو وہ کیا کرے گا۔ وہ وہی کرے گا جو طریقہ آج کل کے ٹی وی اور آج کل کی اسٹیج پر مروج ہے۔ یعنی ایک ہاتھ کی مٹھی بنا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر زور زور سے مارے گا۔ یہی بختیار نے کیا کہ آج کل عورت مرد اسی طرح کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ خدا خبر ہدایت کار نعیم طاہر نے اس طرف کیوں توجہ نہیں دی کہ بختیار کو اس فرسودہ طریق اداکاری سے نکال لیتے۔ بہت سے اچھے مواقع آئے مگر بختیار نے لائنیں سپاٹ بول کر مواقع ضائع جانے دیئے۔ یوں معلوم ہوتا رہا کہ آموختہ اگلا جارہا ہے۔ "صاحب عالم کی آنکھوں میں آنسو" کہئے کیسے کہیں گے۔ بختیار نے اسے بھی ضائع جانے دیا۔ امتیاز علی تاج نے کتنے جملے کاٹے ہوں گے کہ اطمینان بخش نہ تھے موقع کے لفظ نہ تھے۔ پھر ان چھ لفظوں پر اکتفا کیا ہوگا کہ صحیح ترجمان تھے۔ ان میں طلسم تھا۔ محبت کی گہرائی تھی مغرب کے جدید تھیٹر میں منہ موڑ کر مکالمہ بولا جاتا ہے۔ اور ہاؤس کی طرف پیٹھ بھی موڑی جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں خوشی کی بات تھی۔ منہ موڑ کر مکالمے بولے گئے۔ مگر جب بھی بولے گئے نہ سنے گئے۔ ایکٹروں نے دھیان نہ دیا کہ اس پوزیشن میں آواز اونچی ہونی چاہیے باادب با ملاحظہ شہنشاہ معظم ظل الہی والا کلمہ بے مزہ اس لئے معلوم ہوتا رہا کہ وہ ریکارڈ کیا ہوا تھا۔ آواز اسی لئے کھرکھری تھی۔ زندہ آواز جیسا ریڈیو پر رواج ہے مختلف فاصلوں پر سے قریب آتی سنائی دیتی تو زندگی کے قریب بھی ہوتی لطف بھی آتا۔ نہ معلوم بائیں طرف کو پردے کے پیچھے ایک صاحب کھڑے ہم ناظرین کو جھانک کیوں رہے تھے۔ راقم کے پلے میں ایسا ہوتا تو؟

جس منظر میں لڑکیاں شطرنج کھیل رہی تھیں ایک لڑکی چور نگاہوں سے ناظرین کو دیکھ رہی تھی بادشاہ سلامت کے آنے پر سب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سازندے اٹھ کر کھڑے نہیں ہوتے۔ انہوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ یہ لوگ تو ہوتے ہی شاہی دربار کے پروردہ ہیں۔ اعجاز نے کہنی ماری۔ میں نے کہا "میں تو

پرسوں چلا جاؤں گا آپ نعیم طاہر سے پوچھتے رہیے گا۔ یہ سازندے مستقل قسم کے کیوں ہیں کہاں سے آئے ہیں"

قدیم تھیٹر کا ازلی روایتی انداز ہے ایک ایکٹر کا دوسرے کے پیچھے پیچھے چلنا۔ یہ اداکاری کا بہت آسان طریقہ ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اس سے ہم کب نجات پائیں گے۔ اگر آپ کا تعلق قدیم تھیٹر سے نہیں ہے۔ جدید تھیٹر سے ہے تو اس آسان ترین طریقے کے پھندے سے نکل آئیے اور چلت پھرت کو روز مرہ کا لبادہ پہنائیے تو بات بھی ہوئی۔ ناقدین بھی کہہ سکیں جی ہاں قدیم اور جدید کی آمیزش ہوئی نتیجہ اچھا نکلا۔

اس بات کو نعیم طاہر جانتے ہیں وہ بہت اچھے کھیل پیش کر چکے ہیں۔ انہیں معلوم ہے یکسانیت کو نہیں برتا جاتا۔ "Break the symmitry" ورنہ یکسانیت سے بوریت پیدا ہو جاتی ہے۔ شہزادہ سلیم تین مرتبہ ایک ہی ستون سے سہارا لیتا ہے۔ وہ اس یکسانیت کو توڑنے کے لئے کسی اور ستون سے بھی تو سہارا لے سکتا تھا۔ کیوں نہیں لیا؟

شہزادہ سلیم نے بھی بختیار کی طرح کئی لائنیں ضائع کر دی ہیں۔ گھبراہٹ گھبراہٹ نہیں حرف شوق حرف شوق نہیں، گفتار سلیم گفتار سلیم نہیں۔ سب لوگ ایک ہی پچ پر بولتے رہے۔ یوں کہ آموختہ ہے اگل دو۔ ڈرامیٹک جیسچر اور آواز کی اونچ نیچ سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا۔ کئی جملے سپاٹ لائٹ سے زیادہ با اثر بن سکتے تھے۔ مگر سپاٹ وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں ایکٹر کو کچھ کر کے دکھانا ہو مگر جب ایکٹر اس قابل نہ ہو تو سپاٹ لائٹ بے فائدہ ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈرامے کا وہ حصہ جذباتی طور پر بڑا اہم ہے جہاں قید میں پڑی اپنی بہن کی محبت میں تڑپتی ہوئی ثریا شہزادہ سلیم کو برا بھلا کہتی ہے۔ یہ مقام اتنا سپاٹ اور بے اثر گزر گیا کہ لوگ الٹا ہنسنے لگے تھے۔

راقم کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ تھیٹر میں گروپنگ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جس سے نعیم طاہر خوب واقف ہیں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ گروپنگ کا مناسب خیال نہ کیا گیا۔ ان کے پچھلے کئی کھیل راقم کو یاد ہیں جن میں گروپنگ کا خیال رکھا جاتا رہا۔

آخر اسٹیج پر دو چار اوپر نیچے جو قدچے بنائے جاتے ہیں۔ ان سے کام لیا جاتا ہے وہ بے مقصد نہیں ہوتے۔ فائدہ اٹھانا ان سے مقصود ہوتا ہے ایک موقع پر راقم کو خیال آیا کہ دل آرام کا اسٹیج سے نچلے اور شہزادہ سلیم کا اوپر کے حصے پر کھڑا ہو کر گفتگو کرنا زیادہ موثر ہو سکتا تھا۔ مگر فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ اداکاروں کا ایک ہی صف میں کھڑا ہو جانا جدید تھیٹر میں قابل تعریف نہیں سمجھا جاتا۔ گروپنگ کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ straight line نہ بننے پائے۔

صبیحہ مہارانی بنی اور نعیم طاہر شہنشاہ اکبر بنے۔ اس قابل تھے کہ سپاٹ لائن کے دائرے میں اپنی منجھی ہوئی اداکاری کے جوہر دکھا سکتے مگر ایسا نہ ہو پایا بلکہ صبیحہ اور وہ ایک دوسرے کے آگے آگے پیچھے پیچھے چل چل کر پرانے فرسودہ پامال دستور کے مطابق مکالموں کی ادائیگی کرتے چلے گئے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

فخری احمد جنہوں نے خواجہ سرا کافور کا پارٹ ادا کیا یقیناً اپنے اندر صلاحیت کے جراثیم رکھتے ہیں۔ سیٹ خوشگوار تھا اور اختتام پر جہاں انار کلی بیٹھ کر غزل کے چند شعر دوبارہ سناتی ہے نہایت مناسب خاتمہ تھا۔ ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ تھیٹر کے نام لیوا تھیٹر کے قدیم اسلوب میں نیا خون کیوں داخل نہیں

کمرشل آرٹ افسانہ غزل نظم ناول جب جدیدیت کے تجربہ کررہی ہے تو تھیٹر کیوں نہ کرے مجھے یہی شک ہے کہ انارکلی کا ڈراما پرانی ڈگر سے ہٹ کر لکھا گیا نہ مقفیٰ عبارت نہ شعری نہ واویلا نہ ٹھیک نہ ٹھاک۔ اکبر کے مشہور و معروف شاعر بے مثال فیضی کی صرف ایک فارسی غزل (موقع کے عین مطابق) نہ معلوم تاج صاحب کو اس مناسب غزل کی تلاش و جستجو میں کتنی مشقت اٹھانی پڑی ہوگی۔ کتنی غزلیں دیکھنی پڑی ہوں گی اور پھر یہ کہ اس غزل کے انتخاب پر بھی پطرس بخاری اور مولانا سالک کی رائے انہوں نے حاصل کی ضروری سمجھی ہوگی کہ وہ ان کے رفیقان شب و روز تھے۔

انہوں نے "انارکلی" کے دیباچہ میں تحریر کیا تھا کہ تھیٹر کے کسی مالک نے "انارکلی" ڈرامے کو اس کی موجودہ صورت میں کھیلنا گوارا نہ کیا تھا کیونکہ وہ اس میں کمرشل تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے جو تاج صاحب کو کسی صورت گوارا نہ تھیں۔ کیونکہ تاج صاحب نے "انارکلی" لکھنے میں نیا طرز اختیار کیا تھا۔ جو جدید کے قریب تھا اور تھیٹر میں جدت کی طرف کا راستہ تھا۔ اس لئے "انارکلی" کو اسٹیج کرتے وقت اس کی پیشکش میں ایسا تجرباتی انداز اختیار کیا جانا چاہیے جو قدیم طرز تکلم اور قدیم انداز ادائیگی کی روش سے ہٹ ہو۔ چنانچہ "انارکلی" کے آخری منظر میں اکبر بادشاہ اور مہارانی کا ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے چل کر فرسودہ قدیم طرز تکلم اختیار کرنا کوئی تعریفی اقدام قرار نہیں پا سکتا۔

مگر یہ ضرور ہوا کہ روز مرہ کے "میڈم اللہ رکھی" قسم کے ڈراموں سے ایک دم ذائقہ بھر کے "انارکلی" ڈراما پیش کرنا قابل تعریف اقدام ہے۔ اس پیش رفت کو یوں قائم رکھا جا سکتا ہے کہ یہی ٹیم تاریخی مزاج کے ڈرامے پیش کرنے میں تخصیص پیدا کرلے۔ اس طرح سے کچھ نئی راہیں دریافت ہونے لگیں گی جو آگے جاکر زیادہ قابل عمل ہو جائیں گی۔ لوگوں کا ذائقہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ "میڈم اللہ رکھی" قسم کے ارزاں ڈراموں سے لوگ نجات پائیں گے ان کی تہذیبی پرورش ہوگی۔

ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ یاور حیات اور نثار حسین جو ٹیلی ویژن کے سربر آوردہ پروڈیوسر ہیں کیوں نہ اپنے مزاج اور تربیت کے حساب سے "انارکلی" کی تمثیل ٹی وی پر پیش کریں۔ آخر ہر کوئی ڈائریکٹر ایک ہی تمثیل کو اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ہی پیش کرتا ہے جیسے سویڈن تھیٹر "ہملٹ" کو اپنے طور پر کھیلتا ہے انگلستان اور روس اپنے اپنے طرز پر کھیلتے ہیں۔"

۳

"بھئی ہمارا اوپن ائر تھیٹر خالی پڑا ہے۔ کوئی ڈراما کھیلو" ایک روز مسٹر سوندھی نے انگلش پروفیسر مسٹر ڈ جینکرہ سے کہا۔ پروفیسر ڈ جینکرہ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے۔ انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ انگلش لٹریچر پر وسیع نظر تھی، انہوں نے اوپن ائر کے لئے مناسب ڈراما "Last War" منتخب کیا۔ بھائیں بھائیں کرتے ویرانے میں جانوروں کی گفتگو ہورہی ہے۔ شیر ہے ریچھ ہے بندر ہے کتا ہے گھوڑا ہے گھر ہے۔ آخری جنگ لڑی جا چکی۔ کوئی انسان نہیں بچا جنگل کے جانور طنز کرتے ہیں ہنستے ہیں مگر بیچ بیچ میں انسانوں کے وقار اور اس کی شخصیت کا خوف ان کے دلوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہی ڈرامے کی روح تھی۔

بندر کا پارٹ قلابازیاں کھاتا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر' مشکل تھا۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج میں فزیکل انسٹرکٹر محمد فیروز ہوتے تھے۔ پھرتی سے بھرا بدن تھا۔ کمایا ہوا جسم تھا۔ پروفیسر ڈھینگرہ نے ان کو بندر کا پارٹ دیا۔ انہوں نے قلابازیاں کھا کھا کر پھدک پھدک کر کمال جمایا۔ ایکٹروں کے چہروں پر ماسک تھے۔ اردو میں ڈرامے کا ترجمہ صوفی تبسم نے کیا تھا۔ جب جنگ میں بچا ہوا آخری سپاہی کیچڑ سے لت پت وردی پہنے منہ پر مٹی اور دھول پڑی اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے تو جنگل کے تمام جانور جو انسان کی غیر حاضری میں "بڑے شیر بنے ہوئے تھے۔" خوف سے ایک طرف کو سہم جاتے ہیں۔ سپاہی کی خود کلامی پنجابی زبان میں تھی پروفیسر سوندھی خود مزے کی پنجابی بولتے تھے۔ پنجابی زبان کا ان کو اچھا محاورہ تھا۔ دیہات کے رہن سہن اور رسم و رواج پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اس ڈرامے میں اعجاز کے دوست مسعود محمود نے گھوڑے کا پارٹ کیا تھا۔ جی سی ڈی سی کے ایک انگریزی ڈرامے Twilight میں مسعود محمود نے glow worm کا پارٹ کیا Twilight کا کچھ حصہ رفیع پیرزادہ نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ چھوڑ کر چلے آئے۔ طبیعت سے تنک مزاج تھے۔ جھٹ روٹھ جاتے۔ یہی سنتے رہے وہ ایک ڈراما اسٹیج کرنا چاہتے ہیں' بس سنتے رہے۔ انتظار کرتے رہے۔ ان کے بھانجے میرے دوست حاجی جہانگیر خان روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے رپورٹر تھے۔ اپنے کالم میں ماموں کی بہت تعریف کرتے۔ رفیع پیر کی آواز لوگ ان کے نشری ڈراموں میں سنتے جو خاص اہتمام کے ساتھ لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتے تھے۔ اپنے نشری ڈراموں میں وہ خوب پارٹ کرتے۔ ہدایتکاری بھی ان کی ہوتی۔ ان کے ریڈیو ڈرامے ہمیشہ بہت کامیاب رہے مگر افسوس لوگ ان کو اسٹیج پر دیکھنے سے محروم رہے۔ سردیوں میں اون کی گرم نکٹائی لگاتے جس کی knot موٹی سی ہوتی۔ یورپ میں ایکٹر ڈراما نویس آرٹسٹ ادیب شاعر لوگ اسی طرح کی اونی نکٹائی موٹی گرہ کے ساتھ باندھتے تھے عام طور پر یورپ کے تھیٹروں کے قصے سناتے۔ فلم اور اسٹیج کی باتیں کرتے۔ مشہور میوزک ڈائریکٹر خواجہ خورشید انور کے سالے محمد مسعود کے گھر پر کبھی کبھی ان سے ملاقات ہوتی۔ ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی سننے میں آتا وہ ایک ڈراما گروپ بنا رہے ہیں جو بننے میں نہ آتا۔ ان کا ڈراما "عقبیٰ کا قاضی" صفدر میر نے ایچی سن کالج کی اسٹیج پر کھیلا تھا جس کو رفیع پیرزادہ نے ڈائریکٹ کیا تھا۔

انہی دنوں میں نے اپنے کسی مضمون میں لکھا تھا۔ "کاش لاہور میں کوئی ایسا ڈراما اسٹیج ہو سکے جس میں ہمارے ملک کے تین نامور ڈراما نویس اور ایکٹر حکیم احمد شجاع امتیاز علی تاج اور رفیع پیرزادہ حصہ لیں تو واللہ وہ ڈراما تاریخ ساز ڈراما کہلائے گا دیکھنے والے کل کو فخر سے کہہ سکیں گے ان تین یادگار لوگوں کی اداکاری ہم نے دیکھی تھی۔"

پروفیسر خادم محی الدین جنہیں ڈرامے اور موسیقی کا خود بے حد شوق رہا۔ ناٹک سے ہماری دلبستگیاں دیکھ کر ہماری طرف راجع ہوئے۔ انگریزی کے دو ڈراموں کو انہوں نے اردو میں اپنایا تھا۔ ایک چیخوف کا ایک ایکٹ کا۔ نام "منگنی" رکھا۔ اس کو کھیلنے کا فیصلہ کیا دوسرا بھی ایک ایکٹ کا ڈراما تھا "اپنے لوگ"۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ٹی Rechlor or training کرنے کے لئے لڑکیاں موجود تھیں۔ لڑکیوں کی کوئی مصیبت نہ تھی۔ تین ہندو لڑکیاں رضامند ہوگئیں۔ "منگنی" کے لئے لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ پرنسپل چیٹرجی سے بات کی۔ بولے "میری لڑکی پارٹ کر دے گی۔"

ایک روز پروفیسر خادم محی الدین کہنے لگے "ضیاء کہتا ہے کوئی پارٹ اس کو بھی دیا جائے" میں اور

نذیر بولے "ٹھیک کہتا ہے" چنانچہ خادم محی الدین صاحب کو ڈرامے میں ایک بچے کا پارٹ بھی ڈال کر دیا۔ ضیا نے اپنے والد کے ڈرامے میں پارٹ کیا۔ اس وقت ضیا محی الدین چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ گروپ فوٹو ہوا۔ ضیا ہمارے ساتھ بیٹھا۔ گلے میں اچکن کندھے پر کتابوں کا بستہ۔

خادم محی الدین سال کے سال اپنے کالج میں ڈراما پیش کرتے تھے۔ اگلے سال ڈراما "جلاہے" اسٹیج کیا وہ بھی ایک انگریزی ڈرامے "Weavers" کا ترجمہ تھا جس کو اپنے معاشرے میں ڈھال کر لیا گیا۔ ضیا محی الدین کو اس میں بھی پارٹ دیا گیا۔

میں نے ایک دفعہ ضیا کو یہ دونوں گروپ فوٹو دکھائے۔ بولا "یہ ہمارے گھر میں بھی ہیں ایک اور بھی ہے جو آپ کے پاس نہیں۔ زمین پر میں اکڑوں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہوں۔ آپ مجھ کو میک اپ کے متعلق کچھ بتا رہے ہیں۔ پیچھے نذیر سید کھڑا ہے۔ یہ تصویریں ابا جی کے فوت ہونے کے بعد معلوم نہیں کس بہن کے پاس ہیں۔"

ایک سال ہوا اس کو میں نے نیویارک میں Dramatic readings پیش کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ باتیں پوچھنے کے لئے اس کو خط لکھا تھا جس کا جواب اس نے بڑا دلچسپ دیا۔

چیتن آنند بڑا خوبرو اور خوش شکل لڑکا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ تھا (اب پروگرام اسسٹنٹ پروگرام پروڈیوسر کہلاتا ہے) گورنمنٹ کالج میں مجھ سے سینئر رہا۔ بٹالہ تحصیل، گورداس پور ضلع تھا وہ گورداس پور کا رہنے والا تھا۔ ہندی میں شعر کہتا۔ دل ریڈیو سے اچاٹ ہوا۔ ڈراما اسٹیج کرنے کا شوق چرایا۔ Lahore Amature Dramatic Club کے نام سے ایک گروپ بنایا ہندو اور عیسائی لڑکیوں میں اپنی من موہنی صورت سے بڑا مقبول تھا۔ اس گروپ میں سب ہندو یا عیسائی تھے۔ مسلمان صرف میں اور میرا دوست افضل کاظمی۔ کاظمی چھ فٹ لمبا تیکھا جوان تھا۔ ورزشی بدن تھا۔ اس کو چیتن نے فیلڈ مارشل کا پارٹ دیا۔ خود وکیل صفائی کا پارٹ لیا۔ میں نے کلرک آف دی کورٹ کا پارٹ ادا کیا۔ چیتن کی ہدایت کاری تھی۔ انگریزی میں تین ایکٹ کا ڈراما تھا۔ "The Judgement Day" بڑی سہولت کی بات یہ کہ ایک ہی سین پر جو عدالت کا کمرہ ہوا پورا ڈراما ختم ہوتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک پروفیسر کیشپ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں چیتن کا آنا جانا تھا۔ ان کے بیٹے گپتا کیشپ کو وکیل استغاثہ کا پارٹ دیا گیا۔ ڈراما پلازہ سینما ہال میں کھیلا گیا چیتن کے ریہرسل دیکھنے کو بڑی سمارٹ اور خوبصورت عیسائی اور ہندو لڑکیاں آتی رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل مسٹر فیلڈن لاہور اسٹیشن کا معائنہ کرنے کو آیا۔ چیتن کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے فیلڈن نے جیب سے ایک روپیہ دیتے ہوئے کہا "Chetan go and have haircut"

چیتن سیدھا کافی ہاؤس جا پہنچا ان دنوں کافی کی پیالی کی قیمت دو آنے ہوتی تھی۔

چیتن کے جی میں ایسی آئی کہ آل انڈیا ریڈیو سے استعفیٰ دے کر بمبئی کی راہ لی۔ جہاں بہت دھکے کھائے بہت رلا۔ انہیں دنوں مجھے ولور (بمبئی کا ایک حصہ) میں ملا۔ مرجھائے مرجھائے چہرہ پر بیزاری تھی۔ تھکن تھی۔ ناکامی تھی۔ ایک مصرعہ قوال گایا کرتے تھے رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد۔ جب حالات سازگار ہوئے چانس ملے تو اس نے desperate ہو کر فلمیں بنائیں اور فلموں میں اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کے لئے راستے کھول دیئے۔ پروفیسر کیشپ کی بڑی بیٹی کو اس نے فلم میں کامنی کوشل کے نام سے پیش کیا جو دیکھتے دیکھتے مشہور ہو گئی۔ رفتہ رفتہ چیتن نے اپنے چھوٹے بھائی دیوانند کو بھی بلوا لیا اور اپنی

فلموں میں اس کو بحیثیت ہیرو پیش کیا۔

یہاں اس کی ایک فلم "تنہا گھر" کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس فلم میں ایک نہایت اہم پارٹ ادا کرنے کے لئے اس نے لاہور سے رفیع پیرزادہ کو بمبئی بلوایا جنہوں نے بڑی خوبصورتی سے وہ پارٹ ادا کیا۔ اس فلم کے پروڈیوسر جنہوں نے فائنس کیا تھا۔ جالندھر کے رہنے والے دو بھائی شفیق انور اور رفیق انور تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ دونوں بھائی میرے پڑوسی ہو گئے۔ مین روڈ پر میرے ساتھ والی کوٹھی ان کو الاٹ ہوئی تھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا کیا۔ دوستی ہو گئی۔ یہ کہنا از بس ضروری ہے کہ "تنہا گھر" نامناسب وقت پر ریلیز ہوئی تھی اس وقت جب فرقہ وارانہ فساد کا لاوہ پک رہا تھا۔ ایک روز انگریزی میں پوسٹ کارڈ موصول ہوا کہ ٹل تھیٹر گروپ کی تشکیل کے لئے ایک میٹنگ ہو رہی ہے آپ سے استدعا ہے تشریف لایئے۔ پتہ سانمال سٹوڈیو۔ ریگل سینما بلڈنگ۔ جو لوگ اس میٹنگ میں آئے ان میں تنہا مسلمان تھا۔ باقی سب غیر مسلم تھے۔ اندر لال داس اس میٹنگ کے کنوینر تھے۔ وہ حال ہی میں انجینئرنگ کی تعلیم ختم کر کے لندن سے واپس آئے تھے۔ ان کی تقرری جنرل الیکٹرک کمپنی لاہور ہوئی تھی۔ ان کا دفتر مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ میں تھا جہاں آج کل پی آئی اے کا دفتر ہے۔ اس کے ساتھ والے حصہ میں اس وقت کا مشہور وریک ریسٹورانٹ ہوتا تھا۔ نورا رچرڈ اس میٹنگ کے لئے پالم پور سے آئی تھی۔ اندر لال داس نے میٹنگ سے انگریزی میں خطاب کیا۔ ٹل تھیٹر کی تحریک سے متعارف کرایا جو اپنے زور سے سارے یورپ میں مقبول ہو گئی تھی' بنیادی ممبر چنے گئے۔ ڈرامے سے متعلق سرگرمیوں اور تجربے کے سبب سے میں بنیادی ممبروں میں شامل ہوا۔ تھیٹر ہماری قدر مشترک تھی۔ دوستی ہو گئی۔ کئی برس باہر رہنے کی بناء پر وہ لاہور کی علمی و ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے نابلد تھے اسلئے مختلف امور پر مجھ سے مشورہ کرتے۔ ٹل تھیٹر کے لائحہ عمل میں تمثیل خوانی بھی شامل تھی۔ مگر کس ڈرامے سے تمثیل خوانی کی جائے ایسا ڈرامہ کہاں تھا ہمارے پاس۔ تمثیل خوانی کے لئے اردو میں کوئی مناسب ڈراما موجود نہ تھا سوائے "انارکلی" کے اور "انارکلی" میں زنانہ پارٹ زیادہ تھے اور مردانہ کم۔ ایک اور دقت یہ تھی کہ ہندوؤں کو صحیح طور سے اردو پڑھنی نہیں آتی تھی۔ ایک بنیادی ممبر مسٹر پراشر نے آسان اردو میں ڈراما لکھا۔ اندر لال داس نے نظر ثانی کی کیونکہ انہیں کو ہدایتکاری کرنی تھی۔ ڈرامے کا نام رکھا "سوسائٹی کے ٹھیکیدار"

اس ڈرامے میں ایک کشمیری پنڈت مسٹر دانچو کا بڑا تسلیق کردار تھا جو نبھانا سب کے لئے مشکل تھا اندر لال داس نے یہ پارٹ مجھ کو دیا۔ کاسٹ کے سب ارکان ہندو تھے۔ ایک موٹا سکھ بھی تھا اس کی سردارنی بڑی خوش جمال تھی وہ بھی کاسٹ کی گئی۔ ریہرسل میں میرے پاس بیٹھ کر ہنستی رہتی۔

یہ ڈراما اوپن ائر تھیٹر میں تین روز کھیلا گیا۔ انگریزی اخبار "ٹریبون" اور "سول ملٹری گزٹ" تعریف میں بھرے ہوئے تھے۔ اردو اخبار والوں کو نہ اس وقت علم ہوتا تھا کہ ڈرامے پر ریویو کس طرح لکھا جاتا ہے نہ بے چاروں کو آج علم ہے۔ وہ جانیں کیونکہ یہ ان کی تربیت میں ہے ہی نہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر بخاری دہلی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا اوپن ایئر لارنس گارڈن میں ڈراما کھیلا جارہا ہے۔ اپنے دوست امتیاز علی تاج کے ساتھ دیکھنے کو چلے آئے۔ اندر لال داس کی خوشی کی حد نہ تھی معلوم ہوا بخاری آڈیٹوریم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ڈرامے کے خاتمہ پر بھاگم بھاگ باہر گیا۔ بخاری نے تعریف کی۔ یہ اندر لال داس کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔

نورا رچرڈ ہماری ورکشاپ دیکھنے کو پالم پور سے لاہور آئی تھی۔ ڈرامے کے بعد ہنس ہنس کر سب سے ملی اور تعریف کی۔ چند روز بعد جنرل پوسٹ آفس میں ملی۔ کہنے لگی کل واپس جا رہی ہوں۔ میں نے کہا "میرے بیوی بچے گرمیوں میں پالم پور جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ دس ایک دن کے لئے میں بھی آؤں گا۔"

اس نے ایک پرچے پر اپنا پتہ لکھ دیا۔

شالہ کے قریب پہاڑی مضافات میں پالم پور صحت افزا مقام تھا۔ ادھر دھرم سالہ کے بیچ میں کچھ پہاڑیاں۔ ادھر پالم پور۔ جہاں کی آب و ہوا چائے کی کاشت کے لئے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ ڈھلانوں پر چائے کے باغ قافلہ در قافلہ دکھائی دیتے ایک دن میں نے اعجاز سے کہا "چلو آج نورا رچرڈ کو ملیں۔"

شاداب و سرسبز کھیت، اونچی نیچی ڈھلانیں، سیبوں ناشپاتیوں سے بھرے بھرے باغ پہاڑی جھرنے، عجیب عجیب بل کھاتی پگڈنڈیاں۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے۔

پوچھتے پاچھتے پہنچے۔ سرسبز درختوں میں پختہ اینٹوں کا مختصر سا مکان دکھائی پڑا چاروں طرف جنگل کی خاموشی۔ اعجاز نے خاموشی توڑنے کے لئے ایک شخص سے پوچھا "میم صاحب ہیں؟"

"ہیں جی"

میں نے دروازے پر دستک دی۔ اوپر کی کھڑکی کو کھول کر نورا باہر جھانکی مجھ کو نیچے کھڑا دیکھ کر خوشی سے چہچہانے لگی۔ چہچہاتی چلی گئی۔ میں نے انگریزی میں کہا "یہ بالکونی سین رومیو جولیٹ کا کب تک رہے گا۔ میری جان اب نیچے آ دروازہ کھول۔ عاشقوں کو اندر آنے دے" وہ اوپر قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس مکالمے سے لذت پاکر اعجاز مسکرایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ اسیر حرف و سخن یعنی دونوں ہم جماعت وہ اور الطاف گوہر اپنی ہم نشینی و حرف گیری و زور بیان و لذت زبان کی دولت سے پنجاب یونیورسٹی کے لئے اردو ڈی بیٹوں میں کلکتہ، پٹنہ، الہ آباد، علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ یونیورسٹیوں سے ٹرافیاں لا رہے تھے۔ علی گڑھ والے تلملا کر کہتے۔ اب کے یہ سالے آئیں تو دیکھ لیں گے۔ اگلے سال یہ "سالے" پھر جاتے پھر ٹرافی سمیٹ لاتے۔

بڑھیا شوق وافر سے نیچے آئی اور سامنے کے باورچی خانے میں جاکر بجلی کی کیتلی کا پلگ لگا آئی اس وقت تک جوگندر نگر کے بڑے بجلی گھر سے گرد و نواح کے تمام علاقے میں بجلی آچکی تھی۔

نیچے کا کمرہ بیٹھنے کا تھا۔ اوپر والا سونے اور پڑھنے کا تھا۔ ایک پہاڑیہ نوکر چائے لانے لے جانے میں اس کی مدد کرتا رہا۔ بولی "اگر تم آدھ گھنٹہ دیر سے آتے تو ملاقات نہ ہو پاتی، کیونکہ میں اوپر پالم پور بازار میں کچھ سودا سلف لینے کو جا رہی ہوں۔ ڈاکخانہ میں ایک پارسل رجسٹری کرانا ہے۔"

نوکر کی طرف دیکھ کر بولی "ہمارا ٹٹو ٹھیک ہے نا؟"

وہ بولا "ہاں میم صاحب شام کو برکھا ہوگی۔"

میم صاحب بولی "برکھا سے پہلے واپس آئیں گے۔"

چائے پینے کے بعد پہاڑیہ نوکر ٹٹو لے کر حاضر ہو گیا۔ نورا رچرڈ ٹٹو پر سوار ہوئی۔ ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چڑھائی آئی۔ ٹٹو کسی ضدی خچر کی طرح رک گیا۔ اپنی بغل میں لٹکے تھیلے سے نوکر نے بڑھا ہوا

گھاس کا گچھا نکالا۔ گھوڑے کو دکھایا۔ گھوڑے نے منہ مارا۔ نوکر نے ہٹا لیا۔ گھوڑا اس کو چبا کر چل پڑا۔ جہاں رک جاتا نوکر یہی کرتا۔ تھوڑی سی گھاس چبانے کو دیتا پھر ہٹا لیتا۔

انگلستان کے اس انگریز پروفیسر کی عمر رسیدہ بیوی ایک مریل ٹٹو پر بیٹھی تھی جو اپنے وقتوں میں ایک خوشنما اصیل گھوڑے پر سوار ہو کر پنجاب کے طلباء کو انگریزی پڑھانے کالج جایا کرتا تھا۔ وہ دونوں رچرڈ اور نورا ڈرامے کے فدائی تھے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق کالج کے سٹوڈنٹ انگریزی ڈراما اسٹیج کرتے تھے۔ ٹیل کوٹ پہن کر نمودار ہوتے ڈرامے کے زنانہ کردار کرنے والے طلبا جھالردار جیکٹ اور لمبے سائے پہنتے۔ نورا اور رچرڈ دونوں کو مزہ نہ آتا۔ پنجابی زبان کی بیساختگی دونوں کے دلوں میں گھر کرتی جارہی تھی۔ نوکر چاکر دکاندار بساطی کنجڑہ درزی دھوبی موچی سب کی زبان پنجابی۔ پنجابی کا روزہ مرہ حاوی ہوتا چلا گیا۔ زبان کی مقامیت اثر کرتی چلی گئی۔

ان کے اکسانے پر ایک طالب علم نے پنجابی زبان میں ڈراما لکھا۔ جس کا نام ایشور چند نندا تھا ڈرامے کا نام "دلہن" رکھا گیا۔ پروفیسر رچرڈ اور نورا کی ایما پر نندا نے ڈرامے کو نک سک سے درست کیا۔ یہ ڈراما نورا رچرڈ نے خود ۱۹۱۹ء میں ڈائریکٹ کیا تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد ایشور چند نندا گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہو گیا پھر اسی نندا نے ایک ایسا ڈراما گروپ بنایا جو گاؤں گاؤں پھرتا پنجابی ڈرامے اسٹیج کرتا اس کا ایک ڈراما "لی دا ویاہ : لی کی شادی) بڑا کامیاب ڈراما تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے جس میں وہ ایک صاحب جائداد رائے صاحب کا پارٹ خود ادا کرتا تھا۔ ۱۹۳۰ء سے پہلے ۱۹۲۲ء میں اپنے ہی ایک لکھے ہوئے پنجابی ڈرامے "سمدرا" میں بوڑھے باپ کا پارٹ بھی وہ خود ادا کیا کرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گورنمنٹ کالج اور مشن کالج لاہور کے طلباء انگلش پلے انگریزی ملبوسات کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے۔ پنجابی ڈرامے کی تحریک کی عناں گیر اور روح رواں نورا ایک مریل ٹٹو پر بیٹھی اپنے ہاتھوں میں راسیں پکڑے ہوئے سیوں ناشپاتیوں کے باغیچوں کے ساتھ پگڈنڈی پگڈنڈی پہاڑی چڑھ رہی تھی۔ میں اور اعجاز اس کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے جارہے تھے۔ پہاڑیئے کے ہاتھ میں تہ کی ہوئی سفید لٹھے کے غلاف والی چھتری تھی۔ انگریز عورت کے پاؤں ہمارے دیس کی مٹی نے کس مضبوطی سے پکڑ لئے تھے۔ یہ عورت مہم جوئی کا پیکر ارادے عزم اور اعتماد کی تصویر تھی۔ بڑھیا کسی دن بھی لڑھک سکتی تھی۔ اس کی ہر شب اس کا ہر دن مسافر تھا۔ مگر پالم پور کے تو ہم مسافر تھے وہ باسی تھی۔ ڈاکخانہ تک ہم نے اس کا ساتھ دیا۔ پھر اپنی راہ لی۔

ملتان کا رہنے والا افتخار رسول ناٹک کی وارفتگی میں لندن کا ہو رہا۔ لندن کی نورا رچرڈ پالم پور کی ہو رہی۔ یہ ناٹک سے وابستگی کے وہ لوگ تھے جو دوسرے دیس کی ریگزار پر ایک روشن کارواں کا نقش پا بنے۔

۱۹۱۹ء میں پنجابی ڈرامے کی ابتداء نورا رچرڈ کی سعی و کوشش سے ہوئی۔ اس میدان میں ایشور چند نندا کو روشنی دکھانے والی اکسانے والی ناٹک لکھوانے والی مسز نورا رچرڈ تھی۔ پھر یہ ریگ رواں کی اپنی ادائیں ہوئیں کہ وہ وقت بھی آیا جب پنچولی کی بنائی ہوئیں پنجابی فلموں نے لاہور سے نکل کر بمبئی میں دھومیں مچا دیں۔ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو سے رفیع پیر کے پنجابی ڈرامے "اکھیاں" نے لوگوں کو چونکا دیا۔ اور اب لاہور کا ٹیلی ویژن ایسے لاجواب پنجابی ڈرامے نشر کرتا ہے کہ ہندوستان والے دنگ ہوئے جارہے ہیں۔ نورا نے جو ننھا پودا کبھی لگایا تھا اب تن آور درخت بن چکا ہے۔

"ہائے کیا لوگ میرے حلقہ احباب میں تھے" خیال حلقہ احباب سے حلقہ ارباب ذوق کی طرف

شروع کرتا جبکہ سوائے میرے "حلقے" میں کوئی ڈراما لکھ کر نہ لاتا۔ میں افسانہ بھی پڑھتا ڈراما بھی۔ ڈرامے کو پڑھنے کا میرا اپنا انداز تھا۔ جلدی جلدی کترہ نہ کرتا۔ سچ سچ بولتا۔ یہ انداز میں نے سید امتیاز علی تاج سے سیکھا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی کوششیں تھیں جو اپنی نہج سے ہوتی رہیں۔ صرف ایک شخص حلقہ ارباب ذوق میں ایسا ہوا جس کو ڈرامے کی سمجھ بوجھ تھی۔ وہ قیوم نظر تھا۔ بولا "ایک ایسا ڈراما لکھئے جس کو ہم حلقہ ارباب ذوق کے سالانہ جلسے پر اوپن ایئر تھیٹر میں پیش کریں۔ منظر نہ بدلے۔ باغ باغیچہ کا ایک ہی منظر رہے۔" یہ چیلنج تھا۔

میں نے دو ایکٹ کا ڈراما لکھا۔ ایک ہی سین باغ باغیچے کے منظر میں یہ سارا ڈراما ختم ہوا۔ "مصور"(۴) کے نام سے حلقے میں پڑھا۔ ڈرامے پر بحث کرنی بھی کوئی آسان نہیں ہوتی۔ بہرحال ہوئی۔ یہ ڈراما بوجوہ حلقہ ارباب ذوق پیش نہ کر پایا۔ ڈراما کھیلنا کوئی آسان کام نہیں ہوا کرتا۔ حلقے کے جس ہفتہ وار جلسے میں یہ ڈراما پڑھا گیا اور پھر اس پر جو تھوڑی بہت بحث ہوئی اس سے ایک جواں سال "جواں بخت" طالب علم نصیر زیدی کے جی میں کوئی شرارہ ضرور بھڑک اٹھا۔ اس نے اپنی کسی نجی محفل یا کافی ہاؤس میں قیوم نظر، الطاف گوہر، اعجاز بٹالوی اور مجھے Drama Critic کا خطاب دیا۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے۔ سن کر ہنسے۔ ایک روز الطاف گوہر خبر لاتا ہے۔ نصیر زیدی کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہا ہے۔ پھر خبر آتی ہے۔ اوپن ائر تھیٹر میں کھیل رہا ہے۔ پھر ایک دن ہنستا مسکراتا آیا بولا "زیدی کہتا ہے Critics ضرور آئیں۔ جب آئیں مجھے بتا دینا۔ ڈراما شروع نہیں ہو سکے گا جب تک کریٹک نہیں آئیں گے" ہم ہنس کر بات کا مزہ لیتے رہے کہاں کے Critic ہوئے ہم، Critic تو ہمارے استاد تھے۔

لیجئے یہ ٹولی اوپن ائر تھیٹر لارنس گارڈن میں پہنچتی ہے۔ کچے پکے نمدار اندھیرے میں کسی نوجوان سے الطاف گوہر ببانگ دہل کہتا ہے "زیدی کو بتا دو Critics آن پہنچے، شروع کرے۔"

ڈراما نچے بچوں والا کھایا ہوا طوطے کا کچا امرود۔ ہوا کرے۔ زیدی نے تو اس ڈرامے کے بعد بمبئی کی راہ لی۔ اس جواں بخت کے خوابوں میں وہاں کی فلم انڈسٹری اس کے انتظار میں تھی بد بخت۔

اک تم ہی نہیں تنہا الفت میں مری رسوا
اس شہر میں تم جیسے دیوانے ہزاروں ہیں

ساحل بمبئی سے یہ خبر ہرگز نہ آئی وہ شرارہ کب بجھا کہاں ڈوبا کہاں غرق ہوا۔ رہے نام لغزش پا اور شوق فضول کا۔ لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ کوئی کیا میں خود کہوں گا کہ زندہ دلی کی زندگی شکست و ریخت کے چونے گارے سے تعمیر ہو پاتی ہے۔ دل دیوانہ اور دل فرزانہ ایک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جب دیوانے کے حصہ میں جرات رندانہ اور لغزش مستانہ کی دولت آئی تو دل فرزانہ کو کیا ارزاں ہوا۔ مجھے کیا معلوم فارسی کا شاعر عرفی اپنے شعر میں کہتا ہے کمال حیرت ہے کہ سارے شہر میں ایک بھی نعرہ مستانہ سنائی نہیں دیتا۔ جس شہر میں میخانہ نہ ہوا وہ شہر تو ویران ہووے ہی ہووے

یک نعرۂ مستانہ زجائی نہ شنیدم
ویراں شود آں شہرے کہ میخانہ ندارد

(عرفی)

اگر زندگی کے استعارے کو آگے لے جائیں تو رہگزار حیات پر لغزش پا اور جرات رندانہ کا ایک سے ایک

نقش عجیب ملتا ہے۔ بیوی کا زیور بیچ کر فلم بنائی۔ جل کر تمباکو ہوئی' نہیں چلی۔ نہ خدا ملتا ہے نہ وصال صنم۔ میرے دوست قزلباش تھے۔ شفقت شاہ تھے۔ اپنی لغزش مستانہ پر غصہ آیا۔ جرات رندانہ نے پھر ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پھر فلم بنتی ہے پھر فیل ہوتی ہے آخر دونوں ہار کر سرکار کے فلمساز ادارے میں نوکریاں کر لیتے ہیں۔ بیوی کا زیور رہن رکھ کر احسان طرب نے ڈراما کھیلا۔ مار کھا گیا گھاٹے میں گیا۔ مگر یہ کیا بات کہ جرات رندانہ کے جال پر اور لغزش مستانہ کے وبال پر ہر لمحہ ہر لحظہ تازگی چھائی رہتی ہے۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

(غالب)

حواشی

(۱) پچھلے دنوں نیویارک میں ڈاکٹر غزالہ سے ملاقات ہوئی۔ بولیں میں آپ کے نام کو اس وقت سے جانتی ہوں' جب میں ریڈیو سے آپ کے ڈرامے سنا کرتی تھی۔

(۲) دو برس ہوئے جب میں نیویارک سے پاکستان گیا تو کینئرڈ کالج کی ڈرامیٹک کلب کی البم دیکھنے کی غرض سے پرنسپل سے ملا جو مسز فیلوس کی بہو تھی۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب نے پاس کوئی ایسی البم نہ تھی جس سے میں ڈراما "مہاتما بدھ" کی کاسٹ نقل کر سکتا۔ یہ ڈراما کینئرڈ کالج نے اوپن ایئر تھیٹر میں کھیلا تھا جس میں پروفیسر چیٹر جی کی بیٹی روما نے مہاتما بدھ کا رول ادا کیا تھا۔

(۳) اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ دردیدہ ام لطیفہ و در دل نشستۂ

(۴) یہ ڈراما آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے نشر ہوا۔ پھر حیدر آباد دکن کے نشریاتی اسٹیشن سے "مصور کا خواب" کے نام سے براڈکاسٹ ہوا۔

پھر قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی اور لاہور سے نشر ہوا۔ میں نے اس کو اوپن ایئر تھیٹر راولپنڈی کے سٹیج پر پیش کیا۔

پیٹر بکسل

کہانیاں جنہیں زندگی لکھتی ہے۔ ۵

میرے آخری خطبے کا ایک ذیلی عنوان ہے: "ادب کا مقصد" اور اس کا ایک موٹو ہے' جو اوسکر وا یلڈ Oskar Wilde کا تخلیق کردہ ہے جس کا متعدد بار ذکر کر چکا ہوں۔ یہ امر کہیں زیادہ بار پیش آتا ہے۔ کہ زندگی آرٹ کو نقل کرنے کی کوشش کرتی ہے' بجائے اس کے کہ آرٹ زندگی کو نقل کرے۔"

مگر عنوان کو میں نے آپ کے لئے نہیں رکھا' بلکہ خود اپنے لئے۔۔۔۔ آپ کو چکما دینے کے لئے نہیں' بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی خاطر' میں خود اپنے آپ کو اثباتیت کی طرف بہلا کر لے جانا چاہتا ہوں۔

اگر میرا مدعا تربیتی ہوتا' تو اب مجھے اپنا پہلا خطبہ دہرانا چاہئے' تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ آیا میری مثالیں اتنی جاندار تھیں کہ میرے پہلے خطبے کے دعووں پر پوری اتر سکیں۔ مگر میرا مقصود تربیتی نہیں' بلکہ بیانیہ۔ اس طرح میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا' کہ سارے کو پھر ایک بار بیان کروں' مگر دوسرے الفاظ میں۔

ادب دھرائے جانے کا نام ہے' اس بات پر میں یقین رکھتا ہوں۔ کہانیاں دنیا کی ساری لکھی جا چکی ہیں' بائیبل میں' فریسیوں کی کہانیوں میں' ہومر Homer کے ہاں' جو کوئی گوئٹے Goethe کو پڑھتا ہے اور آڈلبرٹ اشٹفٹر Adelbert Stifter اور فونٹانے Fontane کو' تو وہ دنیا کے بارے میں اس سے کچھ کم نہیں جانتا اگر وہ ہائنریش منHeinrich Mann' گونتھر گراس Gunter Grass اور مارٹن والزر Martin Walser کو پڑھتا ہے۔ کہانیاں جو اس کے باوجود نت نئی لکھی جاتی ہیں' انہیں اس وجہ سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمیں نئی کہانیاں چاہئیں۔ انہیں لکھا جانا چاہئے' تاکہ کہانیاں سنانے کی' کہانیاں لکھنے کی روایت ختم نہ ہو جائے۔ پرانی کہانیاں زندگی کو بسر کرنے کے لئے کافی ہیں' مگر کون ایک ایسی دنیا میں زندہ رہنا چاہتا ہے' جس میں نئی کہانیاں نہ تخلیق کی جاتی ہوں' ایک ایسی دنیا میں جینا' جس میں ادیبوں کی تخلیقات کو تو فروغ دیا جاتا ہو' مگر ان کی بقا کو نہیں' تو وہ ادب سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ ادب ایک ایسی چیز ہے' جو اپنے تخلیقی عمل کے ذریعہ زندہ رہتی ہے' نہ کہ اس کے نتیجے میں' اور اس بات کو معاشی اصولوں کے تحت سمجھنا مشکل ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ اس بات کو غیر قارئین کہیں بہتر سمجھتے ہیں قارئین کے مقابلے میں' کیونکہ ادب کا پایا جانا اور اس کی ضرورت غیر قارئین کے لئے بھی اہم ہے۔ خود میں نے بالکل اتفاقی طور پر دوستویوسکی DostoJewski کو کبھی نہیں پڑھا۔ اس کے باوجود وہ میرے لئے موجود ہے اور میں اس کو مس نہیں کرنا چاہتا ہوں۔

اور جب میں خود کہانیاں لکھتا ہوں' تو میں کسی کے ساتھ اپنا مقابلہ نہیں کرتا ہوں۔ یہ امر کہ کلمنز

بیگر Clemens Brentano نے بہتر کہانیاں لکھی ہیں' مجھے اس کام سے باز نہیں رکھ سکا خود یہ امر کہ شاید مجھ سے زیادہ چسندی لکھنے والے پائے جاتے ہیں' اس میں مجھے دلچسپی نہیں۔ میں بطور ادیب کے کسی کے ساتھ مقابلے میں نہیں اترتا ہوں' اور اگر میں کسی کی نقل کرتا ہوں' جیسا رابرٹ والزر Robert Walser کی تو اس وجہ سے میں نے اپنے لئے وہی میدان چنا ہے' ادب کا میدان جس میں سرگرداں ہوں۔ شاید دوسرے ادیب پائے جاتے ہیں' جن کی نقالی مجھے زیادہ پسند ہوتی' مگر میں بدقسمتی سے اس چیز کو چن نہیں سکتا ہوں۔ میں بطور مصنف کے آزاد ہوں۔ بطور قاری کے مجھے میری آزادی زیادہ اچھی لگتی ہے۔ میں قدرتی ٹیلنٹ نہیں رکھتا ہوں۔

میں نے کہانیاں سنانا' کہانیاں لکھنا' کہانیوں کو تخلیق کرنا بس سیکھ لیا ہے۔ جب میں اس دنیا میں وارد ہوا تو یہ چیز موجود تھی اور سیکھی جا سکتی تھی۔

میں نے اس چیز کی گوئٹے کے حوالے سے تشریح کرنے کی کوشش کی تھی' جب انسان ایسا کرتا ہے تو بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں' محض اس وجہ سے کیونکہ آدمی نہیں کہہ سکتا: "گوئٹے مثال کے طور پر" گوئٹے کا ادبی وجود اس قدر معتبر ہے' کہ آدمی اس کو اپنے مفاد کے لئے "مثال کے طور پر" استعمال نہیں کر سکتا۔ میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اختتام پر خود اپنی مثال کو پیش کروں۔

اب چھوٹا سا اشارہ۔ آپ بالکل غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے' اگر آپ ذیل کی کہانی کو آپ بیتی اور صرف آپ بیتی سمجھیں۔ مگر مجھ سے اس کے آپ بیتی ہونے کے بارے میں بات کرنے سے باز رہیں۔ میں ہر چیز کا انکار کروں گا اور اس کے فکشن ہونے والے اپنے حق پر اصرار کروں گا۔

اب وہ کہانی "بے وقت کی کہانیوں" والے مجموعے میں سے جس کا عنوان ہے: "اپنے کونیگ کے نام اس کی پچاسویں سالگرہ پر' بغیر طنز کے۔"

نولڈی ایک ادیب ہے

ایک ٹھگنا سا' موٹا سا بندہ سرخ چہرے والا' فیکٹری کا مزدور وقتی طور پر بے روزگار' وہ بیمار ہے' اسے جلدی ہسپتال میں داخل ہونا چاہئے ایک آپریشن کے سلسلے میں' اور وہ بے حد گھبراتا ہے' کیونکہ جلد ہی پچاس کا ہو جائیگا' اور اس کا کہنا ہے کہ وہ پچاسویں سال کو پورا کرنا چاہتا ہے' پچاسویں سال کو پورا کرنا اپنی پچاسویں سالگرہ کو منانا چاہتا ہے۔

نولڈی اس بات پر بے حد فخرمند ہے کہ وہ پچاس کا ہو جائے گا' وہ پچاس کو ایک خاص بزرگ ہندسہ سمجھتا ہے اور پچاسویں سال کو ایک بڑی عمر' دو سال قبل اس نے کہا تھا کہ وہ دو سال میں پچاس کا ہو جائے گا۔ مجھے اسے یہ بتانے میں باک ہے کہ انسان اس کی عمر کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ آدمی بالکل نہیں کہہ سکتا' اور اسے زیادہ معمر سمجھتا ہے۔ میں اس کے شانے پر ہاتھ مارتا ہوں اور کہتا ہوں۔ "نولڈی' بہت خوب" یا اس سے ملتا جلتا کچھ اور۔

اس کی پچاسویں سالگرہ اس طرح گزرے گی کہ وہ اپنی خم دار ٹانگوں پر شہر میں گھومے گا اور ہر کسی سے کہتا پھرے گا کہ اس روز اس کی سالگرہ ہے' کہ شراب خانے کا مالک اس کو ڈبل پیگ مفت دے گا اور یہ کہ وہ ایک مزید ادھے کی قیمت ادا کرنے پر اصرار کرے گا۔ پھر وہ روہانسا ہو جائے گا اور کہے گا کہ کون کہہ سکتا تھا کہ نولڈی پچاس کا ہو جائے گا۔

وہ بہت غیر واضح طور پر ناک میں بولتا ہے اور آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فقرے کو ایک بار بلند آواز میں سنے' تاکہ اس کو سمجھ سکے' جب وہ دھیرے سے کہتا ہے: میں مر جاؤں گا تو سب لوگ بے حد حیران ہوں گے۔ میں اس سے اختلاف کرتا ہوں: "وہ حیران نہیں ہوں گے۔ وہ کبھی حیران نہیں ہوتے۔" ہم کولیگ ہیں' ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور لوگ ہمیں نہیں سمجھتے۔ ہم مزید ایک بیئر پیتے ہیں۔

"کون سوچ سکتا تھا کہ میں فلم میں آؤں گا۔ نولڈی کہتا ہے۔ یہاں پر شہر میں ایک فلم بنائی گئی جس میں نولڈی ایکسٹرا تھا۔ مگر وہ یونہی کسی آدمی کا رول ادا نہیں کرتا' بلکہ ایک اخبار نویس کا اور اسے ہمیشہ کچھ نوٹ کرنا ہوتا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ اس کا کیا نام تھا' جس نے فلم بنائی تھی: رولف لیسی پھر زیورک میں وہ ایک بار فلم میں آیا تھا اکیلے سومر کے ساتھ' اس کا کہنا ہے اور وہاں پر وہ ایک راہ گیر تھا اور اسے قریب قریب ایک سو فرانک ملے تھے' وہاں پر اسے چلنا پڑا تھا' اور یہ بہت مشکل کام ہے' مگر اسے نہیں بتایا گیا تھا کہ فلم کا نام کیا تھا' اور اس نے اسے نہیں دیکھا مگر ایک روز جب کسی کو اس امر کی توقع نہ ہوگی' اسے بھی نہیں' تو انسان اسے' نولڈی کو' ٹیلی ویژن میں چلتے ہوئے دیکھے گا۔ اسے دراصل تھیٹر میں کام کرنے کی خواہش تھی۔ مگر ماں یہ نہیں چاہتی تھی۔ اسے بلکہ برن کے ایک آدمی کے نام کا پتہ ہے' جو ٹیوشن دیا کرتا تھا۔ مارک ڈوسوالڈ اور اسے یہ بھی پتہ ہے کہ آدمی کو وہاں پر کیا کرنا ہوتا تھا' بہت بہت صاف اور درست فصیح جرمن بولنا۔ جب میں اسے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ ایک بار اس کے ہاں گیا تھا' تو وہ ٹال جاتا ہے۔ کیونکہ نولڈی جھوٹ نہیں بولتا۔۔ اور وہ ایک دوسرا نام لیتا ہے: ایکہارٹ کو ہلنڈ۔

"مجھے پتہ ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔" اس نے کہا جب ہم پہلی دفعہ ایک بار میں ملے تھے "تم مشاہدہ کرتے ہو' میں بھی دراصل یہی کرتا ہوں' اور میں اکثر اسے ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں درج کر لیتا ہوں' آج وہ میرے پاس نہیں ہے' مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سب کچھ اپنے سر میں محفوظ کر لیا ہے۔"

"نہیں میں مشاہدہ نہیں کرتا ہوں" میں نے کہا: "میں اپنی بیئر پیتا ہوں" اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔۔۔ کولیگ کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا' اس عرصے میں رازدان' جو ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں' کہ وہ محض بیئر نہیں پیتے ہیں' جیسے دوسرے لوگ بلکہ وہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہ کچھ اس نے ایک استاد سے سیکھا تھا' وہ کہتا ہے۔ میں اس استاد کو جانتا تھا' خود ایک ادیب تھا مقامی لہجے کا مصنف اس نے معلوم ہوتا ہے اپنے شاگردوں کو ادیبوں کی عزت کرنا سکھایا تھا' ایک صد میں سے ایک نے لگتا تھا اس بات کو پلے باندھ لیا تھا' ٹھگنے موٹے نولڈی نے' جمناسٹک کا پھسڈی' حساب میں کمزور' ٹھگنے موٹے خم دار ٹانگوں والے نولڈی نے' آخری سے پہلی قطار والے نے' اس بات کو جان لیا تھا۔

ادیب غریب ہوتے ہیں۔۔۔ اس بات کو اس نے جان لیا تھا۔۔۔ غریب وہ بھی ہے۔ ادیبوں کی ناقدری ہوتی ہے۔ اس بات کو اس نے جان لیا ہے۔۔ اس کی بھی نا قدری ہوتی ہے۔ ادیب دوسری قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس بات کو بھی اس نے جان لیا ہے۔۔۔ وہ بھی دوسری زندگی بسر کرتا ہے۔

اس کے لئے' نولڈی کے لئے' کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا سوائے ادیب بننے کے اگر وہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ اب وہ بن گیا ہے۔

اور اس کی کہانیاں دوسرے ادیبوں کی کہانیوں سے تھوڑی یا بالکل مختلف نہیں ہوتیں۔ ایک کہانی

اس کی گم شدہ مسودے کے بارے میں ہے۔ وہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیانی فاصلے کے ذریعے دکھاتا ہے۔۔۔ چار سو صفحے میں اندازہ لگاتا ہوں' تکمیل شدہ مسودہ اور پھر تعطیلات گزارنے والے بچے آئے اور انھوں نے سارے کو رنگدار پنسلوں سے بھر دیا' وہ سناتا ہے۔ وہ ایک زمانے میں شادی شدہ تھا' مگر اس بارے میں وہ کچھ نہیں سناتا اور یہ بات ناقابل تصور ہے۔

اور پھر یہ کہانی: اپنے اپریشن کے بعد میں لکھوں گا' اپنی برتھ ڈے کے بعد میں لکھوں گا۔ اور پھر بار تعطیلات گزارنے والے بچوں کی کہانی' جنھوں نے سارے کو بھر دیا تھا۔ اور ایک ضدی اکڑ بازی ساتھ ساتھ: "لفظ بلفظ سب کچھ میرے سر میں ہے' کل پرسوں' اپنی برتھ ڈے کے بعد' اپنے اپریشن کے بعد میں اسے دوبارہ لکھوں گا"۔ میں اسے آج ہی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں" دوستی کی وجہ سے نہیں' بلکہ کمینگی سے' کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ اس کو رد کر دے گا اور وہ ایسا کرتا ہے۔

پھر مزید ایک بیئر کے بعد وہ کہتا ہے: "ہاں میں آج ہی شروع کروں گا" میں محسوس کررہا ہوں" اور میں کہتا ہوں: "ہم کیا شرط لگاتے ہیں' تم ایسا نہیں کرو گے۔" ہم کولیگ ہیں۔

اور اس کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ اس نے کبھی کچھ نہیں لکھا ہے

وہ ایسا کرے گا' وہ ایسا کرے گا' وہ ایسا کرے گا وہ کہتا ہے۔

اور کل اس نے مجھے عنوان بتایا ہے۔ نصف گھنٹہ پہلے وہ اس کو سوجھا تھا۔ "جیہرٹا گواچ گیا۔"

"ادیب ہونا آسان کام نہیں ہے" ہم نے نتیجہ نکالا ہے۔

نولڈی کہتا ہے: "مقامی لہجے میں لکھنا بہت مشکل ہے" ۔۔۔۔۔" میں اس میں نہیں لکھ سکتا ہوں" میں نے کہا اور شاید لوگ حیران ہوں گے۔

اور ایک چیز میں وہ مجھ سے آگے ہے' وہ میرے بارے میں نہیں لکھتا اور مجھے تمسخر اڑائے جانے کی پوزیشن میں نہیں ڈالتا۔

نولڈی ایک ادیب ہے۔۔۔۔ ادیبوں کی زندگی آسان نہیں۔ مگر اس بارے میں اس کو استاد نے بتایا تھا' اور نولڈی کی زندگی یوں بھی آسان نہیں ہے' اس لئے وہ کم از کم اپنی زندگی کا بامعنی طور پر آسان نہ ہونا چاہتا ہے۔ نولڈی ایک ادیب ہے۔"

یہ کہانی لفظ بلفظ سچ ہے۔ اس میں ذرہ بھر دروغ باقی نہیں ہے۔ تمام نقل قولی فقرے ہو بہو لکھ دیئے گئے ہیں۔۔۔ البتہ ہوبہو قابل اعتراض ہے' کیونکہ میں نے ان فقروں کا سوئٹزر لینڈ کی جرمن سے ترجمہ کیا ہے۔ آدمی شناخت ہو سکتا ہے۔ ظاہری طور پر بھی' میرے بیان کی روشنی میں۔ سولو تھورن Solothurn ایک چھوٹا شہر ہے۔ سولو تھورن کے سارے رہنے والے اسے پہچان سکتے ہیں۔ البتہ وہ خود اس میں اپنے آپ کو نہیں جان سکتا۔ اس بات پر میں خوش ہوں۔

اس کہانی میں کچھ بھی جھوٹ نہیں ہے' مگر وہ قریب قریب کسی پہلو سے سچ بھی نہیں ہے۔ نولڈی ایک قابل ترحم شخص ہے اور میں اس حقیقت میں اپنی دوستی کی پیشکش کرتا ہوں' کیونکہ یہ چیز اسے بھاتی ہے' مگر وہ قریب قریب ناقابل برداشت ہے' بے حد بور اور کسی قدر کمزور طبع۔ اس وجہ سے وہ وقت سے پہلے پنشن یافتہ ہے۔ میری کہانی میں کہا گیا ہے۔ "وقتی طور پر بے روزگار" میری کہانی میں وہ ایک کریکٹر بن جاتا ہے' جب کہ وہ ایسا نہیں ہے' وہ تو شہر کا اوریجنل بھی نہیں ہے۔ صرف ایک چیز اس میں ایسی ہے" تے

غیر معقولی کہہ سکتے ہیں' اس کو میں نے نوٹ کیا ہے اور اس پر میں خوش ہوا ہوں' وہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ادیب ہے اور کوشش کرتا ہے' اس طرح کی زندگی بسر کرنے کی' جس طرح وہ سمجھتا ہے کہ ادیب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اب اگر میں یہ دعویٰ کر دوں کہ اس کا ادیب ہونا' میرے ادیب ہونے سے کچھ ایسا زیادہ مختلف نہیں ہے' تو میں پھر رومانیت پسندی میں لگ جاؤں گا اور اپنے موضوع سے ہٹ جاؤں گا میرا خیال ہے کہ کہانی میں میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔

مگر کس وجہ سے یہ قطعاً" سچی کہانی سچ نہیں ہے؟ میں نے صرف ایک چیز کو بدل دیا ہے۔ وقت۔ میری کہانی ساڑھے سات منٹ لمبی ہے اور نولڈی کی عمر پچاس سال ہے۔ یہ اس سے' میں نے اس کا حساب کیا ہے' تین ملین اور ۵۰۴ ہزار بار زیادہ ہے۔

اب انسان کہہ سکتا ہے کہ اس کا الٹ بھی پایا جاتا ہے۔ جوئس Joyce --- اب میں دوسروں کو گھسیٹنے لگا ہوں ۔ ایک کئی سو صفحوں کے ناول میں صرف ایک دن کو بیان کرتا ہے۔ ناول دس گنا لمبا بھی ہوتا' تو وہ اصل وقت کو گھٹانے کا باعث بنتا۔

ایک اور پہلو سے۔ اس طرح کہ میں نولڈی کو وقت دیتا ہوں' ساڑھے سات منٹ' تو میں اس طرح اسے ایک کہانی دیتا ہوں اور عین یہی چیز---- اور صرف یہ چیز۔ اس کو ذاتی طور پر میری کہانی سے ممتاز کرتی ہے۔ خود اس کے ذہن میں کہانیوں کی قسم کی کہانی نہیں ہے۔ وہ ایک وقت سے عاری شکار ہے۔ جب میں اس کو وقت دیتا ہوں' تو وہ قابل ذکر بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس' اگر میں اس کو وقت نہیں دیتا ہوں' تو پھر وہ ناقابل بیان ہے۔ وقت کا مگر--- یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' متن کے ذریعہ تعین نہیں ہوتا' بلکہ کہانی سنانے سے۔ اس مثال میں اس کی لمبائی عین اس صفحے کے برابر ہے' جو مجھے زیور شرٹاگس انزائیگر Zuricher Tagesanzeiger کی طرف سے ایک کالم کے لئے دیا گیا تھا۔ اگر ان کی تعداد ۶۰۰ صفحے ہوتی' تب بھی اس مسئلے میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ ۶۰۰ صفحے بھی اس وقت ہوتا' جس کا تعین باہر سے کیا جاتا۔ میں نے اپنے آپ سے یہ سوال نہ کیا ہوتا کہ ۶۰۰ صفحوں پر کس قدر زندگی کو بیان کیا جا سکتا ہے' بلکہ میں نے یہ سوال کیا ہوتا کہ کیونکر کس طریق سے۔ میں اتنی طوالت تک بیان کر سکتا ہوں۔

نولڈی کی کہانی ایسی کہانی نہیں ہے' جسے زندگی نے تخلیق کیا ہے۔ نولڈی کی کہانی ایک ایسی کہانی ہے۔ جسے میں نے تخلیق کیا ہے' کیونکہ میں نے اسے وقت دیا ہے' جو حقیقت میں اس کے پاس نہیں ہے۔ جس چیز کے پاس وقت ہوتا ہے۔ مثلاً درخت' جو خزاں میں اپنے پتے کھو دیتا ہے' بہار میں اس پر پھول آتے ہیں' پھلدار بنتا ہے اور پھر اپنے پتوں کو کھو دیتا ہے۔ تو اسے ہم بامقصد سمجھتے ہیں اور اکثر نہ صرف بامقصد بلکہ مثالی۔ جس چیز کے پاس وقت ہوتا ہے' وہ فنا کے لئے مثال بن جاتی ہے۔ اور ہماری اس پر دلگیری کی' اور نولڈی اس طرح اور اس کے ذریعہ ایک جذباتی چیز بن جاتا ہے' جو وہ حقیقت میں نہیں ہے۔

کہانیاں' جنہیں زندگی نے تخلیق کیا ہے' ان کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ٹل اویلن شپیگل Till Eulenspiege کو گرفتار کیا جاتا ہے' کیونکہ اس پر قتل کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اسے حوالات میں رکھا جاتا ہے' پھر جیل میں' اور عدلیہ کو ٹل کے انکاری بیانات کے باوجود زیادہ سے زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ وہ قتل میں ملوث ہے۔ ٹل سے چند دوسری باتوں کا بھی ارتکاب ہوا ہے اور

وہ پانچ برس تک جیل میں رہتا ہے۔ واردات والے شہر برلن میں اس کے خلاف مقدمہ چلتا ہے۔ ٹِل کے کسی حد تک شریفانہ طرزِ عمل کے سبب اپنی توجہ مبذول کرواتا ہے، اس وجہ سے بھی کہ پہلی پیشیوں میں یہ اس کا طریق کار نہ تھا۔ وہ اپنے آخری بیان کے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ مگر دوسرے روز سرکاری وکیل کی اختتامی بحث سے پہلے بولنے کی اجازت مانگتا ہے اور بالآخر بیان دیتا ہے، پانچ برسوں کے بعد کہ اس کا عذرِ عدم موجودگی موجود ہے۔ وہ متذکرہ وقت پر برلن میں نہیں تھا۔ بلکہ لیسن میں تھا۔ اس کا عذرِ عدم موجودگی درست اور غیر متزلزل ہے۔ اس کو اس معاملے میں بری کر دیا جاتا ہے۔(۱)

اور بجٹل کہانی کی طوالت: پانچ برس۔ اس کا مطلب ہے، پانچ برسوں تک چھوٹنے سے لطیفے پر خوش ہوتا۔ یہاں تک ٹِل اویلن شپیگل۔

دوسری کہانی: ایک عمر قیدی اپنے دھات کے چمچے سے اپنی کوٹھڑی میں سے ایک سرنگ بنانی شروع کرتا ہے۔ ہر رات سِل کو سرکانا؛ ہر صبح سِل کا اپنی جگہ پر واپس جانا؛ کاغذ کے لفافوں میں مٹی کو روز کی گردش کے دوران باہر لے جانا وغیرہ۔ مہم کو دس برسوں میں انجام کو پہنچنا ہے، نو سالوں کے بعد اس کا راز کھل سکتا ہے یا بارہ برسوں میں وہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

پھر اور کہانیاں۔ ایک شخص ما ئیلینڈ کے چرچ کو کسی پیمانے کی پیمائش کے مطابق سریش سے جوڑی جانے والی ماچس کی تیلیوں سے اصل کے عین مطابق بناتا ہے۔

ایک خاندان سامان کی بہم رسانی کی مشکلات کے ہوتے ہوئے گرم ہوا کا غبارہ بناتا ہے۔ گھر بار کی آخری چادر کی پٹی تک اس میں لگ جاتی ہے، سامان پیدا کیا جاتا ہے، چرایا جاتا ہے، ڈھونڈ کر لایا جاتا ہے۔ زندگی گرم ہوا کے غبارے کی خاطر، جو اڑتا ہے، ملک کی سرحد پر سے پار ہو جاتا ہے۔(۲)

میرے بیٹے متھیاس نے بچپن میں کچھ عرصے تک اپنے بستر کے نیچے ایک کھلی ٹوکری میں ایک بڑے وحشتناک چوہے کو رکھے رکھا۔ اس کو اس امر کی اجازت دینے کی میرے پاس کوئی وجہ موجود نہ تھی۔

ایک شخص سالوں تک ہر روز ہر قسم کے موسم میں ایک پہاڑ پر جاتا ہے، چھٹی کے بعد، تین گھنٹوں کا مارچ، اور ہر بار ایک بڑے پتھر کو اٹھا کے لاتا ہے۔ سالوں کے بعد اس نے ایک بڑا اہرام تعمیر کیا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا اور اس کے متعلق پوچھے جانے کو پسند نہیں کرتا۔

اور ایک آخری بالکل مختصر کہانی: ایک شخص بحرِ اوقیانوس کو ایک سرفنگ بورڈ پر عبور کرتا ہے۔

ان کہانیوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہی انہیں کہانیاں بناتی ہے۔ ان کا وقت کے ساتھ ایک شعوری تعلق خاطر ہے۔ پانچ برسوں تک اپنے عذرِ عدم موجودگی کو چھپانا عدالت کے سامنے ایک مختصر سین کی خاطر۔ دس برسوں میں ایک سرنگ کا لگانا۔ اتنے بے شمار گھنٹوں کی محنت سے ما ئیلینڈ کے چرچ کی نقل بنانی۔ وقت کے گزرنے کا احساس شعوری طور پر ایک چوہے کے ساتھ مل کر رہنے سے کرنا۔ یہ بھی کہانیاں ہیں۔ یہ وقوع پذیر ہوئی ہیں مگر کیا سچ مچ یہ ایسی کہانیاں ہیں، جنہیں زندگی نے تخلیق کیا ہے؟ قسمت؟ اتفاق؟

آدمی جو سرفنگ بورڈ پر بحرِ اوقیانوس کو عبور کرتا ہے۔۔۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اسے اشتہاری شہرت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔۔۔ انسان اس بات کا تصور کر سکتا ہے۔ یہ شخص سمجھتا ہے کہ وہ ایک مہم جوئی کو سرانجام دیتا ہے۔ مگر جس چیز کو وہ شخص سرانجام دیتا ہے، وہ مہم جوئی نہیں ہے۔ اس مقصد کیلئے اس کا کارنامہ سخت بے وقوفانہ اور بے حد بورنگ ہے وہ۔ مہم جوئی نہیں کرتا بلکہ مہم جوئی کی کہانی بناتا ہے۔ اس

ں بات کا جاننا کہ کہانیاں پائی جاتی ہیں' بیان کئے جانے کے قابل' دراصل اس کے فعل کا محرک ہے۔
مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کہانیوں کے متن' مثلاً ممی جونی کی کہانیوں کے ذریعے اس کام پر آمادہ ہوا ہوگا۔
ی کی ظاہری فورم کہانی' کے سنائے جانے کا وجود اس کو تحریک کرتا ہے' اور اس کام کے لئے وہ کہانیاں کافی
ہ' جنہیں انسان نے ماں سے سنا ہوتا ہے۔ مگر میں یہ دعویٰ نہیں کرتا ہوں کہ اس بات کا اس شخص کو پتہ
ہے۔

دوسرا آدمی جو اپنے عذر عدم موجودگی کو پانچ برسوں تک چھپائے رکھتا ہے' اس بات کو جانتا ہے۔ وہ
ں جان بوجھ کر ایک کہانی ایک سچ مچ کی کہانی' کو تخلیق کررہا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ پانچ برس قربان
تا ہے۔ پانچ برس ایک لطیفے کی خاطر جو اسے بھاتا ہے۔ اور کہانی کچھ ایسی لمبی بھی نہیں ہوگی' بلکہ بہت مختصر
اختصار بھی ادب سے نقل شدہ ہے۔۔۔ ادب کے کسی خاص متن سے نہیں ہے بلکہ اس کے بنیادی
ل سے اور یہ کہانی' مختصر کہانی اور بہت سی دوسری کہانیاں' جنہیں وہ بسر کرتا اور تخلیق کرتا ہے' اسے
برس اطمینان کے ساتھ گزارنے دیتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات ژاں پول سارتر Jean -Paul Sartra نے ایک مضمون میں۔۔۔
۔ میں تلاش نہیں کر پایا ہوں۔۔ لکھی تھی کہ کمزور انسان تعذیب جسمانی اور کرب کو طاقت وروں سے
کر برداشت کر سکتے ہیں' کہ یہ کمزور ہی تھے' جنہوں نے کیمپوں اور جنگی قید کی جسمانی اذیتوں کو سہا۔ شاید
ں نہیں کہہ سکتا۔ اس وجہ سے کیونکہ طاقتوروں کے مقابلے میں کمزوروں کا کہانیوں کے ساتھ زیادہ قریبی
ں ہوتا ہے۔ میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں۔

ادب گویا زندگی کا مداوا؟ یہ شبہ درست ہو سکتا ہے کہ یہ کام وہ اپنے مواد کے ذریعے سرانجام دے
ہے' مگر حقیقت میں اس کا محض پایا جانا اس کا سبب ہے۔ اس طرح کہ کہانی سنانے کا وجود پایا جاتا ہے'
اس کا ہمارے سامنے مظاہرہ کیا جاتا ہے' یہ چیز ہمیں اپنی کہانیاں تخلیق کرنے دیتی ہے۔ اس وجہ سے ہم
وش ہیں اپنی کہانیاں سناتے ہیں' کہانیوں میں زندگی گزارتے ہیں۔

قیدی' جو اپنی سرنگ بناتا ہے' وہ اسے باہر نکلنے کے لئے کھودتا ہے۔ مگر میرا خیال نہیں ہے کہ وہ
برسوں تک لفافہ لفافہ اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ وہ صرف اپنے لئے آزادی کا
نہ کھودتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی کہانی کو کھود رہا ہے' وہ ایک کہانی کو تخلیق کرتا ہے۔ ایک انقلابی' جس کی منزل
کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جس کو وہ انقلاب کے ذریعہ اور اس کے بعد حاصل کرنا چاہتا ہے' وہ صرف
منزل کے لئے زندگی نہیں گزارتا' بلکہ وہ اس انقلاب میں جی رہا ہوتا ہے' اور وہ اس میں اس طرح جی
ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کہانی سناتا ہے۔ ہماری زندگی تب بامقصد بن سکتی ہے' جب ہم اپنے
۔ کو اس کی کہانی سنا سکتے ہوں۔

تیز رفتار اور دلچسپ مہماتی کہانی اس پہلو سے دوہری نقصان دہ ہے۔ وہ یہ اثر پیدا کرتی ہے کہ
ے غیر معمولی کہانی سنائی جا سکتی ہے۔ اور وہ قاری کو باور کرواتی ہے کہ اس کی اپنی زندگی غیر معمولی پہلو
نے کے بغیر بے سود ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کو مہماتی کہانیاں نہیں سنانی چاہئیں۔ جب
یف کونراڈ Joseph Conrad کہانیاں سناتا ہے' تو قاری جان جاتا ہے کہ مصنف کے لئے صرف مواد کا
ں کرنا اہمیت نہیں رکھتا' بلکہ کہانی کا سنانا اور کہانی سنانے کے طریق پر سوچ بچار بھی۔

اس کے برعکس بازاری ادب کے مصنف اپنے قارئین کو اس طرح دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ صرف مواد پیش کرتے ہیں۔ قاری ان سے صرف سننا سیکھتا ہے، کہانی نہیں سیکھتا، کیونکہ عام طور سے کہانی سنانے کے بارے میں سوچ بچار نہیں کیا جاتا۔ کسی سیدھے سے جاسوسی ناول کو پڑھنے کے بعد جو خالی پن کا احساس ہم میں پیدا ہوتا ہے وہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کہانی کا راز کھلنے کے بعد سب کچھ جاتا رہتا ہے، کچھ باقی نہیں بچتا۔ کہانی سنانے کے انداز کی کوئی بازگشت سنائی نہیں دیتی۔ کہانی سنانے کا انداز مثلاً جس میں کہ البرٹ شٹفٹر AdelberT Stifter کا قاری گھنٹوں اور ہفتوں بعد زندگی گزار سکتا ہے۔ بعض اوقات وہ کہانی سنانے کے اس انداز کو، کہانی سنانے کے اس ماحول کو خود اپنے آپ کو اپنی زندگی کی کہانی سنانے کے لئے استعمال میں لا سکتا ہے۔ جو کوئی تاریخ میں زندگی گزارتا ہے۔۔۔۔ علم کی تواریخ کے معنوں میں۔۔۔۔ نہ کہ کہانیوں میں، اس کی زندگی بے سود رہ جاتی ہے۔ کامیاب انقلابی کا دردِ سر۔ انقلاب کے دوران جو اسکی کہانیاں ہوا کرتی تھیں، وہ بعد میں تاریخ بن جاتی ہیں، ایسی تاریخ جس کا سب کو پابند کر دیا جاتا ہے، اسے بھی۔ شاید کامیاب انقلابی اس وجہ سے پچھاڑ کھا جاتے ہیں۔ شاید ٹروٹسکی Trotzki کو اس بات کا پتہ تھا۔

میرے لئے سوئٹزر لینڈ کا باسی ہونے کے سبب۔ کیونکہ میں اس بات سے واقف نہ تھا۔ ڈرامے کے مترادف ہے کہ کس طرح یہاں پر جرمنی میں بوڑھے مرد اپنی جنگ کی کہانیوں سے معاملہ کرتے ہیں۔ جب جنگ کا خاتمہ ہوا، تو یہ لوگ ابھی جوان تھے اور انہوں نے جنگ کے سالوں کو ضائع شدہ قرار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب انسان جوان ہوتا ہے، تو وہ آسانی کے ساتھ چھ سالوں کو پرے پھینک سکتا ہے۔ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، تو انہیں مس کرنے لگتا ہے۔ پھر کوئی تو کہانیاں سنانی شروع کر دیتا ہے، وہ ان سالوں کو کہانیاں سنا کر واپس لانا چاہتا ہے۔ دوسرا چپ سادھ لیتا ہے، یا کہانیاں سنانے لگتا ہے، جو اس کی نہیں ہوتیں۔ مجھے یقین ہے کہ سپاہی جو روس پر چڑھائی سے زندہ لوٹا تھا، اس نے اپنے آپ کو کہانیاں سنا کر زندہ رکھا تھا۔ [illegible] کی کہانیاں سالوں کے بعد سنائے جانے کے قابل نہیں رہیں، کیونکہ وہ صرف کہانیاں نہیں بلکہ ہولناک [illegible] بھی ہیں۔

تاریخ اور سیاست بسا اوقات لوگوں کو ان کی کہانیوں کے سلسلے میں دھوکہ دیتے ہیں۔ [illegible] ایک بڑے ملک کے صدر کو "کاؤ بوائے" Cowboy کہا جاتا ہے(۳) وہ دراصل اس کو عالمی طاقت بنا [illegible] کیونکہ یہاں پر یورپ میں "کاؤ بوائے" کا لفظ بولنے سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ کاؤ بوائے ایک ایسا شخص ہے جو کہانیوں میں زندگی گزارتا ہے۔ مگر کاؤ بوائے بطور صدر کے کہانیوں میں زندہ رہنا چاہتا ہے بلکہ [illegible] میں۔۔۔ اور یہ چیز انسانوں کو ناقابلِ اعتبار بنا دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض اوقات سیاسی [illegible] میں ہمیں انسان نظر نہیں آتے۔ تاریخ کہانیوں کی دشمن ہے اور [illegible] کہانیوں میں انسانوں کو [illegible]

[illegible] تاریخی تعریف [illegible]
[illegible] مصالح کے مطابق [illegible]
[illegible]
Teufel [illegible]

خود کو زندہ رکھا(۴) اس کی اجازت تھی' کیونکہ وہ کسی قانون شکنی کا ارتکاب نہ کرتی تھی۔ شاید اس قسم کے قانون صرف اس وجہ سے نہیں بنائے جاتے' کیونکہ ایسی کہانیاں منفرد ہوتی ہیں۔ اگر وہ کثرت سے پیش آنے لگیں' تو مجھے یقین ہے کہ انہیں غیر قانونی قرار دے دیا جائے گا' کیونکہ وہ عدلیہ کے رستے میں' اور ریاست کے رستے میں' اور تاریخ کے رستے میں رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہیں۔

گونتھر آئیش Gunter Eich نے ایک بار کہا تھا: شاعر کو دنیا کی مشینری میں ریت ہونا چاہیے نہ کہ تیل۔ اس نے یہ بات ایک ایسے وقت میں کہی تھی' جب شاید ہی کسی شخص کو تکنیکی ترقی کے بارے میں شبہ تھا۔ اور اس کا مدعا نیچر کی حفاظت شاید ہی رہا ہوگا۔ مگر جب دنیا کی مشینری اتنی تیزی سے چلتی ہے تو کہانیوں کے لئے وقت نہیں بچتا۔ تب انسان اپنے آپ کو زندگی کی کہانی نہیں سنا سکتا۔ یہ امر۔۔۔ اگر ایک سلوگن کو استعمال کیا جائے۔ تو زندگی کوالٹی کے زیاں کے مترادف ہے۔ یہ نہیں کہ زندگی کی کہانی سنائے جانے کے قابل نہیں رہی' بلکہ ہمارے پاس اس کو سنانے کے لئے وقت اور اس کی تکنیک نہیں ہے۔

کہانی سنانے کی تکنیک کی ایجاد اور اس کی پیش کش' دراصل یہ امر ادب کا مقصود ہے۔ کہانیوں کے لئے ادبی کہانیاں ہونا ضروری نہیں ہے۔ کہانیاں بغیر الفاظ کے بھی پائی جاتی ہیں۔ یہاں پر ایک مثال' اور اس کہانی کے گواہ میرے سامعین میں بھی موجود ہیں۔

جب دو ہفتے قبل میں اپنے لیکچر اور سیمینار کے بعد کچھ طالبات اور طالب علموں کے ساتھ پب میں بیٹھا ہوا تھا تو ایک شخص ہماری طرف آیا' جنہیں نیویارک میں مسٹر Rums کہتے ہیں' ہمارے ہاں آوارہ گرد۔ جو مجھے لگتا ہے غلط تصورات پیدا کرتا ہے۔۔ سیدھا سادا ایک شرابی' جو اپنی شراب کے لئے پیسے مانگ تانگ کے اکٹھے کرتے ہیں' اور اس کام کے دوران دوستانہ اور صاف ستھرا ہونے کا تاثر دیتے ہیں' مگر خود جانتے ہیں کہ الکحل ان کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔

اس شخص نے ایک بڑی سی موٹی سی کتاب ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی' کونوں کے اوپر وترا" کسی چاکولیٹ کے ڈبے کی طرح ارغوانی ربن سے بندھی ہوئی۔ اس میں "مجھے بھلا نہ دینا" نامی پھولوں کا گلدستہ لگا ہوا تھا۔ اس نے کتاب کو اس انداز میں اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ دکھایا' جس طرح بیرے شمپین پیش کرتے ہیں' اور کچھ کہا' جیسے پھولوں کو پانی چاہئے' ایک نادر موقع کا ذکر کیا اور قیمت دس مارک مانگی۔

وہ کتاب ردی میں سے تھی: "جانور مخاطب ہوتے ہیں: لا پزگ کے چڑیا خانے کی کہانیاں" مگر یہ بات اہم نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آدمی خود بھی اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ اس نے فورا" مجھ کو تاڑ لیا تھا۔ انسان دیکھ سکتا تھا کہ اسے فورا" پتہ چل گیا تھا کہ میں اس کتاب کو خرید لوں گا اور میں نے اسے خرید لیا۔

اس حراف کو کیسے خبر تھی کہ انسان پائے جاتے ہیں' جو اس قسم کی غیر ضروری اور قطعا" بے قیمت چیزوں کو خریدتے ہیں؟ وہ ان لوگوں کو کیسے پہچانتا ہے؟ اس نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ اسے کیسے پتہ ہے کہ میں ایک شخص ہوں' جو ہر کہانی کو خرید لیتا ہے اور یہ کہ مجھے ایک کہانی کے لئے کسی بھی قیمت کی ادائیگی پر پچھتاوا نہیں ہوتا؟

میرا مطلب یہاں پر کتابیں نہیں ہے۔ میں کہانیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ کیونکہ جس چیز کو اس شخص نے شخص اور کتاب اور پھولوں سے پیدا کیا ہے' وہ ظاہری طور پر اور اسلوبا" ایک کہانی ہے۔ وہ جذباتی

ہے۔۔۔ اس وجہ سے ہم ایک کہانی کا ہونا تصور کرتے ہیں' ایک ایسی کہانی یا ایک خوبصورت لطیفہ گر بعد
پر صرف ایک حیلہ Trick پایا جاتا ہے' ایک لطیفے کا حیلہ' جس نے اتفاقیہ طور پر یا علم کے ذریعہ جان لیا ہے
کہ انسان لوگوں کو ایک کہانی محض ظاہری فورم کے ذریعہ بھی متاثر کر سکتا ہے۔ اس کی تخلیق کردہ چھوٹی ایک
کہانی کی ظاہری فورم کی تصویری شکل ہے۔

صریحی طور پر ضروری ہے' تاکہ میں کہانی کی ظاہری فورم کو پہچان سکوں۔ جب میں کہتا ہوں کہ حتمی
فورم کی حال ہے نہ کہ فورم متن کی' تو میں متن کی اہمیت کی بھی وکالت کر رہا ہوں۔ ظاہری طور پر شرارتی کی
ایجاد کردہ کہانی کی ظاہری فورم کو بھی میں تب جان سکتا ہوں' جب مجھے ایسے متون سے واقفیت حاصل ہو'
ٹکڑوں کہانیوں کے ذریعہ' جنہیں ادب نے اور زندگی نے جنم دیا۔ اور یہ کہانیاں جذباتی ہوتی ہیں۔ اور ان
کہانیوں کی ظاہری فورم۔۔۔۔ ظروف۔۔۔۔ نے آہستہ آہستہ جذباتی پن کی خوشبو کو اپنا لیا ہے۔ صرف اس
وجہ سے میں ظاہری فورم کے ذریعہ متون کی طرف اشارہ کر سکتا ہوں اور جب میں اپنی کہانیوں کو روز مرہ کی
زندگی میں تلاش کرتا ہوں لوگوں' پر اور گرد و پیش پر نظر دوڑاتا ہوں' تو میں دراصل کہانیاں نہیں ڈھونڈ رہا
ہوتا' بلکہ کہانیوں کے لئے سگنل۔ میں چہروں کو ڈھونڈتا ہوں اور جسمانی اداؤں اور حرکات کو جو کہانیوں کی خبر
دیتی ہیں۔

گراگر کو صریحاً" کہانی سنائے جانے کا اور ادب کا پتہ ہے۔ وہ لوگ' جو شام کے وقت ریستورانوں
میں پھول بیچتے ہیں' وہ محض خوبصورت پھول نہیں بیچ رہے ہوتے۔ کوئی شخص انہیں نہیں خریدے گا' کیونکہ
وہ کہے گا: آں ہاں' مجھے پھولوں کی ضرورت ہے اور اس طرح مجھے پھولوں کی دوکان تک نہیں جانا پڑے
گا۔" ریستورانوں میں پھول بیچنے والے بھی کہانیوں کی ظاہری فورم کو بیچنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ یا زیادہ
بہتر۔۔۔۔ کہانیوں کی ظاہری فورم کو پیدا کرنے کے ظروف۔ نوجوان جو ہر حالت میں ہونڈا Honda خریدنا
چاہتا ہے' وہ اس موٹر سائیکل کو ٹرانسپورٹ کے طور پر نہیں خریدتا' بلکہ کہانیوں کی تخلیق کے آلے کے طور
پر۔ کیا وہ آلہ اس کام کے لئے موزوں ہے یا نا موزوں" یہ ایک علیحدہ اور ایک ایسی کہانی ہے۔ لوگوں کے
چہروں پر صرف وہی کہانیاں تحریر نہیں ہوتیں جن میں سے وہ خود گزرے ہوتے ہیں' بلکہ اس سے کہیں زیادہ
اور زیادہ واضح وہ کہانیاں' جنہیں وہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔

تو کیا چیز پہلے تھی' مرغی یا انڈا؟ شے یا اصول؟ کہانیاں سنانا یا ادب؟

یہ سوال صرف اس صورت میں فضول ہے' اگر انسان اس کا شروع میں جواب دینا چاہے۔ ہمیں پتہ
ہے کہ ہم مرغی اور انڈے کے مسئلے کو حل نہیں کر سکیں گے۔ صرف اس قدر یقینی ہے کہ سب کچھ جس کو
ہم کہانی سنانے اور کہانی کے طور پر پہچانتے ہیں' ایک کہانی سنانے کی روایت کی پیداوار ہے۔ ہم کہانیوں کو
ان کے متون کے ذریعہ نہیں جانتے' بلکہ ان کی ادبی روایت کے واسطے سے۔ کہانیاں صرف اس وجہ سے
کہانیاں ہیں' کیونکہ وہ ہمیں کہانیوں کی یاد دلاتی ہیں۔ وہ چیزیں' جو ہمیں کہانیوں کی یاد نہیں دلاتیں' انہیں ہم
وقوعہ کے طور پر جانتے ہیں۔ جبکہ ادب کا یہ فرض منصبی ہے زیادہ سے زیادہ واقعات کو ادب میں جگہ دینا
بڑھتی ہوئی تعداد میں واقعات کو بطور کہانیوں کے قابل پہچان بنانا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بیسویں صدی
میں۔۔۔ نہ صرف قارئین بلکہ غیر قارئین بھی۔۔۔ کہیں زیادہ واقعات کو کہانیوں کے طور پر پہچانتے ہیں
بمقابلہ مثلاً گوئٹے کے ہمعصروں کے۔

مجھے لگتا ہے کہ ادب کے اہم ترین فرائض میں سے ہے' اس چیز کا پیدا کرنا کہ ہم نہ صرف تاریخ کو بلکہ کہانیوں کو بھی پہچان سکیں۔ اس کا تعلق محض حقیقت کو پہچاننے سے نہیں ہے' بلکہ حقیقت کو ایک انسانی روایت' کہانی سنانے کی روایت میں ڈھالنے سے ہے۔ ۱۹۶۸ء کی تحریک کا سوال ادب کی افادیت کے بارے میں اس وجہ سے غلط تھا کہ اس کا تعلق محض متون کے ساتھ تھا' نہ کہ بجائے خود کہانی سنانے کے بارے میں۔(۵) میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا بحث مباحثے سے کوئی اور نتیجہ نکلتا اگر سوال کہانی سنانے کے بارے میں اٹھایا جاتا۔ "تاریخی آگاہی" کے اولیٰ اصول کو "کہانی سنانے والی آگاہی" کے ذریعہ متزلزل کیا جا سکتا ہے۔ ادب کا یہ فرض منصبی اور مدعا ہے کہانی سنانے کی روایت کو زندہ رکھنا' کیونکہ ہم اپنی زندگی کو صرف کہانی سنانے کے ذریعہ گزار سکتے ہیں۔ یہ سوال کہ آیا یہ امر فطری ہے یا ہم نے سینکڑوں سالوں کے دوران اسے اپنایا ہے' غیر اہم ہے۔

اس کے باوجود میں اپنے ادعا پر قائم رہتا ہوں کہ ادب ایک ثانوی چیز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا' تو مجھے خطرہ ہے کہ سیاستدان تاریخ کے ساتھ اپنے مہلک تعلق خاطر کو کہانیوں پر بھی پھیلا دیتے ہیں اور ہم سے اس کو آخری چیز کو بھی چھین لیتے کیا وہ امر جو مغربی رن وے کے سلسلے میں ہو رہا ہے۔(۶) تاریخ اور کہانیوں کے درمیان' تاریخی آگاہی اور کہانیاں سنانے والی آگاہی کے مابین ایک جنگ نہیں ہے؟ کیا رن وے کے مخالفین کی دہشت کی اس خطرے کے سبب نہیں ہے کہ تاریخ ان سے کہانیاں چرا لے گی' جن کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے؟

مجھے پتہ نہیں ہے کہ ایک پرامن معاشرہ جارحیت کے بغیر' مسابقت سے عاری کس رنگ ڈھنگ کا ہو گا اور انسان اسے کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ایک چیز کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ کہانیاں سنانے والا معاشرہ ہوگا نہ کہ تاریخی روایاتی۔ پرامن' جارحیت سے عاری اور کہانیاں سنانے پر خوش ہونے والے بالی کے باشندوں نے مجھے میرے اس ایقان میں محکم کر دیا ہے۔ ہر زندگی کی ایک کہانی پائی جاتی ہے' بشرطیکہ انسان اسے سنانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اس بات کو غالباً" ہومر Homer کے قاری نہیں جانتے تھے' مگر یقیناً نابوکوف Nabokov کا قاری' فریش Frisch کا قاری' بیکٹ Becket کا قاری جانتا ہے۔ یہ چیز اہم ہے کہ کہانیاں لکھی جاتی رہیں' کیونکہ لکھے جانے کے ذریعہ مزید زندگیاں سنائے جانے کے قابل بنیں گی۔

زندگی کے مقصود کی مذہبی تفاہیم پائی جاتی ہے اور فلسفیانہ ادب اس کی حتمی تفہیم ہے۔ کیونکہ میں کہانی سنا سکتا ہوں' اس وجہ سے میں ہوں اور چونکہ میں کہانی سنانے کی استطاعت رکھتا ہوں' اس وجہ سے میں زندگی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر کہانیاں ہماری زندگی کو بچا نہیں سکیں گی۔ وہ اسے صرف قابل برداشت بناتی ہیں۔ یہ سوال مثال کے طور پر کہ خودکشی کرنے والوں میں قارئین کا تناسب اونچا ہے یا غیر قارئین کا۔۔۔ جسے میں نے اپنے پہلے خطبے میں اٹھا دیا تھا۔۔۔ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اور زندگی کی فنا قائم رہتی ہے اور اس پر دلگیری بھی۔

اس طرح میرا دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ میں نے دلگیری پر بات کو شروع کیا تھا' عین وہاں پر' جہاں کہانیاں ہماری مدد نہیں کر سکتیں' عین اس جگہ پر ان کا مبدا پایا جاتا ہے۔ کہانیاں سنانا غیر معاشی امر ہے۔ اس لئے بیکار شے۔ اور ہزاروں انسان پائے جاتے ہیں جو خود اپنی کہانیوں کے سبب' جنہیں وہ خود اپنے آپ کو نہ سنا سکے۔ جل مرے: جینس جوپلین Janis Joplin' جمی ہندرکس Jimmy Hendrix' لیسٹرینگ

لیسٹر ینگ Lester young' چارلی پارکر Charlie Parker' بلی ہولیڈے Billie Holliday' نکولس دے سٹائیل Nicolas de Stael' ڈلن تھوماس Dylan Thomas' برینڈن بیہان Brendan Behan' ہائنرخ وان کلائیسٹ Heinrich von Kleist اور سینکڑوں دوسرے نامور اور بے نام لوگ۔ جو کوئی کہانی سنانے کو اپناتا ہے' وہ اس وجہ سے ایسا نہیں کرتا' تاکہ اپنی زندگی کو بچا سکے' وہ ایسا کرتا ہے' تاکہ اپنی زندگی کو بسر کر سکے۔

نہ صرف قارئین ایسا کرتے ہیں' بلکہ غیر قارئین بھی۔ نہ صرف قارئین کا انحصار اس بات پر ہے کہ کہانی سنانے کی روایت پائی جاتی ہے۔ بنام ادب۔۔۔ بلکہ غیر قارئین کا بھی اس لحاظ سے یہ امر اہم ہوتا ہے' کہ مدرسہ میں تاریخ ادب کے دوران ناموں اور ادب کے چلتے کلموں کا ذکر ہو' کہانی سنانے کی روایت کی موجودگی' کہانیوں پر متنبہ کیا جائے۔ بالآخر تاریخ ادبیات کے بارے میں مصالحانہ بات۔

"Thats it" جینس جوپلین نے اپنے خوبصورت گانے سرسیڈیز بینز کے ریکارڈ کئے جانے کے بعد کہا۔۔۔ اور پھر وہ ہنس دی۔

خواتین و حضرات' دوستو میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں شروع میں آپ سے بے حد بدکتا تھا' مگر آپ نے بے حد مہربانی دکھائی' اور میں نے آپ سے پیار کرنا سیکھ لیا' کیونکہ میں نے دیکھا کہ انسان آپ کو کہانی سنا سکتا ہے آپ نے ایک ایسا کام کیا ہے جو ہم سب کو بہت زیادہ کرنا چاہیے۔ آپ نے مجھے میری کہانیوں کی اجازت دی۔ دنیا کہیں بہتر ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اپنے دوست کو اور اپنی سہیلی کو' جب ہم اپنی بیوی کو اور اپنے مرد کو اور اپنے بچوں کو ان کی کہانیوں کی اجازت دیں اور اپنے پیارے ہمسایوں کو بھی۔

O

حواشی

(۱) ٹل اویلن شپیگل نامی شخص نے قرون وسطیٰ میں شہرت حاصل کی۔ اس کے نام سے بہت سی نوک کہانیاں ہیں' جن کا دیہاتی ہیرو اپنے سیدھے سادے انداز میں' مگر درحقیقت اپنی ذہانت کے بل پر شہریوں' عدالتوں' سرکاری کارندوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

(۲) یہاں پر ایک سچے واقعہ کی طرف اشارہ ہے' جس میں مشرقی جرمنی کی ایک فیملی گرم ہوا کے غبارے میں سرحد کو عبور کرکے مغربی جرمنی میں پہنچی تھی۔

(۳) مراد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر رونالڈ ریگن ہے' جو پہلے وقتوں میں فلموں میں "کاؤ بوائے" کا کردار کرچکا تھا۔

(۴) فرٹز تویفل نے طالبعلمی کے زمانے میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ اس نے عدالت کے سامنے ایک ایسا فقرہ کہا جو عدلیہ کی تاریخ کا جزو بن چکا ہے۔ جب عدالت میں اس کو کھڑا ہوکر بیان دینے پر مجبور کیا گیا' تو اس نے پر سے اٹھتے ہوئے کہا تھا: "اگر اس عمل کے ذریعہ عدالت کو معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے' تو میں اس کے لئے تیار تھا" اس نے اپنے طرز عمل سے ٹل اویلن شپیگل کی یاد تازہ کردی تھی۔

(۵) ۱۹۶۸ء کی تحریک' جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں چلی تھی' جس کے دوران معاشرے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مثلاً ادب کی افادیت کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ ادیبوں نے ادب کو معاشرے کے مفادات کے خلاف استعمال کیا تھا۔ اس وجہ سے ادب عوام کی غلامی کا ذریعہ بن گیا تھا۔

(۶) فرانکفورٹ انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر جب "مغربی رن وے" کے اضافے کا منصوبہ بنایا گیا' تو بائیں بازو کے طالب علموں نے متاثر ہونے والی مقامی آبادی کے ساتھ مل کر اس رن وے کی تعمیر کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے تھے جو ان دنوں میں جاری تھے۔ جب پیٹر بخسل جنوری/ فروری ۱۹۸۲ء میں اپنے خطبات فرانکفورٹ یونیورسٹی میں دے رہا تھا۔

(جرمن سے ترجمہ: منیرالدین احمد)

محشر بدایونی
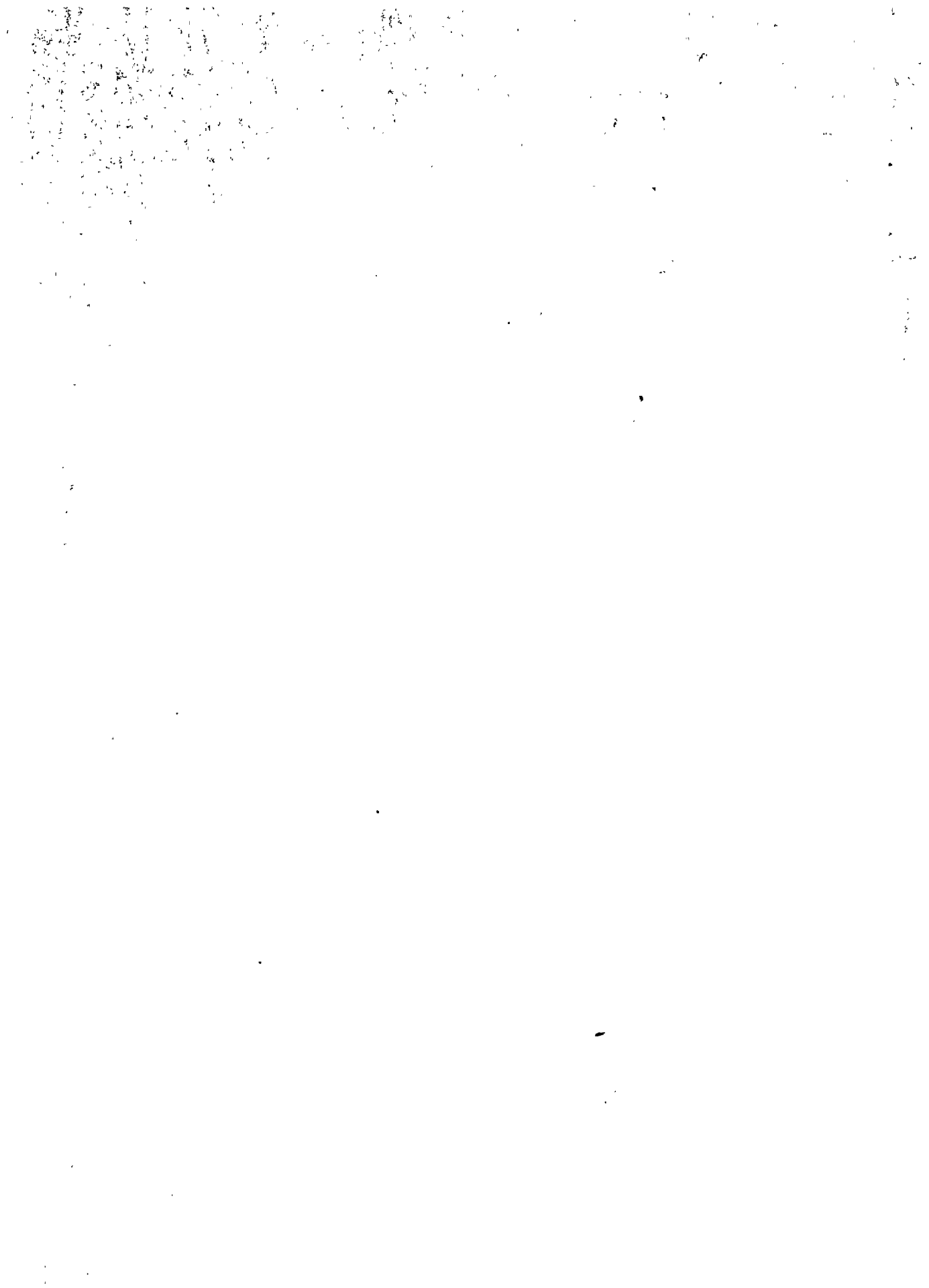
یہ منظر بام و در کے رہ گئے ہیں	دھوئیں آنکھوں میں بھر کے رہ گئے ہیں
گئے ہیں گھر سے جب اندوہ شب کے	تو اندیشے سحر کے رہ گئے ہیں
سفر کے معرکے تو کیا کہ بس اب	تماشے ہی سفر کے رہ گئے ہیں
کہاں آثار حال آئینے تمثال	فریب اپنی نظر کے رہ گئے ہیں
تجلی ہونا، گماں کے داغ دھونا	یہ کام اب چشمِ تر کے رہ گئے ہیں
وہ رقصِ ہمرہاں تو اب کہاں ہے	بگولے رہگذر کے رہ گئے ہیں
انہیں بھی دھوپ اڑا لے جائے گی کیا	جو رنگ اندر شجر کے رہ گئے ہیں
چلے تھے ہم سبکدوش اور اب تو	اُٹھاتا بوجھ گھر کے رہ گئے ہیں
اب آنکھیں دکھ گئی ہیں راہ تکتے	کہاں ساتھی ٹھہر کے رہ گئے ہیں
وہ صدمہ دشمنوں کو بھی نہ پہنچے	جو ہم محسوس کر کے رہ گئے ہیں
کوئی شکلِ نمو ظاہر ہو، یہ کیا	کہ شاخ و برگ مر کے رہ گئے ہیں
انہیں کو قسمتِ دامن سمجھ لیں	جو تارے سے بکھر کے رہ گئے ہیں

یہ شہرِ سرو و گُل کو اب ہوا کیا
کہ قصے تیغ و سر کے رہ گئے ہیں

شوکت واسطی

جنونِ بے سرو ساماں بڑے شکیب میں ہے
کہ تار اب کوئی دامن میں ہے، نہ جیب میں ہے

معاشرہ ہے یہ قائم بہ وصف نادانی
ہر ایک شخص کسی شخص کے فریب میں ہے

بلندیوں پہ چڑھایا ہے تیزرو پانی
رہا نہ دھیان کہ بستی بھی اک نشیب میں ہے

خراب جب سے ہوئی باغبان کی نیت
شمیم و ذائقہ کم کم گلاب و سیب میں ہے

جمالِ ذات رہینِ تکلّفات نہیں
ہے کم نما جو یہ پوشاکِ دیدہ زیب میں ہے

جو درک سینہ بہ سینہ ملا ہے مستوں کو
نہیں رقم وہ کسی کتبہ و کتیب میں ہے

ہے جانگداز محبت کا عارضہ شوکت
کہ مبتلا کوئی اک شوقِ دلفریب میں ہے

اختر ہوشیارپوری

جتنے بھی مجسمے ملے ہیں
اندر سے تمام کھوکھلے ہیں
تصویر ہی اجنبی نہیں ہے
رنگوں کے طلسم بھی نئے ہیں
بچوں کا جلوس آ رہا ہے
سوئے ہوئے رستے جاگ اٹھے ہیں
جب بھی ترا در کھلا ملا ہے
لوگوں کے ہجوم لگ گئے ہیں
دیوار پہ رنگ کیا ہوا ہے
گلدان سے پھول گر پڑے ہیں
جو پیڑ ابھی اُگے نہیں ہیں
ہم ان کو ابھی سے کاٹتے ہیں
مجھ کو بھی سنو کہ سچ ہو شاید
کچھ میں نے بھی تجربے کئے ہیں
پھر آنکھ مری چھلک اُٹھی ہے
پھر راہ میں موڑ آ گئے ہیں
زخموں میں مہک کہاں سے آئی
موسم تو گلوں کے پہلے سے ہیں
تم بھی کبھی اپنا عکس دیکھو
چہرے کی خراشیں آئینے ہیں

جو قافلے آگے جا چکے تھے
کہتے ہیں، پلٹ کے آ رہے ہیں
یہ کس نے کہا سکون رُت ہے
آنکھوں میں تو اب بھی رتجگے ہیں
ہم گزریں تو اب کدھر سے گزریں
راہوں میں مکان بن گئے ہیں
ہم نکلے نہیں سفر پہ تنہا
بادل بھی رکاب میں کھڑے ہیں
اخترؔ چلو گھر کو اب چلیں ہم
بستی میں چراغ جَل چُکے ہیں

محب عارفی

آکر زباں پہ جو سخن ہو کے رہ گیا
اک شعلہ تھا جو اپنا کفن ہو کے رہ گیا

منزل کی فکر کیا مرے سیلِ بہار کو
ٹھہرا جہاں وہیں پہ چمن ہو کے رہ گیا

ویرانہ کھل اٹھا مری وحشت کے فیض سے
کانٹوں سمیت میرا وطن ہو کے رہ گیا

دل کیا لگا کہ ہوش مرے ہو گئے درست
بے فکریوں کا نشّہ ہرن ہو کے رہ گیا

حدِ نظر کے پار پہنچنے کے شوق میں
پائے نگاہ اپنی تھکن ہو کے رہ گیا

سمجھا معاملات کو دنیا کے بس وہی
اپنے خیال میں جو مگن ہو کے رہ گیا

جرّاحیوں سے عقل کی آخر مرا وجود
پیشانیٔ عدم پہ شکن ہو کے رہ گیا

اک عمر سے زمانہ تعاقب میں تھا سو میں
آیا نظر کی زد میں بدن ہو کے رہ گیا

آتے ہی یہ خیال کہ میں کیا ہوں کیا نہیں
میں وہ کبھی نہ تھا جو "معا" ہو کے رہ گیا

رنگینیاں وہ سطح کے روغن کی ہیں محبؔ
غرقاب جن میں آج کا فن ہو کے رہ گیا

جعفر شیرازی

تذکرہ اتنا مرا اس کے فسانے میں ہوا
میں جنوں کے نام پر رسوا زمانے میں ہوا

مجھ کو دنیا نے مٹانے میں نہ کچھ تاخیر کی
کس قیامت کا تساہل تیرے آنے میں ہوا

جابجا ہیں زندگی کی کرچیاں بکھری ہوئیں
اک ذرا سا واقعہ آئینہ خانے میں ہوا

اب بھی اس کو یاد آتا ہے تو مر جاتا ہے وہ
اس کا جو لمحہ بسر میرے مٹانے میں ہوا

ساری دنیا کے لیے میرا حوالہ بن گئے
فائدہ کیا آپ کو میرے بھلانے میں ہوا

فاختہ کی چونچ میں زیتون کی شاخیں رہیں
تجربہ کوئی نہ مجھ کو زخم کھانے میں ہوا

زندگی بھر اس سے مل بیٹھے نہ جعفر بات کی
اور قصہ ختم یونہی آنے جانے میں ہوا

صادق نسیم

کریں گے اپنے لہو سے گلشن کی آبیاری، سفر ہے جاری
بُریدہ بازو علم اٹھائیں گے باری باری، سفر ہے جاری

یہاں تو ہمراہ شہسواروں کے پابُریدہ بھی چل رہے ہیں
رہِ وفا پر نہیں کسی کی اجارہ داری، سفر ہے جاری

سفر کہیں رقصِ موجِ دریا کہیں خرامِ مہ و ستارا
سفر میں ہے کائنات ساری سفر ہے جاری، سفر ہے جاری

بھنور کی صورت ہے گردشوں سے وجود اپنا نمود اپنی
طوافِ کعبہ ہی ابتدا انتہا ہماری، سفر ہے جاری

خدا خدا ہے سدا ہی مُعجزنُما رہا ہے سدا رہے گا
عدو کریں لاکھ فتنہ کاری، بفضلِ باری، سفر ہے جاری

مرے تب و تابِ شب کی محرم جو ہے تو کچھ شمعِ رہگذر ہے
بدن سے شعلے لپیٹ کر زندگی گذاری، سفر ہے جاری

میں بن بکے مصرِ زر پرستاں سے چاہ کی سمت جا رہا ہوں
مرا تو دامن بچا گئی میری کم عیاری، سفر ہے جاری

ہم اپنی راہوں کی بجھتی شمعوں کو ماہ و خورشید کہہ رہے ہیں
کہ جیسے آنکھیں ہی ہو گئیں دیکھنے سے عاری، سفر ہے جاری

اب اپنے اعدا سے کچھ زیادہ ہی اپنے یاروں سے ڈر لگے ہے
نسیم دیکھیں کدھر سے ہوتی ہے سنگ باری، سفر ہے جاری

حبیب فخری

کیسے رفاقت کے تھے پیاسے کل میں' رات' ہوا
رات سے میں روتا تھا لپٹ کر میرے ساتھ ہوا

وہ تو خیر سے اس کی تھکن کو بانٹ لیا میں نے
ورنہ ترخ کے ٹکڑے ہو گئی ہوتی رات ہوا

دن تو ایک ڈھنڈورچی ہے کیا کرتی چپکی رہی
بن گئی اک کہرامِ مجسم آتے ہی رات ہوا

نکہت و رنگ سے عاری' رگ رگ پالے کی ماری
میری ہی کشتِ زیست کی شاید ہے سوغات ہوا

جی مت کھوؤ ہوا کے پیچھے مجھ کو تلاش کرو
میں فریاد ہوا کی' میرے دل کی بات ہوا

میرے ساتھ چلے اک دنیا میں جو رکوں رُک جائے
میرا کُنبہ لہروں کا قبیلہ میری ذات ہوا

بھیگی رات تو دُھل ہی گیا کچھ اس کے دل کا غبار
بھول گئی کچھ دیر کو میرے احساسات ہوا

ضد تھی اٹھو مجھ کو بانہوں میں لو رقص کرو
روٹھ گئی شب مجھ دیوانے سے بے بات ہوا

گھر کے درختوں سے پتے اور میری سوچ سے بول
رات اُتار کے لے گئی سب کے ملبوسات ہوا

فخری تبھی تو میں نے مٹھی کھولے رکھی تھی
مٹھی بند اگر کرتا کب آتی ہاتھ ہوا

حزیں لدھیانوی

نہیں ٹھہرا بارشوں میں کسی سائباں کے نیچے　　میں رواں دواں رہا ہوں، کھلے آسماں کے نیچے

وہ عروجِ خاکِ آدم کی دلیل بن گئے ہیں　　جو طواف کر رہے ہیں درِ کہکشاں کے نیچے

کبھی سطح سے گذر کر بھی تو دیکھ اپنے دل کو　　کئی اور بھی جہاں ہیں، ترے اس جہاں کے نیچے

یہ زمین بھی تو ماں ہے اسے روشنی سے بھر دو　　کبھی تم بھی جا بسو گے اسی خاکداں کے نیچے

کہو فاختہ سے اپنے پر و بال اب سنبھالے　　کہ شکاری آ گیا ہے کوئی آشیاں کے نیچے

تو ستارہ، چاند، سورج، ترا گھر بھی کہکشاں سا　　یہ اندھیرا سا ہے کیسا ترے شمعداں کے نیچے

کوئی موجِ رنگ اُبھرے، کوئی بُو خوشی کی پھوٹے
کہ حزیں ہے خلق کب سے غمِ بیکراں کے نیچے

سید تابش الوری

اچھا رہا یا بُرا رہا ہوں!
میں حرفِ سوالیہ رہا ہوں

وہ "لمحہ" میرے سامنے تھا
صدیوں جسے ڈھونڈتا رہا ہوں

دیکھا تو اسے بس ایک پل تھا
پہروں اسے سوچتا رہا ہوں

آنکھ اس پہ ٹھہرتی ہی نہیں تھی
میں کس طرح دیکھتا رہا ہوں

ہر بار تھا وہ نئی پہیلی
پیہم اسے بوجھتا رہا ہوں

خوابوں کی بکھر رہی تھیں کرچیں
پلکوں سے سمیٹتا رہا ہوں

باہر سے بھرم رہا بدن کا
اندر سے میں ٹوٹتا رہا ہوں

میں اور کسی کو کیسے پاتا
اپنا پتا پوچھتا رہا ہوں

اس کھیل میں جیت ہی نہیں تھی
جس کھیل میں ہارتا رہا ہوں

شہزاد احمد

زمینِ دل کے ہیں انداز بدلے بدلے ہوئے
ہوائیں ٹھہری ہوئیں اور چراغ سہمے ہوئے

ہے میرا رشتہ کسی اور ہی زمین کے ساتھ
مری نظر میں ہیں منظر کبھی نہ دیکھے ہوئے

اسی لیے نظر آتا ہوں سمٹا سمٹا ہوا
ہیں میرے چار طرف آسمان پھیلے ہوئے

کوئی بھی کام ہو مکمل کر نہیں کیا جاتا
اگر اڑا بھی کبھی میں تو پر سمیٹے ہوئے

میں ایک پیڑ ترے راستے کی رونق ہوں
ہیں میرے پھول تری اک نظر کو ترسے ہوئے

خود اپنے حال پہ اک اشک بھی بہایا نہیں
ہمارے حصے میں آئے ہیں ابر برسے ہوئے

کسی نے رخ نہ کیا تھا سمندروں کی طرف
یہ لوگ ڈوب گئے ہیں گھروں میں بیٹھے ہوئے

ابھی تلک در و دیوار اجنبی کیوں ہیں!
زمانہ بیت گیا اس مکاں میں رہتے ہوئے

یہ سوچ کر کہ ادھر سے ترا گزر ہو گا
میں گھر میں چھوڑ گیا ہوں چراغ جلتے ہوئے

یہ تیرگی مرا مقصود تو نہ تھی شہزاد
میں کھو گیا ہوں ستارے تلاش کرتے ہوئے

اکبر حمیدی

دریا ساتھ چلے تو پانی ساتھ چلے
ورنہ کب تک یہ طغیانی ساتھ چلے

اس سے بڑھ کر اسکی چاہت ساتھ نبھائے
میں روکوں اور یہ دیوانی ساتھ چلے

زیست ہمیشہ مجھ سے تھوڑی دور رہی
جیسے نار کوئی بیگانی ساتھ چلے

اور کوئی دن بجلی کڑکے بادل برسیں
جذبوں کا موسم طوفانی ساتھ چلے

دنیا اک لڑکی ہے نخرے کرنے والی
ہاتھ پکڑ لو تو مرجانی ساتھ چلے

حیرت ہی سے لطفِ سفر اور لطفِ نظر
جتنی دور چلوں حیرانی ساتھ چلے

کیا جانے کب کیسی صورت پیش آئے
کچھ دانائی کچھ نادانی ساتھ چلے

پیرہنِ سلطانی چھن بھی جائے اگر
نسلوں تک بوئے سلطانی ساتھ چلے

اکبر کوئی خواب ہی لے کر نکلو گھر سے
کوئی تو صورت امکانی ساتھ چلے

روشن چراغِ خونِ تمنا نیا نہیں
آنکھوں کے سامنے یہ تماشا نیا نہیں

دریا کا رخ ہے حسبِ روایت نشیب کو
بہتی ہے کوئی رشتۂ دریا نیا نہیں

جاتی رُتیں بھی جاتے ہوئے کہہ رہی ہیں صاف
آتی رُتوں کا سلسلہ ایسا نیا نہیں

تنہائیاں دلاتی رہیں یاد ایک بات
دشتِ سفر میں کچھ دلِ تنہا نیا نہیں

پھر میں ہوں اور ایک زمانے کی نفرتیں
میرے لیے یہ پیار کا تحفہ نیا نہیں

میں ہوں کہ حیرتوں میں ہوا جا رہا ہوں گم
حالانکہ کوئی منظرِ دنیا نیا نہیں

سب لوگ ایک جیسے ہی لگنے لگے ہیں کیوں
چہروں میں جیسے کوئی بھی چہرہ نیا نہیں

لگنے لگی ہے زہر سی کیوں تیری بات بات
تیرا سلوک جب کہ کچھ ایسا نیا نہیں

باتوں میں میری ایک کشش پھر بھی پاؤ گے
روحی اگرچہ کوئی بھی وعدہ نیا نہیں

شبنم شکیل

وہ ساجن ہو کے بھی ساجن نہیں ہے
سکھی یہ پیت ہے بندھن نہیں ہے

ادھورا ہے ہر اک سپنا ہمارا
کبھی جھولے کبھی ساون نہیں ہے

کھلونے پاس ہیں حیرانیوں کے
اگرچہ اب مرا بچپن نہیں ہے

یہ مر جاتی ہے اپنی موت خود ہی
محبت کا کوئی دشمن نہیں ہے

چھپوں کیسے میں آخر زندگی سے
کہ اب دل میں وہ سُندر بن نہیں ہے

کوئی رُت اِدھر سے چلی گئی، کسی دوسری کا قیام ہے
اسی آنے جانے کے درمیاں یہاں زندگی کا قیام ہے

یہ جو پانیوں کا بہاؤ ہے، یہ جو پربتوں کا پڑاؤ ہے
کہیں شور اپنے سفر میں ہے، کہیں خامشی کا قیام ہے

یہ جو دن ہے اور یہ جو رات ہے، یونہی نام رکھنے کی بات ہے
کہیں روشنی ہے رُکی ہوئی، کہیں تیرگی کا قیام ہے

تجھے بے تحاشا ہی سوچنا نئے دین کی ہے طرح کوئی
تجھے ایسے ٹوٹ کے چاہنا کسی بندگی کا قیام ہے

وہ بجھی بجھی مری خلوتیں، تھا ثمر وہ تیرے فراق کا
یہ جو اب ہیں اتنی اداسیاں یہ بھی ہجر ہی کا قیام ہے

کسی بے یقیں سی زمین پر تو کھڑا ہے مجھ سے ذرا پرے
کوئی شک ہے جس کے نواح میں۔ تری دوستی کا قیام ہے

یہاں جس کے ہاتھ جو آ گیا اسے اپنا اس نے سمجھ لیا
جہاں جس کو جتنی جگہ ملی وہاں پر اُسی کا قیام ہے

شوکت کاظمی

شریکِ سلسلۂ ماہ و سال ہو نہ سکی
خود اپنی روح بدن سے وصال ہو سکی

اگرچہ ہرکس و ناکس کو شادماں رکھا
جو تھی عزیز وہ ہستی نہال ہو نہ سکی

بس ایک لمحے میں قلب و نظر پہ کیا بیتی
تمام عمر طبیعت بحال ہو نہ سکی

ہمارے فن میں کمی تھی کہ دلبری میں تری
کہ تکمل کے مدحتِ حسن و جمال ہو نہ سکی

خدا سے لینے کے انداز بھی نہیں آئے
کسی بشر سے بھی عرضِ سوال ہو نہ سکی

حضورِ یار پہنچ کر بھی کیا بیاں ہوتی
وہ کیفیت جو اسیرِ خیال ہو نہ سکی

وہ جب ملی تھی تو نصف النہار پر میں تھا
نمازِ عشق بوقتِ زوال ہو نہ سکی

صابر ظفر

رنگ ہی رنگ ہیں تصویر نہیں ہے کوئی
اور اس خواب کی تعبیر نہیں ہے کوئی

در و دیوارِ محبت تھے سبھی بے بنیاد
اور اب حسرتِ تعمیر نہیں ہے کوئی

اپنی اپنی ہیں ملیں سبھی احباب کے پاس
اب مرے حلقے میں زنجیر نہیں ہے کوئی

اب ملاقات بچھڑنے کے لیے ہوتی ہے
کسی رانجھے کے لیے ہیر نہیں ہے کوئی

پُرزے پُرزے ہوئی جاتی ہے کتابِ ہستی
اور کسی پُرزے پہ تحریر نہیں ہے کوئی

داستاں ظلم کی خود لکھتے ہو کیوں مظلومو
کیا یہاں کاتبِ تقدیر نہیں ہے کوئی

میں نے کتنی ہی زمینوں میں ظفرؔ شعر کہے
لیکن افسوس ہے جاگیر نہیں ہے کوئی

خلوم رزمی

یہ جو اک عمر سے ہم فصلِ خزاں کاٹتے ہیں
حاصلِ گُل کی تمنا میں کہاں کاٹتے ہیں!

کتنے خوش فہم ہیں وہ لوگ جو اس ہجرت میں
خواہشِ نفع لیے دشتِ زیاں کاٹتے ہیں

نام غیروں کا لیے جاتے ہیں ورنہ اب تک
یہ وہ بستی ہے جہاں اپنے زباں کاٹتے ہیں

جانتے ہیں کہ نہیں راحتیں حاصل اِس کا
پھر بھی اک عمر سے ہم رنجِ جہاں کاٹتے ہیں

ہم سے پوچھو تو بتائیں کہ طلب میں اُس کی
زیست کرتے ہیں کہاں' سنگِ گراں کاٹتے ہیں

جن کو دعویٰ تھا کہ ہم بات کے پکے ہیں بہت
اپنے خامے سے وہی اپنا بیاں کاٹتے ہیں

اپنے منشورِ مسافت میں ہے اک جھول یہی
اپنی تحریر سے اب لفظِ مکاں کاٹتے ہیں

ہم ہی وہ لوگ ہیں جو خوابِ سحر میں رزمیؔ!
رات بھر شمع جلا کر بھی دھواں کاٹتے ہیں

فاطمہ حسن

کہو تو نام میں دیدوں اسے محبت کا
جو ایک الاؤ ہے جلتی ہوئی رفاقت کا

جسے بھی دیکھو چلا جا رہا ہے تیزی سے
اگرچہ کام یہاں کچھ نہیں ہے عجلت کا

دکھائی دیتا ہے جو کچھ کہیں وہ خواب نہ ہو
جو سن رہی ہوں وہ دھوکہ نہ ہو سماعت کا

یقین کرنے لگے لوگ رت بدلتی ہے
مگر یہ سچ ہو کرشمہ نہ ہو خطابت کا

چلو کہ اس میں بھی اک آدھ کام کر ڈالیں
جو مل گیا ہے وہ لمحہ ذرا سی مہلت کا

سنوارتی رہی گھر کو مگر یہ بھول گئی
کہ مختصر ہے یہ عرصہ یہاں سکونت کا

جان کاشمیری

اس قدر بات ہے تسلیم شدہ
میں تو انسان ہوں تقسیم شدہ

حسبِ ماحول بدل جاتا ہے
پیار ہوتا نہیں تنظیم شدہ

سب فرشتوں نے کیا سجدہ مجھے
روزِ اوّل سے ہوں تعظیم شدہ

تیرے سانچے میں ڈھلے کیوں آخر
وہ تو انسان ہے تجسیم شدہ

تم نہ سمجھو یہ تمہارا ہے کمال
حالِ دل ورنہ ہے تفہیم شدہ

عشق ایثار ہی ایثار ہے جانؔ
جگ میں یہ قول ہے تسلیم شدہ
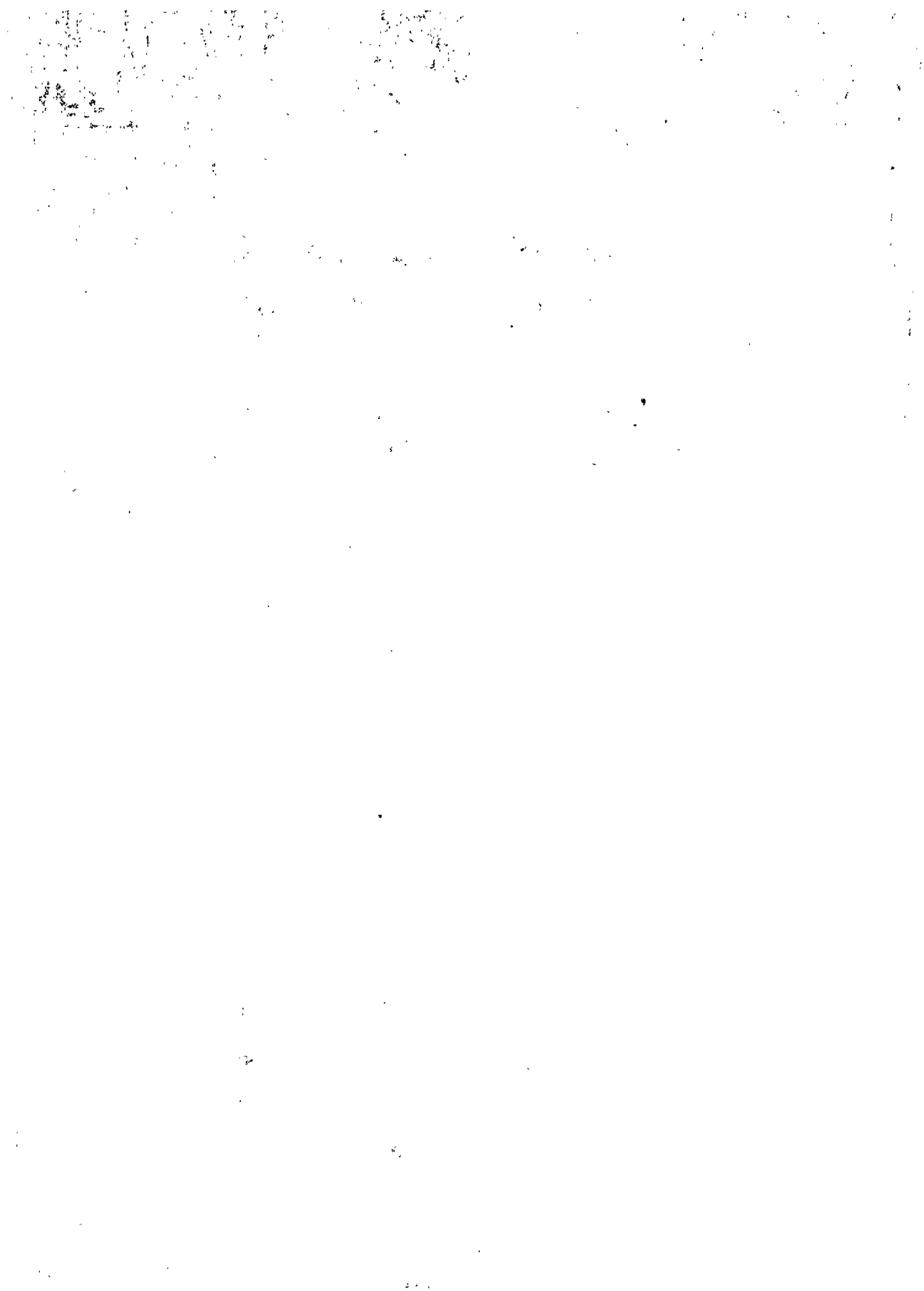
ڈاکٹر این میری شمل

اقبالؒ کا تصورِ عقل و عشق

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل (ولادت ۱۹۲۳ء) کوئی چالیس برس تک ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ میں برصغیر کی زبانوں اور ثقافت نیز اقبالیات کی تدریس کرنے کے بعد مئی ۱۹۹۲ء کو ریٹائر ہوئی ہیں علامہ اقبال کے بارے میں انہوں نے جرمن اور انگریزی زبانوں میں کئی کتابیں لکھیں اور علامہ مرحوم کی کئی کتب کے ترجمے بھی پیش کئے۔ ذیل کا مختصر اقتباس ان کی جرمن کتاب "محمد اقبال فلسفی اور صاحب پیغام شاعر" سے موسوم ہے۔
(مترجم)

علامہ محمد اقبال کا تعلق تین معنوی قلمروؤں سے ہے اور انہیں تین قلمروؤں سے ان کی قابل قدر تصانیف بھی مربوط ہیں۔ ایک قلمرو برصغیر کی ہے دوسری دین اسلام کی روحانی قلمرو ہے اور تیسری مغربی فلسفے کی سرحد ہے۔ اقبال برصغیر میں پیدا ہوئے انہوں نے قرآن مجید کے زیرسایہ تربیت حاصل کی وہ مغرب میں دانتے اور مشرق میں ایران اور عرب کے عرفان کے شناسا تھے مغربی فلسفے کی پیچیدگیوں اور نیٹشے اور برگساں سے وہ پورے طور پر آشنا تھے وہ اپنی فکر کی بلندیاں دکھاتے ہوئے عالم انسانی کو اپنی معنوی قلمرو اسلام کی طرف کھینچتے نظر آتے ہیں۔

اقبال کی تصانیف میں مولانا روم کی تصانیف کی طرح عشق عقل کے مقابلے میں سرگرم عمل اور فعال نظر آتا ہے۔ اقبال کے نقطہ نظر سے عقل بھی صرف سلبی کیفیت نہیں رکھتی کیونکہ دنیا کے نظم و نسق کو باقی رکھنے کے لیے اس کا وجود نہایت ضروری ہے عقل ایک باریک بیں استاد کی طرح ہے وہ بھی بڑی سرگرم قوت ہے مگر باطن کے حرم میں وہ داخل نہیں ہو سکتی' عقل آہستہ آستہ نہایت احتیاط سے اور شک و گمان کے ساتھ قدم اٹھاتی ہے لیکن مجبور ہے کہ محبوبوں کے سلطان کے دربار میں رک جائے' وہ گذشتہ حوادث پر نظر رکھتی ہے پرانے امور کی تحقیق کرتی ہے اور علم و دانش کی سوہان روح بننے والی سرگرمیوں کی طرح اپنے آغاز کار کے کاموں پر توجہ دیتی ہے اور یقین و اعتماد کی جستجو کرتی ہے عشق کا معاملہ اس کے برعکس ہے اس کا تعلق جاذبہ جمال کے ساتھ ہے اور وہ محبوب ازل کی آگ میں نہایت بے باکی سے کود پڑتا ہے اقبال نے کہا ہے:

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومی یہ پوچھتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

(فلسفہ و مذہب: بال جبریل)

اقبال کے ہاں عقل کی مثال کئی جگہ بو علی سینا کی سی دی گئی ہے' وہ رضائے الٰہی سے دور جا پڑتا

ہے اور شیطان کی خو خصلت پیدا کرتا ہے' شیطان کا بجی تو کہہ کے محدود تھا کی میں نور عقل کی بجائے
تھی اس نے صرف مادہ دیکھا اور اس میں ایسا گم ہوا کہ بصیرت درون سے محروم رہا ظاہر ہے کہ
عقل وہ ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو جائے اور دنیا کو ویران کرتی جائے اقبال نے اس مناسبت سے
کہا ہے۔

عشق تمام مصطفیٰ' عقل تمام بولہب

(ذوق و شوق : بال جبریل)

یہ شیطانی عقل ہے اور اقبال ہمیشہ دنیائے مغرب کو ایسی عقل اپنانے پر سرزنش کرتا ہے وہ دنیا جس میں
سارا یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ذات کی عظمت پر توجہ نہ ہو وہ شیطان کے پرتو میں ہے' اس
کے علم و دانش شیطانی وسوسے میں ہیں' پہلے مرحلے میں اس کے سائنسی علوم پر نظر پڑتی ہے جو اپنی اور د
کی تباہی کا سوچتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر عقل کا عشق کے ساتھ سودمند امتزاج ہو جائے تو اس م
معرفت اور عاشقانہ جذبات نمودار ہوتے ہیں اور وہ دنیا کو ایک بہشت بنانے پر قادر ہونے لگتی ہے ان
کے بیان کرنے کے لیے اقبال نے علم اور عشق کی ایک بحث اپنی کتاب "پیام مشرق" میں پیش کی ہے۔

علم

نگاہم رازدار ہفت وچار است گرفتار کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سوباز کردند مرابا آنسوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم
ببازار افگنم رازے کہ دارم

عشق

زافسون تو دریا شعلہ زار است ہوا آتش گداز و زہر دار است
چو بامن یار بودی نور بودی بریدی از من و نور تو نار است
بخلوت خانہ لاہوت زادی
ولیکن دورخ شیطاں فتادی

بیاایں خاکداں را گلستاں ساز جہان پیررا دیگر جواں سا
بیایک ذرہ ازدرد دلم گیر تہ گردوں بہشت جاوداں سا
زروز آفرینش ہمدم استیم
ہماں یک نغمہ رازیروبم استیم

شاید بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ اقبال کا سا عالم استاد اور دانشور فلسفی علم اور عقل کی کیونکر مخالفت کرتا۔
اس سلسلے میں اقبال کی کتاب "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" دیکھیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغرب
کے فلسفے سے پورے طور پر آگاہ تھا اس کتاب میں انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ دوسرے مسلمان بھی ممک

حد تک مغربی فلسفے کی اداؤں سے آگاہ ہوں مگر اقبال کی مخالفت عقل سے متعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ فلسفیوں پر مسلمان مفکر اعتراض کرتے آ رہے ہیں۔ مثلاً ہم کئی راست عقیدہ کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ یونان کے فلسفے سے متاثر بھی تھے لیکن اس پر معترض بھی تھے ان کے اعتراض کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ یونانی دنیا کو حادث نہیں بلکہ قدیم جانتے تھے۔

فلسفے پر یعنی اقبال کی اصطلاح میں علم و عقل پر معترض مسلمان علماء میں سے امام محمد غزالی (م ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کا نام لے سکتے ہیں، جن کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ مشہور ہے۔ اس کتاب نے دیگر ناقدان فلسفہ مثلاً حکیم سنائی غزنوی (و۵۴۵ھ) یا مولانائے روم (و۶۷۲ھ) اور کئی دوسروں کے لیے ایک ماخذ کا کام دیا۔ اس کے مقابلے میں بوعلی سینا کے سے فلسفہ دوست بھی تھے۔ اسے کسی نے خواب میں کہا تھا کہ تم نبوت کی اہمیت جانے بغیر بھی خدا تک پہنچ سکتے ہو۔ اس قسم کے فلسفی عشق کی متاع سے خالی ہیں اور سوچتے ہیں کہ عقل کی مدد سے اسرارعالم جان لیں گے۔ اقبال عقل، اجزا شناسی اور عشق عارفانہ کا موازنہ بار بار کرتا رہا۔ اس کے نزدیک عشق حقیقی کی دلآویزی اسی کا نصیب بنے گی جو عارف وصوفی ہو اور جسے القا اور الہام کی برکات سے بہرہ مند کیا گیا ہو۔

خدا، کائنات اور انسان کے روابط کے بارے میں اقبال نے بڑی جرات افزا باتیں کی ہیں لیکن صاحبان علم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ سب قرآن مجید سے ہی ماخوذ ہیں یا کہیں کہیں انہیں اقبال کی جدت آمیز تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً کتاب، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، کا آغاز (خطبہ اولیٰ) دیکھ لیں کہ اس میں خلق جدید، فطرت پر غلبہ اور معراج انسانی کی کس قدر جرات آموز گفتگو ہے۔ اقبال جو کہتا تھا، قرآن مجید کی تعلیمات کے پیش نظر کہتا تھا۔ اسکے خادم علی بخش (و۱۹۶۹ء) نے کہا ہے کہ اقبال شعر کہتے وقت اسے بار بار کہتے تھے کہ قرآن حکیم کو لائے۔ وہ ہر روز مطالب قرآنیہ پر غور کرتے اور دوسروں سے تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ راست فکر والے مسلمان عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ء) نے لکھا ہے کہ اقبال آخری عمر میں بالخصوص قرآن مجید کو پیش نظر رکھ کر ہی سوچتے اور لکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہیں اقبال کا سا کوئی دوسرا پروفیسر، ڈاکٹر، عالم، فلسفی یا قانون دان نظر نہ آیا جو اس قدر شائق القرآن ہو۔ اقبال دین و دنیا کے سب علوم کا سرچشمہ قرآن کو ہی مانتے ہیں(۲)۔ افغانستان کے ایک سابق بادشاہ کو انہوں نے علم و عقل کے مقابلے میں اس عشق کی تلقین کی اور اپنے پیغام کی قرآن مآبی بھی واضح کی ہے۔

راگ و سازما کتاب و حکمت است	این دو قوت اعتبار ملت است
آں فتوحات جہان ذوق و شوق	ایں فتوحات جہان تحت وفوق
ہر دو انعام خداے لایزال	مومناں راآں جمال است، ایں جلال!
حکمت اشیا فرنگی زاد نیست	اصل اوجز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است	ایں گہراز دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پرکشاد	علم و حکمت رابنا دیگر نہاد
گوہر دریاے قرآں سفتہ ام	شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

با مسلمانان غمے بخشیدہ ام — کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشق من از زندگی دارد سراغ — عقل از صہبای من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟ — با مسلمان حرفِ پرسوزے کہ گفت
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت — تا مقام خویش بر من فاش گشت
حرف شوق آموختم و آسوختم — آتشِ افسردہ باز افروختم
با من آہِ صبحگاہے دادہ اند — سطوت کوہے بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نور لا الہ — در شرابِ من سرورِ لا الہ

(آخری حصہ مثنوی ' مسافر)

توضیحات

Muhammad Iqbal Dichter and Philosoph

اصل مقالہ پہلی بار ماہنامہ جوہر علی گڑھ کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ یہاں لفظی ترجمہ نہیں۔
ماہنامہ کلک تہران اپریل مئی ۱۹۹۲ء صفحہ ۶۸ تا ۷۲۔

(انگریزی سے ترجمہ : ڈاکٹر محمد ریاض)

عبدالحمید اعظمی

پطرس بخاری۔ سوانحی خاکہ

پروفیسر سید احمد شاہ بخاری کا تعلق صرف بخارا شہر سے نہیں بلکہ سادات بخارا کی ایک شاخ سے تھا۔ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ ایلس فیض کے نام ایک خط میں اپنے گھرانے کو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔

"بہرحال "اہل بخارا" کے لئے تمہاری اس محبت کا شکر گزار ہوں۔"

(خط بنام ایلس فیض مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء)

بخاری صاحب کے بزرگ بخارا سے براہ راست پشاور نہیں آئے۔ وہ کشمیر میں آباد ہوئے پھر وہاں سے ہجرت کرکے اس شہر میں بود و باش اختیار کر لی۔ پشاور میں ایک اور بخاری خاندان ہے جو وہاں چار پانچ صدیوں سے آباد ہے وہ سید احمد شاہ کے خاندان کو سادات بخارا کی شاخ شمار نہیں کرتے تاہم منشی محمد دین فوق نے "سادات بخاری" کے زیر عنوان "تاریخ اقوام کشمیر" میں لکھا ہے کہ۔

"سادات بخارا کا نسبی تعلق مخدوم جہانیاں جہانگیر سید جلال الدین بخاری ہی سے ہے۔ تاریخ خواجہ عظیمی کے مطابق آپ کی اولاد میں سید علاؤ الدین بخاری کشمیر کے فرمانروا سلطان سکندر کے دور میں اپنے اہل و عیال کے ہمراہ کشمیر آئے اور زراعت اور کاشتکاری کرنے لگے۔ پیری مریدی بھی جاری رہی لیکن کثرت اولاد کی بناء پر فکر معاش سے آزادی نہ مل سکی...... سلطان کشمیر کے آخری زمانہ میں وہاں معاشی ابتری کے ہاتھوں مجبور ہوکر کشمیر کے بہت سے شرفاء نے وطن چھوڑا۔ اس طرح چند گھرانے کشمیر سے پنجاب اور صوبہ سرحد میں آباد ہو گئے۔ اسی خاندان کے کچھ لوگ پشاور اور بنوں میں آج تک موجود ہیں" فوق صاحب کی تحقیق کے مطابق مشہور شعلہ بیان مقرر سید عطا اللہ شاہ بخاری کا تعلق بھی اسی کشمیری خانوادے سے تھا۔ احمد شاہ بخاری پطرس کے بزرگ پشاور کے محلہ جہانگیر پورہ میں مقیم ہوئے۔ جہاں اس خاندان کے افراد آج بھی اپنے آبائی گھر میں رہتے ہیں۔ اس گھرانے کے افراد ملازمت اور تجارت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی روحانی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ اسی لئے ان کے ساتھ لفظ "پیر" کا سابقہ ضرور لگا دیا جاتا تھا۔

بخاری کے والد کا نام(۱) پیر اسد اللہ شاہ بخاری تھا۔ وہ پشاور کے ایک معروف وکیل خواجہ کمال الدین کے منشی تھے۔ اس کے علاوہ وہ فرصت کے اوقات میں بچوں کو قرآن و حدیث اور سعدی کی گلستان بوستان بھی پڑھایا کرتے تھے۔ سید ذوالفقار علی بخاری نے "سرگذشت" میں ان کے ایک شاگرد بابا شاب الدین کا ذکر کیا ہے جو بعد میں آغا حشر کے شاگرد اور تھیٹر کے مشہور اداکار ہوئے۔ "سرگذشت" میں یہ بھی تحریر ہے کہ بخاری کے والد کو فارسی نعتیں اور پنجابی کافیاں سننے کا بہت شوق تھا۔

پطرس ابھی آٹھ ہی برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ

انہیں ایک نہایت ہی شفیق سوتیلی ماں کی محبت نصیب ہوئی۔ محمد عبد اللہ قریشی کے بیان کے مطابق بخاری کل تین بھائی تھے۔ اس کے علاوہ "سرگزشت" کے مطابق ان کی چند بہنیں بھی تھیں ایک ان سے بڑی تھیں۔

سید اسد اللہ شاہ بخاری کے بڑے بیٹے کا نام پیر محمد شاہ تھا جو شاعری کرتے تھے اور محسن تخلص کرتے تھے۔ دوسرے بیٹے پیر سید احمد شاہ بخاری تھے جو دنیائے ادب میں "پطرس" کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ تیسرے بیٹے پیر سید ذوالفقار علی بخاری تھے جن کا شمار برصغیر کا نامور ماہرین نشریات میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے چند ایک سوتیلے بھائی بھی تھے۔

احمد شاہ بخاری سرکاری کاغذات کی رو سے یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے اس زمانے کے رواج اور خاندانی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے احمد شاہ کی تعلیم کا آغاز گھر ہی پر قرآن پاک کے ناظرہ سے ہوا۔ ابتدائی دینی مسائل سے بھی روشناس کیا گیا۔ اس زمانے میں شرفاء اپنے بچوں کے لئے فارسی تعلیم ضروری سمجھتے تھے اسی لئے والد نے گلستان بوستان بھی سبقاً سبقاً پڑھائیں۔ "صفوۃ المصادر" یعنی فارسی قواعد کی باقاعدہ تعلیم دی گئی۔ دینی اور ثقافتی بنیاد فراہم کرنے کے بعد والد نے آنے والے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر احمد شاہ کو انگریزی تعلیم کے لئے مشن سکول پشاور میں داخل کرا دیا۔ اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

گھر پر دینی ماحول کے علاوہ بخاری کو ادبی ماحول بھی ملا۔ والد اور بڑے بھائی شاعر تھے۔ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے۔ شعر و ادب کے چرچے کان میں پڑتے رہے۔ دینی ماحول نے تو اتنا نہیں البتہ ادبی ماحول نے بخاری کی سوچ اور ذوق کو ابتداء ہی سے بہت زیادہ متاثر کیا۔ مشن سکول میں داخل ہوتے ہی انہوں نے انگریزی نظمیں یاد کرنی شروع کر دیں۔ اس زمانے میں انگریزی پڑھانے والے انگریز ہوتے جو بچوں کے انگریزی لہجے اور تلفظ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ احمد شاہ کی انگریزی نظموں سے اس دلچسپی پر انگریز اساتذہ نے خصوصی توجہ دی۔ ان کے اس ادبی ذوق کی خوب تربیت کی۔ ذوالفقار علی بخاری نے "سرگزشت" میں اور اپنے سوانحی خاکے "بھائی بھائی" میں جو نقوش کے "پطرس نمبر" میں شائع ہوا ہے۔ ایک واقعہ لکھا ہے کہ سکول کے سالانہ جلسے میں سید احمد شاہ نے انگریزی نظم سنا کر صوبے کے چیف کمشنر سر جارس روس کیپل سے داد اور انعام حاصل کیا۔ مہمان خصوصی نے اس نظم خوانی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا "اے کاش میں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے۔"

پشاور میں قیام کے دوران ہی ان دونوں بھائیوں کو تھیٹر کی بھی چاٹ لگی جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہی۔ احمد شاہ بخاری کی دلچسپی صرف شوقیہ طور پر کالج کے سٹیج تک ہی محدود رہی مگر ذوالفقار علی بخاری نے تو بارہا پیشہ ور تھیٹر والوں کے ساتھ حصہ لیا۔ تھیٹر میں دلچسپی کا حال "سرگزشت" میں بڑی تفصیل سے درج ہے کہ کس طرح ان کے والد کے شاگرد بابا شہاب الدین نے جو تھیٹر کمپنی کے ہمراہ پشاور آئے والد کو تھیٹر کے پاس لا کر دیئے۔ مگر والدہ کے ایک معنی خیز جملے سے متاثر ہو کر والد نے تھیٹر دیکھنے کا ارادہ فسخ کر دیا۔ صاحب سرگزشت کے الفاظ میں سنئے۔

"اگلے دن جب سب سو گئے تو میں اور بھائی جان مرحوم ملازم کی خوشامد کر کے منہ لپیٹے، رات کی تاریکی میں سیدھے تھیٹر پہنچے، ہمارے لئے یہ تھی تھیٹر کی ابتداء۔" (سرگزشت: ص۔ ۱۷)

بخاری نے والد کی نظریں بچا کر صرف تھیٹر دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کی۔ وہ والدہ کی پابندیوں سے گھبرا کر گھر سے اکثر بھاگ جاتے۔ اس زمانہ میں پشاور سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے تھے جو سنہری مستقبل کے خواب دیکھنے والے نوجوانوں میں مقبول تھے۔ یا تو مشرق کی طرف ہندوستان میں قسمت آزمائی کی جائے یا پھر مغرب کی سمت سمرقند و بخارا کے قافلوں کے ساتھ جاکر تقدیر کا کرشمہ دیکھا جائے۔ امپیریل گزیٹیر کے مطابق اس زمانے میں پشاور سے یہ قافلے بڑی باقاعدگی کے ساتھ وسطی ایشیاء خصوصاً بخارا جاتے۔ وہاں سے سونے کے سکے، اشرفیاں اور سونے چاندی کے تار لاتے جن کی کشمیر میں شال بافی کے کارخانوں میں بہت مانگ تھی، واپسی میں پشاور سے جو سامان تجارت بخارا جاتا ان میں یہ کشمیری شالیں بھی ہوتیں۔ سید احمد شاہ نے دس برس کی عمر میں متعدد بار وسطی ایشیاء جانے والے ان قافلوں کے ساتھ نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ یہ قافلے پشاور سے رات کے پچھلے پہر روانہ ہوتے تھے۔ ہر بار دس بارہ میل کے سفر کے بعد ہی درہ خیبر میں یا تو گشتی سرکاری دستے یا پھر والد کے آدمی احمد شاہ کو ڈھونڈھ نکالتے اور واپس گھر لے آتے جہاں بقول پطرس "ان کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا جاتا مگر سلوک میں بڑی گرم جوشی ہوتی۔"(۲)

گھر سے اس بیزاری کے باوجود ہر سال امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتے۔ پندرہ برس کی عمر یعنی ۱۹۱۳ء میں میٹرک کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ والد نے بخاری کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اور غالباً محسوس کرتے ہوئے کہ ان کی ذہنی نشوونما کے لئے ایسا تعلیمی ماحول چاہیے جس میں مذہب اور ثقافت کا رنگ نمایاں ہو انہیں اسلامیہ کالج میں داخل کرا دیا۔ بخاری نے انٹر کا امتحان بھی بڑے عمدہ نمبروں سے پاس کیا۔

والد کی دوربین نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ پشاور کے ماحول میں یعنی "صحبت طالح" میں برخوردار کی صالح صلاحیتیں کسی غلط راستے پر پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں۔ انہیں ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور داخلہ دلوا دیا۔ جہاں ابتداء میں وہ شرمیلے اور کم گو مگر ہوشیار طالب علم کی حیثیت میں ابھرے۔ ان کے ایک ہم عصر طالب علم افتخار الدین نے ۱۹۱۸ء کا ایک واقعہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کس طرح اس شرمیلے اور کم گو طالب علم سے جو الگ تھلگ بیٹھا ہوتا تھا گفتگو کا آغاز کیا اور انہیں کرکٹ کھیلنے پر آمادہ کیا۔ لیکن شام میں آکر وہ صرف دو تین گیندیں کھیلے اور بولے "یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

۱۹۱۷ء میں بی اے میں کامیابی کے بعد اپنے ہونے والے خسر کی خواہش پر انہوں نے ایم ایس سی طبیعات میں داخلہ لیا مگر طبیعات پر طبیعت مائل نہ ہوئی اور اپنے پسندیدہ مضمون انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کی ٹھانی اور اس مضمون میں یونیورسٹی بھر میں اول رہ کر طلائی تمغہ حاصل کیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں ادب سے ان کی دلچسپی اور اس میدان میں ایک ممتاز طالبعلم ہونے کی حیثیت میں انہیں کالج کے رسالہ "راوی" کا طالبعلم مدیر مقرر کیا گیا۔ اس رسالہ نے ان کی کوششوں سے ایک قابل رشک مقام حاصل کر لیا۔ ایسی ایسی جدت طرازیاں ہوئیں کہ آج ان کی تاریخی حیثیت مانی جاتی ہے ان کے نقش قدم پر چلنا آنے والے مدیروں نے اپنے لئے باعث سعادت جانا۔ ان کی خداداد حس مزاح کی تقلید ممکن نہ تھی۔ اس لئے اکثر مدیروں نے ٹھوکریں بھی کھائیں۔ بخاری کی جدت فکر اور زور قلم کا یہ نتیجہ تھا کہ "تاریخ گورنمنٹ کالج" کے ایک مصنف ڈاکٹر عبد الحمید کو لکھنا پڑا کہ "بخاری نے مدیر کے مرتبہ

کو اتنا بلند اور بااثر بنا دیا کہ اس کے مقابلہ میں یونین کے بڑی عہدیداروں کی حیثیت بھی نہ تھی۔ وہ چھوٹے موٹے عہدیداروں کو بڑی آسانی سے مرعوب کر لیتے اور ہر طالب علم [illegible] رہتا۔ رسالہ میں اپنی نگارشات شامل کرانے والے طلباء ان کی تعریف و توصیف خوشامد کی حد تک کرتے رہتے۔ اس لئے خوفزدہ رہتے کہ کہیں ان کا نام اس فہرست میں شامل نہ کر دیا جائے جس کا عنوان تھا "بدی کی نوکری۔"

اس دور میں بخاری کے مشاغل وہی کچھ تھے جو تمام طلباء کا مقصود ہوتا ہے۔ اسی دور کا ذکر انہوں نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو نقوش کے پطرس نمبر میں شامل ہے لکھتے ہیں "غریب ماں باپ کا بیٹا' ایک غلام قوم کا فرد' نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا' فسانہ آزاد کا دلدادہ' جلسے اور سادگی کا شوقین' "زمیندار" اور "اگرو گنشال" کا خریدار' عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا' مغلیہ عیش و عشرت کا خواہش مند' اتحاد عالم کا خواب دیکھنے والا' میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔"

پطرس ۲۶۔ ۱۹۲۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ انہوں نے انگریزی ادب میں اعلیٰ ترین سند کے لئے کیمرج یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ کیونکہ وہاں کے اساتذہ ان کی افتاد طبع سے پوری طرح مطابقت رکھتے تھے۔ ان میں ان کے سپروائزر ڈاکٹر Lewis' پروفیسر Bennet' پروفیسر Tillyard' پروفیسر Lucas اور سب سے بڑھ کر استادوں کے استاد پروفیسر Arthur Quiouch شامل تھے جو بخاری کے ٹیوٹر بھی تھے اور بخاری کی تراش خراش میں ان کا سب سے اہم حصہ ہے۔ کیمرج یونیورسٹی کی عظمت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں بخاری لکھتے ہیں۔

"یہ وہ دارالعلوم ہے جہاں Stern John'Harvard Thackery'Tennyson Butler
Oliver Cromwel'William Pitt'Chesterfield'Lord Macandaiz'Milton'Gary
جیسی نابغہ روزگار ہستیاں کسب فیض کر چکی ہیں۔"

بخاری نے کیمرج میں ایک طالب علم کی بھرپور زندگی گذاری' ان کا زیادہ تر وقت لائبریری میں گذرتا' وہ علم کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی تہذیب' ادب' آداب' رہن سہن' بودوباش کی تربیت بھی حاصل کرتے رہے۔ ایک خط میں سید امتیاز علی تاج کو لکھتے ہیں۔

"اب یہ حالت ہے کہ کیمرج کے علمی' ادبی' معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں زندگی اختیار کی ہے۔ اس پر خود بھی حیران ہوں........ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ گذر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جارہا ہے۔ دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے۔ اور ہر سرگرمی اس معیار پر پورا اترنے کے لئے وقف ہے........ کیمرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی جمنے نہیں دیئے اور میں علوم و فنون کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔"

کیمرج میں عمانوئیل کالج کے طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے اپنے اساتذہ کو اپنی صلاحیتوں' محنت اور ادبی شغف سے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے۔ وہ اپنے لائق شاگرد کو بڑے قیمتی مشورے دیتے جن پر بخاری بڑی سعادت مندی سے عمل کرتے۔ حصول علم کی لگن ہی کا اثر تھا کہ انہوں نے "راہبانہ" زندگی گذاری انگریزی ادب میں Tripos کی سند' اول درجہ میں حاصل کی اور عمانوئیل کالج کے سینئر اسکالر منتخب ہوئے۔ وہ برصغیر کے دوسرے طالب علم تھے جنہوں نے انگریزی

ادب میں اول درجہ میں مانولین کالج سے سند حاصل کی۔ یہ بخاری کی صلاحیت کا اعتراف بھی تھا اور ان کی انا کی تسکین کا سامان بھی۔ وطن واپس ہوئے تو ان کا سر فخر سے بلند تھا اور اس میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ انگریزی کے صدر ہونے کا خواب بھی کروٹیں لے رہا تھا۔

بخاری نے ملازمت کا آغاز ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے لیکچرار کی حیثیت سے کیا۔ وہیں سے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے لیکن واپسی پر انہیں ٹریننگ کالج میں انگریزی کا استاد مقرر کر دیا گیا۔ اگرچہ وہ استادوں کے استاد مقرر ہو گئے لیکن اس کالج کی پابندیاں طلباء پر بھی اتنی ہی عائد تھیں جتنی اساتذہ پر اس ماحول کا ذکر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے فیض احمد فیض پر لکھے گئے ایک مضمون میں ہے' لکھتے ہیں:

"سابق درسگاہ (ٹریننگ کالج) کی خشک تدریسی فضاء میں نظم و ضبط سے طبیعت کچھ گھٹی گھٹی سی تھی۔"

(فیض سے میری پہلی ملاقات۔ اولڈراوین ایسوی ایشن کراچی نومبر ۱۹۸۵ء)

مختصر سے عرصہ کے بعد گورنمنٹ کالج کے شعبہ انگریزی سے منسلک ہوگئے اور ان کے آتے ہی بقول صوفی تبسم "کالج کی تہذیبی' ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔"(۳) یہاں آتے ہی انہوں نے شعبہ کا صدر بننے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے اور صدر شعبہ کے لئے جو انگریز تھے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ اس نے صوبہ کے گورنر سے فریاد کی گورنر نے بخاری کو بلایا اور کہا کہ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ انگریزی کے شعبہ کا سربراہ ایک ایسا فرد ہو جو پیدائشی انگریز ہو۔ بخاری نے بڑے ادب سے گذارش کی اعلیٰ حضرت کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک انگریز انگلستان کی یونیورسٹی سے درجہ اول میں اعلیٰ سند حاصل کرے (صدر شعبہ کے پاس دوسرے درجہ کی سند تھی) یہ عجیب بات ہے کہ جب اول درجہ کی سند ایک دیسی فرد حاصل کرے تو اس کی موزونیت ختم ہو جاتی ہے صرف اس لئے کہ وہ انگریز نہیں ہے۔ گورنر نے مسکرا کر بخاری کی طرف دیکھا اور بولا "شکریہ۔ یہ ملاقات ختم ہوتی ہے۔ نوجوان فتح تمہارا مقدر ہے"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء)

گورنمنٹ کالج کے اساتذہ میں شامل ہوتے ہی انتظامیہ نے بخاری کو ذمہ داری کے کئی عہدے پیش کئے۔ وہ کالج کے پراکٹر مقرر ہوئے جس کا کام طلبہ میں نظم و ضبط برقرار رکھنا تھا۔ انہوں نے اس منصب کو بڑی ہنرمندی سے نبھایا وہ طلباء کو سزا نہیں دیتے تھے صرف اس طرح اقبال جرم کراتے کہ ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔ جب ملک احمد حسین ان کے جانشین ہوئے تو بخاری نے انہیں طلباء کے معاملات سلجھانے کا ایک سنہری گر بتایا جو بظاہر بڑا ہی آسان نظر آتا ہے۔ بخاری کا مشورہ تھا کہ مجرم طلباء کا ایک پریشان کن مسکراہٹ سے استقبال کریں لیکن خود اپنے چہرے مہرے سے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ ہونے دیں۔

استاد کی حیثیت سے بخاری کو "راوی" کا نگران استاد مقرر کیا گیا۔ انہوں نے "راوی" کو کالج کی تمام سرگرمیوں کا مستند سرچشمہ بنا دیا۔ خاص توجہ ان مباحثوں پر دی گئی جو اکثر طلباء کے درمیان یونین کے زیر اہتمام ہوا کرتے تھے۔ ان روداودں میں مباحثوں میں شریک طالب علم کے دلائل ان کی خوبیاں اور کمزوریاں تفصیل سے بیان کی جاتیں۔

اس زمانے میں محمد علی جناح (قائد اعظم) کے چودہ نکات نے سیاسی میدان میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ کالج یونین میں اس موضوع پر زوردار مباحثہ ہوا اور جب ایوان سے رائے طلب کی گئی تو مسلم طلباء کی اکثریت کی بناء پر یہ فیصلہ ہوا کہ جناح کے چودہ نکات کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوا ہے اور ان نکات میں اقلیت کے نقطہ نظر کو غلط طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ یونین کا یہ فیصلہ کالج کے سیاسی ماحول کا عکاس تھا "مسلم قومیت" کے قائل طلباء اور اساتذہ کی اکثریت اسلامیہ کالج کا رخ کرتی تھی۔ بخاری کا اگرچہ سیاست سے کوئی خاص تعلق کبھی نہیں رہا۔ لیکن گورنمنٹ کالج کے سیکولر ماحول سے وہ متاثر ضرور رہے۔

انہیں گورنمنٹ کالج کے لیکچرار کے علاوہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے سیکرٹری کی اضافی ذمہ داریاں بھی دیدی گئی تھیں۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس زمانہ میں لاہور وائی ایم سی اے میں جو ریڈیو اسٹیشن کام کررہا تھا اس کے اخراجات یہی ادارہ ادا کرتا تھا۔

گورنمنٹ کالج سے وہ ۱۹۳۵ء کے اواخر تک منسلک رہے جہاں وہ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ایک ایسا حلقہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے جو ان کی علمیت' ادب پروری' جس مزاج کا قائل تھا۔ اس لئے وہ اپنے لیکچر بڑی محنت سے تیار کرتے لیکن طلباء پر اس تیاری کا اظہار نہ ہونے دیتے۔ ان کے ایک مایہ ناز شاگرد کنہیا لال کپور اپنے مضمون "پیرو مرشد" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"بخاری مرحوم حاضری لئے بغیر لیکچر شروع کر دیتے......... غلطی سے بھی کوئی عامیانہ فقرہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا۔"

طلباء کو مرعوب کرنے کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ وہ بظاہر بڑے جوش و حواس پوری تیاری کے ساتھ کلاس میں آتے اور بڑی معصومیت سے پوچھتے یہ تھرڈ ایئر کی کلاس ہے نا۔ لڑکے کہتے نہیں یہ تو فورتھ ایئر ہے۔ وہ چہرے پر کوئی پریشانی لائے بغیر کہتے اچھا تو افسانہ پڑھاتا ہے آواز آتی جی نہیں ڈرامہ۔ اور بخاری اپنا پہلے سے تیار لیکچر شروع کر دیتے۔(۴)

انہیں اپنے شاگردوں کی فلاح و بہبود کا بہت زیادہ خیال رہتا۔ ان کی کوشش یہی ہوتی کہ ان کے شاگرد ایسی ملازمت اختیار کریں جس سے ان کی صلاحیتوں کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ گورنمنٹ کالج ہی میں وہ پنجاب ایجوکیشنل سروس کے سینئر گریڈ میں آگئے تھے ۱۹۳۵ء کے اواخر میں وہ ڈیپوٹیشن پر مرکزی حکومت کے ریڈیو کے محکمہ میں آگئے۔ مرکزی حکومت سے ان کا یہ تعلق دسمبر ۱۹۴۶ء تک قائم رہا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں بخاری نے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس وقت کالج فسادات کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ طالبعلم اور اساتذہ سبھی ذہنی اور مادی افراتفری کا شکار تھے۔ پاکستان کی تشکیل کے دن قریب آرہے تھے۔ مسلمان افسروں کی سخت ضرورت تھی پاکستان کی زیر تشکیل مرکزی حکومت اور مسلم لیگ نے مسلمان افسروں کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی کوششیں سرکاری طور پر شروع کر دیں۔ پہلے تو پنجاب کی حکومت نے چند ایک کتابچے بخاری سے لکھوائے پھر جب تین جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کے مطابق اثاثوں کی تقسیم کے لئے کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تو آل انڈیا ریڈیو اور وزارت اطلاعات و نشریات کے اثاثوں کی تقسیم کی ذیلی کمیٹی میں بخاری کو حکومت پاکستان کا نمائندہ اور سربراہ مقرر کیا گیا۔(۵) اس کام کو بخاری نے بڑی سنجیدگی اور تن دہی سے کیا۔ اس دوران میں پاکستان میں نشریات کے قیام کے بارے میں بھی ان سے مشورے ہوتے رہے۔ ذوالفقار علی بخاری نے "سرگزشت" میں لکھا ہے کہ

"چوہدری محمد علی اور بھائی جان نے یہ طے کیا کہ فی الحال ریڈیو کا صدر دفتر لاہور میں قائم کر دیا جائے۔"

قیام پاکستان کے بعد چوہدری محمد علی سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے کم اگست ۱۹۴۷ء سے بخاری کو حکومت پاکستان کا جز وقتی مشیر برائے نشریات مقرر کیا۔ اس دوران میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔(۶)

انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے لئے بخاری کو لندن بھیجا گیا۔ وہ کئی ماہ وہاں مقیم رہے۔ لیکن بھارت کی ہٹ دھرمی اور برطانوی حکومت کی بندر بانٹ کی حکمت عملی کی وجہ سے کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں بخاری کو حکومت پاکستان کا کل وقتی مشیر برائے نشریات مقرر کرکے میکسیکو سٹی بھیجا گیا جہاں وہ پانچ ماہ تک مقیم رہے اور ریڈیو فریکوئنسی کی تقسیم کے بین الاقوامی اجلاس میں پاکستان کے تین رکنی وفد کی قیادت کی۔(۷)

خلیفہ عبد الحکیم کے قول کے مطابق چوہدری ظفر اللہ خان نے جو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے پروفیسر بخاری کو پہلے اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے منتخب کیا۔(۸) وہ جنرل اسمبلی کے چوتھے اجلاس کے لئے پاکستانی وفد کے قائد اگست ۱۹۴۹ء میں مقرر ہوئے۔(۹) اس کے بعد جون ۱۹۵۰ء میں انہیں اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل نمائندہ مقرر کر دیا گیا اس عہدے پر وہ ۱۹۵۴ء تک کام کرتے رہے۔

اسی دوران میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان امریکہ و کینیڈا کے دورے پر گئے۔ ان کی بیشتر تقریریں بخاری ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں جو Pakistan: Heart of Asia کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ کینیڈا کی پارلیمان میں ان کی تقریر ایسی معرکتہ الاراء تھی کہ اخبارات نے نہ صرف اس کے مندرجات بلکہ اس کی زبان پر بھی اپنے اداریوں پر تبصرہ کیا۔ وہاں کے معروف اخبار Ottawa Journal نے لکھا کہ "یہ تقریر تمام سیاستدانوں کے لئے ایک سبق کی حیثیت رکھتی ہے کہ تقریر کس قسم کی زبان میں کرنی چاہیے۔ انگریزی سیکھنی ہے تو بخاری سے سیکھئے۔

اقوام متحدہ میں اپنی جگہ بنانے کے لئے بخاری کو بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس انجمن میں شرکت سے قبل بخاری کو متعدد بار بین الاقوامی اجلاسوں میں شرکت کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا ۱۹۴۲ء میں انہوں نے افغانستان میں ایک خیرسگالی وفد کی قیادت کی' ۱۹۴۵ء میں دولت مشترکہ کی براڈ کاسٹنگ کانفرنس میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔ ۱۹۴۹ء میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے وہ میکسیکو سٹی میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے تھے۔ اقوام متحدہ میں حقوق انسانی کی کمیٹی میں پاکستانی مندوب کی حیثیت میں شرکت کی۔

اقوام متحدہ میں بہ حیثیت ایک سفارت کار ان کی مصروفیات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا' انہیں اقوام متحدہ کے اجلاسوں اور چھوٹی بڑی کمیٹیوں میں مختلف موضوعات پر تقریر کرنی پڑتی تھی اس کے لئے وہ پوری طرح تیاری کرتے اس کے علاوہ سماجی مصروفیات ان کی شامیں "غارت" کر دیتی تھیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"میں کاک ٹیل کا یوں منتظر رہتا ہوں جیسے کوئی آپریشن کا منتظر ہو کہ تکلیف بھی ہو گی لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ جس دن کاک ٹیل پارٹی ہوتی ہے۔ میری شام غارت ہو جاتی ہے دو گھنٹے مسکرا مسکرا کر کلے اکڑ جاتے ہیں۔"

ان کی سب سے اہم تقریر ۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو سلامتی کونسل میں تیونس کی آزادی کے مسئلہ پر فرانس

کے خلاف گیا۔ ثقافتی مفاہمت پر تھی جس نے انہیں عرب اور ایشیائی ملکوں کے قابل اعتماد ترجمان کی حیثیت عطا کر دی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ٹرسٹی شپ کمیٹی میں ایک پر زور اور مدلل تقریر میں بخاری نے فرانس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے خیالات اور رویہ میں تبدیلی پیدا کرے۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں اقوام متحدہ کی ایڈہاک سیاسی کمیٹی نمبر ۳ کے اجلاس میں نسلی امتیاز کی پالیسی کو اخلاقی لحاظ سے قابل مذمت قرار دیا۔ نومبر ہی میں گولڈ کوسٹ کا پڑوسی ملک ٹوگو لینڈ میں ضم کرنے کے عمل کو نو آبادیاتی ذہنیت کا کرشمہ قرار دیتے ہوئے اس کی تضحیک اور مذمت کی۔ تین دسمبر ۱۹۵۳ء کو خصوصی کمیٹی میں فلسطین کے سوال پر کمیٹی نمبر ۳ کی رکنیت میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۳ء کو فلسطین کے پیچیدہ مگر اہم مسئلہ پر قرارداد پر بحث کرتے ہوئے تین بڑوں کے رویئے پر طنز کے تیر برسائے اسی طرح دریائے اردن کے تنازعہ پر ایک خوبصورت اور موثر تقریر کی۔

ان تقریروں نے ان کی علمیت' انگریزی زبان و ادب پر دسترس اور حس مزاح کی دھاک بٹھا دی۔ نیویارک ٹائمز' کرسچن سائنس مانیٹر' نیویارک ڈیلی' شکاگو ٹریبون نے بخاری کو اقوام متحدہ کے بہترین مقرروں میں شمار کیا۔ اقوام متحدہ میں متعین نامہ نگاروں نے انہیں سب سے زیادہ خوش بیان' فصیح و بلیغ مقرر قرار دیا۔

اقوام متحدہ میں تقریروں کے علاوہ بخاری ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے بھی ملتے رہتے۔ ٹیلیویژن پر انٹرویو دیتے۔ جہاں جاتے یہ نمائندے انہیں تلاش کرتے۔ ایک خط میں مسئلہ تیونس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خدا نے اس بار مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی حیلہ باقی نہیں رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے مجھے وہ سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو این او میں کسی کو نصیب ہوا ہو...... ریڈیو اور ٹیلیویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں" اس جادوبیانی کا یہ بھی اثر ہوا کہ بہت سے ادارے انہیں تقریروں کے لئے مدعو کرتے ۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء کو گورنمنٹ کالج لاہور کے طلباء سے کشمیر کے مسئلہ پر خطاب کیا۔ ۷ اپریل ۱۹۵۴ء کو برنارڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے پچیسویں اجلاس میں افتتاحی تقریر کی۔ ۱۱ فروری ۱۹۵۴ء کو نیویارک میں ABC کے نمائندے John Mocvanec نے کشمیر کے قضیہ پر ٹیلیویژن انٹرویو لیا۔

۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کو ایک جلسے میں پاکستان کے لئے فوجی امداد کے موضوع پر مدلل تقریر کی اور اسے جنگ کے بعد بین الاقوامی تعاون کی اہم مثال قرار دیا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۵۴ء کو نیویارک ٹائمز کے یوتھ فورم میں تقریر کی جس کا موضوع تھا "جارحانہ جنگوں کے خاتمہ کی ضرورت"۔ Yale یونیورسٹی کے طلباء کو کشمیر میں استصواب رائے پر خطاب کے دوران ایک بھارتی طالبعلم نے بخاری کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ وہ خود کشمیری ہے اور نہیں چاہتا کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو۔ ہم بھارت کے ساتھ ہیں بخاری نے اس طالبعلم پر اپنی نظریں گاڑ دیں اور بڑی متانت سے بولے "اگر آپ کشمیر کے اکلوتے باشندے ہوتے تو آپ کا ووٹ یہاں اور اسی جگہ اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیتا مگر مصیبت تو یہ ہے کہ کشمیر میں چالیس لاکھ افراد بستے ہیں نہ سارے کے سارے Yale یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اور نہ انہیں اظہار رائے کی ایسی آزادی حاصل ہے۔"

اقوام متحدہ میں اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے ہفت روزہ "اقدام لاہور کو جو ۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو شائع ہوا۔ ایک انٹرویو میں کہا "میں رات میں صبح دو بجے سوتا ہوں۔ دن بھر کام کرتا ہوں اس کام میں وہ دو گھنٹے شامل نہیں جو میں نے روزانہ پڑھائی کیلئے مخصوص رکھے ہیں۔ پڑھتا ہوں' صرف پڑھتا ہوں' لکھتا نہیں

ہوں" اس لئے کہ کہیں تم مضمون کا مطالبہ نہ شروع کر دو' بے حد معروف آدمی ہوں' کبھی کبھار وقت نکال کر (تحریک پوری کرنے کے لئے) مختلف یونیورسٹیوں میں سیمینار میں لڑکوں کو لیکچر پلاتا ہوں۔ میرے ایک پروفیسر آئی اے رچرڈز سے جنہوں نے تنقید کے اصولوں پر ایک کتاب لکھی ہے (جو ایم اے انگریزی کے نصاب میں شامل تھی) اکثر ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان سے مل کر آجکل بھی سیکھتا ہوں۔ بے شمار اردو کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ ہر نیا رسالہ' ہر نئی کتاب' جو پاکستان میں چھپتی ہے مجھے التزاماً" ملتی ہے میرے پاس کئی ہزار کتابوں پر مشتمل اردو لائبریری ہے تمہارے لاہور کے اخبارات' کراچی کے اخبارات سب مجھے ملتے ہیں۔ سب ہی پڑھتا ہوں۔"

سفارتی دور میں بھی کتابوں سے یہ دلچسپی نیویارک ٹائمز کے نمائندے کی نظر سے اوجھل نہ رہی جو بخاری سے انٹرویو لینے کے لئے ان کی قیام گاہ پر آیا تھا اس نے اس اخبار کے سنڈے میگزین میں جو ۱۹۵۳ء کو شائع ہوا ایک تفصیلی مقالہ سپرد قلم کیا۔ اس نے لکھا کہ بخاری نیویارک میں دریا کے مشرقی کنارے ایک چھوٹی سی گلی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ یہ عزلت گزینی کی انتہا ہے۔ مکان میں سازوسامان بہت ہی سادہ اور معمولی ہے۔ کمروں میں جگہ جگہ کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ کہیں ایک' کہیں دوچار' کہیں ڈھیر کی ڈھیر۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قحط الرجال کی وجہ سے پاکستان کو ایک بلند پایہ عالم سفارت کی بھول بھلیوں میں لاکر چھوڑنا پڑا۔"

اس دور میں بھی طلباء سے بخاری کی دلچسپی برابر قائم رہی۔ پروفیسر حمید احمد خان جو اس زمانے سے کولمبیا یونیورسٹی میں استاد تھے بتاتے ہیں کہ بخاری صاحب اکثر ان کے پاس آ جاتے اور ان کے یہاں طالبعلموں سے مل کر بہت خوش ہوتے' خوب چہکتے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ پاکستان کی خدمت میں اتنے مصروف رہتے کہ انہیں اکثر و بیشتر علمی وادبی فضا سے دوری کا احساس بھی نہ ہوتا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو "نوائے وقت" لاہور میں شائع شدہ ایک مضمون "پاکستان اور اقوام متحدہ" میں لکھتے ہیں:۔

"جب کبھی شام کے وقت یو این سے باہر نکلتا ہوں اور وہاں ساٹھ قوموں کے جھنڈے دیکھتا ہوں اور ان ساٹھ جھنڈوں میں اپنے وطن کا جھنڈا سربلند نظر آتا ہے جو کسی سے بھی کوتاہ نہیں تو دل میں فخر محسوس ہوتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے عزیز ملک اور اپنی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے اور قوموں کے برابر بیٹھتا ہوں۔ اور مجھے بولنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا اوروں کو۔ ان کی شنوائی زیادہ ہو میری کم ہو یہ میری کارگزاری اور میرے اپنے ملک کی اپنی حیثیت اور دنیا کے سیاسی شطرنج پر منحصر ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی قوم کی طرف سے' اپنے ملک کی طرف سے' اپنے دل کا بخار تو نکالتا رہوں۔ آج دو آدمی میری بات سنتے ہیں۔ کل شاید چار سنیں گے' پرسوں شاید دس سنیں۔ اس طرح شاید میں اپنے ملک کا پیغام لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکوں۔"

بخاری نیویارک میں وطن کی خدمت میں مگن تھے۔ لیکن ان کے حلقہ احباب اور وطن میں ثقافتی اور ادبی حلقوں میں ان کی کمی بری طرح محسوس کی جارہی تھی۔ سید عابد نے ایک مضمون میں ان حلقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھا:۔

"وہ بے شک پاکستان کی بہت بڑی خدمت کررہے ہیں لیکن تعلیم کو تہذیب کو' شائستگی کو بلکہ زندگی کو ان کے یہاں نہ ہونے سے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اس کا مداوا کیا ہوگا؟ اس کا جواب شاید بخاری بھی

اپنی شیریں بیانی کے باوجود نہ دے سکیں گے۔ جن چیزوں کو نقصان پہنچا ہے ان میں سے ایک ظرافت یعنی Wit کا نام نہیں لیا کیونکہ جہاں تک اس صنف کا تعلق ہے وہ بخاری کے پاکستان سے باہر جانے کے بعد بالکل ہی معدوم ہو گئی۔" (لاہور ۱۳ اپریل ۵۳ء)

پاکستان ہی بخاری کو یاد نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ خود بخاری کو بھی وطن کی [illegible] یاد آتی تھیں۔ "اقدام" لاہور کے نمائندے کے سوال کے جواب میں کہ پاکستان سے باہر رہ کر آپ سب سے زیادہ کس چیز سے محرومی محسوس کرتے ہیں؟

بخاری نے بے ساختہ کہا "فالودہ"

پروفیسر حمید احمد خان نے ایک ملاقات میں بتایا۔

"نیویارک میں آم کیوبا سے آتے ہیں۔ لوگ انہیں سبزی کی طرح کچا ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں نے انہیں کمبلوں میں لپیٹ کر پکایا۔ ایک بار پورے ایک درجن پکے آم بخاری کو بھیجے۔ کچھ دنوں بعد ملے تو بولے "آم بھیجنے کو کس نے کہا تھا۔ کھاتے وقت تو بہت مزہ آیا مگر ساری رات پاکستان یاد آتا رہا اور میں سو نہ سکا۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۵۸)

اقوام متحدہ میں بخاری کے عہدے کی معیاد ۳۰ نومبر ۱۹۵۵ء کو ختم ہو رہی تھی۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی اور عالمگیر شہرت کے پیش نظر انہیں یہ پوری توقع تھی کہ انہیں اس عہدے پر مزید کام کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن حکومت وقت کی مصلحتیں، دفتری سازشیں جن سے وہ بے خبر تھے ان کی تاک میں تھیں اور جولائی ۵۴ء کے مہینے میں اعلان کر دیا گیا وہ ۳ ستمبر ۱۹۵۴ء کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ یہ اعلان ان کے اور ان کے بہی خواہوں کیلئے اچانک بھی تھا اور غیر متوقع بھی، بخاری اس اعلان سے دلبرداشتہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوستوں کے نام خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ان کی حالت ان کے ایک افسانے "عشق کی خودکشی" کے ہیرو جیسی تھی۔ جس نے کہا تھا۔

"میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی، میری آرزوؤں کے محل، میری توقعات کے قصر، میرے ارادے کے قلعے، سب بلند اور شاندار تھے۔ لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔(۱۱)

حکومت پاکستان کے اس اعلان کے بعد کہ بخاری کو سبکدوش کر دیا جائے گا۔ ۱۹ اگست ۱۹۵۴ء کو اقوام متحدہ کے دفتر نے اعلان کیا کہ بخاری کو انڈر سیکرٹری انچارج پبلک انفارمیشن کے نئے عہدہ پر یکم جنوری ۱۹۵۵ء سے فائز کیا جائے گا۔ یہ بین الاقوامی سطح پر بخاری کی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیمرشولڈ بخاری کی علمی صلاحیت، شیریں گفتاری، ذرائع ابلاغ سے تعلقات اور سفیروں سے خوشگوار روابط سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر بخاری کے لئے یہ نئی آسامی پیدا کی۔ اس پیشکش کے بعد بخاری نے طے کیا کہ وہ اکتوبر ۵۴ء میں قاہرہ ہوتے ہوئے وطن جائیں گے۔ وہاں تین ماہ گزار کر یکم جنوری کو اپنے نئے عہدے کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ اس پروگرام کے مطابق وہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو کراچی پہنچے۔ ہوائی اڈے پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ جس میں ان کے دوستوں، شاگردوں، اور مداحوں کے علاوہ عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔(۱۲) یہ پاکستان کے لئے ان کی خدمات کا ہم وطنوں کی طرف سے اعتراف تھا۔ اقوام متحدہ میں اس تقرری کے خلاف بھارت نے سخت

احتجاج کیا۔ بھارت کو یہ اعتراض تھا کہ بخاری پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے کشمیر جیسے متنازعہ مسئلہ پر یک طرفہ رائے کا بار بار اظہار کرتے رہے ہیں۔ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بھی اس تقریری پر لوک سبھا میں غم و غصہ کا اظہار کیا کشمیر کے بارے میں پنڈت نہرو کا رویہ منطق سے اتنا ہی دور تھا جتنے ان کے اجداد کشمیر سے قریب تھے۔ اسی لئے ایک بار بخاری نے سالک کو لکھا کہ "نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔" بخاری کے اس عہدے پر ان کا چراغ پا ہونا فطری ردعمل تھا۔ انہوں نے بخاری سے اپنے دیرینہ مراسم کا بھی پاس نہ کیا۔ ایشیاء کے ایک سپوت کی ترقی پر پنڈت جی کے اس ردعمل سے تیسری دنیا کے لوگ اور اقوام ایشیاء کے ساتھ ان کی ہمدردی کی قلعی کھل گئی۔ بھارتی مندوب کے اعتراض کے بعد عراق اور ناروے نے باقاعدہ یہ اعتراض کیا کہ ایسے افراد کا اقوام متحدہ کے اعلیٰ عہدہ پر تقرر جو کسی اختلافی مسئلہ میں فریق رہ چکے ہوں اس عظیم ادارے کے ضابطوں کی خلاف ورزی ہے۔ ان کے اس اعتراض اور استدلال سے صاف ظاہر تھا کہ اس پردہ زنگاری کے پیچھے کوئی نہ کوئی معشوق ضرور ہے کون ہے

من انداز قدت را می شناسم

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیرشولڈ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انتظامی کمیٹی میں یہ فیصلہ سنایا کہ "جن خدشات کا اظہار کیا گیا ہے اور جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سب کی سب نامناسب اور غیر ضروری ہیں یہ تقرری قواعد و ضوابط کے عین مطابق ہے۔"

ظاہر ہے بخاری پر یہ بھارتی حملہ اس لئے ہوا تھا کہ انہوں نے اقوام متحدہ اور اس سے باہر کشمیر کے سوال پر پاکستان کے موقف کو نہایت مدلل اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا تھا۔ ذرائع ابلاغ میں ان کے دلائل مقبول تھے وہ پاکستان کی حمایت کررہے تھے۔ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے سب لوگ قائل ہیں اور بیش از بیش کالم نویس ان کے معترف بنتے چلے جاتے ہیں لیکن کوئی بندۂ خدا ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا' سب اپنا الو سیدھا کرتے ہیں"

اقوام متحدہ کی آسامی قبول کرتے وقت قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ انہیں یہ آسامی ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرنی پڑی۔ بقول صوفی غلام مصطفیٰ تبسم "رکاوٹوں سے ان کی طبعی صلاحیتیں ابھرتی تھیں۔"(۱۳) یہ عجیب اتفاق تھا کہ وہ جتنی عمدہ کارگزاری دکھاتے ان کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا۔ پروفیسر حمید احمد خان نے نیویارک کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ۔

"مجھے ایک سہ پہر یاد آرہی ہے جب میں ان کے ساتھ تھا۔ اور ایک سربر آوردہ سفارتی شخصیت نے ان سے ملاقات کی۔ باتیں بڑی خوشگوار ہوئیں۔ جب وہ چلے گئے تو بخاری نے کہا دیکھئے مجھ سے ملتے وقت کتنی شیریں کلامی کا اظہار کیا ہے لیکن کمیٹی میں پہنچ کر میرے خلاف تمام حربے استعمال کرے گا۔"(۱۴)

ڈاگ ہیرشولڈ نے جس آسامی کے لئے منتخب کیا تھا اس کی اہمیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ دسمبر ہی میں بخاری کو یہ پیغام ملا کہ پہلی جنوری سے قبل ہی نیویارک پہنچنا ضروری ہے کیونکہ اسی تاریخ کو سیکرٹری جنرل ایک مشن پر چین جارہے تھے۔ اور ساتھ جانے والی جماعت میں بخاری بھی شامل تھے۔ نیویارک پہنچتے ہی انہوں نے عہدہ کا چارج سنبھالا اور ہوائی سفر کے لئے تیار ہوگئے یہ جماعت BOAC کے ایک چارٹرڈ طیارے میں نیویارک سے روانہ ہوئی۔ دو جنوری کی صبح یہ طیارہ کراچی پہنچا جہاں ان کا شایان شان استقبال

کیا گیا۔ کراچی میں دو گھنٹے مختصر قیام کے بعد طیارہ دلی کے لئے پرواز کر گیا۔

پنڈت نہرو نے اس جماعت کے اعزاز میں ظہرانہ دیا یہ ظہرانہ ایک پارک میں دیا گیا تھا وزیر اعظم ان کی کابینہ کے اراکین، سفارتی نمائندے اور معززین شہر موجود تھے۔ واپسی پر نیویارک میں ایک پریس کانفرنس میں جب بخاری سے سوال کیا گیا کہ دلی میں سیکرٹری جنرل کا بڑی بیدلی سے استقبال کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا استقبالیہ اور ظہرانہ میں تمام سفارتی ادب کا خیال رکھا گیا۔ ملاقات میں گرم جوشی مفقود تھی۔ جب ان سے ہندوستانی حکومت کے رویہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ ظہرانے میں وزیر اعظم کے علاوہ پرانے دوستوں، شناساؤں سے بھی ملاقات ہوئی ان میں سے اکثر کابینہ کے رکن تھے۔

یہ سفارتی مشن اقوام متحدہ کی ان کوششوں کا نقطہ عروج تھا جو یہ ادارہ ان گیارہ امریکی ہوا بازوں کی رہائی کے لئے کررہا تھا جو چین میں قید تھے۔ سیکرٹری جنرل اور چواین لائی کے درمیان یہ گفتگو اہم بھی تھی اور نازک بھی اسی لئے ڈاگ ہیمرشولڈ محتاط بھی تھے اور کچھ کچھ پریشان بھی، کہا جاتا ہے کہ چواین لائی سے ملاقات کے لئے جاتے وقت ہیمرشولڈ نے بخاری سے پوچھا۔ وزیر اعظم سے کس طرح بات کی جائے۔ بخاری نے فوراً جواب دیا یہ تو بہت ہی آسان ہے:۔

"Chew And Lie"

واپسی پر نیویارک میں ذرائع ابلاغ والوں نے بڑے گہرے اور معنی خیز سوالات پوچھے کیونکہ چین صحافیوں کے لئے بھی ایک نامعلوم جزیرہ تھا۔ وہاں کے سیاسی، سماجی، اقتصادی حالات کے بارے میں لوگوں کو بہت ہی کم معلوم تھا۔ جستجو سب ہی کو تھی۔ نہ سفارتی تعلقات تھے۔ نہ تجارتی نہ ثقافتی، بخاری نے چواین لائی کی شخصیت دو الفاظ میں اس طرح بیان کی کہ تمام صحافی عش عش کر اٹھے Chou is alert and intelligent (چواؤ چوکنے اور ذہین ہیں۔)

اقوام متحدہ کی کوشش کی ساری دنیا میں بہت عمدہ طریقہ سے تشہیر ہوئی۔ جس سے سیکرٹری جنرل مکمل طور پر مطمئن تھے۔ پہلا مرحلہ تھا اور بخاری سرخرو ہوئے۔ اطلاعات کا یہ محکمہ ابتداء ہی سے اہمیت اختیار کر گیا ان کی کوشش یہی تھی کہ ترقی پذیر دنیا کو آگاہ کیا جائے کہ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے ان ملکوں کے لئے کتنے مفید ثابت ہو سکتے ہیں تیسری دنیا کے ذرائع ابلاغ پر بخاری کی خصوصی توجہ تھی۔ اخبارات اور رسائل میں مضامین کے علاوہ اکثر ملکوں کو راضی کر لیا گیا کہ وہ اقوام متحدہ کا پروگرام یواین میگزین اپنی اپنی زبان میں نشر کریں۔ اسی کوشش کے تحت پاکستان میں یہ پروگرام پہلی بار ۷ فروری ۱۹۵۵ء سے لاہور ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوا۔ اس پروگرام میں بخاری کی افتتاحی تقریر بھی شامل تھی۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ایک کتاب بھی شائع کرائی۔ جس کا عنوان تھا "اقوام متحدہ کے مقاصد Aims of U.N" اس کتاب کا پیش لفظ بخاری کا لکھا ہوا ہے۔ تشہیر کے میدان میں ان کی کارگذاریوں کو نہ صرف سیکرٹری جنرل بلکہ اقوام متحدہ میں صحافیوں کی انجمن کی بھی مکمل تائید حاصل رہی۔ اس کے باوجود پبلک اطلاعات کے دفتر کے معاملات، انتظامی اور مالیاتی کمیٹیوں میں اکثر زیر بحث رہتے۔ یہ عجیب سا لگتا ہے کہ سیکرٹری جنرل مطمئن ہیں، صحافیوں کی انجمن کو کوئی شکایت نہیں مگر چند مندوب در پردہ سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ بخاری کو ان تمام باتوں کا علم ہے، وہ بھی محسوس کررہے ہیں کہ خوش گفتاری Wit اور علم و فضل، کوئی بھی خوبی ان اراکین کو مخالفت سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان کی باگ دوڑ کہیں اور ہے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس کشمکش اور

عوارض سے بخاری رفتہ رفتہ بے دست و پا ہوتے جا رہے ہیں۔ امتیاز علی تاج کو لکھتے ہیں۔
"میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں' بے بس اور دور افتادہ"
کام کی زیادتی' ذمہ داری کے احساس اور ہر لمحہ بڑھتے ہوئے ذہنی دباؤ کی وجہ سے بخاری کی صحت متاثر ہوئی۔ پرانے امراض عود کر آئے' اس حالت میں بھی بخاری نے فلاحی کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی' پروفیسر حمید احمد خان کا بیان ہے کہ ۔
"نیویارک میں بخاری صاحب نے فلاحی کاموں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ نابینا بچوں کی امداد کرتے تھے۔ وہاں ایک انجمن ہے جو نابینا بچوں کے لئے ریکارڈنگ کرتی ہے۔ اس میں دلچسپ تقریریں' ڈرامے شامل ہوتے ہیں بخاری صاحب نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے کئی اقتباسات اور سقراط کی آخری تقریریں ریکارڈ کرکے بغیر کسی نام کے بھجوا دیئے۔"(۱۵)
بخاری کی کامیابی میں ذہن کے علاوہ محنت کی عادت کو بہت زیادہ دخل حاصل تھا۔ ان کی خوبیوں میں متعدد زبانوں پر ان کا عبور بھی تھا۔ نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے لکھا کہ:-
"مختلف زبانوں پر عبور بخاری کو پشاور میں بچپن سے ہی حاصل ہو گیا تھا۔ اور یہ ملکہ عمر بھر انہیں حاصل رہا۔ وہ مقامی بولی ہندکو' فارسی' اردو اور پشتو بچپن سے بول رہے تھے۔ انہوں نے Cockney کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اقوام متحدہ کے اکلوتے سفارت کار ہیں جس نے استاد کی مدد سے Cockney (لندن کی مقامی بولی) سیکھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب لندن کے کسی ریستوران میں کوئی زبان میں میں گفتگو شروع کرتا ہوں تو وہ چونک پڑتے ہیں اس کے بعد آہستہ آہستہ مجھے تسلیم کر لیتے ہیں۔"(۱۶)
بخاری نے عمر کے اس مرحلہ پر اپنی تمام صلاحیتیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے وقف کر دی تھیں۔ لیکن لکھنے کا کام ختم کر دیا تھا۔ ۸ فروری ۱۹۵۳ء کو "اقدام" (لاہور) کے نمائندے کو بتایا کہ لکھتا اس لئے نہیں ہوں کہ کہیں تم مضمون کا مطالبہ نہ شروع کر دو یہ جملہ ان کے مزاح کا نمونہ نہیں بلکہ ان کی اس رائے کا مظہر تھا جو انہوں نے پاکستان میں شائع ہونے والے ادب کے بارے میں گہرے مطالعہ کے بعد قائم کی تھی۔ ان کے شاگرد' اور سفارت کار ڈاکٹر افضل اقبال نے اسپین کے دورہ کے موقع پر جب ان سے یہ سوال پوچھا کہ وہ اب لکھتے کیوں نہیں تو پہلے تو وہ خاموش رہے لیکن تھوڑی دیر بعد کہا کہ "میں "بانجھ" ہو چکا ہوں۔ میں اب کچھ نہیں لکھ سکتا۔ پاکستان میں صرف دو قسم کی کتابوں کی مانگ ہے۔ اسلام اور کوک شاستر۔ میں ان پر لکھنے سے قاصر ہوں۔"(۱۷)
اپنے ملک کے ادبی ماحول سے یہ بے اطمینانی کہاں تک جائز تھی یہ تاریخ ادب کے طالب علموں کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ بخاری نے ایک چوتھائی صدی تک ادب میں عملی دلچسپی لینے کے بعد نہ صرف یہ رائے قائم کی بلکہ اس پر آخری دم تک قائم رہے۔ بخاری نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شعر و شاعری بھی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ والد اور بڑے بھائی کے طفیل انہیں ایسا ماحول میسر آیا جس نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا دینے میں بڑی مدد دی۔ ادب سے ان کی دلچسپی ان کی افتاد طبع کے عین مطابق تھی۔
بخاری نے اپنی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز سول اینڈ ملٹری گزٹ سے کیا۔ وہ عموماً تنقیدی مضامین لکھتے۔ اس کے لئے انہوں نے Peter Watkins کا قلمی نام اختیار کیا تھا۔ یہ ایک لحاظ سے مشن اسکول

کے انگریزی ماحول سے قلبی تعلق کا اظہار تھا جس کے لفظ پیئر کے فرانسیسی تلفظ نے بگڑ کر اردو میں "پطرس" بنا دیا۔(۱۸) اس وقت سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر انگریز Mr. E. Hardy تھے وہ بخاری کو ایک کالم کا سولہ روپیہ ادا کرتے تھے جو اس زمانہ میں نصف تولہ سونے کی قیمت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔

"پطرس" کا قلمی نام سب سے پہلے انہوں نے رسالہ "کہکشاں" کے ایک سلسلہ مضامین پرانی کہا اور ان کے خیالات کے لئے استعمال کیا۔(۱۹) فکر انگیز مقالوں کے علاوہ بخاری نے ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنے لئے نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ شعر کہے مگر بعد میں کہتے رہے کہ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔ افسانے لکھے۔ تراجم کئے۔ تنقیدی مضامین تحریر کئے۔ فلسفہ کا میدان ان کے لئے موزوں نہیں تھا لیکن فرانسیسی فلسفی برگساں کی کتاب Laughter نصاب میں تھی اور افتاد طبع کے مطابق بھی وہ اپنے طلباء کو اس کتاب پر خوبصورت لیکچر دیتے۔ کنہیا لال کپور نے لکھا ہے کہ کتاب Laughter کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کلاس کو بتایا:۔

"انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے۔"

"بندر بھی ہنستا ہے" کپور نے لقمہ دیا۔ "کیونکہ وہ انسان کا جد امجد ہے" بخاری نے ہنس کر فرمایا۔(۲۰) برگسان ایک ایسا فلسفی ہے جسے ۱۹۲۷ء میں ادب کا نوبل انعام ملا۔ وقت کے بارے میں اس کا نظریہ بھی انقلابی نوعیت کا ہے بخاری برگساں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انہوں نے برگساں کے فلسفہ پر ایک مضمون لکھا۔ جس میں اس کے "فلسفہ خنداں" کے اسرار و رموز بیان کئے گئے۔(۲۱) یہ مقالہ علامہ اقبال کی نظر سے بھی گذرا۔ انہوں نے اس مقالہ کو ایک فلسفی کے نقطہ نظر سے دیکھا اور بخاری کو فلسفی تو نہیں محض فلسفہ زدہ ہی سمجھا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:۔

"بخاری صاحب نے اس رات یہ دلچسپ بات بھی سنائی کہ ضرب کلیم میں اقبال کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کے نام"...... یہ نظم اقبال نے انہی کو مخاطب کرکے لکھی تھی بخاری صاحب کہنے لگے۔ نظم کا آخری شعر

"چوں دیدہ راہ بیں نہ داری   قائد قرشی بہ از بخاری" پڑھ کر میں نے سالک صاحب سے کہا ڈاکٹر صاحب نے کمال کر دیا ہے دوسرے مصرعے میں میرا نام بخاری بھی لے آئے ہیں۔ سالک صاحب نے جواب دیا نام تو آپ کا پہلے بھی موجود ہے' میں نے پوچھا کیوں کر۔ کہنے لگے دیکھئے نا علامہ نے فرمایا ہے۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا

"تو کھوتا" (گدھا) یقیناً آپ ہیں۔(۲۲)

پطرس کی تحریریں اپنے زمانہ کے موقر رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کی بیشتر تحریریں "کاروان" "نیرنگ خیال" "کہکشاں" "مخزن" اور "راوی" میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ پطرس کے مضامین کے عنوان سے شائع ہوا اور آج تک ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا ہے ان کے انگریزی مضامین رسالہ "راوی" میں گورنمنٹ کالج کے صد سالہ جشن کے موقع پر یکجا کر دیے گئے۔ یہ مجموعہ مکمل نہیں ہے ان کے خطوط بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ خطوط اور اردو مضامین کا ایک مجموعہ کلیات پطرس اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

بخاری کی زندگی میں بھی اکثر احباب کو ان کے مضامین یکجا کرکے شائع کرنے کا خیال آیا۔ لیکن یہ منصوبہ اکثر انہی کی بے نیازی کی نذر ہوتا رہا۔ روایت یہ ہے کہ ایک بار عبد المجید سالک نے کہا کہ آپ اپنے مضامین جمع کرکے شائع کریں اور نام رکھیں "صحیح بخاری" اس پھبتی سے احباب لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ بخاری نے بڑی سنجیدگی سے کہا آپ بھی اپنا کلام یکجا کریں۔ اس کا عنوان ہوگا "کلام مجید" اس طرح کی نوک جھونک ان کے قریبی دوستوں تک ہی محدود رہتی جن میں مہر سالک' حفیظ' تاثیر' ہری چند اختر' میکش' صوفی تبسم' فیض احمد فیض شامل تھے۔ جب مہر اور سالک روزنامہ "زمیندار" سے بوجوہ علیحدہ ہوئے تو انہوں نے ایک روزنامہ "انقلاب" جاری کیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس نے ہندوؤں کے مقابلے میں دلائل سے جنگ لڑنے کی ابتداء کی۔ کہنہ مشق صحافی اور ادیب مولوی محمد سعید کا بیان ہے کہ "اس کی پشت پر نوجوان شعرا کا ایک گروہ تھا (جس میں بخاری بھی شریک تھے)(۳۳)

پطرس کے مضامین کی اشاعت سے بخاری اردو مزاح نگاری میں ایک منفرد مقام کے حامل قرار پائے۔ اس کتاب کی خصوصیات کے حوالہ سے نقادوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

وہ ظرافت کو ظرافت کے سہارے قائم رکھتے ہیں۔	رشید احمد صدیقی
بخاری کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
اس کے خامہ کی آواز نوائے موسس ہے۔	محمد احسن فاروقی
پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی طرز کی ہے۔	نیاز فتح پوری
پطرس مزاح نگاری کے جملہ لوازم سے واقف تھے۔	اثر لکھنوی
بخاری صاحب ادب برائے ادب کے وکیل۔	فیض احمد فیض

بخاری کی تحریروں میں جمالیات اور رومانیت کا ایک لطیف رنگ از اول تا آخر جھلکتا رہتا ہے۔ وہ جب انگلستان سے فارغ التحصیل ہوکر واپس آئے تو آسکر وائلڈ کی جمالیات کی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ یہ تحریک ان کے لئے یوں پرکشش تھی کہ اس میں خیال اور اظہار میں جدت اور خوبصورتی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے لیکن جمالیات اور جمال پرستی میں بال برابر فرق ہوتا ہے' بخاری حسن کا پیکر عورت کو اور تمام علوم و فنون کی بنیاد بنت حوا کو قرار دیتے۔ کالج کے ایک مباحثہ میں جو صنف نازک ہی کے بارے میں تھا انہوں کہا "صنف نازک ہی مطالعہ کا اصل موضوع ہے......... آج فنون لطیفہ ختم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ کے اصل موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔" ایک نوجوان کی حیثیت سے سفر انگلستان سے قبل بھی بخاری صنف نازک میں دلچسپی لیتے نظر آئے ہیں۔ ایک خط میں وینس کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "عورتیں نہایت حسین' خوش اخلاق خوش سلیقہ ہیں" اسی خط میں لکھتے ہیں "ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ نہیں جس کا نام لے کر میں تم سے کہوں کہ وینس اس سے دس ہزار گنا ہوس انگیز ہے دن بھر San Marco (وینس کا ایک بہت مشہور چوک) میں کھڑا اپنی آنکھوں کی ساقی گری کرتا رہا۔" انگلستان سے واپسی کے بعد اس جذبہ کو ایک نظریاتی بنیاد بھی فراہم ہو گئی۔ اسی لئے بخاری کی ذات کے ساتھ متعدد اسکینڈل وقتاً" فوقتاً" منسوب ہوتے رہے۔ اقبال سنگھ نے مشہور سکھ خاتون مصور امرتا شیر گل پر جو کتاب لکھی اس میں بخاری کا بھی ذکر ہے۔ کہ کس طرح انہوں نے اس کی تصاویر اور فن پر ایک عمدہ مقالہ لکھا

اور فن کاروں کے قریب آنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ جنگ عظیم کے دوران دلی میں ریڈیو کی سربراہی کے دوران بھی ان کے خلاف ایک خاتون کی شکایت پر باقاعدہ انکوائری ہوئی۔ یہ انکوائری مشہور مورخ اور سینٹ سٹیفن کالج دلی کے پروفیسر T. P. Spears نے کی جو اس وقت اطلاعات کے محکمے میں ڈپٹی سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس الزام سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا انہیں اسی زمانے میں ان کی خدمات کے صلے میں C. I. E خطاب ملا۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے اسپین کی ایک خاتون پروفیسر کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔(۲۴)

بخاری کو اردو ادب سے جو قلبی وابستگی تھی وہ آخر دم تک قائم رہی۔ ذوالفقار علی بخاری لکھتے ہیں۔

"مرنے سے کچھ عرصہ قبل میرے بھائی نے مجھے نیویارک سے ایک بڑے مزے کا خط لکھا اس میں تحریر فرمایا کہ میں امریکہ کے ایک بہت بڑے شاعر کو غزل کی روایات سمجھا رہا تھا۔ معاملہ کچھ چل نکلا اور وہ کچھ کچھ غزل کی تاریخی اہمیت سمجھنے لگا۔ مجھ سے کہا بہت خوب اب کوئی غزل سناؤ اور اس کا انگریزی ترجمہ کرو۔ میں نے انعام اللہ خان یقین کی غزل کا مطلع پڑھا۔

نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گذری　　ہمارے توبہ کرلینے سے پیمانے پہ کیا گذری

"اب کے سال" پر آکر میری انگریزی ختم ہو گئی اور مجھے ان تین لفظوں کی اس قدر وضاحت کرنی پڑی کہ رات کے بارہ بج گئے ظاہر ہے "اب کے سال" کوئی جنتری کا سال تو ہے نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔(۲۵)

بخاری کو ادب کے علاوہ فنون لطیفہ کی مختلف انواع سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ موسیقی سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا جو ریڈیو میں ان کے لئے مفید ثابت ہوا۔ مشن سکول میں داخل ہوئے تو انگریزی نظمیں سنانے پر خصوصی توجہ دی۔ انگریزی نظم خوانی کہنے کو تحت اللفظ ہوتی ہے لیکن اس کو بھی موسیقی سے اس طرح ہم آہنگ کر لیا ہے کہ بچوں کو ابتداء ہی سے بنیادی سروں اور تال سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ مشن سکول میں نظم خوانی کرنے والے احمد شاہ میں یہ احساس پوری طرح جاگزیں ہو چکا تھا۔ اس احساس کو تھیٹر دیکھنے اور کرنے کے شوق نے تیز تر کر دیا تھا یہ وہ دور تھا جب مکالمے بھی گائے جاتے تھے اور گانے بھی خود ہی اداکاروں کو گانے پڑتے تھے۔ پس پردہ موسیقی ابھی رائج نہیں ہوئی تھی۔ نہ فلموں میں نہ تھیٹر میں۔ اس لئے ہر اداکار کے لئے موسیقی سے شد بد ضروری تھی۔ بخاری کو موسیقی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے واقفیت تھی جو ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ کنہیا لال کپور لکھتے ہیں کہ "ایشیائی عوام کی مبالغہ پسندی کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کہا کرتے تھے کہ "ہم ہندوستانی مدہم کی بجائے پنچم میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔(۲۶) مدہم اور پنچم ہماری سپتک کے دو بنیادی سر ہیں۔ امتیاز علی تاج کو کیمرج سے ایک خط میں انگریزی فلم Light Of Asia کا ذکر کرتے ہوئے اس کی موسیقی کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں کہ "موسیقی پر خاص توجہ ہے......... جو موسیقی بجتی ہے اس میں بھیرویں کی بے شمار تانیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ یوں بھی آرکسٹرا کے سارے پروگرام میں ہندوستانی راگوں کا رنگ نمایاں ہے۔ ہندوستانی موسیقی پر جامع تبصرہ یوں کیا ہے کہ ہندوستانی موسیقی میں سوز ہے جوش نہیں۔(۲۷) کلاسیکی موسیقی میں بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیمرج میں اپنے استاد کولر کوچ سے بھی کیا۔ اس کا حال کنہیا لال کپور کے الفاظ میں سنئے بخاری کی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے

کہتے ہیں۔

"کیمرج میں ایک بار میں نے اپنے استاد کولر کوچ کو پکے گانوں کے چھ سات ریکارڈ سنوائے۔ اس کے بعد ان کی ہندوستانی موسیقی کے بارے میں رائے دریافت کی۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے "بور کرنے کے لئے ایک ہی ریکارڈ کافی تھا آپ نے چھ سات سنوانے کا خواہ مخواہ تکلف کیا۔(۲۸) ایک مضمون کے چند جملے موسیقی کے حوالہ سے

"نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔ تم جاگو موہن پیارے"

"وارفتگی جذبات" میں موسیقی کا ذکر جذبات کی وارفتگی کا اظہار ہے۔ "رباب کی سادہ موسیقی رات کی تنہائی میں، دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے..... رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے اور گیت میں لے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔"(۲۹)

ایک اور مضمون "آئینہ دل" میں اسی رباب کے تاروں سے جذبات کے تاروں کو یوں آئینہ دکھاتے ہیں۔

"گیت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بے قراری، ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے تحاشا اور بے تابانہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں جب بربط کی جان نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔"(۳۰)

وینس کی سیر کرتے ہوئے جب کشتی میں دوسروں کا نغمہ سنتے ہیں تو لکھتے ہیں "حفیظ صاحب کی نظمیں وینس میں بہت یاد آئیں مثلاً کشتی میں سوار ہو کر میں "گنگو تری سے نکلی" گاتا رہا۔

نقوش کے لاہور نمبر میں سید عابد علی عابد نے پطرس کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر مقرر ہوئے تو ان کے گھر قوالی اور سرود کی بڑی معرکہ کی محفلیں منعقد ہوئیں۔"

بخاری کی موسیقی سے دلچسپی صرف سننے تک ہی محدود نہیں وہ اس کا علم بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی باقاعدہ استاد سے، ایک بار یہ کوشش بھی کی۔ اس کا حال "سرگذشت" میں یوں بیان کیا گیا ہے "بھائی جان مرحوم اور میں دونوں وشنو ڈگمبر کے لاہور والے سکول میں داخل ہوئے تاکہ دیکھیں تو سہی یہ لوگ کیا کرتے ہیں مگر چند ہی دنوں میں لاحول پڑھ کر باہر آگئے۔ اب کون بیٹھ کر بھجن گاتا اور وہ بھی بے سرے استاد کی آواز میں آواز ملا کر"

موسیقی سننے کا شوق بخاری کو اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ انہیں فارسی کلام سننے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ سرگذشت میں حبیب تنویر (بھارتی سبھا کے کارکن اور عوامی تھیٹر کے معروف منتظم) کی ریڈیو سے ابتدائی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے ذوالفقار علی بخاری لکھتے ہیں۔

"حبیب تنویر کی شعر خوانی کا یہاں تک چرچا ہوا کہ بھائی جان مرحوم اور فیض ان سے حافظ کا کلام سننے بمبئی آئے بھائی جان مرحوم مرتے دم تک کہتے رہے کہ حافظ کا کلام اور حبیب تنویر کا ترنم یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عرفان کی بارش ہو رہی ہے۔"

بخاری کو مصوری سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ تھا۔ انہیں نہ صرف اچھی بری تصویر کی پہچان تھی بلکہ وہ فن مصوری کے اسرار و رموز سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ صنف نازک کی اہمیت پر کالج کے ایک مباحثے

میں مغربی مصوروں کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں۔

"اگر لیونارڈ' رافیل اور مائیکل انجلو نے عورت کے خدوخال کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو کیا وہ ان لافانی تصاویر اور مجسموں کو تخلیق کر سکتے تھے۔"(۳۱)

امرتا شیر گل کے فن پر بخاری کی تحریر کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مصوری میں اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے عبد الرحمٰن چغتائی کو حلقہ یاراں میں داخل کر لیا تھا۔ انہیں اکثر و بیشتر قیمتی مشوروں سے نوازتے۔ صوفی تبسم نے ایک بار مجھ سے یہ کہا کہ ایک بار بخاری صاحب نے چغتائی کو یہ مشورہ دیا کہ اچھے مصوروں کی طرح وہ انسانی خدوخال کی تصویر کشی میں مہارت حاصل کریں۔ خواتین کو اچھے سارے کپڑوں میں ملبوس کرنے سے پہلے Nude پر مشق کریں۔ چغتائی اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے دو چار روز بعد ایک Nude لے کر آئے' بخاری نے دیکھا اور بولے اگر یہی Nude ہے تو انہیں اچھے اچھے کپڑوں ہی میں چھپا کر رکھیے۔ چغتائی کے فن کے' وہ نہ صرف قدردان تھے بلکہ انہیں متعارف کرانے کے لئے بھی ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ان کو مشوروں سے بھی نوازتے اور ان کی مالی امداد کے لئے بھی سعی کرتے۔ ایک خط میں چغتائی کو لکھتے ہیں۔

"مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ لکھنے والے یعنی Wood صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور طالب علم اور نقاد ہیں اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں...... علاوہ بریں بمبئی کے اہل فن میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور اکثر تصویروں کی نمائش میں کھنڈاں والا' مسز داویا اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔ جو جو آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہ راست ان کو بھیج دیں خواہ میری معرفت۔"

بخاری کی صلاحیتوں میں سب سے اہم ان کی مستعدی اور محنت تھی۔ صوفی تبسم کا کہنا تھا کہ وہ "معمولی اقدام کے لئے بھی کئی دنوں تک غور کرتے رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے سوچتے تھے....... ان کا مقولہ تھا کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ چسکا ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے تو ایسے ذوق و شوق سے کیا کرتے کہ گویا انہیں اس کا چسکا ہے۔"(۳۲)

پطرس کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اقوام متحدہ میں متعین صحافیوں سے وقتاً" فوقتاً" سیکرٹری جنرل سے ملاقات کا اہتمام کرتے رہیں۔ اپریل ۱۹۵۸ء میں سیکرٹری جنرل نے چند صحافیوں کو ظہرانہ پر مدعو کیا تھا۔ اس دعوت کے دوران بخاری پر دل کا دورہ پڑا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ڈاکٹروں نے Thromboisis تشخیص کیا وہ نیویارک کے ایک ہسپتال میں مسٹر براؤن کے فرضی نام سے داخل ہوگئے۔ لیکن ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے کام میں معمول کے مطابق مصروف ہوجاتے۔ وہی گہما گہمی' وہی ذہنی دباؤ جس کی بخاری میں کوئی کمی نہ تھی۔ اس اعلیٰ منصب پر ان کی تقرری چند ملکوں کی آنکھوں میں بری طرح کھٹک رہی تھی۔ ان کے نمائندے اس ٹوہ میں لگے رہتے کہ کس طرح تعلق عامہ کے اس شعبے میں کیڑے نکالے جائیں' کس طرح اس شعبے کے واجبات میں معتدبہ کمی کر دی جائے۔ ان کی یہ کوشش ڈاگ ہیمر شولڈ کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ اقوام متحدہ کی پانچویں کمیٹی بجٹ میں کمی نہ کرا سکی مگر اس نے اس شعبے میں خرابیوں کا ایسا ڈھنڈورا پیٹا کہ ان کی خرابیوں کی نشاندہی کے لئے ایک انکوائری شروع کرادی۔(۳۳) جس سے بخاری کے ذہنی دباؤ میں مزید اضافہ ہوگیا دل کا یہ مرض نیا نہیں تھا۔ ۱۹۲۲ء میں جب وہ سرکاری ملازمت

ہیں آئے تو ان کے میڈیکل سرٹیفکیٹ میں سول سرجن نے لکھا کہ

"There is functional murmur in the mitral area of heart"

دل کی یہ خرابی جس احتیاط کی متقاضی تھی وہ بخاری کی زندگی کے معمولات سے کسی طرح ہم آہنگ نہ تھی۔ خلیفہ عبد الحکیم نے بتایا کہ "کالج چھوڑنے کا بہانہ یہ تھا کہ ان کا سرطان کا آپریشن ہوا ہے۔ اور انہیں مغربی ممالک میں علاج کی سخت ضرورت ہے۔"(۳۴)

سرطان کا ذکر کسی اور نے نہیں کیا البتہ بخاری نے سالک کے نام جولائی ۱۹۵۰ء میں ایک خط میں لکھا ہے کہ "یہاں پہنچا تو ذیابیطس کی شکر اپنے ساتھ لایا............. ٹیکے پچکاریاں اور قطرہ پیمائیاں' دن رات' اس نوع کے شیشہ آلات کی نذر ہو گئے" بیماری پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی گئی۔ دل کے دورے بار بار پڑنے لگے وہ اکثر بے ہوش ہو جاتے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان ٹائمز (لاہور) کے نمائندے Marcelle Hitschmannc نے لکھا ہے کہ اگر ان کے ذہن پر دباؤ نہ ہوتا تو شاید وہ چھ ماہ یا سال دو سال اور زندہ رہ جاتے وہ آخر میں تو زندگی سے اتنے بددل ہو چکے تھے کہ اپنے ڈاکٹروں سے جو ان کے دوست بن چکے تھے اکثر پوچھتے۔ "مجھے چھٹکارا کب ملے گا کس روز" ان کی زندگی احتجاج اور افسردگی کا مجموعہ تھی۔

بخاری کی دل شکستگی اور ذہنی کوفت کا سلسلہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب بنتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اپنوں نے ابتداء کی تھی۔ ان کی شہرت' وطن پرستی اور سفارتی کامیابیوں نے حاسدوں اور بداندیشوں کا گروہ پیدا کر دیا تھا۔ انہیں اپنی صلاحیتوں اور کارکردگی کی داد ملنے کی پوری توقع تھی جو رفتہ رفتہ خوش فہمی میں تبدیل ہو گئی۔ وزارت خارجہ یا حکومت میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو ان کے ساتھ انصاف کرتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں بھی عجیب خوش فہم ہوں۔ اب تک یہی غرہ تھا کہ اس عہدے پر ہم نے وہ خدمت گذاری کی ہے۔ اور رستم کی گور پر وہ لات ماری ہے کہ ہمیں یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آئے گا۔ لیکن ملازمت تو ایک چکی ہے۔ چکی میں دانے کی کیا حیثیت ہے چاہے تو پسے اور چاہے تو نہ پسے۔ عرض و معروض توکی ہے۔ دیکھئے کیا حشر ہو آپ جانتے ہیں میں عمر بھر جنبہ داری سے دور رہا ہوں۔ محض خدمت گذاری اور خدا پر اعتماد رہا ہے۔ کون ہے جو اپنی مصلحتیں چھوڑ کر میری بہبودی کا بیڑہ اٹھائے"

بخاری نیویارک آئے تو ان کی تنہائیوں میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔ نہ گھریلو آرام نہ آسائش' نہ کھانا نہ ناشتہ دو اپارٹمنٹ تبدیل کئے۔ ملازم کوئی نہ تھا۔ ایک خط میں سالک کو لکھتے ہیں "کھانا بھی باہر کھاتا ہوں بجز صبح کے ناشتہ کے چنانچہ انڈا پکانے میں مہارت حاصل کر لی۔" ستمبر ۱۹۵۱ء میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور ایک حبشی کو ملازم رکھ لیا۔

کمزوری بڑھتی گئی۔ مگر دفتر جانا نہ چھوڑا۔ گھر میں تھا کیا' نہ کوئی عزیز نہ بیٹا نہ بیوی۔ دفتر ہی ایسی جگہ تھی جہاں دل لگنے کے اسباب پیدا ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر دل کی حالت دیکھتے اور مکمل آرام کا مشورہ دیتے بخاری دل کی گھبراہٹ سے ڈرتے اور دفتر کا رخ کرتے۔ چار دسمبر ۱۹۵۸ء کو وہ ڈاکٹروں کے مشوروں کو پس پشت ڈال کر بستر سے اٹھے اور چلنا پھرنا شروع کر دیا تھوڑی دیر بعد بے ہوش کر گر پڑے۔ نرس اور آکسیجن کا اہتمام ان کے مین ہٹن کے فلیٹ میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ ڈاکٹر آیا کچھ دوائیاں دیں۔ رات کے پہلے پہر

طبیعت سنبھلی تو ڈاکٹر نے بچے شیکسپیئر سے لگاؤ تھا بخاری صاحب سے اجازت لی اور جاتے ہوئے شیکسپیئر کے یہ الفاظ دہرائے "اچھے شہزادے خدا حافظ" رات آرام سے گزرتی گئی لیکن صبح ساڑھے پانچ بجے نرس نے ڈاکٹر کو فون کیا کہ مریض کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئے اور سوا چھ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی کہ "انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے کہ اس کے مر جانے کے بعد کچھ غلغلہ ہوگا۔ کوئی تھامے گا۔ کوئی اٹھائے گا۔ کوئی روئے گا۔ کوئی چلائے گا۔"(۳۵)

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر اقوام متحدہ میں پہنچ گئی۔ کراچی ان کے اہل خانہ کو مطلع کیا گیا۔ بخاری کے چھوٹے بھائی سید ذوالفقار علی بخاری نے فون پر نیویارک میں پاکستانی سفارت خانے کو اطلاع دی کہ لاش کراچی بھیجنے کی ضرورت نہیں انہیں نیویارک ہی میں سپرد خاک کر دیا جائے۔ میاں محمد شفیع کا کہنا ہے کہ بیگم بخاری کا فیصلہ تھا۔(۳۶)

بخاری کا تابوت پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر پاکستان ہاؤس میں عام دیدار کے لئے رکھ دیا گیا۔ تابوت کے ایک جانب پاکستان کا پرچم اور دوسری طرف اقوام متحدہ کا پرچم تھا۔ دونوں ہی احترام میں سرنگوں تھے۔ تابوت طرح طرح کے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سفید پھولوں کی ایک چادر سب سے نمایاں تھی جس کے ایک گوشے میں لکھا تھا "آپ کا مخلص دوست پرنس علی خان" اقوام متحدہ کی طرف سے تعزیتی تقریب ہوئی۔ جس میں ڈاگ ہیمرشولڈ اور پرنس علی خان نے مختصر مگر جامع تقریریں کیں۔ ڈاگ ہیمر شولڈ نے کہا "جدید نسل کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر وہی فضائل و مکارم پیدا کرے جو بخاری کی شخصیت میں آشکارا تھے۔"

تعزیتی تقریب کے بعد نیویارک میں مقیم ایک عرب نژاد باشندے خلیل عیسیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تابوت ایک جلوس کی صورت میں نیویارک سے تیس میل دور Valwalla کے Kesico قبرستان لے جایا گیا۔ جہاں سینکڑوں مداحوں، دوستوں اور سفارتی نمائندوں کی موجودگی میں یہ تصویر قبر کے چوکھٹے میں جڑ دی گئی۔

بخاری صاحب جب پاکستان سے رخصت ہوئے تو سید عابد علی عابد نے ایک مضمون میں لکھا۔

"جن چیزوں کو نقصان پہنچا ہے ان میں، میں نے قصداً طرازی یعنی Wit کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ جہاں تک اس صنف کا تعلق ہے وہ بخاری کے پاکستان سے باہر جانے کے بعد بالکل معدوم ہو گئی۔"(۳۷)

اور جب بخاری دنیا سے رخصت ہوئے تو پرنس علی خان نے اقوام متحدہ کی کمیٹی نمبرا کے اجلاس میں فرمایا

"ان کے رخصت ہونے سے اقوام متحدہ کے ایوان سنسان ہو چکے ہیں"

اقوام متحدہ کے ایوان ہر چند سنسان تھے لیکن بخاری کے الفاظ گونج رہے تھے "میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں آرام و سکون میرے نامکمنات سے ہے نہ مجھے اس وقت ناصح مفید ہو سکتا ہے نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔"(۳۸)

ان کی اس تنہائی میں شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا۔ ان کی شادی والدین کی مرضی اور زمانہ کے دستور کے مطابق پشاور میں زبیدہ خاتون سے ہوئی جن کے والد محکمہ پولیس کے افسر خان بہادر عبد اللہ تھے۔ زبیدہ خاتون پرانے رسم و رواج کی پابند تھیں۔ ان سے پطرس کی ذہنی ہم آہنگی ممکن نہ تھی۔ "سرگذشت":

ذوالفقار علی بخاری نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہماری بھابھی پرانے فیشن کی خاتون ہیں۔ انگریزی سے نابلد انگریزی طور طریقوں سے ناآشنا"۔(۳۹) ان کے بطن سے دو صاحبزادے منصور بخاری اور ہارون بخاری پیدا ہوئے۔ بخاری کے گھر سے باہر کی مصروفیات اور طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ان کے لئے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کماحقہ دلچسپی لینا ممکن نہ تھا لیکن چھوٹے بیٹے ہارون بخاری کے نام ایک خط میں بچوں کی تربیت جس نہج پر ہوئی تھی اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"پہلی نصیحت تو یہ ہے کہ قانون شکنی نہ کرنا........ تمہیں غنڈوں اور بدمعاشوں کی صحبت نصیب ہی نہیں ہوئی۔ دوسری بات کا تعلق خواتین سے ہے۔ اس معاملہ میں عمدہ تربیت اور صالح اقدار تمہاری رہنمائی کے لئے کافی ہیں....... ہاں اگر تم میں یہ اقدار موجود ہی نہ ہوں تو میرے سینکڑوں خطوط بھی تمہیں اس کا احساس نہیں دلا سکتے۔ وقت گذرتا جائے گا اور ہمارے نام تمہارے خطوط کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی...... اپنی امی کو خط برابر لکھتے رہنا۔ تم ان کے لئے اس سے کہیں زیادہ اہم ہو جتنی تمہاری امی تمہارے لئے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں تمہاری زیادہ ضرورت پڑے گی۔ ہو سکتا ہے تمہیں ان کی ضرورت نہ پڑے۔ اپنے دل میں ان کے لئے نرم گوشہ ضرور رکھنا۔ اور ان کی دل شکنی نہ کرنا۔"

بیوی اور بچوں کے ساتھ اتنی شیفتگی، محبت اور شفقت کے باوجود یہ معمہ حل طلب ہے کہ وہ نیویارک میں تنہا کیوں رہے یا تنہا رہنا پسند کیوں کیا۔ آخری وقت بجز ایک کرایہ کی نرس ان کے سرہانے کوئی اپنا نہ تھا۔ انہیں اہل خاندان کی خواہش پر نیویارک ہی میں دفن کر دیا گیا۔ کسی عزیز نے ان کا آخری دیدار تک نہ کیا۔ فیض نے شاید ان ہی کے لئے کہا تھا۔

گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلئے تو ہرگام پہ غوغائے سگاں ہے

(زیر تصنیف کتاب "پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری ریڈیو میں" کا پہلا حصہ)

حواشی

۱۔ کرنل غلام سرور نے کسی غلط فہمی کی بناء پر "پطرس ایک مطالعہ" کے صفحہ نمبر۱۸ پر نام پیر سید اللہ شاہ بخاری۔ تحریر کیا ہے۔

۲۔ نیویارک ٹائمز سنڈے میگزین مورخہ ۱۹ اپریل مارچ ۱۹۵۳ء۔

۳۔ پطرس بخاری مرحوم نقوش نمبر ص ۸۰۔

۴۔ ڈائری آف اے ڈپلومیٹ از ڈاکٹر افضل اقبال۔

۵۔ رپورٹ: اثاثوں کی تقسیم مطبوعہ حکومت ہند پارٹیشن سیکرٹریٹ۔ نئی دہلی۔
۶۔ گزٹ آف پاکستان مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء۔
۷۔ پاکستان گزٹ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۴۸ء۔
۸۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ دسمبر ۱۹۵۸ء۔
۹۔ پاکستان گزٹ مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء۔
۱۰۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء
۱۱۔ مخزن جون ۱۹۱۱ء۔
۱۲۔ روزنامہ ڈان۔ کراچی ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۴ء۔
۱۳۔ پطرس بخاری۔ نقوش پطرس نمبر۔
۱۴۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء۔
۱۵۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء۔
۱۶۔ سنڈے میگزین نیویارک ٹائمز ۱۹ مارچ ۱۹۵۳ء۔
۱۷۔ ڈائری آف اے ڈپلومیٹ۔ ڈاکٹر افضل اقبال۔
۱۸۔ سرگذشت۔ سید ذوالفقار علی بخاری۔
۱۹۔ ایضاً۔
۲۰۔ پیرو مرشد کنہیا لال کپور۔ نقوش پطرس نمبر۔
۲۱۔ پطرس ایک مطالعہ۔ کرنل غلام سرور۔
۲۲۔ چند یادیں اور تاثرات ص ۱۸۔ ۱۷۔
۲۳۔ آہنگ بازگشت ص ۳۸۔
۲۴۔ ڈائری آف اے ڈپلومیٹ۔
۲۵۔ سرگذشت صفحہ ۲۳۴۔
۲۶۔ نقوش پطرس نمبر۔
۲۷۔ پطرس کے خطوط۔
۲۸۔ نقوش پطرس نمبر۔
۲۹۔ وارفتگی جذبات۔ مخزن جولائی ۱۹۱۲ء۔
۳۰۔ آئنہ دل/مخزن نومبر دسمبر ۱۹۱۲ء۔
۳۱۔ پیرو مرشد۔ کنہیا لال کپور۔ نقوش پطرس نمبر۔
۳۲۔ پطرس بخاری مرحوم۔ نقوش پطرس نمبر ص ۱۳۔
۳۳۔ اقوام متحدہ میں پاکستان ٹائمز (لاہور) کے نمائندے Marcelle Histchmannc
۳۴۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء۔
۳۵۔ خط بنام عبد الحمید سالک مورخہ جولائی ۱۹۵۰ء۔
۳۶۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء۔

۳۷۔ نقوش۔ لاہور نمبر۔

۳۸۔ مضمون "تحویل" مطبوعہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۱ء۔

۳۹۔ سرگذشت ص ۲۴۔

نظیر صدیقی

ناممکن کی جستجو

تصنیف : ناممکن کی جستجو
مصنف : حمید نسیم
ناشر : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار کراچی
صفحات : ۶۰۶
سال اشاعت : ۱۹۹۰ء
قیمت : ۲۵۰/- روپے

یہ کتاب ایک ایسے شخص کی خود نوشت سوانح عمری ہے جسے خود نوشت لکھنے کا پورا حق حاصل تھا اور جس نے یہ کتاب لکھ کر خودنوشت لکھنے کا حق ادا کر دیا' میں نے اردو کی تمام خود نوشتیں نہیں پڑھی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہورہی ہے کہ حمید نسیم کی یہ کتاب اردو کی دو تین نہایت دلچسپ خود نوشتوں میں سے ہے۔ اس کے نہایت دلچسپ ہونے میں مواد اور اسلوب دونوں کو دخل ہے۔ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے حمید نسیم کا ذکر سنتا رہا ہوں۔ لیکن مجھے ان کی نثر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب جو یہ کتاب سامنے آئی ہے تو اس کی نثر پڑھ کر اتنی ہی خوشگوار حیرت ہوئی جتنی زیڈ اے بخاری کی "سرگزشت" پڑھ کر ہوئی تھی۔ حمید نسیم نے بخاری کی بزرگانہ افسری کے سائے میں اپنی دفتری زندگی بسر کی ہے۔ کتاب میں بڑی محبت کے ساتھ ان کا تذکرہ بھی ہے۔ شاعری کے معاملے میں حمید نسیم کا معیار نظر بہت اونچا رہا ہے۔ پھر بھی انہوں نے بخاری کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف کیا ہے جبکہ ایک شاعر کی حیثیت سے انہیں (میرے سوا) کسی نے تنقیدی توجہ کا مستحق نہیں سمجھا۔ لیکن حمید نسیم نے نہ تو ان کی کتاب "سرگزشت" کا ذکر کیا نہ اس کی غیر معمولی خوبصورت نثر کا۔ میرا خیال ہے کہ زیڈ اے بخاری اور حمید نسیم اپنی ایک ایک تصنیف کی بدولت اردو خود نوشت کی تاریخ اور اردو نثر کی منصفانہ تنقید میں زندہ رہیں گے۔

حمید نسیم نے اپنی خود نوشت عمر کی اس [illegible] میں لکھی ہے جب وہ [illegible] کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ دور حاضر کے نوبل پرائز پانے والے [illegible] نے خود نوشت کے بارے میں ایک دلچسپ بات کہی ہے کہ عام طور پر مصنفین [illegible] کوئی بات یاد رکھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اس میں [illegible]

لوگوں کے حافظے عام طور پر یکساں نہیں ہوتے۔ حمید نسیم کو نہایت قوی حافظے کی نعمت ملی ہے۔ ممکن ہے وہ
اپنا روزنامچہ بھی لکھتے رہے ہوں جس کی مدد سے انہوں نے اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کو آسانی سے
یکجا کر لیا ہے۔ اتنی ضخیم خود نوشت وہی لکھ سکتا ہے جس کو اپنی زندگی کے سارے واقعات تفصیل کے ساتھ
یاد ہوں۔ واقعات کے بیان میں جو حسن اور دلکشی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ لکھنے والے کو اپنے
واقعات سے دلچسپی رہی ہے۔ اگر مصنف کو خود اپنے واقعات سے دلچسپی نہ ہو تو وہ انہیں اپنے قارئین کے
لئے دلچسپ نہیں بنا سکتا۔

اس خود نوشت کی دلکشی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ حمید نسیم کی زندگی زیادہ تر ایسے لوگوں
کے ساتھ اور ایسے لوگوں کے درمیان گزری ہے جن میں سے ہر شخص اپنی ذہانت، صلاحیت، کمال اور
کارکردگی کے اعتبار سے عہد حاضر کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہو رہا ہے۔ یوں تو خود نوشت لکھنے کا حق گمنام
سے گمنام آدمی کو بھی حاصل ہے لیکن خود نوشت کا لطف بڑی حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ لکھنے والا خود
بھی جاذب توجہ ہو اور جن لوگوں کے ذکر سے اس کی زندگی عبارت ہے وہ بھی جاذب توجہ ہوں۔

حمید نسیم کا اپنی سکول کی زندگی سے لے کر اب تک ایسے لوگوں کا ساتھ رہا ہے جو یا تو پہلے ہی
مشاہیر کی صف میں تھے یا بعد میں مشاہیر بننے سے نہ بچ سکے۔ وہ جب سکول کے طالب علم تھے آج کے
مشہور و ممتاز صحافی ظہور عالم شہید ان کے ہم درس تھے۔ جب انہوں نے کالج میں داخلہ لیا تو انہیں ڈاکٹر
تاثیر جیسا استاد ملا جب انہوں نے انگریزی اور فلسفے میں ایم اے کیا تو انہیں اپنے زمانے کے کئی نہایت اچھے
استاد نصیب ہوئے۔ جب وہ ایک debator کی حیثیت آل انڈیا ڈیبیٹنگ چیمپئن شپ میں نکلے تو ان کا مقابلہ
اختر الایمان اور الطاف گوہر جیسے لوگوں سے رہا۔ جب وہ ملازمت میں آئے تو انہیں بخاری برادران جیسی
ہستیوں کی ماتحتی میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ ریڈیو کی ملازمت کی بدولت ملک و قوم کے ہر شعبہ حیات
کے ممتاز و منفرد لوگوں کو دیکھنے، ان سے ملنے اور بہت سوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسر آئے۔ بڑے
بڑے مشاعروں کو سننے اور بڑی بڑی محفلوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے
میں دنیا کے بڑے ملکوں میں جانے اور بڑے اداروں کو دیکھنے کی مسرتیں حاصل ہوئیں۔

کتاب کے آغاز میں "ایک وضاحت" کے عنوان سے جن باتوں کی وضاحت کی گئی ہے ان میں سے
ایک یہ ہے:

"ناممکن کی جستجو" ایک عام حساس دل رکھنے والے سچے آدمی کا بیان کیا ہوا عصر رواں کا حال ہے
میں نے اپنے آپ کو کبھی اہم نہیں گردانا۔ سو یہ کتاب صیغہ واحد میں لکھی ہے اور لکھنے والے نے حسب
ضرورت اپنے سارے عیب و ثواب بلا کم و کاست لکھ دیئے۔ اگر پڑھنے والے کو اس کی ذات میں برائیاں
زیادہ نظر آئیں تو اس سے التماس ہے کہ وہ لکھنے والے کیلئے بخشش کی دعا مانگے۔

جب حمید نسیم اس خود نوشت کو اپنا احوال کہنے کی بجائے عصر رواں کا احوال قرار دیتے ہیں تو بھی
اس کتاب کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ خود نوشت رہتی ہے کیونکہ اس کتاب کا مرکزی کردار
خود مصنف ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب مصنف کے احوال سے زیادہ عصر رواں کے احوال کا بیان ہے
اس میں اگر ان کے عیب و ثواب ہیں تو وہ بہت ڈھونڈھنے سے ملتے ہیں۔ اس میں مصنف کی زندگی کے ؟
دور کے سیاسی حالات اور ادبی حالات بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مصنف کی ذاتی او

داخلی زندگی کا عکس بہت کم نظر آتا ہے۔

انگریزی میں دو لفظ ہیں autobiography اور memoirs شاید اس کتاب کو memoirs کہنا بہتر ہوگا یا یہ سمجھنا بہتر ہوگا کہ یہ کتاب ان دونوں اصناف کا امتزاج ہے۔

بہر حال حمید نسیم نے اس کتاب میں کئی ادوار اور بہت سی شخصیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر تاثیر ہمارے معاشرے اور ہماری تاریخ کی ایک نہایت اہم شخصیت تھے ان کی اہمیت سے اب بھی کسی کو انکار ممکن نہیں ہے۔ ان کی تحریروں کو ان کی وفات کے بعد کتابی شکل میں شائع کرکے محفوظ کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن وہ کتنے بڑے استاد تھے ان کا شاگرد ہونا کتنی بڑی خوش نصیبی تھی اور کیا معنی رکھتا تھا؟ وہ اپنے باصلاحیت شاگردوں کو کیا کچھ بنا دیتے تھے غرضیکہ ان کی شخصیت کے کئی عظیم پہلو ہیں جن پر کوئی روشنی کہیں سے نہیں ملتی۔ حمید نسیم نے جس محبت سے ان کی شخصیت کی عظمتوں کو اجاگر کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ان کے ایک شاگرد محمود نظامی جو ریڈیو پاکستان کے بڑے افسروں میں سے تھے ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے آج تک کسی نے ان کا شخصی خاکہ نہیں لکھا۔ حمید نسیم کے صرف ایک پیراگراف سے اندازہ کیجئے کہ وہ کیسی گرانمایہ شخصیت کے مالک تھے:

"محمود نظامی جیسا خوش کلام' برجستہ گو' بذلہ سنج کروڑوں میں کوئی ایک آدھ شخص ہوتا ہے۔ محمود نظامی جس محفل میں بیٹھتے جان محفل بن جاتے۔ وہی سب کی توجہ کا مرکز ہوتے۔ انگریزی ادب کے مورخ کہتے ہیں کہ آسکر وائلڈ نے جیسی خوبصورت باتیں اپنے ڈراموں میں لکھی ہیں جیسے لاثانی مکالمے تحریر کئے ہیں ان سے کہیں زیادہ کجل باتیں وہ عام محفلوں میں کرتا تھا۔ ویسا conversationalist انگریز قوم نے گزشتہ پانچ چھ صدیوں میں پیدا نہیں کیا۔ یہ بات سو فیصد سچائی اور دیانت کے ساتھ اپنے معاشرتی تناظر میں مرحوم محمود نظامی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے ایسے سچے دل والا انسان دوست ہو' بزرگ ہو' وہ بڑا خوش نصیب انسان ہے جسے ایسے انسان سے کوئی نسبت حاصل ہو اور اسے محمود نظامی مرحوم کا نیاز مند ہونے کا شرف حاصل رہا۔ یہ اس (حمید نسیم نے اپنی پوری کتاب میں اپنے لئے میں اور مجھے وغیرہ کی بجائے وہ اور اس کے ضمائر استعمال کئے ہیں -------- ن۔ ص) کے لئے بڑے فخر کی بات ہے کہ محمود نظامی اسے اپنے نیاز مندوں میں شمار کرتے تھے۔"

ڈاکٹر اشرف بڑے پائے کے مقرر گزرے ہیں۔ آج تک ان کی شخصیت پر کوئی مضمون پڑھنے کو نہیں ملا۔ حمید نسیم نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری قوم کا کیسا گوہر گرانمایہ تھے:۔

"ہندوستان کی عصری تاریخ (۱۹۳۶ تا ۱۹۷۷ء) میں ڈاکٹر کنور محمد اشرف کے پایہ کا پبلک اسپیکر اور کوئی نہیں ہوا............ ڈاکٹر صاحب اسٹیج پر آئے۔ ایک میانہ قامت' اکہرے بدن کا آدمی' سر تا پا کھدر پوش' عمر تیس بتیس کے لگ بھگ' چہرے میں کوئی کشش کوئی جاذبیت نہ تھی یعنی وہ بہت سادہ رو تھے ہاں آنکھوں میں روشنی عام آنکھوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ روشنی علم اور لگن کی تھی۔ تقریر شروع ہوئی۔ نہایت شائستہ' دھیمے' نرم خیز انداز میں۔ ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے کوئی جسمانی کرتب نہیں دکھائے' جہاں کسی بات کسی نکتے کی طرف توجہ بطور خاص منعطف کروانا مقصود ہوتی اس فقرے کو ذرا سا زیادہ زور سے کہتے۔ ڈاکٹر کچلو کی طرح اچانک چیخ نہیں مارتے تھے۔ تقریر چار گھنٹے جاری رہی۔ لوگوں کا یہ عالم تھا جیسے کسی

نے جادو کی چھڑی لگا کر بت بنا دیا ہو۔"

امرتسر میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا ایک چھوٹا سا حلقہ تھا جس کے تین اہم [illegible] گئے۔ فیض، محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں۔ فیض اور محمود الظفر ایم اے او کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ حمید نسیم دونوں کے شاگرد۔ رشید جہاں بہ اعتبار پیشہ ڈاکٹر تھیں۔ حمید نسیم اپنی کتاب میں "[illegible]" پہلی مرتبہ بتاتے ہیں کہ لوگوں نے بڑے قصے مشہور کئے کہ رشیدہ آپا اور فیض صاحب کا بڑا رومانس بلکہ affair چلا۔ بالکل غلط، جھوٹ، لغویات۔ حمید نسیم نے رشید جہاں سے اپنی پہلی ملاقات یوں بیان کی ہے۔

"........ پہلے صاحبزادہ صاحب (محمود الظفر) نے کہا۔ یہ ہمارے وہ نئے شاگرد ہیں جن کا میں نے کل تم سے ذکر کیا تھا۔ میں انہیں تم سے ملوانے لے آیا ہوں۔ پھر اس (حمید نسیم) سے کہا۔ یہ میری بیوی ہیں۔ رشید جہاں ڈاکٹر ہیں۔ افسانے لکھتی ہیں........ ڈاکٹر رشید جہاں اس کے قریب آئیں۔ اس کی ٹھوڑی انگلی نیچے رکھ کر اوپر اٹھائی۔ یوں کہ اس کا چہرہ ذرا سا اوپر اٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کئی لمحوں تک اسے بڑے غور سے دیکھا۔ پھر مسکرا دیں۔ بڑی معصوم بڑی بے محابا مسکراہٹ تھی...... کہا بیٹھو۔ چائے پیو گے کہ شربت؟

اس ایک دن کی ملاقات کے بعد یوں محسوس ہوا کہ وہ رشید جہاں کو ہمیشہ سے جانتا ہے۔ قد آدم، چینی کی گڑیا۔ پچیس برس کی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ تیز نگاہیں ایسی کہ معلوم ہوتا تھا دل کے پار ہو جاتی ہیں۔"

اس بیان میں بڑی رومانیت محسوس ہوگی۔ حمید نسیم یقیناً" بڑی جاذب توجہ شخصیت کے مالک تھے جیسا کہ اس تصویر سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو کتاب کی پشت پر موجود ہے۔ ادب اور فلسفے سے انتہائی گہرا تعلق رکھنے والا یہ شخص نہایت شدید جمالیاتی احساس کا بھی مالک رہا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کی طبیعت میں وہ بنیادی شرافت موجود رہی ہے جو انسان کو تہذیبی اقدار کا پاسدار بناتی ہے۔ حمید نسیم رشید جہاں کو ہمیشہ رشیدہ آپا کہتے رہے اور وہ بھی انہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگیں۔ محمود الظفر کے دل میں نہ صرف استادانہ بلکہ کوئی پدرانہ جذبہ ہی تھا کہ وہ ایک جوان رعنا کو اپنی جوان اور نہایت پرکشش بیوی سے ملانے کے لئے لے آئے۔

چھ سو چھ صفحے کی اس کتاب کا کوئی حصہ کوئی صفحہ پڑھ جایئے یہ محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اس کتاب کا مصنف اپنی عشق و عاشقی کے باوجود ایک نہایت شریف، شائستہ، منکسر المزاج اور درویش صفت انسان ہے۔ علم کی طلب اور حقیقت کی تلاش اس کی زندگی کا محور رہی ہے۔ یہ تلاش اسے فلسفے کے راستے سے تصوف تک لے آئی ہے۔ حقیقت تک رسائی ہوگی یا نہیں یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن ایک حساس اور باشعور انسان تلاش سے کیونکر باز رہ سکتا ہے؟ ممکن ہے یہ جستجو ناممکن ہی کی جستجو ہو۔

نظیر صدیقی

کہتا ہوں سچ

تصنیف	:	کہتا ہوں سچ
مصنف	:	شوکت واسطی
سال اشاعت	:	۱۹۹۱ء
ناشر	:	بزمِ علم و فن پاکستان اسلام آباد
صفحات	:	۳۰۸
قیمت	:	مجلد ۲۰۰ روپے غیر مجلد ۱۵۰
ملنے کا پتا	:	۱۱۔ شان پلازہ۔ بلیو ایریا اسلام آباد

"کہتا ہوں سچ" شوکت واسطی کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ یہ بات تو اربابِ تحقیق ہی بتا سکیں گے (کیا عجب کہ وہ بتا چکے ہوں پھر بھی مجھے خبر نہیں) کہ اردو ادب میں خود نوشت سوانح عمری کی صنف کب اور کہاں سے آئی۔ جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا تو میرا ایک مضمون فارسی بھی تھا۔ ہمارے فارسی نصاب میں شیخ علی حزیں کا ایک طویل مضمون تھا جو بالکل autobiographical تھا۔ اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی ادب میں خود نوشت سوانح عمری کا وجود اس وقت بھی تھا جب مغرب سے ادبی اصناف کے لینے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ سوانح عمری ہو یا خود نوشت سوانح عمری اردو میں ان دونوں اصنافِ ادب کی ترقی میں مغربی ادب کے اثرات کو ضرور دخل ہے۔ دراصل ان اصنافِ ادب کی ترقی کے لئے جو مناسب ذہنی فضا چاہیے وہ تو اب بھی مشرق میں موجود نہیں ہے۔۔۔ کم از کم مشرق کے اس حصے میں جہاں اردو ادب آباد ہے۔ یہاں تو لوگ دوسروں کی سوانح عمری لکھتے وقت بھی بے تکلفی اور صاف گوئی سے کام نہیں لے پاتے۔ پھر اپنے بارے میں لکھتے ہوئے جرات اظہار کہاں سے لائیں۔ خود نوشت تو ادب کی وہ صنف ہے جس کے لئے جرات اظہار ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے تو خاصی مقدار میں بے شرمی بھی چاہیے۔ بے شرمی اور جرات اظہار دونوں کے امتزاج سے خود نوشت حقیقی خود نوشت بنتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ خود نوشت صرف بدمعاشوں کی نہیں شریفوں کی بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں اس میں کیا شبہ لیکن قدرت کی ستم ظریفی نے ہر بدمعاش کے اندر ایک شریف اور ہر شریف کے اندر ایک بدمعاش چھپا رکھا ہے اس کا کیا جواب۔ اگر سوانح عمری اور خودنوشت سوانح عمری کا مقصد کسی شخصیت کی سچی اور بے لاگ تصویر کشی ہے تو اپنے گناہوں کا اعتراف دوسرے کے گناہوں کی نشاندہی سے مفر کہاں؟

سوانح عمری اور خود نوشت سوانح عمری سے ایک تصور یہ وابستہ رہا ہے کہ دونوں کے ہیرو نہایت

ممتاز قسم کی شخصیتیں ہونی چاہئیں۔ دونوں کی زندگی پر از واقعات ہو' دونوں کے تعلقات غیر معمولی شخصیتوں سے رہے ہوں۔ دونوں کے تجربات میں کوئی غیر معمولی پن ہو۔ معمولی شخصیتوں پر افسانے اور ناول تو لکھے جا سکتے ہیں۔۔۔ ایسے افسانے اور ایسے ناول جنہیں لکھ کر آدمی پریم چند اور ٹالسٹائی بن سکتا ہے لیکن معمولی شخصیتوں کو خود نوشت سوانح اور سوانح عمری کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ دراصل یہ زیر بحث استدلال اب کا ایک غیر جمہوری تصور ہے جو جمہوریت کے دور میں باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اب ایک مدت سے ایسے بہت سے خود نوشت سوانح شائع ہو رہے ہیں جن کے لکھنے والے تھوڑی بہت شہرت کے مالک ضرور ہیں لیکن وہ کسی نہایت ممتاز حیثیت کے مالک نہیں۔ بہر صورت ایسوں کی خود نوشت سوانح عمریاں بھی دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں ہوتیں۔ ہر لکھنے والا اپنے دور اور اپنے دیار کی بہت سی قابل ذکر اور قابل قدر باتوں کو محفوظ کر جاتا ہے۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ افسوس ناک ہے کہ ہمارے معاشرے کے اہم ترین لوگوں میں خود نوشت اور یادداشتیں (memories) لکھنے کا عام رجحان اب بھی ناپید ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ و تہذیب کے بہت سے اہم راز متعلقہ لوگوں کے ساتھ قبر میں دفن ہو جاتے ہیں۔

شوکت واسطی صوبہ سرحد کے انگریزی اساتذہ میں ایک جانی پہچانی شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے اس صوبے کے کئی شہروں میں کالجوں کے طلبہ کو انگریزی پڑھائی ہے۔ پروفیسر ہونے کے علاوہ وہ بعض دوسرے تعلیمی عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ تعلیمی محکموں سے وابستگی کے دوران وہ بہت سے دلچسپ' افسوسناک اور عبرت آموز تجربات سے گزرے ہیں۔ انہوں نے پروفیسروں کی جہالتیں بھی دیکھی ہیں اور ان کی سیاستیں اور سازشیں بھی۔ ان کے ایک رفیق کار کی علمی بے مائیگی کا حال یہ تھا کہ وہ ہستی کو مستی لکھا کرتے تھے اور اس طرح بیسیوں غلطیاں کرتے رہتے تھے لیکن اپنی علمی بے مائیگی کے باوجود کالج کی سیاست میں سرفہرست رہا کرتے تھے۔ شوکت واسطی نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز بیان کرتے ہوئے اپنے بہت سارے ہم سفروں اور ہمراہیوں کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔ ان جھلکیوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ گزشتہ ۴۴ سال کے دوران پاکستان نے زوال و انحطاط کے جتنے مرحلے طے کئے ہیں وہ تقریباً" ناگزیر تھے کیونکہ بقول میر ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے۔

شوکت واسطی نے اپنے ادبی معاصرین کے تذکرے میں بڑی کشادہ دلی اور فیاضی سے کام لیا ہے۔ ان کی ذہنی صلاحیتوں کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور ان کے کمال و کارکردگی کو ذہنی تحفظات کے بغیر سراہا ہے۔ اس خود نوشت میں سرحد کے اندر اردو شعر و ادب کی تمام سرگرمیاں محفوظ ہو گئی ہیں۔ آئندہ جو شخص بھی سرحد میں اردو شعر و ادب کی تاریخ لکھے گا اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔

خودنوشت کی کامیابی کا راز غالباً" اس بات میں ہے کہ لکھنے والے کو اپنی زندگی کے واقعات و جزئیات سے دلچسپی ہو اور اپنے آپ پر یہ اعتماد ہو کہ وہ اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے دلچسپی کا موجب بنا سکتا ہے۔ شوکت واسطی اپنی خودنوشت میں اس شرط کو پورا کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی خود نوشت صرف خارجی واقعات سے عبارت ہے۔ اس میں ان کی تعلیم' ان کی ملازمتیں' ان کی پیشہ ورانہ ترقیاں' ان کے سفر' ان کے زمانے کی ملکی سیاست' یہ سب کچھ موجود ہے لیکن اس میں ان کی داخلی زندگی کی پرچھائیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کا سبب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کی کوئی داخلی زندگی ہے ہی نہیں۔ دراصل اندر کے طوفان کو بیان کرکے باہر بحران کا سامنا کون کرے۔ بہر حال اس کتاب میں انہوں نے جتنا کچھ محفوظ کر دیا ہے۔ وہ

بھی قابل قدر ہے۔

ذہنی اعتبار سے شوکت واسطی بڑی ہمت اور حوصلے کے آدمی ہیں اس وقت تک ان کی بیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ تصانیف کی یہ تعداد خاصی متاثر کن بلکہ مرعوب کن ہے لیکن جو بات تصانیف کی تعداد سے بھی زیادہ مرعوب کن اور داد طلب ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے مجموعے شائع کرنے کے علاوہ مغرب کے کئی شعری کلاسیکس کو اردو کا منظوم جامہ پہنا دیا ہے۔ ان میں زیادہ تر کلاسیکس ایسے ہیں جنہیں عام طور پر انگریزی میں بھی پڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ مثلاً ملٹن کے مشہور شاہکار فردوس گم گشتہ کے بارہ دفتر' دانتے کے ڈیوائن کیمڈی کے تینوں حصے' ہومر کے ایلیڈ کے چھ دفتر۔ ان سب کے نہ صرف منظوم ترجمے کر دیئے ہیں بلکہ اپنے قائم کردہ ادارے کے زیر اہتمام انہیں شائع کرکے اردو قارئین کی دسترس میں پہنچا دیا ہے۔ مغرب کے ان مشکل ترین شاہکاروں کے علاوہ انہوں نے کرسٹوفر مارلو کی مشہور کتاب Dr. Faustus اور ٹیگور کی گیتان انجلی' کے بھی منظوم ترجمے کر دیئے ہیں ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں' ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اتنی ضخیم خودنوشت لکھ ڈالی ہے۔ اور ابھی بہت کچھ کرنے کے ارادے ہیں۔ اس میں کیا شک کہ انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

خودنوشت میں شوکت واسطی نے نثر اچھی لکھی ہے۔ اس خودنوشت کا آغاز غالباً اردو کی تمام خودنوشتوں سے مختلف' زیادہ دلچسپ اور منفرد ہے۔ لکھتے ہیں:

'' کوئی غیرمعمولی بات نہیں ہوئی۔ لاکھوں کروڑوں ممیاتے' منمناتے بچے بچونگڑوں کی طرح جو سینکڑوں ہزاروں سال سے پیدا ہورہے ہیں اور ہوتے رہیں گے میں نے بھی ایک معمولی متوسط گھرانے میں آنکھیں کھولیں' دائی نے معمول کی گھٹی دی۔۔۔۔ آسمان پر کوئی نیا ستارہ نہ جگمگایا' جنتریوں نے کوئی شگون نہ اگلا۔ زائچے کھینچے نہ جنم پتریاں بنیں رمالوں نجومیوں کا پیٹ بھرا نہ پیروں فقیروں کو منت نذرانہ ملا توپیں دغیں نہ چراغاں ہوا۔ پرانے ٹونے ٹوٹکے ہوئے ہوں گے۔ سائے پرچھائیں سے بچنے کے جتن حیلے بھی شاید رہے ہوں گے راکھ ساگا چٹائے ہوں گے۔ کاجل کے تل ماتھے ٹھوڑی پر لگائے ہوں گے۔ پل رکے نہ گھڑیاں ٹھٹکیں۔ چلتے چلتے وقت ایک ماں کو اس کے تیسرے بچے کی پرورش کا فرض سونپتا گیا۔ پہلے بھی ایک بہن اور پھر ایک بھائی سوا سوا ڈیڑھ سال کے وقفے سے اس کی ممتا کی تسکین کر چکے تھے۔''

شوکت واسطی بڑے صاحب علم آدمی ہیں۔ لیکن اس خودنوشت میں انہوں نے اپنی وسیع علمیت کو نمود و نمائش کا ذریعہ بنائے بغیر استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

سوکھے ساون

کتاب	:	سوکھے ساون
مصنف	:	ضمیرالدین احمد
ناشر	:	مکتبہ دانیال، کراچی
طبع	:	اول، اپریل ۱۹۹۱ء
صفحات	:	۲۷۲
قیمت	:	-/۱۲۰ روپے

ضمیر الدین احمد(۱۹۲۶ء-۱۹۹۰ء) کے تین اولین افسانے"چاندنی اور اندھیرا" (مطبوعہ:نقوش لاہور،۱۹۵۲ء)، "پکا راگ" اور "بادوباراں" ۱۹۵۶ء کی تخلیقات ہیں اور ان کے آخری دو شاہکار افسانے" تشنہ فریاد" اور "سوکھے ساون" (تکمیل : ۱۹۸۷ء) قیام لندن کی یادگار۔ ان آخری دو شاہکار افسانوں کے علاوہ ضمیرالدین احمد کے حقیقی آخری افسانے" رانگ نمبر" اور "پاتال" (زمانہ تکمیل: ۱۹۹۰ء) حال ہی میں" سوغات"" بنگلور کی پہلی کتاب مطبوعہ: ستمبر ۱۹۹۱ء میں سامنے آئے۔ یوں مجموعی طور پر ضمیرالدین احمد نے لگ بھگ چالیس افسانے لکھے، جن میں سے بارہ افسانوں کا انتخاب" سوکھے ساون" کے لیے خود انہوں نے کیا۔

ضمیر الدین احمد کا شاہکار"تشنہ فریاد" لگ بھگ پندرہ برس کی مسلسل خاموشی کے بعد سامنے آیا تھا اور ضمیرالدین احمد نے اسی تسلسل میں" سوکھے ساون" اور "پچھم سے چلی پروا" لکھ کر جہاں اپنے قارئین کو ایک خوشگوار حیرت سے دو چار کیا، وہیں ہمارے فہرست ساز اور تن آسان ناقدین کی اس جعلی نظریہ سازی کی بنیادیں ہلا دیں، جس کے تحت بیانیہ کا دوسرا نام فرسودگی قرار پایا تھا اور تخلیقی زبان کے مقابلے میں عجز بیان کو بڑھوتری ملی تھی۔

بے شک،ضمیرالدین احمد کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہونا چاہیے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ افسانوی ادب میں ضمیرالدین احمد کے مقام اور مرتبے کے تعین میں ان کی ناوقت موت کوئی چھوٹ یا رعایت مانگے۔ یقیناً" خود انہیں بھی اس نوع کی رعایت کی طلب نہ تھی۔

۱۹۸۷ء میں طویل خاموشی کے بعد جب ضمیرالدین احمد "سوکھے ساون" اور "تشنہ فریاد" کے حوالے سے زیربحث آئے تو ہمارے چند ناقدین نے اس طویل دورانیے کے مستند اور مستقل فعال افسانہ نگاروں کے نزول کام کو یکسر پس پشت ڈالتے ہوئے ضمیرالدین احمد کی تعریف میں قدرے غیر متوازن رائے کا اظہار کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ضمیرالدین احمد ہمارے ایک انتہائی اہم افسانہ نگار تھے اور اگر ان کی تخلیقی

سرگرمیاں جاری رہتیں یا ان کے تخلیقی دورانیے میں طویل وقفے نہ آتے تو وہ بڑے معرکے کا کام کر جاتے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ جن افسانہ نگاروں خصوصاً سریندر پرکاش، انور سجاد، بانو قدسیہ، جیلہ ہاشمی، واجدہ تبسم اور خان فضل الرحمن نے ضمیرالدین احمد کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا، انھوں نے انفرادی سطح پر اردو افسانے کو کیا کچھ دیا، اور ان میں سے ہر ایک کے مقابلے میں ضمیرالدین احمد کی عطا کس قدر ہے۔ یہاں میں دو بدو مقابلے یا درجہ بندی کی بات نہیں کر رہا اور نہ ایسا کچھ بھی ممکن ہوا ہے۔ میرا اشارہ محض تقابلی جائزے کی طرف ہے، جو ہمارے ناقدین کی ایک بھولی بسری ذمہ داری ہے۔
فی الوقت ضمیرالدین احمد کا صرف ایک افسانوی مجموعہ "سوکھے ساون" طبع اول: اپریل ۱۹۹۱ء سامنے آیا ہے۔ جس میں "سوکھے ساون"، "تشنہ فریاد"، "پچھم سے چلی پروا"، "صراط مستقیم"، "قصہ مسماۃ پھول وتی کا"، "کلیا"، "شوبھارانی"، "بہتا خون ابلتا خون"، "کبھی کھوئی ہوئی منزل بھی"، "پکا گانا"، "بادوباراں" اور "چاندنی اور اندھیرا" کل بارہ افسانے یکجا ہو سکے ہیں۔ اٹھائیس افسانے اس کے علاوہ ہیں، جو یقیناً بہت جلد سامنے آجائیں گے اور اس طرح ضمیرالدین احمد کے فن پر جم کر بات کرنا آسان ہو گا۔
ضمیرالدین احمد کے ہاں "چاندنی اور اندھیرا" (۱۹۵۶ء) اور "کلیا" (۱۹۵۵ء) جیسے افسانوں کے سبب جنسی لذت کوشی کا متین انداز اور بیان کی ایمائیت ہمیشہ قابل توجہ رہی ہے البتہ "تشنہ فریاد" (۱۹۸۷ء)، "سوکھے ساون" (۱۹۸۷ء) اور "پچھم سے چلی پروا" (۱۹۸۶ء) جیسے افسانے کسی قلم کار کے ہاں کبھی کبھار ہی، خدا کی جانب سے خصوصی توفیق ملنے پر ظہور پاتے ہیں۔
"تشنہ فریاد" پڑھتے ہوئے مجھے صابر ظفر کا ایک شعر بار بار یاد آیا:

گروہِ عاشقاں پکڑا گیا ہے
جو نامہ بر رہے ہیں، ڈر رہے ہیں

یہ دراصل گنجان آباد، آپس میں جڑے ہوئے مکانوں پر گزرتی ہوئی گرمیوں کی دوپہروں اور سردیوں کی طویل راتوں کا منظرنامہ ہے۔ اس کے متحرک کردار، نوجوان لڑکے لڑکیاں ہیں اور ان کی دوست داریاں اور معصوم محبتیں۔ ایسے کردار، جو یہ نہیں سمجھ پاتے کہ آنے والا کل ان کو زندگی کے جہنم میں کس طور جھونکے گا، یہ نوجوان لہو کی تیز گردش کے شاخسانے ہیں۔
"تشنہ فریاد" کی جواں مرگ بے نام خاتون اور نوجوان شاعر رسوا کی محبت یا دل لگی (بے محبت بیاہتا خاتون کے طرف سے اور دل لگی رسوا کی) کے بیان اور منطقی انجام کی تفصیلات اور اس کا بے تکلف بیان، محدود دائروں اور محدود تجربات کے حامل افسانہ نگاروں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے زندگی کے متنوع رنگوں کو اپنے ظاہر اور باطن پر بسنا پڑتا ہے۔ چار جانب بکھری ہوئی، اس لامتناہی زندگی کا یہ تجربہ کتابی مطالعے سے ہاتھ نہیں آتا۔ ہر وقت لیے دیے رہنے والے ادباء زندگی کے ایسے انوکھے تجربات سے ہمیشہ محروم دکھائی دیتے ہیں۔
راجندر سنگھ بیدی نے اس قبیل کا ایک شاہکار "جوگیا" لکھا تھا۔ "جوگیا" میں بیدی نے تصوف کی چھوٹ ڈال کر معنوی الجھاؤ پیدا کر دیے تھے اور ضمیرالدین احمد نے "تشنہ فریاد" میں لکھنؤ کا تہذیبی رچاؤ اور اختتامیہ پر مذہبی جڑاؤ کے ساتھ گمان اور زندگی کی حقیقت پر سوال اٹھا کر اپنے افسانے کو کئی جہتوں میں پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کر دیا۔

بانی اماں، نمازِ عشاء کے بعد طویل مراقبے سے باہر نکلیں تو خدا سے یا اپنے آپ سے، افسانے کے تیسرے مرکزی کردار سے یا پھر ساری خدائی سے یہ سوال کرتی ہیں:

"نصیبوں جلی نے کن لوگوں پہ نچھاور کر دی، جان سی عزیز شے!"

اسی طرح ضمیرالدین احمد نے "سوکھے ساون" میں ایک جوان بیوہ کی نفسیاتی، جذباتی اور جنسی زندگی کو کچھ اس طرح گھلا ملا کر پیش کیا ہے کہ افسانے کا اختتامیہ ایک روحانی مکاشفے میں ڈھل گیا۔ وہ اپنی فطری حالت میں، اپنے بدن پر تیز بارش کی باڑ کو سہتے ہوئے تادیر عالمِ رقص میں رہتی ہے۔ یہ بارش ان معاشرت کے وہ سارے سرد و گرم ہیں، جو اس نے چکھے۔ پھر یہ بارش اس تپ سے نجات کا پہلا غسل بھی ہے۔

ضمیرالدین احمد نے کمال مہارت کے ساتھ مرکزی کردار کی بیوگی اور مشکلات کو اپنے بیان سے خارج کر کے صرف وہاں سے اڑان لی ہے، جہاں جوان بیوہ اپنی اکلوتی بیٹی کو بیاہ کر ایک اہم معاشرتی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔

اس کی طبیعت کی کسلمندی اس بات کی غماز ہے کہ اس بھاری بوجھ کو بطریقِ احسن اتارا۔ بس یہیں سے اس کی دبی اور ازخود دبائی ہوئی نفسی اور جسمانی خواہشات سر اٹھاتی ہیں۔ مہترانی کی مروبار جوانی اس کے سامنے ہے۔ بیٹی کے بستر کی سلوٹیں اس سے کیا کہہ رہی ہیں؟ برساتی میں بچھی ہوئی چارپائی (جس پر اس کی بیٹی اور داماد نے رات کا کچھ وقت گزارا) کے نیچے پڑا ہوا کپڑا خاموش نہیں رہا اور جب بوا نے اس سے جھجکتے ہوئے دوسرا بیاہ کر لینے کی بات کی تو وہ کنوار پنے کے اس زمانے میں واپس چلی گئی، جب شادی بیاہ کی بات چہرے پر گلال چھڑک دیتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ لحاتی تھی، محض وقتی۔ اس لیے کہ وہ اس تیسری دنیا کی بیوہ ہے، جو خاوند کی چتا میں جلنے سے تو بچ گئی لیکن پھر بھی کہاں بچ سکی۔

ضمیرالدین احمد کا بیانیہ اسلوب "شنہ فریاد" میں اپنے کرداری حوالوں کے ساتھ جتنا بے تکلف اور کھلا ہے، "سوکھے ساون" میں وہ پیش کردہ نفسی الجھاووں کے بیان کے لیے اتنا ہی پہلو دار اور شان دار ہے۔

افسانہ "پچھم سے چلی پروا" پہلی بار "نیا دور" کراچی ۱۹۸۶ء میں "پروائی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ افسانہ اسلوبیاتی اور تکنیکی سطح پر "شنہ فریاد" سے بہت قریب ہے جبکہ موضوعاتی سطح پر یہ "سوکھے ساون" کی قبیل کا افسانہ ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ "پچھم سے چلی پروا" میں ضمیرالدین احمد نے وہ منطقہ دریافت کیا، جس کے پھولنے پھلنے کے امکانات "شنہ فریاد" اور "سوکھے ساون" میں روشن ہوئے تو شاید اس بات سے بہت کم اختلاف کی گنجائش نکلے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ضمیرالدین احمد نے یہ افسانہ پینتیس برس قبل بھی لکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا ایک افسانہ "چاندنی اور اندھیرا" مطبوعہ "نقوش" ۱۹۵۶ء جو اس کتاب میں بھی شامل ہے، کو افسانہ "پچھم سے چلی پروا" کے ساتھ ملا کر پڑھیے اور پھر ان کا ایک اور افسانہ "کبھی کھوئی ہوئی منزل بھی" دیکھیے جو "فن کار" دہلی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ یہ تینوں افسانے، درحقیقت ایک ہی افسانہ ہے۔ ایک ہی طرز کے چار کردار --- بیوی، شوہر، بچہ اور بیوی کا محبوب۔

"چاندنی اور اندھیرا" (۱۹۵۶ء) اس تھیم کی خام اور ناکام صورت ہے اور "کبھی کھوئی ہوئی منزل بھی"

(۱۹۵۳ء) اوسط درجے کا افسانہ' لیکن جب ۱۹۸۶ء میں اسے "پچھم سے چلی پروا" کے عنوان سے تیسری بار لکھا گیا تو بلاشبہ ایک شاہکار نے جنم لیا۔ آگے چل کر "شنتہ فریاد" اور "سوکھے ساون" جیسے اہم افسانوں میں ضمیرالدین احمد کے اس نزول منطقے کے دیگر ابھار سامنے آتے ہیں۔

افسانہ "پچھم سے چلی پروا" کے تین بنیادی محور ہیں۔ بیوی' خاوند اور ان کا بیٹا۔ یہ تینوں الگ الگ' اپنے اپنے دائروں میں محو حرکت تھے۔ زندگی ایک خاص ڈھرے پر چلی جا رہی تھی' جب پہلی بار "پروائی" کے لفظ نے اپنے استعمال کے سلسلے میں بیٹے کو حیرانی اور ماں کو یادوں کے حوالے سے ٹکراؤ سے دو چار کیا۔ ایسے میں خاوند ایک عام سا مرد دکھائی دیتا ہے جو پاکستان اور بھارت کے عام بیاہتا مردوں کی طرح معمول کی زندگی گزارتا ہے اور جس کی زندگی میں واحد تفریح اس کی منکوحہ عورت ہے۔

اس افسانے میں پہلی چیخ اسی ایک لفظ "پروائی" نے پیدا کی اور پھر پچھم کی طرف سے آئے ہوئے ایک چھیلے کنوارے قاضی مسرور احمد کی جھلک نے روزمرہ کے معمول کو ایک جھٹکے کے ساتھ' خصوصا میاں بیوی کی جذباتی زندگی کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ اب روز کے جنسی عمل سے اکتائی ہوئی عورت یکلخت بدلی بدلی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا جسم بظاہر اپنے خاوند کو پکارتا ہے لیکن درحقیقت وہ آنکھیں میچے اپنے کھوئے ہوئے ماضی کے قاضی مسرور احمد کی منتظر ہے۔

افسانے کے اختتام پر قاری کے سامنے اس زندگی کے بے جوڑ اور بے ربط' لیکن بظاہر آپس میں مربوط سلسلوں کا سارا تاروپود ادھڑنا شروع ہوتا ہے۔ ادھڑتا چلا جاتا ہے۔ تکنیکی سطح پر اس افسانے کی تکنیکی تہ داری اور ابہام ضمیرالدین احمد کے مخصوص علامتی رنگ کی پہچان کو ممکن بناتے ہیں۔

ضمیرالدین احمد نے پیشہ ور ناقدین سے بچ بچا کر اپنے متعدد افسانوں کے آغاز میں احباب کی تنقیدی آراء اور تاثرات کو کتاب کی زینت بنایا ہے' جن کا ایک الگ ذائقہ ہے۔

ڈاکٹر توصیف تبسم

مختلف

مجموعہ کلام	:	مختلف (مجموعہ غزلیات)
مصنف	:	احمد ظفر
پبلشرز	:	ظفر مظفر پبلشرز، راولپنڈی۔
سال اشاعت	:	۱۹۹۴ء
قیمت	:	۹۰/- روپے

احمد ظفر کی شاعری کا مجموعہ "مختلف" گزشتہ برس شائع ہوا ہے، اس مجموعہ میں صرف غزلیات شامل ہیں۔ یہ غزلیں احمد ظفر کی شاعری اور اس کے فن کی مجموعی کیفیت کی آئینہ دار ہیں جیسا کہ ایک جگہ اس نے خود لکھا ہے:

> "میرے نزدیک غزل، اردو شاعری کی جان ہے۔ دنیا کے ادب کی تمام تر خوبیاں یک جا کر دی جائیں تو اردو غزل میں ایک گلدستہ کی صورت میں مجتمع نظر آتی ہیں۔ غزل نہ صرف نازک سے نازک احساس کی متحمل ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کے بوجھل سے بوجھل غم کی جھلک بھی آپ غزل کے آئینے میں اسی خوبصورتی سے دیکھ سکتے ہیں۔"

(دیباچہ "حسن خزاں" ص ۱۴)

احمد ظفر کہتا ہے:۔

مختلف ہے دوسروں سے جو ظفرؔ
میں اسی دیوان میں الجھا رہا

اس شعر سے پیش نظر مجموعہ کلام کا نام بھی اخذ کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ دیوان شاعری میں کلام کے مختلف ہونے کی نوعیت کیا ہے۔ "دوسروں" کا اشارہ، دوسرے شاعروں کی طرف ہے یا خود اپنے ان دواوین کی طرف جو اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ کسی شاعر کے کلام کا، کسی دوسرے شاعر کے کلام سے مختلف، ہونا اس لحاظ سے قابل اعتنا نہیں کہ جس طرح ہر شخص ایک جداگانہ شخصیت رکھتا ہے، اسی طرح ہر شاعر کا کلام بہ اعتبار انتخاب الفاظ و مضامین ضرور مختلف ہوتا ہے، تو پھر کیا احمد ظفر اپنے موجودہ دیوان کو، اپنے دوسرے دواوین سے مختلف قرار دیتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس اختلاف کی نوعیت کیا ہے اور اس کے اس دعوئی میں کس حد تک صداقت موجود ہے۔

احمد ظفر، کم و بیش ۴۰ برس سے شعر کہہ رہا ہے، اس کی غزلوں کا اولین مجموعہ "حسن خزاں" کے

نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے چار برس پہلے اس کی پنجابی شاعری کا مجموعہ "بیلے بیلے" سامنے آ چکا تھا۔ جب سے اب تک اس کے قلم سے متعدد شعری مجموعے نکل چکے ہیں جن میں "دل دو نیم" اور "لازوال" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ "نذر غالب" ۱۹۶۹ء میں اس نے مکمل کیا جو دراصل غالب کی صد سالہ برسی پر ایک اظہار عقیدت کا درجہ رکھتا ہے۔ "داستاں در داستاں" کے عنوان سے پانچ ہزار مصرعوں پر مشتمل ایک طویل نظم بھی وہ لکھ چکا ہے' اس کی نثری تصانیف میں "مجسّمے" اور "دریچے" شامل ہیں۔ اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ احمد ظفر ایک جزوقتی شاعر یا ادیب نہیں۔ احمد ظفر کی بڑائی اس میں ہے کہ اس نے اوائل عمر میں جو خود سے پیمان وفا باندھا تھا اب تک اس پر قائم ہے اور دنیا کے صلے اور ستائش سے بے نیاز بڑی استقامت کے ساتھ اب تک اس راستے پر گامزن ہے جس کو اس نے اس میں حائل صعوبتوں کے علم کے باوجود اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ کہتا ہے:

> "شاعری میرے لیے نغمہ جاں ہے' نوحہ رنگ نہیں' اس سے میں نے اپنی نادیدہ تمناؤں کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ انہیں کبھی کسی پھول کے پیکر میں دیکھا ہے تو کبھی کسی گل رُخ پیکر سے خاک اڑتی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ میرے لیے نام و نمود کی خواہش نہیں بلکہ صداقت کی تلاش میں وسیلہ سفر رہی ہے۔"

احمد ظفر کا تعلق شاعروں کے اس گروہ سے ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد ادب کے منظر پر ابھرا۔ تقسیم ملک کے بعد کے حالات نے معاشرہ میں ایک اتھل پتھل کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ بدلے ہوئے معاشرتی حالات میں شعر و ادب سے بڑھ کر جسم و جاں کے کچھ اور تقاضے تھے جو شاعر سے جو اسی معاشرہ کا ایک حساس فرد تھا ترجیحی بنیادوں پر اپنا مداوا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہونے والی شعر و ادب سے ایک عمومی بے اعتنائی کے باوجود' احمد ظفر کا مسلسل سفر اس کا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں پر کامل یقین کا ثبوت فراہم کرتا ہے اس کی شاعری ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے جو کناروں کے مناظر سے بے نیاز اپنی دھن میں بہتا چلا جا رہا ہے۔

غزل کا فن ریزہ خیالی کا فن ہے اور اس کا مطالعہ ایک پرزے پرزے تصویر کے ٹکڑوں کو ملا کر اصل عکس کی بازیابی کا فن ہے۔ یہ بازیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم شاعر کے اندر کی آواز کو سن سکیں۔ ہمارے یہاں غزل کی شاعری کا بیشتر حصہ ایک میکانکی عمل کا مرہون منت رہا ہے۔ ایسی شاعری کا بڑا حصہ سطحی محسوس ہوتا ہے جو شاعر کے باطن سے مربوط ہونے کے بجائے ایک طرح کی لفظی شعبدہ گری دکھائی دیتا ہے۔

پہلا تاثر جو اس کتاب کے مطالعہ سے ایک قاری کا ذہن قبول کرتا ہے' وہ اس کا بھرپور ہونا ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۵۷ غزلیں ہیں' یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس سے ایسے دو مجموعے باآسانی تیار کئے جا سکتے تھے جیسے ان دنوں عموماً" چھاپے جا رہے ہیں۔ غزلوں کی اتنی بڑی تعداد سے اس تخلیقی توانائی کا علم بھی ہوتا ہے جو شاعر کے اندر ہے اور اپنا اظہار چاہتی ہے:-

میں ساتھ لے کے چلا تھا سخن کا جم غفیر
کیا ہے دشت کو نقش و نگار میں تبدیل

پھول مرجھاتے نہیں ہیں جس میں
دل میں اک ایسا چمن رکھا ہے

وقت کے پاس امانت میں نے
اپنا انداز سخن رکھا ہے

"مختلف" میں جو غزلیں موجود ہیں، ان میں معانی کی بو قلمی کی تہہ میں احساس کی وحدت ایک زیریں لہر کی صورت میں جاری رہتی ہے، اس لہر کا اپنا ایک رنگ ہے جو دوسرے کئی رنگوں سے ترتیب پاتا ہے۔ یہ رنگ، یاد، تنہائی، ہجر، خواب، شکست خواب، حوصلہ مندی، حالات کی ناسازگاری اور اپنے آورش سے پیار کے رنگ ہیں۔ شعر اور شخصیت کی اسی ہم آہنگی کے نتیجے میں، صداقت احساس کا جوہر پیدا ہوا ہے جو شعر میں اس وقت تک نہیں ابھرتا ہے جب تک شاعر خود اپنے آپ سے مخلص نہ ہو۔ اس فضا بندی کے قیام میں ایک اور وسیلہ شیرازہ بند ردیفوں کا بھی ہے۔ شاعر نے ان ردیفوں کا انتخاب شعوری طور پر نہیں کیا بلکہ وہ اس کے بطون سے خودبخود پھوٹی ہیں۔ یہ شیرازہ بند ردیفیں سنگلاخ ضرور ہیں۔ ان میں رواں دواں شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ احمد ظفر اپنی بات اتنی آسانی سے کہہ جاتا ہے کہ ذہن ردیف کے کڑے پن کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ یہ کمال شاعر کو ایک عمر کی ریاضت کے بعد کہیں حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں احمد ظفر نے جو غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر، غالب کے دیوان کے جواب میں پورا دیوان کہا، شعر کہنے کی یہ غیرمعمولی استعداد اسی مشق سخن کا حاصل نظر آتی ہے۔

"مختلف" میں شامل غزلوں کا ایک اور امتیازی پہلو، ان کے سابقہ مجموعہ ہائے کلام کے مقابلہ میں یہ بھی ہے کہ ان شعروں میں فکر کی گہرائی نسبتاً زیادہ ہے۔ ایسا ہونا ایک فطری سی بات ہے کیونکہ عمر کے ساتھ، بشرطیکہ شاعر کے ذہن کے دریچے کھلے ہوں، اس میں مشاہدہ کی قوت ہو اور اثرپذیری کی صلاحیت، اس کے تجربے اور خیالات میں وسعت ضرور آ جاتی ہے۔ ان گہرے خیالات کے اظہار میں بعض شعروں میں ابلاغ کی کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے:

تصویر کی مانند کوئی حرف ہے اس کا
تلوار کی مانند زباں سر پہ کھڑی ہے

دائرے میں آنکھ کے جو آگیا
کوئی موسم ایسے منظر کا نہیں

شام نے مجھ سے کہا، شام کا آئینہ ہوں
میں کسی ساعت بے نام کا آئینہ ہوں

اک روز کسی خواب کی خواہش میں ملا تھا
وہ شخص جو پھولوں کی نمائش میں ملا تھا

عین ممکن ہے کہ خود شاعر کے ذہن میں کوئی گہری بات کہتے ہوئے اس کے تلازمے واضح اور صاف ہوں لیکن ایک عام قاری ایسے شعر پڑھتا ہے تو شاعر کے ہم قدم لڑکھڑا سا جاتا ہے ایک قاری کے نقطہ نظر سے ہمارے خیال میں اس مجموعہ کلام کا بہترین حصہ وہی شعر ہیں جہاں شاعر بغیر کسی انگ پیچ کے اپنا مافی الضمیر آسان پیرایہ میں بیان کر جاتا ہے۔

ایک مصور تھا دونوں کا جس کی دو تصویریں تھیں
ایک پرندہ خون میں لت پت ایک پرندہ چہکا تھا
آدھا چاند تھا آدھی رات تھی آدھا تیر مرے دل میں
سایا میرے ساتھ چلا تو میں بھی آدھا لگتا تھا

شفق کے رنگ تری گفتگو میں یاد آئے
کہ تیرے عکس مجھے ہر سو میں یاد آئے
رہا نہ دل مرے پہلو میں جانتا ہوں میں
کٹے نہ دن جو تری آرزو میں' یاد آئے
بکھر گئے ہیں جو مشت غبار کی مانند
اتر کے بارہا میرے لہو میں یاد آئے

ایک سا موسم جہاں رہتا نہیں
دل مرا شاید وہاں رہتا نہیں
دھند میں لپٹا ہوا منظر نہ ہو
میری آنکھوں میں دھواں رہتا نہیں
منزلیں آتی ہیں رستوں کی طرف
جب خیال جسم و جاں رہتا نہیں

پیاسا ہی مجھے مرنا ہے' تعبیر یہی ہے
بہتے ہوئے دریا کا سفر' خواب میں دیکھا
وہ اور ہی سیارے کی مخلوق تھا شاید
دیکھا تو اسے بار دگر' خواب میں دیکھا
میں وقت کے ہر موڑ پہ دیکھ آیا ہوں جس کو
وہ دھند کے پیچھے ہے سحر' خواب میں دیکھا

روشن ہے جو نصف' نصف تاریک
سورج اسی کائنات کا ہوں

مٹی کے خمیر میں ہیں شامل
میں پھول کے ساتھ کھل رہا ہوں

پوچھا ہے ظفر نے کون ہوں میں
پتہ سا ہوا میں کانپتا ہوں

احمد ظفر اپنی شعرگوئی کے ابتدائی برسوں میں' ترقی پسند تحریک کا سرگرم رکن رہا ہے۔ اس تحریک نے جہاں اس کو دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے میں مدد دی' وہیں گرد و پیش میں رونما ہونے والے ایسے واقعات کی مذمت پر بھی ابھارا جس سے انسان کی تذلیل کے پہلو نکلتے ہیں۔ یوں بھی آدمی ایک معاشرہ میں رہتے ہوئے' الگ تھلگ زندگی نہیں گزار سکتا۔ احمد ظفر کے یہاں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جس معاشرتی شعور کی تربیت ہوئی' وہ اس مجموعہ کلام میں پہلے سے بھی زیادہ توانا دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعہ کے بعض شعروں میں تو ماضی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی جھلک بہت نمایاں نظر آتی ہے:

دور ہوں شہر کی فضاؤں سے
پیار کرتا ہوں اپنے گاؤں سے

کیا مجھے دیں گے وقت کے فرعون
کیا ملا ساختہ خداؤں سے

ڈاکوؤں کو دیا گیا تاوان
بچے چھینے گئے ہیں ماؤں سے

سازشیں ہوتی ہیں جتنی شہر میں
شہر والے اس میں شامل کیا نہیں

مٹی مری ماں ہے ' میں ہوں بیٹا
کیسے میں کہوں کہ میں بڑا ہوں

لہریں مری چھت سے کھیلتی ہیں
دریا کے قریب جھونپڑا ہوں

وہ خلعتیں جو سربزم بانٹتا دیکھا
قبا کسی کی کرے تار تار میں تبدیل

شہادت سلسلہ ہے روشنی میں زندہ رہنے کا
عبادت اور کیا ہے سر کٹا کر جا رہا ہوں میں

خودکشی تھی' قتل تھا یا اتفاق
کیسی گفتار عبث ہے شہر میں

قاتل شہر کے چاروں جانب پھیل گئے ہیں
کٹ جاتا ہے مجھ سے خوف کا سایا مجھ کو

ایک حساس فرد جب زمین و آسماں، سورج اور ستاروں کی پائیداری اور دوام کے مقابلہ میں خودکو
ر دیکھتا ہے تو اس کو اپنا وجود بہت ہی حقیر اور بے مایہ دکھائی دیتا ہے، لہٰذا وہ ابدیت کی تلاش کا سفر
کرتا ہے۔ مذاہب اور فنون لطیفہ جس میں شاعری بھی شامل ہے، بجز تلاش ابدیت کے اور کیا ہے، لیکن
جیسے انسان عمر کے راستے پر آگے بڑھتا ہے، آخری منزل کی قربت کا یقین، اس کے اندر احساس فنا کو
تر کر دیتا ہے۔ اس مجموعہ کلام کی غزلیں چونکہ عمر کے ایک خاص مرحلہ کی پیداوار ہیں، اس لیے ان
زندگی کی ناپائیداری اور اس کے فانی ہونے کا احساس، احمد ظفر کی دوسری غزلوں کے مقابلہ میں کہیں
گہرا دکھائی دیتا ہے:

رشتہ جسم و جاں جو ٹوٹ گیا
خاک میری وبال سے نکلی

خاک میں خاک ہو گیا کیسے
آسماں جس کی ایک جست رہا

ایک پرندہ شاخ پہ پل بھر بیٹھا تھا
باغ دنیا سے یہ میری نسبت ہے

زمین کھینچ لی، دشمن نے میرے قدموں سے
بلا رہا ہے مجھے آسماں، چلے آؤ
تمام کوششیں بے سود ہوتی جاتی ہیں
بسر جو کی ہے، گئی رائیگاں چلے آؤ

خاک ہے سر میں کسی کے اور بیاباں موت کا
جان دینا درمیان بام و در آسان ہے
دلدلوں کی سرزمیں تھی بعد میں یہ زندگی
پہلے پہلے سوچنا، کتنا سفر آسان ہے

عمر بھر کے فاصلے ہیں سامنے
ایک تنہا راستہ ہے اور میں

فرا "مختلف" ایک ایسے شاعر کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جس نے روایت کی پاسداری میں ایسی غزلیں
اپنا منفرد ذائقہ رکھتی ہیں، اس انفرادیت کا سبب وہ خاص دلسوزی ہے جو ہر شعر کے پیکر میں روح
نہ رکھتی ہے۔ خود سے وابستگی کے نتیجے میں شاعر کی شخصیت کے کم و بیش تمام رنگ خوش نما
صورت میں، ان غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

علی تنہا

سنجیاں سالیں

کتاب	:	سنجیاں سالیں/ Tenements on Sand
مصنف	:	حسن رضا گردیزی
انگریزی مترجمین	:	مقبول عزیز، جان ہرڈمین، حسن نواز
ناشر	:	مکتبہ فکر و دانش۔ لاہور
صفحات	:	۳۲
قیمت	:	دو صد روپے

سرائیکی زبان برصغیر کی قدیم اور شیریں، زبان ہے۔ مگر شومئی قسمت کہ پاکستان کے ایک وسیع رقبے پر پھیلے لوگوں کی بولی، اپنی بھرپور شناخت کرانے میں بوجوہ ناکام رہی ہے ہرچند اس تہ دار اور بلیغ زبان میں کمال کے تخلیق کار پیدا ہوئے مگر سلاطین کے درباری مفادات نے اسے ایک بڑی زبان کے طور پر آگے بڑھنے میں معاونت تو کیا، رد کرنے کی ہر ممکن کاوش کی، یہ ایک طویل بحث ہے اس لئے برسر مطلب آتے ہیں حسن رضا گردیزی کی زیر تبصرہ کتاب، خوش بختی کی حامل ہے کہ اسے حسن گردیزی جیسے فاضل مترجم ہاتھ آئے اور انہوں نے حضرت خواجہ فرید کے بعد اسے انگریزی کا جامہ پہنایا۔ ۶۰ء کی دہائی میں سرائیکی زبان نے ایک نئی کروٹ لی اور یہاں سے تخلیق کاروں نے بدلتی ہوئی دنیا کے نئے وژن کے ساتھ سرائیکی شعرو ادب کا دھارا بدلنے کی طرف بھرپور توجہ دی اس ضمن میں ڈاکٹر مہر عبدالحق، اسلم رسول پوری، ظامی بہاولپوری اور حسن رضا گردیزی کی فکر انگیز سرگرمیوں نے تخلیقی زندگی کو اظہار کی نئی وسعت سے ہمکنار کیا۔

سید حسن رضا گردیزی نے مغرب اور مشرق کے کلاسیکل ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں شروع میں راشد سا استاد ملا۔ اور زندگی میں مجید امجد ساعہد ساز شاعر، جس نے گردیزی صاحب کی فکری و تخلیقی زندگی میں گہرے نقوش ثبت کئے اور ایک مجموعی تخلیقی ذہن کی تشکیل میں، تہذیبی امتیاز کے ساتھ نئے دور کا نیا رویہ شامل کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شعریات کا جو دستور العمل وضع کیا، اس میں، بالخصوص وکٹورین عہد کے انگریزی شعراء اور فارسی کے قدیم اساتذہ کا آہنگ نمایاں ہے۔

حسن رضا گردیزی نے سرائیکی اسالیب کے قدیم پیٹرن کو نئی بصیرت کے ساتھ، انسانی تجربے کی حیرت انگیز قوت شعر کے ساتھ بدلا۔ کیونکہ ان کے سامنے سرائیکی کے قدیم کلاسیکی نمونے ضرور موجود تھے مگر جدید سانچوں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ انہوں نے اجتماعی بصیرتوں کے جس نئے دور کا آغاز کیا، وہ اس لحاظ سے نئی

بشارت ہے کہ سرائیکی کو پہلی بار معینہ ہیئتوں سے ہٹ کر زندگی سے خارجی حسن کا متحرک سخن سننے کو ملا۔ انہوں نے گویا شعر کے تخلیقی ابعاد کو نئی لرزش اور رفتار کا نیا پیمانہ عطا کیا۔ انہوں نے سرائیکی کے لسانی ڈھانچے میں نئی زبان کا جو خون دوڑایا' وہ نئی سماجی و نفسیاتی صورتحال کے عین مطابق تھا ان کے طرز احساس کی اس حسن آفرینی کے نمونے اس خوبصورت کتاب TENEMENTS ON SAND میں بھرپور زاوئے سے موجود ہیں۔ چونکہ حسن رضا گردیزی کے موضوعات سماجی جبر' جمالیاتی اقدار کی پامالی اور ایک مستقل نایافت ہیں' اس لئے ان کے ہاں المیہ کا مجموعی تاثر بڑی حد تک فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی سے ملتا جلتا ہے۔ مگر ان کا شعری لب و لہجہ انسانی تجربے کی جمالیاتی سطحوں تک قائم رہتا ہے۔ وہ آراستہ اور پر شکوہ ترکیبات اور نہایت صحت کے ساتھ نئے سرائیکی لہجے کی بناوٹ میں معروف شاعر کے طور پر بھی اس مجموعہ میں ابھرتے نظر آتے ہیں۔

حسن رضا گردیزی کے فاضل مترجمین نے جس رمزیت' چستی اور اسلوبیاتی انفرادیت کے ساتھ اسے انگریزی میں ڈھالا ہے' وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ انہوں نے نپی تلی اور آہنگ پذیر زبان میں بعض مقامات پر تو سرائیکی کے پراسرار حسن اور تہہ داری کو چھو لیا ہے حسن رضا گردیزی کی شاعری بصارت کے دائرے میں محیط ہونے والی شاعری کا دوسرا نام ہے۔ وہ موضوع کے تدریجی ارتقاء کی تنظیم کو جس صورت سے مزین کرتے ہیں' مترجم حضرات نے خارجی پرت کے اس شاعر کو نئی حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے' اس کی ایک آدھ مثال۔

آہدن پچھلی رات دے ویلے
جاں ایہہ ریت دے بنے ٹھردن
لندے چن دیاں پیلیاں کرناں
سنجیاں سا نیں وچ آوڑ دن
اسا ناں توں پوڑھیاں لاکے
کئی انجانے بندے لندن
گھنگرو تے پازباں وجدن

اب ان کا انگریزی ترجمہ

Some say
In the middle of the night
When the dunes cool off
The yellow beams of the waning moon descend
Strange creatures
Whore feet jingle bells and anklets music

ایک اور نظم آخری نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو

جیویں لندے مجھ دے منہ تے خون دا رنگ نظر دے
جیویں وسمڑ ویلے ڈیوا آخری وار ابھر دے

ایہ دی میڈیاں نظماں میڈیاں سوچاں دیاں تصویراں
بھیوں دیاں سوغاتاں دردان سولاں دیاں جاگیراں
بھک بھکیندے ڈیوے جاگدیاں راتاں دیاں تحریراں
کالی کوجھی رات وچ نوری خواباں دیاں تعبیراں

Even as the face of the setting sun

is flushed with blood

Even as the flame of the dying lamp

flares up for the last time

So my poems reflections of my thoughts

Fruits of my loneliness pain and torment

Are but prelude

اس وقیع مجموعہ میں حق نواز گردیزی صاحب نے **Siraiki language and its poetries** کے زیر عنوان' سرائیکی زبان کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کا عالمانہ تجزیہ شامل کیا ہے۔ تاکہ قارئین اس قدیم و عظیم زبان کے ثقافتی مظاہر کے بنیادی عناصر سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی فاضل مترجم نے **Of historical Multan** کے تحت' ملتان کے احوال و آثار سے متعلق بھی بصیرت افروز مباحث کئے ہیں اور ملتان کی سرزمین کی عظیم تر روایات و فکری رویوں کی تصویر کو نئے امکانات کے ساتھ دکھانے کی خوب ترجمانی کی ہے۔

فی الحقیقت سرائیکی زبان کے اس انگریزی ترجمے نے ایک اہم پاکستانی زبان کی وجودی معنویت کے باب میں اہم قدم اٹھایا ہے۔ ترجمہ' ہر چند مشکل ترین فن ہے مگر تینوں ترجمہ نگاروں نے سرائیکی زبان کی حلاوت کا سراغ جس زندہ زبان کے ساتھ پایا ہے' اس کی داد نہ دینا صریحاً" ناانصافی ہوگی۔

∞

انجم یوسف زئی

دریچۂ دل

کتاب	:	دریچہ دل
مصنف	:	ناز سرحدی
ناشر	:	رضوان پبلشر
صفحات	:	[illegible]
قیمت	:	تمیں روپے

طلا محمد خان جن کا قلمی نام ناز سرحدی ہے' پیشے کے لحاظ سے سپاہی ہیں اور وہ کرنل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ پٹھان ہونے کے ناتے سو پشت سے پیشہ آباء بھی سپہ گری ہے۔ لیکن غالب کی طرح شاعری ان کے لئے بھی ذریعہ عزت نہیں محض جذبہ تخلیق کی تسکین کا باعث ہے۔ دوران ملازمت ذوق شعر گوئی جزوی طور پر رہا لیکن سبکدوشی کے بعد "دریچہ دل" وا کرکے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تخلیق کا جو لاوا ان کی ذات میں کروٹیں لے رہا تھا' اس کے اخراج کا صحیح وقت ہو چکا ہے۔

زیر نظر شعری مجموعہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ ابتدا حمدیہ و نعتیہ اور امام عالی مقام کی منقبت سے کی ہے۔ پھر غزلیہ کلام اور کہیں کہیں کوئی نظم ہے جو قاری کے لئے دوران مطالعہ تنوع پیدا کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ اردو غزل فارسی غزل کی مرہون منت ہے جس میں ہندی شاعری کا پر تو بھی ہے۔ یہ آمیزش دراصل اس معاشرے کی پیداوار ہے جس نے سرزمین ہند میں مسلمانوں کی آمد کے سبب جنم لیا اور اس میں ایک مخصوص نیرنگی تھی' ترک' ایرانی' افغانی' پنجابی' سندھی غرض بے شمار علاقوں کے رہنے والے مسلمان آباد تھے جبکہ ہندو یہاں کے قدیم باشندے تھے۔ اس یکجائی نے ایک نئی زبان اردو کے خدو خال مہیا کئے اور ان خدو خال سے اردو غزل کے نقوش ابھرے۔

اردو غزل کی ابتداء دکن سے ہوئی دہلی اور لکھنؤ دو اہم مراکز ہونے کے باوجود برصغیر کے مضافات اور غیر مرکزی علاقے بھی اس کی ترویج و ترقی میں حسب توفیق معروف رہے تقسیم ملک کے بعد لاہور' کراچی' سرگودھا' پشاور' کوہاٹ اور پاکستان کے دیگر مقامات پر اردو زبان اور اردو شاعری کی ترویج و ترقی کا فریضہ نہایت سرگرمی سے ادا ہوا۔ ناز سرحدی کا تعلق پشاور اور کوہاٹ سے رہا لہذا ان کی شاعری یہیں پروان چڑھی۔ ان کی شاعری کی کونپل روایت کی شاخ پر پھوٹی ہے۔ وہ سہل ممتنع میں دل کی بات دل تک پہنچاتے ہیں اور یوں اپنی وجدانی و روحانی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی "ان کے کلام کو یکجا دیکھنے پر محسوس ہوا کہ وہ غزل اور تغزل کے بنیادی مطالبات کا شعور رکھتے ہیں۔ اور ان مطالبات کو پورا

کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی غزل کو گردو پیش کے حالات و واقعات، معاشرے کے نشیب و فراز اور انسانی زندگی کے متعدد آلام و مصائب سے بیگانہ نہیں رکھا۔ بلکہ جگہ جگہ ایسے اشعار وارد ہوتے ہیں جو نوع انسان سے بالعموم اور اہل وطن سے بالخصوص صاف ستھری محبت کا اظہار بن جاتے ہیں۔ مثلاً۔

اس کے ملنے کا ہر انداز جداگانہ ہے
کچھ گریزاں سا بھی لگتا ہے گریزاں بھی نہیں

ناز دل بھی اسی کا حامی ہے
اس لئے بدگماں نہیں ہوتا

اڑا دیا تھا جسے قہقہوں میں محفل نے
مجھے تو خون کے آنسو رلا گئی وہ بات

اور

کیا جانے لگائے ہیں ہمیں اس نے کدھر داغ
دل میں ہے ادھر داغ جگر میں ہے ادھر داغ

تاہم ناز کے ہاں روایت محض لکیر کے فقیر کی طرح نہیں ہے بلکہ الفاظ کو نئے مفاہیم دینے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً۔

پھیل کر اپنی حدوں سے باہر
ہوگیا شہر مضافات میں گم

یوں ان کے گلزار سخن میں تازہ ہوا کے جھونکے اور شگوفے طراوت مہیا کرکے اپنی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی سادہ انداز بیان کی مظہر ہیں۔ مگر مشاہدے، مطالعے اور ندرت بیان کے نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی ایک نظم "اے وطن!" میں وطن سے مخاطب ہیں۔

کتنے سفاک تھپیڑوں میں سفر کر آیا
کتنی منہ زور ہواؤں سے گذر کر آیا

دریچہ دل کے دوران مطالعہ ناز کی غزل کے مقابلے میں نظمیں کئی لحاظ سے کمزور محسوس ہوتی ہیں۔ جو اس شعری مجموعے کا گراف غزل سے بھی نیچے لے جاتی ہیں۔ اگر یہ نظمیں مجموعے میں شامل نہ کی جاتیں تو بہتر ہوتا۔

مختصر یہ کہ ناز نے غزل کی روایت سے انحراف نہ کرتے ہوئے غزل کے فنی محاسن کو حسب توفیق خوب برتا ہے۔ ان کے ہاں عصری آگہی کا شعوری عنصر موجود ہے۔ ان کی غزل بنیادی طور پر رومانوی فضا سے ہم آہنگ ہے۔ تاہم انہوں نے غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ ذات کے حوالے سے کائنات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اظہار بیان میں پختگی اور فنی محاسن ہیں۔ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے فن سے واقف ہیں۔ مجموعی طور پر ناز کی شاعری سخن گوئی کا قابل توجہ نمونہ ہے۔ اور اس دور میں جبکہ شعری مجموعوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ دریچہ دل کی قیمت محض تکلف محسوس ہوتی ہے۔ کتاب مجلد' سرورق مناسب اور ضخامت ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ البتہ منظومات کی فہرست میں صفحات کی غلط نشاندہی قدرے گراں گزرتی ہے۔

اشرف سلیم

دکھ کا جزیرہ

کتاب	:	دکھ کا جزیرہ (مصور ایڈیشن)
مصنف	:	اکرام تبسم
ناشر	:	ماورا پبلشرز' ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور
صفحات	:	۴۸
قیمت	:	-/۱۰۰ روپے

کائنات کی تخلیق سے لے کر شعر کی تخلیق تک سفر میں بنیادی مسئلہ شناخت کا ہے لیکن اس کی شکلیں ہیں ان شکلوں میں ایک شکل اظہار کی ہے جو سب سے زیادہ مشکل مگر بہتر صورت ہے۔ اظہار کا تعلق گنگنانے' قلم سٹوڈیو کے ذریعے ہو یا لفظوں سے' اس کے پس پردہ شناخت ہی سفر کررہی ہوتی ہے۔

افسانہ نگار اور شاعر کا اظہار لفظوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور ہر تخلیق کار کے پاس کوئی تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ مشاہدہ جتنی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا جائے' اتنے ہی بہتر انداز میں اظہار بھی ہوگا۔

ہماری شاعری میں تجربہ اور مشاہدہ دو طرح سے سامنے آیا ہے' ان میں ایک رومانوی (جسے ہم کلاسیکی انداز کہتے ہیں) انداز ہے اور دوسرا فلسفیانہ۔

کلاسیک انداز ہمارے قاریوں کے ذہنوں میں زیادہ دیر تک حکومت کرتا ہے' جبکہ فلسفیانہ انداز کسی گہری سطح سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ لیکن قاری اس کی فلسفیانہ بھول بھلیوں کے راستے میں کھو جاتا ہے' اور شاعر کا اظہار دھندلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی شناخت کرانے میں دیر کر دیتا ہے۔

اکرام تبسم نے اپنی شناخت کرانے کے لئے رومانوی انداز کو اپنایا ہے' جس کی مجموعی صورت "دکھ کا جزیرہ" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے اس میں سارے عکس رومانوی انداز سے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ جن کو غور سے دیکھا جائے تو ہمارے آس پاس کے بے شمار عکس دکھائی دیتے ہیں۔

اکرام تبسم اپنی ذات کا اظہار کسی فلسفہ کے سمندر میں ڈوب کر نہیں کرتے' بلکہ اوپر والی لہروں سے گہرائی کا اندازہ لگا کر کرتے ہیں۔ اور مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔

آج آیا ہوں یارو خدا دیکھ کر   ڈوبتے ایک بچے بچا
ہم ایسے سرپھروں کی بھی شہرت کہیں تو ہو   اک خواب پر لٹا دیں تبسم جو جان و دل
سفر مت کرنا   کچ بھروسے پہ   راستے صاف ہوں جتنے چاہے

دکھ کا جزیرہ کی تمام شاعری جو ان جذبوں کی شاعری ہے جسے پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے اکرام تبسم

اپنے ٹوٹے ہوئے جذبوں' زخمی زخمی خواہشوں کا اندمال کرنے کی کوشش میں لفظوں کو شعریت کا لبادہ دیتا ہے۔

پھر کس نے گرتے گرتے سہارا دیا مجھے
جب دوست تیرا ہاتھ مرے ہاتھ میں نہ تھا
تم اپنے گھر سے نکلتے تو دیکھ سکتے تھے
وفا کے دیپ جلائے تھے ہم نے پلکوں پر
تیرے نام کے سارے حرف سہانے ہیں
تجھ کو سوچنا سوچتے جانا اچھا ہے

یہ مجموعہ رومانوی انداز کا ایسا مجموعہ ہے جس کا جمال سارے شہر میں رچ بس گیا ہے جس طرح خوشبو ہوا کے ساتھ بکھر جاتی ہے اور ہر ایک کو اپنا اسیر کر جاتی ہے اسی طرح اکرام تبسم کے اشعار بھی شہر میں بکھرے جاتے ہیں' اور دلوں میں اترتے جاتے ہیں۔

موسم تھا خوب اور بڑا بے مثال تھا
شاید ہمارے ساتھ تمہارا خیال تھا
وہ کون تھا جو رہتا تھا سڑکوں پہ رات بھر
اس واقعے کا شہر میں چرچا رہا بہت
جیت ہر خانے میں رکھی ہے تبسم لیکن
ایک خانے میں چھپی مات بچا کر رکھ لے
زخم ہی زندگی کی دولت ہیں!
کوشش اندمال مت کرنا!

اکرام تبسم کے ہاں پلک' خواب' بہار اور تعبیر جیسے استعارے عام ملتے ہیں۔ وہ اپنے استعاروں میں محبوب کا عکس ڈھونڈتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ صرف خواب نہیں دیکھتا بلکہ تعبیر کی تلاش میں خوابوں کی منزل تک پہنچنے کے لئے اپنا دامن بھی پھیلا دیتا ہے۔

جب مل جائے منزل تم کو خوابوں کی
مجھ کو کچھ راہوں کے نقشے دے جانا
خواب پلکوں پہ سجانے والا
عمر بھر دکھ سے بھرا رہتا ہے

ان کی شاعری میں محبت کی تلاش جگہ جگہ ملتی ہے' وہ صحرا میں بھی جاکر محبت ہی تلاش کرتے ہیں' اور نفرت سے دور بھاگتے رہتے ہیں

صحرا میں سائبان کی صورت کہیں تو ہو
نفرت تو ہر جگہ ہے محبت کہیں تو ہو

اس خوبصورت مجموعے میں مختصر مختصر نظموں نے بھی جگہ گھیر رکھی ہے جو اپنا ایک تاثر رکھتی ہیں ان کی ایک نظم دیکھیں' عنوان ہے "ایک خواہش":

کہا اس نے
تمہارے ساتھ جو بھی وقت گزرا ہے
بہت اچھا بہت ہی خوبصورت تھا
میں چاہوں گی
کسی صورت یہ پھر واپس پلٹ آئے

ایسی ہی بے شمار نظمیں اس مجموعے میں ملتی ہیں جو اپنا تاثر چھوڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں "بازار مصر سے گزرتے ہوئے"۔ "چاندنی کا دکھ"۔ "سچ کے کڑوے بول سن" کی مثال دی جا سکتی ہے۔

یہ مجموعہ ملک کے نامور مصور اسلم کمال کی تصویروں سے آراستہ ہے۔ ہر تصویر اسلم کمال کے فن کی نمائندگی کرتی ہے۔

ڈاکٹر توصیف تبسم

توشہ

کتاب	:	توشہ
شاعر	:	سید حسنین کاظمی شاد
ناشر	:	کاروان دانش، سیکٹر آئی ۸/۱، اسلام آباد۔
قیمت	:	۷۵/- روپے

"توشہ" بزرگ شاعر سید حسنین کاظمی شاد کا مجموعہ کلام ہے جس میں حمد، نعت، منقبت، سلام اور ان کے مذہبی قصائد شامل ہیں۔ ان تمام منظومات کی تخلیق کا محرک جذبہ ان کا وہ حاسۂ مذہبی اور جذبہ ایمانی ہے جو اس شاعری کو اپنے لئے زاد راہ اور توشہ آخرت سمجھتا ہے۔ یوں نہ ہوتا تو وہ اپنے اس مجموعہ کلام کو یہ نام کبھی نہ دیتے ان کے اس بنیادی محرک جذبے کا اظہار ان شعروں میں دیکھئے ۔

الٰہی بخش دے دولت ہمیں عشق محمدؐ کی
عنایت ہم پہ اے مولا تری بے انتہا ہوگی

نظر آئے گا کچھ اس طرح جلوہ حق کا محشر میں
میری آنکھوں میں تصویر محمدؐ مصطفیٰ ہو گی

وہ گرچہ رحمت اللعالمین ہیں شادؔ عاصی پہ
نظر ہوگی عنایت کی مگر سب سے جدا ہوگی

اس مجموعہ کلام میں شامل منظومات کی تہہ میں اگرچہ رسولؐ اور آل رسولؐ کی محبت کا شدید جذبہ کارفرما ہے مگر شاعر کا شعور بھی کم توانا نہیں جس کی تقریر پر گرفت کہیں بھی کمزور نہیں پڑتی یہی وجہ ہے کہ جہاں اس صورت حال کے سبب ایک خاص قسم کی دماغی اور ذہنی شاعری ہمارے سامنے آئی ہے شاعر ان حدود کے تعین میں بھی کامیاب رہا ہے جو الوہیت، رسالت اور امامت کے نازک فرق اور مقام و منصب سے تعلق رکھتی ہے اور جن کا لحاظ ہمارے بہت سے نعت گو اور منقبت گو شاعر شعر کہتے ہوئے نہیں رکھ پاتے۔ شاد کو شاعری اور دینی روایات کا علم ورثے میں ملا ان کے والد گرامی میر سید حسین سعید، ایک اچھے شاعر اور عالم دین تھے، سید حسنین کاظمی شاد کی بیشتر شاعری، بیانیہ شاعری کے زمرے میں آتی ہے، وہ جب اقوال بزرگان دین، مذہبی روایات اور تلمیحات کو نظم کرتے ہیں تو نظم کرتے ہی چلے جاتے ہیں، روایات کو نظم کرنے کے رجحان کے سبب ان کی نعت، منقبت اور سلام میں اکثر قطعہ بند اشعار آتے ہیں کیونکہ کسی روایت کو تسلسل ہی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، اسی سلسلہ میں جب وہ مصائب اہل بیت کا ذکر کرتے ہیں

تو ان کے یہاں ایک خاص دردمندی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی ۔

پہنچ سکا نہ جو پانی سکینہ بی بی تک — حباب روتے ہیں، نہر فرات روتی ہے،
جو دن میں رونے پہ زینبؑ کے بندشیں ہیں کڑی — تو قید خانہ میں وہ ساری رات روتی ہے
سکینہ گوشۂ زندان میں بیٹھ کر دن بھر — کسی سے کرتی نہیں کوئی بات، روتی ہے
سب نے یہ جانا کہ شہ کے ہاتھ پر قرآن ہے — اصغر بے شیر جب میدان میں لائے گئے
رسیوں کے نیلے نیلے کچھ نشان دیکھے گئے — سید سجاد کے بازو جو کھلوائے گئے

"توشہ" میں شامل منظومات کے مطالعہ سے شاعر کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ سنگلاخ زمینوں میں بے تکان شعر کہتا چلا جاتا ہے[1] ایک زمین میں دو دو نعتیں اور دو غزلے کہنا بھی، اس کی قدرت کلام کا ثبوت فراہم کرتا ہے، مثلاً اس کا وہ سلام جس کی زمین ہے تاثیر چنگی ہیں، اکسیر چنگی میں اور تدبیر چنگی میں، اٹھارہ شعروں پر مشتمل ہے اسی طرح ایک اور سلام دو غزلے کی صورت میں ہے، زمین ہے، آل پیمبرؑ دھوپ میں، پتھر دھوپ میں وغیرہ، اس دو غزلے میں کل ۴۱ اشعار ہیں، ہمارے خیال میں شاد اگر نعت و منقبت میں صرف قصائد کہتے تو ان کے یہاں وہ قدرت اظہار اور زور بیان موجود تھے جو اس روبہ زوال صنف شاعری کو ترقی کے مدارج سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ اس مجموعہ کلام میں کچھ منظومات اگرچہ "قصائد" کے عنوان سے بھی شامل کی گئی ہیں، مگر وہ فنی لحاظ سے معروف معنی میں قصیدے نہیں کیونکہ شاعر نے شعر کہتے ہوئے قصیدے کے درجات ترتیبی اور فنی شرائط کا خیال نہیں رکھا۔ انہی منظومات میں سے جن کا موضوع میلاد حسن علیہ السلام اور میلاد حضرت عباسؓ ہے، قصائد سے زیادہ نظم کہنا مناسب ہوگا۔ پھر قصیدے کے لئے جس حلاوت لسانی، شکوہ الفاظ اور زور بیان کو اس کا لازمہ اور حسن قرار دیا گیا ہے وہ ان منظومات میں موجود نہیں۔ یوں ان کی بعض نعتوں میں یہ شکوہ لفظی اس حد تک موجود ہے کہ کبھی کبھی غرابت تک جا پہنچی ہے، مثلاً ان کی نعت جس کا پہلا مصرعہ نہ ہوں کیوں مفتخر ان کی رسالت پر نبی آدم میں، اعلم اکرم، ارحم، خالق مجرم وغیرہ بہت ہی غریب قوافی آئے ہیں، نعت و منقبت چونکہ اپنے موضوع کے لحاظ سے قصیدہ ہی کے تحت آتے ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے لفظی شکوہ پیدا کرنے کے لئے ایسے نامانوس الفاظ سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نعت منقبت اور سلام کا ایک تعلق اس کے پڑھنے اور سننے والے سے بھی ہے، یہ شاعری اخلاق حسنہ اور اعلیٰ کرداری خصوصیات کی تبلیغ کا وسیلہ بھی ہے، شعر میں اگر ایسے الفاظ و تراکیب لائے جائیں جو ایک عام آدمی کی فہم اور استطاعت سے بالاتر ہوں تو اس خاص قسم کی شاعری کا اثر اسی تناسب سے محدود ہو جاتا ہے، ہرچند کہ ایسے مقامات ان کے یہاں کم ہیں، لیکن جہاں وہ سادگی سے بات کرتے ہیں، وہاں لطف کلام اور تاثیر دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، ہمارے خیال میں اس مجموعہ کلام کا بہترین حصہ یہی شعر ہیں۔ نعت رسول مقبولؐ میں یہ شعر سنئے ۔

انتہا یہ کہ ابتدا ہی سے — پیشوا سارے انبیاءؑ کا ہے
جس کا ہوتا نہ تھا کہیں سایہ — میرے سر پر اسی کا سایا ہے

اس کی آواز نغمۂ وحدت لحن داؤد اس کا لہجہ ہے
قاب قوسین بن گئی اک حد ورنہ اس حد سے ماورا کیا ہے
راستہ عرش کے مسافر کا کہکشاؤں سے بھی گذرتا ہے
بس ترے در کی خاک، ایک چٹکی اور کیا میں نے تجھ سے مانگا ہے

نعت سلام کہتے ہوئے جب ان کا قلم خالص مدح اور بیان روایات کے راستے سے ہٹ کر تغزل کی راہ پر چل نکلتا ہے تو اس کے شعروں میں خاص جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دل میں گھٹ گھٹ کے رہے قطرۂ خوں کی مانند
اشک آنکھوں میں جو چھلکے تو روانی مانگے

ظاہری عشق سے ہوتی ہے بھلا کب تسکین
جاں نثاری ہے یہی درد نہانی مانگے

عشق میں یوسف بلھا کے زلیخائے سخن
آج پھر دامن عصمت سے جوانی مانگے

اور یہ سلام کے شعر دیکھئے

ہستیاں ایسی کہاں دیکھی ہیں چشم دہر نے
سنگباری میں بھی جو آئینہ ساماں ہوگئیں

قید خانے سے نکل کر کس طرح جاتے اسیر
سرد آہیں جب اٹھیں، دیوار زنداں ہوگئیں

ہم نے نعت، منقبت اور سلام کا جائزہ الگ الگ عنوانات کے تحت نہیں لیا، کیونکہ ہمارے خیال میں، منقبت اور سلام بھی بہرحال نعت ہی کی صورتیں ہیں، خود شاعر کا بھی یہی خیال ہے، ورنہ وہ نعت کہتے ہوئے منقبت اور سلام کے شعر نہ لکھتا: ع "ثناء ہو کس طرح امت سے اس یکتا پیمبر کی" میں یہ شعر ہمارے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے کافی ہیں، کہتے ہیں۔

وہ یکتائے زمانہ تھے کہ تھے نور نظر دونوں
یہ تھی چشم نبیؐ میں منزلت شبیرؑ و شبرؑ کی

وہ شہر علم ہیں اور شہر کا در حیدر صفدر
زہے قسمت جو دربانی ملے مجھ کو اسی در کی

اس گفتگو کا اختتام، سید حسنین کاظمی کی ایک نعت کے چند شعروں پر کرتے ہیں، ان اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے ہم بھی ان میں شاعر کے ساتھ برابر کے شریک ہیں:۔

زندگی مختصر ہے کار دراز اور شب و روز کا سفر ہے طویل
میرے مولا، یہ میری حسرت ہے بہر دید مدینہ، کوئی سبیل
شاخ زیتون کی نہیں خواہش ہو عطا مجھ کو ایک شاخ نخیل
آب زمزم کا ایک مشکیزہ کتنا جاں بخش ہے بوقت رحیل

حمد و نعت اور منقبت و سلام پر مشتمل یہ مجموعہ کلام "توشہ" کاروان دانش، سیکٹر آئی ۸/۱ اسلام آباد نے شائع کیا ہے، کتاب کی قیمت ۷۵ روپے ہے۔

شعیب اظہر

قفس رنگ

کتاب	:	قفس رنگ
مصنف	:	حزیں صدیقی
ناشر	:	مکتبہ جدید پریس، لاہور۔
سال اشاعت	:	۱۹۹۰ء
صفحات	:	۱۴۴
قیمت	:	۷۵/- روپے

"قفس رنگ" حزیں صدیقی کی غزلیات کا خوبصورت انتخاب ہے جو کوئی سال بھر قبل چھپ کر منظر عام پر آیا اور اس کی اشاعت سے ایک بار پھر ان تمام شکوک و شبہات کی نفی ہوگئی ہے جن کا واویلا نثری اور آزاد شاعری کے دعویدار کرتے آرہے تھے کہ غزل عصر نو کی ترجمانی کا بار نہیں اٹھا سکے گی۔ عاصی کرنالی نے کیا خوب بات کہی ہے کہ "جن اصحاب کے خیال میں دو مصرعے قاموس تخیل کو جذب نہیں کر سکتے اور جن غزل دشمنوں کی رائے میں غزل حسن و عشق کی حد بندیوں میں محدود اور افلاس فکر کے زنداں میں محبوس ہے، وہ آئیں اور حزیں صدیقی کی غزل کا مطالعہ کریں۔ انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ غزل جذب و خیال کی کثرت سامانیوں اور موضوعات و مضامین کی متنوع تجلیات کا حیرت کدہ اور جہان معانی و معارف کا آئینہ خانہ ہے۔" حزیں صدیقی کا شمار ملتان کی ادبی دنیا کے بزرگ ترین شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے ذرائع ابلاغ کی سرد مہری کی پرواہ کئے بغیر مشق سخن جاری رکھی، غزل ان کا اصلی میدان ہے، اختصار پسندی بحروں کے انتخاب سے ظاہر ہے، چھوٹی بحروں میں علامتی اسلوب اپناتے ہوئے متنوع مفہوم سا دیتے ہیں جو صرف انہیں کا خاصہ ہے اگر مجھے قفس رنگ کا تعارف ایک سطر میں کرانا پڑے تو صرف یہی کہوں گا کہ قفس رنگ کی اشاعت سے اچھی شاعری میں اضافہ ہوا ہے اور اچھی کتابوں میں بھی۔ ان تعارفی کلمات کے بعد آیئے، حزیں صدیقی کی غزل کا تفصیلی اور بنظر عمیق مطالعہ کریں۔

اپنے کلام کے آئینے میں حزیں صدیقی "خود آگہی کے متلاشی" کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور میرے خیال میں وہ کسی حد تک خود آگاہی کی دولت کم یاب تک رسائی میں کامیاب رہے ہیں، پھر اس دولت نایاب کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے شعروں کے ذریعے قاری تک بغیر کسی تامل کے، پہنچانے کے لئے کوشاں رہے ۔

عجب خود آگہی کے مرحلے ہیں
ہم اپنے سامنے حیران کھڑے ہیں
کل تیری جستجو تھی مرا مقصد حیات
پھرتا ہوں آج اپنا پتہ پوچھتا ہوا

انسان کو اپنی خفتہ قوتوں کے ادراک اور اپنی اصل کی شناسائی کا تجسس رہتا ہے۔ یہ مشکل مرحلہ کم از کم میرے نزدیک عرفان ذات یا خود آگہی کے بغیر سر نہیں ہو سکتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر پر ایک جنون سا طاری ہو گیا اور وہ گریباں چاک کر کے خود آگہی کی تلاش میں نکل کھڑا ہو بلکہ اس کے لئے ہوش و خرد، مکمل شعوری توانائی، تحقیق خیز بیداری اور روحانی تجسس ضروری ہوتے ہیں اور حزیں صدیقی کے ہاں ان چاروں عوامل کی کمی نہیں، اس چیز سے وہ خود بھی بخوبی آگاہ ہیں:

تلاش ذات نہ جانے ہمیں کہاں لے جائے
نہ جانے اپنے تعاقب میں ہم کدھر جائیں

مگر وہ اس حقیقت کا بھی بھرپور ادراک رکھتے ہیں کہ:

ہر مسافر کے لئے ہوں سنگ میل
میں کسی کی راہ کا پتھر نہیں

خود آگہی کے سفر میں اپنے باطن کا مطالعہ صرف ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ آہستہ آہستہ انسانی فطرت کی قوتوں کو بھی بے نقاب کر جاتا ہے، ایسے موضوعات حزیں صدیقی کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں جس کے لئے وہ "آئینہ" کا استعارہ استعمال کرتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

آئینے محروم جوہر ہو گئے
پتھروں میں رہ کے پتھر ہو گئے
انجمن انجمن ہیولے ہیں
آئینے عکس کو ترستے ہیں
نگار خانہ ہستی کا ہائے وہ منظر
جب آئینوں میں کوئی عکس جلوہ گر نہ رہے
عکس ہے اپنے خیالوں کا میرے خوابوں میں
کچھ ترے آئینہ خانے سے چرایا تو نہیں
رات آئینے کو عجب سوجھی
تیرا چہرہ دکھا دیا مجھ کو
کس کی آواز کا عکس ہوں، دل میں سوچا بہت
آئینہ کچھ بتاتا نہیں، میں نے پوچھا بہت
میں تو آئینے کے موجد کو دعا دیتا ہوں
یہ بہر طور مرے سامنے لاتا ہے مجھے

دیکھئے کہ شاعر نے زندگی کے کتنے رنگا رنگ اور متنوع پہلوؤں کو مخصوص داخلی کیفیات کے حوالے سے "آئینے" کے استعاراتی توسط سے شعری روپ بخشا ہے۔ حزیں صدیقی ان خیالات کو عمومی بیانیہ انداز

میں پیش کر سکتے تھے مگر اس صورت میں نہ تو گہرا تاثر در آتا اور نہ جمالیاتی حسن پیدا ہوتا۔ یہ بات نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ حزیں کا کلام جمالیاتی حوالے سے بھرپور کلام ہے اگرچہ ان کے اشعار تشبیہی، استعاراتی اور کنایاتی اسلوب پر اصرار کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی جمالیات دوستی ان کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دور نہیں بلکہ باخبر رکھتی ہے۔

اترے تھے آسمان سے زمیں کو سنوارنے
رکھ دی اڑا کے خاک غم روزگار نے
کون سے منظر کا پس منظر نہیں
حسن جو باہر ہے وہ اندر نہیں

زیر نظر مجموعہ کلام کا انتساب اس عظمت کے نام ہے جسے "ماں" کہتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ انتساب حزیں صدیقی کے فکر و فن تک رسائی کا پہلا زینہ بھی ہے اور آخری بھی، یہ شاعر مجید امجد اور ظہور نظر کے قبیلے کا فرد لگتا ہے جس کا شعری افق بہت سے معاصر شعراء سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جس کا روئے سخن، اس کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے نتیجہ میں اخذ کردہ اپنے موضوعات ہیں جو حزیں صدیقی کو معاصرین میں ممتاز بنا دیتے ہیں، موتیوں کی طرح پروئے ہوئے مختلف موضوعات سے بھرپور "قفس رنگ" کو جہاں سے کھو لئے، ایسا لگتا ہے کہ چھٹی کے وقت کسی سکول کا پھاٹک کھلا ہو اور جس دھوم دھام سے لڑکے لڑکیاں باہر نکلتے ہیں، اسی قسم کا تنوع حزیں صدیقی کی غزلیات میں ملتا ہے۔

وہ خاک زمزمہ آگہی خریدیں گے
شکست ساز کی جھنکار سے جو ڈر جائیں
رونا چاہیں بھی تو رو سکتے نہیں
قہقہے جن کا مقدر ہو گئے
وجہ لکھوں گا برے حالات کی
جب کبھی حالات بہتر ہو گئے

حسن و عشق۔۔۔۔۔۔ کلاسیکی اردو غزل کے دو بنیادی موضوعات ہیں۔ اگرچہ جدید شاعری میں غم روزگار کی بھرمار نے غزل سے اس کا یہ مخصوص کلاسیکل رومانی رنگ چھین لیا ہے، بہرحال حزیں صدیقی نے اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے جداگانہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے اپنی غزلیات میں حسن و عشق کے تصورات کے تحت جبلی تقاضوں سے کہیں دور علامتی انداز اختیار کیا ہے۔ ان کے ہاں دوسروں کی طرح محبوب کی بے وفائیوں اور کج ادائیوں کی تکرار کی بجائے حقیقتوں کے اعتراف و ادراک کا عنصر ملتا ہے۔

شرح تمنا کیا اے دوست؟
ایک افسانہ بے عنوان
حسن کہاں ہے، ایک ہیولہ گلشن کا سرمایہ ہے
عشق کہاں ہے، ایک بگولہ فرد بساط صحرا ہے

"قفس رنگ" کا استعارہ حزیں صدیقی کے کلام میں بکثرت ملتا ہے جو غالباً عرفان ذات کے تجسس، اجتماعیت سے وابستگی اور حقیقت پسندی کی تشکیک سے وجود میں آیا ہے۔

کیا ملا ذات سے جدا ہو کر
کھو گیا ہوں ترا پتا ہو کر
قفس رنگ سے رہا ہوکر
رہ گئی بوئے گل ہوا ہوکر
زندگی خواب ہے نہ افسانہ
یہ حقیقت کھلی فنا ہو کر

رنگ ــــ خوشبو ــــ دریچہ ــــ پتھر ــــ پھول ــــ سمندر ــــ اور دریا جیسی روزمرہ کی مستعمل علامات کے ذریعے حزیں نے زندگی کے مختلف گوشے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جس کا اندازہ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

فصیل رنگ کی تسخیر ہو تو کیوں کر ہو؟
صبا ہے ساتھ نہ خوشبو کی ہمر کابی ہے
میں تو دریا ہوں ملوں خود جاکر
وہ سمندر ہے ادھر کیوں آئے؟
ایسی محبوس بھی نہیں خوشبو
قفس رنگ میں جھروکے ہیں

مگر میری بات کا یہ مطلب نہیں کہ حزیں صدیقی علامات کے جا و بے جا استعمال کے درپے ہے بلکہ وہ تو خود آگاہی کے ادراک کے لئے اردگرد کے ماحول کا تجزیہ کرتا ہے اور اسی مقصد کی خاطر روزمرہ زندگی سے قریب تر نئی علامات تراشتا ہے۔ یہ علامات ایک تندرست ذہن اور درد مند دل کے ساتھ صحت مند شعریت کی بھی عکاس ہیں اور رنگ تغزل کی بقاء کی آئینہ دار بھی ــــ حزیں نے جس دور میں شعر کہنا شروع کیا وہ جوش کی پرجوش نظموں کا دور تھا' اقبال کی پر فکر نظمیہ شاعری کی پذیرائی کا عہد تھا' حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا زمانہ تھا مگر حزیں شروع سے اب تک غزلیں کہہ رہا ہے' اس کی غزلیں خیالی' غیر حقیقی اور ماورائی احساسات پر مبنی نہیں بلکہ حزیں کے غیر روایتی احساس کا بے باکانہ اظہار ہیں۔ ناصر کاظمی' جگر مراد آبادی اور عبد الحمید عدم کے بعد اگر کسی نے غزل کا حقیقی اسلوب اپنایا ہے تو وہ حزیں صدیقی' نذیر قیصر اور شہزاد احمد جیسے چند ایک شعراء ہیں ورنہ اکثر اوقات غزلوں میں موضوعات کی فراوانی تو ہوتی ہے مگر غزل کی روانی اور تازگی کا احساس بہت کم ملتا ہے۔

حزیں صدیقی کی پوری شاعری ــــ خواہ غزل ہو' نظم ہو' قطعات ہوں' سلام ہو یا نعت ــــ انوکھے تجربات سے عبارت ہے' تجربے کے بغیر کسی بھی فن کی ترقی اور توسیع ناممکن ہے' حزیں صدیقی کے تجربات بے معنی نہیں بلکہ ان کے ہاں غزل میں دو خوش کن رجحانات ملے ہیں (ا) جدید اردو نظم سے قربت (ب) قدیم ہندی گیتوں سے قربت ان کی زبان اور اسلوب جدید تر شعری تحریکوں سے متاثر ہونے کے باوجود فارسی کی خوشگوار روایتی تراکیب اور روایتی لفظیات سے ہم آہنگ ہے۔ حزیں صدیقی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔

امجد طفیل

شجر ممنوعہ

تصنیف	:	شجر ممنوعہ
مصنف	:	منیر الدین احمد
سال اشاعت	:	۱۹۹۱ء
ناشر	:	مکتبہ "ادب لطیف" ۳۴۔ سی گلبرگ۔ ۳، لاہور۔
صفحات	:	۲۵۶
قیمت	:	۲۵۰ روپے

اردو لکھنے والوں کی ایک معقول تعداد برصغیر پاک و ہند سے باہر آباد ہے۔ یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں مقیم یہ ادیب ایک سطح پر اپنی زبان کے مرکز سے دور ہونے کے سبب اگر اردو میں لکھے جانے والے ادب سے خاصی حد تک منقطع ہو جاتے ہیں تو دوسری سطح پر یہ ادیب جس ملک میں مقیم ہو وہاں کے زبان و ادب سے رشتہ استوار کرنے کے مواقع انہیں زیادہ میسر آتے ہیں۔ جس سے امید پیدا ہوتی ہے کہ یہ لوگ موضوعات، اسلوب، فن کاری اور دیگر حوالوں سے اپنے زبان و ادب میں وسعت پیدا کریں گے۔ بعض ادباء نے واقعی ایسا کیا بھی ہے جن میں عبد اللہ حسین، محمد عمر میمن اور ساقی فاروقی کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ خاص طور پر یورپ میں مقیم اردو ادباء کے پاس وسیع مواقع ہوتے ہیں کہ وہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دیگر زبان کے ادب سے براہ راست رشتہ استوار کریں اور ان ممالک کی تہذیب و معاشرت کو قریب سے دیکھتے ہوئے اپنے فنی تجربے کا حصہ بنائیں۔ منیر الدین احمد کا شمار ایسے ہی لکھنے والوں میں ہوتا ہے جو ایک طویل عرصے سے جرمنی میں آباد ہیں اور انہوں نے دو سطحوں پر کام کیا ہے۔ ایک پاکستانی ادب کے جرمن میں تراجم کئے ہیں جس سے پاکستان کے ادیبوں کو ایک ایسا حلقہ ملا جس میں پہلے ان کی پہنچ نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسری سطح پر انہوں نے معاصر جرمن ادب و افسانے کو اردو کے قالب میں ڈھالا تاکہ اردو کا قاری ایک بڑی یورپی زبان کے تخلیق کاروں کے تجربات میں شریک ہو سکے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے اندر کے تخلیق کار کو مترجم کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا اور "زرد ستارہ" کے بعد ان کی دوسری کتاب "شجر ممنوعہ" منظر عام پر آئی ہے جس میں ان کے افسانے، نظمانے اور نثرانے شامل ہیں، بات کی ابتداء ہم ان کے افسانوں سے کرتے ہیں۔

اپنے پیش لفظ میں منیر الدین احمد نے "ہجرتی ادب" کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے مختصر بات ان

اردو ادیبوں کے بارے میں کی ہے جو ملک سے دور رہ کر ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"اس وجہ سے ان کا تخلیق کردہ ادب بیشتر صورتوں میں ادب کے اس دھارے سے جداگانہ ہوتا ہے جو پاک و ہند میں لکھا جارہا ہے۔ اس بات کا اظہار بعض اوقات زبان کے برتاؤ سے ہوتا ہے جس کا سبب ان ملکوں کی زبانیں بنتی ہیں جو تخلیق کار کے گرد و پیش بولی جاتی ہیں۔ اور جو خود اس کے لئے روز مرہ کی زبان کا درجہ رکھتی ہے" (ص ۔ ۳۰)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ "ہجرتی ادب" میں ایسے موضوعات ملتے ہیں جو اردو قاری کے لئے قدرے اجنبی ہیں یا اس حد تک تو ہمیں منیر الدین احمد کے ہاں بھی ایسی کہانیاں ملتی ہیں جو پاکستان میں لکھی جانے والی اردو کہانی سے موضوع کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن جہاں تک زبان کے برتاؤ کا تعلق ہے تو میری رائے میں ان کی تحریروں کی زبان پر ہمیں قیام جرمن کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا سوائے زبان کی کہیں کہیں اغلاط کے۔

منیر الدین احمد کا اسلوب بیانیہ ہے اور اس حوالے سے ہمیں ان کے ہاں ان تجربات کا نشان نہیں ملتا جو اردو افسانے میں پچھلے بتیس سالوں کے دوران کئے جاتے رہے ہیں وہ کہانی کو غیر روایتی انداز میں کسی بھی جگہ سے شروع کرتے ہیں اور بیانیہ زور پر چلاتے ہوئے کسی نقطے پر ختم کر دیتے ہیں اس طرز میں کہانی لکھنا ایک مشکل فن ہے ہر دفعہ یہ خدشہ گھیرے رہتا ہے کہ کہانی سپاٹ نہ ہو جائے۔ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس تکنیک کو اچھے انداز سے برتنے کی کوشش کی ہے اور "جولیا جولیا" "بروک بروک" "نسیاں کے نہاں خانے" "نوکروں کا زینہ" اور خاص طور پر "رستے کنویں کے سائے میں زندگی" ان کے کامیاب افسانے ہیں۔ منیرالدین احمد کی کہانیوں کے کردار متنوع جاندار اور زندگی کی حرارت سے بھرپور ہیں انہوں نے نفس انسانی کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے اور انسان کے بعض ایسے روپ سامنے لائے ہیں جو عموماً ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں پہلے مقدمے کا ملزم "جولیا" اور "رستے کنویں" والا فضل عرف ھیبو اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے کردار بھی خاصی کامیابی سے تخلیق کئے گئے ہیں۔

منیر الدین احمد کے افسانوں کی دنیا میں پاکستان اور جرمن ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا گاؤں راولپنڈی شہر اور جرمنی کے شہر ایک ہی افسانے میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں "ملوک سنگھ کا پوتا" خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے تقسیم سے پہلے کے حالات اور جرمنی کی موجودہ صورتحال اور خاص طور پر پاک و ہند کے لوگوں کا احوال جمع کر دیا ہے۔ اس طرح یہ افسانہ زماں و مکاں کی حدبندیوں کو توڑتا ہے اور دو مختلف زمان و مکان میں مختلف صورتحال کے تقابل سے افسانہ نگار نے انسانی زندگی کے مختلف رخ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

منیر الدین احمد کے بیانیہ میں کافی قوت ہے اور انہوں نے کافی رواں نثر لکھی ہے اس میں موضوعات کی جدت قاری کے لئے دلچسپی کے کافی سامان رکھتی ہے۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے قاری ان حالات و کیفیات سے دو چار ہوتا ہے جو ابھی ہمارے معاشرے کے لئے اجنبی ہیں جنہیں خود افسانہ نگار نے ہمارا مستقبل قرار دیا ہے جو بقول ان کے اگر کسی کسی جگہ ہمیں نظر آجائے تو ہمیں اسے اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے۔

اردو میں مختصر افسانے لکھنے کا باقاعدہ آغاز منٹو سے ہوتا ہے اور "سیاہ حاشئے" پہلی کتاب ہے جس میں مختصر افسانچے شامل کئے گئے تھے اس کے بعد کئی افسانہ نگاروں نے افسانچے لکھنے کی کوشش کی نئے لکھنے والوں میں جوگیندر پال کے افسانچوں پر مشتمل ایک مجموعہ چند سال پیشتر منظرعام پر آیا تھا۔ منیر الدین احمد نے بھی اپنے اس مجموعے میں افسانچے شامل کئے ہیں اور انہیں نثرانے کا نام دیا ہے۔

"شجر ممنوعہ" میں منیر الدین احمد کے سترہ نثرانے شامل ہیں۔ ان فن پاروں میں چونکا دینے والے انجام کے بل پر طنز کے نشتر سے مختلف معاشرتی رویوں کو ہدف بنایا ہے۔ ان نثرانوں میں بھی ہمیں دو تہذیبیں پہلو بہ پہلو ملتی ہیں۔ زیادہ تر نثرانے جدید مغرب اور منیر الدین احمد کے حوالے سے بطور خاص جرمن تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بعض بعض جگہ طنز بہت کاری ہے اور پڑھنے والے بھی اس کی چبھن محسوس کرتے ہیں دوسرے مقامات پر طنز اگرچہ مخفی ہے لیکن اس کی مار کافی زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک مثال درج ذیل ہے۔

"ہمسائے" میں انہوں نے مغربی معاشرے کی مغائرت اور افراد کی ایک دوسرے سے لاتعلقی کو موضوع بنایا ہے اور اس کے موضوع کو بیان کرنے کے لئے انہوں نے خوبصورت طرز کو اپنایا ہے۔

> "کون تصور کر سکتا ہے اس تین سالہ بچے کے وہم و غم کا جس نے اپنے ہمسایوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی خاطر ڈھیروں کاغذوں کو پھاڑ کر دروازے میں بنی ڈاک کی درز سے باہر پھینکا تھا' بلکہ اپنے عزیز ترین کھلونوں کو بھی اسی راستے مکان سے باہر دھکیل دیا تھا' ہمسایوں کو اس کے رونے کی آوازیں سنائی نہ دی تھیں۔ انہوں نے آپس میں چہ میگوئیاں کی تھیں اور اس کی ماں کو کوسا تھا جو اپنے بچے کو اس طرح دروازے پر گند پھیلانے سے نہ روکتی تھی' پولیس کو انہوں نے اس وقت بلایا جب تین روز تک دودھ کی بوتلیں دروازے پر جمع ہوتی رہی تھیں۔ پولیس دروازہ توڑ کر اندر گئی تو دیکھا بچہ بھوک' پیاس اور غم سے نڈھال اپنی ماں کے پاس فرش پر بیٹھا ہوا تھا جو تین روز قبل دل کا دورہ پڑنے سے مرگئی تھی" (ص۔ ۱۹۷)

اس مختصر سے نثرپارے میں انہوں نے جس خوبصورتی سے معاصر مغربی زندگی کے ایک رخ کو پیش کیا ہے اسے شاید کسی طویل افسانے میں بھی اتنی خوبصورتی سے پیش کرنا مشکل تھا۔ ایسا بچہ جو تین دن تک اکیلا اپنی ماں کی لاش کے پاس بیٹھا رہا ہو اس کے ذہنی و نفسیاتی احوال کا تصور ہی فرد پر لرزا طاری کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس کتاب کے تیسرے حصے کو انہوں نے "نظمانے" کا نام دیا ہے اور پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انہیں ان تحریروں کے نظم ہونے پر اصرار نہیں لیکن نثر ہونے پر اصرار کیا ہے۔ بادی النظر میں ہمیں ان پر نثری نظم کا گمان ہوتا ہے۔ منیر احمد نے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے

> "اس مجموعے میں افسانے' نثرانے نظمانے یکجا پیش کئے جارہے ہیں افسانے میری اور نثرانے زندگی کی تخلیق ہیں۔ رہے نظمانے' تو مجھے ان کے نظم ہونے کے بارے میں کوئی دعوی نہیں ہے' البتہ ان کے نثر ہونے پر مجھے اصرار ہے۔" (ص۔ ۱۴)

ہمارے ہاں نثری نظم کے حوالے سے بحث اب تقریباً پرانی ہو چلی ہے لیکن منیر الدین احمد نے اپنے

موقف کی وضاحت کرتے ہوئے بالواسطہ انداز میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ اگر نثر میں جان ہو تو اسے بہتر بنانے کے لئے اس پر نظم کا لیبل چسپاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگرچہ ہیئت کے اعتبار سے انہوں نے چھوٹی چھوٹی سطروں میں نظمانے تخلیق کئے ہیں لیکن پڑھنے والوں کو اس میں ایک بہاؤ اور ردم کا احساس ضرور ہوتا ہے یوں اگر انہیں شاعر بننے کا شوق ہوتا تو وہ ہمارے دوسرے نثری نظم کے بل پر شاعر بننے کی جدوجہد میں کوشاں لوگوں کی صف میں باآسانی بار پا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے خود کو نثر نگار کے طور پر ہی پیش کیا ہے۔ ان کے نظمانیے میں موجود باطنی آہنگ اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر نثر سلیقے سے لکھی گئی ہو تو اس میں بھی بہاؤ اور ردم نظم کے قریب چلا جاتا ہے۔

"ہوا کی منزل"

ہوا رواں دواں ہے
وہ سارا سارا دن چلتی ہے
اور رات رات بھر
بلا تکان
ستانے سے لاپرواہ
اپنے ساتھ لئے جاتی ہے
پانی کی روانی کو
پھولوں کی باس کو
پرندوں کی چہکار کو
صبح کی تازگی کو
سورج کی تمازت کو
شام کے جھٹ پٹے کو
رات کی سیاہی کو

بس انسانوں سے وہ کنی کتراتی ہے
اور خاطر میں ہی نہیں لاتی ان کو
بچپن کے بھولپن کو
جوانی کی لاپرواہی کو
بڑھاپے کی یادوں کو
دن کے خوابوں کو
راتوں کی آہوں کو

وہ ان کے پاس سے یوں گزرتی ہے
جیسے ان کا وجود ہی نہ ہو
جیسے وہ محض ہوا ہوں (ص: ۲۰۸۔ ۲۰۹)

ان "نظمانوں" میں موضوعات کو تنوع اور طرز کی لہر خوبصورت بناتی ہے۔ منیر الدین احمد نے اپنے افسانوں کو اپنی اور نثرانوں کو زندگی کی تخلیق قرار دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "نظمانے" مصنف اور زندگی نے مل کر تخلیق کئے ہیں۔ اس لئے مجھے وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

سہ ماہی "ادبیات" میں جملہ ادبی اصناف میں تازہ کتابوں پر جائزے شامل کرنے پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ جائزے کے لئے مصنفین اور ناشرین کی طرف سے مدیر اعلیٰ کے نام ان کی تازہ کتابوں کے دو دو نسخوں کی ترسیل ضروری ہے۔
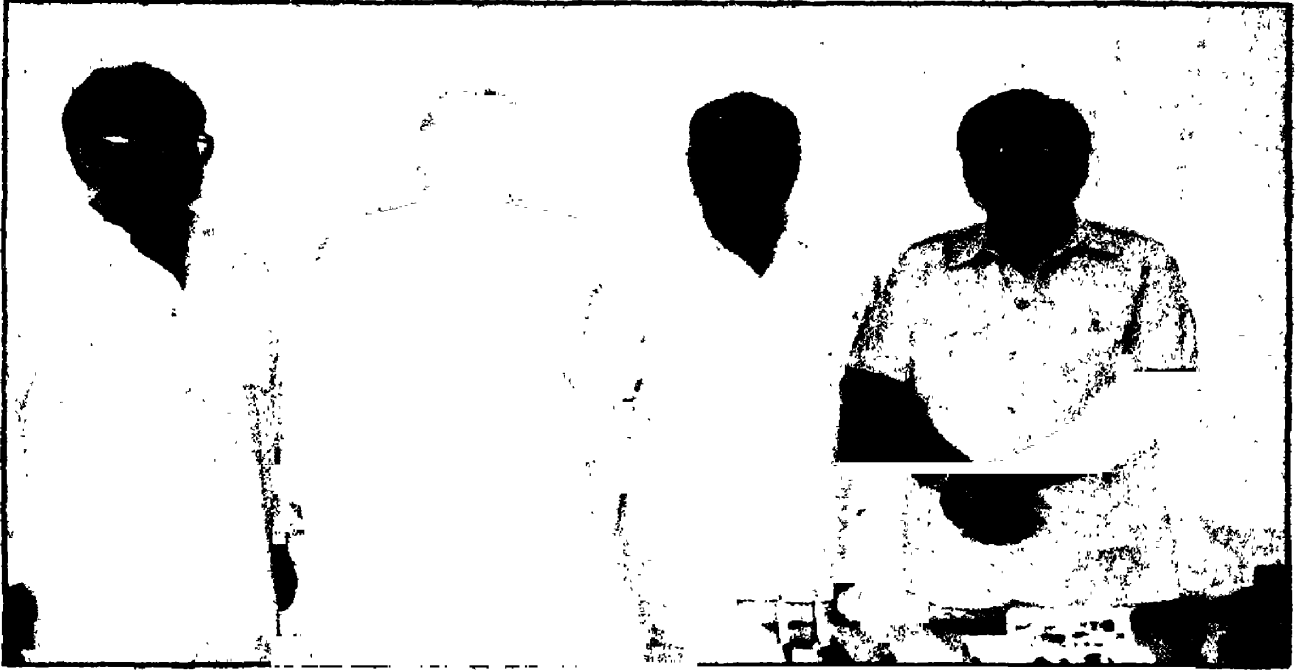
غلام ربانی آگرو، احمد مرزا جمیل، سجاد حیدر، افتخار عارف
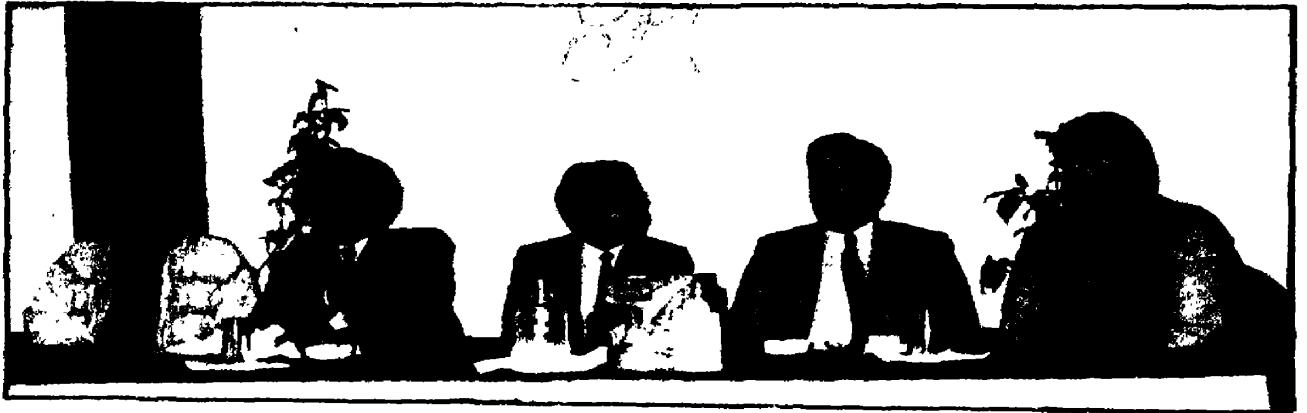
افتخار عارف، عطا الحق قاسمی، اختر حسین جعفری، انیس ناگی، منصور آفاق

امراؤ طارق' محمود شام' مشتاق احمد یوسفی' گلنار آفریں' محسن بھوپالی' اظہر جاوید' نسیم درانی

قلمی معاونین کے پتے

۱۔ Agha Babar
50 X 177 White Plaino Road
Tarry Town- NY 10591- U.S.A

۲۔ آفتاب اقبال شمیم،
۱۱۵۔ آئی ۹/۱،
اسلام آباد۔

۳۔ (ڈاکٹر) ابرار احمد،
۷۹۳۔ ای، گلشن راوی،
لاہور۔

۴۔ ابو سعید قریشی،
۸۱۔ بی، بلاک۔ ۲، گلشن اقبال
کراچی۔۴۷

۵۔ اختر گلخ،
فلیٹ نمبر ۷، بلاک نمبر ا،
ایف آئی اے فلیٹس،
جی ۸/۲
اسلام آباد۔

۶۔ اختر ہوشیار پوری،
۵۴۸۔ او، محلہ کرتار پورہ،
راولپنڈی۔

۷۔ ادیب سہیل،
انجمن ترقی اردو پاکستان،
ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،
کراچی۔

۸ اشرف جاوید،
اسٹیٹ بینک آفیسرز کالونی،
گلبرگ III،
لاہور۔

۹۔ اشرف سلیم،
کوٹھی رتن چند (رتن باغ)،
میو ہسپتال
لاہور۔

۱۰۔ اطہر ناسک،
معرفت سیمزن مووینر، رائل پارک
لاہور۔

۱۱۔ اقتدار جاوید،
منیجر
حبیب بینک لمیٹڈ،
ملک وال (ضلع گجرات)

۱۲۔ اکبر حمیدی،
۱۸۔ ڈی، گلی نمبر ۲۲،
جی ۔ ۶/۲
اسلام آباد۔

۱۳۔ انجم سلیمی،
۲۔ جناح کالونی،
فیصل آباد۔

۱۴۔ انجم یوسف زئی،
کیڈٹ کالج،
رزمک (وزیرستان)

۱۵۔ الطاف فاطمہ،
۲۶۔ گنج گلی، حبیب اللہ روڈ،
لاہور۔

۱۶۔ انور جمال،
گورنمنٹ کالج، سول لائنز
ملتان۔

۱۷۔ (ڈاکٹر) انور زاہدی،
۱۹۱۸۔ آئی ۱۰/۱،
اسلام آباد۔

۱۸۔ انور شعور،
"سب رنگ" ۷۔۴۔ پریس چیمبرز،
آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔

۱۹۔ تصدق شعار،
سید ہوسٹل، کرشن نگر،
لاہور۔

۲۰۔ (ڈاکٹر) توصیف تبسم،
۶۸۷، گلی نمبر ۶، جی ۳/۹،
اسلام آباد۔

۲۱۔ جاوید احمد،
ریڈیو پاکستان،
لین نمبر ۳، پشاور روڈ،
راولپنڈی۔

۲۲۔ جاوید شاہین،
"۱ تدریس" شام نگر،
لاہور ۔ ۲۵

۲۳۔ جعفر شیرازی،
۵۵۴۔ کے، شیراز کاٹیج،
فرید ٹاؤن
ساہیوال۔

۲۴۔ جان کاشمیری
۲۔ منہاس پورہ،
گوجرانوالہ۔

۲۵۔ جلیل عالی،
فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج برائے طلباء
راولپنڈی، صدر

۲۶۔ جیلانی کامران،
۳۱۰۔ نشتر بلاک، اقبال ٹاؤن،
لاہور۔

۲۷۔ حبیب فخری،
۲۰۱۵۔ آئی ۲/۱۰،
اسلام آباد۔

۲۸۔ حزیں لدھیانوی،
۱۱۔ پی، جھنگ بازار،
فیصل آباد۔

۲۹۔ حمید قیصر،
۳۶۶، گلی ۲۷، جی ۸/۱،
اسلام آباد۔

۳۰۔ حنیف باوا،
مکان نمبر ۵۵الف اے، نواں شہر
جھنگ صدر۔

۳۱۔ خادم رزمی،
وارڈ نمبر ۹، نزد چلڈرن پارک،
کبیروالہ (ضلع خانیوال)

۳۲۔ خوشی محمد طارق،
سابق ممبر ضلع کونسل،
معرفت بابو گل، ۲۱۷، سینما بازار
گلگت۔

۳۳۔ خیرالدین انصاری،
مکان نمبر ۹۲۵۔اے، سیٹلائٹ ٹاؤن،
جھنگ۔

۳۴۔ رفعت سلطان،
باہو کاٹیج، رانا کالونی،
جھنگ صدر۔

۳۵۔ Rafat Murtaza
1382- Lapaloma Circle
'inter Spring FL- 32708
U.S.A

۳۶۔ (ڈاکٹر) ریاض مجید،
۳۸۰۔ ڈی، پیپلز کالونی،
فیصل آباد۔

۳۷۔ روحی کنجاہی،
۵۹۵/A11، بلاک ۴، ٹاؤن شپ،
لاہور۔

۳۸۔ رفیق سندیلوی،
۲۵۷، گلی ۲۰، جی ۸/۱،
اسلام آباد۔

۳۹۔ زوار حسین،
"سار کاٹیج" جسٹس حمید کالونی
ملتان۔

۴۰۔ ستار سید
سنٹرل پروڈکشن یونٹ
ریڈیو پاکستان
لاہور

۴۱۔ سید تابش الوری،
۱۳۔ اے، سیٹلائٹ ٹاؤن
بہاولپور۔

۴۲۔ سعید احمد،
مکان نمبر ۳۱۲۔ ایس اے، سروس روڈ،
صادق آباد، راولپنڈی۔

۴۳۔ سید مشکور حسین یاد،
۸۔ ظفر کالونی، ندیم شہید روڈ،
سمن آباد،
لاہور۔

۴۴۔ شبنم شکیل،
۹۔ سٹریٹ ۲، ایف ۳/۷،
اسلام آباد۔

۴۵۔ شعیب انصر،
سب ایڈیٹر روزنامہ "آفتاب"
حسن پروانہ کالونی،
ملتان۔

۴۶۔ شوکت کاظمی،
ایڈیشنل سیکرٹری،
پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن،
کمرہ نمبر ۲۱۴، پی بلاک،
پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد۔

۴۷۔ شوکت واسطی،
پوسٹ بکس نمبر ۱۹۳۵،
اسلام آباد۔

۴۸۔ شہزاد احمد،
۱۳۰۔ ڈی، آفیسرز کالونی، غازی روڈ،
لاہور۔

۴۹۔ صابر ظفر،
سی۔۵۰، پنجابی کالونی،
بالمقابل فیڈرل کیپٹل ایریا،
کراچی۔

۵۰۔ صادق نسیم،
۶۵۔ دہلی روڈ، ویسٹریج،
راولپنڈی۔

۵۱۔ ضیاء جالندھری،
۱۷۔ گلی۔ ۱۳، ایف ۲/۷،
اسلام آباد۔

۵۲۔ ظفر اقبال،
ایڈووکیٹ
ضلع کچہری، اوکاڑہ۔

۵۳۔ عباس تابش،
لیکچرار اردو،
گورنمنٹ انٹر کالج،
لالہ موسیٰ۔

۵۴۔ عباس خان،
معرفت کاروان بک سینٹر،
ملتان، صدر۔

۵۵۔ عدنان بیگ،
۷۔ حفیظ پارک،
گوجرہ
(ضلع فیصل آباد)

۵۶۔ عطیہ خلیل عرب،
۵/۷۔ رمپا اسکائی لائن،
شارع فیصل،
کراچی۔

۵۷۔ عبدالحمید اعظمی،
سپیچ رائٹرز سیل،
پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ،
اسلام آباد۔

۵۸۔ عبدالغنی خان غنی،
ولی باغ
چارسدہ۔

۵۹۔ عبدالکافی ادیب،
محلہ معروف خیل،
چارسدہ ٹاؤن،
چارسدہ۔

۶۰۔ علی تنہا،
سینئر پروڈیوسر، ریڈیو پاکستان،
ملتان۔

۶۱۔ غلام جیلانی اصغر،
۶۳۔ کلب روڈ،
سرگودھا۔

۶۲۔ غلام حسین ساجد،
۵۴۱، جناح سٹریٹ، جلالی کالونی،
صدیقیہ روڈ، نیو گلگشت،
ملتان۔

۶۳۔ غلام ربانی آگرو،
چیئرمین،
اکادمی ادبیات پاکستان،
سیکٹر ایچ ۸/۱،
اسلام آباد۔

۶۴۔ غلام الثقلین نقوی،
۴۷ا۔ بدر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن،
لاہور۔۱۸

۶۵۔ غلام محمد قاصر،
۲۸۲۔ کے/۴، فیز ۳، حیات آباد،
پشاور۔

۶۶۔ فاطمہ حسن،
۵/۱۱، بلاک ۱۳۔اے، گلشن اقبال،
کراچی۔

۶۷۔ قلندر مومند،
۶۔ خوشحال کالونی،
نزد روڈ ویز ہاؤس،
پشاور۔

۶۸۔ قمر رضا شہزاد،
۲۳۔ "المرتضیٰ"
کبیروالہ (ضلع خانیوال)

۶۹۔ کرم حیدری،
۹۔ بی، سیٹلائٹ ٹاؤن،
راولپنڈی۔

۷۰۔ گلزار بخاری،
اسسٹنٹ پروفیسر،
گورنمنٹ دیال سنگھ کالج،
لاہور۔

۷۱۔ محب عارفی،
مکان نمبر ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۳، عزیز آباد،
فیڈرل بی ایریا، بلاک نمبر ۸،
کراچی۔

۷۲۔ 'Masood Munawar
Syrin Vegen 15 A
3408 TRAN -BY
NORWAY.

۷۳۔ محشر بدایونی،
"برگ وبار"
سی۔۵۷، بلاک ایل، شمالی ناظم آباد،
کراچی۔

۷۴۔ محمد افسر ساجد،
اے سی (جنرل) کمشنر آفس،
فیصل آباد۔

۷۵۔ (ڈاکٹر) محمد ریاض،
چیئرمین، شعبہ اقبالیات،
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،
اسلام آباد۔

۷۶۔ (ڈاکٹر) مرزا حامد بیگ'
گورنمنٹ ڈگری کالج'
اٹک۔

۷۷۔ محمد نذیر'
۵۶۸' سیکٹر اے ون' ٹاؤن شپ'
لاہور۔

۷۸۔ منظور بلوچ
۱۲۶۔ بی' گلی ۲۳'
جی ۲/۱۔۶' اسلام آباد۔

۷۹۔ محمود احمد قاضی'
ملت کالونی نمبر۲' راہوالی'
گوجرانوالہ۔

۸۰۔ محمود علی محمود'
۲۸۵۔ یو' فرید ٹاؤن'
ساہیوال۔

۸۱۔ محمد خالد'
۴۔ ڈی' طارق سٹریٹ'
اسلامیہ پارک' پونچھ روڈ'
لاہور۔

۸۲۔ مقبول الٰہی'
۹۔ ڈی' سیٹلائٹ ٹاؤن'
راولپنڈی۔

۸۳۔ مقصود زاہدی'
۱۹۱۸' گلی نمبر ۱۳'
آئی ۱/۱۰'
اسلام آباد۔

۸۴ مقصود وفا'
جینک دولت پاکستان'
فیصل آباد۔

۸۵۔ Dr. Munir D. Ahmed
Deutsches Orient
Institut Mittel Weg 150
2000 Hamburg-13
GERMANY.

۸۶۔ میرزا ادیب'
"لالہ صحرا"
چوہان روڈ' اسلام نگر'
لاہور۔

۸۷۔ ناصر بلوچ'
ایف ای ڈی۔ ۳۰' وحدت کالونی'
لاہور۔

۸۸۔ ناصر شہزاد'
محلہ مسلم آباد'
ساہیوال۔

۸۹۔ نواز'
"نور گھر"
نزد مزار باگھے شاہ'
۵۱/۹' حبیب اللہ روڈ'
لاہور۔

۹۰۔ نظیر صدیقی'
اے۔۲۹' ریلیکس اپارٹمنٹس'
بلاک۔ ۲۰' فیڈرل بی ایریا'
کراچی۔۳۸

۹۱۔ نذیر قیصر'
۱۱/۷' ماڈرن کالونی' چکو روڈ'
لاہور۔ ۴۰

۹۲۔ یونس متین'
۸۴۔ ایچ'
عارف والہ۔

۹۳۔ یوسف چوہدری'
لندن آٹوز' غزنی چوک'
چوگلی نمبر ۴' پیرودھائی روڈ'
راولپنڈی۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم/مرتب	مجلد	پیپر بیک
۱۔	انتخاب اردو غزل (۱۹۷۶ء۔۱۹۷۹ء)	ادارہ	۵۰ روپے	
۲۔	زینت (مرزا قلیچ بیگ کے سندھی ناول کا اردو ترجمہ)	امداد حسینی		۳۰ روپے
۳۔	مہکتے ہار (چینی نظموں کا اردو ترجمہ)	کوثر جمال	۲۵ روپے	
۴۔	ادبی تناظر (سندھی ادبی ثقافت پر مقالات)	ادارہ	۳۰ روپے	
۵۔	منتخب پاکستانی اردو افسانے (انگریزی میں)	پروفیسر احمد علی	۹۰ روپے	۷۰ روپے
۶۔	ور چین (جام درک کے بلوچی کلام اردو نثری ترجمہ)	میر مٹھا خان مری	۹۰ روپے	۶۰ روپے
۷۔	ور چین (جام درک کے بلوچی کلام کا پشتو ترجمہ)	حاجی پردل خٹک	۴۰ روپے	۳۰ روپے
۸۔	ور چین (جام درک کے بلوچی کلام کا کا پنجابی نثری ترجمہ)	زینت قاضی	۶۰ روپے	۵۰ روپے
۹۔	کلام خوشحال خان خٹک (اردو نثری ترجمہ آٹھ جلدیں)	پریشان خٹک	۱۰۰ روپے	۷۵ روپے
۱۰۔	پیام باہو (کلام باہو کا اردو نثری ترجمہ)	ضمیر اظہر	۳۵ روپے	
۱۱۔	ارشادات بلھے شاہ (کلام بلھے شاہ کا اردو نثری ترجمہ)	ضمیر اظہر	۳۵ روپے	
۱۲۔	سندھی شاعری (قدیم و جدید شعراء کے کلام کا اردو نثری ترجمہ)	نیاز ہمایونی		۶۰ روپے
۱۳۔	پشتو شاعری (قدیم و جدید شعراء کے کلام کا اردو نثری ترجمہ)	حاجی پردل خٹک	۱۲۰ روپے	
۱۴۔	بھارت میں اردو (بھارتی ادیبوں کے مقالات)	ادارہ	۵۰ روپے	
۱۵۔	پشتو شاعری کی تاریخ (ایک تحقیقی جائزہ)	پروفیسر پریشان خٹک		۴۵ روپے
۱۶۔	شب تاب موتی (چینی لوک کہانیوں کا اردو ترجمہ)	اعجاز احمد فاروقی		۷۰ روپے
۱۷۔	دجادو چاقو (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	قیصر علوی	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۱۸۔	طلسمی چاقو (چینی لوک کہانیوں کا اردو ترجمہ)	ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۱۹۔	دجادو مرغی (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	افضل رضا	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۰۔	طلسمی پرندہ (چینی لوک کہانیں کا اردو ترجمہ)	بہجت شبیر	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۱۔	خوزے قیسی	عبدالکافی ادیب	۶۰ روپے	۵۰ روپے
۲۲۔	دواور قوم قیسی (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	حیران خٹک	۷۰ روپے	۶۰ روپے
۲۳۔	جادو دا چاقو (چینی لوک کہانیوں کا پنجابی ترجمہ)	قیصر علوی	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۴۔	دسملطو ملاء (چینی لوک کہانیوں کا پشتو ترجمہ)	تسنیم گلاب	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۲۵۔	داور قبیلے کے قصے	حکیم اکرام الحق	۷۰ روپے	۶۰ روپے
۲۶۔	پشتو لوک ادب	محمد افضل رضا	۷۰ روپے	۶۰ روپے
۲۷۔	کلام شاہ حسین (اردو نثری ترجمہ)	ضمیر اظہر	۶۰ روپے	۵۰ روپے

نمبر	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت	قیمت
۲۸-	دیوان رحمن بابا (پنجابی نثری ترجمہ)	الطاف پرواز	۱۵۰ روپے	۱۳۰ روپے
۲۹-	جادو دا پرندہ (چینی لوک کہانیاں)	فردوس حیدر	۵۰ روپے	۴۰ روپے
۳۰-	گل ستی (شمالی علاقہ جات کی لوک کہانیاں)	روبینہ امتیاز قزلباش		۵۰ روپے
۳۱-	مست توکلی (جیون کہانی تے شاعری)	الطاف پرواز	۶۰ روپے	۵۰ روپے
۳۲-	پیر محمد کاکڑ (پشتو شاعری کا اردو ترجمہ)	عابد شاہ عابد	۸۰ روپے	۷۰ روپے
۳۳-	سفر دوستی کا (چینی دانشوروں کے تاثرات)	یوان یک۔ چو منگ		۵۰ روپے
۳۴-	رسالو ریکھائی (سندھی شاعری)	شیخ محمد حسن		۴۰ روپے
۳۵-	پنجابی ادب دا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق جاوید		۱۲۰ روپے
۳۶-	پنجابی کتابیات (جلد اول)	ڈاکٹر شہباز ملک		۳۰۰ روپے
۳۷-	مولانا صلاح الدین احمد۔ ایک مطالعہ	ڈاکٹر انور سدید	۱۲۰ روپے	
۳۸-	یونس ایمرے (ترکی کے عظیم شاعر کے کلام کا اردو ترجمہ)	ڈاکٹر احمد اسرار		۷۵ روپے
۳۹-	پاکستانی ادب۔۹۰ (حصہ نثر)	رشید امجد	۲۰۰ روپے	۱۷۵ روپے
۴۰-	پاکستانی ادب۔۹۰ (حصہ نظم)	شہزاد احمد ۱۲۵ روپے	۱۰۰ روپے	
۴۱-	سندھی لوک کہانیاں (انگریزی)	شیریں خان		۱۲۰ روپے
۴۲-	کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء	سعیدہ درانی		۹۰ روپے
۴۳-	جدید اردو انشائیہ	اکبر حمیدی	۸۵ روپے	۷۰ روپے
۴۴-	اردو افسانے کی روایت	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۵۰۰ روپے	۳۵۰ روپے
۴۵-	اردو مزاحیہ شاعری	سرفراز شاہد	۱۹۵ روپے	۱۸۰ روپے
۴۶-	پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ	ڈاکٹر انور سدید	۱۵۰ روپے	۱۰۰ روپے
۴۷-	ہیر وارث شاہ (اردو نثری ترجمہ حصہ اول)	پروفیسر شریف کنجاہی	۱۵۰ روپے	۱۰۰ روپے
۴۸-	جاگو جاگو (پنجابی ترجمہ)	منشا یاد	۱۱۰ روپے	۱۰۰ روپے
۴۹-	جاگو جاگو (سندھی ترجمہ)	کریم بخش خالد	۱۱۰ روپے	۱۰۰ روپے
۵۰-	جاگو جاگو (پشتو ترجمہ)	محمد نواز طائر	۱۱۰ روپے	۱۰۰ روپے

رابطہ

سرکولیشن منیجر اکادمی ادبیات پاکستان

سیکٹر ایچ ایٹ ون اسلام آباد

فون نمبر ۲۵۴۵۶۷

ادبیات کے لئے ہمارے ایجنٹ

۱۔ گلزار نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ ہسپتال
روڈ لاہور

۲۔ شمع بک سٹال، بھوانہ بازار،
فیصل آباد

۳۔ افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار،
پشاور

۴۔ گوشہ ادب، سرکلر روڈ
کوئٹہ۔

۵۔ بیکن بکس گول باغ، گلگشت کالونی،
ملتان

۶۔ ملک تاج محمد، ملک نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ،
راولپنڈی

۷۔ مکتبہ ہمدانی، رام دین بازار،
جہلم

۸۔ کریمی بک ہاؤس، ۴/ بالمقابل چاندنی سینما،
حیدر آباد سندھ

۹۔ دائم اقبال اکیڈمی،
منڈی بہاؤ الدین

۱۰۔ اسلامی کتب خانہ، جدید بازار،
رحیم یار خان

۱۱۔ رحمان نیوز ایجنسی، جنگی سٹریٹ،
آئی/ ایس کالج گیٹ، پشاور۔

۱۲۔ مسعود اختر زیب، القائم بک ڈپو، مین بازار
خوشاب

۱۳۔ نیشنل نیوز ایجنسی اسد چیمبرز گراؤنڈ فلور شمبھو ناتھ روڈ نزد پاسپورٹ آفس صدر
۳ کراچی

۱۴۔ مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر نمبر ۲،
عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی نمبر ۳۔

۱۵۔ نقش کتاب گھر ۳۸۰ ڈی سکیم نمبر ۲ سیٹلائٹ ٹاؤن
میرپور خاص (سندھ)

۱۶۔ محمد افضل راز، نیوز ایجنسی، عقب نشیمن ہوٹل
ریلوے روڈ، گجرات

۱۷۔ آزاد بک ڈپو ــــــــ صدر بازار،
حیدر آباد (سندھ)

۱۸۔ فضل ربی راہی، شعیب سنز، اوحیانہ بازار، کی ال
مینگورہ سوات

۱۹۔ ماڈرن بک ڈپو، عزیز شہید روڈ
سیالکوٹ۔

۲۰۔ الہدر بک کارپوریشن، رنگیل چوک صدر،
نزد ریلوے پل، اوکاڑہ

۲۱۔ رحمت بک سٹال اینڈ نیوز ایجنٹ،
نزد ریلوے پل اوکاڑہ۔

۲۲۔ راجہ برادرز متصل مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ رحیم با
ڈیرہ اسماعیل خان۔

۲۳۔ مکتبہ ادب، ۳۵۳- پاک کالونی،
میرپور خاص (سندھ)

۲۴۔ گلشن بک ڈپو، اردو بازار
سیالکوٹ شہر۔

۲۵۔ حاجی گل بخشالوی، بخشالوی پبلشرز
اینڈ نیوز ایجنٹ، کھاریاں

۲۶۔ خالد بک سٹال، مسلم بازار،
گجرات

۲۷۔ بخاری نیوز ایجنسی، نزد گرلز ہائی سکول،
احمد پور شرقیہ۔

۲۸۔ اتحاد نیوز ایجنسی،
ایبٹ آباد

۲۹۔ شمع بک ایجنسی، بینک روڈ،
مردان

۳۰۔ پیرزادہ بک سینٹر، ایئرپورٹ روڈ،
گلگت

۳۱۔ چوہدری محمد شریف آزاد،
گجرات

۳۲۔ اکبر لائبریری
بالمقابل گورنمنٹ ڈگری کالج
برائے خواتین، کوہاٹ

مشتہرین کی توجہ کے لئے

آئندہ شمارے کے لیے اشتہارات یکم اکتوبر ۹۵ء تک ارسال کردیے جائیں

شرح

پشت سرورق	۵۰۰۰/- روپے
اندرونی سرورق	۳۰۰۰/- روپے
فی صفحہ	۲۰۰۰/- روپے
آدھا صفحہ	۱۲۰۰/- روپے
رسالے کا سائز	۸/۲۶"X۲۰"

رنگین چھپائی کے لیے عام نرخ سے پچیس فیصد فی رنگ زیادہ رقم وصول کی جائے گی۔ سال بھر کے لیے اشتہار معاہدے پر دس فیصد رعایت دی جائے گی۔ نجی اداروں سے رقم پیشگی نقد یا بذریعہ بینک ڈرافٹ وصول کی جاتی ہے۔

مزید معلومات کے لئے:
مینجر سرکولیشن و اشتہارات
سہ ماہی "ادبیات"
سیکٹر ایچ ایٹ ون، اسلام آباد
فون نمبر۔ ۲۵۴۵۶۷

مطبوعات کے ایجنٹ حضرات کی توجہ کے لئے

اکادمی کی مطبوعات کی فہرست اپنی پسندیدہ کتب کے آرڈر کی مالیت کا تعین کریں نیز اپنی قریبی بینک شاخ کا مکمل اور کتب کی ترسیل کی وضاحت کریں تاکہ بذریعہ ٹرک / ریل / بنک بلٹی جس میں آپ کو سہولت ہو' ارسال کی جا مال کی بلٹی آپ کی بنک شاخ کو ارسال کی جائے گی جہاں ادائیگی بذریعہ ڈرافٹ بنام اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام کرنے کے بعد آپ بلٹی حاصل کر سکیں گے ترسیلی اخراجات بذمہ پارٹی ہوں گے۔ فی کتاب کے آرڈر سرکولیشن ارسال کیجئے جائیں تاکہ ان پر فور کارروائی کی جاسکے۔

اگر آپ کی دکان ہمارے صوبائی دفتر سے قریب ہے تو آپ اپنی مطبوعہ کتب وہاں کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر سے راست بھی انہی شرائط پر حاصل کرسکتے ہیں جن کے پتے اور فون نمبر درج ذیل ہیں۔

کراچی

جناب آغا نور محمد پٹھان

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر

اکادمی ادبیات پاکستان

دسویں منزل' شیخ سلطان ٹرسٹ

۲۵۔ سول لائنز' کراچی

کراچی۔ (صوبہ سندھ)

فون: ۵۶۸۲۷۰۱

کوئٹہ

جناب سید الطاف حسین بخاری

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر

اکادمی ادبیات پاکستان

میکانگی روڈ' بالمقابل وٹرنری ہسپتال

کوئٹہ (بلوچستان)

فون: ۷۳۱۰۱

لاہور

جناب قاضی جاوید

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر

اکادمی ادبیات پاکستان

۲۳۰۔ گلشن بلاک' اقبال ٹاؤن

لاہور (پنجاب)

فون: ۴۳۱۳۳۷

پشاور

جناب بہزاد ابراہیم

(ریذیڈنٹ ڈائریکٹر)

اکادمی ادبیات پاکستان

دکان نمبر ۱۴۱۳ ملحقہ شمال ہوٹل

جی ٹی روڈ' پشاور شہر

پشاور۔

(صوبہ سرحد)

فون: ۲۱۰۵۰۳

اکادمی ادبیات پاکستان کی نئی مطبوعات

اردو افسانے کی روایت

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

مجلد ۵۰۰/-

پیپر بیک ۳۵۰/-

اردو مزاحیہ شاعری

سرفراز شاہد

مجلد ۱۹۵/-

پیپر بیک ۱۸۰/-

پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

ڈاکٹر انور سدید

مجلد ۱۵۰/-

پیپر بیک ۱۰۰/-

ہیر وارث شاہ

مترجم: پروفیسر شریف کنجاہی

مجلد ۱۵۰/-

پیپر بیک ۱۰۰/-

رابطہ وفاقی دفتر بہبود آبادی، اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان

ایچ ۸/۱ اسلام آباد

۱۴۱۱ - ۱۴۱۲ ہجری

اکادمی ادبی انعامات

اکادمی ادبیات پاکستان جولائی ۱۹۹۰ء تا جولائی ۱۹۹۲ء کے دوران اردو، پنجابی، سندھی، بلوچی، سرائیکی پشتو، انگریزی ادبیات کی نثری اور شعری اصناف یعنی تنقید، تحقیق، ناول، افسانہ، انشائیہ، سفرنامہ، سوانح، طنز و مزاح، غزل اور نظم کی بہترین طبع زاد پہلی بار چھپنے والی کتب پر انعامات دے گی۔

اکادمی اپنے ذرائع سے ان کتابوں کے بارے میں جو اس دوران شائع ہوئی ہیں۔ معلومات جمع کر رہی ہے تاہم ادباء، شعراء، ناقدین، محققین، ناشرین اور قارئین ادب سے بھی درخواست ہے کہ وہ مقررہ عرصے کے اندر شائع ہونے والی اپنی اور دوسرے ناشرین / مصنفین کی کتابوں کے نام اور ناشر یا تقسیم کار کے پتوں سے فوری طور پر مطلع فرمائیں۔

یہ انعامات طبع زاد اور مقررہ مدت کے دوران پہلی مرتبہ شائع ہونے والی کتب کے لئے ہیں۔ تراجم اور تدوین شدہ کتب انعامات کے اس پروگرام میں شامل نہیں۔ اکادمی ان انعامات کے قواعد و ضوابط پر پورا اترنے والی کتابوں کو "قیمتاً" خریدے گی۔ تاہم التماس ہے کہ کتابیں وی۔پی ارسال نہ فرمائیں۔

نسیم احتشام

ڈپٹی ڈائریکٹر

ریسرچ اینڈ پروگرامز

Overnight delivery in 32 cities of Pakistan. Special handling from receipt to delivery.

International Speed Post

Parcels and packets documents and trade samples speedily delivered in 32 cities of Pakistan and 72 countries around the world.

Urgent Mail Service

Effective, cheaper than any other courier service, fast and reliable for your immediate mail in 134 towns of Pakistan with extended booking hours

Fax Money Order Service

For instant payment as if across the table. To beat others where money matters.

These fax services are available at 77 district GPOs where NWD facility is available.

Fax Mail

Your messages papers/documents instantly transferred and delivered between 77 stations in original form at economical cost. You transact your business in moments.

Urgent Money Order Service

For money transactions that involve time factor to meet a commitment between 134 towns of Pakistan.

pakistan post

Ministry of Communications
Govt. of Pakistan